

دُنیا کی عظیم کتابیں

سٹار طاہر

دنیا کی سو سو عظیم کتابیں

ستار طاہر

مکتبہ اصابین



کتابخانہ

جملہ حقوق محفوظ

۶۱۹۸۶	بار اول
ایک ہزار	تعداد
آر۔ آئی۔ پرنٹرز لاہور	مطبع
کاروان ادب ملتان صدر	ناشر
روپے	قیمت

اپنی شریک حیات

نگہت کے نام

عمل سے تمہی دامن آدمی کی زندگی کو آپ نے اپنی
سچی، حوصلہ بخش رفاقت سے مسرتوں اور آسوں کیوں
سے بھر دیا۔ آپ کی رفاقت نصیب نہ ہوتی تو یہ
کام کبھی مکمل نہ ہو پاتا۔

دُنیا کی سَوِطِیم کتائیں

- ۱۳ — ۱۔ القرآن
- ۲۳ — ۲۔ صحیح بخاری
- ۳۰ — ۳۔ عہد نامہ عقیق
- ۳۷ — ۴۔ عہد نامہ جدید
- ۴۴ — ۵۔ گستا
- ۵۷ — ۶۔ اقوال کینفیوش
- ۶۸ — ۷۔ دھماپد
- ۷۷ — ۸۔ گرنٹھ صاحب
- ۸۳ — ۹۔ ابلید — ہومر
- ۹۹ — ۱۰۔ کلید دمنہ
- ۹۸ — ۱۱۔ کہانیاں۔ ایوپ
- ۱۰۶ — ۱۲۔ الف لیلا
- ۱۱۷ — ۱۳۔ کٹری برمی ٹیلز — چاسر
- ۱۲۷ — ۱۴۔ ایڈی پیس — سنوکلین
- ۱۳۵ — ۱۵۔ ایکٹرا — یوری پیڈیز
- ۱۴۹ — ۱۶۔ شکنتلا — کالی داس
- ۱۵۵ — ۱۷۔ فیدرا — راسین
- ۱۶۱ — ۱۸۔ ہیمیلٹ — شیکسپیر
- ۱۷۵ — ۱۹۔ فاؤسٹ — گوئٹے
- ۱۸۶ — ۲۰۔ اے ڈالرز ہاؤس — ایسن
- ۱۹۳ — ۲۱۔ ڈیکرون — یوکیچیو
- ۲۰۵ — ۲۲۔ ڈیوانن کامیڈی — دانٹے
- ۲۲۰ — ۲۳۔ فصوص الحکم — ابن عرب
- ۲۳۶ — ۲۴۔ کشف المحجوب — علی ہجویری
- ۲۴۳ — ۲۵۔ شاہنامہ — فردوسی

- ۲۵۴ — گلستان — سعدی
- ۲۶۵ — مثنوی — رومی
- ۲۶۶ — دیوان — حافظ
- ۲۸۹ — یوٹوپیا — مومس
- ۲۹۶ — نیواٹلائس — بیکن
- ۳۰۵ — پرنسپیا — نیوٹن
- ۳۱۳ — اصل الانواع — ڈارون
- ۳۲۳ — مقدمہ — ابن خلدون
- ۳۳۵ — ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر — گبن
- ۳۴۲ — اے سٹڈی آف ہسٹری — ٹائٹن بی
- ۳۴۶ — لیویاتھن — ہابز
- ۳۵۷ — ٹریکیس تھیما لوجیکو پولٹیکس — اسپینوزا
- ۳۶۸ — ری پبلک — افلاطون
- ۳۷۶ — سیاسیات — ارسطو
- ۳۸۴ — میڈی ٹیشنز — ڈیکارت
- ۳۹۱ — تنقید بر عقل محض — کانٹ
- ۴۰۰ — فلاسفیکل ڈکشنری — والشیر
- ۴۱۴ — پرنس — میکاویلی
- ۴۲۵ — معاہدہ عمرانی — روسو
- ۴۳۹ — وولڈ ایزول اینڈ آئیڈیا — شو پنہار
- ۴۴۹ — بیگ اینڈ ٹنٹھنگس — سارتر
- ۴۵۶ — ایسٹھیک — کروچے
- ۴۶۲ — پرنسپلز آف سوشیا لوجی — اسپنسر
- ۴۶۸ — اور زرتشت نے کہا — نطشہ
- ۴۷۶ — کونسیپٹ آف دی ڈریڈ — کوکیکارڈ

- ۴۸۲ — ۵۱ — کرٹیویو ایرو لیوشن — برگساں
- ۴۸۸ — ۵۲ — لوچک — ہیگل
- ۴۹۴ — ۵۳ — رائٹس آف مین — پین
- ۵۰۲ — ۵۴ — داس کیپیٹل — مارکس
- ۵۱۱ — ۵۵ — سائیگو انالسز — فرائیڈ
- ۵۱۸ — ۵۶ — میموریز - ڈریزری فلیکشنز — ڈونگ
- ۵۲۵ — ۵۷ — پلگرمز پراگریسی — بنین
- ۵۳۱ — ۵۸ — جیسٹن — ڈی سیڈ
- ۵۳۹ — ۵۹ — لامز رابیلز — ہیوگو
- ۵۴۷ — ۶۰ — سکارلٹ لیٹر — ہاٹھیرون
- ۵۵۵ — ۶۱ — ڈیڈ سولز — گوگول
- ۵۶۵ — ۶۲ — ایپل ٹامر کیبن — ہیریٹ سٹوڈ
- ۵۷۴ — ۶۳ — ڈورنگ ہائیس — ایملی برونیٹ
- ۵۸۲ — ۶۴ — فادر اینڈ سنز — ترگنیف
- ۵۹۰ — ۶۵ — ہیرو آف آور ٹائمز — لر منتوف
- ۶۰۱ — ۶۶ — ریڈ اینڈ دی بلیک — ستان وال
- ۶۰۷ — ۶۷ — ریمبرنس آف تھنگز پاسٹ — پروست
- ۶۱۳ — ۶۸ — دی ٹرائل — کافکا
- ۶۱۸ — ۶۹ — مادام بوواری — فلو بیڈ
- ۶۲۴ — ۷۰ — مال — گوری
- ۶۲۹ — ۷۱ — فرام ارتھ ٹو دی مون — ورن
- ۶۳۴ — ۷۲ — برادرز کرمازوف — دوستوئیفسکی
- ۶۴۰ — ۷۳ — ڈیوڈ کا پرفیلڈ — ڈکنز
- ۶۴۹ — ۷۴ — دی نیٹرسن — رائٹ
- ۶۵۶ — ۷۵ — ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ — سٹونسن

- ۶۶۲ — رابنس کروسو — ڈیفو
- ۶۶۸ — موبی ڈک — میلول
- ۶۷۸ — گلیورز ٹریولرز — سوئفٹ
- ۶۸۳ — کونٹ آف مانتی کرسٹو — ڈوما
- ۶۹۱ — ہیومن کامیٹی — بالزاک
- ۶۹۹ — وار اینڈ پیس — ٹالسٹائی
- ۷۰۵ — ڈان کیجوٹے — سروانیٹن
- ۷۱۵ — پولیسر — جوائس
- ۷۲۲ — نظیں — پوشکن
- ۷۳۰ — بدی کے پھول — بودیلیئر
- ۷۳۶ — رباعیات — عمر خیام
- ۷۴۱ — لیوز آف گراس — وہٹمین
- ۷۴۸ — اے سیزن ان دی ہل — ڈاں جو
- ۷۵۶ — ایلیجز — ریک
- ۷۶۳ — ویسٹ لینڈ — ایلٹ
- ۷۷۲ — کینٹوز — پونڈ
- ۷۷۷ — جاوید نامہ — اقبال
- ۷۸۴ — فیری ٹیسلز — اینڈرسن
- ۷۹۱ — چھوٹی بڑی کہانیاں — چیخوف
- ۷۹۶ — منتخب کہانیاں — اوہنری
- ۸۰۲ — کہانیاں — موپسان
- ۸۰۸ — والدین — تھوریو
- ۸۱۴ — سینچریز — فوسٹر ڈامس
- ۸۲۲ — سٹی ان دی سائیکلو جی آف سیکس — ایلس
- ۸۲۷ — شاخ زریں — فریزر

چند باتیں

اس ایک کتابے میں شان۔ ہر کتابے پر ایک پوری کتابے لکھی جاسکتی ہے اور بلاشبہ ان کتابوں پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے، جسے کا شمار ممکن نہیں۔
میں نے اس کتابے کا منصوبہ بنایا تو چند اہم نکاتے اور امور کو سامنے رکھنے اور ان پر عمل کرنے کے کوششے کی۔ غیر ملکی زبانوں میں کتنی ہی ایسی کتابیں ملتی ہیں جنہ میں ان کتابوں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ جن کا شمار دنیا کے اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے اور جنہو نے انسانے افکار اور تہذیبے، تمدنے اور معاشرتے کو تبدیل کرنے میں انقلابے کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ایسے تمام مجموعوں اور تعارفی کتابوں میں دنیا کے آبادی کے ایک بڑے حصے کو ہمیشے سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ بڑی کتابیں جنہوں نے انسانے ذہنے اور فکر کو تیز کیا۔ صرف یورپے اور سفید نام دنیا میں ہی نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ میں بھی ایسے کتابوں کے تخلیقے ہوئے جنہوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو ہر زمانے میں متاثر کیا ہے۔ اسے اعتبار سے جن کتابوں کو میں نے دنیا کے سوجھڑی کتابوں میں شامل کیا۔ ان میں انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے کتابوں کے علاوہ فارسی، عربی اور پنجاب کے کتابوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

کتابوں کے انتخابے کے واسے میں دورے ہو سکتی ہیں۔ بعض ذہین قارئین اعتراضے کر سکتے ہیں کہ فلاں کتابے جو اس اہمیتے کے حاملے تھے اسے کو اس کتابے میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔

اس ضمنے میں نے یہ اصول سامنے رکھا کہ ان کتابوں کو شامل کیا جائے جو اپنے جہوج اور اسلوب اور پیرائے بھر گیر اثراتے کے وجہ سے 'بیداری' اہمیتے کے حاملے

ہوں۔ بعض کتابیں جنہوں نے ایک دور میں انسانوں کے گتے نسلوں کے ذہنوں پر حکمرانی کی۔ آج ان کے اثرات ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے صرف ان کتابوں کو شرمیہ کیا گیا جو عام معنوں میں — سدا بہار کہلاتے ہیں۔

یہ سوکتا ہے وہ یہ جنہوں نے انسانی فکر کو بدلا ہے۔ اختلافات اور دائمی مباحثے کا سرچشمہ ٹھہری ہیں۔ لیکن ان کی ہمہ گیری اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

”دنیا کے سوعظیم کتابیں“ کا سلسلہ روزنامہ ’امروز‘ لاہور میں شائع ہوتا رہا۔ اس دوران میں مجھے بہت سے خطوط ملتے رہے۔ بعض قیمتی مشوروں سے مجھ کو آرا گیا۔ جن سے میں نے بہت استفادہ کیا۔ اب ان مضامین کو کتابی صورت میں یکجا کرتے ہوئے ایک بار پھر نظر ثانی کی گئی ہے بعض ترامیم کی گئیں اور اضافے بھی.....

ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری یہ کتاب ایک تعارفی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے حوالے سے یہ آرزو رکھ رہی ہے کہ اردو کے قارئین مجھ کو اصل کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اس کتاب سے پڑھنے والوں کو ترغیب دینے اور تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صدیوں سے انسانوں کے بہترین اور نابغہ ذہنوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے اور انسانی شعور اور فکر کو عام کیا جاسکے۔

یہ ایک بڑا کام تھا۔ جو بالآخر اپنے انتقام کو پہنچا۔ میری محنت اور شوق کے علاوہ طالب علمانہ لگن نے اس کتاب کی تکمیل میں میرا بہت سا ہتھ دیا۔

اور آج جب یہ کتاب آپ کے خدمت میں پیش کر رہا ہوں تو یہ عاجزانہ سہ مسرت صندروسوں ہوتے ہے کہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور واحد کتاب ہے...!!

ستار طالب

لاہور

۱۸ مارچ ۱۹۸۵ء

القرآن الحکیم

القرآن الحکیم دنیا کی واحد کتاب ہے جس کا ہر دعویٰ سچا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے پہلی اور سب سے آخری الہامی کتاب ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں آج تک کوئی تحریف نہیں ہوئی۔ نہ اس میں کوئی اضافہ ہوا نہ ترمیم نہ کمی۔ قرآن پاک وہ کتاب ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود مالک ارض و سما اور کتاب کے اتارنے والے نے لی ہے۔ آج بھی اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نطقہ اسی طرح محفوظ اور موجود ہے، جس طرح اسے آج سے چودہ سو برس پہلے اتارا گیا اور صدیوں پہلے نامعلوم وقت میں، کائنات کی تخلیق سے پہلے لوح محفوظ پر تحریر کیا گیا تھا۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔

”ہم نے ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں،“ (القرآن)

تاریخ القرآن میں مولانا عبدالقیوم ندوی لکھتے ہیں:

”روایتوں میں آیا ہے کہ اللہ رب العزت نے پورے قرآن شریف کو رمضان کی ایک شب قدر میں کائنات کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے آسمان دنیا پر نازل فرمایا اور وہاں سے حضرت جبریل امین آہستہ آہستہ حسبِ ضرورت اور حسبِ الحکم رب تعالیٰ، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۲ یا ۲۳ سال میں نازل فرماتے رہے۔ یہی قول مشہور مفسر صحابی عبداللہ بن عباس کا ہے۔ اس کی طرف اکثر اہل علم صحابہؓ و تابعینؓ گئے ہیں اور یہی زیادہ صحیح اور واضح ہے۔“

(تاریخ القرآن، عبدالقیوم ندوی ص ۳۴)

قرآن پاک خدا کی آخری کتاب ہے جو نبی آخر الزماں حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کے ساتھ ہی جہاں نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوا۔ وہاں دنیا پر اب کوئی الہامی کتاب نازل نہ ہوگی جب تک یہ دنیا قائم ہے یہ کتاب ہمیشہ کے لئے نبی نوع انسان کی رہنمائی اور ہدایت کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ قرآن پاک کے کئی دوسرے اسمائے مبارک بھی ہیں۔ جن میں الفرقانِ رحیق و باطل میں تمیز کرنے والا، النور الکتاب، الہدیٰ، کتاب میں زیادہ مشہور ہیں۔

لفظ قرآن ایک رائے کے مطابق قرأت سے مشتق ہے۔ یہ مبالغہ اور فضیلت کا صیغہ ہے۔ جس کا مطلب ہے بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتاب، حقیقت بھی یہی ہے اور ایک تازہ ترین تحقیق کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ جس کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ وہ قرآن پاک ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے قرآن کو قرآن سے ہی مشتق قرار دیا ہے جس کا مفہوم مولانا عبید اللہ سندھی نے یہ متعین کیا ہے کہ قرآن پاک تمام دنیا کی اقوام کے درمیان یکابخت اور محبت قائم کرنے کے لئے نازل ہوا اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ تمام اقوام عالم ایک رشتہٴ وحدت میں منسلک ہو جائیں۔

قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کی آخری اور مکمل ترین کتاب ہے۔ یہ وہ دعویٰ ہے کہ جس پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی کوئی الہامی یا غیر الہامی کتاب نہ تو یہ دعویٰ کر سکتی اور نہ ہی اس کا دعویٰ سچا ہو سکتا ہے۔ لہذا یہ۔ یہ صفتِ خاص قرآن پاک سے ہی مخصوص ہے کہ اس کو دنیا کی آخری الہامی اور مکمل ترین کتاب کا رتبہ بلند حاصل ہے جو اس کے علاوہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔

جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس وقت اس سے پہلے کی دوسری مذہبی اور الہامی کتابیں تو ریت، زبور، انجیل اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ تھیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

”یہودی الفاظ کو ان کے اصلی معنوں سے پھیر دیتے ہیں اور انہوں نے ان

ہدایتوں کا ایک بڑا حصہ مجلادیا جوان کو دی گئی تھیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں ان سے ہم نے عہد لیا تھا مگر انہوں نے ہدایات کا ایک حصہ مجلادیا جوان کو دی گئی تھیں (المائدہ-۳)

متی کی اصل انجیل دُنیا سے غائب ہے۔ صرف اس کا ترجمہ باقی ہے۔ اصل عبارت سرے سے موجود نہیں۔ زبور و تورات بھی اصل حالت میں موجود نہیں۔ لوقا اور قس کی

قرآنی حروف کی تفصیل

الف : ۲۸۸۷۲	ب : ۱۱۴۲۸	ت : ۱۰۹۹
ث : ۱۲۷۶	ج : ۳۳۷۳	ح : ۳۷۹۳
خ : ۲۴۱۶	د : ۵۶۰۲	ذ : ۲۶۷۷
ر : ۱۱۷۹۳	ز : ۱۵۹۰	س : ۵۸۹۱
ش : ۲۲۵۳	ص : ۲۰۱۳	ض : ۱۶۰۷
ط : ۱۲۷۷	ظ : ۸۴۲	ع : ۹۲۲
غ : ۲۲۰۸	ف : ۸۴۹۹	ق : ۶۸۱۲
ک : ۹۵۰۰	ل : ۳۰۴۳۳	م : ۲۶۵۰
ن : ۴۵۱۹۰	و : ۲۵۵۳۶	ہ : ۱۹۰۷۰
ہ : ۴۷۲۰	ی : ۴۵۹۱۹	

(مندرجہ بالا حروف قرآن پاک میں جتنی بار استعمال ہوئے ہیں انکی تفصیل یہی ہے)

اناجیل کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھے۔ ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو برس بعد ہی عیسائی علماء اور کلیسیا میں اناجیل کے استاد پر بحث کا آغاز ہو گیا تھا جو آج تک جاری ہے۔ برناماس کی انجیل جو پاپائے روم کے کتب خانے میں موجود ہے اسے بیشتر عیسائی مستند نہیں مانتے اور یہ انجیل بھی اصل نہیں ہے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں اناجیل کی تعداد کا فرق پایا جاتا

ہے۔ ہندوؤں کے دیدار اور دیگر کتابیں۔ دیو مال سے تعلق رکھتی ہیں ان کا مذہب اور الہام سے سرے سے کوئی تعلق نہیں۔ دُنیا میں سوائے قرآن پاک کے کوئی ایسی مقدس اور الہامی کتاب نہیں جو اپنی اصلی حالت میں موجود ہو۔ قرآن پاک اپنے سے پہلے کی تمام الہامی کتابوں کی تائید کرتا ہے۔ لیکن ان کی اصلی حالت میں قرآن پاک تمام الہامی کتابوں کا تمہ ہے، اہمیت ہے، تکمیل ہے۔ اس کے بعد بنی نوع انسان کو کسی الہامی کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیونٹا لٹائی نے اپنے کتابچے ”مذہب کی روشنی“ میں لکھا تھا۔

”اگر یہی ایک کتاب القرآن دُنیا کے سامنے موجود ہو اور کوئی مُصلح یا پیغمبر نہ آیا ہوتا تو حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک کتاب انسانی ہدایت و فلاح کے لئے کافی تھی“
قرآن پاک صحائفِ آسمانی اور الہامی کتابوں کا تسلسل بھی ہے اور تکمیلی نقطہ بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ امودودی لکھتے ہیں:

”قرآن اس تعلیمِ خداوندی کو پیش کرتا ہے جس کو تورات اور انجیل پیش کرتی تھیں۔ بلکہ یہ اس وجہ سے بھی ناگزیر ہے کہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کا جدید ترین (LATEST) بلکہ آخری ایڈیشن (LAST EDITION) ہے۔ اس میں بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھیں اور بہت سی وہ چیزیں حذف کر دی گئی ہیں جن کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہذا جو شخص اس ایڈیشن کو قبول نہ کرے گا۔ وہ صرف خدا کی نافرمانی ہی کا مرتکب نہ ہوگا۔ بلکہ ان فوائد سے بھی محروم رہ جائے گا جو آخری اور جدید ترین ایڈیشن میں انسان کو عطا کئے گئے ہیں“ (تفہیمات حصہ اول ص ۱۷۷)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ یہ سورۃ علق ہے جو قرآن پاک کے تیسویں پارہ میں ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ.....

”پڑھ اپنے رب کا نام لے کر جس نے کائنات کی تخلیق فرمائی جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور اس احساس کے ساتھ

کہ تیرا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم عطا کیا اور انسان کو وہ کچھ سکھا دیا۔ جس کا اسے علم نہ تھا۔“

نزولِ قرآن کی تاریخ میں علماء کا اختلاف ہے، امام طبری کے مطابق ۱۷ رمضان المبارک (مطابق ۶ اگست ۶۱۰ء) ہے۔ علامہ جلال الدینی سیوطی ۲۷ رمضان المبارک پر اصرار کرتے ہیں اور اسی پر بیشتر آئمہ اور محدثین متفق ہیں۔

امام احمد بن حنبل کی ایک روایت تیسرا این کثیر میں منقول ہے۔ جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں: ”حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی شب نازل کئے گئے۔ تو رات کا نزول پھر رمضان کو ہوا۔ زبور بارہ رمضان کو نازل ہوئی اور انجیل اٹھارہ رمضان کو اتری قرآن پاک رمضان کی پچیسویں شب نازل ہوا“

قرآن پاک کی آخری وحی کے ذریعے جمعۃ الوداع کے موقع پر دین بھری کے احقر ہیں نازل ہوئی یہ سورہ مائدہ آیت ہے:

أَيُّدُهُ أَكْمَلْتُ لَكُمْ وَيُنَكِّفُ.....

”آج کے دن، ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا“

دیگر مذاہب اور اسلام میں وحی اور الہام کے تصور میں بہت فرق ہے، قرآن پاک کا ایک ایک لفظ حنذا وندی ہے۔ جو برہ راست لوح محفوظ سے حضور نبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن کی جو آیت حضور صلعم پر نازل ہوتی آپ اسے خود یاد کر کے صحابہ کرام کو یاد کرا دیتے پھر صحابہ کرام اسے کاغذ کے ٹکڑیوں، کھجور کے پتوں، ٹکڑی کے تختوں اونٹ کے کجاووں، پتھر کے ٹکڑوں، چمڑے کے غلافوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ کچھ صحابہ کرام کاتبان وحی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ انہیں حضور نبی کریم صلعم نے خود وحی لکھنے کے لئے مامور فرمایا تھا۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ، عبد اللہ بن سلامؓ ابوالوا رثا معاذ بن جبلؓ اور معاویہؓ شامل ہیں۔

کاتبان وحی کے علاوہ ایسے صحابہ کرام بھی تھے جو قرآن پاک حفظ کرتے جاتے تھے۔

حفاظ قرآن میں ان صحابہ کرام کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابو موسیٰؓ، اشعریؓ
خواتین حفاظ قرآن میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام ورقہؓ
بن نوفل کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن پاک لوح محفوظ پر بالکل اسی طرح موجود ہے جس طرح آج مصاحف میں موجود ہے۔ جس طرح حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہے۔ قرآن پاک ٹھوڑا ٹھوڑا نازل ہوا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسی طرح لکھوانا شروع کیا جس طرح لوح محفوظ میں موجود ہے اور جس طرح آج محفوظ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں پورا قرآن جمع کر لیا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے جمع القرآن میں صرف یہ فرق ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تمام اجزائے قرآن پاک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے قرآن کے مطابق لکھوایا اور جمع کر لیا حضرت عثمانؓ نے سورتوں کو مرتب کر لیا اور مختلف قراتوں کو چھوڑ کر قریش کی قرات پر قرآن جمع کیا۔ کیونکہ اسی پر قرآن نازل ہوا تھا۔ یوں قراتوں میں جو اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔

یہودی مستشرقین نے اپنی طرف سے قرآن پاک کے بارے میں مختلف النوع الزام تراشوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی انہوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کی ذمہی اختراعات اور تحقیقات کو پیش کیا کہ تو بہ نعوذ باللہ قرآن پاک کے چالیس سپارے تھے اور دس سپارے غائب ہو چکے ہیں۔ لیکن ان یہودی اور غیر مسلم مستشرقین کے جھوٹے کلام کا پول خود ہی کھل جاتا رہا ہے۔

دُنیا کی تاریخ کسی بھی کتاب کے بارے میں اتنی مستند معلومات فراہم کرنے سے ناصر ہے۔ قرآن پاک کا ایک ایک حرف، ایک ایک شوشہ روزِ ازل سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پر نزول سے لے کر آج تک محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار خود خالقِ دو جہاں ہے۔

قرآنِ پاک پر ایک نظر			
سورتیں	۱۱۴	سپارے	۳۰
مدنی سورتیں	۲۱	مکی سورتیں	۹۳
حروف	۳۲۲۶۷۱	آیات	۶۶۶۶
ذکر	۵۳۲۲۳	کلمات	۸۶۴۳۰
بیتیں	۱۷۷۱	نقطے	۱۰۵۶۸۲
رکوع	۵۴۰	شذیہیں	۱۲۵۳
حروف مقطعات		۳۱	

قرآنِ پاک رشد و ہدایت کی سب سے بڑی اور مکمل کتاب ہے۔ یہ علوم کا خزینہ ہے۔ انسان کی دنیوی اور دنیاوی رہنمائی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں یہ فرمودہ خداوندی ہے اور تمام ادیان کی تکمیل کرتا ہے۔ بنی نوع انسان کی فلاح اور نجات صرف اور صرف قرآنِ پاک پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ چودہ صدیوں سے قرآنِ پاک کی وجہ سے دنیا میں جو نور پھیلا ہے اس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ گمراہی تاریکی اور ضلالت کے ہر دور میں قرآن نے انسانوں کی رہنمائی کی ہے اور تا ابد رہنمائی کا ذریعہ ادا کرتا رہے گا کیونکہ کسی کتاب کو یہ رتبہ اور یہ فرض نہیں سونپا گیا جو قرآنِ پاک کو حاصل ہے۔

گوٹے نے کہا تھا:

”قرآنِ پاک کی تعلیم کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کر سکتی اپنے تمام نظام ہائے تعلیم کے ساتھ اگر ہم چاہیں بھی تو قرآن کی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور یہ کسی

انسان میں برطاعت ہے کہ وہ قرآن سے بہتر نظام پیش کر سکے
 قرآن پاک ایک اساسی دستور ہے۔ منبع رشد و ہدایات ہے۔ انسان کے تمام مسائل کا
 حل اس میں موجود ہے۔ انسان کی اس زندگی اور حیات بعد الممات کے لئے اس میں دائمی
 سچائی اور رہنمائی موجود ہے۔ قرآن پاک کے بارے میں نہ صرف آئمہ اسلام اور علمائے اسلام
 بلکہ دنیا کے تمام بڑے دانشور اور فلسفی اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن پاک کی تعلیمات انسانی
 فطرت کے عین مطابق ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب الفوز الکبیر، میں قرآن پاک کے جملہ مضامین
 کو پانچ اصناف میں تقسیم کیا ہے۔

- ۱- علم عقائد: اسلامی عقائد و افکار کی تعلیم پر مشتمل آیات الہیہ
- ۲- علم الاحکام: جن میں حلال حرام۔ جائز ناجائز نیک و بد کی تفصیلات ہیں۔
- ۳- تذکیر بالآلاء اللہ: اللہ کی نعمتوں کا تفصیلی تذکرہ انسانوں پر اللہ کی عنایات۔
- ۴- تذکیر بایام اللہ: وہ آیات جن میں اللہ نے اپنے بندوں اور مصیبت کشش
 قوموں کے ساتھ اپنے سلوک کا ذکر فرمایا ہے۔ تابع فرمان بندوں اور امتوں سے جو
 معاملہ طے کیا ہے اس کی وضاحت موجود ہے۔

۵- تذکیر بالموت وما بعدہ: موت اور اس کے بعد زندگی کے متعلق مسائل ...

قرآن پاک دنیا کی واحد کتاب ہے جس کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں ۵۵۲۴
 میں موجدین کے دور میں تراجم قرآن کی اہمیت کا احساس ہوا اور پہلی بار اس کا ترجمہ ہوا۔ فارسی
 زبان میں شیخ سعدی نے ۶۹۱ھ میں قرآن پاک کا پہلی بار فارسی ترجمہ کیا۔ ہندوستان میں
 شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے ترجمہ کیا ان کے نامور صاحبزادوں شاہ عبدالقادر شاہ فیض الدین
 نے اردو میں پہلی بار لفظی ترجمے کئے دنیا کی ہر زبان میں قرآن پاک کے کئی تراجم موجود ہیں اور
 رہتی دنیا تک ہوتے رہیں گے، جرمانی، یونانی، ارمینی، جادوی، پرتگالی، ڈنمارک، رومانوی
 ترکی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تیلگو، پشتو، سندھی، لاطینی، اطالوی، ہسپانوی
 برمن، فرانسیسی، انگریزی، روسی، ڈچ، چینی، الغرض دنیا کی ہر زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ

ہو چکا ہے اور قرآن پاک کے بارے میں ان گنت کتب شائع ہو چکی ہیں۔

قرآن پاک رہتی دنیا تک رشد و ہدایت کا منبع ہے۔ قرآن پاک کے ساتھ ہی علم التفسیر نے جنم لیا عالم اسلام نے ایسے ایسے مفسران کرام پیدا کئے۔ جنہوں نے تعلیمات قرآن کو عام کیا مفسرین میں صحابہ کرام میں سے خلفائے راشدہ عبداللہ بن مسعود، ابن عباس، زید بن ثابت، ابو سعید اشعری، امام حن بصری، سعید بن جبیر، مکمل، حلقہ، عطاء بن ابی ریح، مشہور ہیں۔ علمائے کرام ہیں سے ابن جریر، ابن ماجہ کی تفاسیر بے حد مشہور ہیں۔ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت احمد رضا خان کی تفاسیر قرآنی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

قرآن پاک کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت کا حال رقم کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور پھر بھی نہ ذکر کمال نہ ہو قرآن پاک کے ساتھ مسلمان مسلمانین کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود کتابت قرآن کر کے فخر محسوس کرتے تھے۔ دنیا کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ پر قرآنی اثرات بے حد گہرے ہیں۔

علم التفسیر کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں حفظ قرآن کا جذبہ پیدا ہوا ہر دور میں مسلمانوں میں ان گنت مسلمان بڑی عقیدت سے قرآن پاک حفظ کرتے ہیں۔ حفاظ قرآن کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس میں ایک نوجوان لاموریل نے لاطینی میں اناجیل ازبر کی تھی تو سارے یورپ میں اس کا نامے پر تہلکہ مچا ہوا گیا تھا جب کہ مسلمان پندرہ صدیوں سے ہر دور میں ہر ملک میں ان گنت تعداد میں حفظ قرآن کرتے آ رہے ہیں۔ یہ بھی ایک اعجاز القرآن ہے۔

قرآن پاک کی کتابت کو ایک اعلیٰ ہنر اور باعث رحمت و برکت سمجھا گیا۔ ابن مفلد بیضاوی شیرازی (سن ۲۷۲ھ) بغداد کے رہنے والے تھے وہ بڑے نامور خطاط تھے۔ نسخ، رفاع اور ریحان خط تحریر کے وہی موجد و بانی تھے ابن مفلد نے خط نسخ کا نام خط بدیع رکھا تھا۔ یہ خط نسخ قرآن پاک کی کتابت کے لئے مخصوص ہوا آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں قرآن پاک کو اسی خط نسخ میں کتابت کیا جاتا ہے۔ ابن مفلد کا سن ولادت

۳۲۸ھ (مطابق ۹۴۰ء) ہے۔

قرآن پاک نے انسانوں کو ایک رب، ایک رسول، ایک کتاب پر عقیدے اور ایمان کی تعلیم دی قرآن پاک پوری انسانیت کے لئے ہمیشہ کے لئے ہے قرآن دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور جو اس معجزے سے انکار کرتا ہے وہ روشنی سے محروم رہے گا۔ قرآن پاک دنیا کی سب سے بڑی سب سے پہلی اور سب سے آخری اور سب سے مکمل کتاب ہے۔

صحیح بخاری

قرآن پاک کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور مقدس کتاب صحیح بخاری ہے۔ صحیح بخاری، کئی حوالوں اور پہلوؤں سے دنیا کی عظیم اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کے حوالے سے ہی مسلمانوں کی فقہ کے بارے میں بنیادی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ صحیح بخاری، اسلامی تمدن کی بنیاد ہے۔ رسول آخر الزمان صلعم سے مسلمانوں کو جو عقیدت ہے اس کی ایک روشن ترین مثال صحیح بخاری ہے

مسلمانوں نے علوم و فنون میں جو آخرتِ اعلیٰ کیسے جو انقلاب پیدا کئے ان کی تفصیل کے لیے ایک عہد چاہیے۔ کچھ علوم ایسے ہیں جو صرف مسلمانوں سے ہی مخصوص ہیں لیکن ان سے ساری دنیا فیض یاب ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان ہی علوم میں ایک علم - علم الحدیث ہے۔ وحی الہی کے بعد حدیث کی قدریں اس طرح متعین کی گئی ہیں کہ جو احکامات آنحضرتؐ نے اپنی طرف سے سہاری خارجی اور داخلی زندگی جن میں سہارا مکمل معاشرہ شامل ہے۔ کے لیے عنایت فرمائے۔ وہ تمام احادیث میں شامل ہیں۔ نبی آخری الزمان اور انسان کامل کی زندگی کا ایک ایک نقش احادیث میں موجود ہے۔ بعض علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ ثقافتِ اسلام میں احادیث کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ اگر حدیث کو نظر انداز کر دیا جائے تو مسلمانوں کا کلچر تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد احادیث جمع کرنا یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ اگرچہ بعثت سے رحلت تک زمانے میں صحابہ کرام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد، کلمے، طرز زیست کے ہر اطوار کو عقیدت و محبت کے ساتھ ذہن نشین کر لینے کی کوشش کرتے تھے۔

حدیث رسول کے بارے میں ایک خاص وضاحت ابتدا میں ہو جائے تو بہتر ہے۔ سادہ ترین الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کا کلام قرآن پاک ہے۔ رسول اللہ صلعم کا کلام۔ حدیث ہے۔ کلام الہی تو وحی کے ذریعے حضور نبیؐ پر نازل ہوا۔ احادیث کے بارے میں قرآن پاک کی یہ آیت مبارکہ خاص طور پر سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

”ہمارا رسولؐ کوئی بات نفس کی خاطر نہیں کہتا۔ یہ تو وہ کہتا ہے جو ہم کہلاتے ہیں۔“
 ”اس سلسلے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا فرمان بھی دھیان میں رکھیے کہ حضور نبی کریم صلعم چلتا پھرتا قرآن تھے۔“

تمدین حدیث کی ابتدائی منزل تو یہ سمجھتی کہ کچھ صحابہ نے کچھ ارشادات نبوی لکھ لیے تھے، کچھ زبانی یاد کر لیے تھے، جو ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں کسی لفظی اشتباہ تک کی گنجائش کو برداشت نہ کیا جاتا تھا۔ صحت اور سند کا پورا خیال اور احترام کیا جاتا تھا۔ کسی لفظ پر کوئی ہلکا سا شبہ بھی ہوتا تو مستند راویان سے رجوع کیا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے تمدین حدیث کو خاص اہمیت دینی شروع کی۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا دور تھا۔ اس وقت علمائے کرام کثرت سے موجود تھے۔ اور خود عام میں بھی احادیث کا ذوق عام ہو چکا تھا۔ متعدد علمائے کرام ذاتی طور پر جمع احادیث میں مصروف تھے۔ خود حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے بھی علمائے کرام کو اس عظیم کام کے لیے تیار کیا۔ اس زمانے میں احادیث کی سینکڑوں کتابیں مرتب ہو گئیں۔ مرتبین کی صف اول میں سعید بن عویذؓ زہری اور ربیعؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ بتانا کہ عالم اسلام میں سب سے پہلا مرتب کون تھا۔ جس نے احادیث کو مدون اور مرتب کیا۔ اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ علمائے کرام جنہوں نے جمع و تمدین حدیث کا آغاز کیا۔ ایک ہی دور اور عمر کے تھے۔ اس دور میں جمع حدیث کا ذوق و شوق اور بڑھا اور اس زمانے میں ایک موضوع کے تحت ہی احادیث جمع کی جاتی تھیں۔ یعنی اس زمانے میں محدثین کرام ایک ہی موضوع پر انفرادی طور سے احادیث جمع کیا کرتے تھے۔ کسی ایک مرتب کے ہاں مختلف مواضع کی احادیث نہیں ملتی ہیں۔

انہی

دوسرے دور میں امام مالک، امام اوزاعی، حماد، ابن جریج اور سفیان قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں تدوین احادیث کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ امام مالک کی "موطا" مدینہ منورہ میں لکھی گئی۔ امام مالک کی موطا۔ فن حدیث کی پہلی بنیادی کتاب ہے۔ اسے نقش اولیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ امام مالک کی موطا کے کچھ عرصہ کے بعد صحیح بخاری مرتب ہوئی جو سب سے بہتر، اہم اور مکمل کتاب احادیث ہے اور امام بخاری کا زمانہ وہی دورِ زریں ہے جب صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابوداؤد اور نسائی مرتب ہوئیں۔ ان کی اہمیت اور فضیلت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جو اعلیٰ قدریں، صحیح بخاری کو حاصل ہوئیں کسی دوسری کتاب کے حاصل نہ ہو پائیں۔ اس کے بعد کے دور میں تو فن حدیث کو وہ کمال حاصل ہوا کہ درس حدیث اور فن حدیث کے حوالے سے ان گنت علمائے عظام سامنے آئے۔ جنہوں نے اپنی زندگیوں اسی نیک کام کے لیے وقف کر دیں۔

قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ دار خود خالق قرآن خدائے تعالیٰ ہے۔ احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری صحابہ کرام پر تھی جس کا انہوں نے سچی ادا کر دیا۔

اس میں کچھ کلام نہیں نہ ہی اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ابتدا میں اور بعد میں ہی احادیث میں رطب و یابس اور من گھڑت احادیث کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی مختلف وجوہات سامنے آتی ہیں جن کا یہاں تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ٹھوس علمی حقیقت ہے کہ علمائے کرام نے ان امور کی طرف پوری توجہ دی۔ صحت و اسناد کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی صحیح اور غریب وغیر ثقہ احادیث کی پرکھ کا نازک کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ جس کے لیے ان بزرگوں نے کچھ اصول وضع کیے۔ چنانچہ جو حدیث ان وضع کردہ اصولوں پر پورا نہ اترتی تھی اسے شامل نہ کیا جاتا تھا۔ "اصول حدیث" کے علم و فن نے بھی وقت کے ساتھ ترقی کی اور اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے۔

اسی فن کی ایک شاخ "اسمار الرجال" ہے جس پر دنیا بھر کے علماء اور محقق وادویے بغیر نہیں رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم کو یہ مشرف حاصل نہیں کہ اس کے پاس اس کی اپنی کوئی ایسی مشکل تاریخ موجود ہو، جیسی مسلمانوں کی ہے جس میں مسلمانوں

کا قانون، فقہ، تمدن، معاشرہ اور کچھ سب کچھ موجود ہے۔

امام بخاری نے جو اصول وضع کیے۔ ان میں ان کا بنیادی اصول تو یہ ہے کہ انہیں بہر طرح کی احادیث جمع کرنے کا شوق نہیں۔ وہ ثقہ اور مستند احادیث کو سب سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ سب سے پہلے راوی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ راوی کے سلسلے کو چلنے دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ راوی کے خانہ دانی حالات، اس کے افکار و خیالات، اخلاق، عادات، صدق و وفا، طرزِ حیات، وطن مالوف خاندان، امانت و یمانت، نیکی اور ایمان داری ان تمام پہلوؤں پر تحقیق کر کے یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کن درجات پر فائز ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بھی سامنے رکھتے ہیں کہ اس راوی کا تعلق۔ راوی اولیٰ سے تحقیقی ہے یا سنی سنائی کسی جا رہی ہے۔ امام بخاریؒ راوی کی زندگی کو پرکھتے ہیں۔ اس کے اعمال کو سامنے رکھتے ہیں۔ راوی کی نیک طینتی کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں کیونکہ ان ان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے غلطی کا امکان ہے۔ وہ بہک سکتا ہے۔ ترغیب میں آسکتا ہے۔ امام بخاریؒ یہ بھی پیش منظر رکھتے کہ راوی نے انصاف سے گریز تو نہیں کیا؟ وہ کوئی مغیر فطری بات تو نہیں کہہ رہا؟ اس کڑی جانچ پڑتال۔ تحقیق و تدقیق کے بعد امام بخاریؒ کے پاس ایک اور کسوٹی بھی ہوتی۔ تمام احادیث کو آیات وحی سے مطابقت کی کسوٹی، یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ مسائل شرع اور اجرائے فتاویٰ کے باب میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ امام بخاریؒ کی محنت، تحقیق اور ایمان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اس ڈلے سے کہ کوئی حدیث کلام الہی یا کلمہ الہی کے منافی نہ ہو جائے۔ استخارہ بھی کیا کرتے تھے۔

امام بخاریؒ کا عقیدہ اور اصول تھا کہ حضور نبی کریم کا ہر ارشاد و ارشادِ ربانی کی تائید میں ہوگا۔

امام بخاریؒ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بردزید الجعفی بخاری ہے۔ امام بخاری کے والد محترم کا انتقال ان کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ اس لیے والدہ ماجدہ کی آغوشِ شفقت میں تربیت پائی۔ کچھ عرصہ سنجالا تو محلے کے مدرسے میں پڑھنے جانے لگے۔ امام بخاریؒ کی عمر

نوز برس تھتی کہ انہوں نے قرآن پاک کو حفظ کر لیا۔ دس برس کی عمر میں وہ فنِ حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۶ برس کی عمر میں اس میں خاص قابلیت پیدا کر چکے تھے۔

امام بخاریؒ کے دور میں فنِ حدیث سے منسلک علمائے کرام کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی انہیں اعلیٰ سرکاری عہدوں سے نوازا جاتا تھا۔ مگر امام بخاریؒ کو ایسے عہدوں اور اعزازات سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ عابد اور متقی پرہیزگار تھے۔ آپ کسی لالچ اور خواہش کے بغیر خدمت حدیث میں مصروف رہے۔ دربار اور دنیاوی عروج و جاہ کے کبھی قریب تک نہ پھیلے۔ امام بخاریؒ ۲۱۰ھ میں اپنی والدہ محترمہ اور بھائی کے ساتھ حج کے لیے حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے۔ حج کے فریضہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ان کی والدہ ماجدہ اور بھائی تو واپس وطن چلے گئے۔ لیکن امام بخاریؒ کو یہ سرزمین ایسی پسند آئی کہ وہیں قیام کا ارادہ کر لیا۔ امام بخاریؒ نے ایک عرصے تک ارضِ حجاز، یمن، شام، عراق اور دیگر اسلامی مراکز سے علم حدیث حاصل کیا اور ایک کمال پایا کہ سب سے بڑے محدث کے تہتے پر بیٹھے۔

امام ترمذیؒ جیسے ایک لاکھ کے قریب طلباء نے امام بخاریؒ سے علم حدیث کا فیض اٹھایا۔

آپ اپنے وطن آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وطن آئے تو حاکم صوبہ نے ان کو بلا کر درخواست کی کہ اس کے بیٹوں کو بھی وہ علم حدیث پڑھا دیں۔ ساتھ ہی حاکم صوبہ نے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ جس وقت میرے بیٹے پڑھیں تو دوسرے لڑکے پڑھنے نہ آئیں یا آپ ہمارے مکان پر آکر ان کو تعلیم دیں۔

امام بخاریؒ نے اس کے جواب میں فرمایا یہ علم پیغمبر کی میراث ہے۔ میں اسے کسی ایک کے لیے مخصوص کرنا نہیں چاہتا۔ ساری امت اس میں شریک ہے۔ یہ سب کے لیے ہے جس کو غرض ہے میرے درس میں شریک ہو جائے۔

امام بخاریؒ کی سب سے مشہور تصنیف "المجموع الصغیر" ہے۔ جسے آج ہم صحیح بخاری کے نام سے جانتے ہیں۔ صحیح بخاری سولہ برس کی تحقیق و تدوین اور محنت سے مرتب ہوئی امام

بخاریؒ کی یہ وہی کتاب ہے جسے کلام اللہ کے بعد مسلمانوں میں افضل ترین کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے کہ یہ حدیث نبویؐ ہے۔ امام بخاری کی دیگر تصانیف میں ایک "تاریخ الکبیر" ہے جس میں علمائے حدیث کا تذکرہ ہے۔

"الادب المفرد" بھی امام بخاری کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اخلاق و معاشرت کے موضوع پر مسائل پر یہ احادیث کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ امام بخاری کے نام سے کسی چھوٹی بڑی کتابیں بھی منسوب کی جاتی ہیں۔ جنہی حیثیت متنازعہ رہی ہے۔

امام بخاری نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔

"صحیح بخاری" کو امام بخاری نے تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصے کو تقدس و تبرک کے طور پر پارے کے نام سے موسوم فرمایا۔ احادیث کی تحقیق و موضوعات کے مختلف عنوانات کو ابواب سے موسوم کر کے اس کی تدوین کی۔ امام بخاری نے لاکھوں احادیث کی چھان بین کی اور مستند و ثقہ احادیث کو صحیح بخاری میں شریک کیا۔ آٹھ ہزار احادیث کے اس مجموعے میں کسی ایک حدیث سے تکرار کا وجود نہیں ملتا۔

صحیح بخاری۔ رسول کریمؐ کے ارشادات کا ہی مجموعہ نہیں۔ بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم دے مثل کردار، عادات و اطوار، شخصیت کا بھی آئینہ ہے۔ یہ اسلامی کلچر کا نقشہ بھی ہے کہ زندگی کسی طرح بسر کرنی چاہیے اور مسلمانوں کا معاشرہ اور کلچر کیسا ہونا چاہیے۔ شرعی مسائل کے علاوہ انسان کی زندگی کے داخلی اور خارجی مسائل اور روزمرہ کے آداب کے بارے میں بھی اس کتاب سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

صدیوں سے امام بخاریؒ کی مرتبہ "صحیح بخاری" ان گنت مسلمانوں اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ پورے عالم اسلام کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک اور اقوام میں اس کتاب کو اہمیت حاصل ہے۔

"صحیح بخاری" کی متعدد زبانوں میں شرحیں لکھی گئی ہیں اور ہمیشہ اس پر کام ہوتا رہے گا۔ اس کے کسی غیر مطبوعہ قلمی نسخے دنیا بھر کی اہم لائبریریوں میں موجود ہیں۔ شارح بخاری کی حیثیت سے کسی علمدار نے بڑا نام اور احترام حاصل کیا ہے۔ جن میں ابن حجر عسقلانی سرفہرست ہیں۔

صحیح بھاری کے تراجم بھی دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ صحیح بھاری اور امام بھاری پر ان گنت کتابیں، مضامین شریں اور احوال دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور یورپ کی کسی دیگر معتبر زبانوں میں صحیح بھاری کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے صحیح بھاری کی شرح مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے تیرہویں صدی ہجری کے آواخر میں ترتیب دے کر شائع کی۔

اُردو میں مرزا میرت دہلوی نے صحیح بھاری کا ترجمہ کیا جو زبان و محاورہ کے اعتبار سے خاص شہرت رکھتا ہے۔

صحیح بھاری، دنیا کی ان محدودے چند کتابوں میں سے ایک ہے جنہیں سب سے زیادہ پڑھا گیا اور پڑھایا جاتا رہے گا اور ہر دور کا انسان اس سے رہنمائی حاصل کرتا رہے گا۔

عہد نامہ عتیق

بنی اسرائیل کے نبیوں اور پیغمبروں پر جو صحائف نازل ہوئے یا الہام کے ذریعے انہوں نے ان کو دوبارہ مرتب کیا یا اپنی یادداشتوں کے حوالے سے لکھا یا انہوں کے علاوہ ان کے ماننے والوں نے جو کچھ تحریر کیا اسے "عہد نامہ قدیم" یا عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) کا نام دیا گیا ہے۔

صدیوں سے یہ کتاب ان گنت انسانوں کے مطالعے میں رہی ہے۔ اس کتاب کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔ عہد نامہ عتیق کو اس لیے بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ عیسائی اسے اپنی اناجیل اور مقدس کتب کے مجموعے "عہد نامہ جدید" کے ساتھ منسلک رکھتے ہیں اور ان پر ایمان سمیٹی اس اعتبار سے یہ کتاب جہاں یہودیوں میں ایک طویل عرصے سے زیر مطالعہ رہی ہے۔ اس طرح عیسائی بھی اس کا مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں یوں اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عہد نامہ عتیق - کیا ایک الہامی کتاب ہے؟ اس کے بارے میں اب کسی شبہہ کی گنجائش نہیں رہی کہ عہد نامہ عتیق کے حوالے سے یہودیوں کے ہاں الہام کا تصور بے حد ناقص اور نامکمل ہے۔ قرآن پاک نے تورات، زبور کی تصدیق کہ وہ الہامی کتابیں تھیں لیکن یہودیوں نے ان میں تحریف کر دی۔

مسیحی آج بھی عہد نامہ عتیق کو ایک مقدس کتاب کی حیثیت دیتے ہیں۔ جب کہ مسیحی علماء اور محققین نے جو کام طویل عرصے سے کیا ہے۔ اس سے یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ مصلیٰ - اپنی اصلی صورت میں عہد نامہ عتیق ایک الہامی کتاب ہو۔ لیکن اپنی موجودہ صورت میں اسے کسی

طرح بھی الہامی کلام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

عہد نامہ عتیق کی پہلی پانچ کتابوں - پیدائش، خروج، اجبار گنتی اور استثناء کو یہودی تورات کہتے ہیں۔ اور ان پانچ کتابوں کا خالق حضرت موسیٰ ام کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن قدیم اور جدید تحقیق نے اس دعوے کو باطل قرار دیا ہے یہ کتابیں دراصل عظیم انسانی دانش فہم اور تجسس اور یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ عہد نامہ عتیق کے خالق ان گنت ذہن اور غیر معمولی انسان ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے دور کی یادداشتوں حکمت اور تاریخ کو صدیوں تک لکھا۔ یاد رہے کہ یہ اصول اس عہد نامہ عتیق پر اطلاق کرتا ہے جو آج دنیا میں موجود ہے اور جسے ان گنت انسان پڑھتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں عہد نامہ عتیق کے صرف تین نسخے محفوظ ہیں۔

۱- یونانی نسخہ - ۲- عبرانی نسخہ - ۳- سامری نسخہ

یونانی نسخے کو ساتویں صدی عیسوی تک عیسائی معتبر تسلیم کرتے رہے۔ تب عبرانی نسخہ کو سحر لیت شدہ کہا جاتا تھا۔ بہر حال عہد نامہ عتیق کا یہ یونانی نسخہ آج بھی یونانی اور مشرقی کلیساؤں میں معتبر مانا جاتا ہے۔

۲- عبرانی نسخہ وہ ہے جس کو یہودی بھی معتبر مانتے ہیں اور عیسائیوں کا پڑھنا

فرقہ بھی۔

عبرانی اور یونانی نسخے ہی وہ نسخے ہیں جن میں عہد نامہ عتیق کی تمام کتابیں شامل ہیں۔ سامری نسخہ صرف سات کتابوں پر مشتمل ہے اور اسے یہودیوں کا سامری فرقہ معتبر و مقدس تسلیم کرتا ہے۔

ان تینوں نسخوں میں بھی بے حد اختلافات ہیں جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عہد

نامہ قدیم۔ الہامی نہیں ہے۔

عبرانی نسخہ میں حضرت آدم سے لے کر طوفان نوح کا زمانہ ۱۶۵۶ سال بتایا جاتا ہے جبکہ یونانی نسخے میں حضرت آدم سے طوفان نوح کا زمانہ ۲۲۶۲ برس بتایا گیا ہے جبکہ سامری نسخہ یہ زمانہ ۱۳۰۶ برسوں پر مشتمل ہے۔

ہسری واسکاٹ نے COMMENTRY (جلد اول) میں اس حوالے سے لکھا ہے کہ

یہودی تحریف کرنے میں کسی طرح کی پچھلی ہرٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ عیسائی دشمنی میں بھی انہوں نے اپنی ہی مقدس کتابوں کی تحریف کو ڈالی۔ کہا جاتا ہے کہ تورات میں یہودیوں نے تحریف ۱۲۰ میں کی ہے۔

جدید محققین اور علماء نے تاریخی شواہد، اسناد اور آثار قدیمہ کے حوالے سے ثبات کیا ہے کہ عہد نامہ قدیم ایک تاریخ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ کتب پر مصری تہذیب اور عقائد کی گہری چھاپ ہے۔ قدیم ترین دور کے علماء دانشور اور فہم رکھنے والے ان گنت انسانوں نے اس کی تصنیف میں حصہ لیا ہے۔ اس اعتبار سے عہد نامہ عتیق ایک بے مثل اور منفرد کتاب ہے جس کی تخلیق ان گنت دانشوروں، علماء اور حکما کی مرہون منت ہے۔ عظیم موضوعین جن میں یسعی، برائٹن جیسے محقق شامل ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے حوالے سے عہد نامہ عتیق کے بارے میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ عہد یہودیوں کی اپنی تاریخ اور ان کی بد اعمالیاں اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مقدس کتابوں میں تحریف کی بلکہ اصل کتاب میں ناپید ہو چکی ہیں۔ لیکن نے تاریخ اخلاق یورپ میں لکھا ہے۔

”یہود اپنی عملی زندگی میں سے زیادہ تر اور سب سے زیادہ فخر سزا تھے۔“

عہد نامہ عتیق میں ایک کتاب ”قضاة“ (JUDGES) کے نام سے ہے۔ اگر عہد نامہ عتیق کے حوالے سے اور اس کے بعد کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قاضیوں کے عہد کے بعد یہودیوں میں سلاطین (KINGS) کے دور کی ابتدا ہوئی۔ ان سلاطین میں سب سے زیادہ شہرت حضرت داؤد نے پائی۔ ان کے بعد حضرت سلیمانؑ آئے اور حضرت سلیمانؑ کے بعد یہود سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ یہود میں نفاق پیدا ہوا۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ۵۸۶ ق۔ م میں بابل کے شاہ بخت نصر نے یہود کی جنوبی حکومت کو تباہ کر دیا۔ اس حکومت کا پایہ تخت یروشلم تھا جس کی تباہی کا لائحہ عمل عہد نامہ عتیق میں شامل ہے اور جسے پرمیاہ نبی کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ یروشلم میں ہیکل سلیمانی میں حضرت سلیمانؑ نے تورات اور دیگر تبرکات کی العان کو محفوظ کیا تھا۔ بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو بھی آگ لگا دی۔ اس نے تمام مذہبی کتابیں جلا دیں جو یہودی زندہ بچے ان کو اپنے ساتھ بابل لے گیا۔

ہیکل سلیمانی کی تباہی، تورات اور مقدس تبرکات کے ضیاع کی شہادت خود عہد نامہ عتیق و کتاب سلطین باب ۲۴، ۱۱-۱۷ میں ملتی ہے۔ تقریباً نصف صدی کے بعد شاہ ایران حورش نے بائبل کو شکست دی تو اس نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ یہود کے نبیوں عذرا اور سنیاہ کی کوششوں سے اس کی تعمیر ۵۳۷ ق۔ م میں ہوئی۔ لیکن تورات اور مقدس تبرکات کا سراغ نہیں ملتا۔ سلندر اعظم کے زمانے میں یہودی ایرانی اقتدار کے زیر سایہ زندہ رہے۔ ایرانیوں کے بعد یونانیوں کے زیر حکومت رہے۔

۱۶۸ ق۔ م میں الناکہ کا واقعہ پیش آتا ہے۔ جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں موجود ہے کہ شاہ انترکس نے یروشلم فتح کیا اور اسے وہاں عہد نامہ عتیق کے جتنے نسخے ملے سب بھڑا دیے یا جلا دیے۔ اور حکم دیا کہ جس سے عہد نامہ عتیق کا کوئی نسخہ برآمد ہوگا وہ مار ڈالا جائے گا۔ کسا جاتا ہے کہ ہر مینے یہود کی تلاشی لی جاتی اور جس سے عہد نامہ عتیق کا کوئی نسخہ ملتا۔ اسے جان سے مار دیا جاتا اور نسخہ تلف کر دیا جاتا۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک یہودی حکومت پھر قائم ہوئی لیکن ۷۰ء میں رومی حکمران ٹیس (TETUS) نے یروشلم کو بھر بھرا دیا۔ ہیکل سلیمانی ایک بار پھر تاراج ہوا۔ اس کے بعد یروشلم کی طویل غلامی اور ذلت کا دور شروع ہوتا ہے۔

مؤرخین اور محققین نے اس تاریخی پس منظر کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سلیمان کے بعد یہود کی تحریب اور بربادی اور بد اعمالیوں کی سزا کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے کسی طور پر بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے دینی صحیفے اپنی اصلی حالت میں برقرار رہے ہوں گے۔

یہودیوں کے ایک مذہبی رہنما ربی (RABBI) یہود نے حضرت عیسیٰؑ کے سو برس کے بعد جبار اور دوسری کتب کے احوال کو جمع کیا۔ جس کا نام (MISHNA) یعنی زبانی تعلیم ہے۔ یہ گویا تورات کی تفسیر ہے۔ اصل تورات ناپید ہے اور جن کتب کو یہود تورات کہتے ہیں۔ وہ الہامی کلام نہیں۔ بلکہ انسانوں کا جمع کردہ اور عقل و فہم اور یادداشتوں پر مبنی ہے۔ مشنا کی بھی ایک تفسیر کی گئی۔ یعنی تفسیر کی بھی تفسیر ہوئی اور اس کا نام گومرا (GOMRA) رکھا گیا۔ ان

دروں مضمیمہ مجموعہ کو تالمود کا نام دیا گیا۔

تالمود بھی ایک نہیں ہے۔ ایک لاطینی اور دوسری باہلی تالمود، کو یہود عہد نامہ عتیق کے بعد دوسرا درج دیتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور رچرچ انسائیکلو پیڈیا میں یہ تفصیل موجود ہے جس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ تورات کا اصل نسخہ غائب اور ناپید ہو گیا ہے۔

عہد نامہ عتیق میں شامل کتابوں کے نام یہ ہیں:-

پیدائش، طروج، احبار، گنتی، استشار، یسوع، قضاة، روت، سمویل پہلا (۲)۔
سلاطین (۲)۔ سلاطین (۲) تواریخ (۱) تواریخ (۲)۔ حوراء، نحمیاہ، آستر، ایوب، زبور، امثال (سلمان) داخل غزل، المزمزلات، لیسینا، یرمیاہ، نوزم، حوقیل، دانیال، ہوسیع، یوایل، عاموس، عبداہ، یوناہ، میکا، ناسوم، حبقوق، حینقہ، حجتی، ذکیا، ملائیا۔

عہد نامہ عتیق کی یہ کل ۲۹ کتابیں جو یہودیوں کے علاوہ عیسائی پرڈٹسٹنٹ فرقے کے نزدیک بھی معتبر و مسلم ہیں لیکن رومن کیتھولک فرقے کے عہد نامہ عتیق میں کتابوں کی تعداد ۳۹ نہیں بلکہ ۴۶ ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی جس عہد نامہ عتیق کو معتبر مانتے ہیں ان میں یہ کتابیں بھی شامل ہیں۔

طوبیاہ، نیبودیت، حکمت، یسوع بن سیراخ، باروک، ملائین (۱) ملائین (۲) یہود اور عیسائی ان متذکرہ بالا کتابوں کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کتابیں اپنی اصلی زبانوں یعنی عبرانی اور کلدی میں جھوٹی ہیں۔ اور نہ ہی یہ کتابیں اپنے اصل زمانے میں کبھی موجود تھیں۔ ربی شمعون ایلیا جو یہودیوں کے بڑے نامور مذہبی عالم اور محقق ہونے میں ان کا کتا ہے کہ یہ جھوٹی کتابیں ہیں۔

عہد نامہ عتیق، صدیوں سے ساری دنیا میں، مختلف زبانوں میں پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کتاب کی حیثیت ایک تاریخ کی ہے۔ اور ایک طویل رزیے اور حکایت کی بھی۔ اس کتاب کے حوالے سے دنیا میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ دنیا کے ان گنت انسان اپنے عقیدے کی وجہ سے عہد نامہ عتیق کو ایک خدائی کتاب مانتے ہیں۔

عہد نامہ عتیق۔ انسانی جستجو، تجسس، فہم اور دانش کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی مثال

نہیں ملتی۔ عمد نامہ عتیق کے حوالے سے انسانی تاریخ کا قدیم ترین دور سامنے آتا ہے۔ اس کا آغاز تو کائنات کی تخلیق کی داستان سے ہوتا ہے کہ یہ دنیا کس طرح بنی اور کس طرح بڑھی پھولی۔

اس میں خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کے حالات ہیں۔ ان کے بارے

میں حکایات ہیں۔ قدیم ترین دور کا تمدنی منظر بھی موجود ہے۔ انسانوں کی عادات اور ان کے رسم و رواج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

عمد نامہ عتیق میں تنوع ہے انسانی تجربے کا ایک جہان آباد ہے۔ عمد نامہ عتیق نے دنیا بھر کے علوم و فنون کو متاثر کیا ہے اس کے اقوال اور تمثیلیں، اس کی حکایات نے ہر دور کو متاثر کیا ہے۔ علوم و فنون کے لیے عمد نامہ عتیق ایک لازوال سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عمد نامہ عتیق، میں اجتماعی انسانی، دانش اور حکمت کے وہ بے مثل شہ پارے بھی ملتے ہیں جن کی مثال کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔ مذہبی اعتبار سے آج اس کی جو حیثیت ہے۔

اس پر تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے؛ لیکن ایک اہم انسانی دستاویز کے حوالے سے عمد نامہ عتیق۔ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہر دور کا ہر انسان بہت کچھ حاصل کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

عمد نامہ عتیق، کی زبان اس کا شکوہ، اس کا حسن و تراجم میں بھی وہ تاثیر رکھتے ہیں کہ جودلوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ ”عمد نامہ عتیق“ میں جہاں تاریخ ہے پیغمبروں کے قصے اور حکایات ہیں وہاں سلیمان کے نام سے منسوب، امثال، بھی ہیں جو حکمت و دانش کا بے مثل خزانہ ہیں۔ اس میں غزل اللغزلات جیسی بے مثل شاعری بھی ہے۔ یرمیاہ بنی کا لوح بھی ہے اور ردت، ایک عام عورت کی دفا شکاری، انسانیت دوستی اور بے مثل خدمت گزار کی دلگداز داستان بھی۔ اس میں انسانی زندگی کا وہ سارا کرب بھی موجود ہے جو انسان اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ مصائب کا شکار ہوتا ہے۔

عمد نامہ عتیق کی کتاب ”ایوب“ انسان اور خدا کا ایک ایسا مکالمہ ہے۔ انسانی آلام و مصائب میں مبتلا انسان کا ایسا نقشہ ہے جو تخلیق اور تاثیر کے اعتبار سے شاید ہی اپنی مثال رکھتا ہو۔ عمد نامہ عتیق، دنیا کے قدیم ترین دانشوروں، شاعروں، حکیموں، علما اور انسانوں کا ایک عظیم اور بے مثل ورثہ ہے۔ یہ انسانی تاریخ کے آغاز سے بھی پہلے کائنات

کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور ہزاروں برسوں تک پھیلا ہوا ہے۔ حمد نامہ عتیق کو اس اعتبار سے بھی دنیا کی عظیم کتاب کا درجہ حاصل ہے کہ جہاں ان گنت لوگ اپنے عقیدے کے تحت اسے ایک الگ الگ اور مقدس کتاب کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ وہاں ایسا عقیدہ نہ رکھنے والوں کے لیے بھی یہ تاریخ اور عقل و دانش کا ایک بے مثل خزانہ ہے۔ ان گنت انسانوں کے فہم و دانش کا مجموعہ حمد نامہ عتیق نے صدیوں سے انسانی اذہان کو مغلوظ کیا ہے۔ وہاں ہر دور میں یہ کتاب کسی نہ کسی پہلو سے انسانوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

۴

عہد نامہ جدید

عہد نامہ جدید جسے عرف عام میں انجیل مقدس کا نام دیا گیا ہے۔ وہ کتاب ہے جسے دنیا بھر کے کروڑوں عیسائی اپنی مذہبی اور سہما مقدس کتاب تسلیم کرتے ہوئے اپنے عقیدے کے مطابق اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یقینی امر ہے کہ وہ لوگ جو اس کتاب پر مذہبی عقیدہ استوار نہیں کرتے اور نہ ہی اسے الہامی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ وہ بھی اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ کتاب حکمت و دانش کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے ہر مذہب اور ہر نقطہء خیال کا پڑھنے والا اپنے اپنے انداز میں کسب فیض کر سکتا ہے۔

عہد نامہ جدید سائیس (۲۷) کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں چارانا جیل ہیں۔ مسمیٰ کی انجیل، مرقس کی انجیل، لوقا کی انجیل، یوحنا کی انجیل، ان چارانا جیل کے علاوہ ایک کتاب۔ رسولوں کے اعمال ہے جس کا مصنف لوقا کو بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پولوس رسول کے چودہ خطوط ہیں۔ جو رومیوں (ایک) کرنتھیوں (۲) گائیٹوں (ایک) افسیوں (ایک) ہلبوں (ایک) کلیسیوں (ایک) تھسلونیکیوں (۲) تیمتیس (۲) طلس (ایک) فلیمون (ایک) اور جبرانیوں (ایک) کے نام خطوط ہیں۔ پولوس رسول (سینٹ پال) کے ان چودہ خطوط کے علاوہ ایک۔ یعقوب کا عام خط ہے۔ پطرس کے دو عام خط، یوحنا کے تین خطوط اور ایک یہوداہ کا عام خط ہے۔ آخری کتاب یوحنا عارف کا مکاشفہ ہے جس میں مشکوٰۃ کی گئی ہیں اور عیسائیوں کا ایک بڑا طبقہ۔ یوحنا عارف کے مکاشفے کو الہام قرار دیتا ہے۔

عہد نامہ جدید میں برناہیں کی انجیل شامل نہیں کی گئی ہے۔ جس کا ذکر قدرے تفصیل سے آئے گا۔ عہد نامہ جدید کا پس منظر اور صحیح مقام سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ

پولوس رسول کا کچھ ذکر کیا جائے جسے مسیحی محققین، مورخین اور مذہبی علماء ایک طرح سے مسیحیت کا بانی قرار دیتے ہیں جو آج مختلف شکلوں میں رائج ہے اور پولوس رسول کو اس کا سب سے بڑا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ پولوس رسول کا اصلی نام شاؤل تھا۔ وہ ایک یونانی یہودی تھے۔ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ پر بھی عبور رکھتے تھے۔ پولوس رسوا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیکھا وہ مسیحیوں کا جانی دشمن تھا۔ ان پر شدید ترین ظلم و تشدد روا رکھنا سے بے حد مغرب تھا۔ مسیحیوں کے دلوں پر اس کی دہشت سوار تھی۔ وہ اس کے نام تک سے لڑتے تھے ایک دن حالتِ سفر میں شاؤل نے سورج کی روشنی سے بھی زیادہ روشن نور دیکھا اور اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آواز سنی کہ تو مجھے کیوں ستاتا ہے۔ شاؤل تاب ہوا اور اس نے مسیح کو اپنا سجات دہندہ تسلیم کر لیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے مخالف اور ماننے والے اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک تو وہ اس سے مخالف تھے دوسرے وہ اسے نیک نیت تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے برگزیدہ حواریا برناباس نے اس کا تعارف حواریوں اور متقین سے کر دیا اور برناباس کی سعی سے ہی اسے قبول کیا گیا۔ مسیح کو اپنا سجات دہندہ تسلیم کر لینے کے بعد بتایا جاتا ہے کہ کم و بیش تین برس تک پولوس رسول کی سرگرمیوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ان تین برسوں میں پولوس رسول نے گہرا غور و خوض کیا کہ اسے مسیحیت کو کون بنیادوں پر استوار کرنا ہے پولوس کو جدید مسیحیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کی تعلیمات مسیح میں اس کی وجہ سے تحریف کا آغاز ہوا۔ پولوس رسول کے خوالے سے چند اہم حقائق خاص طور پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں ایک زمانے میں وہ اور برناباس دونوں تبلیغ کے لیے ایک ساتھ جلتے تھے وہ دونوں انطاکیہ اور ایشیائے کوچک کے کئی علاقوں میں ایک ساتھ غلوں اور جوش کے ساتھ نئے مذہب کی تبلیغ میں مصروف اور مصوبتیں برداشت کرتے رہے لیکن بعد میں ایسے گہرے مراسم کے باوجود ان دونوں کے مابین ایک معمولی سی وجہ سے اختلافات کا ایسا آغاز ہوا کہ پولوس رسول نے برناباس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کا کامیاب آغاز کیا۔

اب ذرا یہ دیکھیں کہ یہ عہد نامہ جدید کس ترتیب سے لکھا گیا اور مکمل ہوا۔ اناجیل ابولہ

کو دراصل - خدا کا کلام - کہا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولوس رسول کے خطوط پہلے لکھے گئے اور اناجیل بعد میں - برٹین نے سولائزیشن آف وی دیسٹ میں لکھا ہے -

سینٹ پال (پولوس رسول) کا خط کرنتھیوں کے نام ۵۵ء میں لکھا گیا - رسولوں کے اعمال کا زمانہ ستمبر ۶۰ء سے ۶۶ء ہے - قرس کی انجیل کا سن تصنیف ۶۵ء ہے - ممتی اور ٹوٹا کی انجیل ۸۰ء اور ۸۲ء کے درمیان لکھی گئیں - جبکہ یوحنا کی انجیل ۱۰۰ء میں لکھی گئی ایک اور عیسائی عالم اور محقق جمیس ڈینیل کا بیان بھی دیکھیے۔

مسیحیت میں فرقے پیدا ہونے پر ذر ذر خود کو مسیح کا صحیح مقلد بتاتا ہے اور اپنی تائید میں پیش گوئیاں ، رسالے ، انجیل اور کتب تائید پیش کیا کرتا تھا ایسی انجیل کی تعداد ۲۷۰ تک پہنچ گئی جن میں سے چار کو منتخب کیا گیا ۔

قرآن پاک میں ذکر آیا ہے اور شہادت ملتی ہے کہ انجیل میں تحریف کی گئی جس سے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم مسیح کر دی گئی اگر عیسائیت کے بارے میں ایک عام سوال پوچھا جائے کہ عیسائیت کیا ہے تو اس کا سادہ جواب یہ جائے گا کہ عیسائیت کی بنیاد تشکیک ، حول ، تجسیم اور کفارے پر رکھی گئی ہے جبکہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں یہ تینوں عنصر موجود نہیں نہ ہی ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے - دراصل یہ پولوس رسول تھا - جس نے عیسائیت کو اپنے انداز و فکر کے مطابق اپنے سانچے میں ڈھال کر ایک مذہب بنا دیا - انجیل اور عہد نامہ جدید کے شمولات کے بارے میں خود عیسائیوں میں ہی اختلافات و شکوک کا سلسلہ ابتدائی زمانوں میں ہی شروع ہو گیا تھا سب سے زیادہ بحث یوحنا کی انجیل پر ہوتی ہے جس کا کچھ خلاصہ پیش خدمت ہے۔

دوسری صدی عیسوی میں ہی عیسائیوں کے ایک بڑے طبقے نے یوحنا رسول کی انجیل کو ان کی تصنیف ماننے سے انکار کر دیا - انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۳) میں اس پر طویل بحث و حقائق موجود ہیں - اصل یوحنا جو عیسیٰؑ کے حواری تھے وہ ان پڑھ اور ماہی گیر تھے جبکہ یوحنا کی انجیل تعلیم یافتہ اور اثر و رسوخ رکھنے والے کسی بلند رتبے کی لکھی ہوئی ہے فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا میں تو یہ صاف نکتہ نکالا گیا ہے کہ یوحنا کی انجیل دراصل خود پولوس

رسول کی تصنیف ہے۔ جس نے اسے یوحنا کے نام سے منسوب کر دیا۔ کیونکہ یوحنا پولوس رسول کا چہیتا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اور محققین میں سے اولین سرسریٹ، بشپ گور اور دیسکاٹ جیسے عالمی شہرت یافتہ محقق۔ یوحنا کی انجیل کو یوحنا کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ پورے عندنامہ جدید میں تحریف کے قائل ہیں۔

اناجیل کی تعداد چار نہ تھی۔ اس کی شہادت تو خود لوقا کی انجیل سے بھی ملتی ہے خود لوقا نے اعتراف کیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اناجیل لکھی تھیں۔ خود لوقا کا یہ حال ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو دیکھا تھا نہ تھا۔ اس نے یہ انجیل پولوس رسول کے زیر اثر لکھی۔ لوقا کی انجیل میں مسمیٰ اور مرقس کی اناجیل کے مقابلے میں مواد بھی کہیں زیادہ ہے یوحنا کی انجیل کا ذکر پہلے آچکا ہے اس کے بارے میں پادری برکت اللہ کہتے ہیں:-

”ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ روایت کہ انجیل چہارم مقدس یوحنا ابن زبیدی کی تصنیف ہے۔ صحیح نہیں ہو سکتی۔“

(قدامت و اصلیت اناجیل جلد دوم صفحہ ۱۳۱)

بیشتر عیسائی علماء اور محقق اس بات پر متفق ہیں۔ یوحنا کی انجیل دراصل حضرت عیسیٰ کے حواری یوحنا ابن زبیدی کی نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے فرد یوحنا بزرگ (ELDER) کی تصنیف ہے اور عندنامہ جدید میں جو خطوط یوحنا کے نام سے شامل ہیں دراصل وہ بھی اسی یوحنا بزرگ کے ہیں جس نے حضرت عیسیٰ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ رسولوں کے اعمال کا مصنف لوقا کو بتایا جاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا فیصلہ ہے ان میں سے صرف اس خطوط پولوس رسول کے ہیں۔ چار خطوط کسی اور کے لکھے ہیں۔ (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ:-

”پال پولوس رسول کے خطوط ۱۰ء میں لکھے گئے۔ جب ابھی اناجیل نہ لکھی گئی تھی۔ عیسائی عندنامہ جدید میں جو خطوط پطرس کے ہیں ان کی اصلیت بھی سامنے آچکی ہے۔ ایک تزیہ کہ پطرس ان پڑھ تھے اور پھر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰، مقالہ ”پیٹر“ کے مطابق۔“

پطرس کا پہلا خط اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب پطرس خود زندہ نہ تھے۔ گویا خط ان کے نام سے ان کی موت کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔

تحریر و ترمیم کی بحث اور اس کے متعلق حقائق کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ کے اب اس انجیل کی طرف آئیے جو برناباس کی انجیل کے نام سے مشہور ہے لیکن وہ عہد نامہ جدید میں شامل نہیں۔ یہ انجیل برناباس سولہویں صدی میں پوپ اسکٹس پنجم کے خفیہ کتب خانے سے ملی تھی۔ ایک زمانے سے اس انجیل کو مثلثی کے کوشش جاری تھی۔ پوپ چیناٹش اول نے تونسی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی کئی برس پہلے برناباس کی انجیل کے بارے میں یہ حکم صادر کیا تھا کہ اس کو پاس رکھنے والا اور اس کو پڑھنے والا مجرم سمجھا جائے گا۔ اور اس کی نجات کبھی نہ ہوگی۔ برناباس کی انجیل کی مخالفت بلاوجہ نہ تھی۔ جب پولوس رسول نے اصلی اور حقیقی مسیحی تعلیمات کو منع کرنا شروع کیا تو پولوس رسول اور برناباس کے درمیان اختلافات نے جنم لیا۔ برناباس۔ حضرت عیسیٰ کا حواری تھا۔ اب اسے کب کیسے کہنا جیل میں بارہ اسماء کے بارے میں ساری اناجیل متفق نہیں بلکہ ان میں اختلاف ہے۔ اعمال اور متی کے تضادات اس کے سوا ہیں، برناباس اپنی انجیل میں ان عقائد سے انکار کرتا ہے جو دیگر اناجیل اور پولوس رسول کی تعلیمات میں ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تسلیم نہیں کرتا۔ عہد نامہ قدیم کے صحیفوں میں جس مسیح کی آمد کی مزید دی گئی تھی برناباس کی انجیل میں حضرت عیسیٰ کو کہتے ہیں وہ نہیں بلکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انجیل برناباس میں حضور کا اسم مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔ برناباس کی انجیل میں حضرت عیسیٰ کو مصلوب ہوتے ہوئے بھی نہیں دکھایا جاتا۔ بلکہ برناباس کہتا ہے کہ وہ خدا ہیودا اسکریوٹی کی صورت بدل دی گئی تھی اور اسے عیسیٰ سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح برناباس یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے وہ صاحبزادے حضرت اسحاق نہیں تھے، بلکہ حضرت اسماعیل تھے جن کو رضائے خداوندی کے لیے قربانی کے لیے جایا گیا تھا جب کہ عہد نامہ قدیم میں حضرت اسحاق کو ذبیح اللہ کا مرتبہ دیا گیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ برناباس کی انجیل کی تعلیمات دیگر اناجیل سے مختلف ہیں۔ پولوس

رسول کی تعلیم کی نفی کرتی ہیں۔ اسی لیے برناباس کی انجیل کو چھپانے اور مٹانے کی کوشش کی گئی اور یہاں تک کہا گیا کہ برناباس کی انجیل کسی مسلمان کی تصنیف ہے جو عیسائیوں میں تفرقہ اور انتشار پیدا کرنے کے لیے گھڑی گئی۔

یہ بحث اپنی جگہ۔ اب آئیے عہد نامہ جدید کی طرف اناجیل میں دراصل حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات فلم بند کی گئی ہے اور تحریف اور ترمیم کے باوجود اس میں حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیمات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ اگرچہ اس پر بھی بعض مسیحی علماء کو خاصے اعتراضات ہیں۔ برٹین کی کتاب "تہذیب یورپ" کو ایک مسئلہ حقیقی اور تاریخی مطالعہ اور کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اور وہیں مولانا غلام رسول مہر نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ایک اقتباس دیکھیے جو فرانس کے عظیم ناول نگار ادیب اور نوبل انعام یافتہ مصنف اناطول فرانس کے حوالے سے ہے۔ اناطول فرانس کا قول یوں ہے۔

"یسودی عہد نامہ قدیم کو لفظاً لفظاً درست سمجھتے ہیں۔ یہی کیفیت عہد نامہ جدید کے متعلق عیسائیوں کی ہے۔ اگر یہ کتابیں خدا کی طرف سے ایسا ہی الفاظ کا مجموعہ ہیں تو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اگر عہد نامہ جدید کو اس کی موجودہ صورت میں دور حاضر کے اسی طور طریق پر پرکھا جائے جن کے متعلق اور مذہبی رسالے سے حاصل کردہ دستاویزوں کو پرکھا جاتا ہے تو ماہرین فن کی متفقہ رائے یہ ہے کہ متفق علیہ اناجیل کو حضرت مسیح کی زندگی کے متعلق معاصر دستاویز قرار نہیں دیا جاسکتا۔"

(تہذیب یورپ پریٹن - ترجمہ مولانا غلام رسول مہر)

اناجیل یقیناً خدا کا کلام نہیں ہیں۔ اگر یہ خدا کا کلام ہیں تو پھر اس کے بار بار REVISED AUTHORIZED VERASION کیوں شائع ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء تک مکمل عہد نامہ عتیق و جدید کے جو انگریزی کے تراجم ہوئے ان کو پچاس سے زائد مرتبہ REVISE کیا گیا اور عہد نامہ جدید کا صرف انگریزی ترجمہ ۱۱۰ مرتبہ REVISE ہو چکا ہے۔ اب وہی سہی کسر ریڈرز ڈائجسٹ والوں نے نکال دی ہے کہ وہ عہد نامہ عتیق و جدید کی ایک مخصوص شائع کر رہے ہیں۔ تحریف کی دونوں صورتیں ہیں۔ تحریف مسنوی کہ اصل معانی کو مسخ کیا جائے اور تحریف لفظی

کے الفاظ میں دیے جائیں۔ بزن محقق ٹاکٹر سیسل نے عہد نامہ جدید کے چند نئے صبح کر لیے ان موازنہ اور مقابلہ کیا تو اس نے تیس ہزار اختلافات عبارت شمار کیے۔

بائبل مقدس کا جو نیا ترجمہ چند برس پہلے امریکہ سے شائع ہوا اور پاکستان کے متعدد وکلیں، ماؤں کو اس کی سرپرستی کا شرف حاصل اور وہاں اسے پڑھا جاتا ہے اس کے بارے میں پادری عنایت ایس مل لکھتے ہیں

”اس ترجمہ کے ذریعے عید: مدعی تعلیم راج کی جا رہی ہے۔ کلام مقدس کی بیشتر آیات خداوند مسیح کی الہیت، کفارہ اور خداوند کے آسمان پر اٹھانے جانے کے متعلق ہیں۔ اس نئے امریکی بائبل آر۔ ایس۔ وی سے کسی وجہ اور تشریح کے بغیر نکال دی گئی ہیں۔“

اپنے اس پس منظر کے باوجود ان گنت عیسائی جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اس کتاب کو اپنی مذہبی اور الہامی کتاب کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ تاہم اصل بائبل منقود ہو چکی ہے۔ عہد نامہ جدید میں جو کچھ موجود ہے۔ اس میں حکمت و دانائی اور ہدایت کا خزانہ موجود ہے۔ بھلا پہاڑی کے وعظ کی تاثیر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ عہد نامہ جدید دنیا میں بہت زیادہ پڑھی جانے والی عظیم کتاب ہے لیکن سب سے زیادہ پڑھی جانے والی نہیں۔

جے۔ ڈبلیو۔ سی وائڈ (WAND) نے اپنی تازہ کتاب ”دی چرچ ٹو ڈے“ (THE

CHURCH TO DAY) میں لکھا ہے۔

کیا یہ افسوسناک صورت حال نہیں کہ ہمارے کیتھولک علماء کی ایک کثیر تعداد جو ہمارے

پادری بھی ہیں انہوں نے بائبل کو کبھی پورا نہیں پڑھا۔ حتیٰ کہ عہد نامہ جدید کو بھی۔

گیتا

بھگوت گیتا — سنسکرت کے عظیم اور قدیم رزمیہ مہا بھارت کے چھٹے باب کا ایک حصہ ہے۔ جس کا اجمالی ذکر آگے چل کر آئے گا۔

گیتا — لغتاً عبادت ہے۔ اس میں بھگوان کا راز "گایا گیا ہے۔ سب شاستروں اور ویدوں کی روح اس میں موجود ہے۔ یہ ویدانت کی تفسیر ہے۔

گیتا — میں سات سوانشوک، اٹھارہ ادھیائے ہیں جو تین برابر حصوں "کرم بھگتی" اور "گین" پر مشتمل ہیں۔ ہندوؤں میں اپنے عقیدے اور دوسرے پرائوں کے حوالے سے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں۔ لیکن گیتا پر وہ سب متفق ہیں اور اس پر مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں۔

گیتا کے حوالے سے چند اہم باتیں

ہندوؤں نے اپنی تاریخ مدون نہیں کی لیکن ان کی زبان سنسکرت ان کی تاریخی قدامت پر دلالت کرتی ہے۔ ہندومت کے بارے میں ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے اور اسے میکس ملر کے ایک جملے کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ میکس ملر نے یونانی فلسفے پر ہندو فلسفے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا۔

"فلسفہ اور مذہب — ہندوؤں میں ناقابل تقسیم ہیں۔"

ٹھیکل نے اس موضوع پر خاص کام کیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس وقت اس موضوع کو چھیدو مانگیتا کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیتا کا

کا تاریخی اس حقیقت کا اعتراف کرے گا جسے میکس ملر نے بیان کیا ہے۔
 ویدوں کا زمانہ - حضرت مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں کے
 پُران جن کی تعداد اٹھارہ ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ مہا بھارت کے زمانے
 سے لے کر سولہویں صدی ق۔م تک لکھے گئے۔
 گیتا کے بارے میں محققین کا قیاس ہے کہ یہ ایک ہزار سال قبل مسیح کے زمانے
 میں لکھی گئی۔

میکڈائن اس کا زمانہ ۵۰۰ برس ق۔م بتاتا ہے۔ گیتا کی شہادت یونانی مؤرخوں اور
 یونانی کتبوں سے بھی ملتی ہے۔ ۴۰۰ ق۔م میں گیتا کا وجود ثابت ہو چکا ہے۔
 گیتا کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو سماج جو ذات پات کی لعنت
 میں جکڑا ہوا ہے۔ گیتا میں موردِ ثبات پات کا ذکر نہیں ملتا۔ گویا ذات پات کی تفریق اور تقسیم
 گیتا کے بعد ہوئی۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مہا بھارت میں آنے والے اودار میں
 اضافے کیے جاتے رہے۔

گیتا کے زمانے تک ہندومت کی جو شکل سامنے آتی ہے۔ وہ کچھ اس طرح سے ہے۔
 سب کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔ یہ ایک تین میں متشکل اور تقسیم ہوا۔ یعنی برہما
 (خالق، دشنو (حفاظت) شیو (کائنات کو پیدا اور فنا کرنے والا) شیو کی تین بیویاں سرسوتی، لکشمی
 اور پاربتی ہیں جنہیں قابل پرستش تسلیم کیا۔

دشنو کے دس اوتار ہیں جو مختلف زمانوں میں ظالموں کو ختم کرنے کے لیے دنیا میں آئے
 ان کی شکلیں مختلف ہیں۔ انہی میں سے ایک اوتار وہ تھا جو مچھلی کی شکل میں دنیا میں آیا اور
 ویدوں کو طوفانِ نوح سے بچایا۔ رام بھی دشنو کے اوتار تھے۔ رامائن کو اس لیے مذہبی کتاب
 کا درجہ دیا گیا۔ لیکن ہندوؤں کے نزدیک رام سے بھی بڑا اہم مقبول اوتار کرشن ہے۔

کرشن مسخر کے شاہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ظالم راجہ کنس کے خوف سے گراووں
 کے ہاں پرورش پائی (حضرت موسیٰ اور فرعون کا واقعہ بھی ذہن میں رکھیے)۔ کرشن - نٹ
 کھٹ شریہ ہے۔ زندہ دل اور عشقِ دوستی میں سرشار۔ کرشن جو ان ہو کر کنس کا غارت کرتے ہیں

اپنی حکومت اور راجد معانی پر قبضہ کیا۔

یہی کرشن - مہا سبھارت کی جنگ میں ارجن کو جو اپدیش دیتے ہیں - وہ گیتا ہے - یہی کرشن کی تعلیمات ہیں - کرشن کے ماننے والے ویشنو کھلاتے ہیں -

گیتا کے تراجم

دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں گیتا کے تراجم بار بار نہ ہوئے ہوں - مسلمانوں میں البیرونی، عبدالقادر بدایونی، نقیب خاں، شیخ سلطان مخافیسری اور فیضی وغیرہ سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے - انہوں نے گیتا کو پڑھا اور اس سے فیض اٹھایا تھا - دارا شکوہ بھی سنسکرت کا عالم تھا - جس نے اپنی نگرانی میں اپنشدوں کا ترجمہ کروایا - یوں اپنشد فارسی میں منتقل ہوئے - فیضی نے گیتا کا ترجمہ منظوم فارسی میں کیا - یہ ترجمہ ہر شعر کا نہیں ہے بلکہ ایک باب کے مفہوم کو فارسی میں منظوم کر دیا گیا ہے -

شونہا گیتا اور ویدوں کا بے حد مداح تھا - اس کے فلسفے پر بھی بہت حد تک اس کے تاثرات ملتے ہیں - لیٹ ایس ایٹھ اور ایڈرا پوٹڈ بھی گیتا کے قاری تھے -

برصغیر کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں گیتا کا ترجمہ نہ ہوا ہو - ہما مہا گاندھی نے اسے گجراتی میں منتقل کیا تھا جس کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے - اردو میں کئی شاعروں نے اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے - جس میں اثر لکھنوی کا آزاد اور منظوم ترجمہ، لغتہ جادید کے نام سے شائع ہوا - خواجہ دل محمد نے بھی اس کا منظوم ترجمہ کیا - منور لکھنوی کا اردو منظوم ترجمہ بھی خاصا اہم ہے -

گیتا کا ایک خاص ترجمہ اور مطالعہ - محمد اجمل خاں کی تصنیف و تالیف ہے - یہ وہی محمد اجمل خاں ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکرٹری رہے - محمد اجمل خاں نے گیتا کے ترجمے کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا اس طرح سے موازنہ کیا ہے کہ گیتا اور اسلام کی مشترک اقدار اور تعلیمات سامنے آگئی ہیں - محمد اجمل خاں کا یہ کام - ایک اہم کام ہے -

انگریزی میں مختلف ادوار میں گیتا کے تراجم ہوئے - ان میں آرٹلڈ میور کا ترجمہ

اہم اور مفرد ہے۔

مہاجرات

گیت کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے مہاجرات کی جنگ کے بارے میں جاننا ناگزیر ہے مہاجرات کے بارے میں جدید تحقیق کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ بارہ سو قبل مسیح سے ایک ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں لڑی گئی۔ ہندوؤں کی اصطلاح میں یہ یوگ (وصال) کا دور ہے۔

مہاجرات کی اس جنگ کو سنسکرت، شاعری ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کی رزمیہ شاعری میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مہاجرات ایک ایسی رزمیہ نظم ہے جسے سنسکرت کی "ایلیٹ" کہا جاسکتا ہے۔

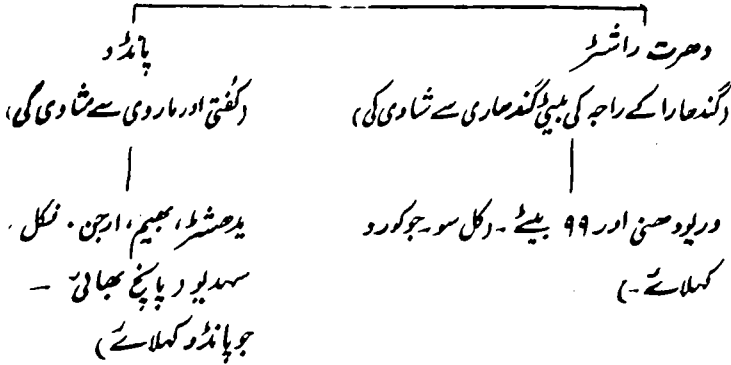
مہاجرات کا قصہ یوں ہے۔!

آریاؤں کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ ہندوستان آئے تو یہاں پر آباد اقوام سے لڑتے رہے۔ لیکن مہاجرات وہ جنگ ہے جو ان کے درمیان لڑی گئی۔ آریا پنجاب سے گنگا و جمن کے علاقے میں پہنچے تو انہوں نے شہر آباد کیا۔ اور اسے اپنی راجدھانی بنایا۔ ہستنا پور سے ۷۵ میل کے فاصلے پر پانڈوؤں نے اندر پرستھ کی بنیادیں رکھیں جسے آج ہم دہلی کہتے ہیں۔

مہاجرات کی جنگ خاندانی جنگ تھی۔ یہ ایسے راجاؤں کے درمیان لڑی گئی جو ایک سی دادا کی اولاد تھے۔ جس کا نام کرو تھا۔ اس کا بیٹا دیاس تھا۔ جس کے دو بیٹے دھرت راشترا اور پانڈو تھے۔ دیاس کی موت کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا بھیشم نے کی۔ جب سن بلوغت کو پہنچے تو راج پاٹ پانڈو کو دے دیا گیا۔ حالانکہ وہ دھرت راشترا سے چھوڑا تھا۔ اسے راج پاٹ اس لیے سونپا گیا کہ دھرت راشترا پیدا ہونے لگا تھا۔

مہاجرات میں لڑنے والے دونوں فریقوں کا شجرہ نسب یہ ہے۔

دیاس



پانڈو کی موت کے بعد دھرت راشٹر نے اپنے بیٹوں کی مدد سے ہستنا پور کی گدی پر قبضہ کر لیا۔ یہ دھرت کے محل کو آگ لگا دی گئی۔ لیکن پانچوں پانڈو بھائی کسی طرح بچ نکلے اور مدتوں آوارہ بھٹکتے رہے۔

پانچال قوم کے مہاراجہ دروید نے اپنی بیٹی درویدی کے سوا کر کا اعلان کیا۔ تیرا مذہبی کا مقابلہ ہوا۔ ارجن نے جیت لیا۔ اور اس کے ساتھ درویدی بھی۔ جو پانچوں پانڈو بھائیوں کی بیوی بنی۔ اب دہر بھگنے والے پانڈوؤں کو راجہ دروید کا سہارا مل گیا۔ دھرت راشٹر کے دل میں بھی کچھ نیکی آئی اور اس نے اپنے بھتیجوں کو بلا کر آدھاراج پاٹ اور حکومت ان کو دی۔ پانڈوؤں نے اندر پرستھ (دہلی) کی بنیاد رکھی اور اسے اپنی راجدھانی بنایا۔

کوروؤں کو پانڈوؤں کا راج پاٹ اور حکومت پسند نہ آئی۔ وہ ہوس ملک گیری میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ایک منصوبے کے ساتھ پانڈوؤں کو بلایا۔ ایک سمجھا سمجھائی گئی اور جو اٹھینا شروع کیا۔ کورو جوئے میں پانڈوؤں کا راج پاٹ، حتیٰ کہ درویدی بھی جیت گئے۔ ان کو بارہ برس کا بن باس دیا گیا۔ بارہ برس کے بعد جب پانڈو لوٹے اور اپنی حکومت مانجی تو کورو اپنے وعدے سے منکر گئے۔

اب کرشن کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ کوروؤں کے ظلم کے خلاف تھے۔ چاہتے تھے کہ امن و امان سے معاملے طے پا جائے۔ وہ دھرت راشٹر کے دربار بھی گئے۔ اور آنا مطالبہ کیا کہ

پانڈوں کو صرف پانچ گاؤں دے دیے جائیں لیکن کورڈوں نے اتنا سا مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ کرشن کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کرشن بچ نکلے۔

اب مہاجرت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریقوں کے حلیف راجے مدد کے لیے آہنچے۔ درلیو دھن (کردو) اور ارجن راجن پانڈوں دونوں نے کرشن سے مدد مانگی۔ کرشن دونوں کے رشتے دار تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس جنگ میں مہتیار نہ اٹھائیں گے۔ دونوں سے کہا کہ وہ خود ان کا اور ان کی فرج میں سے جس کا انتخاب چاہیں کر لیں۔ درلیو دھن نے کرشن کی فرج کو پسند کیا۔ کیونکہ کرشن نے تولڑائی میں حصہ نہ لینا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے لیے فرج کو مفید اور کارآمد سمجھا۔ ارجن نے کرشن کا انتخاب کیا۔

ارجن نے جب اپنے عزیزوں و رشتہ داروں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا پایا تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ کرشن جو اس جنگ میں ارجن کے رفیق بنے۔ انہوں نے ارجن کو اپدیش کیا۔ جنگ لڑنے پر اکسایا۔ یہی وہ اپدیش ہے جو گیت کہلاتا ہے۔

مہاجرت کی جنگ میں سارے کور دمارے گئے۔ پانڈوں کے سارے ساتھی بھی ہلاک ہو گئے۔ دھرت راتھ کے سارے بیٹے جنگ میں کام آچکے تھے۔ اس نے بیوی کو ساتھ لیا، سلطنت چھوڑی اور سفیاس کی راہ لی۔ پانڈو حکومت کرتے رہے۔ ۲۶ برس بعد جب انہیں خبر ملی کہ کرشن دنیا سے سدھا گئے ہیں تو انہوں نے بھی راج پاٹ چھوڑا اور ہمالیہ کی راہ لی۔ راہ میں ایک ایک کر کے سب مر گئے۔ صرف یدھشٹر اور اس کا کتا زندہ بچے جو جنت کی تلاش میں نکلے۔ یدھشٹر نے اور اس کا کتا جنت کی تلاش میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یدھشٹر نے اس وقت تک جنت میں جانے سے انکار کر دیا جب تک اس کے بھائی اور بیوی درپدی بھی جنت میں داخل نہ ہو جائیں اس کی یہ دعا قبول ہوئی لیکن کتے کو جنت میں لے جانے کی اجازت نہ ملی۔ یدھشٹر نے ایسی جنت قبول کرنے سے انکار کر دیا جہاں اس کا دنا دار ساتھی کتا نہ جاسکتا تھا۔ دوزخ میں وہ اکٹھے ہو گئے۔ یہاں یہ تینا مقصود تھا کہ یہ سب مایا ہے۔ ہر چیز مایا ہے۔ ...

مساقتا گا ذہنی نے۔ گیتا۔ کا جو ترجمہ کیا تھا اس کے دیباچے میں لکھا تھا۔
 گیتا مختصر کتاب نہیں ہے۔ گیتا ایک بڑی مذہبی منظوم کتاب ہے۔ اس
 میں جتنے گہرے اُترتے اتنے ہی اس میں سے نئے اور خوب صورت معانی ملیں
 گے۔ گیتا مختلف انسانی جماعتوں کے لیے ہے اس میں ایک ہی بات مختلف
 طریقوں سے کہہ دی ہے۔ اس لیے گیتا کے مشہور الفاظ کے معانی ہر زمانے
 میں بدلتے اور وسیع ہوتے رہیں گے۔ گیتا کا بنیادی اصول (مول منتر) کبھی
 نہیں بدل سکتا۔ وہ منتر جس طریقے سے ثابت کیا جاسکتا ہے اس طریقے سے متاثر
 ہی چاہیے۔ جو معانی نکال سکتا ہے۔

گیتا میں گیان کی بزرگی مانی گئی ہے۔ پھر بھی گیتا کو عقل سے پانا ممکن نہیں۔
 یہ دل سے پہنچنے کے لائق ہے۔ اس لیے وہ کمزور یقین والوں کے لیے
 نہیں ہے۔ گیتا بنانے والے نے بھی کہا ہے :
 جو پتھوسوی نہیں ہے وہ بھگت نہیں ہے۔ جو سنا نہیں چاہتا اور جو مجھ سے
 نفرت کرتا ہے اس لیے گیانی بھی مت کہنا۔

(گاڈھی۔ ترجمہ بھگوت گیتا۔ (اردو) صلا۔ ۱۲)

گیتا کی تلخیص

یہ تلخیص اس ترجمے سے کی گئی ہے جو مساقا گا ذہنی نے گجراتی میں کیا ہے۔ اور پھر اس کا
 اردو ترجمہ ہوا ہے۔

تماش کے بغیر گیان نہیں ہوتا۔ دکھ کے بغیر سکھ نہیں ہوتا۔ دھرم بگڑنے کی چٹا اور
 من کا خیالات میں الجھنا سب جگیا سوؤں (مثلا شیوں) کو ایک بار ہوتا ہی ہے
 ہر ایک جسم میں اچھی اور بُری ترغیبوں میں لڑائی لگی ہی رہتی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا۔
 وہاں دونوں فوجوں میں موجود بڑے بڑے پتا مہا چارج ماما، بھائی بیٹوں، پوتوں،
 دوستوں، سببوں اور پیاروں کو ارجن نے دیکھا۔ ان سب بھائی بندھوں کو اس طرح

کھڑا دیکھ کر دکھی ہونے کے کارن بنے ہوئے کُنٹی کے پُتر ارجن نے اس طرح کہا۔
 - یہ کرشن بیدھ کرنے کی خواہش سے لکٹھے ہوئے۔ ان اپنے آدمیوں کو دیکھ کر میرے انگ
 واصلے پر لگے۔۔۔۔۔ لڑائی میں اپنے آدمیوں کو مارنے میں مجھے کوئی بھلائی نظر نہیں آتی۔
 - یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے یا مجھے تین لوگ کا راج بھی مے تو بھی، میں مدھوسورن
 میں انہیں مارنا نہیں چاہتا تو پھر زمین کے ایک ٹکڑے کے لیے انہیں کیوں ماروں۔۔۔۔۔
 اپنوں کو مار کر کیسے خوشی حاصل کی جا سکتی ہے۔۔۔۔۔

- اوہو۔ کیسی دکھی کی بات ہے کہ ہم لوگ بڑے بھاری پاپ کمانے کے لیے تیار
 ہو گئے۔ یعنی راج سکھ کے لالچ میں پر لگا پونوں کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔

موہ کے دس آدمی ادھرم کو دھرم مان لیتا ہے۔ موہ کے کارن اپنے اور پرانے کا بھید
 ارجن نے کہا۔ یہ بھید جھوٹا ہے۔ یہ بتلاتے ہوئے مشری کرشن مشریرا دتتا کے آگ۔ آگ
 ہونے کا درتق کرتے ہیں۔ اس میں جسم کا فنا اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا اور آتما کا غیر فانی ہونا اور
 اس کا ایک دھنوا ہونا بتلاتے ہیں۔

آدمی اپنا فرض ادا کر سکتا ہے۔ نتیجہ اس کے اختیار میں نہیں ہے اس لیے اسے اپنے فرض
 کا فیصلہ کر کے بے فکری سے اس میں لگے رہنا چاہیے۔
 مشری بھگوان بولے۔

ناقابل افسوس بات کا تو افسوس کرتا ہے اور عالموں کی سی باتیں کرتا ہے لیکن عام لوگ
 مردہ زندگیوں کا افسوس نہیں کرتے۔

ہے کُنٹی کے پُتر ارجن احواس خمر کے احساسات۔ اس آدمی کو اور کھو دیتے دلے
 ہوتے ہیں۔ وہ کالی ہوتے ہیں۔ وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں برواشت کر۔۔۔۔۔
 نیستی کی ہستی نہیں ہے اور ہستی کی نیستی نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ تمام دنیا جس سے بھری ہوئی
 ہے اسے لافانی سمجھو۔ اس لافانی کو فنا کرنا کسی کی طاقت میں نہیں ہے۔

- جو لے مارنے والا ملنے ہیں اور جو لے مرا ہوا مانتے ہیں وہ دونوں کچھ نہیں جانتے
 یہ روح نہ کسی کو مارتی ہے اور نہ کسی سے ماری جاتی ہے۔

روح نہ پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ جو تھا اور مستقبل میں نہیں ہوگا۔ یہ سبھی نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہ پیدا ہونے والی ہے نہ مرنے والی۔ سدا رہنے والی ہے۔ قدیمی ہے۔ جسم کے نشا ہونے پر اس کا نشا نہیں ہوتا۔

• جیسے آدمی پرانے کپڑوں کو تار کرنے کے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ویسے ہی روح کمزور اور پرانے جسم کو چھوڑ کر نئے جسم کو حاصل کر لیتی ہے۔

اس روح یا آقا کو اوزار کاٹ نہیں سکتے۔ آگ جلا نہیں سکتی۔ پانی نکلا نہیں سکتا اور ہوا سکھا نہیں سکتی۔ پیدا ہونے والوں کو موت اور مرنے والوں کے لیے پیدائش لازم و ملزوم ہے۔ اس لیے جو لازمی ہے اس کا افسوس کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں نے تجھے فلاسفی کے اصولوں کے مطابق تیرا یہ فرض بتلایا ہے۔ اب کرم یوگ سمجھتا ہوں۔ وہ سن اس کا سہارا لینے سے تو کرم کی پچاسی کو توڑ سکے گا۔

تیرا اپنے کرموں کے کرنے کا ہی اختیار ہے اس سے پیدا ہونے والے بے شمار نتائج پر تیرا کوئی اختیار نہیں۔ کرم کے پھیل کی کو لے کر کام نہ کر۔ ہے ارجن۔ پھنساوٹ کو چھوڑ کر یوگ میں نگارہ کامیابی میں یکساں رہ کر کرم کر۔

غصہ سے دور رکھتا رہے وقوفی پیدا ہوتی ہے۔ بیوقوفی سے ہوش ٹھکانے نہیں رہتا۔ ہوش ٹھکانے نہ رہنے سے علم کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اور جس میں علم ہی نہ رہا وہ مردہ کی مانند ہے۔

لیکن جس کا من اپنے قابو میں ہے اور جس کے حواس پھنساوٹ یا دشمنی سے خالی ہو کر اس کے قابو میں رہتے ہیں۔ وہ آدمی حواس سے کام لیتا ہوا بھی راحت قلب حاصل کر لیتا ہے۔

اطمینان قلب سے اس کے سارے دکھ دور ہو جاتے ہیں جسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اس کی عقل فوراً ہی برقرار ہو جاتی ہے۔

جسے اطمینان نہیں اسے تمیز نہیں ہے۔ اسے بھیگتی نہیں ہے اور جسے بھیگتی نہیں ہے اسے شانتی نہیں ملتی ہے اور جہاں شانتی نہیں وہاں سکھ کہاں سے آسکتا ہے۔

جب سب جاندار سوتے رہتے ہیں۔ تب نفس مطمئنہ والا انسان جاگتا رہتا ہے جب لوگ جاگتے رہتے ہیں تب عارف سوتا رہتا ہے۔

اناج سے سب جاندار پیدا ہوتے ہیں، اناج بارش سے پیدا ہوتا ہے۔ بارش بگیہ سے ہوتی ہے۔ بگیہ کرم سے ہوتا ہے۔ تو جان لے کہ کرم قدرت سے پیدا ہوتے ہیں قدرت کی ہستی لافانی خالق سے ظہور میں آتی ہے۔ اس لیے ہر جا حاضر و ناظر خالق ہمیشہ بگیہ میں موجود ہے۔

پاپیوں کا ناش ہی ہے کیونکہ جھوٹ کی ہستی نہیں ہے۔ یہ جان کر انسان کو اپنی فاعلیت کے غور سے کسی کو ایذا نہیں پہنچانی چاہیے۔ بُرے کام نہیں کرنے چاہئیں ایشور کی گہری قدرت اپنا کام کرتی ہی جاتی ہے۔ اصل میں ایشور کے لیے پیدائش ہوتی ہی نہیں ہے۔

جو امیدیں نہیں باندھتا جس کا من اپنے قابو میں ہے جس نے جمع کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے اور جس کا صفت جسم ہی کام کرتے ہوئے اس کے اثرات سے مبرا ہے۔
”ہے ارجن روپے پیسے سے کئے گئے بگیہ کی نسبت گیان کا بگیہ زیادہ اچھا ہے۔“
”ہے ارجن۔ جس طرح جلتی ہوئی آگ ایندھن کو فنا کر دیتی ہے۔ ایسے ہی گیان کی آگ سب کرموں کو جسم کر دیتی ہے۔“

جو گیانی (لا علم) اور یقین سے خالی ہو کر تشکیہ حالت میں رہتا ہے اس کا ناش ہو جاتا ہے۔ تشکیہ مزاج کے لیے نہ تو یہ لوک ہے اور نہ پر لوک۔ اسے کہیں سکھ نہیں ہے۔

”جو آدمی کسی سے دشمنی نہیں کرتا اور خواہش نہیں کرتا اسے ہمیشہ سنیاسی سمجھنا چاہیے۔ جو رنج و راحت کے جھمیوں سے آزاد ہے۔ وہ بڑی آسانی سے زنجیروں سے چھوٹ جاتا ہے۔“

”ایشور کسی کے گناہ ثواب کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ لائیلی کے ذریعے علم رگیان اُدھک جاتا ہے اور اس سے لوگ دہم و گمان میں پھنس جاتے ہیں۔“
”آتما ہی آتما کا مددگار ہے اور آتما ہی آتما کا درشن اس کا آتما مددگار ہے۔ جس نے

اپنی طاقت سے من کو جیت لیا ہے جس نے آتما کو جیتا نہیں وہ اپنے آپ سے ہی دشمن کی طرح بتا د کرتا ہے۔"

مے کنتی کے پتر۔ جس میں رس میں ہوں۔ سورج چاند میں چمک میں ہوں۔ سب دیدوں میں اونکار رادم شد، میں ہوں۔ آکاش میں آوازیں ہوں۔ اور انسانوں میں کام کی طاقت میں ہوں۔ مٹی میں خوشبو میں ہوں۔ آگ میں حرارت میں ہوں اور سب جانداروں میں زندگی میں ہوں۔ تپ کرنے والوں کا تپ میں ہوں۔ ہے ارجن سب جانداروں کا تپ اولین میں ہوں، عقل مند کی عقل میں ہوں۔ تیج والوں کا تیج میں ہوں۔ بلوان کا خوش اور محبت کے بغیر بل (طاقت) میں ہوں۔

بدچلن، جاہل بیچ آدمی میرا سہارا نہیں لیتے بدی کے خیالات والے ہوتے ہیں۔ اور مایا کے ذریعے ان کا لیان دور ہوا ہوتا ہے۔

ہے ارجن، چار قسم کے نیک چلن آدمی مجھے یاد کرتے ہیں۔ دکھی، متناستی، کچھ حاصل کرنے کی خواہش والے اور گیانی۔ ہے ارجن، ماضی حال اور مستقبل کے سبھی جانداروں کو میں جانتا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔ "پیدائش اور فنا کا جوڑا ساتھ ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔"

دنیا میں گیان اور اگیان یہ دونوں قدیمی مسلسل راستے مانے گئے ہیں ایک یعنی گیان کے راستے سے انسان نجات حاصل کرتا ہے اور دوسرے یعنی اگیان کے راستے سے اسے دوسرا جہنم حاصل ہوتا ہے۔ ہے پارکھ ان ہر دور استوں کو جاننے والا کوئی بھی ہو کبھی دھوکا نہیں کھاتا۔

"میرے نظر نہ آنے والی شکل سے ساری دنیا بھری ہوئی ہے۔ مجھ میں میرے سہارے پر سب جاندار ہیں۔ ہیں ان کے سہارے پر ہوں۔ پھر کبھی میں ان میں نہیں ہوں لیکن میں ان کی وجہ پیدائش ہوں۔ ہے کنتی کے پتر، میں جاندار کلب کے آخر میں میری قدرت میں سما جلتے ہیں اور کلب کے آغاز میں ایکٹ نہیں پھر پیدا کرتا ہوں۔" میرے اختیار میں رہ کر قدرت متحرک دنیا کو پیدا کرتی ہے۔ اور اس وجہ سے کنتی کے پتر، دنیا کو تپوں کی منڈی

کی طرح گھومنا کرتی ہے۔

”اس جگت کا باپ میں ہوں، ماں میں ہوں، سہارا دینے والا میں۔
 پاک روم لفظ میں۔ رگ دیدیگر وید اور سام دید بھی میں ہوں۔ حرکت میں پرورش
 کرنے والا میں ماہک میں شاید میں مقام میں سہارے کی جگہ میں۔ خیر خواہ میں۔ پیدائش میں
 فنا میں، قیام میں، خزانہ میں لافانی بیچ بھی میں ہوں۔“
 ”جو لوگ مجھے لائبریک مان کر میری یاد کرتے ہیں۔ میری عبادت کرتے ہیں۔ ان کو
 ہمیشہ ہی مجھ میں محراب ہونے والوں کی خیر و عافیت کا بوجھ میں اٹھاتا ہوں۔“
 ”سب جانداروں میں یکساں رہتا ہوں۔ میرے لیے نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن،
 جو مجھے جھگڑتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ مجھ میں ہیں۔ میں بھی ان میں ہوں۔ یاد کرتے ہیں۔ وہ
 مجھ میں ہیں۔ میں بھی ان میں ہوں۔“

”سخت بدلن آدمی بھی اگر یک دل ہو کر مجھے یاد کرے تو اسے بھی نیک ہوا ہی ماننا
 چاہیے۔ کیونکہ اب اس کا اچھا ارادہ ہے۔“

”ہے ارجن، مخلوقات میں آغاز، آخر اور بیچ میں ہوں۔ علموں میں برہم دو یا میں ہوں
 اور بحث میں مباحثہ کرنے والوں میں محبت میں ہوں۔“

”سب کو فنا کرنے والی مدت میں ہوں۔ مستقبل میں پیدا ہونے والے کا موجب پیدائش
 میں ہوں اور نونٹ قسم کے ناموں میں کیرتی و شہرت، کشمی و دھن دولت بانی (زبان، سمرتی
 (مذہبی کتب) میدھا (عقل)، دھرتی (استقلال)، کھشما (صافی) میں ہوں۔“
 ”دھوکا کرنے والے کا جو میں ہوں۔ بارعب آدمی کا رعب میں ہوں۔ فتح میں ہوں۔
 یقین میں ہوں۔ نیک خیالات والوں کی نیکی میں ہوں۔“

شری جگوان نے کہا۔

”ہے پارتھو میری ہزاروں صورتیں دیکھو وہ مختلف قسم کی عجیب ہیں۔ علیحدہ علیحدہ رنگ
 اور شکل کی ہیں۔ ان اپنی چمکے کی آنکھوں سے تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ تجھے میں عجیب آنکھیں
 دیتا ہوں تو میری قدرت کا تمنا دیکھو۔“

ہے راجن، یوگیشور کرشن نے اسپانیہ کرپارتھ کو اپنی خدائے شکل دکھائی۔ وہ بے شمار منہ اور آنکھوں والی بے شمار اور عجیب نظر آنے والی۔ بے شمار زیورات پہنے اور بے شمار ٹھٹھے ہوئے ہتھیاروں والی تھی۔ اس نے بے شمار عجیب و غریب ہار اور کپڑے پہنے ہوئے تھے اور عجیب خوشبو دار لپ کیا ہوا تھا۔ ایسے وہ سب سے حیران کن بے حد اور سب جگہ جاؤ ناظر دیکھتا تھا۔

راجن نے کہا:-

”آپ کو میں بے شمار ہاتھ، پیٹ منہ اور آنکھوں والا بے شمار شکلوں والا دیکھتا ہوں۔ آپ کی کوئی حد پیش ہے۔ وسط نہیں ہے اور نہ آپ کی ابتدا ہے... سورج اور چاند کی شکل میں جس کی آنکھیں ہیں جس کی منہ جلتی ہوئی آگ کی طرح ہے اور جو اپنے تیج سے اس دنیا کو حرارت پہنچا رہا ہے ایسے آپ کو میں دیکھ رہا ہوں آسمان اور زمین کے بیچ کے اس فاصلے میں اور سب اطراف میں آپ ہی اکیلے پھیل رہے ہیں۔

”سب راجاؤں کے گرد وہ کے ساتھ دھرتی راشر کے یہ لڑکے... اور ہمارے بڑے بڑے سپاہی ڈاڑھو مارے آپ کے ڈراؤنے منہ میں تیزی سے داخل ہو رہے ہیں۔ کتنے ہی کے سر چہرے جا کر آپ کے دانتوں میں لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سب لوگوں کو سب اطراف سے نکل کر آپ اپنے جلتے ہوئے منہ سے چاٹ رہے ہیں۔

شری بھگوان نے کہا:-

”لوگوں کو فنا کرنے والا بڑھا ہوا میں کال ہوں۔ دنیاؤں کو فنا کرنے کیلئے یہاں آیا ہوں ہر

ایک فوج میں جو سب سپاہی آئے ہوئے ہیں ان میں سے تیرے لڑنے سے انکا کرنے پر بھی بیچ کر نہیں جاسکتے ایسے تو دکھی ہو، شہرت حاصل کر، دشمن کو جیت کر روپے پیسے اور راج سے بھرا ہوا راج بھوگ، انہیں میں نے پہلے سے مار ڈالا ہے تو تو معنی ایک ذریعہ بن جاتا۔

قدرت اور انسان دونوں کو ازلی کچھ تبدیلیاں اور صفات قدرت سے پیدا ہوتے ہیں آقا کا ناش رنیوالا دوزخ کا یہ تین قسم کا درد اذہ ہے، شہرت، غصہ اور لالچ ایسے انسان کو ان تینوں کو چھوڑ دینا چاہئے

اوم - ت - ست !

اقوال

اس سلسلے میں بہت تحقیق ہوئی ہے کہ کنفیوشس کے اقوال اور تعلیمات کو کب اور کس نے جمع کر کے مرتب کیا۔ محققین اور مورخوں کی آراء میں بہت تضاد اور فرق پایا جاتا ہے تاہم کسی خاص سال و سن کے تعیین میں اختلاف کے باوجود محققین اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ کنفیوشس کی موت ۴۷۹ ق م کے کچھ عرصے کے بعد اس کے شاگردوں اور پیروکاروں نے اس کے اقوال کو جمع کر کے کتابی شکل دے دی۔ کنفیوشس کی تعلیمات پر مبنی ان اقوال کو جو قدیم چینی زبان میں مرتب ہوئے۔ صدیوں سے دنیا کی ہر زبان میں منتقل کرنے کا عمل جاری ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جو ان اقوال کو اپنے اپنے بسنے والوں تک نہ پہنچا سکی ہو۔ صدیوں سے کنفیوشس ساری دنیا کے لیے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ صدیوں سے اس کے اقوال و تعلیمات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ ایک ہی زبان میں اس کے کئی کئی تراجم ملتے ہیں اور نئے تراجم ہوتے رہتے ہیں۔

کنفیوشس کا شمار دنیا کے عظیم ترین اخلاقی معلمین میں ہوتا ہے۔ اسے مذہبی رہنما ہونے کا دعوے نہ تھا۔ اگرچہ بعض لوگ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر تھا، نہ ہی وہ کسی مذہب کی تبلیغ کرتا اور تعلیم دیتا تھا۔ اس کے ہاں خدا کا تصور بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس وہ والدین کی اطاعت، آباؤ اجداد کی تقدیس و احترام کی تعلیم دیتا ہوا ملتا ہے۔ وہ پانچ نعمات پر زور دیتا ہے، اور اپنے پیروکاروں کو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ پانچ اوصاف یہ ہیں۔

نرمی اور تحمل، صداقت، وقار، شفقت اور عاجزی۔

اپنے انداز میں یہ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو کسی مذہب کو دنیا میں پھیلانے یا لانے کا دعوے دار نہ اٹھا جو خود کو مذہبی رہنما اور پیغمبر نہ گردانتا تھا اس کی تعلیمات کو مذہب کا درجہ دیا گیا۔ کنفیوشس مت ایک مذہب بن گیا۔ صدیوں تک ان گنت لوگ جو زور رنگ سے تعلق رکھتے تھے نسلاً بعد نسل اس مذہب کے پیروکار رہے کنفیوشس اور اس کی تعلیمات کو ماننے والوں نے اپنی زندگی کو ایک نیا انداز دیا۔ ان کا ذہن طرز عمل دوسرے لوگوں سے بہت مختلف اور منفرد ٹھہرا۔

کنفیوشس کی عظمت و اعزاز کو قائم رکھنے اور حراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک معبد تعمیر کیا گیا۔ اس سلسلے میں مزے کی بات یہ ہے کہ یہ معبد ایک ایسے چینی حکمران نے تعمیر کیا جو کنفیوشس کا پیروکار نہ تھا۔ جانے کتنی نسلوں کے لوگ اس معبد میں کنفیوشس کے نام پر نذر پیش کرتے رہے ہیں۔ موجودہ چین کا مذہب اب کنفیوشس مت نہیں ہے۔ اس کے باوجود کون انکار کر سکتا ہے کہ آج کے چین کی اخلاقی بنیادیں کنفیوشس کی ہی استوار کردہ ہیں دنیا کے ان گنت لوگ آج بھی پہلے کی طرح کنفیوشس کے اقوال سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے اقوال پر مبنی کتاب کو عالمگیر شہرت حاصل ہے اور یہ شہرت صرف موجودہ دور کی ہی نہیں بلکہ اسے یہ شہرت صدیوں سے حاصل ہے۔ زمانے میں ان گنت تبدیلیاں آئیں، انسانوں کے مزاج اور عقائد تبدیل ہوئے۔ کنفیوشس کے بعد کتنے ہی خدا کے فرستادہ بنی اور پیغمبر اس دنیا میں انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے آئے لیکن کنفیوشس کی تعلیمات ان گنت لوگوں کی اخلاقی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

کنفیوشس کا سن پیدائش ۵۵۱ ق۔ م ہے۔ کنفیوشس ایک گاؤں میں پیدا ہوا جو موجودہ چین کے صوبے شان ننگ میں واقع ہے۔ کنفیوشس کا والد ایک بہادر اور ممتاز سپاہی تھا۔ کنفیوشس کی عمر تین برس تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ کنفیوشس کا حسب نسب قدیم چینی شاہی خاندان سے جا ملتا ہے۔ کنفیوشس کی عمر ۱۹ برس کی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی۔ اس شادی کے نتیجے میں وہ ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کا باپ بنا۔ اپنی شادی کے

زمنے میں کنفیو شس غلے اور اناج کے سرکاری گوداموں اور میٹھیوں کا انچارج تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی کہ جب اس نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا۔ پھر یہی اس کی عمر کا سب سے اہم مصروفیت مٹھری۔ اس کی دانش کی شہرت جلد ہی پورے چین میں پھیل گئی۔ اس کے شاگردوں اور ماننے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم ہو گیا۔ ہر شخص اس کا احترام کرنے لگا۔ نہ صرف اس کے اپنے صوبے کے حکمران اور بادشاہ بلکہ دوسرے صوبوں کے حکمران بھی مشوروں کے لیے اس کی طرف رجوع کرنے لگے۔

۱۵۰ ق۔ م میں ڈیوک لو نے کنفیو شس کو چینگ تو شہر کا گورنر مقرر کر دیا یہاں اس کی تعلیمات نے عملی جامہ پہنا تو اس صوبے کی ترقی میں معجزانہ تبدیلیاں ہوئیں ایک برس کے بعد اسے وزیر تعلیمات مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد اسے جرائم کے شعبے کا وزیر بنا یا گیا۔ تین برسوں تک وہ اپنی تعلیمات اور اصلاحات کی وجہ سے عوام کی آنکھوں کا تارہ بنا رہا وہ جس صوبے میں بھی ہوتا وہ صوبہ انقلابی تبدیلیوں کے بعد خوش حال ہو جاتا۔ اس کی ان کامیابیوں نے حاسدوں کو پیدا کیا جو دوسرے صوبوں کے حکمران تھے اور کنفیو شس کی بے مثل خدمات اور ان کے نتائج سے جلنے لگے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے صوبوں میں ایسی تبدیلیاں اور خوش حالی لانے میں ناکام رہے تھے۔ حاسدوں نے ڈیوک لو کے کان بھرنے شروع کیے جس کے نتیجے میں کنفیو شس کو ڈیوک لو کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے۔ ۴۹۷ ق۔ م میں کنفیو شس اپنی سرکاری اور انتظامی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا۔ اس زمانے میں جو سرکاری ذمہ داریوں سے آزادی کا زمانہ تھا۔ کنفیو شس نے اس صوبے کی تاریخ قلم بند کی جو ۲۲ ق۔ م سے ۴۸۱ ق۔ م کا اٹھ کر لے ہے۔ اس زمانے میں کنفیو شس نے چین کا دورہ کیا۔ وہ ہر جگہ اپنی تعلیمات کا درس دیتا رہا۔ یوں ایک طرح سے پورا چین ہی اس اگلی زندگی میں اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ نئے ڈیوک لو نے اس کو پھر سے انتظامی ذمہ داریاں سونپنے کی کوشش کی لیکن کنفیو شس کو اب ان سے کوئی رول چسی باقی نہ رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری برس اپنی تعلیمات کے درس اور چینی موسیقی کی تشکیل نو پر صرف کیے۔ کنفیو شس کا انتقال ۴۸۱ ق۔ م میں ہوا۔

کنفیوٹشس ایک نئے نظام فلسفہ کا بھی داعی تھا لیکن اس کی تعلیمات کو مذہب کی صورت دے دی گئی۔ کنفیوٹشس کے اقوال اس کی موت کے بعد اس کے شاگردوں نے جمع اور مرتب کیے اور یہ ایک مذہب کا صحیفہ بن گئے۔

کنفیوٹشس کو سمجھنے کے لیے اگر چین کے اس عہد کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو خاصی مدد ملتی ہے۔ کنفیوٹشس جس زمانے میں پیدا ہوا اور اس نے زندگی بسر کی۔ اس عہد میں جاگیر دارانہ نظام رائج تھا۔ ملک میں کئی جاگیر دار حکمران بن بیٹھے تھے۔ اس دور میں استادوں کی بے حد تحریم کی جاتی تھی۔ یہ استاد زیادہ تر زبانی ہی درس دیتے تھے۔ کتابیں نہیں لکھتے تھے اس کے باوجود بعض ایسی کتابیں اس دور میں پڑھی جاتی تھیں جن کو اس زمانے میں بھی کلاسیک کا درجہ حاصل تھا ان میں قدیم تحریریں جو قدیم بزرگوں نے لکھیں اور نظمیں۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چین میں شاعری کی روایت بہت قدیم اور پختہ ہے۔ شاعری صرف ایک وسیلہ نہ تھا کہ جس کے ذریعے شاعر اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کرتے تھے بلکہ چینی شاعری کی روایت یہ ہے کہ وہ فطرت کے بے حد قریب ہوتی ہے۔ اور فطرت کے حسن کو اپنے اندر سمونے کی خلاقانہ کامیاب کاوش ہے۔ شاعری کا اثر اس معاشرے پر بہرہ گیر تھا۔

کنفیوٹشس کے زمانے کا چین۔ مذہب اور دیوتاؤں کے تصور سے خالی نہ تھا۔ آسمان کو سب سے بڑی حیثیت حاصل تھی۔ روجوں، بھوتوں، پرلیوں، آسیوں اور اشیاء کی تہجیم کو مانا اور پوجا جاتا تھا۔ عناصر فطرت کی بھی عبادت کی جاتی تھی۔ لیکن کنفیوٹشس کی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کنفیوٹشس کو اپنے عہد کے ان عقائد سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ کنفیوٹشس کی تعلیمات کی روح۔ اخلاقی اعمال اور تربیت سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ تعلیم دیتا ہوا ملتا ہے کہ اخلاقی اقدار کو کس طرح اپنایا جاسکتا ہے۔ اخلاقی سے کس طرح انسانی بلندی حاصل کر سکتا ہے۔ اخلاقی اصولوں اور آداب کو اپنا کر انسان بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے اس اعتبار سے دیکھیں تو کنفیوٹشس کی تعلیمات اور نظریات اس کے اپنے عہد کے مذہبی نظریات سے بالکل مختلف اور جدا گانہ تھے۔ کنفیوٹشس کے ایک شارح اور مفسر جیمز آر۔ ویبر نے لکھا ہے:-

اس دور کے مذہبی عقائد نے کمزور گنجلک اور ناقابل تشریح ہو چکے تھے کہ جب کنفیوٹس اخلاقی تعلیمات کا درس دینے لگا تو اس کی تعلیمات کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور پھر لوگوں نے قدیم مذہبی عقائد کو چھوڑ کر کنفیوٹس کی تعلیمات پر یعنی ایک نئے مذہب کی بنیادیں کھڑی کر دیں۔

یہ کنفیوٹس ہی تھا جس کی تعلیمات کے اثر سے دنیا کی ایک بڑی تہذیب نے جنم لیا، جسے چینی تہذیب کہا جاتا ہے۔ زمانہ بہت بدلا ہے اور کئی انقلاب آچکے ہیں اس کے باوجود چینوں کے مزاج اور ان کی تہذیب میں کنفیوٹس کی تعلیمات کے اثرات ختم نہیں ہو سکے اور نہ ہو سکیں گے۔

صدیوں پہلے چین کے اس عظیم اخلاقی معلم نے کہا تھا۔ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسرے کے لیے ہی پسند کرو۔ جو چیز تمہیں ناپسند ہو وہ کبھی دوسرے کے لیے موزون نہ سمجھو۔ ذرا غور کیجیے تو آپ کو کنفیوٹس کا یہ قول اس کے بعد کنے والے کتنے ہی برگزیدہ انسانوں کے اقوال اور تعلیمات میں اپنے آپ کو دہراتا ہوا ملے گا۔

کنفیوٹس کے اقوال

ذیل میں کنفیوٹس کے کچھ اقوال پیش کیے جا رہے ہیں۔ انہیں چینی زبان سے انگریزی میں حیرت آردیر نے ترجمہ کیا اور کئی صورت میں شائع کیا ہے۔

۱۔ تیز طرار گفتگو، دوسروں کو جان بوجھ کر متاثر کرنے والے آداب سے کوئی شخص بڑا آدمی نہیں بنتا۔ تین بار میں اپنا محاسبہ کرتا ہوں، اور یہ جائزہ لیتا ہوں کہ کیا میں دوسرے لوگوں کے کاموں سے جی تو نہیں چرا رہا؟ کیا میں اپنے دوستوں سے فریب تو نہیں کر رہا؟

۲۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو کچھ مجھے سکھایا گیا ہے، میں اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام تو نہیں ہوں۔

۳۔ جب کسی شخص کا باپ زندہ ہو تو اس شخص کے مقاصد کا مشاہدہ کرو۔ جب اس کا باپ مر جائے تو اس کے اعمال کا جائزہ لو وہ اپنے باپ کی موت کے تین برس بعد بھی اپنے

اند کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔ تو پھر وہ سپامرو ہے۔ آپ اس آدمی کو کیا نام دیں گے جو اگرچہ عزیز ہے۔ لیکن غرضاً مد نہیں کرتا اور اس آدمی کو کیا کہیں گے جو اگرچہ امیر ہے لیکن منکبر نہیں۔

لیکن نہیں۔ ایک تیسرا آدمی بھی ہے۔ یہ وہ ہے جو عزیز ہے اور سرد رہتا ہے، اور جو امیر ہے، لیکن اپنی انسانی اور اخلاقی روایات کو فراموش نہیں کرتا۔

۴۔ میرا اس بات سے کچھ علاقہ نہیں کہ کوئی شخص مجھے کیوں نہیں جانتا مجھے تو اس بات سے دل چسپا ہے کہ میں اسے کیوں نہیں جانتا۔

۵۔ جب آپ کسی اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز ہوں تو آپ کو شمالی ستارے کی طرح بن جانا چاہیے۔ یہ ستارہ ہمیشہ اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے۔ حرکت نہیں کرتا اور دوسرے ستارے اس کے گرد چھوٹ ڈال دیتے ہیں۔

۶۔ "نظئیں" (چین کی کلاسیک) کی تین سونظموں کا خلاصہ ایک جملے میں یوں ہے۔
 - ہمارے خیالات راستی پر مبنی ہونے چاہئیں۔

۷۔ اگر کسی انتظامی قانون کے تحت سب لوگوں کو سزا دینے کے معاملے میں یکساں سلوک کا مستحق سمجھا جائے تو وہ آئندہ کے لیے جرم نہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لیں گے لیکن وہ احساسِ ندامت سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم کسی اخلاقی نظام کے تحت سب انسانوں کو یکساں سمجھیں اور ان کو جرم کے ضمن میں سزا بھی یکساں دیں تو وہ احساسِ ندامت کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے اپنی اصلاح کر لیں گے۔

۸۔ جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں۔ اخلاقی آداب و رسوم کے تحت ان کی خدمت کریں۔ جب وہ فوت ہو جائیں تو اخلاقی رسوم کے تحت ان کو دفن کریں اور اس کے بعد ان کی یاد میں اخلاقی روایات کے تحت نذرانے پیش کرتے رہیں۔

۹۔ آج کے دور میں فرماں بردار ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے والدین کی کفالت کر رہا ہو۔ لیکن یہی شخص اپنے کتوں اور گھوڑوں کی خوراک، غذا اور دیکھ بھال کا بھی نوکفیل ہوتا ہے۔ اصل چیز تو وہ فرق ہے جو وہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان روا رکھتا ہے۔

۱۰۔ عظیم انسان کی تعریف یہ ہے کہ پہلے وہ خود دوسروں کے لیے مثال بنتا ہے پھر

دوسروں کو تقلید کی دعوت دیتا ہے۔

ۛ۔ بڑا آدمی آفاقی نقطہ نگاہ رکھنے کی وجہ سے غیر جانبدار ہوتا ہے۔ چھوٹا آدمی جانبدار ہوتا ہے اور اس کا نقطہ نظر آفاقی نہیں ہوتا۔

ۛ۔ کیا میں آپ کو بتا دوں کہ علم کیا ہے؟ علم ان دونوں باتوں کے جاننے کا نام ہے کہ آپ کیا جانتے ہیں اور آپ کیا نہیں جانتے۔

ۛ جس حد تک ممکن ہو، علم حاصل کریں، سیکھیں، اس کے بعد جو کچھ نافع اور مشکوک ہے اس کو ایک طرف ڈھیر کر دیں۔ تب آپ کو غلطی کرنے سے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ جس حد تک ممکن ہو، دنیا کا مشاہدہ کریں اور سیکھیں۔ اس کے بعد جو کچھ غیر موزوں ہے اسے ایک طرف رکھ دیں یوں آپ کو کبھی اپنے اعمال کی وجہ سے معذرت نہ کرنی پڑے گی۔ اپنی زبان کو کوتاہی اور غلطی سے، اپنے اعمال کو معذرت سے آزادی دلائیں۔ یہی کار خیر ہے جو کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ۛ۔ اگر آپ بے ایمان اور بے انصاف حکام کی جگہ منصف اور ایماندار لوگوں کو لائیں گے تو لوگ آپ کی عزت کریں گے اور مطیع ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ایماندار اور منصف حکام کی جگہ بے ایمان اور بے انصاف حکام کو لاکھڑا کریں گے تو پھر لوگ نہ آپ سے حواش ہوں گے نہ مطیع رہیں گے۔

ۛ۔ بزدلی اصل میں یہ ہے کہ آپ حق کے لیے آواز نہ اٹھا سکیں۔

ۛ۔ آپ کو بھیڑ سے محبت ہے اور مجھے قربانی سے۔

ۛ۔ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ مذاکرات پسند نہیں کرتا جو اپنے سجدے اور پھٹے گونے

لباس پر شرمندہ ہو۔

ۛ۔ بڑا آدمی وہ ہے کہ جو دنیا کے بارے میں یہ رویہ اپناتا ہے کہ کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتا

لیکن انصاف کے لیے وہ متعصب اور سخت گیر بن جاتا ہے۔

ۛ۔ چھوٹے آدمی کو مرعات اور مفادات سے غرض ہوتی ہے۔ بڑے آدمی کو اصولوں

اور ضوابط کا پاس ہوتا ہے۔

ۛ۔ وہ شخص جو اپنے تمام اعمال کو صرف اپنے مقاصد اور مفاد کے لیے وقف کر دیتا ہے

اس کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ۛ۔ اس بات پر کبھی نہ کڑھیے کہ آپ اعلیٰ اعمدے پر فائز نہیں۔ ہمیشہ اس بات پر دھیان دیں کہ آپ کو جو فرض سونپا گیا ہے وہ بخوبی انجام پائے۔ آپ کو کوئی نہیں جانتا تو پریشان نہ ہوں اپنے آپ کو اس قابل بنانے پر توجہ دیجئے کہ لوگ آپ کو جاننے لگیں۔

ۛ۔ جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں، آپ کو مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے جانے کی ضرورت نہیں۔

ۛ۔ وہ جو اپنے ساتھ محکم اور سخت رویہ رکھتا ہو وہ کبھی نہیں گرتا۔

ۛ۔ بڑے آدمی گفتگو میں دھیمے اور عمل میں تیز ہوتے ہیں۔

ۛ۔ میں ابھی تک ایسے شخص سے نہیں ملا جو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو طرم بھی سمجھتا ہو۔

ۛ۔ ہمارے استاد کنفیوشس نے ایک دن اپنے شاگردوں سے سوال کیا مجھے بناؤ کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش اور آرزو کیا ہے؟

چانگ یونے جواب دیا میں شاندار گاڑیوں، گھوڑوں اور شاندار ملبوسات کی خواہش رکھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ اتنی افزائے ہوں کہ میں انہیں اپنے دوستوں میں تقسیم کر سکوں اور اگر وہ ان کو ضائع بھی کر دیں تو مجھے اپنے دوستوں پر غصہ نہ آئے۔

ۛ۔ بن ہونی نے کہا میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اپنی قابلیت کی بڑے ہانگوں۔ میرے اچھے اعمال کبھی لوگوں پر ظاہر نہ ہوں۔

استاد نے کہا میری خواہش کوئی پوچھے تو یہ ہے کہ میں بوڑھوں کو ہمیشہ تحفظ دے سکوں اپنے دوستوں کا ہمیشہ وفادار رہوں اور اپنے چھوٹوں سے ہمیشہ شفقت برتوں۔

ۛ۔ جب یوآن شین کو ایک بڑا اعمدہ سونپا گیا تو اس کے مہاندھن میں طے والے اناج کو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے فرائض تنخواہ لیے لیں اور کرنا چاہتا تھا۔ کنفیوشس نے اسے مشورہ دیا۔

”تمہارا یہ عذر بھی غلط ہے اپنی تنخواہ ضرور وصول کرو اور اپنے غریب پر دوستی کو دیدو۔“

ۛ۔ وہ شخص جو راستی سے زندگی بسر نہیں کرتا۔ اگر وہ تباہ نہیں ہوتا تو غیر معمولی طور پر خوش قسمت واقع ہوا ہے۔

ۛ۔ چیزوں کا خاموشی سے مشاہدہ اور مطالعہ کرو۔ اور کتنا ہی پڑھ جاؤ اشتیاق اور لگن کو برقرار رکھو۔ دوسروں کو تعلیم دینے سے کبھی نہ ٹھکنا چاہیے۔

ۛ۔ جس روز استاد (کنفیوشس) کسی کی تدفین میں شرکت کرتا تھا۔ اس روز وہ موسیقی نہ سنتا تھا۔

ۛ۔ دولت کے حصول کے لیے لوگ حقیر اور نیچ کام تک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود دولت نہیں ملتی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان اپنے قدیم دانشوروں کی تعلیم کو سامنے رکھے اور دولت سے مستغنی ہو جائے۔

ۛ۔ گوشت کے بغیر سبزی کھانا پڑے، پینے کے لیے صرف پانی ملے۔ سونے کے لیے تکیہ نہ ہو بلکہ اپنے بازو کو ہی تکیہ بنانا پڑے۔ یہ حالت بہتر ہے اس دولت سے جو بے انصافی سے حاصل کی گئی ہو۔

ۛ۔ میں پیدا ہوا تو مجھے یہ علم نہ تھا کہ مجھے تمہیں کیا تعلیم دینی ہے۔ میں نے ماضی کے علم کو دریافت کیا اور جان لیا کہ مجھے کیا درس دینا ہے۔

ۛ۔ تم سب شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے کچھ چھپا رہا ہوں میرا کوئی راز نہیں ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس میں دوسروں کو شریک نہ کر سکوں۔

ۛ۔ ہمارے استاد کنفیوشس کی تعلیم کے چار بنیادی نکات ہیں۔

ادب (لٹریچر)، اخلاقی رویہ، اعمال، وفاداری اور ذمہ داری۔

ۛ۔ ہمارے استاد (کنفیوشس) نے کبھی کسی بیٹھے ہوئے پرندے پر تیر نہیں چلایا۔

ۛ۔ بڑا آدمی ہمیشہ مطمئن رہتا ہے۔ چھوٹا آدمی ہمیشہ ڈالواں ڈول۔

ۛ۔ لوگوں کو کسی کی اطاعت کرنا تو سکھایا جاسکتا ہے لیکن یہ نہیں سکھایا جاسکتا کہ وہ اس

نظام کو سمجھ بھی سکیں۔

ۛ۔ وہ جو کہ شجاعت کا رسیا ہے لیکن غربت کی شکایت کرتا رہتا ہے ایسا شخص بدامنی

کا سبب بنتا ہے ایسے آدمی کا ملنا محال اور ناممکن ہے جو تین برس تک مسلسل علم حاصل کرے اور سرکاری نوکری کا سوا ہاں نہ ہو۔

ۛ۔ دوسرے شخص کو کسی مداخلت کے بغیر کام کرنے دو۔

ۛ۔ مطالعہ اس طرح کرو کہ تم علم پر کبھی حاوی نہ ہو سکو گے اور ہمیشہ اس خون میں مبتلا رہو

کہ تم نے جو پڑھا ہے وہ کہیں ضائع نہ کرو۔

ۛ۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ بعض سچ پودا نہیں بنتے اور ضائع ہو جاتے ہیں اور کیا یہ بھی

سچ نہیں ہے کہ بعض پودوں کو مچھول نہیں لگتے۔

ۛ۔ مجھے بالوئی آدمی اچھا نہیں لگتا۔

ۛ۔ بڑا آدمی نہ پریشان ہوتا ہے نہ خوفزدہ۔

ۛ۔ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنی خوبیاں دوسروں میں منتقل کرتا ہے۔ اور اپنی برائیوں اور

کوٹاہیوں کو دوسروں سے دور رکھتا ہے۔

ۛ۔ اگر آپ کسی چھوٹی چیز پر نظر لگائے بیٹھے ہیں تو بڑی چیز آپ کو کبھی نہ ملے گی۔

ۛ۔ وہ جو صرف اپنی آسودگی اور آرام کا خیال رکھتا ہے۔ آدمی نہیں ہے۔

ۛ۔ بڑا آدمی تھوڑے الفاظ اور زیادہ کارناموں کا مالک ہوتا ہے۔

ۛ۔ وہ جو اعلیٰ اعمدوں پر فخر کرتا ہے، اگر وہ اخلاقیات کے پابند ہیں تو وہ آسانی سے

لوگوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ۛ۔ بڑا آدمی ہمیشہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی شکایت کرتا رہتا ہے۔

ۛ۔ بڑے آدمی کا ہر مطالبہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ چھوٹا آدمی دوسروں سے مطالبہ کرتا ہے۔

ۛ۔ وہ آدمی جو مختلف راستوں پر چل رہے ہوں وہ ایک دوسرے سے مشورہ کیلئے

کر سکتے ہیں؟

ۛ۔ ہم دوسروں کے بارے میں اندازہ لگاتے رہتے ہیں کہ وہ کس قدر وقیمت کے

مالک ہیں۔

ۛ۔ ہماری عادات ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جاتی ہیں۔ وہ جن میں کبھی کوئی

تبدیلی نہیں آتی، ولی ہوتے ہیں یا احمق۔

پ۔ وہ جوان کج مقدر کی پہچان نہیں رکھتا وہ بڑا آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ جو اخلاقی

روایات اور رسوم کا خیال نہیں کرتا وہ زندگی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتا۔ وہ جسے الفاظ کی قدر و قیمت کا علم نہیں۔ وہ انسانوں کو سمجھ نہیں جان سکتا،۔

دھماپد

”دھماپد“ مہاتما بدھ کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔

دھماپد۔ پالی زبان میں ہے جو سنسکرت سے بے حد قریب ہے۔ سنسکرت کا ایک لفظ ”دھرم“ جو معنی رکھتا ہے وہی معنی ”دھما“ کے ہیں اور اس کے معنی ہیں صداقت۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل جو مقدس کتابیں لکھی ہیں وہ پالی زبان میں ہیں اور پالی زبان سے ہی ان کا ترجمہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہوا ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل یہ مقدس کتابیں پالی زبان میں مسمری لنگا، برما اور انڈونیشیا میں لکھی گئیں۔ بعض ماہرین لسانیات کا فیصلہ ہے کہ پالی اور سنسکرت دونوں زبانیں اسی طرح ایک دوسرے سے متعلق اور مربوط ہیں جس طرح اطالوی اور لاطینی زبانیں صدیوں کا فرق ہے۔ ”دھرا“ پالی میں ”دھما“ بن جاتا ہے اور ”زوان“ پالی زبان میں ”نہانا“۔

”دھماپد“ کا مفہوم یوں ہوا۔ دھرم کا راستہ، صداقت کا راستہ.... مہاتما بدھ کی تعلیمات میں پد (PATH) کے معنی بہت وسیع ہیں۔ پد۔ یہاں وہ راستہ ہے جو لٹوکو کاری، سچائی، صداقت اور نیکو کار راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو دراصل خود انسان بناتا ہے۔ جو چلتا ہے۔ قدم رکھتا ہے اور راستہ بنتا چلا جاتا ہے۔ یہ انسان کے اعلیٰ اعمال سے بننے والا راستہ ہے۔ روشنی کا راستہ، صداقت مطلق کا راستہ، اور بدھ کی تعلیمات کے حوالے سے ”زوان“ کا راستہ.... عرفان کا راستہ۔ اس راستے پر چلنے والے کو ”زوان“ یا عرفان حاصل ہوتا ہے وہ ”دھیلدھیبھ“ خرچ کیے بغیر ملتا ہے۔

مہاتما بده کی زندگی کے بارے میں میں یہاں تفصیل سے نہیں لکھوں گا۔ گوتم جس کا زمانہ ۴۸۳ - ۵۶۲ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ شہزادہ ستھا اور اپنی تلاش میں اپنے محل، اپنے راج، باپنی بیوی، اپنا بیٹا اور ساری آسودگیوں اور آسائشیں چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ مطلق سچائی کی تلاش میں تھا۔ اپنی اس تلاش میں اس نے چھپے فزکر نہیں دیکھا۔ اس کی یہ لافانی کش مکش، جدوجہد اور جستجو چھ برس تک جاری رہی۔ بالآخر چھ برسوں کی جدوجہد کے بعد یاکوس ہو کر آگیا۔ میں برگد کے درخت کے نیچے اس عزم کے ساتھ بیٹھ گیا کہ یا تو وہ مر جائے گا یا پھر ابدی زندگی حاصل کر کے رہے گا۔ اس کی تپسیا، سچیل ہونے کا لمحہ آچکا تھا اور پھر:

تاریخی چھٹ گئی۔ اور گوتم نے پہرہ دیکھا۔ چار عظیم سچائیاں اس پر منکشف ہوئیں اور تکمیل کرنے والی آٹھ آٹھ سوجوبوں کا راستہ دیکھا۔ توازن کا راستہ پایا۔ اسے نردان حاصل ہوا اور وہ گوتم سدھارتھا سے مہاتما بده۔ جاگ ہوئی روح، نردان پانے والا بن گیا۔

مہاتما بده کی تعلیمات کا ایک مجموعہ دھما پدہ کے نام سے مرتب ہوا۔ یہ بده کی تعلیمات کی بنیادی مقدس کتاب ہے۔ دھما پدہ کی ترتیت و تدوین کا زمانہ تین سو سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ جب بده نے نردان حاصل کیا تو نہیں بنایا جاتا ہے۔ اس نے اپنے نردان پانے کی مسرت کا اظہار جن الفاظ میں کیا۔ وہ دھما پدہ میں موجود ہیں۔ مہاتما بده نے کہا تھا:

”میں نے یونہی بے کار میں زندگی اور موت کے خالی کو تلاش کرنے کے لیے کسی جہنم لیے اور مسلسل گردش میں رہا۔ زندگی کا الم کتنا بے بہا ہے کہ بالآخر میں مرنا ہے لیکن اب میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ اے - مہمار، اے خالق اب تم اس گنہ گرو کو مزید تعمیر نہ کر سکو گے۔ گناہ کے شہتیرے ٹوٹ چکے ہیں۔ جہالت کا ستون تباہ ہو گیا ہے۔ ترغیب کا بنجار اتر چکا۔ کیونکہ میرے ذہن نے نردان کی ابدی مسرت کو پایا ہے۔“

دھما پدہ کا جو ترجمہ میرے سامنے ہے اس کو پالی زبان سے جوآن ماسکو نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ جوآن ماسکو نے اس ترجمے کے ساتھ ایک دیباچہ اور دھما پدہ کا تعارف بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ فارسیں جو دھما پدہ پڑھنے کے

خزاں ہوں وہ جوآن ماسکو دکا تجربہ پڑھیں۔

دنیا کے تمام بڑے مذاہب اور خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی تعلیم کا جوہر اور ماحصل ایک ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات بھی صرف بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ ہر انسان ان تعلیمات پر عمل کر کے اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔ جوآن ماسکو اس حوالے سے اس دیا چے میں لکھتا ہے:-

”ہم جانتے ہیں کہ کتنی ہی مقدس کتابیں ہیں۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ مذاہب بھی مختلف ہیں۔ لیکن اگر ہم ان مقدس کتابوں کا مطالعہ احتیاط، دقت نظر سے اور روحانی صفائی سے کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ ان سب کا اخلاقی اور روحانی جوہر ایک ہے۔ کائنات کی سچائی، لادبی طور پر ایک ہے۔ جس طرح سائنس، شاعری، مذہب اور انسانیت کی روح بھی ایک ہے اور بدھ نے بھی اسی ایک سچائی کو دریافت کیا۔ اس کا نردان حاصل کیا۔“

”دھما پد“ نثر میں نہیں ہے۔ اس کا اظہار شعری ہے۔ اس حوالے سے جوآن ماسکو نے خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

”سائنس زمین پر چلتی ہے۔ جبکہ شاعری زمین کے اوپر اڑتی ہے۔ انسان کی ترقی کے لیے دونوں ناگزیر ہیں۔ لیکن ہم خوب صورتی، جمال، محبت، خیر اور صداقت کو مایکلو سکوپ سے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کو تو ہم شاعری کے حوالے سے ہی جان سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی سائنس پُرانی ہو جاتی ہے۔ جب کہ ماضی کی شاعری کبھی پُرانی نہیں ہوتی۔ جب ہم ”دھما پد“ پڑھتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات سے متعارف ہوتے ہیں تو ہمارے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو ہمیں دوسرے بڑے مذاہب اور پیغمبروں نے بھی دی ہے۔ یہ درست ہے کہ مہاتما بدھ کے ماں، مابعد الطبیعیاتی مسائل کو سرے سے ہی چھوڑ نہیں گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ بدھ ہمیں جو راستہ دکھاتا ہے، اگر ہم اس پر چل نکلیں تو ہمیں خود ہی ان سوالوں کا جواب مل سکتا ہے کیونکہ ان تعلیمات پر عمل کرنے کے بعد جو ”نردان“ یا عرفان حاصل ہوتا ہے اس میں سب

کچھ موجود ہے۔ ہر سوال کا جواب۔

چھوٹا منہ بڑی بات، والی بات ہے۔ لیکن میں یہ اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ
 ”دھماپد“ کا مطالعہ کرنے کے بعد بدھ کی تعلیمات کے ڈانڈے ہمارے اسلامی تصوف کے
 ”مسکب وحدت الوجود“ سے ہم آہنگ اور یک جان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں سمجھتا
 ہوں کہ ”دھماپد“ کا مطالعہ اس نظریے سے بھی کرنا چاہیے۔

”دھماپد“ کے حوالے سے مہاتما بدھ کی تعلیمات کا جو سر یہ سامنے آتا ہے کہ ”وہ نہ کرو
 جو شر ہے وہ کرو جو خیر ہے۔ اپنا ذہن پاک رکھو۔ یہی بدھ کی تعلیم ہے۔“ (دھماپد)
 اس سلسلے میں ایک کہانی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مسلح شخص نے
 ایک بار طویل سفر اس مقصد کے تحت کیا کہ وہ بدھ کے کسی پیروکار سے ملے گا اور اس
 سے استفادہ کرے گا کہ کیا اسے مہاتما بدھ کی تعلیمات سے لڑا جاسکتا ہے۔ طویل سفر کے
 بعد وہ بدھ کے ایک نامور بھکشو اور پیروکار سے ملا۔ اس نے مسافر سے کہا بدھ کی تعلیم
 یہ ہے کہ جو بُرا ہے وہ نہ کرو۔ جو خیر ہے اس پر عمل کرو۔ اپنا ذہن ہمیشہ پاک رکھو۔ اس مسلح
 شخص نے جو لمبا سفر کر کے آیا تھا کہا: بس یہی اس کی تعلیم ہے؟ یہ تو ہر پانچ برس کا بچہ
 بھی جانتا ہے۔ اس بھکشو نے جواب دیا۔

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن اسی برس کے بھی چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جو اس
 پر عمل کر سکتے ہوں۔“

”دھماپد“ کا ترجمہ دنیا کی ہرزبان میں ہو چکا ہے۔ دھماپد کی تعلیمات کی بازگشت موثر
 انداز میں دنیا کی ہر مذہبی کتاب اور پیغمبروں کی تعلیمات میں سالی دیتی ہے۔ کیونکہ دھماپد
 کی تعلیمات ہر مقدس کتاب اور پیغمبر کی تعلیمات کے ساتھ مربوط ہیں۔ ایک ہیں
 ”دھماپد“ دانش کا بے مثل مجموعہ ہے۔ ”دھماپد“ میں مردانہش کی تعریف یوں ملتی ہے۔
 ”جس طرح جھیل کا پانی پاک ہوتا ہے، پرسکون اور گہرا، اسی طرح مردانہش کی روح
 ہوتی ہے۔“

”دھماپد“ کے الفاظ صداقت ہیں۔ ”دھماپد“ تاریکیوں میں ذرواں ایک کبھی نہ

مجھنے والی مشعل ہے۔ دھماپہ میں بدھ کی آواز سنتے ہیں جو روشنی اور محبت سے معمور ہے
جولانا نانی ہے۔ ہر عہد پر چھپائی ہوئی ہے۔ گونج رہی ہے۔

ذیل میں دھماپہ کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ دھماپہ جس کی ہر سطر
ایک ستارے کی طرح ہے۔ جو کل کی حقیقت میں ابدیت کی مانند ہے۔ !!

پڑ۔ ہم آج جو ہیں۔ وہ اپنے کل کے خیالات کی پیداوار ہیں۔ اور ہمارے آج کے
خیالات ہمارے کل کو تعمیر کریں گے۔ ہماری زندگی ہمارے ذہن کی تخلیق ہے۔

پڑ۔ اس نے میری امانت کی۔ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ اس نے مجھے شکست
دی۔ اس نے مجھے لوٹ لیا۔ وہ لوگ جو ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ وہ کبھی نفرت سے
نجات نہ پاسکیں گے۔

پڑ۔ اگر کوئی شخص پاک زرد لبادہ اوڑھتا ہے اور اس کی روح ناپاک ہے، اپنے آپ
سے اور سچائی سے ہم آہنگ نہیں تو وہ اس لبادے کا حق دار نہیں ہے۔

پڑ۔ ایک دشمن دوسرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور ایک آدمی جو نفرت
کرتا ہے وہ دوسرے کو دکھ پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا اپنا ذہن گمراہ ہو چکا ہے
تو وہ اپنے آپ کو ناقابل بیان نقصان پہنچائے گا۔

پڑ۔ ایک باپ، ایک ماں، یا رشتے دار کسی ان کا بھلا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ
خود راست رو ہے تو وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ بھلائی دے سکتا ہے۔

پڑ۔ جس طرح شہد کی مکھی پھول کا رس اور خوشبو چوس کر پھول کے حسن کو
مجروح کیے بغیر اڑ جاتی ہے، اسی طرح نیک آدمی دنیا میں گھومتا رہتا ہے۔

پڑ۔ دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو۔ یہ تو دیکھو کہ دوسروں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا
اپنے گناہوں کے باسے میں سوچو اور ان کاموں کا خیال کرو جو تم نے کیے ہیں یا نہیں
کیے ہیں۔

پڑ۔ وہ جو نیکیوں اور خوبیوں سے متصف راستے پر چلتے ہیں۔ جو محتاط ہیں، جن کی
سچی روشنی ان کو آزادی بخشتی ہے۔ ان کا راستہ "مارا" موت کبھی نہ کاٹ سکے گی۔

بڑے۔ یہ میرے بیٹے ہیں۔ یہ میری دولت ہے۔ لیکن احمق اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہیں۔ وہ جو اپنے آپ کا مالک نہیں ہے۔ وہ مچھلا اپنے بیٹوں اور دولت کا مالک کس طرح بن سکتا ہے۔

بڑے۔ ایسے بھی احمق ہوتے ہیں جو ساری عمر کسی مردودانہ کی رفاقت اور صحبت میں رہتے ہیں لیکن وہ دانائی کا راستہ اختیار نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگوں کی مثال اس چمچے کی طرح ہے جو کبھی شراب کا ڈالٹھہ نہیں جان پاتا۔

بڑے۔ وہ احمق جسے اپنی حماقت کا احساس ہو جائے وہ اس اعتبار سے دانابوا۔ لیکن وہ احمق جو اپنے آپ کو دانانا سمجھے وہ دراصل احمق ہے۔

بڑے۔ ایک بڑے عمل کار کو عمل کبھی فرمی طور پر سامنے نہیں آتا جس طرح تازہ دودھ کبھی یک دم نہیں چھٹتا۔ راکھ کے نیچے چھپی ہوئی آگ بھی تڑھوتی ہے۔

بڑے۔ اس آدمی کی قدر کرو جو تمہاری خامیوں سے تمہیں اس طرح آگاہ کرتا ہے جیسے وہ چھپے ہوئے خزانے کا پتہ بتا رہا ہو۔ وہ مردودانہ تمہیں زندگی کے خطرات سے آگاہ کرتا ہے اس کی تقلید کرو اور جو کوئی اس کا متقلد بنے گا وہ خیر تک پہنچے گا۔ شر سے بچا رہے گا۔

بڑے۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو وقت کا دریا پار کر کے نردان حاصل کر سکیں۔ بیشتر تو بھاگتے ہوئے دریا کے اس پار ہی گر پڑتے ہیں۔

بڑے۔ لیکن جو قانون اور اصول جانتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ وہ دوسرے کانٹے پر پہنچ جاتے ہیں اور موت کی سلطنت سے نکل جاتے ہیں۔

بڑے۔ مسافر اپنے سفر کے اختتام تک پہنچ گیا۔ مطلق آزادی حاصل کر کے وہ رنج و غم سے نجات پا گیا۔ وہ تجربیوں جنہوں نے اسے جکڑا ہوا تھا وہ سب ٹوٹ پھوٹ گئیں اور زندگی کا جلتا ہوا بخار باقی نہیں رہا۔

بڑے۔ عقل مند اپنے حواس پر اس طرح غالب آتا ہے جس طرح ایک شہسوار اپنے گھوڑوں پر قابو پالیتا ہے اور وہ جو گھٹیا خدمات اور تیجگر میں آزاد ہو جاتا ہے، دلیوتا بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔

ۛ۔ ایک نیک مقدس آدمی جہاں قیام کرتا ہے وہی حقیقت میں قیام مسرت ہے۔ خواہ وہ گاؤں ہو، جنگل، وادی یا پہاڑیاں

ۛ۔ ہزاروں بے کار اور بے معنی الفاظ کے مقابلے میں وہ ایک لفظ بہتر ہے جو سکون بخشتا ہے۔

ۛ۔ ایک شخص ایک جنگ یا ہزاروں جنگیں جیت لے وہ اس آدمی سے بڑا اور بہتر نہیں ہو سکتا جس نے اپنے آپ پر فتح پائی ہو۔ ہزاروں بڑی فتوحات سے بڑی فتح اپنے آپ پر فتح پانا ہے۔ اور جس نے ایسی فتح پائی ہو اسے آسمانوں پر رہنے والے دیوتا اور زمین کے نیچے رہنے والے شیطان بھی شکست نہیں دے سکتے۔

ۛ۔ محبت سے کام لو، اور وہ کرو جو اچھا ہے۔ اپنے ذہن کو ترسے دور رکھو۔ اگر کوئی شخص عمل خیر میں سست رہے تو پھر اس کا ذہن شر میں خوشی حاصل کرنے لگتا ہے۔

ۛ۔ آسمان کی بلندیوں پر، سمندروں کی پہنائیوں میں، نہ ہی پہاڑوں کی اندھی غاروں میں نہ ہی کہیں اور۔ آدمی موت سے بچ سکتا ہے۔

ۛ۔ جب تک برائی اپنا پھل نہیں لاتی، انسان اس بُرائی میں خوش رہ سکتا ہے۔ جب برائی بُھی پھل لاتی ہے تو پھر آدمی بُرائی کو سمجھ لیتا ہے۔

ۛ۔ سلعے وجود خطرے کے سامنے کانپتے ہیں۔ سب موت سے ہراساں رہتے ہیں جب ایک آدمی اس حقیقت کو پالیتا ہے تو وہ نہ کسی کو ہلاک کرتا ہے نہ کسی کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔

ۛ۔ کبھی درشت اور سخت الفاظ نہ بولو۔ کیونکہ اگر ایک بار یہ زبان سے نکلے تو خود قہماری طرٹ پلٹے آئیں گے۔ غصیلے الفاظ دور اور دکھ دیتے ہیں۔

ۛ۔ جب ایک احمق بُرا کام کرتا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ ایسی آگ جلا رہا ہے جس میں وہ خود ایک دن جل مرے گا

ۛ۔ یہاں کوئی کس طرح قہمہ لگا سکتا ہے؟ یہاں کس طرح محبت کا دور دورہ ہو سکتا ہے جبکہ ساری دنیا جل رہی ہو۔ اور جب تم گھوڑا اندھیرے میں ہو گے تو تم چراغ حاصل کرنا نہ چاہو گے۔

ۛ۔ یہ جسم ہڈیوں کا گھر ہے۔ ہڈیاں جن پر گوشت چڑھا اور جن میں خون ہے۔ سب کو اور بنا نفرت اس گھر میں رہتے ہیں اور بڑھا پادرو موت بھی۔

ۛ۔ بادشاہوں کے شاندار محلے ٹوٹ چھوٹ جاتے ہیں۔ جسم بوڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن خیر کی خبر لی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔!

ۛ۔ ہر غلطی یا برائی جو انسان سے سرزد ہوتی ہے اس کے اندر جہنم یعنی اور وہی اس کا سبب ہے اور یہ بُرائی احمق آدمی کو اسی طرح کچل کر رکھ دیتی ہے۔ جس طرح بھاری پتھر۔ سنگریزے کو۔!

ۛ۔ اپنی ذات کے لیے بُرائی کرنا، جو اپنے لیے بُرا ہوا وہ بھی بے حد آسان ہوتا ہے۔ لیکن اچھائی کرنا اور جو اپنے لیے اچھا ہو۔ یہ عمل بہت مشکل ہے۔

ۛ۔ جاگو، اٹھو، دیکھو، سچے راستے پر چلو۔ وہ جو سیدھے راستے پر چلتا ہے۔ اس کے لیے اس دنیا اور اگلی دنیا میں بھی مسرت ہے۔!

ۛ۔ وہ جس کی زندگی کے ابتدائی دنوں جہالت میں بسر ہوئے اور جس نے بعد میں دانش کو پایا۔ وہ دنیا کو اسی طرح روشن کرتا ہے جس طرح چاند جو بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔

ۛ۔ کچھ کبھی دیوتاؤں کے بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا اور احمق کبھی نجات کی تعریف نہیں کر سکے۔ لیکن اچھے لوگ فیاضی میں مسرت حاصل کرتے ہیں۔

ۛ۔ اپنے اعمال اور گفتار سے کسی کو آزار نہ پہنچاؤ۔ کھانے پینے میں اعتدال سے کام لو۔

ۛ۔ آدمی اپنے خوف سے بچنے کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

مقدس درختوں اور خانقاہوں میں پناہ کی تلاش میں جاتے ہیں۔ لیکن کہیں پناہ نہیں ملتی۔

کیونکہ رنج سے مفر نہیں۔ پناہ ہے تو صداقت میں، بددعا کی تعلیمات میں۔

ۛ۔ سنو، مسرت، اور شادمانی کی زندگی بسر کرو۔ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوئے جو نفرت کرتے ہیں۔ نفرت کرنے والے لوگوں میں محبت کے ساتھ رہو۔

ۛ۔ حرص سے بُری کوئی آگ نہیں۔ نفرت سے بُری کوئی بُرائی نہیں۔ ہر آگ بجی کے قفلان سے بڑا کوئی درد اور رنج نہیں۔ اور جو ان کو ٹھکت دیتا ہے وہی آدمی مسرت حاصل کرتا ہے۔

ۛ۔ غصہ ترک کر دو۔ تجربہ چھوڑ دو۔ دکھ اور رنج اس شخص کو چھو بھی نہیں سکتے۔ جو ایسے بندھنوں سے آزاد ہو

ۛ۔ غصے پر امن سے غلبہ حاصل کرو۔ شر پر نیر سے برتری حاصل کرو۔ کمینگی پر فیاضی سے غلبہ پاؤ اور جو جھوٹ ہوتا ہے وہ سچ اپنائے۔

ۛ۔ سچ بولو۔ غصے سے مغلوب نہ ہو۔ جو مانگتا ہے اُسے جو کچھ دے سکتے ہو، دو۔ یرتین اقدام تمہیں دیوتاؤں کے قریب لے جائیں گے۔

ۛ۔ تمہاری زندگی کے درخت پر زرد پتے لٹک رہے ہیں۔ موت کا قاصد انتظار میں ہے۔ تمہیں دُور راز کا سفر طے کرنا ہے۔ کیا اس طویل مسافت کے لیے تمہارے پاس زادراہ ہے؟

ۛ۔ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ جہالت ہے۔ اے انسان! اس گناہ کو دھو ڈالو اور اس گناہ سے پاک ہو جاؤ۔

ۛ۔ ایک آدمی اس لیے عظیم اور بڑا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو ہلاک کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ کسی ذمی روح کو ہلاک نہ کرے۔

ۛ۔ سب کچھ عارضی اور فانی ہے۔ جب انسان یہ جان لیتا ہے تو وہ رنج سے ماوراد ہو جاتا ہے۔ اور یہی سیدھا راستہ ہے۔

ۛ۔ وہ لوگ جو اس وقت ندامت محسوس کرتے ہیں جب انہیں نادام ہونا چاہیے اور وہ جو اس وقت ندامت کا اظہار نہیں کرتے، جب انہیں نادام ہونا چاہیے۔ وہ لوگ ہیں جو بصیرت نہیں رکھتے اور شیب کو جاننے والے راستے پر چل رہے ہیں۔

ۛ۔ زندگی کے راستے میں ایسے سفر کرنا اس سے بہتر ہے کہ ہم سفرِ حقیقی ہو۔!

۸

گھر تھ صاحب

”بانگِ در میں علامہ اقبال کی ایک نظم ہے ”بانگِ“ علامہ اقبال گورو بابا نانک کے
بارے میں اس نظم میں فرماتے ہیں :-
قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
تدر پہچانی نہ اپنے گورہر یکدا نہ کی
آہ! بد قسمت ہے آوازِ حق سے بیخبر
غافل اپنے پھیل کی شیرینی سے ہوتا ہے بخر
اشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو سوز ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شور کے لیے ہندوستانِ غم خانہ ہے
دردانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی محفلِ اغیار میں
بتکہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آفر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اسی طرح علامہ اقبال، بانگ درا کی نظم "ہندوستانی بچوں کا" قومی گیت میں
بابا نانک کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ع

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا!

سکھوں کی مذہبی کتاب، گرنتھ صاحب، کے ذکر کے ساتھ گورو بابا نانک جی کا ذکر
لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کی بابا نانک جی کے بارے میں نظم کا حوالہ
اس لیے ضروری بنتا ہے کہ اقبال کے علاوہ برصغیر کے تمام مفکر اور دانشور بابا نانک جی کو
موتھ سمجھتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا جوہر وحدانیت میں ہے۔ جبکہ ہندو فلسفی، سیاست دان
اور عالم ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ سکھ پنٹھ کو ہندومت کا ہی ایک حصہ ثابت کیا جائے
اور اس طرح جس حد تک ممکن ہو بحیثیت قوم سکھوں کا استحصال کیا جائے۔ جس کا ثبوت
واضح طور پر سکھ قوم کو برصغیر کی تقسیم کے بعد ہو چکا ہے۔

ہندو عقیدے (علماء اسے مذہب نہیں مانتے) اور سکھ مذہب اور ہندوؤں کی مقدس
کتاؤں اور سکھوں کے گرنتھ صاحب کی تعلیمات میں بدیہی فرق اور تضاد ہے۔ ہندو ان گنت
دیوی دیوتاؤں کو مانتے، ان کی مورتیاں بناتے اور ان کی مندروں میں پوجا کرتے ہیں وہ
اپنے دیوی دیوتاؤں کی تجسیم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس سکھ مت پرستی، مورتیوں اور
گروؤں کی تجسیم کو کفر سمجھتے ہیں۔ گوروواروں میں کسی مورتی کی پوجا نہیں کی جاتی۔ جبکہ ہندوؤں
کے کسی مندر کا تصور بھی مورتی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔

بابا نانک، ان کی شخصیت، گرنتھ صاحب اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ دلچسپ

بھی ہے اور بصیرت افزا بھی۔

اسلام اور اسلامی تعلیمات کے اثرات بابا نانک جی اور گرنتھ صاحب اور اس کی
تعلیمات سے صاف عیاں ہیں۔ ہندو علمائے ہمیشہ انہیں جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔ گوگل
چند نارنگ اپنی کتاب "رائسٹار میٹن آف سکھ ازم" میں لکھتے ہیں :-

ALTHOUGH PRECIPITATED BY ISLAM SIKHISM IS NOTHING TO THAT RELIGION . IT IS, ON THE OTHER SIDE A PHASE OF HINDU RELIGIOUS REVIVAL AND HAS IN CONSEQUENCE RETAINED ALL ESSENTIAL FEATURES OF REAL HINDUISM. (P.P.254)

باباناںک کی اور گرنٹھ صاحب کی تعلیمات کی اتنی غلط اور گمراہ کن تفسیر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن بیشتر ہندو علما کا یہی رویہ ہے۔ باباناںک موحد اور گرنٹھ صاحب۔ وحدانیت کا پرچار کرتے ہیں۔ اصنام پرستی کے علاوہ ذات پات کی مکمل نفی سکھ مذہب کا جوہر ہے جن کے بغیر ہندومت کا تصور محال ہے۔ لیکن اس بنیادی فرق کے باوجود بعض روشن خیال سکھ دانشوروں کا بھی یہی خیال ہے۔ خوشونت سنگھ صاحب دانشور بھی اسی خیال اور نظریے کا مؤید ہے۔ خوشونت سنگھ اپنی کتاب 'THE SIKHS' میں لکھتے ہیں:-

THERE IS LITTLE EVIDENCE TO SUPPORT THE BELIEF THAT GURU NANAK PLANNED THE FOUNDING OF A NEW COMMUNITY SYNTHESIZING HINDUISM AND ISLAM HE SIMPLY REFORM HINDUISM. (P.P.45)

میں بڑے عجز سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو گورو باباناںک اور گرنٹھ صاحب کی تعلیمات کا مطالعہ کرے گا وہ خوشونت سنگھ کی اس عالمانہ رائے سے انکار کرے گا۔ ہر وہ شخص جو ہندومت اور سکھ مذہب کی بنیادی تعلیمات کو جانتا ہے وہ اس فرق کو سمجھتا ہے کہ باباناںک پر اسلامی تعلیمات کا اثر بے حد شدید اور گہرا تھا۔ وہ ہندومت کی اصلاح نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ایک نئے مذہب اور قوم کی بنیاد رکھ رہے تھے جس پر اسلام کے گہرے اثرات ہیں۔ لیکن وہ ہندومت کی مکمل نفی کرتا ہے۔

خود باباناںک جی کی زندگی کے متعدد ایسے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں اور پھر گرنٹھ صاحب کی تعلیمات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

سکھ مذہب اور ہندومت کا فرق سمجھنا ہو تو پھر سکھ مذہب کی مابعد الطبیعیات کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

گرنتھ صاحب۔ دنیا کی مذہبی کتابوں میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب ایک خاص پہلو کے اعتبار سے اس کتاب کی مثال نہیں دے سکتی۔ دنیا کی ہر مذہبی کتاب کا ایک خاص مزاج ہے۔ وہ الہامی ہے یا نہیں، یہ مسئلہ اس وقت بحث طلبہ نہیں ہیں لیکن ہر کتاب اپنے پیغمبر اور اپنے مذہب کا خالص مظہر بنتی ہے۔ جبکہ سکھوں کی مذہبی کتاب 'گرنتھ صاحب' میں یہ بات نہیں ہے!

سکھوں کے پانچویں گورو گوروارجن نے گرنتھ صاحب کی تدوین و ترتیب کا ایک عظیم فریضہ ادا کیا۔ اپنے سے پہلے چار گوروؤں کے مرتبہ کاموں کا بھی گوروارجن نے جائزہ لیا۔ گورو بابا نانک جہاں جہاں گئے تھے وہاں گوروارجن نے اپنے نمائندے بھیجے۔ تاکہ ان کے کلام، ان کے فرمودات کو جمع کیا جائے۔ حتیٰ کہ ایک نمائندہ سری لنکا بھی گیا جس کے ہاں میں بتایا جاتا ہے کہ گورو نانک جی نے جو چار اہم سفر کیے تھے۔ ان میں سے ایک کے درمیان میں وہ سری لنکا بھی تشریف لے گئے۔ گوروارجن نے اس مقدس کام کے سلسلے میں فاتی دلپٹی بھیجی لی اور خود تیسرے گورو بابا موہن کے پاس گئے اور ان کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے بھنے میں گوروؤں کی جو تحریریں ہیں وہ انہیں سوئپ دی جائیں۔ لیکن گوروارجن نے گرنتھ صاحب کی ترتیب و تدوین اور یک جانی کے سلسلے میں ایک ایسا کام بھی کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی مذہبی کتاب پیش نہیں کر سکی۔ گرنتھ صاحب میں ہندو جھگڑتوں اور مسلمان صوفیائے کرام کا کلام بھی شامل کر لیا۔

گرنتھ کا یہ نسخہ جو گوروارجن نے تیار کیا اور جس کی ترتیب میں بھالی نے گورواس نے نیابت کی۔ اسے 'آدھی گرنتھ' کا نام دیا گیا۔ ۱۶۰۴ء میں اسے امرتسر کے ہری مندر میں رکھا گیا اور جو پہلا گرنٹی مقرر ہوا اس کا نام بھالی 'بڈھا تھا'۔

بعد میں گورو گو بند سنگھ نے اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر دیا۔ جس میں نوز گورو تیغ بہادر کے شبد بھی شامل کر لیے گئے۔ لیکن گورو گو بند سنگھ نے اس میں اپنے اشوک شامل نہ

کیے۔ تاہم ان کا ایک اشوک کسی طرح گرنختہ صاحب میں باقی رہ گیا۔ (گرنختہ صاحب کے پوسٹ نسخے کی املا خود گورد کو بند سنگھ نے ڈڈمر (ٹوٹو نڈی ساہو) میں خود کرویائی۔)!

گرنختہ صاحب میں گوروؤں کے شبدوں اور اشوکوں کے علاوہ ۳۶ ایسے افراد کا کلام بھی شامل ہے جو سکھ نہ تھے۔ سکھ مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے گرنختہ صاحب دنیا کی عجیب اور بے مثل مذہبی کتاب ہے کہ اس میں ان لوگوں کا کلام بھی شامل ہے جو اس مذہب سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ جن کے اپنے عقائد اور مذاہب تھے۔ لیکن ان کے کلام اور فرمودات کو اب سکھ گرنختہ صاحب کے حوالے سے اپنے عقیدے میں شامل کر چکے ہیں۔ اس سے سکھ مذہب کی وسیع المشربی کا ثبوت ملتا ہے۔

ڈاکٹر جسبیر سنگھ اہلووالیہ نے اپنی کتاب *THE SOVEREIGNTY OF SIKH DOCTRINE* میں تفصیل سے حوالہ دیا ہے کہ تصنیف کے کس کس علاقے کے کس

کس بزرگ کا کلام گرنختہ صاحب میں شامل ہے جس کا اجمالاً یہاں ذکر کرتا ہوں۔
بنگلہ سے بے دیو کا کلام گرنختہ صاحب میں شامل کیا گیا۔ ملتان سے بابا فرید کا کلام گرنختہ میں شامل ہوا۔ ہمارا شرط سے نام دیو، تلوچن اور پرمانند، یوپی (موجودہ اتر پردیش) سے بیسی رامانند سائیں، بھگت کبیر، رومی داس اور بھیکن، راجستھان سے دھنا اور ادودھ سے سور داس وغیرہ کے کلام گرنختہ صاحب میں شامل کیا گیا۔ یہاں میں نے کلام کو وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے۔)

گردیا گرنختہ صاحب میں ۳۶ ایسے بزرگوں کا کلام بھی شامل ہے جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے اور مختلف اقوام اور ذاتوں سے منسک ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ سکھ مذہب وسیع المشربی میں یقین رکھتا ہے اور گرنختہ صاحب دراصل ایک خزانہ ہے جس میں برصغیر کے تمام فرقوں اور مذاہب کے نادر و حسین انکار اور تہذیبی عناصر یک جا کر دیے گئے ہیں۔

بعض محققوں اور مذہبی عالموں نے اس سلسلے میں کچھ اور تشریحات بھی کی ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ اختصار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بابا نانک ایک موحّد تھے۔

اور وہ وحدانیت کا پیغام لے کر آئے۔ ہندومت دیوی دیوتاؤں، اصنام پرستی اور ذات پات کی رنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ باباناہک نے توحید کے حوالے سے انسانیت کو سچی راہ دکھائی بعد میں آنے والے گوروؤں نے اس کو باقاعدہ ایک مذہب کی صورت دی۔ یہ ان کی وسیع فطرت کیسی یا سیاسی ضرورت کہ انہوں نے اپنے مذہب کی طرف دوسروں کو راغب کرنے کے لیے دوسرے مذاہب اور بزرگوں کے کلام کو بھی گزشتہ صاحب میں شامل کر لیا۔ اور اس کے بعد سکھوں نے ایک عظیمہ قوم کی حیثیت سے پختہ جنگیں لڑیں خواہ ان کی نوعیت سیاسی تھی یا مذہبی۔ ان کی بنا پر وہ مزید منظم ہوئے اور آج ایک مارشل ریس مین چکے ہیں۔

گزشتہ صاحب کا ترجمہ کسی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سکھ مذہب نے پنجاب میں جنم لیا۔ گورو باباناہک اور سکھ مذہب کے حوالے سے بیشتر مقدس مقامات اور زیارتیں پاکستان میں ہیں۔ امرتسر میں سکھوں کا سب سے بڑا گورو دارہ ہے اور اس کی بنیاد حضرت میاں میر صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے رکھوائی گئی۔

سکھوں نے برصغیر کی تقسیم اور ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جو کردار ادا کیا، وہ ہمارا منور نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ پچھلے چند برسوں سے گزشتہ صاحب کو ساری دنیا میں بطور خاص متعارف کرایا گیا ہے۔ سکھوں نے اپنے آپ کو شناخت اور دریافت کیا ہے اور اپنے تشخص کو بحال اور قائم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور گزشتہ صاحب کی تعلیمات عام ہو رہی ہیں۔

ایلیڈ

- ایلیڈ "اور" اور ایسی "دنیا" ادب کے دو قدیم ترین رزمیے ہومر کے نام منسوب کیے جاتے ہیں۔

ہومر کون تھا؟

اس کے بارے میں حتمی طور پر کہیں معلومات نہیں ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہومر کا زمانہ ۷۵۰ برس ق۔ م ہے۔ موجودہ عہد کے ایک محقق نے اسے دس صدی ق۔ م کا زمانہ قرار دیا ہے۔

ہومر نے کتنی عمر مانی؟ وہ کہاں کہاں رہا، ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ تہذیب یونان کے پانچ قدیم شہریہ دعوے کرتے ہیں کہ ہومر ان شہروں میں پیدا ہوا تھا۔ ہومر کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اندھا تھا۔

ہومر ایک رومانی اور داستانی کردار لگتا ہے۔ پورے دثوق سے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ایلیڈ اور اور ایسی کا خالق ہومر ہی تھا۔ ایک عرصے تک تو یہ بھی بحث چلتی رہی کہ کب رزمیہ شاعری کے ان عظیم لافانی شہسپاروں کو کسی ایک شاعر نے لکھا تھا یا دو نے یا زیادہ۔ پورے دثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ہومر نے پہلے ایلیڈ لکھی تھی یا اور ایسی ان تمام پر اسرار باتوں کے باوجود۔ ایلیڈ اور اور ایسی، دنیا کے ادب کے دولانانی

شہسکار ہیں۔ صدیوں سے پوری دنیا میں انہیں پڑھا جا رہا ہے۔ متعدد بار ان کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ایلیڈ اور ایسی اور ہومر ساری ٹیکسٹس جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان دونوں رزمیہ شہسپاروں میں سے زیادہ کون رزمیہ پڑھا جاتا ہے اس کے بارے میں

بھی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم ایلیدہ کو بعض پہلوؤں سے اوڈیسی پر فوقیت حاصل ہے۔ ایلیدہ میرے نزدیک ایک ٹریجڈی ہے اور اوڈیسی ایک طرہ پر، دونوں کے تقابلی مطالعے سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایلیدہ میں متاثر کرنے کی صلاحیت اوڈیسی سے کہیں زیادہ ہے۔

اردو زبان اس اعتبار سے بدقسمت ہے کہ ایلیدہ کا اس میں ترجمہ نہیں ہوا۔ البتہ اوڈیسی کا ایک بہت اچھا، بہت خوب صورت، بہت سچا ترجمہ، جہاں گرد کی واپسی کے نام سے محمد سلیم الرحمن نے کیا ہے اور یہ ترجمہ ان کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔!

سکندر اعظم کے بارے میں یہ شہادت بڑے وثوق سے ملتی ہے کہ وہ ایلیدہ کے ایک پُرانے قلمی نسخے کو اپنی اوائل عمری سے ہی بڑا عزیز رکھتا تھا۔ وہ اسے اپنی سب سے قیمتی متاع سمجھتا تھا۔ ایران کی فتح کے بعد کسی نے اس کی خدمت میں لوٹ مار میں ہاتھ لگنے والا ایک بے حد قیمتی اور خوب صورت ڈیڑھ پینٹ کیا جو ہنرمندی کا شاہکار تھا۔ سکندر اعظم نے کہا ایسے خوب صورت بے مثل ڈیڑھے میں کیا رکھوں گا، یہ میرے کس کام آنے گا، پھر خود ہی بولا، "ہاں میرے پاس ایلیدہ کا نسخہ ہے اسی کو اس میں رکھتا ہوں کہ وہی ایک ایسی چیز میرے پاس ہے جو اس ڈیڑھے میں رکھی جاسکتی ہے۔"

صدیوں سے ان گنت انسانوں نے "ایلیدہ" کو عزیز جان بنائے رکھا۔ اسے محبت اور عقیدت سے پڑھا ہے۔ صدیوں سے انسان اس کو پڑھتے اور پسند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ مذہبی کتابیں نہیں۔ اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قبل مسیح کے زمانے کے یونانی ہومر کو اپنی "دینیات" کا خالق سمجھتے تھے کہ اس نے اولمپس پر رہنے والے خداؤں اور دیوتاؤں کے بارے میں ان کو بتایا اور دیوتاؤں کو زمین پر لے آیا۔ "ایلیدہ" ایک ڈرامائی کہانی ہے اس کہانی کا مرکزی کردار ایکلیزر ہے۔ ایکلیزر جو سورا ہے اور انسان بھی اور دیوی دیوتاؤں کی اولاد بھی۔

ایک محقق نے ایلیدہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایلیدہ میں جو کہانی سنائی گئی ہے وہ چالیس سچاس دنوں کے واقعات کے حوالے سے ہیں یہ بتاتا ہے کہ کیا کچھ ہو چکا ہے اور کیا

کچھ ہونے والا ہے۔

ایلیڈ کا آغاز ایکلیئر کی ناراضی اور اس کے اس شدید ردِ عمل سے ہوتا ہے کہ وہ جنگ میں حصہ لینے پر انکار کر کے اپنے خیمے میں ہتھیار کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس کہانی کا ایک پس منظر ہے۔

متحدہ یونانی افواج کے کمانڈر اور شاہ ایگمنان کے بھائی مینیلیوس کی بیوی سبین کو ایلیم کے شہنشاہ پر اہم کامیڈیا پیرس اغوا کر لیتا ہے۔ ایلیڈ میں سبین کی زبانی بتایا جاتا ہے کہ وہ انیس برس تک پیرس کی جائز بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہی ان ۱۹ برسوں میں دس برس کا طویل عرصہ وہ ہے جو جنگ کا ہے۔

سبین کی واپسی کے لیے شہنشاہ ایگمنان یونانی تاجداروں اور سرداروں کی فوج جمع کرتا ہے اور ایلیم پر لشکر کشی کرتا ہے شہنشاہ ایگمنان اور اس کے حلیف ایچسین کہلاتے ہیں۔ اور اہل ٹرائے، ٹرڈجن ایچسن کا پلہ اس طویل جنگ میں مہجاری رہتا ہے وہ ایلیم کے بہت بڑے علاقے کو فتح کر چکے ہیں۔ کسی قبضوں، شہروں اور بستیوں کو تاراج کر چکے ہیں۔ ایلیم کا محاصرہ ہو چکا ہے۔ ایچسین کو جو برتری حاصل ہے اس کا اعزاز ایکلیئر کی بے مثل شجاعت کے سر بندھتا ہے اور یہی ایکلیئر اس لیے ناراض ہو جاتا ہے کہ اس کی ایک کینز کو اس سے زبردستی واپس لے لیا جاتا ہے۔

یہ لونڈمی دراصل اپالودیتوٹا کے ایک بچاری کی بیٹی ہے جو شاہ ایگمنان سے اس کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ بدو عاجھی دیتا ہے۔ اپالودیتوٹا کو خوش کرنے اور تباہی سے بچنے کے لیے ایگمنان ایکلیئر کو ناراض کر کے بچاری کی بیٹی جو اس کی لونڈمی بن چکی ہے اس کے باپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایکلیئر ناراض ہو کر جنگ سے دست کش ہو جاتا ہے۔ اب اہل ٹرائے کا پلہ مہجاری ہو جاتا ہے۔ ایچسین فوج کو مہجاری نقصان پہنچنے لگتا ہے۔ ایکلیئر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خیمے میں جا پڑا ہے اور جنگ میں حصہ لینے سے انکاری ہے۔ ایکلیئر کا بہادر دوست اور ساتھی پیٹرولکس اس صورت حال میں ایکلیئر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اب ضد کو چھوڑ دے۔ لیکن ایکلیئر کا غصہ بدستور قائم ہے۔ وہ پیٹرولکس کو جنگ میں حصہ

لینے سے نہیں روکتا۔ بلکہ اسے خود تیار کر کے بھیجتا ہے۔ پیڑ ٹوکس شجاعت کے جوش میں لڑتا ہوا دشمن کی فوجوں میں دوزخ گھس جاتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس کی موت ایلیگز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ وہ غیض و غضب اور انتقام کا پیکر بن جاتا ہے۔ ایلیگز کو یقین ہے کہ وہ فتح حاصل کرے گا۔ اہل ٹرائے کو تباہ کر دے گا۔ اور پھر فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن لوٹ جائے گا لیکن اس کا مقدر ایسا نہیں ہے۔

پیڑ ٹوکس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ایلیگز پھر سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے۔ ایک بار پھر پھینکس کا پلٹ بھاری ہو جاتا ہے۔ مڑوجن کو بھاری نقصان پہنچتا ہے۔

ٹرائے کا بادشاہ پرام بہت بڑھا ہے۔ اس کا بیٹا اور پیرس کا بھائی ہیکٹر فوجوں کا سپہ سالار ہے۔ وہ ایک بہادر ہے۔ صحیح معنوں میں سورما، شریف النفس، ایلیگز اور ہیکٹر دونوں سورما ہیں۔ لیکن دونوں کے کردار اور مزاج میں ایک نمایاں تضاد ہے۔ ایلیگز اور ہیکٹر مقابلے میں ہیکٹر کے لیے موت کے سوا کچھ نہیں۔

انتقام، جوش اور غیض و غضب میں اندھا ہو کر ایلیگز ایک ایسی مذموم حرکت کرتا ہے۔ جسے یونان کے رسم و رواج کی صریح خلاف ورزی اور توہین قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ ہیکٹر کی لاش کی تذلیل کرتا ہے۔ اس کے مردہ جسم کو میدان جنگ اور ایلیم کی فصیلیوں کے قریب رگیدنا اور رندنا پھرتا ہے۔

یونانی لپنے مردوں کے بارے میں بہت ذکی الحس، واقع ہوئے تھے۔ ہمارے زمانے کے رسم و رواج سے کہیں زیادہ ہی اپنے مردوں کا احترام کرتے تھے۔ سفز کلینز کے ڈرامے "انٹی گونی" کا بھی یہی موضوع ہے۔ انٹی گونی بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بے سہارا اور بے گور و کفن بھائی کی لاش کو دفن کر۔ اطمیہ کا عظیم کردار بن جاتی ہے۔ ایلیگز اپنے دشمن ہیکٹر کی لاش واپس کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

بڑھا بادشاہ پرام دل شکستہ ہے۔ وہ خود ایلیگز کے پاس جاتا ہے اور اپنے بیٹے کی لاش واپس کرنے کے لیے درخواست کرتا ہے۔ کچھ تکبر اور پکچھا ہٹ کے بعد ایلیگز لاش واپس کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ہیکٹرک لاش کی تدفین کی رسومات پر "ایلیڈ" کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔!
 کیا یونان کی تاریخ میں ایسی لڑائی لڑی گئی تھی۔ کیا لڑائے کو تاخت و تاراج کیا گیا تھا
 کیا وہ کردار جو "ایلیڈ" میں سامنے آتے ہیں، حقیقی ہیں؟ ہومر نے تاریخ کو بیان کیا ہے یا کسی
 سنی سنائی کہانی کو بیان کر دیا ہے؟

صدیوں سے "ایلیڈ" اور ہومر پر بہت کام ہوا ہے۔ سکالروں، عالموں، مورخوں، محققوں
 اور آثار قدیمہ کے ماہروں نے بہت مغز چھپی کی ہے۔ ان عالموں میں لانسز، پروفیسر ویسٹ
 اور مائیکل ویٹرس کو خاص شہرت اور مقام حاصل ہے۔ ان لوگوں نے ہومر اور "ایلیڈ" کے
 دور کو کھوجنے کی سعی کی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسا واقعہ منور ہوا تھا۔ آثار قدیمہ سے پتہ
 چلتا ہے کہ لڑائے کبھی موجود تھا۔ لیکن وہ ایک بار کی بجائے تین بار فوجی لیڈر کا شکار بن کر
 تاخت و تاراج ہوا۔

یہ یقینی بات ہے کہ یہ واقعہ ہومر کے عہد سے بہت پہلے رونما ہو چکا تھا اور یقینی طور
 پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہومر سے پہلے کے شاعر اور عوامی مغنی اور لوک فنکاروں نے اسے
 نہ صرف نظم کیا بلکہ اسے لوگوں کو سناتے بھی پھرتے تھے۔ خود ہومر بھی ایک ایسا ہی مغنی تھا، جو
 عوام کو "ایلیڈ" سنایا کرتا تھا۔

"ایلیڈ" کے حوالے سے جو ذخیرہ الفاظ سامنے آتا ہے۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا
 سکتا ہے کہ اس وقت یعنی ہومر تک یونانی زبان بہت وسیع ہو چکی تھی اور ہومر نے اپنے
 پیشروؤں کی کادشوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

ایک مثال کے طور پر یونان کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہیرا رانجھا کے قصہ کو سب سے
 سے خوب صورت انداز اور بھرپور شعری اسلوب میں وارث شاہ نے لکھا۔ اسی طرح ہومر نے
 "ایلیڈ" کو شاعری کا روپ دیا۔ جبکہ وارث شاہ سے پہلے بھی ہیرا رانجھا کا قصہ لکھا جا چکا تھا۔
 اور ہومر سے پہلے بھی ایلیڈ کا قصہ رقم ہو چکا تھا۔

ہومر کی عظیم فطانت اور تخلیقی عظمت یہ ہے کہ وہ خود کردار تخلیق کرتا ہے۔ ان کو اپنے
 انداز سے سراپا اور شخصیت بخشتا ہے۔ ہومر کے ایک مترجم E. V. Rieu نے اسے حقیقت

نکار“ قرار دیا ہے۔ ہومر اپنے سامنے کے دیکھے بھالے انسانوں کو اپنا ماڈل بنا کر ان سے اپنے سورما تراشتا ہے۔ وہ ایک بڑا شاعر ہے۔ اس کی قوت متخیلہ اور شعری انعام کا جواب نہیں وہ خوب صورت انداز میں گلابی انگلیوں والی صحبوں اور تاریک شاموں کا بیان کرتا ہے۔ وہ اتنا قادر الکلام ہے۔ اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ ہم ایلید میں ایک گھوڑے کی موت کا واقعہ پڑھ کر اُداس ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو کیساں سطح پر رکھتا ہے۔ اس کا ہر سورما، بہادر شریف اور یکتا ہے۔ وہ جن عورتوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ سب خوب صورت ہیں۔ انہیں لباس پہننے اور بال سنوارنے کا خاص سلیقہ ہے۔

ہومر کی "ایلید" ایک خاص واقعہ خاص عہد کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے کردار آج

کی دنیا میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن کیا حقیقت میں ایسا ہے۔

"ایلید" اور ہومر کی عظمت یہ ہے کہ اس کے تراشے ہوئے کردار۔ آفاقی ہیں۔ وہ انسان

ہیں اور انسانوں کے دائمی ازل، فطری جذبات و احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسے ناموں ایسے لباسوں ایسے قد کاٹھ کے ایسے کارنامے انجام دینے والے لوگ آج نہیں ملتے لیکن اس طرح محسوس کرنے والے، جذبات رکھنے والے، رد عمل ظاہر کرنے والے انسان آج بھی موجود ہیں۔ یہ کردار آفاقی سمجائیوں کے امین ہیں۔ ان میں انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ ہنستے بھی ہیں روتے ہیں، روٹھ جاتے ہیں، غیض و غضب کا شکار ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ وہ سب اپنی تقدیر سے ناواقف ہیں۔

یہ ایک عجیب داستان ہے۔ ایک ایسی لڑائی کا طویل قصہ ہے جو ایک خوب صورت ترین پہرہ

رکھنے والی عورت کی بازیابی کے لیے لڑی گئی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے کہ ہومر جنگ کا پرستار نہیں وہ اگر جنگ سے نفرت کرتا ہوا نہیں ملتا تو بھی جنگ اسے پسند نہیں۔ جنگ تو ایک وسیلہ اور حوالہ ہے۔ جس کے ذریعے وہ بتاتا ہے کہ کیسے کیسے انسان کس طرح اپنی ذات اور شخصیت کا انعام کرتے ہیں۔ وہ انسان کی نفسیات کو بیان کرتا ہے۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان بہت طاقتور ہونے کے باوجود کتنا حقیر اور کمزور ہے اور یہی حقیر اور کمزور انسان دراصل ولیرتاؤں سے بھی برتر ہے۔

"ایلید" کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ یونانی، یومالا کو مضبوط صورت میں پیش کرتی ہے

قدیم یونانی ایک اعتبار سے اسے اپنی "دینی" کتاب بھی سمجھتے تھے۔ اولمپس پر رمنے والے خداؤں اور دیوتاؤں کی دنیا کو ہومرنے پیش کیا ہے بلکہ E - U - RIEU کے الفاظ ہیں۔ تو ہومر ایسا خلاق ہے اس کی ایسی شاندار قربت متخیلہ ہے کہ اولمپس کی بلندیوں پر رہنے والے دیوتاؤں اور خداؤں کو وہ زمین پر لے آیا ہے۔!

ایک زیرک اور ذہین قاری کے لیے "ایلیڈ" کے یہ دیوتا اور خدا۔ خاص کشش رکھتے ہیں جب ہومران دیوتاؤں کی دنیا میں ہیں لے جاتا ہے جب وہ ان کے اعمال اور واقعات کو بیان کرتا ہے۔ تو اس وقت اس کا انداز بیان تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ دیوتاؤں کو مضحکہ خیز انداز میں بیان کرتا ہے۔ انہیں مقدس سمجھنے کے باوجود وہ ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کرتا ہے ایک پر لطف انداز میں وہ ان کا مذاق اُڑاتا ہے۔ یہ دیوتا بھی انسانوں کی طرح ہے۔ ایک ٹوکے سے حد کرتے ہیں۔ جلتے ہیں۔ آپس میں لڑتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ ان کی دنیا میں پُر لطف مضحکہ خیز اور پُر مذاق واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود مضحک ہیں۔ ہومر کا مزاج اس کی خاص خوبی ہے اور اس کا مزاج، اس وقت چوکھا ہو جاتا ہے جب وہ دیوتاؤں کا ذکر کرتا ہے۔

"ایلیڈ" کا وہ حصہ تو ذرا پڑھ کر دیکھیے۔ جہاں وہ ایک لنگڑے دیوتا کا ذکر کرتا ہے۔ یا جہاں وہ دیوتاؤں کے خاندان کی کانفرنس کا احوال بیان کرتا ہے تب یہ لوگ کتنے پُر لطف، مضحکہ خیز اور دلچسپ بن جاتے ہیں۔

"ایلیڈ" نگار اور تاریخ کا امتزاج ہے۔

"ایلیڈ" کو کئی امور میں اولیت حاصل ہے۔ محققوں اور عالموں نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ فن تنقید کا پہلا اور جامع نمونہ۔ "ایلیڈ" کا ایک ٹکڑا ہے جو جدید تنقید کے معیار پر اترتا ہے جو تنقید کے اصولوں کو پہلی بار واضح کرتا ہے۔ یہ وہ ٹکڑا ہے جہاں ہومر ایک ڈھال کا ذکر کرتا ہے۔

افلاطون نے اپنی "ریاست" سے شاعروں کو خارج کر دیا تھا لیکن ہومر کو وہ اپنی ریاست سے نکلانے پر قادر نہیں۔ بلکہ وہ ہومر کو مثالی شاعر بتاتا ہے۔ دوسروں کو اس کی تقلید پر مجبور کرتا ہے

میں نہیں جانتا، اپنی اصل زبان میں اسہی کتاب کی زبان کی تاثیر کیا ہے لیکن اس کے مختلف تراجم کا مطالعہ کرنے سے ہی میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ جس کا ترجمہ اتنا پُر اثر ہے وہ اصل زبان میں کتنی بے مثل شاعری ہوگی۔

”ایلیڈ“ اور ”اوڈیسی“ کسی ہومر نام کے اندھے معنی اور شاعر نے لکھی تھیں یا نہیں۔ لیکن آج وہ ہومر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ عظیم رزمیے اس کی تھمیں قرار دیئے جاتے اور اس کے ساتھ منسوب ہیں۔

صدیوں سے اس کتاب کو ان گنت انسانوں نے پڑھا اور اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ”ایلیڈ“ بلاشبک شہرہ دنیا کی عظیم اور بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔

کلیدِ دمنہ

ملک الشعرا بہار نے لکھا ہے۔

”دنیا نے ادب میں کوئی کتاب ایسی نہیں کہ اتنی مدت تک مقبول اور محبوب و مرغوب رہی ہو۔ اور جس کے متعلق یہ یقین ہو کہ رہتی دنیا تک اس کی ہر دل عزیز کا یہی عالم رہے گا۔ کسی قوم کی تخصیص نہیں، کسی زمانے کی قید نہیں کسی عہد کی شرط نہیں۔ ہر جگہ ہر وقت مختلف معاشرتی اداروں میں اور ثقافتی مرکزوں میں یہ تالیف دلپذیر اور مقبول رہی ہے بادشاہوں نے اسے سبقتاً سبقتاً پڑھا ہے۔ رات کو سوش رو اور جوش گلا غلاموں اور کینیزوں نے اس کی کہانیاں سنی ہیں۔ امراء نے حل مشکلات میں اس کو پیش نظر رکھا اور عام لوگوں نے اسے دستور حیات سمجھا ہے۔ صحافیوں نے اور نباتات کے طالبوں نے اس کے مندرجات میں عالمگیر صداقتوں کی جھلک دیکھی ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کا مؤلف یا مؤلفین علم حیات اور علم نفس کے ماہر تھے۔ زندگی کے تجربات سے بہرہ یاب تھے۔ زمانے کی ادب سے آگاہ تھے۔ مردم شناس تھے۔ اور مشکلات میں پریشان نہیں ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ تالیف ہندوستان کی فکری اور ذہنی تاریخ کا نقطہ سروج ہے۔ وہاں کے دانشوروں اور مفکروں کے تجربات کا حاصل ہے۔“

یقیناً یہ اقتباس پڑھ کر دل میں خیال آتا ہے کہ وہ کون سی ایسی کتاب ہے جو ہر زمانے پر حاوی رہی ہے۔ اور جسے آنے والی نسلیں بھی ہمیشہ پڑھتی رہیں گی۔ ملک الشعرا بہار نے یہ کلمات تحسین جس کتاب کے لیے لکھے۔ وہ کتاب ہے۔

کلیدِ دمنہ :-

کلیدِ دمنہ کا شمار دنیا کے عظیم کلاسیک میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کبھی دورِ ایں پیش نہیں ہوئیں۔ اس کی مقبولیت افادیت اور تخلیقی صداقت کا ہمیشہ ہر دورِ معترف رہا ہے۔

کلیدِ دمنہ "میں جانوروں کی زبان سے معاشرتی آداب، تدبیر و تقدیر اور آئینہ انداز کے اصول داستانوں کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ کلیدِ دمنہ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہر زمانے میں ادب کے ہر شعبے اور ادبی سحر کوئی پراثر انداز ہوئی ہے۔ داستانِ درواستان کی تکنیک سے دنیائے ادب پہلی بار اس کتاب کے حوالے سے متعارف ہوئی ہے۔ اور الف یسلیٰ اور "ہزار داستان" پر اس کے اثرات صاف اور واضح دکھائی دیتے ہیں۔

کتھن سرت ساگر "جیسا افسانوی مجموعہ بھی کلیدِ دمنہ کا ہی مرہونِ منت ہے۔ پھر اپنے اثرات کے اعتبار سے کلیدِ دمنہ اتنی ہی ہمہ گیر کتاب ہے کہ اس کے واضح اثرات نظام الملک کے سیاست نامہ سے لے کر قابوس نامہ "چہادِ مقالہ" "گلستان" "بہارستان" اور "خارستان" پر صاف نظر آتے ہیں۔

فرائسیسی زبان میں جو مصنف FABRES کے نام سے مشہور و منفرد ہے۔ اس پر کلیدِ دمنہ کے اثرات کا فرائسیسی محققوں اور عالموں نے حوزہ اعتراف کیا ہے۔ انگریزی ادب کی کسی ایسی کتاب میں ہی جن پر اس کے اثرات بے حد واضح ہیں۔

کلیدِ دمنہ ایک ایسی عالمی کلاسیک ہے جس کے ماخذ، مطالب، تکنیک اور اسلوب نگارش پر ساری دنیا کے اہم محققوں اور ادیبوں نے بحث کی ہے۔ عالمی سطح پر حقیقی اہمیت اس کتاب کو حاصل رہی ہے۔ شاید ہی کسی کتاب کو حاصل رہی ہو۔ کلیدِ دمنہ کے بارے میں برسہا برس کی تحقیق کے بعد جو امور سامنے آئے ہیں

ان کی تفصیل یوں بنتی ہے :-

کلیدِ دمنہ۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی۔

لوشیروان ساسانی کے حکم پر حکیم بروزیہ کو اس کا نسخہ حاصل کرنے کے لیے بطور خاص ہندوستان بھیجا گیا۔

ایک روایت کے مطابق لوشیروان کے وزیر بزرجمہر نے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا۔ پہلوی زبان سے ابن المرقع نے اسے عربی میں منتقل کیا۔ ساسانیوں ہی کے عہد میں اس کا ایک اور نثری ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا۔ اس کے بعد رودکی نے اسے تلمیض اور قطع و برید کے بعد منظم ترجمے کی صورت دی۔

اس کے بعد نصر اللہ مستوفی نے کلید و منہ کے نام سے جتنے نسخے موجود تھے۔ ان کو سامنے رکھ کر اس کا ایک فارسی نسخہ تدوین و مرتب کیا۔ نصر اللہ مستوفی نے اسے زبان پہلوی کے بجائے عام طور پر پڑھنے والے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔

حسین واعظ کاشفی نے کلید و منہ، نصر اللہ کو بنیاد بنا کر اس میں پرشکوہ اور پر تکلف اضافے کیے اور نام اس کا "النوار سہیلی" رکھا۔ یہی کتاب "النوار سہیلی" منسکرت کلید و منہ کی معروف ترین شکل ہے۔

اکبر اعظم کے عہد میں کلید و منہ کے جو نسخے دستیاب ہو سکتے تھے۔ ان کو سامنے رکھ کر ابو الفضل نے ان کو سادہ اور عام فہم زبان میں لکھا۔ اس کی ترتیب نو کا فریضہ انجام دیا اور نام اس کا "عیار دانش" رکھا۔

کلید و منہ کی اس شکل یعنی "عیار دانش" کا ترجمہ حفیظ الدین احمد نے "عز و افزون" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔

گویا "النوار سہیلی" کا ترجمہ "بستان حکمت" کے نام سے کیا۔ دکھنی میں بھی اس کے کسی تراجم ہوئے۔

اصل کتاب "کلید و منہ" ہے۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس نے کئی دوسرے چراغوں کو روشن کیا۔ کلید و منہ کو مختلف ادوار میں مختلف زبانوں میں مختلف ادیبوں اور مترجموں نے اپنے انداز میں پیش کیا۔ جس میں "النوار سہیلی" کو بطور خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اصل کتاب تو کلید و منہ ہے جو کتاب کے دو کرداروں کا مرکب ہے یعنی کلید اور منہ۔

کلیدِ دمنہ - ہندوستان میں اس زمانے میں لکھی گئی جو ہندوستان کے زرعی نظام کا سنہری دور ہے۔ دن کو تھوڑی بہت محنت کرنے کے بعد، زرخیز زمینوں اور لہلہاتے کھیتوں کے مالک کسان شام کو محفل جاتے اور گپ شپ لگاتے اور یوں داستانوں اور قصوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

کلیدِ دمنہ کی کہانیاں ازلی اور ابدی ہیں۔ اسی لیے محققوں کو ان کا ماخذ تلاش کرنے میں ہمیشہ وقت محسوس ہوتی ہے۔ اصل میں ان کہانیوں کی جڑیں کسی ایک شخص کے ذہن اور دماغ میں نہیں، بلکہ قدیم ہندوستان کی معاشرت میں پورست ہیں۔

”البراکہ“ کے خالق عبدالرزاق طوسی کا بیان ہے کہ کلیدِ دمنہ بیدیا پنڈت کی تصنیف تالیف ہے۔ جو اس نے راجہ رائے دایشلم کے لیے لکھی تھی۔ رائے دایشلم گجرات کے چاؤرہ خاندان کا بادشاہ تھا۔ ہندوستانی تاریخ کے مورخ بتاتے ہیں کہ یہ خاندان محمود غزنوی کے حملوں تک سر ریہ رائے تخت تھا۔

ابوریحان بیرونی کلیدِ دمنہ کا ماخذ ”پنچ منتر“ کو قرار دیتا ہے۔ ایک خاص تحقیق تو یہ ہے کہ یونان کو چھوڑ کر تمام دنیا کی زبانوں میں حکایات کے مجموعے مقبول و معروف ہیں ان سب کا ماخذ ”جاہک“ ہے یعنی وہ ۵۵۰ کہانیاں جو مہاتما بدھ کی پیدائش کے حوالے سے مہرمن وجود میں آئیں۔

پروفیسر لی بان (قدیم ہند - مترجم سید علی بلگرامی) بھی بیرونی کی تائید کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:-

”کلیدِ دمنہ“ کا ماخذ ”پنچ منتر“ نامی کتاب ہے جو حکایات و امثال کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر لی بان حکایاتِ لقمان کا ماخذ اسی کتاب کو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر کرٹین سین نے بھی ”کلیدِ دمنہ“ کو پنچ منتر سے ماخوذ قرار دیا ہے۔

”اس کی پہلوی صورت ”کلیگ دوونگ“ ہے جس کا مترجم حکیم بردزیر ہے۔

فلپ کے حقی نے ”تاریخ عرب“ میں لکھا ہے۔

”ہم تک عربی کی جو قدیم ترین ادبی کتب پہنچی ہے۔ وہ کلیدِ دمنہ حکایاتِ بیدیا

ہے۔ یہ کتاب اصلاً سنسکرت میں تھی۔ پھر پہلی میں ترجمہ کیا گیا اور عربی ترجمہ اس پہلی ترجمے سے کیا گیا۔ خسرو نوشیروان کے عہد حکومت میں ۵۳۱۱-۲۵۷۸ء جہاں ہندوستان سے شطرنج آئی۔ وہاں اصل سنسکرت کتاب بھی آئی، کلیدہ دمنہ کا عربی ایڈیشن اس لیے اہم ہو گیا کہ نہ تو پہلی نسخہ ملتا ہے نہ اصل سنسکرت کتاب، پہنچتے تھے، میں یہی مطالب اور معانی زیادہ مفصل صورت میں پائے جاتے ہیں۔ عربی سے ہی قریباً چالیس زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا۔ یورپی زبانوں سے قطع نظر عبرانی، ترکی، حبشی اور ملایا کی زبان میں بھی تراجم ہوئے۔ آئس لینڈ میں بھی اس کا ترجمہ ملتا ہے۔ (حصہ ۲۰۸)

کلیدہ دمنہ۔ جو سنسکرت زبان میں تھی۔ اس کا پہلا پہلی ترجمہ مفقود ہے۔ اس کا عربی ترجمہ جابن المفتح نے کیا۔ اس سے ساری دنیا نے فیض اٹھایا۔ سریانی میں کلیدہ دمنہ کا ترجمہ ۵۷۰ء میں ہوا۔ پھر گیارہویں صدی میں یونانی میں سے اسے ۱۰۸۰ء میں مترجم کیا گیا۔ نصر اللہ نے ۱۱۲۰ء میں اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں اس کا عبرانی ترجمہ ہوا۔ لاطینی میں اسے منظوم مترجم کیا گیا۔ ہسپانوی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ۱۲۱۲ء میں لاطینی میں اس کا ایک نثری ترجمہ ہوا۔ اطالوی میں کلیدہ دمنہ کو ۱۵۸۲ء میں منتقل کیا گیا۔ جرمنی میں ۱۴۸۰ء رڈچ زبان میں ۱۸۲۳ء اور فرانسیسی میں ۱۶۰۹ء میں اس کے تراجم ہوئے۔ اردو میں کلیدہ دمنہ کے مختلف روپ پائے جاتے ہیں۔ بہادر علی حسینی نے اس کا ترجمہ اسیویں صدی کے اوائل میں افلاق ہندی کے نام سے کیا۔ پھر شیخ حفیظ الدین احمد نے 'عزاد افروز' کے نام سے اس کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے ایما پر کیا۔ یہ ترجمہ موجود ہے۔۔۔ کلیدہ دمنہ کی کہانیاں انسانی تجربات کا پتھر ہیں۔ یہ ایک ایسا جہان طلسم ہے کہ جسے پڑھنے والا اس میں ہمیشہ کے لئے کھو کر رہ جاتا ہے، کلیدہ دمنہ میں جانوروں کی زبان سے دانائی اور صداقت کی ایسی تعلیم دی گئی ہے کہ اس کی مثال پوری دنیا کے ادب میں نہیں ملتی۔ کلیدہ دمنہ کی دو مختصر حکایات پیش خدمت ہیں۔!

حکایت نمبر ۱

ایک شخص سر مایہ دانش و تجربے کا نہ رکھتا تھا اور دعویٰ طبابت کا کرتا تھا۔ شہر میں دکان لگائے بیٹھا تھا اور اس کی مردم کشی کا بازار گرم تھا۔ ایک طبیب دانا کہ جو دست نشاں رکھتا تھا اس کی حکمت و طبابت اس نقلی طبیب کے سامنے نہ چلی سکی۔ دانا طبیب ایسے اہل علموں کو پہچان کر رفتہ رفتہ اندرھا ہو گیا۔ جبکہ اس کا مقابل نقلی حکیم دولت میں کھیلتا اور اس کی شہرت میں ہر روز اضافہ ہوتا تھا۔

اس ملک کے بادشاہ کی ایک صاحبزادی محنتی، نہایت حسین، شادوی اس کی بادشاہ کے بھتیجے سے ہولی رخصتی۔ وہ حاملہ ہولی اور شدید درد میں مبتلا رہنے لگی۔ بادشاہ نے دانا طبیب کو بلا کر کہا کہ وہ شہزادی کا علاج کرے تاکہ اُسے درد سے چھٹکارا ملے۔ دانا طبیب نے تشخیص مرض کی اور کہا کہ علاج اس کا مہران سے ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ دو کہاں ہے؟ کہاں سے ملے گی؟ دانا نابینا طبیب نے کہا کہ دوائی میں نے ایک بار بادشاہ کے ہی دواخانے میں دیکھی تھی۔ نایاب و کمیاب ہے لیکن شاہی دواخانے میں موجود ہے۔ ایک چھوٹی ٹیسی ڈبیا میں بند ہے جس کو سونے کا تالا لگا ہے۔ اب مجھے آنکھوں سے تو سوچتا نہیں اس لیے تلاش سے عاجز ہوں۔

بادشاہ کے درباریوں نے ذکر اس حکیم کا کیا جو نقلی تھا لیکن شہرت رکھتا تھا۔ بادشاہ کے حکم پر اس کو دربار میں لاکھڑا کیا۔ طبیب نقلی نے بادشاہ سے عرض کی کہ یہ نابینا حکیم کیا جانتا ہے۔ جس دوا کا ذکر اس نے کیا۔ یہ بھی مجھ سے سنا ہوا تھا۔ میں دراصل دوا کو پہچانتا اور اس کے استعمال کی ترکیب بھی جانتا ہوں۔ اس نقلی طبیب کو شاہی دواخانے بھجوا دیا گیا۔ بہت سرگرا مگر وہ چھوٹی ٹیسی ڈبیا نہ ملی کہ جس پر سونے کا تالا لگا ہوا تھا۔ اس سے ملتی جلتی ایک ڈبیا اٹھائی اور اس کا تالا کھول دیا۔ اس میں ایک شیشی تھی جس میں زہر۔ تھا۔ شیشی کھولی کہ اس کے چند قطرے پانی میں ڈال کر شہزادی کو پلا دیے۔ اوپر وہ پانی شہزادی کی زبان سے چھڑا اور وہ اسی لمحے مر گئی۔ بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا تو حکم صادر کیا کہ باقی دوائی طبیب نادان کو پلا دیں پیتے ہی وہ بھی سر دو گیا اور سزا اپنی جہالت کی پائی۔۔۔

ومنہ نے کہا میں نے یہ قصہ اس لیے بیان کیا تاکہ غم جان سکو کہ لوگ نادانی سے جو کام کرتے

ہیں نال کار اس کا یہ ہے کہ صرف گمان پر ہوا اس میں خطرے بہت ہیں۔"

حکایت نمبر ۲

ایک مینڈک کسی سانپ کی بانہی کے پاس رہتا تھا۔ جب اس کے بچے ہوتے، سانپ کھا جاتا۔ مینڈک بے چارے کے دل پر اولاد کی موت کا گہرا زخم لگتا۔ مینڈک کی دوستی ایک لیکڑے سے ہو گئی۔ اس نے لیکڑے سے ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا: "یار اس قوی دشمن سے جان چھوٹنی چاہیے۔ کوئی ترکیب بنا۔" لیکڑے نے کچھ دیر غور کیا۔ پھر بولا: "فکر نہ کرو۔ تیرا قوی دشمن فریب کے دام میں پھنس سکتا ہے۔" ایک جگہ ایک نیولا رہتا ہے لڑاکا، ہواؤ اور تند خو۔ تو ایسا کر کہ کچھ مچھلیاں سچڑ کر ان کو سانپ کی بانہی کے پاس لا کر رکھ دے۔ نیولا ان مچھلیوں کو ایک ایک کر کے کھاتا ہوا سانپ کی بانہی تک جا پہنچے گا اور پھر سانپ کو بھی کھا جائے گا۔ بس اسی فریب کے حال میں تو اپنے قوی دشمن کو پھانس سکتا ہے۔"

مینڈک نے اسی تدبیر پر عمل کیا۔ جب دو تین دن گزرے نیولے کو مچھلی کھانے کی چاٹ لگ گئی۔ جہاں کھانے کا مزہ ملا، وہاں پہنچ گیا۔ جب مچھلیاں نہ پائیں، مینڈک کو تمام بچوں سمیت کھا گیا۔"

"یہ قصہ آکس لیے میں نے کہا کہ نال کار حیلہ سازوں کا انجام گرفتاری اور ہلاکت ہے۔"

کہانیاں

معلوم دنیا کی کوئی ایسی زبان اور خطہ نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی صورت میں ایسوپ کی حکایتیں نہ پہنچی ہوں۔ دنیا کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی زبان میں ان حکایتوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان حکایتوں نے دنیا بھر کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ اس سرچشمے سے کئی سوتے پھولے ہیں صدیوں پرانی ہونے کے باوجود یہ حکایتیں آج بھی تازہ، معنی خیز اور نئی ہیں۔ گہری معنویت اور بنیادی صداقت کی وجہ سے ان حکایتوں کی دل کشی ہر دور میں بڑھتی رہی۔ ان میں ایسی صلاحیت اور سکت موجود ہے کہ بدلے ہوئے زمانوں میں یہ حکایتیں نئے معنی سے روشناس کراتی ہیں جو اس دور کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ ان حکایتوں کے حوالے سے جو اخلاقی درس ہمیں دیا جاتا ہے بلاشبہ اس سے انسانی زندگیوں کو بہتر انداز میں بسر کرنے کے لیے رہنمائی ملتی ہے۔

انسانی تاریخ کا ایک دور وہ تھا جب انسان اور حیوان ایک دوسرے کے ہمسائے تھے۔ جب پرندوں اور جانوروں کے ساتھ انسان کا بہت قریبی اور گہرا رشتہ تھا۔ دنیا کے ادب میں مختلف زبانوں میں ایسی حکایتوں کا ذخیرہ بہت فراوان ہے جن میں جانوروں، حیوانوں اور پرندوں کے حوالے سے کہانیاں بیان کر کے انسانی صورت حال نقدیہ اور روزمرہ زندگی کے اطوار اور اخلاق کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ایسی روایتی کہانیوں کے بارے میں لکھنا، ایک ایسا موضوع ہے جو علیحدہ مضمون یا کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ تاہم معلوم انسانی ذرائع اور دیوبالا کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے اس انداز کی تمام حکایات کا بنیادی سرچشمہ ایسوپ کی کہانیاں ہیں۔

یہ ایسوپ کون تھا؟ کہاں پیدا ہوا، کیسے زندگی بسر کی۔ اس نے کب یہ حکایات تخلیق کیں ایسے بنیادی سوالوں کے جواب میں دنیا کی مختلف کتابوں اور شخصیات کے حوالے سے مل جاتے جاتے ہیں مگر یقینی اور حتمی طور پر ایسوپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ وہ ایک دیو مالالی کردار بن گیا ہے۔ ایک یونانی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ جو لازوال حکایتیں منسوب کی گئی ہیں۔ ان کی طرح وہ خود بھی ایک حکایت بن چکا ہے بعض علماء اور محقق نے ایسوپ (Aesop) اور حضرت لقمانؑ کو ایک ہی شخصیت قرار دیا ہے۔ میں تمام تر مماثلت اور دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اس سلسلے میں کوئی حتمی اور دو ٹوک رائے نہیں دے سکتا۔ حضرت لقمانؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ قرآن پاک میں ان کا ذکر آتا ہے ان کی حکمت اور دانائی منسوب المثل بن چکی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ کئی حکایات منسوب ہیں اور مستند اور غیر مستند انداز میں ان کے حوالے سے کئی مجموعے بھی مختلف زبانوں شائع ہوئے ہیں۔ جن کے بارے میں دعوے ایک کیا ہے کہ یہ حضرت لقمانؑ کی حکایات ہیں۔

تاہم۔ ایسوپ اور حضرت لقمانؑ ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے۔ اس کا کوئی یقینی اور حتمی ثبوت اور جواب نہیں ملتا۔

ایسوپ کا تعلق یونان سے بیان کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر وہ علاقہ جسے ایشیائے کوچک کہا جاتا ہے۔ یونان کے قدیم اور قبل از مسیح دور کی بعض تحریروں میں حکایات کا سراغ ملتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہیسوڈ کی ایک حکایت ملتی ہے بعد میں یہ حکایت ایسوپ کے نام منسوب کر دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا خالق ہیسوڈ تھا جو ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں زندہ تھا۔

بعض محققوں نے ایک زلزلے میں اپنی تحقیق کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ حکایات کی جنم بھومی یونان نہیں بلکہ قدیم ہندوستان ہے لیکن جدید تحقیق نے ایسے شواہد پیش کر دیے ہیں کہ جس سے یہ تحقیق غلط ثابت ہوئی ہے۔ قدیم ہندوستان میں پرانی حکایت کا سراغ چوتھی صدی ق۔ م سے پہلے نہیں ملتا۔ جبکہ یونان میں حکایت کا سراغ ساتویں اور آٹھویں صدی میں پورے اسناد کے ساتھ مل چکا ہے۔ محققین اور علماء نے اس سلسلے میں

یہ فیصلہ بھی دیا ہے کہ یونانی حکایت کا براہ راست اثر قدیم ہندوستانی حکایتوں پر واضح انداز میں ملتا ہے اور دنیا بھر میں اس ابتدائی انسانی اختراع اور تخلیق - حکایت پر یونان کا ہی اثر ملتا ہے۔

بریان روب (BRIAN ROBB) نے لکھا ہے:

”جہاں تک حقائق کی روشنی میں دیکھا گیا ہے اس کے حوالے سے ہم بلا

جھجک کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونانی تھے جنہوں نے حکایت کو تخلیق کیا۔“

اور حکایت - جس نے پوری انسانیت کو متاثر کیا - اسے ایسوپ کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔

اور یہ ایسوپ کون تھا؟

پانچویں صدی قبل مسیح میں ایسوپ یونان میں ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اسے ایک عظیم الترتیب مصنف کا درجہ دیا گیا تھا۔ اس کی یہ عام شہرت تھی کہ وہ حکایات کا خالق ہے۔ اس شہرت اور بعض دوسرے شواہد کے باوجود حتمی طور پر پتہ بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نام کا کوئی شخص موجود بھی تھا یا نہیں۔

یونانیوں کے مجموعی مزاج کو سامنے رکھا جائے تو ”ایسوپ“ کا معاملہ کچھ اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ یونانیوں کو جہاں حکایت سے دلچسپی تھی - وہاں وہ ایسے فرضی ان فنون کو بھی تخلیق کرنے کا شوق رکھتے تھے جو بذاتِ خود ایک حکایت کا درجہ حاصل کر لیں۔

بہر حال ایسوپ کے وجود کے بارے میں پہلی گواہی ہیرودوٹس سے ملتی ہے۔ جسے تاریخ کا بار آہم کہا جاتا ہے۔ ہیرودوٹس نے اپنی تاریخ میں ایسوپ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی تفصیل یوں ہے۔

ایسوپ چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں مصر کے فرعون عمیس کے زمانے میں زندہ تھا اور اسے حکایات کے مصنف اور خالق کی شہرت حاصل تھی۔

• - ایسوپ کا تعلق جزیرہ ساموس سے تھا۔

• - ہیرودوٹس بتاتا ہے کہ ایسوپ ساسوس جزیرے کے ایک باسکی آئیڈمن کا

غلام تھا۔

• - ہیرودوٹس یہ بھی بتاتا ہے کہ ایسوپ کی موت ڈیلیفی کے پجاریوں کے ہاتھوں ہوئی۔

ہیروڈوٹس کے زمانے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسوپ بہت مشہور تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہیروڈوٹس ایسوپ کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کا وسط بتاتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ پانچویں صدی ق۔ م کے آواخر میں لکھی گئی تھی۔

حضرت لقمانؑ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کسی کے غلام تھے۔ ایسوپ کے ساتھ بھی یہ منسوب ہے کہ وہ غلام تھا مگر ایسوپ کے غلام ہونے کے بارے میں پورے شواہد نہیں ملتے، میں۔ نہ ہی ہیروڈوٹس یا بعد کا کوئی مؤرخ یا عالم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ایسوپ کن وجوہات کی بنا پر غلام تھا۔ بہر حال ایسوپ ہویا حضرت لقمانؑ ان کے باپے ساری دنیا میں یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ غلام تھے۔ ایک دوسری صفت جس کو شہرت حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ ایسوپ بد صورت انسان تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس کے خدو خال بڑے مضحکہ خیز تھے۔ حضرت لقمانؑ کے بارے میں بھی بعض ایسی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ہیروڈوٹس کے بعد۔ یونان کے بعض عالمگیر شہرت رکھنے والے ڈرامہ نگاروں، فلسفیوں اور عالموں کے ہاں ایسوپ کا حوالہ ملتا ہے۔ ان میں ارسٹوفینز، زینز، افلاطون اور ارسٹوفینز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ایسوپ کی حکایات اور ان سے وابستہ دانائی اور حکمت کی تعریف کرتے ہیں۔

ارسطوفینز نے ایسوپ کی موت کے بارے میں لکھا ہے کہ ایسوپ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے ڈیلفی کے مقدس مندر سے ایک پیالہ چرائیا تھا جس کی سزا سے یوں ملی کہ ڈیلفی کے سچاریوں اور لوگوں نے اسے ہلاک کر دیا۔

پلٹارک نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ ڈیلفی کے مندر کے سچاری اور لوگ اس کی حکایات کو بعض پہلوؤں کو اپنے لیے اہانت اور طنز کا باعث سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسوپ کو مار ڈالا۔ ارسٹوفینز کے ایک شارح نے لکھا ہے کہ اصل وجہ یہ تھی کہ ڈیلفی کے لوگ اس کی حکایات کو اپنے لیے اہانت اور حقارت کا سبب قرار دیتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسوپ کے سامان میں خود ہی مندر کا ایک قیمتی پیالہ چھپا کر ایسوپ پر چوری کا الزام لگا دیا۔

اصل واقعہ خواہ کچھ ہو، ایسوپ کی زندگی کے واقعات میں یہ بات بھی شامل کر لی گئی کہ اس کی موت بے انصافی اور ظلم کے نتیجے میں واقع ہوئی۔

پانچویں صدی ق۔ م میں ایسوپ کی حکایتیں اور ایسوپ کا نام یونان کے مختلف علاقوں بالخصوص ایٹھنز میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ پانچویں صدی ق۔ م کے بعد اس کا ذکر کسی حوالہ سے سامنے آتا ہے اور اس کے نام سے منسوب حکایات بھی تیزی سے پورے یونان میں گردش کرنے لگی تھیں۔ ارسٹو فینز، زینو، افلاطون اور ارسطو اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ ایسوپ نے اپنی حکایتیں خود قلم بند کی تھیں یا اس کے بعد کسی اور نے ان کو مرتب کیا تھا۔ بہر حال اس وقت یعنی پانچویں صدی ق۔ م میں ایسوپ کی حکایتوں کے کسی قلمی نسخے موجود تھے۔

ایسوپ اور اس کی حکایات کو اس کے بعد اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ رواج چل نکلا کہ ہر حکایت کو اسی نام سے منسوب کر دیا جاتا۔ حالانکہ بعض ایسی حکایات کا واضح طور پر سراغ ملتا ہے جو ایسوپ کے زمانے سے بہت پہلے کہی اور لکھی گئی تھیں۔ مگر بعد میں ان کو بھی ایسوپ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔

ایسوپ، ایک فرضی انسان تھا یا حقیقی، وہ اور حضرت لقمانؑ ایک ہی شخصیت تھے یا نہیں۔ ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایسوپ کے نام سے منسوب جو حکایات ہیں آج پڑھنے کے لیے ملتی ہیں ان کے بارے میں یقینی طور سے کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کتنی ہی ایسی حکایات ہیں جن کا خالق، اصلی یا فرضی ایسوپ نہ تھا بلکہ ان کہانیوں کو اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا اس لیے پورے دثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کونسی کہانی ایسوپ کی ہے۔

تین سو برس قبل مسیح میں ایسوپ کی حکایتوں کا ایک جامع نسخہ مرتب ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس کا مرتب دمپٹریس تھا جو ایٹھنز کا ایک نامور شہری تھا۔ بعد میں ایسوپ کی حکایات کے مترجم دیگر زبانوں میں ہونے لگے جن میں لاطینی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہورلیس نے بھی کچھ کہانیوں کا ترجمہ کیا۔ مقدونیز کے ایک غلام فیدرس کے نام سے بھی ایسوپ کی

حکایتوں کا ایک مرتب کردہ مجموعہ منسوب ہے یہ غلام اپنی زندگی کا بیشتر حصہ روم میں مقیم رہا تھا اور بعد میں رومی شہنشاہ ایگلٹس کے حکم سے اسے آزاد کر دیا گیا تھا۔

اب ہمک ایسوپ کی حکایات کا ترجمہ مقدور بار دنیا کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی زبان میں ہو چکا ہے ان حکایات نے دنیا کے ادب پر جو گہرے اور انٹ اثرات چھوڑے اور پوری انسانیت کو صدیوں سے متاثر کیا ہے۔

ایسوپ کی حکایات کاتین چو بھالی، حصہ جانوروں، حیوانوں اور پرندوں کے حوالے سے کہانی کو بیان کرتا ہے ایک چو بھالی، کہانیاں انسانوں اور دیوتاؤں کے حوالے سے کہانی کو بیان کرتی ہیں ہمارے ہاں اردو میں لقمان کے نام سے منسوب حکایات بھی ملتی ہیں۔ اور ایسوپ کی حکایات کو بھی بعض لوگوں نے ترجمہ کیا ہے اگرچہ کاتبی صورت میں ایسوپ کی حکایات کو ابھی تک شائع نہیں کیا گیا۔

ایسوپ کی حکایات کا وہ مجموعہ جسے ایس اے، ہینڈ فورڈ نے ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اس مجموعے میں ۲۰۷ حکایات شامل ہیں۔ ان میں سے چند حکایات کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ان حکایات میں سے چند حکایات ایسی ہیں جو سامری دنیا میں ایسوپ کے نام سے منسوب اور مقبول ہیں۔

ایک سبق احمقوں کے لیے

ایک کوڑا اپنی چونچ میں گوشت کا ایک ٹکڑا ادا بنائے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا ایک لومڑی کا اہر سے گزر ہوا اس نے گوشت کے ٹکڑے کو ہتھیلے کا فیصلہ کر لیا لومڑی کوٹے کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگی "تم کتنے خوب صورت اور دل کش پرندے ہو تمہیں تو تمام پرندوں کا بادشاہ بننا چاہیے میں سچ کہتی ہوں اگر تمہاری آواز میں بھی وہد بہ اور رعب موجود ہے تم یقیناً پرندوں کے بادشاہ بنا دینے جاؤ گے۔ کوڑا خوشامد کے جال میں پھنس چکا تھا اس نے اپنی آواز کو بھی بادشاہوں کی آواز ثابت کرنے کے لیے منہ کھولا۔ اور کائیں کائیں کرنے لگا۔ گوشت کا ٹکڑا زمین پر گرا جسے لومڑی نے جلد ہی سے چھپٹ لیا اور جاتے جاتے بولی۔

”اگر تم اپنی خوبئوں میں تھوڑی عقل بھی شامل کر لیتے تو تم یقیناً بادشاہ بن جاتے۔“

طاقت

خزگو شوں کا جلسہ ہو رہا تھا، مقرر خزگو ش نے ایک ہی بات پر زور دیا کہ سب کو شکار سے مسامحہ حاصل چاہیے۔ شیر جو وہاں موجود تھا۔ بولا۔ ”خزگو شوا! تم نے خطابت کے جوہر تو خوب دکھائے۔ لیکن ان میں ان پنجوں اور دانوں کی کمی تھی جو صرف ہمارے پاس ہیں۔“

طاقت کی زبان

ایک بھیڑیا ایک بھیڑ کو شکار کر کے اٹھائے چلا آ رہا تھا کہ اس کی شیر سے مڈ بھیڑ ہو گئی شیر نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس نے وہ بھیڑ، بھیڑیے سے حصین لی۔ بھیڑیا مجبور تھا، شیر سے کچھ دور کھڑا ہو کر بولا۔

”تمہیں میری بھیڑ ہتھیانے کا کوئی نہیں تھا۔“

”اچھا اگر تمہیں یہ طریقہ پسند نہیں آیا تو میں اسے ایک درست کاٹھنہ سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔“

پورا بوجھ

گھوڑا اور گدھا دونوں اپنے مالک کا سامان اٹھائے جا رہے تھے۔ گدھے نے

وردناک آواز میں کہا:

”بھائی گھوڑے میرا کچھ بوجھ بنا لو۔ ورنہ میں اس بوجھ تلے دب کر مر جاؤں گا۔ گھوڑے

نے حقارت اور نفرت سے گدھے کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دینے کی بجائے خاموشی سے چلتا رہا۔

تھوڑا نا اہل طے کرنے کے بعد گدھا واقعی زمین پر گر اور مر گیا مالک نے جب دیکھا کہ گدھا

مر گیا ہے تو اس نے وہ سارا بوجھ گھوڑے پر لا دیا اب گھوڑے کو کچھ دبا ہوا اور وہ سوچنے

لگا کہ میں گدھے کی بات مان لیتا تو یہ گدھا مرتا اور مجھے سارا بوجھ اٹھانا پڑتا۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ طاقتور مرکز اور بوجھ اٹھانے تو دونوں کو فائدہ پہنچتا

ایک ہی کافی ہے

تمام جانور پرندے اور حیوان جشن منار ہے تھے کہ سورج شادی کرنے والا ہے اور خوشیاں منانے والوں میں مینڈک بھی شامل تھے۔ ایک بوڑھے مینڈک نے کہا، احمقو، جا بلو تم کیوں خوشیاں منار ہے ہو کیا تمہارے تالابوں کو خشک کرنے کے لیے کیا ایک ہی سورج کافی نہیں ذرا سوچو تو اگر اس نے شادی کر لی تو پھر پھر ہمارا انجام کیا ہوگا۔ وہ اس کی بیوی اور بچہ اس کے بچے مل کر تو ساری دنیا کا پانی خشک کر دیں گے۔ واقعی دنیا کے ان گنت احمق لوگ ان باتوں پر ہی خوشیاں مناتے ہیں جو خود ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔“

الف لیلہ

ہر بڑی کتاب کے پیچھے ایک بڑا ذہن اور ایک بڑا تجربہ ہوتا ہے۔
ایک بڑا مصنف بہت سے۔ ان گنت چھوٹے گنم اور عام مصنفوں کی ہل چلائی ہوئی زمین میں
اپنی ذہانت، تجربے اور روایت کا بیج بو تاپے۔

ہر بڑی کتاب ایک خاص معاشرے اور تہذیب کی عکاسی ہی نہیں کرتی۔ بلکہ اس بڑی
تہذیب اور معاشرے کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔

بعض کتابوں کو ایک پوری انسانی تہذیب اور ان گنت انسانوں اور نسلوں کا اجتماعی تجربہ
تحریر کرنا ہے۔ ایسی کی ایک کلی، ایک پٹے۔ ایک بولی مان گنت، لوگ گنتوں اور کھاؤں کی
طرح بعض کتابوں کے مصنفوں کے بارے میں بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کون تھے.....

ہر دور میں انسان ایک تہذیب ایک معاشرے کو جنم دیتا رہا اور پھر یہ تہذیب اور یہ
معاشرہ اپنا اظہار بھی کرتا رہا۔ ایلوورا اور بابا اور افریقی ممالک کی غاروں میں کی گئی تصویر کشی شکر ساشی
دراصل انسانوں کے اجتماعی تہذیبی اور تخلیقی جذبوں کا ہی اظہار تھا۔

”الف لیلہ“، بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کو ایک تہذیب نے جنم دیا۔ انتظار حسین نے لکھا ہے
”الف لیلہ کو جس تخلیق نے جنم دیا ہے۔ آج ہم اس کے خالق یا خالقوں کے نام بھی
صحیح طور پر نہیں بتا سکتے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ سارے عربوں نے یا ایک پوری
تہذیب نے اسے تصنیف کیا ہے“

(اجتماعی تہذیب اور افسانہ۔ انتظار حسین)

ایک پوری تہذیب کی یہ تصنیف — الف لیلہ — دنیا کی ان معدودے چند کتابوں میں

سے ہے۔ جس نے ایک وطن میں بھی اس طرح جہم لیا کہ اس کا عالمگیریت اور بین الاقوامیت سے خمیر اٹھا تھا اور مکمل ہونے کے بعد بھی اس کا گھر اور وطن ساری دنیا ہے۔

الف یلیٰ کے ایک ہزار ایک روپے ہیں۔ یہ عربوں کی اس تہذیب کی پیداوار ہے۔ جب عرب تاجر کی حیثیت سے دنیا دنیا گھومتے تھے۔ رنگ رنگ کے لوگوں کو ملتے اور طرح طرح کے عجائبات سے متعارف ہوتے تھے۔ خاص قبائلی طرز احساس رکھنے والے ان جہانیاں جہاں گشت عربوں نے دنیا بھر میں جو دیکھا جو سنا۔ وہ اپنے خاص انداز میں، قصے اور حکایت کے روپ میں الف یلیٰ کی کہانیوں میں یک جان کر دیا۔

تحقیق نے "الف یلیٰ" پر جو کام کیا ہے۔ وہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ صدیوں سے الف یلیٰ انسانوں کے مطالعے میں رہی ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک زبان سے دوسری زبان تک الف یلیٰ کا سفر، چہار اکناف عالم کا احاطہ کرتا ہے۔ دس دس کے لوگوں اور محققوں نے اپنے اپنے زمانے میں جا دو کے اس پیارے کے طلسم کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور کچھ نتائج برآمد کئے ہیں۔

الف یلیٰ میں بہت سی ایسی کہانیاں ہیں جو دوسرے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً الہ ادرین اور جلدوئی چراغ کوہی لیجئے تو اس کا قدیم ترین سراغ قدیم چین میں بھی ملتا ہے۔

سند باد کے فانڈے — یونیسس سے جاتے ہیں۔ اس طرح بہت سی کہانیوں کے واقعات عناصر ایسے ہیں جو عربوں کی سیاحت اور تجارتی سفر کے تجربے کے حوالے سے عربوں تک پہنچے اور انہوں نے ان کو اپنا رنگ دے کر الف یلیٰ میں شامل کر لیا ہے۔

یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کتابی اور تحریری صورت میں آنے سے پہلے یہ کہانیاں عرب ایک دوسرے کو سنتے تھے۔ حتیٰ کہ عربوں کے معاشرے میں جو بڑے میلے لگتے ہیں۔ وہاں عربی کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ کہانیاں سننے کا بھی مقابلہ ہوتا تھا۔ بازاروں اور قہوہ خانوں اور سراؤں میں بھی داستان گو یہ کہانیاں سناتے تھے۔ سفر کے مراحل طے کرنے والے قافلے کہیں پڑاؤ کرتے تو کہانیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ تھکن بھی اتر جاتی اور ذہن بھی تازہ ہو جاتا۔

» الف یلیٰ « کو کس نے پہلی اور کتابی اور تحریری صورت دی۔ اس سلسلے میں کسی ایک

کا نام نہیں لیا جاتا۔ محققوں نے بھی جو تحقیق کی ہے۔ وہ بھی کسی دو ٹوک فیصلے تک نہیں پہنچتی۔
الف یلے کو ایک پورے معاشرے۔ ایک پوری جلتی جاگتی دینا اور ایک بھر پور تہذیب نے
تخلیق کیا ہے۔ تاہم ہمیں محققوں کے حوالے سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ الف یلے کو تحریر کرنے کا زمانہ
عباسی دور کے خلفار کے بعد کا ہے۔

الف یلے کے راجہ دو اور طلسم کا اندازہ تو اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عباسی دور خلافت کے
بعد جب یہ تحریر ہی صورت میں آئی تو ساری دنیا میں اس طرح مقبول ہوئی۔ جیسے واقعی جادو اور جڑی
کمر پوتے ہے۔ جن سے اب تک اس کا جادو قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

دنیا کی کون سی زبان ہے جس میں الف یلے اتر جہ تھیں ہوئی اور ایک بار نہیں بار بار اس کا ترجمہ
ہوا۔ کتنے ہی لکھنے والوں نے الف یلے کی کہانیوں کو اپنے اپنے انداز میں لکھا۔ یہ وہ کتاب ہے
جس کی کہانیاں ہر نسل اور ہر ملک کے انسانوں میں مقبول ہیں۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جن سے بچے
بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔

الف یلے کی کہانیوں پر یعنی بننے والی فلموں کو بھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ کون سا ملک ہے
جہاں الف یلے پر یعنی کئی کہانیوں پر کتنی ہی فلمیں مختلف ادوار میں نہ بنی ہوں۔

الف یلے میں سحر ہے۔ وہ کشش ہے ایسا جادو ہے جو سب کو امیر کر لیتا ہے۔ عالمی ادب
میں شاید چند ہی ایسی کتابیں ہوں گی جن کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور لافانی ہوں گے جتنے الف یلے
کے۔ الف یلے کے کرداروں نے عالمی ادب کو نئی معنویت نئی علامتیں اور نئے استعاروں کی
دولت سے بہرہ ور میں مالا مال کیا ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو نہ صرف ایک تہذیب کی پیداوار ہیں
بلکہ ہر انسان کے جذبات، امنگوں، حسرتوں، خوشیوں، مہموں، جذبہ سیاحت، نفرت محبت
اور ان گنت احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

صدیوں سے یہ کردار زندہ ہیں۔ زبان زد عام ہیں۔ روزمرہ گفتگو میں اپنا اظہار کرتے ہیں
ہر ذہنی سطح کا انسان ان کے حوالے سے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

ہر انسان کے اندر دوسری دنیاؤں کو دیکھنے اور برتنے کا ایک میکران جذبہ ہوتا ہے۔ الف یلے
کے کردار اسی جذبے کا، آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ کردار اور وہ دنیا ہے جس میں

انسان کا تعلق فطرت اور فطرت کے تمام مظاہر سے پوری طرح قائم ہے وہ نئی نئی مخلوقات اور عجائبات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ الفیلے ایسی ہی بڑا سرسبز زمینوں میں اپنے قاربین کو لے جاتی ہے جو ان دیکھی ہیں جو انسانوں کے وسیع اور بیکراں تخیلات میں ازل سے آباد ہیں۔

اس دور کا انسان تو ہم پرست نہیں تھا۔ بلکہ جادو، ٹوٹا، طلسم، جن، بھوت، پریاں اور جادو کے کرتبے اس کے لئے بڑی حقیقتیں ہیں۔ ان انسانوں کا تخیل وسیع اور بے پایاں ہے اور یہ تخیل یقین میں اس حد تک تبدیل ہو چکا ہے کہ ان کھٹولا، جادو کا گھوڑا، الہ دین کا جادوئی چراغ ایسے ان گنت کرتبے اس کے لئے حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں۔

الفیلے میں لافانی کرداروں کی ایک دنیا آباد ہے شہزادے، شہزادیاں، غلام، کینزیں وزیر مصاحب، خواجہ سرا جادوگر، بزرگ، چڑھلیں، آسیب، سیاح، مزدور، فقیر، حجام، نانبائی، ملاح اور طرح طرح کے جانور اور پرند، جن کا دنیا کے ان باسیوں کے ساتھ گہرا اور سچا رشتہ ہے۔ ان کرداروں کی اس دنیا میں شراب و کباب کی دعوتیں اور مٹھلیں جمتی ہیں اور ان دعوتوں میں طرح طرح کے فریب دیئے جلتے ہیں۔ یہاں ایک آن میں انسان کی قسمت بدل جاتی ہے۔ گدا بادشاہ بن جاتا ہے اور بادشاہ گدا۔ زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانے ان انسانوں پر اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کرداروں کی ایک دنیا اور سطح تو ظاہری ہے لیکن ان کی اصل سطح باطنی ہے اور یہی وہ باطنی سطح ہے جو ہر دور کے انسانوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتی اور ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ کردار مختلف انسانی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف طبقوں سے ان کا واسطہ ہے مگر اس میں انسان ہے کیا؟ یہ الفیلے کی کہانیوں کا موضوع ہے۔

الفیلے کا آغاز جس انداز میں ہوتا ہے وہ اپنی جگہ بے حد معنی خیز ہے۔ ایک بادشاہ ہے شہریار، اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ملکہ ایک بدکار عورت ہے۔ شہریار کو اپنی ملکہ کی بدکاری سے اتنا صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ عورت ذات سے ہی بدظن ہو جاتا ہے۔ وہ ہر روز ایک عورت سے نکاح کرتا ہے اور دوسری صبح اُسے ہلاک کر دیتا ہے۔

کیا وہ عورت ذات سے انتقام لے رہا ہے؟

کیا وہ ہر رات عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا؟

یہ سوال اپنی جگہ۔ لیکن شہریار یہ سمجھتا ہے کہ اب عورت کے ساتھ بس ایک رات ہی بسر کرنی چاہیے تاکہ وہ زندہ رہے۔ نہ بے وفائی کر سکے۔ وزیر زادی شہر زاد بھی ایک رات کی بیوی بننے کے لئے شہریار کی حرم سرا میں داخل ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بہن دنیا زاد کو بھی لے آتی ہے جو شاد و کی رات کہانی سننے کا تقاضا کرتی ہے۔ شہر زاد کہانی سناتی ہے۔ کہانی سے کہانی نکلتی ہے شہریار بھی کہانی کے جادو کا گھائل ہو گیا ہے۔

عالمی ادب میں شہر زاد — ایک لافانی کردار ہے۔ اس کردار کو ہر دور میں نئے نئے معنی پہنائے جاسکتے ہیں۔

WOMENS LIB کے اس دور میں بھی شہر زاد کے نئے نئے معنی سامنے آئے ہیں۔ شہر زاد — دانا ہے وہ اپنی کہانیوں کے حوالے سے انسانی فطرت سے پرہیزے اٹھاتی چلا جاتی ہے وہ ان کہانیوں کے ذریعے بتاتی ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کی فطرت کیا ہے اس کی اصل کیا ہے۔ شہر زاد کے کردار کا ایک خاص پہلو ان کہانیوں کے حوالے سے سامنے آتا ہے جن میں وہ اپنی ہم جنسوں کے بارے میں بڑی سفاکی کا اظہار کرتی ہے۔ وہ عورت کے ساتھ انصاف کرنے کی کھال ہی نہیں دکھائی دیتی۔

ایک ہزار ایک راتوں کے بعد ان کہانیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو شہریار — شہر زاد کو قتل نہیں کرتا۔ بلکہ اسے ایک دانا اور صاحبِ بعیرت عورت کے حوالے سے اپنی ملکہ قبول کر لیتا ہے۔ اصل میں شہریار — شہر زاد کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے اس انسانی فطرت کا شعور اور ادراک حاصل کر لیتا ہے۔ جو اسے پہلے حاصل نہیں تھا۔

» الف لیلے « میں جو کہانیاں شامل ہیں ان کی ایک خاص خوبی ہے جسے دنیا بھر کے اہل علم نے سراہا ہے۔ وہ خاص خوبی یہ ہے کہ مشرقی ممالک کی حکایات اور قصوں کے ساتھ اخلاقی ہندو نصائح اور وعظ کی جو بیج لگی ہوئی ہے وہ الف لیلے کی کہانیوں میں سر سے سے موجود نہیں۔ کسی طرح کا کوئی اخلاقی معیار۔ انسانی فطرت کے اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ آدمی کو مدد دینی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی جو کوشش الف لیلے میں ملتی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ بیسویں صدی کے مغربی فکشن کا بڑا اوصاف یہی ہے جو الف لیلے کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

الف ییلے کی کہا نیوں کے کردار بھی خاص طرح کے کردار ہیں۔ یہ بڑے بڑے انقلابات کی ظاہری اور باطنی تبدیلیوں سے ممکنہ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے جاگلس مراحل طے کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مافوق الفطرت کردار نہیں بنتے، اس سلسلے میں انتظار حسین نے ان کرداروں کا تجزیہ بہت صحیح کیا ہے انتظار حسین کہتے ہیں:

” الف ییلے میں قد آور کردار نہیں ملتے اس کے مختلف کردار اعلیٰ انسانی صفات رکھتے مافوق الفطرت طاقتوں سے بھی انہیں ملک حاصل ہو جاتی ہے لیکن وہ اتنے قد آور نہیں بنتے۔ کپوری الف ییلے پر سچا جائیں۔ سندباد جہاز ہی نے بھی بہت سفر کئے ہیں اور بہت کشت کھینچے ہیں اور اپنی ذہانت و قنانت کے زور پر خطروں سے نجات حاصل کی ہے مگر وہ یوسیس نہیں بنتا۔ اس حیثیت سے الف ییلے شاید پرانے زمانے کی داستانوں اور رزمیہ قصوں سے قدرے الگ ہے۔ رزمیہ قصوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ کسی برگزیدہ خاندان کا ایک فرد یا چند افراد ساری انسانی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اتنے قد آور بن گئے ہوں کہ خلقت کے مرجع و مرکز بنے ہوئے ہیں۔ الف ییلے میں مثالی ہیرو کے اس تصور کی نفی ملتی ہے۔ اس کی کہا نیوں کے ہیرو محض خوبیوں کا مجموعہ نہیں ہیں ان میں بہت سی اچھائیاں ہیں جن کے زور پر وہ ترقی کرتے ہیں مگر پھر انسان ہیں۔ ان میں کمزوریاں بھی تو ہیں اس لئے کسی منزل پر وہ فوق الانسان دیوتا نہیں بنتے،“

اردو انگریزی اور فارسی میں جلنے الف ییلے کے کتنے طرح طرح کے ایڈیشن ملتے ہیں لکھنے والے نے اپنے اپنے انداز میں الف ییلے کی کہا نیوں کو لکھا ہے میرے مطالعے الف ییلے کے انہی تینوں زبانوں کے نسخے گزرے ہیں۔ رچرڈ برٹن نے جو الف ییلے مرتب کی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے اس کا شہرہ بھی بہت ہے الف ییلے کے متعدد ایڈیشنوں کی بھی ایک زمانے میں دھوم مچی۔ ہمارے ہاں رتن ناتھ سرشار نے جو الف ییلے مرتب کی۔ اس کا ذائقہ مختلف ہے اردو میں جلنے کتنے نائٹروں نے اسے کس کس انداز میں شائع کیا ہے اور یہی حال ساری دنیا کی دوسری زبانوں کا ہے!

الف ییلے کی تلخیص ممکن نہیں۔

کسی ایک کہانی کا انتخاب بے حد مشکل ہے ایک مضمون میں کون سی کہانی شامل کی جائے؟ کسے رو کیا جائے؟ الف ییلے کی کہانیاں بچپن سے سنتے چلے آئے والے لوگ بھی جب اسے دوبارہ سنتے اور پڑھتے ہیں تو اس میں ایک نیا لطف اور حُظِ عسوس کرتے ہیں۔ میں کون سی کہانی کا ذکر کروں؟

”علی بابا چالیس چور، کاسہ“ الہ دین اور جادوئی چراغ، کاسند باد جہاز ہی کا، سونے جگتے۔ ابو الحسن کے قصے کا کانسے مزدور اور قلندروں کا قصہ، کہانی کا شغز کے درزی اور کبرے کی کہانی، ججام میک کے بھائیوں کے قصے، میمون پرہی اور شہزادہ قمر الزماں کی کہانی... خانم کی حکایت۔ نعمان اور اس کی گھوڑی کی کہانی... کس کس کہانی کو بیان کروں کسے رکھوں کسے چھوڑوں؟ چلیں۔ آپ اس ججام سے ہی مل لیں جس کے بھائی بھی اس کی طرح بے مثل تھے۔

الف ییلے کا کردار

بنداد کا ایک جوان معزز تاجروں کے خاندان کا چشم و چراغ، باپ کی موت کے بعد بامداد کا دارت مالک بنا۔ سچا کاروباری، عورتوں سے متنفر، لیکن ایک دن ایک مکان کے درپیکھے میں ایک جین مچھیں کو دیکھ کر دل آگیا۔ جو قاضی شہر کی دختر نیک اختر متھی ایک بڑھیا کے توسط سے ملاقات کی سبیل بنی جسے کو اسے اپنی بیویہ کے ہاں جانے کا پیغام ملا۔ وہ جمعے کے دن جمبوہ سے ملاقات کی تیار یوں میں مصروف ہے۔ ججامت بنانے کے لئے ایک ملازم سے کہا وہ ایک ججام کو لے آیا۔ اب سنتے۔ وہ نوجوان کیا سنا تا ہے۔

”ججام نے آتے ہی مجھے سلام کیا دعائیں دے کر پوچھا آپ بال کٹوانا چاہتے ہیں یا فصہ کھلوانے کا ارادہ ہے پھر بولا جمعہ کے دن بال کٹوانا ستر بیماریوں کو دور کرتا ہے اور فصہ کھلوانا بیماریوں کو دعوت دیتا ہے میں نے کہا کہ تم اس وعظ نصیحت کو رہنے دو جلدی سے میری ججامت بنا دو۔ یہ ججام نافرہام بات سنتے ہی آلات نجوم نکال کر عین صحن میں سورج کے سامنے کھڑا ہو گیا چند منٹ سوچ کر بولا! ستارہ منج

اس وقت سات درجے اور چھ دقیقے پر ہے یہ ساعت حجامت کے لئے موزوں نہیں تھے اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کسی نیک آدمی کے پاس جا رہے ہیں۔ مگر گفتگو کے بعد مصیبت و تکلیف کا سامنا کرنا ہو گا۔ میں نے بھیجلا کر کہا ”بکواس نہ کرو جس کام کے لئے بلائے گئے ہو وہ کام کرو“

یہ بد بخت بولا ”آپ کو کونسا کام درپیش ہے تفصیل سے بیان کریں۔ صحیح اور اچھا مشورہ دوں گا۔ میں نے اسے بکواس سے روکا تو بولا صاحب آپ مجھے بکواسی کہتے ہیں بکواسی اور بے ہودہ تو میرے بھائی ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں نے میرا نام ہی ساعت رکھ دیا ہوا ہے“ یہ بد بخت مجھے اپنے بھائیوں کے نام سننے لگا عجیب و غریب ناہے بقبوق، بلبک، الکوڑ وغیرہ، میں اس سے تنگ آ گیا۔ غلام سے کہا اسے ادھار دینا۔ دے کر رخصت کرو میرا وقت ضائع کر رہا ہے وہ بد بخت بولا۔ حضرت خدمت کئے بغیر تو میں نہ جاؤں گا۔ آپ نے مجھے پہچانا۔ میری قدر کی۔ میں کچھ نہیں مانگتا۔ مفت خدمت کروں گا آپ کے والد محترم کے بھی مجھ پر بڑے احسان ہیں میں اس کی اور بھی بکواس سے تنگ آ کر مشتعل ہوا تو بولا ”آپ ناراض نہیں ہوں آپ کے والد تو میرے مشورے سے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہ ڈالتے تھے یاد رکھیں اس وقت تمام دنیا میں مجھ سے بڑھ کر آپ کسی کو اپنا ہمدرد اور غلص نہ پائیں گے میں اس کی بکواس سے تنگ آ گیا۔ لیکن وہ تو مجھے یہ بتا کر شرمندہ کرنے لگا کہ بچپن میں وہ مجھے کندھوں پر سوار کر کے کتے پہنچایا کرتا تھا خدا جانتا ہے وہ جھوٹ بولتا تھا بیچارے کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں نے اسے سختی سے ڈانٹا کہ حجامت بنانا ہے تو بناؤ۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ بالآخر اس نامزد نے استرا نکالا اور پتھر پر تیز کرنے لگا۔ ایک گھنٹہ اور بکواس میں ضائع کر کے حجامت بنانے لگا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بلا سے نجات ملنے والی ہے ابھی آدمی حجامت کرنے پایا تھا کہ میں نے کہا ”جلدی کرو“ بس یہ الفاظ سنئے ہی اس نے ہاتھ روک لیا اور بولا صاحب بزرگوں کا قول نہیں سنا۔ تبجھل کار سے شیاطین بود۔

بس اسے موقع مل گیا، یوں گھٹنے ٹیک وہ ہاتھ دوسرے کے زبان چلاتا رہا۔ جب میں نے پھر اسے غصے سے ڈانٹا تو مجھے سمجھنے لگا کہ ابھی چھوٹے ہیں اور نا تجربہ کار میں مجھے بتائیں کہاں جانا ہے حجامت آدھی چھوڑ پھر بخوم کے آلات لے کر بیٹھ گیا بولا کہ جمع میں ابھی تین گھنٹے پڑے ہیں کیا جلدی ہے۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ ڈانٹا۔ غصہ نکالا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا آخر میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایک دعوت میں جانا ہے۔ دعوت کا نام سنا تو وہ بے جبا اچھل پڑا اسے کو پھر پتھری پر تیز کرتے، موٹے بولا۔ ایک بات بنا بھول گیا، میں نے بھی کل اپنے کچھ دوستوں کو دعوت پر اپنے گھر بلا یا ہے مگر ابھی تک کوئی تیاری نہیں کی۔ میں نے کہا کہ تم فکر نہ کرو جلدی سے حجامت بنا دو۔ دعوت کا انتظام میں کر دوں گا۔ وہ کم سخت اب یہ پوچھنے لگا کہ دعوت کے لئے اسے کیا کیا چیزیں ملیں گی، میں نے کئی چیزوں اور دکھاؤں کے نام لے کر اپنی جان چھڑانا چاہی بولا "مجھے بھی چیزیں دکھا دی جائیں،" مرتا کیا ناکرتا نو کروں کو بلوا کر اسے بھی کچھ دکھایا تو وہ بدبخت بولا بس اک شراب کی کمی ہے۔ میں نے جب شراب بھی منگوا دی تو وہ لگا میرا قصیدہ پڑھنے۔ مگر حجامت کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھایا۔ پتھری پر استزار گڑا چلا گیا پھر بولا آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن تھوڑی سی خوشبو بھی منگوا دیں، "قدر درویش بر جان ریوش یہ حکم بھی پورا کیا اور پھر منت سماجت کرنے لگا کہ وہ حجامت بنا دے اس پر کچھ استرا ہلا، تھوڑی سی حجامت بنا کر باقی ادھوری چھوڑا اپنی کم گوئی (غاسوشی)، کم زبانی اور میری سخاوت کے متعلق اشعار کہنے لگا پھر اپنے دوستوں کے قصے لے بیٹھا۔ خدا خدا کر کے کسی طرح حجامت مکمل کرنے پر رضامند کیا۔ خدا خدا کر کے کئی گھنٹوں میں حجامت ختم ہوئی تو بولا کہ آپ غسل کر لیں۔ میں سامان دعوت اپنے احباب کو دے کر ابھی حاضر ہوتا ہوں آج میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ خدا نہ کرے دعوت میں کوئی مصیبت پیش آجائے متورے کے لئے میرا ہونا بے حد ضروری ہے،"

خدا خدا کر کے وہ سامان اٹھا کر چلا گیا۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ جی میں خوش تھا کہ عذاب سے جان چھوٹی مگر وہ بدبخت تو ایک کائیاں نکلا۔ سامان مزدوروں کے ہاتھ گھڑ بھوا کر

وہ گلی میں چھپ رہا۔ میں نے خوب کے مکان کا راستہ لیا تو میرے پیچھے پیچھے چھپ کر چلتا رہا۔ میں خوب کے مکان کے اندر پہنچا، وہ بھی چھپ کر اندر آ پہنچا اور شرمی قسمت سے قاضی صاحب گھر میں تھے۔ ہمیں نوٹڈی پر خفا ہوئے اور اسے مارنے لگے۔ نوٹڈی کو بچانے کوئی غلام بیچ میں آ گیا تو قاضی صاحب نے صفحے میں اسے بھی دھر لیا۔ غلام کے چلانے کی آواز سے یہ نافر جام حجام سمجھا کہ شاید اندر میری دستک بن رہی ہے۔ اس نے کپڑے پھاڑ چلانا شروع کر دیا محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے یہ انہیں کہنے لگا:

”قاضی صاحب میرے آقا کو پیٹ رہے ہیں“

پھر میرے گھر دوڑا، میرے غلاموں کو بلالایا جو لاٹھوں سے مسلح ہو کر قاضی صاحب کے مکان پر گئے اور دروازہ توڑنے لگے۔ قاضی حیران کر الٹی کیا ماجرا ہے؟ دروازے پر لوگوں کا ہجوم دیکھا تو پوچھا سب نے کہا:

”ہمارے آقا کو بے گناہ کیوں مار رہے ہو“

قاضی صاحب نے پوچھا:

”تمہارا آقا کون ہے؟ کب اور کیوں آیا اور بھلا اس نے میرا کیا بگاڑا تھا کہ میں اسے مارنے لگا؟“

اس ظالم حجام نے جواب دیا:

”قاضی تو بڑا مرزا رہے۔ اب مکرنا ہے۔ میرا آقا تمہاری بیٹی پر عاشق ہے۔ تمہاری بیٹی نے موقع پا کر آج اسے دعوت پر بلایا تمہیں کسی طرح خبر ہو گئی، تم نے اپنے غلاموں سے میرے آقا کو قتل کر دیا۔“

میری گھبراہٹ اور پریشانی کا اندازہ لگائیے اس نافر جام حجام نے سالا بھاڑا اچھوڑ دیا تھا۔ قاضی صاحب شرمسار ہو رہے تھے۔ اپنا بھرم رکھنے کو بولے:

”تمہارا آقا اندر ہے تو جا کر خود ہی لے آؤ“

مخوس حجام اندر داخل ہوا۔ اپنی خوب کی بدنامی کے خوف سے میں ایک صندوق میں چھپ گیا۔ ظالم حجام اس صندوق کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ میں بلدی سے صندوق سے نکلا اور بھاگا۔ لوگ میرے

ہمچھے پیچھے تالیاں بجاتے آرہے تھے میں نے اشرفیاں جیب سے نکال کر پھینک دیں کہ لوگ پیچھا نہ کریں۔ لیکن لوگ اشرفیاں اٹھا کر پھر میرے پیچھے بھاگے اس بھاگ دوڑ میں میری ٹانگ پر سخت چوٹ اگئی اور میں لنگڑا ہو گیا، ایک کوچے میں گھس کر چھپنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ یہ حجام میرے پیچھے بھاگتا چلا آ رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

دو دیکھا صاحب۔ میں نہ کہتا تھا کہ جلد ہی شیطان کا کام ہوتا ہے خدا کا نکر ہے۔ آقا کہ آپ کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اگر میں موقع پر نہ پہنچتا تو نصیب دشمنان آپ کی جان جانے میں کیا کسرتھی“

اس بدبخت نے میری بیویہ کو ہمیشہ کے لئے بچہ سے جدا کر دیا تھا:

”میں نے اسے ڈانٹا کہ خدا کے لئے اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو مگر یہ کم بخت اپنی بکواس لے بیٹھا۔ کسی طرح اس سے جان چھڑا کر ایک دوست سوداگر کے ہاں پناہ لی اور عہد کیا کہ جس شہر میں یہ حجام رہے گا میں وہاں نہ رہوں گا۔ اپنی جائیداد ادا کرنے پر: بیچ بگدا و چھوڑ دیا آج یہ پھر دکھائی دیا ہے اس کی موجودگی میرے لئے کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ میں یہ شہر بھی چھوڑ دوں گا“

کنٹربری ٹیلز

وہ شخص جسے انگریزی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ جوہزی چاسر ایک اندازے کے مطابق ۱۳۴۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی جس کتاب کو عالمگیر شہرت ملی اور جس کی وجہ سے وہ دنیا کے عظیم شاعروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے وہ کنٹربری ٹیلز ہیں۔ پچھلی پانچ صدیاں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ کنٹربری ٹیلز کو نہ صرف ساری دنیا میں پڑھا گیا ہے بلکہ اس کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔ کنٹربری ٹیلز نے اپنے محاسن اور شاعری کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ دنیا کی عظیم کتابوں میں سے ایک ہے۔ چاسر وہ شاعر ہے جس کی زبان آج بہت حد تک متروک ہو چکی، لہجے اور املا میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔ اس کے باوجود چاسر ہی وہ شاعر ہے جس نے انگریزی شاعری کے وسیع تر امکانات کو نمایاں کیا اظہار کو دست سے آشکار کیا اور انگریزی نظم و شعر کو نئی جہتیں بخشیں جو بعد میں عظیم انگریزی شاعری کے لیے بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

کنٹربری ٹیلز ایک خاص وجہ سے حوالے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ کنٹربری ٹیلز میں ایک کہانی ہے "WIFF OF BATH" اس منظوم کہانی میں بعض ایسے الفاظ ایسے پیرائے میں استعمال ہوئے ہیں جب بھی کسی کتاب پر فحاشی یا عیوانی کا الزام لگایا اس پر مقدمہ چلایا گیا تو اس کہانی کا ذکر ضرور ہوا۔

کنٹربری ٹیلز، ہائیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ دو کہانیاں ناممکن بھی ہیں اس پر ایک طویل۔ THE GENERAL PROLEBUE بھی شامل ہے۔ حوالے اترین شاعری کا منظر ہے۔ چاسر اپنی اس کتاب کو کس طرح ترتیب دینا چاہتا تھا اور اس کے ذہن میں اس کی تکمیل کا کیا

نقشہ تھا۔ اس کے بارے میں دثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ چاسر اپنا یہ کام مکمل نہ کر سکا کیونکہ ہسپاٹ نے لکھا ہے کہ کنٹر بری ٹیلر کے اسی قلمی مسودے موجود ہیں جن میں خاصا تضاد پایا جاتا ہے۔ جیورفی چاسر کا باپ لندن کی ایک سرائے کا مالک تھا۔ چاسر کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں اور انہیں بھی مستند نہیں کہا جاتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے آکسفورڈ یا کیمبرج میں تعلیم حاصل کی ہوگی تاہم یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ بادشاہ ایڈورڈ سوم کا ملازم و مستند خاص تھا۔ جب ۱۲۵۹ء میں ایڈورڈ سوم نے فرانس پر حملہ کیا تو چاسر اس کے ساتھ تھا۔ اس لڑائی میں چاسر لاجبگی قیدی بنایا گیا تھا۔ خود بادشاہ نے اس کے خدیوے کی رقم ادا کر کے اسے رہائی دلوائی۔

پرنس لائینل ڈیلوک آف کلیرنس اس کا مرتب تھا۔ ۱۳۶۸ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی خدمات پرنس لائینل کے بھائی پرنس ڈیلوک آف لنکاسٹر نے حاصل کر لیں۔ ۱۳۷۰ء سے ۱۳۸۶ء تک چاسر کا تعلق دربار سے رہا۔ اسے کئی بار ہم سفر ترقی پر بھیجا گیا اسے متعدد بار ہم حدودی پر فائز رہنے کا موقع ملا۔ سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ عمدے اکثر عارضی ثابت ہوتے رہے۔ ۱۳۸۶ء میں وہ ویسٹ منسٹر میں منعقد ہونے والی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوا۔

۱۳۸۷ء میں اس کی بیوی کا انتقال ہوا اس کا اوصو را نام ہی معلوم ہو سکا ہے جو فلپا ہے۔ چاسر کا ایک بیٹا ایوس بھی تھا۔ اس کے بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں کہ بعد میں وہ کیا بنا۔ ۱۳۹۳ء میں بادشاہ نے چاسر کے لیے تاحیات میں پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ جب ہنری چہارم بادشاہ بنا تو چاسر نے اس کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی کہ اس پیش میں اس کا گزارہ نہیں ہونا اور وہ انتہائی ناداری سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ بادشاہ ہنری چہارم نے اس کی پیشش دگنی کر دی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۴۰۰ء کو چاسر کا انتقال ہوا اسے ویسٹ منسٹر لایب کے اس گروٹھے میں دفن کیا گیا جسے آج گروتھ شرا کے نام سے شہرت حاصل کی۔

چاسر کی شاعری کی ابتداء کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ جب اس کے مرتب اور آقا ڈیلوک آف لنکاسٹر کی سیکم فوت ہوئی تو چاسر نے انجیلیا۔ ۱۳۶۹ء میں ایک منظم اس کی موت پر لکھی اس کے بعد اس نے کئی دوسری نظمیں بھی لکھیں۔ ۱۳۸۷ء میں وہ اپنے شہر آفاق تخلیقی فن پائے کنٹر بری ٹیلر پر خاصا کام کر چکا تھا۔

چاسر کی بار اٹلی گیا وہ ڈانٹے اور بوکیچیو سے بے حد متاثر تھا۔ کنسٹریٹلینز میں بعض ایسی حکایات ہو چڑی ہیں جو چاسر نے بوکیچیو کی ڈیکورن سے لی ہیں، اس نے ان کہانیوں کے مواد کو اپنے انداز میں استعمال کیا ہے۔

پہلے پہل اس نے سات مصرعوں پر مشتمل بند STANZA پر مبنی نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک پورا پورا باوزن شعر لکھ کر نظم کی ہیئت میں تجربے کرتا رہا۔

کنسٹریٹریٹلینز، انگریزی ادب کے عظیم ترین شاعر کاروں میں ایک ہے۔ عمر اور زندگی نے اس کے ساتھ وفانہ کی کردہ، کنسٹریٹریٹلینز کو اس طرح پورا کر سکتا۔ جس طرح کا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ اس کے باوجود موجودہ شکل میں بھی یہ ایک عظیم فن پارہ ہے۔

کنسٹریٹریٹلینز میں طویل ابتدائیے کا ذکر ہو چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ عالمی شاعری میں یہ نظم (ابتدائیہ) ایک بڑا شعری کارنامہ ہے اس میں ایسی شگفتگی، ایسی سچائی اور جامعیت ملتی ہے جو دنیا کے بہت کم شعری فن پاروں کو حاصل ہوئی ہے۔

کنسٹریٹریٹلینز کی فارم کچھ یوں ہے کہ کچھ زائرین ہیں جو لندن سے سینٹ تھامس بیگٹ کے مزار کی زیارت کے لیے کنسٹریٹریٹلینز روانہ ہوتے ہیں۔ کنسٹریٹریٹلینز کے ابتدائیے سے پتہ چلتا ہے کہ زائرین کی تعداد تیس ہے وہ راستے میں دو دو کہانیاں سناتے ہیں۔ واپسی میں دو کہانیاں پوری ہوتی ہیں۔

چاسر کا زمانہ عمد وسطی کا آخری دور ہے۔ یہ تیس زائرین اس دور کے انسانوں اور ہر ٹاپ کی نمائندگی کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ چاسر کا مشاہدہ ہمیں ان کرداروں سے اس طرح متعارف کرانا ہے کہ ہم ان کرداروں کی شبابہت جلیے اور نفسیات تک سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

اس سے پہلے کی شعری تاریخ میں ایسا انداز اور تجربہ کہیں نہیں ملتا بلاشبہ چاسر بوکیچیو کی ڈیکورن سے متاثر تھا لیکن کنسٹریٹریٹلینز میں وہ اپنے لیے بالکل نئی اور منفرد راہ نکالتا ہے۔

چاسر عمد وسطی کے آخری دور کے انسانوں کے حوالے سے جو کہانیاں ہیں سناتا ہے، یہ کہانیاں اپنے اسلوب اور بیان کے اعتبار سے بے حد منفرد ہیں یہ ہمیں آج کی حکایتیں محسوس ہوتی ہیں اسے چاسر کی خلافتی سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ایک زائر جو کہانی سناتا ہے وہ اس

کے اپنے مزاج، کردار اور نفسیات کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ کہانی اپنے سننے والے زائر کے نظریات بھی ہم تک منتقل کرتی ہے۔

”کنٹری بری ٹیلز“ میں چارس نے جو ادبی اور تخلیقی سا پختیار کیا ہے وہ اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر کے نقادوں نے ان کہانیوں کی تاثیر اور قوت کو سراہا ہے۔ یہ کہانیاں صرف نیکی بری اور انسانی اعمال پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ کہانیاں ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ انسان کیسا ہوتا ہے اور کیا ہے ان کہانیوں کے حوالے سے ہم انسان کی توانا شخصیت کو سمجھتے ہیں۔

چارس ایک ایسا شاعر ہے جو ایک خاص انداز فکر بھی رکھتا ہے وہ اپنی کہانیوں میں جب عورت کو موضوع بناتا ہے کسی عورت کے حوالے سے بات کرتا ہے تو ہمیں بہت جلد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ چارس اپنی خاص توجہ اور تخلیقی عمل سے عورت کو صرف عورت ہی نہیں رہنے دیتا بلکہ وہ عورت کو خاص عورت بنانے کا فن جانتا ہے۔ یہ اس کی ذاتی توجہ، فکری اور شادمانی گہرائی ہے وہ جب کسی پرندے مثلاً مرغ کا ذکر کرتا ہے تو وہ ہوتا تو عام مرغ ہے لیکن اسے وہ اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ مرغ پڑھنے والوں کے لیے ایک خاص مرغ بن جاتا ہے۔

چارس ایک انسان دوست اور شگفتہ مزاج شاعر ہے۔ جس لطافت اس کی شاعری کی جان ہے وہ انسانوں اور ان کے اعمال سے مغلوط ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو انسان ہی دکھاتا ہے۔ ان کو غیر معمولی توانا، خوب صورت، بد صورت یا احمق بنا کر نہیں دکھاتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسانوں میں تمام انسانی عناصر موجود ہوتے ہیں اس کے ہاں مزاج کا اظہار بھی بڑے خوب صورت رمز یہ انداز میں ہوتا ہے جو باطن کو متاثر کرتا ہے۔

KNIGHT 'S TALE ایک طویل منظوم کہانی ہے۔ یہ عمدہ سلی کا ایک دو مائس ہے۔

محبت اور محبت میں رومانی ذہن رکھنے والوں کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ اس کہانی کا خاص پہلو ہے۔ اس کہانی میں مسرت اور درد دونوں اس طرح سے گڈتے ہوئے ہیں جس سے ان کا تاثر اور بھرپور بنتا ہے۔

چارس کیسی انگریزی لکھتا تھا۔ اس دور میں انگریزی اٹلا اور لہجہ کیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے میں چارس کی ”کنٹری بری ٹیلز“ کے ابتدائی کے چار مصرعے دے رہا ہوں۔ یہ وہ انداز تحریر ہے جو

چاسر کا ہے ان چار مصرعوں کو آج کی زبان میں کس طرح لکھا جائے گا۔ اسے بھی تقابلی موازنے کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔

چاسر کے چار مصرعے

WHAN THAT APRILL WITH HIS SHOURS SOTE .

THE DROUGHTE OF MARCHE HAS PERCED TO THE ROTE,
AND BATHED EVERY VEYNE SWICH LICOUR OF WHICH
VERTY ENGENDRED IS THE FLOUR.

اب چاسر کی ان چار مصرعوں کا موجودہ انگریزی ورژن دیکھیے۔

WHEN APRIL WITH HIS SWEET SHOWERS HAS.

PIERCED THE DROUGHT OF MARCH TO THE ROOT,
AND BATHED EVERY VEIN IN SUCH MOISTURE.

AS HAS POWER TO BRING FORTH THE FLOWER.

یہ ترمیمی اور جدید ورژن جس کا ادب پر حالہ دیا گیا ہے اس کے مرتب کیمنٹ اور کانٹریسٹ سبٹ ہیں۔
جنہوں نے کنٹریسٹ برسی ٹیلز نئی شکل میں ترجمہ کر کے مرتب کیا ہے۔

کنٹریسٹ برسی ٹیلز کے ابتدائیے کے کچھ ٹکڑے۔

ذیل میں کنٹریسٹ برسی ٹیلز کے طویل ابتدائیے سے کچھ حصے دیے جا رہے ہیں جس سے اردو کے

تاریخین چاسر کی شعری صلاحیتوں اور شاہدے سے کسی حد تک متعارف ہو سکتے ہیں۔

اس طویل ابتدائیے میں چاسر کنٹریسٹ برسی ٹیلز کی وجہ تعریف بتاتا اور زائروں کا تعارف کراتا ہے

” اور ان میں ایک رابو برتن ابھی تھی۔

خانقاہ کی ننگوان

اس کی مسکراہٹ بڑی متوازن اور شیریں ہوتی

وہ بڑی سے بڑی قسم یہ کھاتی ”سینٹ لونی کی قسم“

ان کا نام مادام الکلنٹن تھا

وہ حمد کے نغمے بہت موثر انداز میں گاتی تھیں
 وہ فرانسیسی زبان بہت عمدہ بولتی اور جانتی تھی
 کھانے کی میز پر ان کے آداب و اطوار قابل تعریف تھے
 ان کے ہونٹوں سے کبھی ایک بھی لقمہ نیچے نہ آتا تھا
 وہ اپنی انگلیاں طشتری میں اس طرح لے جاتی تھیں کہ
 ان کی انگلیاں سالن سے کبھی آلودہ نہ ہوتی تھیں
 بڑی نفاست سے وہ لقمہ بنا کر اپنے ہونٹوں تک لے جاتی
 اور بڑی احتیاط سے کام لیتی تھی کہ
 ان کے سینے پر سالن کا کوئی قطرہ نہ گرے
 وہ اپنے بالائی لب کو اس احتیاط سے پونچھتی تھیں کہ
 ان کے گلاس پر چمکانی کا کبھی دھبہ یا داغ نہ لگتا تھا
 وہ بڑے نازک احساسات اور جذبات کی مالک تھیں
 ان کا دل فیاضی اور ہمدردی سے بھرا ہوا تھا۔
 کسی چوسے تک کو زخمی یا مردہ دیکھ کر
 وہ آنسو بہنے لگتی تھیں
 ان کے ساتھ کچھ کتے بھی تھے۔
 جنہیں وہ بٹھنا ہوا اگر شت اور عمدہ روٹی کھلاتی اور دو دو پلاتی تھیں
 اگر ان میں کوئی تکلیف میں ہوتا یا مر جانا
 تو وہ رونے لگتی تھیں
 ان کے سر کے بال مینڈھیلوں میں گندھے ہوئے تھے
 ان کا ناک خوش وضع تھا اور آنکھیں
 شیشے کی طرح چمک دار اور شفاف
 ان کا دلانا بہت چھوٹا، نرم اور مرنج تھا

اور بلاشبہ ان کی پیشانی بہت خوب صورت تھی

ان میں آکسفورڈ کا ایک کلرک بھی تھا۔
 جو ایک مدت سے اپنے آپ کو منطق کی راہ پر لگا چکا تھا
 آپ کا گھوڑا، واہ سبحان اللہ، اپنی مثال آپ تھا۔
 مرل، مرلا تڑا، خم کھایا ہوا
 اور آنجناب بھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں
 فریب یا صحت مند نہ تھے
 بڑے کھوکھلے سے اور سنجیدہ دکھائی دیتے تھے
 ان کا لبادہ تازنار ہو رہا تھا
 جس سے ان کی حالت ظاہر تھی کہ
 دنیاوی اور مادی اعتبار سے وہ کامیاب نہیں ہیں
 نہ ہی وہ کسی اچھے سماجی رتبے کے حامل تھے
 لیکن اسے کیا کہیے کہ آنجناب کے پاس
 میں مہلکہ۔ سرخ و سیاہ جلد والی
 ارسطو کی تصانیف اور فلسفے اور منطق کی۔
 کتابیں تھیں جنکو وہ اپنے سر ہانے رکھ کر سوتے تھے۔
 اسی لیے نہ تو ان کے پاس عمدہ لباس تھے۔
 نہ شیریں سروں والی بالنسری،
 وہ تو ایک فلسفی اور منطقی تھے۔
 اس لیے ان کے ہاں سونا کہاں دکھائی دیتا
 اپنے دوستوں اور احباب سے وہ جو کچھ حاصل کرتے
 سب اپنی تعلیم اور کتابوں پر خرچ کر کے

ان کے لیے سچے دل سے دعا کرتے تھے
 جوان کی تعلیم اور شوق کو باہمی رکھنے میں ان کے مدد و معاون ثابت ہو رہے تھے
 آسجناب اپنا زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرتے تھے
 ضرورت کے بغیر ان کے منہ سے کبھی ایک لفظ نہ نکلا تھا۔
 اور وہ جو بات کہتے وہی سچی، برعمل اور دو کوک ہوتی

ادمان میں ایک طبیب بھی تھے
 میں کہہ سکتا ہوں کہ ان جیسا
 اس پوری دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔
 طب اور جراحی میں وہ اپنی مثال آپ ہی تھے۔
 وہ علم سیارگان کے تحت اپنے مریضوں کا
 علاج کرتے تھے۔

ان کو بتاتے تھے کہ اس وقت کونسا تارہ کہاں ہے
 اور کس حال میں ہے اور اس کا اثر مریض پر کیا پڑ رہا ہے
 وہ مریض کو بتاتے تھے کہ جب اس کا تارہ فلاں مقام پر
 فلاں وقت پہنچے گا تو اس وقت مریض کے لیے دوائی کا استعمال مفید اور کارگر ثابت ہوگا
 ان کا علم ان کا اپنا تھا، ان کا طریق علاج اپنا تھا۔
 قدما میں سے وہ بقراط کر جانتے تھے نہ گین کو
 نہ ابن رشد کو، نہ ابن سینا کو
 وہ سُرخ اور نیلا لباس پسند کرتے تھے اور اکثر انہی رنگوں کے ملبوسات میں دکھائی دیتے۔
 عمدہ ریٹھی لباس دھاری دار
 وہ بہت ممتا تھے لیکن خرچ کرنے میں سخیل تھے۔
 دد حور و پریکا تے سے بڑے دلیں کے لیے جمع کر رہے تھے۔

چونکہ دو ایٹوں اور کشتوں میں سونا استعمال ہوتا ہے۔
اس لیے وہ سونے سے خاص محبت کرتے تھے۔

ان میں ایک اچھی خانہ دار بیوی بھی تھی۔ جو ہاتھ کے قریب کی رہنے والی تھی
یہ مشرم اور انسوس کی بات ہے کہ وہ کچھ اونچی ہنستی تھی۔
کپڑا بننے میں اسے وہ مہارت حاصل تھی کہ اس نے
پیرس اور گھنٹ کے جولا ہوں کو سمجھے چھوڑ دیا تھا
اس کا چہرہ کھلا ڈھلا ، خوب صورت اور سرخ و گلانی تھا
ساری عمر اس نے بڑے ٹھانڈے سے سچی عورت کی طرح بسر کی تھی۔

پانچ مردوں سے تو اس نے گرجے میں شادیاں کی تھیں
اور جوانی میں کتنے ہی نئے جن کے ساتھ رفاقت رہی تھی
لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔

تین بار وہ بی بی یروشلم جا چکی تھی
اس نے کتنے ہی معیب اور ابلجائے دریا عبور کیے تھے
وہ روم ، کولون ، بومگونہ میں کتنی زیارتوں

کا دیدار حاصل کر چکی تھی

وہ دوسروں کی موجودگی میں کھل کر ہنسنے اور جی بھر کر

گپ شب گمانے کی عادی تھی۔

وہ محبت کے دکنوں کا مداوا جانتی تھی۔

اور جب تک بعد میں معلوم ہوا وہ محبت کرنے کے قدیم فن کو جانتی تھی۔ محبت میں کس طرح

رقص کیا جاتا ہے،

وہ اس پر بھی مہارت رکھتی تھی....

اور ان میں سے ایک کسان بھی تو تھا۔ ایک سچا محنت کش
 اس نے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کون سا کھجور سے کتنے چھکڑے بھرے تھے
 وہ ایک سچی بے ریا اور ایماندارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔
 خدا کو وہ سچے دل سے پیار کرتا تھا
 خواہ وہ مسرور ہوتا یا رنجور۔ اس کا دل ذکر خدا سے خالی نہ ہوتا
 اور پھر خدا کے بعد سب سے زیادہ وہ اپنے پڑوسی سے پیار کرتا تھا
 وہ ہر محتاج اور غریب کے لیے یسوع کے نام پر
 ہر طرح کی خدمت انجام دینے کے لیے آمادہ رہتا
 اس کا بس چلنا تو کبھی کسی سے معاوضہ نہ لیتا۔

اور پھر وہاں ایک چکی والا بھی تھا۔
 وہ مجازی مضبوط اور بڑی ہڈیوں سے بنا ہوا آدمی تھا
 اس کے کندھے چھوٹے اور سینہ چوڑا تھا
 اور ہر دروازے کو اکھاڑ کر رکھ سکتا تھا۔ ہر دروازہ توڑ سکتا تھا
 اس کی دائرہ صی سرخ رنگ کی تھی جیسے لومڑی سرخ ہوتی ہے
 اور وہ دائرہ صی چھاج کی طرح چوڑی اور بڑی تھی۔
 اس کے نتھنے سیاہ اور چوڑے تھے۔
 اس کا منہ کسی بھی کی طرح کھلا اور فران تھا
 وہ بالترقی تھا اور ایسی کہانیاں سنا تا تھا جو سرائے کے لوگ سنایا کرتے ہیں
 کہانیاں جو گناہوں کی ترفیبات پر مبنی ہوتی ہیں۔
 وہ اناج چرانا اور اس کی تین گنا قیمت وصول کرنا بھی جانتا تھا
 وہ سفید کوٹ اور نیلا پڑ پہنتا تھا۔

ایڈمی پوس

سفنوکلینز اور اس کے ڈرامے 'ایڈمی پوس' کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں چند مختصر سی باتیں یونان، سیٹیج اور سفنوکلینز کے پیش رو ایسکائی 'س' کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ جن کا ذکر سفنوکلینز اور اس کے ڈرامے کے حوالے سے ناگزیر ہے۔

قدیم یونان نے تہذیب و فن، فن تعمیر اور فلسفہ میں جو بڑے لوگ اور بڑے کام پیدا کیے، ان کے اثرات آج تک پوری دنیا پر پائے جاتے ہیں۔ ایقمتنز جو یونانی فکر و فن اور فلسفے کا مرکز ہے اس کے بارے میں بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا تہذیبی مرکز سمیرا شاید تہذیب کے زمین پر قائم نہیں ہو سکا۔ ڈرامے میں 'شاعری' میں، دیوالا میں، فن تعمیر میں فلسفہ میں، جمہوریت میں، سیاست میں، ریاضی میں جو ادبیت یونان کو حاصل رہی ہے اور ان شعبوں میں جو نقوش اس تہذیب نے چھوڑے وہ انٹل اور لازوال ہیں۔ یہاں مختصر سی بات صرف ڈرامے کے حوالے سے ہوگی۔

ڈرامے کی ابتدا کب ہوئی اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ڈرامے پر جو تحقیق ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامے کی ابتدائی صورت مبدوں اور عبادت گاہوں میں رقص اور گیت کی فنی ہے۔ جس میں دیوتاؤں کی برتری کو خراج تحسین پیش کیا جاتا تھا۔ ناچنے اور گانے والے جانوروں کے چہروں سے ملے جلتے نقاب (MASK) اپنے چہروں پر اڑھ لیتے تھے اس طرح وہ گانا چ کر دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ بعد میں جب یہی رقص اور گیت عوامی سیٹیج پر پیش ہونے لگا تو ڈرامہ کہلایا۔ بارہ افراد پر مشتمل ایک گانے والوں کا طائفہ ہوتا تھا۔ جسے کورس کہتے تھے، جو مختلف وقتوں میں گاتے ناچتے تھے اور اصل کردار صرف

ایک ہونا تھا۔ جو دیوتاؤں سے مکالمہ کرتا تھا۔

ایسکانی ٹس (۵۲۵ ق م - ۴۵۵ ق م) کو (یونانی) المیہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے پہلی بار یونانی سٹیج پر اپنے شعری ڈراموں میں دوسرے اور تیسرے کردار کو بھی متعارف کرایا۔ جبکہ ایسکانی ٹس سے پہلے کوکس کے ساتھ صرف ایک ہی کردار ہوتا تھا۔ ایسکانی ٹس نے سٹیج کی اسٹیٹ میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں۔ بلاشبہ وہ دنیا کے عظیم ترین خلاق ڈرامہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ ایتھنز میں ہر برس تین یوم کے لیے "ڈرامہ فیستیول" کا انعقاد ہوتا تھا۔ جس میں ڈرامہ نگاروں کے درمیان بہترین ڈرامے پیش کرنے کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ سال بھر اس تقریب کا انتظار کرتے اور بڑے اہتمام سے ڈرامے دیکھنے جاتے تھے۔ ہزاروں افراد ایتھنز میں ڈرامہ دیکھنے ان کو سٹیج سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر بٹھایا جاتا تھا۔ جب انہیں کوئی منظر کوئی مکالمہ پسند آتا تو وہ داد کے لیے تائیاں بجاتے اور اگر کوئی نکھیل یا اس کا حصہ پسند ہوتا تو کولمبی کے بیچ بجانے لگتے۔ جن پر وہ بیٹھتے تھے۔

ایسکانی ٹس نے ان مقابلوں میں مسلسل تیرہ برس تک پہلا انعام حاصل کیا۔ کوئی اس کو چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ بعد میں نوجوان نسل میں سفو کلیز سامنے آیا۔ جس نے ایسکانی ٹس کی برتری کو ختم کیا اور ایک مقابلے میں پہلا انعام حاصل کر کے اسکانی ٹس کو شکست دی۔

کہا جاتا ہے کہ ایسکانی ٹس کم از کم نوے ڈراموں کا خالق تھا۔ مگر اب اس کے صرف سات ڈرامے زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے ہیں۔ جن میں اس کا شہکار "پرومتھیس" بھی ہے۔ جس کا شمار نہ صرف ایسکانی ٹس کے بلکہ دنیا کے عظیم ڈراموں میں ہوتا ہے۔ یہ امر بے حد اہم ہے کہ ایسکانی ٹس، سفو کلیز اور اس کے بعد پوریڈیز نے جو ایسے لکھے وہ تمام کے تمام دیوالیہ اور اساطیری داستانوں پر مبنی تھے۔ ڈرامہ دیکھنے والے ہزاروں ناظرین کو پہلے سے ڈرامے کی کہانی کا علم ہوتا تھا۔ یہ صرف ان عظیم اور لائق المیہ نگاروں کا کمال فن تھا کہ وہ سب کو معلوم کہانیوں پر ایسے ڈرامے لکھتے اور پیش کرتے تھے کہ جو ناظرین کی توجہ کو مطلق بھٹکنے نہ دیتے تھے۔

اس پس منظر اور روایت نے سفولیز کو جنم دیا۔ جس کے سن پیدائش کے بارے میں حتمی طور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم محققوں نے یہ بتا لگایا ہے کہ وہ اگلا ۲۹۳ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ ایٹھنز کے قریب کولنس قبضے میں وہ پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام سوفیس تھا۔ وہ ایک مشہور اور خوشحال صناع تھا۔ جس کے پاس غلام بھی تھے۔ جن کی مدد سے وہ کام کرتا تھا۔ سفولیز نے اسی خوشحال ماحول میں پرورش پائی۔ موسیقی اور کھیلوں سے اُسے خصوصی لگاؤ تھا۔ لاپرس نامی موسیقار سے اُس نے بہت عرصے تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور جب سلاویز کی جنگ میں یونانیوں نے فتح حاصل کی تو فتح کے جشن میں لڑکوں کی ایک لڑکی نے گیت سنانے جن میں سفولیز بھی شامل تھا۔

سفولیز کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ جب اس نے المیہ ڈرامے کے باوا آدم ایسکالی بس کو اس میدان میں شکست دے کر پہلا انعام حاصل کیا۔ اس وقت ایسکالی بس کی عمر ۵۸ برس تھی۔ سفولیز مستقل ایٹھنز میں رہنے لگا۔ وہ اہم المیہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک سفارت کار اور فوجی جرنیل بھی تھا۔ وہ انکسار اور خذا ترسی کی وجہ سے بھی خاصی شہرت رکھتا اور اس نے رفاہ عام کے سلسلے میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔

سفولیز کے بارے میں جو بنیادی معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سب سے اہم فریبہ۔ عظیم یونانی طریقہ نگار اسٹوفینز کا کھیل۔ میڈیک ہے۔ یہی وہ کھیل ہے۔ جس میں اسٹوفینز نے سقراط کا بھی خاکہ اڑایا تھا۔ سفولیز کا خاکہ اڑاتے ہوئے اسٹوفینز ہیں بتاتا ہے کہ سفولیز نے المیہ کو اپنے اور پرانا حامی اور مسلط کر لیا تھا کہ وہ بوڑھے کی عمر کے آرام مصائب کو بخوشی گلے سے لگانے پر تیار تھا۔ اسٹوفینز اس کا خاکہ اڑاتے ہوئے یہ بھی بتاتا ہے کہ خود سفولیز کا اپنا بیٹا لوفن اس پر الزام لگاتا تھا۔ سفولیز اس قابل بھی نہیں رہا کہ اپنے ذاتی معاملات کو ہی سمجھا سکے۔ گویا وہ اپنے باپ پر نااہلی کا الزام لگا رہا تھا۔ اصل میں یہ الزام اور اس کی کہانی سچی نہیں۔ یہ تو اسٹوفینز کا مخصوص انداز تھا کہ وہ اپنی کہانی گھڑ کر لوگوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ سسرور نے اسے سچ جان لیا اور سسرور کے بعد گنے والے اس کہانی کو سچا سمجھتے تھے۔

سفوکلینز نے کسی وجوہات کی بنا پر کسی پرانی روایات کو توڑا۔ سفوکلینز سے پہلے ڈراما نگار خود بھی اپنے ڈرامے میں اداکاری کرتا تھا۔ اس زمانے میں (بلکہ آج بھی) اور اپنی گرجدار آواز کو ڈراما کے فنکار کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ سفوکلینز کی آواز باریک اور کمزور تھی اس لیے اس نے ایک تو اس روایت کو ختم کیا کہ لکھنے والا بھی اداکاری کرے۔ پھر اس نے ڈرامے کے کورس کے ساتھ ڈرامے کے کرداروں میں بھی مزید اضافہ کیا۔ جس کا آغاز ایسکالی سس نے کیا تھا۔ اس نے ایٹیچ کی آرائش اور بناوٹ میں بھی کئی تبدیلیاں کی تھیں۔ سفوکلینز کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا یونانی المیہ نگار تھا جو بعض اداکاروں کو ذہن میں رکھ کر ان کے لیے کردار تخلیق کرتا اور ایسے لکھتا تھا

سو کے لگ بھگ ڈرامے سفوکلینز کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مگر اب اس کے صرف سات ڈرامے ہی مکمل صورت میں ملتے ہیں۔ اس کے مشہور زمانہ ڈراموں میں "ایٹیلوئی"، "ایڈمی پس" اور "اجاکس" اور "ایکٹرا" ہیں۔

"ایٹیلوئی"، "ایڈمی پس" اور "ایکٹرا" نے پوری نسل انسانی کو متاثر کیا ہے۔ یہاں یہ ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ ہمارے عہد کے عظیم فرانسیسی ڈرامہ نگار ژاں انولنے نے "ایٹیلوئی" پر ایک کھیل لکھا۔ اسے نئی معنویت سے آشکار کیا۔ یوجین اونیل نے "ایکٹرا" کی تعلیم کو جدید کرداروں اور نئی معنویت کے ساتھ اپنے شہکار کھیل (MOURNING BECOME ELECTRA) میں برتا۔ مگر جو شہرت اس کے کھیل "ایڈمی پس" کو نصیب ہوئی وہ لافانی ہے۔ اسی کھیل کے حوالے سے فریڈ نے سفوکلینز کو حراج تحسین پیش کیا۔ اور "ایڈمی پس" الحجاب کا نظریہ بھی اسی کھیل سے اخذ کیا۔

دنیا کی ہرزبان میں "ایڈمی پس" کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی اس کا ایک ترجمہ میری نظر سے گزرا ہے۔ مترجم شاہدہ حمید خان ہیں۔ سفوکلینز کے زمانے میں یہ کھیل خاص لوگوں کے لیے کھیلا جاتا تھا۔ عوامی سطح پر یہ کھیل پہلی بار اس کی موت (۴۰۶ ق م) کے بعد اس کے پوتے نے ۴۰۲ ق م میں پیش کیا۔

"ایڈمی پس" کا ترجمہ مختلف ادوار میں کتنی بار ہوا۔ اس کو آج تک کتنی بار سیٹیج پر کھیلا

گیا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو ہرزبان میں منتقل ہوا اور ہرزبان کے قاری نے اسے پڑھ لیا۔ اسی طرح مختلف شکلوں اور زبانوں میں یہ کھیل دنیا بھر میں کھیلا گیا اور سیٹج کیا جاتا رہے گا۔

ایڈمی پس پر اس کی زندگی اور تقدیر کا سب سے بڑا اور ہولناک اسرار کھل چکا ہے وہ جس نے سنسکس کی پہلی کوبو بھریا تھا۔ وہی ایڈمی پس اپنے مقدر کے اسرار سے پردہ اٹھنے دیکھتا ہے تو اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوڑ کر المیہ کا عظیم ترین کردار بن جاتا ہے وہ دنیا کا عجیب و غریب انسان بن چکا ہے۔ دیوتاؤں نے اس کے ساتھ بڑا ہولناک مذاق کیا ہے۔ ایڈمی پس کے آخری منظر میں اندھا ایڈمی پس کتا ہے؛

”میری بچو! کنوں ہو تم، میرے پاس آؤ۔ اپنے بھائی کے پاس جو تمہارا باپ بھی ہے۔ میرے اپنے ان ہاتھوں نے تمہارے باپ کی ان آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے جو بھی دیکھتی تھیں، روشن تھیں۔ ہاں میں اندھا اور بے عقل تھا۔ مگر اب نہیں۔ تم تمہارا باپ بنا اور تمہاری ماں میری بھی ماں تھی۔ اگر چاہ میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ مگر تمہارے مستقبل کو دیکھ کر میں رورہا ہوں۔۔۔۔۔ آہ تمہارے باپ نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ اس نے اس زمین میں بیج بویا جس سے خود اس نے جنم لیا تھا۔ اور پھر تمہیں جنم دیا۔ اپنے بچوں کو اپنی ماں کی ہی کوکھ سے جنم دیا۔۔۔۔۔“

سفر کلینک المیہ ایڈمی پس۔ کورس اور ہجوم کے علاوہ دس کرداروں پر مشتمل ہے۔ ایسے کام کرسی کردار ایڈمی پس ہے، جو کاسٹا ہے، جو ایڈمی پس کی ماں تھی مگر تقدیر نے اسے اپنے ہی بیٹے کی لیلاد کی بھی ماں بنا دیا۔ یاون ہے جو ملک جو کاسٹا کا بھائی ہے۔ اسٹیکو، ڈو اور ازمن ہیں جو ایڈمی اور ملک جو کاسٹا کی بیٹیاں ہیں۔ زیوس دیوتا کا پجاری۔ ٹائرسیاس۔ ایک اندھا الہام کوکورنتہ کا ایک قاصد۔ ایک بوڑھا چرواہا۔ ایک پینیا مبریکل کردار ہیں۔ جب ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے تو تختیبر تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے۔ ایک نامعلوم ہاتھرن کر تختیبر کے شہریوں پر لوٹ پڑی ہے۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ مویشی مر رہے ہیں ہر گھر میں موت داخل ہو چکی ہے۔ لوگ دیوتاؤں کے حضور نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ گڑگڑا

رہے ہیں۔ ایڈمی پس تھینبر کا حکمران تھا۔ وہ اس شہر میں ایک اجنبی کی حیثیت سے کبھی داخل ہوا تھا۔ اس وقت بھی شہر مصیبت میں مبتلا تھا۔ اس نے ظالم سلطنت سے تھینبر کے شہر پر کورہانی دلالی سمیٹی اور چونکہ اس شہر کا بادشاہ لیوس انجانے میں انہی کے ہاتھوں سے قتل ہو چکا تھا۔ لوگ اسے اپنا سناٹا دہندہ سمجھ کر اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اسے دیوتا اور انسانوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ رواج کے مطابق ایڈمی پس۔ شاہ کی بیوی سے شادی کر لیتا ہے اور اس کی اولاد بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا دور حکومت خوش حالی اور بے فکری کا زمانہ ہے۔ مگر اچانک یہ وبا پھوٹ پڑتی ہے۔ ایڈمی پس کو اپنی رعایا سے اپنے بچوں کی طرح محبت ہے۔ وہ خود اس وبا کا خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ دیوتا اور تقدیر اس کے مقابل کھڑے ہو چکے ہیں۔

اپا لو دیوتا کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ جب تک شاہ لیوس کے قاتل کو سزا نہ دی جائے گی اس وقت تک وبا نہ ٹلے گی۔ اور قاتل تھینبر میں ہی موجود ہے۔

پورے ڈرامائی عمل، تدبیر کاری، انسانی احساسات کی کش مکش اور تجسس کے عناصر کے ساتھ یہ عظیم المیہ تکمیل پاتا ہے۔ انسانی تقدیر کے انہماک کھلتے ہیں۔ یہ شاہ لیوس ہی تھا جس کا بیٹا خود ایڈمی پس تھا۔ یہ ملکہ جو کاٹا ہی تھی جو ایڈمی پس کی ماں تھی جسے اس کی ولادت پر معلوم ہوا کہ یہ نوزمو لو اپنے باپ کو قتل کرے گا۔ اپنی ماں سے شادی کرے گا۔ ملکہ جو کاٹا اسے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے عمل سے باہر بھجوا دیتی ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ مگر ملازم اُسے زندہ چھوڑ آتے ہیں۔ اور ایڈمی پس ایک چرواہے کے پاس پرورش پاتا ہے پھر وہ ایک رات جوان ہو کر تھینبر آتا ہے۔ راستے میں اس کی جھڑپ گھڑ سواروں سے ہو جاتی ہے۔ اس کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کا باپ شاہ لیوس اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔

تقدیر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

وہ تھینبر کے شہریوں کو سفنکس کے مظالم سے سناٹا دلاتا ہے۔ وہ اسے اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنی ماں سے انجانے میں شادی کر لیتا ہے۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوا ہے اور اب دیوتا اور تقدیر ہی یہ چاہتے ہیں کہ اس گندے اور ناپاک وجود سے تھینبر کو پاک کیا جائے اور اس کو سزا دی جائے۔ جس نے نہ اپنی تقدیر لکھی ہے نہ جان بوجھ کر ارادی طور پر کوئی گناہ

کیا ہے۔ انتہائی تجسس کے مراحل سے گزرتا ہوا اس مقام پر پہنچتا ہے کہ جب ایڈمی پس کو اپنی اصلیت اور حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ ایسے کے ہیرو اور بالخصوص قدیم یونانی ایسے کے ہیرو کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ارسطو نے ایسے اور ایسے کے کردار پر جو بحث کی ہے وہ ادبی تنقید اور انسانی نفسیات کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے کا ہیرو ایک ایسا انسان ہے جو دیوتاؤں اور تقدیر کے ہاتھوں بندھا اور جکڑا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں پہلے سے سب کچھ بتا دیا جاتا ہے کہ وہ سب کچھ کرے گا اور تقدیر اسے حالات پیدا کرتی ہے کہ تقدیر کا لکھا پورا ہو سکے اور ایسا ہو کر رہتا ہے۔

ایسے کے حوالے سے انسانی تقدیر کی جبریت کا اظہار ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کی مطلق العنانی سامنے آتی ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان تقدیر کے سامنے مجبور محض ہے۔ وہ جکڑا ہوا ہے۔ وقت اور تقدیر اس کو ان کیسے تھیں۔ وہ ان سے بچ نہیں سکتا۔ ایڈمی پس میں کورس گاتا ہے

”حقینبر کے شہر لو!۔ دیکھو اس ایڈمی پس کو جو دنیا کا مسرور ترین آدمی تھا۔ ہمارا بادشاہ جس کی خوش قسمتی پر سب کو رشک آتا ہے۔ مگر اسے وقت اور تقدیر نے آن لیا اور اب وہ غموں کے سمندر میں ڈوب رہا ہے۔“

جب ایسے کا ہیرو آتا سبھی بلے بس ہے۔ ان دیکھی طاقتوں اور تقدیر کا کھلونا ہے تو پھر وہ کس طرح اتنا بلند اور قدآور سمجھا جاتا ہے؟ اس کے اندر کونسی ایسی خوبی اور نیکی چھپی ہوئی ہے کہ جو اس کو عظیم بنا دیتی ہے؟

اس کے جواب کے لیے پہلے تو سفوکلز کے ایڈمی پس کا ایک ٹکڑا پڑھیے۔ ایڈمی پس

اپنی آنکھوں کو چھوڑ چکا ہے۔ کورس اس سے پوچھتا ہے:

”آپ نے بہت ہی جیسا کام کیا ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو کس طرح اپنی ہی

آنکھوں کی روشنی چھین لینے پر تیار کر لیا۔ کیا آپ کو کسی غیبی طاقت نے ایسا کرنے پر

مجبور کیا؟“

ایڈمی پس جواب دیتا ہے۔

”میرے دوستو! وہ اپالو کی قوت تھی جس نے میرے دکھوں کو انجام تک پہنچایا۔ مگر وہ ہاتھ جنہوں نے میری آنکھوں کو اندھا کیا، میرے اپنے تھے۔“

الیسے کا ہیرو میرے نزدیک ایک ایسا کردار ہے جو اپنا انجام اپنی قوتِ ارادی اور اپنے ردِ عمل سے خود انتخاب کرتا ہے۔ وہ یوں انسانی ارادے، چیز اور برتری کی علامت بن جاتا ہے بلکہ جو کاسٹا کی تقدیر میں اپنے بیٹے اور اپنے ہی شوہر کے قاتل کے بچوں کی ماں بنا لکھا تھا۔ مگر اسے یہ کسی ویلونا نے نہ بتایا تھا کہ جب وہ انسانی رشتوں کے اس ہونک اسرار سے واقف ہوگی تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے کر اپنی انسانیت کو چار چاند لگا دے گی ایڈمی پس پر اپنی اصلیت کھل چکی ہے۔ وہ اب نہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے نہ انسانوں کو، ویلوناؤں اور تقدیر کی جبریت نے اسے جس ندامت سے دوچار کیا ہے۔ اس پر اس کا جو ردِ عمل ہے وہ ایک مشرف ترین انسان اور الیسے کے عظیم ہیرو کا ردِ عمل ہے۔ اور یہی وہ جوہر ہے جو الیسے کے ہیرو کو ایسی قدو قامت، برتری اور عظمت عطا کرتا ہے کہ جس کی مثال ادب کی دوسری اصناف میں نہیں ملتی۔ اور اس کا یہی ردِ عمل اور اپنی انسانیت کا اظہار ہے جو الیسے کے ناظر اور قاری کی کیفیت سس کرتا ہے۔

- ایڈمی پس - وینکے عظیم فن پاروں میں سے ایک ہے۔ ایک لافانی المیہ جو ہمیشہ ہر دور میں پڑھا اور کھیلا گیا۔ اور دنیا نے ادب کا ایک لافانی اور عظیم فن پارہ -

ایسکرا

یورپیڈیز کا عرصہ حیات (اغلباً) ۲۸۵ ق م سے ۲۰۶ ق م پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب یونان کے عظیم المیہ نگاروں نے اپنے شاہکار لکھے اور پیش کیے جس وقت ایسکلیز اپنے عظیم شاہکار پیش کر رہا تھا تو یورپیڈیز جوان بوجھ کا تھا۔ سفو کلیز نے اپنے عظیم شاہکار بھی اسی دور میں پیش کیے۔ یورپیڈیز ان دونوں سے چھوٹا ہونے کے باوجود ان کا ہم عصر تھا۔ اس کے بغیر یونانی المیہ بلکہ عالمی ڈرامہ کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسکلیز، سفو کلیز اور یورپیڈیز کے المیہ ڈراموں کا مطالعہ بے مدول چسپی کا حامل ہے۔ ان تینوں عظیم ترین المیہ نگاروں کا زمانہ ہی ایک نہیں بلکہ ان کے موضوعات بھی ایک ہیں۔ ان کے المیہ ڈراموں کا سرچشمہ یونانی دیویالا ہے۔ ان کے کردار بھی ایک ہیں۔ اس کے باوجود ان تینوں کا مزاج مختلف ہے، ایک ہی رات، ایک جیسے کرداروں کو وہ اپنے اپنے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان تینوں کی عظمت اور فنی صلاحیتوں کا انفرادی اظہار سامنے آتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سٹیج کے پردے، مناظر، کردار ادا کرنے والے اداکار تک ایک تھے۔ اس کے باوجود جب ان میں سے کسی ایک کا کھیل کھیلا گیا تو وہ دوسرے کے کھیل سے بہر حال مختلف تاثر کا حامل ثابت ہوا۔

ان نمایاں مشابہتوں اور واضح عناصر کے باوجود جب ہم یورپیڈیز کو پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں سفو کلیز اور ایسکلیز سے بہت دور کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

میرے لیے یورپیڈیز کے چند اہم ڈراموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا خاصا

مشکل تھا۔ کیونکہ میرے علم کے مطابق اس کے پانچ ایسے کھیل ہیں جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین المیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے نام ہیں۔ الیکٹرا، میڈیا، ہسپول تیس، آئندہ رماشے اور ٹرورجن وویمن یہ پانچ کھیل ایسے ہیں جو اپنی پہلی پیش کش سے اب تک صدیوں سے ہر ملک میں کیسے چارہے ہیں۔ یورپیڈیز کے ان کھیلوں کا دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے میں نے "الیکٹرا" کو چند خاص وجوہات کی بنا پر چنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں جو بڑی لازوال اور ناقابل فراموش شخصیات لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک "الیکٹرا" ہے۔

"الیکٹرا" کے انتخاب اور اس کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ وہ قارئین بہتر انداز میں کر سکتے ہیں جنہوں نے قدیم یونانی المیوں کے ان تینوں "ماسٹرز" کا مطالعہ کیا ہے۔ یوں تو یورپیڈیز کی یہ انفرادی اور امتیازی حیثیت ہے۔ اس کے عظیم پیشرو اسکلیز اور سفولیز کلاسیکیت کی شان و شوکت پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ یہیں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں وہ بیشتر صورتوں میں عام آدمی کا تجربہ نہیں بنتا۔ بلکہ اسے میں یوں کہوں گا کہ اسکلیز اور سفولیز اپنی تمام فنی عظمتوں اور بے مثل فن پاروں کے خالق کی حیثیت کے باوجود۔ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہیں۔ عام آدمی کی ان ہمک رسائی زوراً مشکل ہے۔ پھر تراجم کے حوالے سے بھی ان دونوں "ماسٹرز" اور یورپیڈیز کی زبان میں جو فرق ہے وہ بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات والی جبارت ہی سمجھیے۔ لیکن کیا حقیقت نہیں کیا اسکلیز اور سفولیز کی زبان بڑی شاہانہ کردار رکھتی ہے اور اس میں جو گہمی اور شعرت ملتی ہے وہ آج کل بہت حد تک "باسی" لگتی ہے۔ اس کے برعکس یورپیڈیز کی زبان عام انسانوں کی زبان کے بہت قریب ہے۔ وہ قدیم یونانی تھئیٹر کے تمام تقاضوں اور پابندیوں میں گھرا ہوا اپنے المیوں کے ذریعے ہمیں یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کی اپنی بھی حدود ہیں۔ وہ اپنا خاص نقطہ نگاہ رکھتا ہے۔ یہیں اس کے المیہ کھیلوں سے حیران کن انکشاف بھی ہوتا ہے کہ وہ اسکلیز اور سفولیز کے برعکس دیوالی دیواروں کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ ان کی زندگی میں جو المیہ جنم لیتا ہے۔ اس کی وجوہات۔ مذہبی نہیں ہوتیں۔ بلکہ انسانی ہوتی ہیں

صرف یہی ایک ایسی امتیازی خوبی ہے جو یورپیڈیز کو اس کے ہم عصروں سے الگ کر دیتی ہے
MOSES HADAS نے بالکل سچ لکھا ہے کہ یورپیڈیز ایسا المیہ نگار ہے جو ہمارے
بے قریب ہے۔ زمانہ قبل مسیح میں اپنے ہم عصروں ایسکلینز اور سٹوکلینز کے ساتھ نہیں بلکہ اس
اور ہارڈشا کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

یورپیڈیز کے ہاں تنقید حیات ملتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے بہت آزاد
خیال اور عقلیت پسند تھا۔ وہ پہلا المیہ نگار ہے جس کے ہاں جمہوریت کے عناصر ملتے
ہیں۔ وہ جمہوریت کے مفہوم کو سمجھتا ہے اور اس کو فنکارانہ انداز میں پیش بھی کرتا ہے۔
لکھا جاتا ہے کہ سقراط کے ساتھ اس کے بہت گہرے تعلقات تھے اور سقراط کی تعلیمات کا
اس کی زندگی اور اس کے فن پر بہت گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

یورپیڈیز کے عظیم المیوں میں سے "الیکٹرا" کا انتخاب اس لیے کیا گیا اور اسے اس
لیے دنیا کی سوبریمی تخلیقی کاوشوں میں شمار کیا گیا ہے کہ "الیکٹرا" وہ المیہ ہے جو نہ صرف
یہ کہ یورپیڈیز کی انفرادیت کا عظیم منظر ہے بلکہ اس کی معنویت اور تاثیر کی وجہ سے اسے صدیوں
کھیل، پڑھا اور ان گنت ادوار میں دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیا ہے۔ تقابلی موازنے
کے حوالے سے جو بات میں نے ابتدا میں ادھوری چھوڑی تھی اب اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔
'الیکٹرا' بھی اسی موضوع اور کرداروں پر لکھا گیا المیہ ہے جن پر ایسکلینز اور سٹوکلینز نے
مجھے ڈرامے لکھے۔ ایسکلینز اور سٹوکلینز کے برعکس یورپیڈیز نے کھیل کا آغاز محل سے نہیں بلکہ
ایک کسان کے چھوٹے سے کلب سے جو اپنی جگہ یورپیڈیز کی ذہنی اختراع اور مخصوص زاویہ
فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ ایسکلینز اور سٹوکلینز کے ہاں یہی موضوع جب ڈرامہ بنا تو اس کے کردار
مجھ پر انداز کے ہیرو تھے۔ ان ہیروئیں پوانی اور طے شدہ صفات موجود تھیں۔ لیکن یورپیڈیز
کے اس کھیل میں یہ کردار محض برائے نام ہیرو بن کر جاتے ہیں۔ سٹوکلینز اور ایسکلینز کے ہاں
یہ کردار تجربہ دیتے کا شمار ہو گئے۔ اصطلاحاً انہیں ABS TRACT TYPE
لکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ یہی کردار یورپیڈیز کے ہاں اپنی پیش کش کے اعتبار سے موجود دور
کے میٹار کے قریب تر آجاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یورپیڈیز نے ان کو خود سوچا

ہے ان کو تراشا ہے۔ ان کو ایک ایسا وجود بخشا ہے جو اس کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ پھر اس میں الیکٹرا کی زبان بے حد منفرد اور اہم ہے جو دوسرے دونوں ماسٹرز کے بس کی بات نہیں تھی۔ یسکلینز اور سفو کلیز کے ہاں الیکٹرا جس جذبے اور دُعا سے تھریک لیتی ہے۔ وہ اس کی اپنے باپ کے ساتھ محبت تھی۔ جبکہ یورپیڈیز کے ہاں وہ اپنی ماں سے حسد کرتی ہے۔ اور اس جذبے سے تھریک اور قوت حاصل کرتی ہے اور سیٹس کو بھی یورپیڈیز نے بچسور بدل کر ایک خوفزدہ آوارہ گرد بنا دیا ہے اور پھر اس میں زیادہ واضح انداز میں یورپیڈیز کا اپنا طرز فکر ملتا ہے وہ طرز فکر جو الیکٹرا اور سفو کلیز اور اس دور کے عام عقائد سے انحراف کا درجہ رکھتا ہے یورپیڈیز ہمیں یہ بتاتا ہے کہ المیہ۔ اپالو کے حوالے سے رونما نہیں ہوا۔ بلکہ ان پرفریب محققات کی وجہ سے ہوا جن میں یہ کردار اُلجھے ہوئے تھے!

وہ الیکٹرا کا کردار نہیں تھا جس سے متاثر ہو کر یوجین اونیل نے اپنا عظیم شاہکار MOURNING BECOMES ELECTRA لکھا تھا۔ بلکہ یہ یورپیڈیز کا ہی شاہکار تھا۔ جس نے یوجین اونیل کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے اپنا عظیم ڈرامہ لکھا۔

یورپیڈیز کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے معلومات نہیں ملتی ہیں۔ وہ سلامیز میں پیدا ہوا کہا جاتا ہے کہ وہ ٹھیک اس روز پیدا ہوا جس دن یونانیوں نے اہل ایران پر عظیم فتح حاصل کی تھی۔ یورپیڈیز کا والد ایک معمولی تاجر تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے بیٹے کو محقول تعلیم دلوائی۔ ایک کاہن نے بچپن میں اس کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ اس کے سر پر سنہری تاج پہنایا جائے گا۔ یورپیڈیز نے پہلے تو جہنا تک میں بڑی دلچسپی لی پھر ڈرامہ نگاری کی طرف راغب ہوا۔ اغلباً اس کا پہلا کھیل ۵۶ م ق میں لکھا گیا۔ اس کے کئی برس بعد اس کو اس کے کھیل پر پہلا انعام ملا۔ یوں وہ ایسکلینز اور سفو کلیز کی صف میں اکھٹا ہوا۔

یورپیڈیز کے ڈراموں کا طرہ امتیاز اس کا غیر مذہبی طرز فکر، فلسفیانہ تفکر اور تعقل پسندی ہے۔ جس کی وجہ سے اس زمانے میں اس کی شدید مخالفت بھی ہوئی۔ کیونکہ وہ لوگوں کے اعتقادات کو سامنے نہ رکھتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دوبار شادی

کی اور دونوں بار اس کی بیویاں سے دھوکا دے کر چلی گئیں۔
ایٹھنٹھ میں اس کے لیے ماحول ناساز کار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سفر طاق تو تھا نہیں کر زہر
کا جام پی لیتا۔ لیکن اس نے بھی اپنے طرز فکر گہنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں جب
مقدونیہ کے بادشاہ نے اسے اپنے ہاں بلوا بھیجا تو اس نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور
ایٹھنٹھ چھوڑ دیا۔ مقدونیہ میں اس کی موت اس کا انتظار کر رہی تھی وہاں بھی اس کے مخالف
موجود تھے۔ اور پھر اس کے کھیل رُودجی و دین کی وجہ سے مخالفت میں کچھ اور بھی اضافہ
ہوا۔ یورپیڈیز طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

اس کی موت کی خبر جب ایٹھنٹھ میں پہنچی تو سفوکلیز نے اپنے انداز میں اس کی موت
کا سوگ منایا اپنے ڈرامے کے کورس کے کرداروں کو ماتی اور سیاہ لباس پہنا کر اس نے ان
سے ایسے جگے کھلوے جو ماتم اور سوگ کا اظہار کرتے تھے۔

یورپیڈیز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نوے یا سو کے لگ بھگ ڈرامے
لکھے۔ لیکن آج دنیا میں اس کے صرف اٹھارہ ڈرامے موجود اور محفوظ ہیں۔

یورپیڈیز۔ اپنے زمانے سے آگے کا فنکار ہے۔ اس کا ذاتی المیہ یہ تھا کہ المیہ نگاری
میں اعلیٰ ترین انعام حاصل کرنے اور بے حد افرا دیت کے باوجود وہ سفوکلیز کی شہرت کے
ساتھ تکے و بار ہا۔ حالانکہ وہ سفوکلیز جتنا بڑا المیہ نگار تھا۔ اُسے اپنے دور میں
اپنے طرز فکر اور انداز خیالی کی وجہ سے بھی مخالفت کا کاٹنا پڑا۔ لیکن وقت گزرنے
کے ساتھ ساتھ جہاں اس کی عظمت اور رتبے کا استحکام ہوا وہاں یورپیڈیز کو بھی اصلی
مقام مل گیا۔ آج کی دنیا میں ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود وہ ہمارے قریب ہے جوتہ
ہے اور ڈرامے کے بہت سے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

جرمنی میں جب شیلنگ جیسے نفاذ اور مفکر نے یورپیڈیز کو جرمنی زبان میں منتقل کیا تو
یورپیڈیز کی صحیح شناخت ہوئی اور اسے اس کا صحیح مقام مل گیا۔ شیلنگ نے اس کے
بارے میں لکھا تھا۔

” بہت کم مصنفوں میں یہ صلاحیت رہی ہے کہ وہ بدی اور نیکی کو یکساں سطح پر پیش کر

سببیں یورپیڈیز ایسا ہی باصلاحیت فنکار تھا۔ یہ غلطی صرف اور صرف یورپیڈیز کے ہاں ہی ملتی تھی کہ اس کے ہاں بے انتہا خوب صورتی اور ثنبت ابتداء ایک سطح پر ملے ہیں۔
- الیکٹرا کی تخلیق۔

پہلا منظر ایک مکان کے چھوٹے کاحے۔ یہ مکان سارے المیے کے پس منظر اور اس کے کرداروں سے متعارف کرانا ہے وہ بتاتا ہے کہ کس طرح ٹرانے کی جنگ شروع ہوئی شاہ ایک عثمان ساری یونانی فوجوں کا کمانڈر چنگی۔ ہیلن جسے پیرس انوار کے ٹرانے نے کیا تھا۔ ایک عثمان کے بھائی کی بیوی اور اس کی اپنی بیوی کلاٹمنسٹرا کی بہن تھی۔ جب وہ جنگ میں مصروف تھا تو اس کا اپنا گھر اس کی بیوی کی بنے و فانی اور ایجس تھیس کی غداری نے تباہ کر دیا۔ جب فاتح ایک عثمان واپس آیا تو اس کی بیوی کلاٹمنسٹرا نے اس کو قتل کر کے اپنے عاشق کو بادشاہ بنا دیا۔ ایک عثمان کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور بیٹس اور لڑکی الیکٹرا۔ جب اور بیٹس کی جان کو خطرہ لاحق ہوا تو ان کا قدیم معلم اسے بھگالے گیا۔ تاکہ ایجس تھیس اسے قتل نہ کرادے۔ الیکٹرا اپنے باپ کے محل میں رہی جہاں اس کی ماں نے اس کے باپ کو ایجس تھیس کے ساتھ مل کر ہلاک کر دیا تھا۔ الیکٹرا کی جوانی کے دنوں میں ہی اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ لیکن ایجس تھیس خوفزدہ تھا کہ اگر الیکٹرا کی شادی کسی نامور شخص سے ہو گئی تو وہ اس سے انتقام لے گی۔ اسے ڈرتھا کہ وہ اچھے خاندان کے فرد کے بچوں کی ماں بنی تو وہ ان کو بھی یہ تربیت دے گی کہ ایجس تھیس سے انتقام لیا جائے۔ اس لیے اس نے اس کی کہیں شادی نہ ہونے دی۔ الیکٹرا کی ماں کلاٹمنسٹرا شقی القرب اور غلام تھی کہ اس کے ہاتھ اپنے خاوند کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی اولاد کو قتل کرنے سے بچھپاتی تھی۔ اور بیٹس تو اس کے نزدیک کم ہو چکا تھا۔ الیکٹرا کو قتل کر کے وہ اپنے لیے مزید رسواں کا سامان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ایجس تھیس نے اس شخص کے لیے بھاری انعام مقرر کر رکھا تھا جو بیٹس کو قتل کر دے اور اس نے الیکٹرا کو میرے سپرد کر دیا کہ وہ میری بیوی بن جائے۔ اگرچہ میرا بھی خاندان حسب نسب کے اعتبار سے اچھا ہے لیکن میں غریب ہوں۔ عزت ہو تو پھر صحیح النسبتی بھی برقرار

نہیں رہتی۔

ایکس تھیس نے تو الیکٹرا کو زبردستی میری بیوی اس لیے بنایا کہ میں کمزور اور نادار ہوں میرے دست و بازو کمزور ہیں۔ میں اور مجھ سے پیدا ہونے والی اولاد اس سے بدلہ نہ چکا کے گی۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے الیکٹرا کے بستر کو کبھی شرمندہ نہ کیا۔ مقدس لوٹا میرے گواہ ہیں کہ الیکٹرا ابھی تک کمزوری ہے۔ میں اسے ایک باعثِ ندامتِ فعل سمجھتا ہوں کہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاؤں میں تو اپنے نام کے رشتے دار اور سلیس کا خیال کر کے ہی غمزہ وہ بوجھاتا ہوں کہ جب وہ کبھی زندہ سلامت آگوس واپس آئے گا تو اپنی بہن کو اس ناداری اور غربت کے عالم میں دیکھ کر کتنا ناخوش و رنجور ہوگا۔

الیکٹرا اسٹیج پر آئی ہے اس کا سر اس دور کی غلام عورتوں کی طرح منڈا ہوا ہے اس نے پانی کا ایک برتن اٹھا رکھا ہے۔ پورے کھیل میں وہ حوڑ کلابی کرتی ہوئی رہتی ہے۔ جب وہ اس منظر میں داخل ہوتی ہے تو اس وقت بھی اپنے آپ سے ہاتھیں کر رہی ہے۔

جب رات کالی ہو جاتی ہے تو میں یہ بھاری برتن اٹھا کر چٹے سے پانی لینے جاتی ہوں۔ اگرچہ مجھے اس پر مجبور نہیں کیا گیا۔ لیکن میں دیوتاؤں کے سامنے فریاد کرتی رہوں گی۔ جس نے میرے باپ کو قتل کیا اس نے مجھے میرے باپ کے محل سے نکال دیا۔ اس نے ایکس تھیس کے بچے جنے ہیں اور مجھے اور میرے بھائی کو تو ایک بھول جانے والا حادثہ سمجھتی ہے۔۔۔

کسان اسے کہتا ہے کہ وہ آخر اتنی مشقت کیوں کرتی ہے۔ الیکٹرا بتاتی ہے کہ وہ کسان کو اپنا دوست سمجھتی ہے جو ایک شفیق اور مہربان دل رکھتا ہے۔ اس نے اس کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تمہیں گھر کے باہر بہت محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔ میں تمہارا بوجھ کچھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ جب ایک کسان کھیتوں سے واپس آتا ہے تو اسے اس سے بڑا آرام ملتا ہے کہ گھر میں ہر چیز موجود ہے اور گھر میں سارا کام ہو چکا ہے۔ کسان اسے کہتا ہے کہ اب وہ گھر کے اندر جاتے۔ رات کا آخری پھر ہے۔ وہ مویشیوں کو لے کر کھیتوں کو جا رہا ہے۔ کولی ریحی سسٹ آدمی اپنی روزی حاصل نہیں کر سکتا خواہ اس پر دیوتا کتنے ہی مہربان کیوں نہ ہوں روزی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔

اوریسٹس اور پیلا ڈیو ایٹیج پر آتے ہیں۔ پیلا ڈیس اوریسٹس کا سچا دوست ہے۔ جس نے جلا وطنی میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ اب وہ پوری چھپے اس علاقے میں داخل ہوا ہے تاکہ اپنی بہن کو تلاش کرے۔ اگر گوس کے اندرونی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو کر اپنے باپ شاہ ایک مہمان کے قتل کا بدلہ لے سکے۔

ایکٹرا خود کلامی میں خود جھوٹے کی طرف جا رہی ہے کہ دوسری غلام لڑکیوں سے ایک جشن میں رقص کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ایکٹرا ان سے کہتی ہے۔ "میں اگر گوس کی لڑکیوں کے ساتھ کیسے ناچ سکتی ہوں۔ میں آنسو بہا کر رات گزارتی ہوں اور دن بھی آنسو بہانے گزارتے ہیں۔ میرے لباس کو دیکھو جو چھتیروں سے بدتر ہے۔ کیا یہ لباس اس شاہ ایک مہمان کی بیٹی کا ہو سکتا ہے جس نے ٹرائے پر چڑھائی کی اور اسے فوج کیا...."

اوریسٹس اور ایکٹرا۔ بھائی بہنوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ چونکہ مدتوں سے بھڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے۔ ایکٹرا سے اپنی پتلا سنانی ہے کیونکہ اوریسٹس اسے یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ اس کے بھائی کا قاصد اور پینا مبر ہے۔ اسے یہاں کے حالات جاننے اور تمہاری تلاش میں بھیجا گیا ہے۔

ایکٹرا جو اپنے بھائی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ اور اس کی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ یہ خبر سن کر نہال ہو جاتی ہے کہ اس کا بھائی اوریسٹس زندہ ہے۔ وہ تفصیل سے اپنے مصائب کا اظہار کرتی ہے۔ وہ کسان کے بارے میں بھی آگاہ کرتی ہے اور اوریسٹس کسان کی نیکی سے بے حد خوش ہوتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے۔ اوریسٹس اس سے پوچھتا ہے "تم جن مصیبتوں اور آلام سے گزر رہی ہو۔" کیا اس سے تھلا ماں دکھی نہیں ہے؟" ایکٹرا جواب دیتی ہے۔

"بیویاں اپنے شوہروں کی دوست ہوتی ہیں اپنے بچوں کی نہیں۔ اوریسٹس پوچھتا ہے کیا تمہاری ماں کا خاندان اور تمہارے باپ کا قاتل جانتا ہے کہ تم ابھی کھناری ہو۔ ایکٹرا جواب دیتی ہے: "اسے اس کی کچھ خبر نہیں۔ میں نے یہ راز اس سے چھپا رکھا ہے سب سے...." اوریسٹس پوچھتا ہے اگر تمہارا بھائی واپس آجائے تو وہ کس طرح اپنے باپ کے

قاتل کو ہلاک کر سکتا ہے۔ ایکٹرا کے پاس اس کا جواب موجود ہے۔
 "جرات اور بہادری سے" اسی جرات کام لے کر جس سے ہمارے دشمنوں نے کام لے
 کر میرے باپ کو قتل کر دیا۔

اور لیٹس اس سے سوال کرتا ہے کیا تم بھی یہ جرات کرو گی کہ اپنے بھائی کے ساتھ
 اپنی ماں کو قتل کر سکو۔ ایکٹرا جواب دیتی ہے: "ہاں بلکہ میں اس گلہاڑے اپنی ماں کو
 ہلاک کروں گی جس سے اس نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔"

اور لیٹس: "کیا تم واقعی یہ فیصلہ کر چکی ہو۔ کیا میں تمہارے بھائی کو یہ بھی بتا دوں؟"
 ایکٹرا: "میں تو زندہ ہی اس لیے ہوں کہ اپنی ماں کا خون بہاؤں پھر بے شک
 مری جاؤں۔"

ایکٹرا اپنے بھائی کو بلانا چاہتی ہے۔ اُسے ابھی تک اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس
 کے سامنے اس کا بھائی ہے وہ اُسے کتنی ہے۔ میرے بھائی کو میری بد نصیبی کی داستان
 سنا دینا۔ اسے بتانا کہ ہم دونوں کو کس طرح ذلیل کیا گیا۔ اسے بتانا کہ میں نے کیسے کپڑے
 پہن رکھے تھے۔ اُسے اس غلامت کے بارے میں بتانا جس میں میں کھڑی ہوں۔ جس طرح
 کے گھر میں میں رہتی ہوں اُسے بتا دینا۔ میں جو محلوں میں پل سکتی، خاک اور گندگی میں رُل
 رہی ہوں اور ہر میری ماں ہے جس نے میرے باپ سے بے وفائی کی اُسے قتل کیا۔ وہ
 محل میں سخت پر بیٹھتی ہے۔ اس کے ارد گرد کینڑوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ وہ کینڑی ہیں
 جنہیں میرے باپ نے ملک فتح کر کے کینڑی بنایا تھا۔ وہ مجھ سے کہیں بہتر لباس پہنتی
 ہیں۔ اسے بتانا کہ ہمارے باپ کی قبر کی بے حرمتی کس طرح کی جاتی ہے۔ شراب اور لٹکا
 کے نشے میں چور داتوں کو وہ ہمارے باپ کی قبر کی بے حرمتی کرنے جاتا ہے۔ وہ اس کی
 قبر کو تارنا ہے۔ پھر وہ چیتھے۔ کہاں ہے وہ لونڈا اور لیٹس اسے اپنے باپ کی قبر کو
 بے حرمتی سے بچانے کے لیے آنا چاہیے۔ تاکہ میں بھی دیکھوں کہ وہ کتنا بہادر ہے۔"
 کسان بھی آجاتا ہے وہ غریب ہے لیکن عظیم انسان ہے۔ مہمان نواز، غربت و
 ناداری کے باوجود وہ اور لیٹس اور پلاڈیا کو اپنے گھر کے اندر آنے کی دعوت دیتا ہے۔

ایکٹرا اُسے علامت بھی کرتی ہے کہ وہ کس برتنے پر ان معزز زمین کو اپنے جھونپڑے میں بلا رہا ہے اور ان کے سامنے خاطر تواضع کے لیے کیا رکھے گا! لیکن وہ اصرار سے مہالوں کو اپنے گھر لے جاتا ہے اور ایسٹس اس غریب کی عظمت کو سراہتا ہے

یہ ہے وہ آدمی جو اس لیے بڑا نہیں کہ وہ دولت مند ہے اور محل میں رہتا ہے یہ تو ایک عام آدمی ہے۔ عام آدمیوں میں سے ایک لیکن یہی آدمی صحیح معنوں میں ایک مہذب اور شریف آدمی ہے کیا تم اس شخص سے دانائی کی بات نہ سیکھو گے۔ آدمیوں کے ہائے میں فیصلہ کرتے ہوئے ان کے حسب نسب اور دولت کو نہ دیکھو بلکہ اس کے کردار کو سامنے رکھو۔"

ایکٹرا مہالوں کو چھوڑ کر گاؤں کے ایک آدمی کے ذریعے اپنے پرنے معلم کو بلوا۔ بھیجتی ہے۔ وہ اسے یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہے کہ اور ایسٹس زندہ ہے اور اس کا قاصد آیا ہے۔ معلم آتا ہے۔ دونوں میں بات چیت ہوتی ہے۔ پھر معلم اور ایسٹس کو پہچان لیتا ہے کہ یہ قاصد نہیں خود اور ایسٹس ہے۔ یوں دونوں بجائی بہنوں کا ملاپ ہو جاتا ہے۔

اب وہ اپنی ماں کلاٹنٹسٹر اور اس کے نئے خاندان ایجس تھیس کے قتل کا منصوبہ بناتا ہے معلم انہیں بتاتا ہے کہ یہ موقع بہت اچھا ہے ایجس تھیس ایک خاص قربانی دینے کے لیے ادھر گیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ صرف غلام ہیں جو مزاحمت نہیں کریں گے اور ایسٹس اور پیلا ڈیس اس کے قتل کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ ادھر ایکٹرا ابھی ایک چال چلیتی ہے وہ معلم سے کہتی ہے کہ وہ محل میں جا کر اس کی ماں کو اطلاع دے کہ اس کی بیٹی نے ایک بچے کو جنم دیا ہے وہ بچہ دیکھنے ضرور آئے گی اور اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

اور ایسٹس اور پیلا ڈیس اپنی مہم پرنکل جانتے ہیں۔ معلم ملکہ کو اطلاع دینے روانہ ہو جاتا ہے اور ایسٹس قربانی دیتے ہوئے ایجس تھیس کو قتل کر دیتا ہے۔ غلام کچھ حرکت کرتے ہیں تو وہ انہیں بتاتا ہے کہ وہ ان کے اصل مالک اور بادشاہ ایک مہمان کا بیٹا اور ایسٹس ہے غلام مزاحمت ترک کر دیتے ہیں۔

ایکڑا کو خیال گزرتا ہے کہ اس کا بھائی مارا گیا ہے۔ ایجنس تھیس نے اسے ہلاک کر دیا ہے لیکن جب وہ مایوسی کے لمحے میں خود کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے والی ہوتی ہے تو قاصد آجاتا ہے وہ پوری تفصیل سے خبر دیتا ہے کہ اوریسنٹس کامران رہا ہے۔ ایجنس تھیس مارا گیا۔ پیلا ڈیس اور اوریسنٹس واپس کر ہے ہیں۔ اوریسنٹس واپس آتا ہے وہ اپنے ساتھ ایجنس تھیس کی لاش بھی لے آیا ہے ایکڑا اس لاش کو مخاطب کر کے ایک طویل تقریر کرتی ہے وہ کہتی ہے۔

تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ میرے باپ سے محروم کر کے مجھے یتیم بنا دیا۔ ہم نے تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑا تھا تم نے شرمناک طریقے سے میری ماں سے شادی کی اور اس کے خاوند کو قتل کر دیا۔ تم اس فوج میں شامل نہ ہوئے جس نے ٹرائے کو فتح کیا اور جس کا سربراہ میرا عظیم باپ تھا۔ تم نے میرے باپ کی بیوی کو درغلا یا مہر جبراً اس سے شادی کی۔ کاش تمہیں کوئی بتا سکتا کہ جس عورت نے پہلے اپنے شوہر سے بے وفائی کی وہ تمہارے ساتھ بھی وفانہ کرتی تھی۔ تم جلتے تھے کہ تم نے ایک ناپاک شادی کی ہے اور میری ماں جانتی تھی کہ اس کا خاوند ایک بد معاش ہے۔ تم دونوں برائی کے پتلے اور ایک دوسرے کے شر کے زیر اثر تھے۔ تم نے اس کا شر اپنایا اور اس نے تمہارا گناہ سائے ملک میں لوگ تمہیں کھلمنفسر کا خاوند کہہ کر پکارتے تھے۔ اسے کوئی ایجنس تھیس کی بیوی نہ کہتا تھا اس بڑی بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے گھر پر مرد کی بجائے عورت کا راج ہے۔

تم نے دھوکا کھلایا اور کبھی اس دھوکے کا تمہیں احساس نہ ہوا تم اپنی دولت کی وجہ سمجھتے تھے کہ تم بھی کچھ ہو لیکن دولت تو عارضی رفاقت کی طرح ہوتی ہے۔ دولت نہیں کروا رہا تیار ہوتا ہے۔ کروا رہا تو کورنخ کرتا ہے۔ دولت بے انصافی پیدا کرتی ہے۔ ایجنس تھیس کی لاش کو وہ اپنے جھوٹے بے ایمانوں کے ایک کمرے میں لے جاتے ہیں۔ اب وہ اپنی ماں کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ اوریسنٹس جو ابھی ابھی ایجنس تھیس کو قتل کر کے آیا ہے وہ اپنی ماں کو قتل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ ایکڑا اسے کہتی ہے کہ وہ بزدل نہ بنے اور اس کے ساتھ مل کر اس عورت کو قتل کر دے جو ان کی ماں اور ان کے باپ

کی قاتل ہے۔

جب کلائٹمنسٹر کی سواری آئی تو اور لیٹس جھونپڑے کے اندر جا کر چھپ جاتا ہے
ماں بیٹی کے درمیان بڑی تلخ اور طنزیہ گفتگو ہوتی ہے۔ ایکٹر اپنی ماں سے کہتی ہے کہ وہ بھی تو
ایک غلام ہے۔ کیا وہ اس کا ہاتھ کینڑ کی طرح تمام کر اسے اندر لے جاسکتی ہے۔ اس کی ماں
کہتی ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی بانڈیاں یہ فرض ادا کریں گی۔ ایکٹر ا کہتی ہے۔
"لیکن کیوں؟ کیا میں بھی ایک غلام نہیں ہوں جسے اس کے گھر سے نکال باہر کیا گیا ہے۔
جب میرے گھر پر غیروں نے قبضہ کیا تو مجھے بھی باندی بنا دیا گیا اب کیوں ہوا؟

کلائٹمنسٹر ایک طویل وضاحت پیش کرتی ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے باپ کی وجہ سے ہوا
جس نے اس سے اس کی بڑی بیٹی کو اس بیٹے چھین لیا کہ وہ اس کی شادی ایلکیز سے کرنا
چاہتا تھا لیکن اس نے اسے قربان کر دیا۔ جس سے اس کے گھرانے کو فائدہ پہنچتا تھا
نہ کسی اور کو اس نے میری بیٹی کو ہلاک کر دیا۔

صرف ایک سٹر فٹج کرنے کے لیے ایک ممان نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ وہ ٹرائے
کی فٹج کے بعد بہن کو بھی اپنے ساتھ میری سوکن بنا کر لے آیا۔ "بے شک عورتیں احمق ہوتی
ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتی لیکن جب ایک شوہر اپنی بیوی سے بے وفائی کرے
تو پھر بیوی بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اس سے بے وفائی کرتی ہے لوگ عورتوں کو مجرم قرار
دیتے ہیں لیکن اصل مجرم تو مرد ہے جو عورتوں کو بے وفائی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اپنی ماں کے دلائل اور وضاحتوں سے ایکٹر کی تشفی نہیں ہوتی۔ وہ اس کا جواب

دیتی ہے۔

"اے میری ماں کاش تیرا دل اچھا ہوتا۔ تم اتنی حسین ہو کہ تمہاری تعریف کرنی پڑتی
ہے۔ تم اور بہن دونوں بہنیں حسن میں یکساں ہو۔ دونوں کے کتنے ہی طلب گار ہوں گے لیکن
تم دونوں بے کار نکلیں۔ وہ اپنی مرضی سے انخواہی ہوئی اور اپنی رضا مندی سے اپنی عفت
ٹی بیٹھی مچھرم نے اپنا ڈھونگ رچایا اور بہانہ کیا کہ چونکہ میرے باپ نے اپنی بیٹی کو فٹج
کے لیے قربان کیا تھا اس لیے تم نے بیٹی کے دکھ میں اسے قتل کر لیا تم کیوں بھول جاتی

ہو کہ ابھی میرے باپ کو جنگ پر گئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ تم نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مینڈھیاں سنوارنا شروع کر دی تھیں۔ وہ عورت جو اپنے خاندان کی عدم موجودگی میں بناؤ سنگھار کرتی ہے وہ اپنی ہوس کا اظہار کرتی ہے۔ اور یہی تم نے کیا جب ٹرائے والوں کے بارے میں خبریں کافی تھیں کہ وہ میرے باپ کی فوجوں کو چھپاڑ رہے ہیں تو تم خوش ہوئی تھیں تم نے ایجنس تھیس کو اپنا سب کچھ سوپ دیا۔ تم یہ چاہتی ہی نہیں تھیں کہ تمہارا خاندان اور میرا باپ ٹرائے سے زندہ واپس آئے۔ حالانکہ وہ ایجنس تھیس سے کہیں اچھا شوہر اور مرد تھا۔ اچھا اگر تم کہتی ہو کہ ہمارے باپ نے تمہاری ایک بچی کو قتل کر یا تو وہی لے یا اور لیٹس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم نے اپنے شوہر کو قتل کیا۔ ایک اجنبی کو اپنے گھر میں لے آئیں۔ تم نے بھاری قیمت ادا کر کے اپنے عاشق کو حاصل کیا جلاوطن تمہارا عاشق نہیں بلکہ تمہارا بیٹا ہوا تمہارا عاشق قتل نہیں ہوا بلکہ میں قتل کر دی گئی میں اگرچہ زندہ ہوں لیکن ہلاک ہو چکی ہوں اگر خون کا بدلہ خون ہے تو پھر مجھے اور اور لیٹس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ تمہیں قتل کر کے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لیں اگر تمہارا رویہ درست تھا تو پھر یہ بھی درست ہے

کلائٹنسنر ڈاے کہتی ہے کہ تم ہمیشہ سے اپنے باپ کی طرف دار رہی ہو میں تمہیں معاف کرتی ہوں جو کچھ ہوا میں بھی اس پر خوش نہیں ہوں۔ وہ موضوع بدلتی ہے۔ اس کے بچے کے بارے میں پوچھتی ہے۔ الیکٹرک جھوٹ بولتی ہے کہ بچہ اندر ہے اور اس کی پیدائش کی رسمیں ادا نہ ہو سکیں اس لیے اس نے بلوایا تھا۔ یوں وہ حیلے بہانے سے اپنی ماں کو جھوٹے بچے کے اندر لے جاتی ہے۔ پھر کلائٹنسنر ڈاے چہنٹی ہے۔ اس کی آواز باہر تک آتی ہے۔

”میرے بچو! مجھے قتل نہ کرو۔“

اور لیٹس اور الیکٹرک اس کی ایک نہیں سنتے اسے قتل کر دیتے ہیں جب وہ سیٹیج پر سامنے آتے ہیں تو دونوں پشیمان ہیں۔ الیکٹرک کہتی ہے۔ ”میرا غصہ آنا بھڑکا کہ میں نے اسے قتل کر دیا جو میری ماں تھی اور میں جس کی بیٹی ہوں۔ اور لیٹس کہتا ہے میں

ہچکچا رہا تھا۔ میں اپنی ماں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن تم نے مجھے دغلیا طیش دلایا مجبور کر دیا آہ میری ماں کے وہ نرم و نازک اعضا وہ اس کاٹا ہوا جسم اور تم۔ اور سیٹس حج اٹھتا ہے۔ میری ماں کے اعضا اور اس کے جسم کو دھانپ دو تم نے جن بچوں کو جنا تھا وہی تیرے قاتل بن گئے۔

جب وہ لیشیانی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں آسمان پر کاسٹر اور پولیکس نمودار ہوتے ہیں جو دونوں دیوتا ہیں۔ اور ان کی ماں کے رشتے دار تھے۔ کاسٹر اپنا اور پولیکس کا تعارف کرتا ہے پھر کہتا ہے۔

”اب قسمت اور زلیس نے تمہارے لیے جو فیصلہ کیا ہے وہ تمہیں قبول کرنا ہے۔ پیلاولیس الیکٹرک کو اپنی بیوی بنا کر اپنے وطن اپنے گھر لے جائے۔ الیکٹرک تم کبھی اپنے وطن واپس نہ آسکو گی۔ اپنی ماں کے خون کے دھبے لے کر اس شہر کی گلیوں میں تم نہیں نکل سکتی ہو۔ ایجس تھیس کی لاش کو آرگوس کے لوگ دفن دیں گے۔

تمہاری ماں کی تدفین ہیلن اور اس کا خاوند مینلیوس کریں گے۔ ٹرانے میں جو کچھ ہوا اور تم نے جو کچھ کیا وہ سب دیوتاؤں کی مرضی پر ہوا۔ الیکٹرک اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتی ہے۔

۔۔ نہیں نہ تو اپالون نے نہ ہی کسی دیوتا نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی ماں کو ہلاک کر دوں اور سیٹس کو دکھ برا کہ اپنی جس بہن سے وہ اتنی مدت کے بعد ملا وہ اتنی جلد ہی اس سے جدا ہو رہی ہے۔ کبھی نہ ملنے کو الیکٹرک کو وطن چھوڑنے کا حکم ہے۔

یوں وہ بہن بھائی بچھڑ جاتے ہیں اور سیٹس کو ایک غیر جانبدار عدالت کے سامنے اپنی ماں کے قتل کے جرم میں پیش ہونا ہے۔ دیوتا اسے مزید دیتے ہیں کہ وہ مقدس شہر میں طلبا یا جائے گا۔

الیکٹرک کہتی ہے۔ الوداع۔ میرے شہر۔ الوداع میرے شہر کی عورتوں۔ میں جا رہی ہوں۔ میری نرم پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہیں۔

شکنتلا

ڈرامے کا فن بہت قدیمی ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے کہ مختلف ممالک میں ڈرامے اور تھیٹر کا آغاز کس طرح ہوا اور کون سے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آج کہاں پہنچ گیا ہے قدیم عہد کے جن ڈراموں کا شمار ساری دنیا میں ہے ان میں ایک کھیل کالی داس کا ہے اور اس کا نام شکنتلا ہے۔ کالی داس کی "شکنتلا" کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو سنسکرت میں لکھا گیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کی ساری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کھیل کا موازنہ یورپی زبانوں کے قدیم اور مشہور افسانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کھیل کا ایک اپنا مزاج ہے اور اپنا ماحول اس کے باوجود شکنتلا میں ایک ایسی آفاقیت اور انسانیت ہے جس نے اس ڈرامے کو قدیم یورپی زبانوں کے ڈراموں کی صف میں لکھ ڈالا ہے۔

کالی داس کے بارے میں جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ بہت مختصر اور ناکافی ہیں۔ بعض بڑے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے دراصل اپنے کام کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل کرتے ہیں اور کالی داس بھی انہی میں سے ایک ہے۔ کالی داس کا شمار دنیا کے چند بڑے شاعروں میں ہو سکتا ہے۔ اس کے دونوں شاہکار "شکنتلا" اور "میگھ دوت" "عظیم شاعری کے بے مثل فن پائے شامل ہیں۔

"میگھ دوت" ہجر و فراق کی وہ شاعری ہے جو صرف ایشیا اور مشرق سے ہی مخصوص ہے اس میں شاعر بادلوں کو اپنا قاصد بنا تا ہے اور ان کے ذریعے اپنے محبوب تک اپنے ہجر کا

احوال بیان کر کے مرعزہ ہوتا ہے۔ میگھ دوت کی شاعری میں ایسا سوز ہے۔ ایسا درد ہے جو دنیا کی بڑی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ کالی داس کے میگھ دوت کو پڑھتے ہوئے اگر مولوی غلام رسول کی چٹھیاں یاد آجائیں تو جان لیجئے کہ دنیا کی ہر زبان میں صدیوں کے فاصلوں کے باوجود بڑے شاعر ہجر و فراق کے ایسے تجربوں سے گزرتے رہے ہیں جنہوں نے پوری دنیا کے ان انسانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے جنہوں نے ہجر و فراق کے دکھ سکھے ہیں۔

...~...~...

شکنتلا کالی داس کا وہ شاہکار ہے جس کے ہائے میں گوٹے نے کہا تھا،
 ”کیا تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا نام ہو جس میں سال کے اولین پھول اور آخری
 شمارہ اور وہ تمام چیزیں جن سے روح مسور، محفوظ اور سیراب ہوتی ہے اور
 آسمان اور زمین سبھی سما جائیں۔ تو پھر شکنتلا تیرا نام لینا کافی ہے۔“
 ۱۰۔ اچھیاں شکنتلا کا انگریزی میں جو مستند ترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے وہ رائیڈز کا ہے اردو
 میں سب سے اچھا ترجمہ قدیر زیدی نے کیا ہے اور اس کے لیے وہ خصوصی داد کی مستحق
 ہیں۔ شکنتلا کے تعارف کے لیے میں نے جو ٹکڑے لیے ہیں وہ قدیر زیدی کے ہی ترجمہ
 کا حصہ ہیں۔

شکنتلا میں بھی یونانی المیوں کی طرح دیوتا بھرپور اور فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ وہی
 ہیں جو تقدیر بنانے والے ہیں۔ ان کے شراب اور دان کی دعا سے انسانوں کی قسمتیں تبدیل
 ہو جاتی ہیں۔ شکنتلا کے ہاتھ کی انگوٹھی ٹھوکتی ہے تو اس کے محبوب راجہ دشینت کا غلط
 مجھ کو کھو جاتا ہے۔ یوں ایک ایسا المیہ جنم لیتا ہے جس کے خالق دیوتا ہیں لیکن جیسا کہ یونانی المیوں
 کے کردار دیوتاؤں کے غیظ و غضب اور تقدیر سازی کا شکار ہونے کے باوجود کھٹ پٹی نہیں بنتے
 بلکہ اپنی انسانیت کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح شکنتلا کے کردار بھی اپنے انسان ہونے کا بہت
 ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہ شکنتلا جو بہن کٹیا میں ملی اور رہتی ہے ان معدودے چند کرداروں میں سے ایک ہے
 جن کے ہائے میں بڑے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی ذہن نے اتنے نرم و نازک

اور حسین کردار بہت کم تخلیق کیے ہیں۔ شکنتلا کا حسن اس کی معصومیت اس کی سادگی و پرکاری غالب کے اس شعر میں ملتی ہے۔

سادگی و پرکاری بے خودی و ہرشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا۔

شکنتلا کا حسن معصومیت میں بھی ایسی جرات آزمانی کا مظاہرہ کرتا ہے جس کی مثال دنیائے ادب میں خال خال ہی ملتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج تک جتنی اداکاراؤں نے سینج پریا فلم میں رومی شان تارام کی فلم شکنتلا میں جے مشری (شکنتلا کا روپ دھارنے کی کوشش کی ہے اپنی شاندار مظاہرہ و فہانت کے باوجود اس شکنتلا کا عکس نہیں بن سکتی جس کا خالق کالی داس ہے کالی داس نے اپنے بے پناہ تخیل سے الفاظ میں جو چیز کاری کی ہے وہ دنیا کی مخلوق ہونے کے باوجود دنیائے ماورائے نظر آتی ہے۔

راجہ دشنیت جب پہلی بار شکنتلا کو بن میں دیکھتا ہے تو وہ ایک ایسا منظر ہے جو کبھی بھلائے نہیں بھول سکتا۔ راجہ دشنیت شکنتلا کو ایک خاص حالت میں دیکھنے کے بعد اپنے آپ سے یوں کہتا ہے۔

”اس کے سینے پر بندھی ہوئی چھپال اس کے جو بن کو اس طرح چھپا رہی ہے جیسے کوئی کسی حسین غنچے کو پیلے پیلے پتوں میں چھپا کر اس کے حسن کو کم کرنے کی کوشش کرے۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ یہ بل کل کی چولی تو اس کے قابل نہیں پھر بھی اس کے حسن کو دو بالا کر رہی ہے۔ بھلا بے کس کھلی ہوئی دکھنی کا اپنی سبط سے باہر نکلا ہوا ڈنٹھل بھی بُرا لگتا ہے اور کالی کے گھر جانے پر بے کس کنول کا حسن کم ہوا ہے کیا چاند کا داغ چاند کی عجب صورتی کو دو چند نہیں کر دیتا۔ اس طرح یہ بل کے کپڑوں میں اور بھی حسین معلوم ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن والے کچھ بھی نہیں ہیں۔ ان پر چھینے لگتا ہے۔“

کالی داس کی یہ شکنتلا جو بن لکھیا میں ملتی ہے جو دیوی ہے۔ دشنیت اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ یہ عشق ایک طرہ نہیں ہے۔ محبت کی ہی آگ شکنتلا کے دل کو بھی گرماتی ہے۔

دشْنیت اس سے اپنا آپ چھپاتا ہے وہ تو شکنتلا کے روپ کو ہی دیکھ کر اس کو اپنانے پتئی بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

شکنتلا میں وہ منظر بھی تو ایک ایسا منظر ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ منظر ہے جس میں دشْنیت دیکھتا ہے کہ ایک کالا مھوڑا کس دُھٹائی سے شکنتلا کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ شکنتلا اس مھوڑے سے تنگ آچکی اپنی سکیوں سے کہتی ہے۔

یہ بدترین مھوڑا نہیں ملے گا۔ میں ہی یہاں سے ہٹ جاؤں۔ اے

اے یہ تو یہاں بھی میرا چھپا کر رہا ہے۔ اب کیا کروں۔ اے سکیو۔ مجھے اس دشت مھوڑے سے بچاؤ۔“

اس منظر کے دُہرے معنی ہیں۔ دنیا کا ہمین مھول اور اس پر منڈلانے والا مھوڑا اور پھر دشْنیت بھی تو اس وقت شکنتلا کے لیے مھوڑا بن کر ہی وہاں چھپا کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور وہاں سے ملنے کا نام نہیں لیتا۔

نرم دنازک جذبات بہت ہی ظالم خیالات اور احساسات اعمال اور رد عمل پر مبنی یہ کھیل انسانی جذبات کا ایک بے مثال مرتج ہے۔ تقدیر اور دیوتا اپنا دار کرتے ہیں۔ دیولوالا اور مذہب کے حوالے سے بھی اس میں جو بعض دیگر شہرہ آفاق واقعات کے ساتھ مشابہت ہے۔ وہ اپنی جگہ خاص معنویت رکھتی ہے۔

شکنتلا کی وہ انگوٹھی گم ہو جاتی ہے جو اسے راجہ دشْنیت نے دی تھی جو اس کے اور راجہ دشْنیت کی شادی اور بندھن کا ثبوت ہے۔ اس کے کھو جانے اور راجہ کی یادداشت مٹ جانے کے درمیان دیوتاؤں کی مرضی شامل ہے اور یوں ہجر کا دور شروع ہو جاتا ہے حضرت سلیمانؑ کے حوالے سے بھی ایک روایت ہے کہ ان کی خاص انگوٹھی گم ہو جاتی ہے اور پھر انہیں بادشاہت سے محروم ہو کر بارہ برس بھاڑ مھوڑا کھانا پڑتا ہے اور پھر یہ انگوٹھی جو حضرت سلیمانؑ کی ہے۔ وہ بھی مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوتی ہے اور جو انگوٹھی شکنتلا کی انگلی سے نکل کر گرتی ہے وہ بھی مچھلی کے پیٹ سے ہی نکلتی ہے ان تصورات اور خیالات میں جو عالمگیر اشتراک اور مسادات پائی جاتی ہے۔ یہ وہ موضوع ہے کہ جس پر جتنا زیادہ کام ہو

کئے اتنا ہی انسانوں کے لیے انسانی زندگی اور اس دنیا کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے اور انسان انسان کے زیادہ قریب آ سکتا ہے۔

... ~ ...

سفرت اور ہنڈی ڈرامے اور شاعری کا ایک خاص دور ایسا ہے جو اسے دوسری زبانوں کے ادب میں خاص مقام دلانا ہے۔ یہاں صرف مرد ہی عورت کے حسن کی تعریف نہیں کرتا بلکہ عورت بھی مرد کے حسن کی تعریف کرتی ہے۔ شکنتلا میں کچی کا بیان دیکھیے جو راجہ دشنیت کے بارے میں ہے۔

راجہ اندر آتا ہے نگین اور سوگوار ہے۔ کچی اسے دیکھ کر کہتی ہے۔

”حسین کسی حال میں ہی ہوں حسین ہیں۔ سوگوار ہونے پر بھی ہمیں سزا گنتے ہیں۔ آہوں سے نچلے ہونٹ کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ فراق میں جاگتے ہوئے آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں مگر اس پر بھی جمال کا یہ عالم ہے کہ کانٹا سا جسم لڑکے سا بچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہیرا سان پر چڑھ کر چھوٹا ہو جائے پر اپنی جوت نہیں کھوڑتا۔“

شکنتلا کا ایک اپنا ماحول ہے، اتنا خوب صورت دلکش اور شاعرانہ ماحول شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے ڈرامے میں پیش کیا گیا ہو۔ پھر اس کے کردار بھی اپنے انداز سے دنیا کے دوسرے بڑے ڈراموں سے بے حد مختلف ہیں۔ ان کے لباس بھی مختلف ہیں ان کے اعمال اور مزاج بھی دوسرے عظیم فن پاروں کے کرداروں سے مختلف ہیں۔ شکنتلا ایک ایسا کھیل ہے جو منفرد اور نیکتا ہے۔

ڈیوئیڈ منیلے نے شکنتلا پر خاص انداز کی تنقید لکھی ہے ڈیوئیڈ منیلے کا وہ طویل مضمون شکنتلا کے محاسن پر ہی نہیں بلکہ سفرت ڈرامے پر بھی ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ ڈیوئیڈ منیلے لکھتا ہے۔

کالی داس نے شکنتلا میں جو دنیا بسائی ہے۔ وہ ہر بڑے ڈرامہ نگار کی تخلیق کردہ دنیا مختلف الٹھی اور خوب صورت ہے۔ برلن میں ایک بار جس نے اس ڈرامے کو دیکھا وہ

اس کاشیدائی ہو گیا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے دیکھنے والے بیشتر لوگ اس تہذیب کلچر اور دولہا سے بالکل نااہل تھے۔ جس نے اس عظیم کھیل کو تخلیق کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اس کھیل میں جو ماحول، جو مناظر پیش کیے گئے تھے جس ماحول میں شکنتلا کے کردار زندہ رہتے ہیں۔ وہ ان کے لیے اتنا اذکما، جاذب اور خوشگوار تھا کہ میرے خیال میں اس کو دیکھنا ان ناظرین کے لیے ایک بڑے تجربے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ پھر سنسکرت میں اس ڈرامے کی شاعری ہے جو ایسا نوبر ہے کہ آنکھوں کو بصیرت بخشتا اور ہمیشہ کے لیے دل میں سما جاتا ہے۔

عالمی ادب میں کتنے ایسے شہ پارے ہیں کہ ہیر وینس شکنتلا کی طرح خوب صورت ہیں، شاید بہت کم، شاید ایک بھی نہیں، شکنتلا اپنی طرز کی واحد ہیر وینس اور تخلیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے ہر زبان کے لوگ اسے پڑھتے چلے آ رہے ہیں اور پڑھتے رہیں گے۔

فیدرا

فرانسیسی نقاد اور ادب کے مورخ راسین کو فرانسیسی ڈرامے کا امام اور جدید فرانسیسی ڈرامے کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے ہاں کلاسیکی عناصر واضح نظر آتے ہیں اور اس کے ہاں کلاسیکیت کا تتبع اس حد تک پایا جاتا ہے کہ فرانسیسی نقاد اسے کلاسیک پارا کیلیکس کا بھی طرہ امتیاز بخشتے ہیں۔ اس نے جو ایسے لکھے ان میں سے کسی ایسے ہیں جنہیں اس کا شہکار قرار دیا جاتا ہے لیکن فیدرا اس کا عظیم شاہکار ہے اور اسے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

”فیدرا کی تقسیم کے کردار اور واقعات نئے نہیں۔ فیدرا اور اس کا امیہ قدیم یونانی امیہ نگاروں کا موضوع بن چکا ہے۔ لیکن اس پُرانے ایسے کو راسین نے ایسے انداز میں لکھا ہے کہ یہ امیہ نئی معنویت اور گہرائی کا حامل بن گیا ہے اور پورے کلاسیکی عناصر کے باوجود ایک جدید امیہ ہے۔“

فیدرا کا یہ خالق۔ تراں راسین دسمبر ۱۶۳۹ء میں فرانس کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر میں ہی وہ یتیم ہو گیا۔ اور اس کی پرورش اس کی دادمی نے کی۔ جو تھیست نیسائی عقیدے پر ايمان رکھتی تھی۔ جس کا اثر ہمیں راسین کی زندگی اور شخصیت پر بہت گہرا ملتا ہے۔ راسین کی زندگی ایسے معمول سے پُر ہے جو تصفوات سے جہنم ایسے ہیں۔ اپنے مذہبی عقیدے کے حوالے سے وہ براشکی اور توہم پرست انسان تھا وہ بہت نرم خوار و محبت کرنے والا انسان تھا۔ لیکن جوہاں اس کے مذہبی عقائد کا سلسلہ

آجاتا تھا وہ مشتعل مزاج بن جاتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس کی دادی نے اسے پورٹ رائل میں ایک سکول میں داخل کرا دیا۔ جو تریسٹ عقیدے کے لوگوں کا تھا۔ راسین نے یہاں عبرانی اور فرانسیسی میں شاعری لکھنی شروع کی اور قدیم یونانی ادبیات میں گہری دل چسپی لینے لگا۔ اس ضمن میں اس نے خاص شہرت حاصل کی۔ وہ یونانی ادب کا بے حد پُر خلوص اور سنجیدہ طالب علم تھا۔ اس کالج میں وہ زیادہ عرصہ تک نہ ٹم سکا۔ اس کے ہم سبب دنیاوی امور میں الجھے رہتے۔ ان کے اشغال سے راسین کو نفرت تھی۔ مذہبی عقیدے میں اس کی غلو پسندی اسے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن ہارکوٹ کالج سے اس کی شہرت باہر بھی پھیل چکی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے وہ اپنی شناخت کرا چکا تھا۔ اور پھر جب بادشاہ لونی سپاروہم کی شادی پر اس نے ایک نظم لکھی تو نہ صرف اس کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ بادشاہ نے اسے انعام سے بھی نوازا۔

راسین ۱۶۶۲ء میں پیرس میں پہنچا۔ جہاں اسے بطور شاعر سماجی اور اعلیٰ اہل علموں میں تسلیم کر لیا گیا۔ لونی پانزدہم جب بیماری سے صحت یاب ہوا تو راسین نے ایک نظم لکھی جس سے اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اور اسی زمانے میں اس کا تعلق اپنے عہد کے بڑے لکھنے والوں، مولیئر، فونٹین اور بولیو سے پیدا ہوا۔ مولیئر نے بطور خاص اس کی ہمت افزائی کی۔ مولیئر کی اپنی عقیدہ ریکل کمپنی تھی۔ اور راسین کا پہلا ڈرامہ مولیئر نے ہی پروڈیوس کیا۔ راسین کا دوسرا ڈرامہ بھی مولیئر کی ہی کمپنی نے کھیلا لیکن اس کھیل کے دو ہفتوں کے بعد تھئیٹر کے اداکاروں کی وجہ سے مولیئر اور راسین میں شدید ناچاقی پیدا ہو گئی۔ تاہم ان دونوں ڈراموں کی وجہ سے راسین بطور ڈرامہ نگار اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور فرانس کے بزرگ ڈرامہ نگار کورنیٹیل کا حریف سمجھا جانے لگا۔

اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے راسین کی شہرت میں خاصا اضافہ کیا۔ پورٹ رائل کے تریسٹ عقیدے کے لوگ ڈرامہ اور سٹیج کے شدید مخالفت تھے اور

ایک خاص طرح کے محدود ڈرامے کے قابل تھے۔ اس گروہ کے سربراہ ایک مصنف نکول نے ڈرامے کے خلاف ایک بہت تیز مضمون شائع کرایا۔ جس میں ڈرامہ نگاروں کو عوام اکائیڈی قرار دیا کہ یہ لوگ محض عوام کو حوسٹ کرنے کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔ راسین کا فن ڈرامہ کے بارے میں اپنا ایک عقیدہ اور فلسفہ تھا۔ راسین نے نکول کے مضمون کا بڑا ٹیکھا جواب دیا۔ اور یوں ایک لمبی بحث چھڑ گئی۔ ڈرامے کی عالمی تاریخ اور بالخصوص فرانسیسی ڈرامے کی تاریخ میں یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر راسین ہتھیار ڈال دیتا۔ ڈرامے اور ڈرامہ نگاروں کا دفاع نہ کرتا تو فرانس میں ڈرامے کی تاریخ اور روایت قدرے مختلف ہوتی۔ بہر حال اس طویل مباحثے کے نتیجے میں راسین کے مزاج میں بڑی تلخی پیدا ہوئی۔ اس نے بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں وہ جس پر خود بھی پھپھکتا تھا۔ بہر حال اس واقعہ کے بعد وہ پورٹ رائل سے چلا اور اس کی زندگی کے دس برسوں کے بارے میں بہیں خاص معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ بہر حال ۱۶۷۳ء میں اسے۔ اکادمی فرانس کا رکن بنایا گیا۔ ۱۶۹۷ء میں سٹیج اور ڈرامے کی دنیا میں اس کی فتوحات کا آغاز ہوا اور انہی میں "فیدرا" بھی شامل ہے۔ راسین نے صرف المیہ ڈرامے ہی نہیں لکھے بلکہ طربیہ کھیل بھی لکھے۔ ایک طنزیہ کھیل "تائون" پر بھی لکھا۔

ڈرامے اور سٹیج کے لیے راسین نے کمی لڑائیاں اور مخالفتیں مول لی تھیں۔ وہ فرانس میں سٹیج کے معاملات کے بارے میں بڑا سنجیدہ تھا۔ اور تبدیلیوں کا حزامان تھا۔ لیکن یہ تبدیلیاں ٹرینسٹ گروہ کے ساتھ لڑ جھگڑ کرنے کی جاسکتی تھیں۔ اس لیے اس نے سٹیج اور ڈرامے کی بہتری کے لیے ٹرینسٹ گروہ سے مصالحت بھی کر لی اور یوں وہ فرانسیسی سٹیج کی دنیا میں بعض ناگزیر اور انقلابی تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہو گیا۔ سٹیج اور ڈرامے کی دنیا میں یہ اس کی بڑی عطا ہے۔ انتہائی سہولت اور کامیابی کے بعد ایک دور چھرا لیا آتا ہے جب وہ ڈرامے اور سٹیج کی دنیا سے نکل جاتا ہے۔ اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ کیونکہ اس کا تعلق اس کے شہکار "فیدرا" سے ہے۔ راسین نے اس زمانے میں شادی کر لی۔ گھر لیو زندگی بسر کرنے لگا اور اپنے مذہبی اشتغال میں

زیادہ انہماک کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ۱۶۷۷ء میں اس نے ایک سادہ اور عام عورت سے شادی کی تھی۔ وہ سات بیٹوں کا باپ بنا۔ شاہ فرانس نے اسے شاہی مورخ کا عہدہ دے دیا تھا۔ جس کا اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ بادشاہ اسے ستائش بھی بھیجا کرتا تھا۔ اپنی آخری عمر میں راسین نے پھر دو ڈرامے لکھے۔ جن میں مذہبی رنگ اور ایک عجیب طرح کا اضمحلال بڑا نمایاں ہے۔ ان میں ایک ڈرامہ بائبل کے مشہور کردار۔

اسٹیو پر مبنی ہے۔

راسین کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۶۹۹ء کو پیرس میں ہوا اور اس کو پورٹ رائل میں

دفن کر دیا گیا۔

”فیدرا“ اور راسین کا فن

نقادوں نے راسین کا موازنہ دنیا کے بڑے بڑے المیہ نگاروں سے کیا ہے۔ عام سطح کے نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ واقعات اور حادثات پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ حالانکہ یہی راسین کی سب سے بڑی خصوصیت اور جدیدیت ہے۔ ایک بات پر تمام نقاد متفق ہیں کہ راسین ڈرامے کے آرٹ کو سب سے بہتر انداز میں سمجھتا اور برتا تھا۔ وہ کلاسیکیت کا علمبردار تھا۔ اور اس کے فن پر کلاسیکیت کی چھاپ بہت گہری اور نمایاں ہے۔ اس کے ڈراموں میں قوت اظہار اور قوت متخیلہ دونوں بے پایاں اور انتہائی موثر ہیں۔

راسین کے قاری ہی جانتے ہیں کہ ”فیدرا“ اور اس کے دوسرے ڈرامے کن خصوصیات کے حامل ہیں۔ راسین کلاسیکی طرز اسلوب کا المیہ نگار ہونے کے باوجود جدید المیہ نگار ہے۔ وہ اپنے ایسے ہی واقعات اور واقعات کو بہت معمولی وقعت دیتا ہے۔ انہیں محض اضافی قوت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے ڈراموں کی مرکزی روح اور بنیاد جذباتی کشمکش اور جذباتی سجان ہے۔ جذبات کا تصادم اور تضاد ہے جن سے المیہ جنم لیتا ہے۔ ”فیدرا“ کو اسی لیے اس کا شہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس میں

جذبات کا تصادم، تضاد اور کش مکش انتہائی نرم و نازک اور سچیدہ بلندلیوں پر ہے۔
 راسین انسانی نفسیات کو سمجھتا ہے۔ وہ انسانی جذبات کا تجربہ بھی کرتا ہے۔ اسی
 لیے بعض نقادوں نے اس کے المیوں کی "نفسیاتی ایسے" قرار دیا ہے۔ اور پھر جہاں بھی
 نفسیاتی اور جذباتی "کسٹن مکش تیز ہوئی ہے۔ وہاں راسین کا شعری انبار بھی بلند تر
 بڑجاتا ہے۔ وہ محبت کو جس انداز میں نفسیاتی تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اس کا اندازہ فیدرا کے
 مطالعے سے ہی ہو سکتا ہے۔

ایم ایچ بائیل نے ایک کتاب "راسین اور ٹیکسڈیر" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں
 بائیل نے راسین کی شاعری کو ٹیکسڈیر کے ڈراموں کی شاعری سے بہتر ثابت کیا ہے۔
 "فیدرا" راسین کا وہ المیہ کھیل ہے جو اس نے اس دور میں لکھا جو اس کے فن کی
 بلندلیوں اور کھیلنگی کا دور ہے۔ "فیدرا" پہلی دفعہ جنوری ۱۶۶۷ء میں ہوٹل ڈمی بورگون میں کھیلا
 گیا۔ اور بہت کامیاب رہا۔ لیکن راسین کے مخالف عہد ہی میدان میں آگئے۔ ایک نئے
 تھیٹر میں نکولس پراون کا لکھا ہوا "فیدرا" بھی سیٹیج کیا جانے لگا۔ "فیدرا" ایک ہی موضوع
 پر دو ڈرامے پیرس میں بیک وقت دکھائے جا رہے تھے۔ ان میں راسین کا کھیل فن کا
 شہکار تھا۔ اس میں نفسیاتی گہرائی اور تعمیلی حسن اور آرٹ کا گہرا شعور موجود تھا۔ جبکہ نکولس پراون
 کا کھیل عامیانہ تھا۔ اور عامیانہ انداز میں ہی لکھا اور کھیلا گیا اور پھر جیسے کہ ایم ایچ بائیل
 نے لکھا ہے :-

"راسین عام آدمیوں کا ڈرامہ نگار نہیں۔ وہ خاص طبقے اور باذوق المیہ پسند کرنے
 والوں کا المیہ نگار ہے۔"

نتیجہ دہی نکلا جو اکثر ہر دور میں سامنے آتا ہے کہ مقبذ ل، عامیانہ کام کو اکثریت پسند
 کرتی ہے۔ گہری سچائی، رمزیت اور انسانی نفسیات کے تجربہ کو اچھے ذوق کے لوگ
 ہی پسند کر سکتے ہیں۔ یوں اس وقت عامیانہ کھیل نے شہکار فیدرا کو بچھا ڈیا۔ جس کا
 راسین کو بے حد قلق ہوا۔ اور وہ ایک عرصہ تک ڈرامہ نگاری سے ہی اکتا گیا۔ لیکن آج
 یہی ڈرامہ ہے جو عالمی شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔

”فیدرا“ ایک عالمی اور عوامی تنظیم کے علاوہ ایک دیومالائی موضوع بھی ہے۔ تین کروڑ باپ، بیٹا اور عورت۔ جو باپ کی دوسری بیوی بنتی ہے۔ دولت، جوانی اور حسن، ان منزل کا تصادم، جذبات ہی جذبات، محبت ہی محبت اور پھر جذبات کا شکر اؤ۔ تصادم جو عظیم المیے کو جنم دیتا ہے۔ ”فیدرا“ جوانی، حسن اور جذبات سے بھری ہوئی عورت ہے۔ جس کی شادی ایک بوڑھے دولت مند سے ہوتی ہے۔ جس کا جوان بیٹا ہے۔ اس بیٹے کی نئی ماں حسین ہے تو بیٹا جذبات اور جوانی اور لڑوں وہ اس جوان کی محبوبہ بن جاتی ہے۔ جذبات کی آگ دہک اٹھتی ہے۔ الاؤ۔ جو باپ کی نفرت کو جنم دیتا ہے۔ جذبات کا طوفان ... جس میں تینوں انسان بہ جاتے ہیں۔ فیدرا خود کشی کرتی ہے جو ان بیٹا مارا جاتا ہے اور باہر زندہ رہتا ہے۔ ایسے کا تاثر گہرا اور انٹ کرنے کے لیے ”فیدرا“ میں ایسی نرمی، ایسی رمزیت، ایسی جذباتی کشمکش اور ایسا جذباتی پچھتاوا ہے جس نے اسے دنیا کا عظیم شہکار بنا دیا ہے۔ اس پورے کھیل میں راسین کا انداز اور اسلوب بے حد سادہ لیکن پُرکار ہے۔ اس میں محسوسات اور نفسیاتی تجربے کا ایک نادر امتزاج ملتا ہے اور پھر محبت کے جذباتی سپر اور SHADES اس المیے کو ایسی معنویت سے آشکار کرتے ہیں جو دنیا کے بڑے تخلیقی فن پاروں کا ہی خاص حسن ہوتا ہے۔

”فیدرا“ کے حوالے سے میں ایک فلم کا ذکر کروں گا جس کے ہدایت کار جارج ڈائسن تھے اس میں یونان کی عظیم اداکارہ جیلینا مریکوری نے ”فیدرا“ کا کردار ادا کیا تھا۔ اب یہی اداکار اپنے ملک کی دزیر ثقافت ہے۔ میں سمجھتا ہوں جن لوگوں نے راسین کے کھیل ”فیدرا“ پر یعنی فلم کا نیا درشن دیکھا ہے وہ اس فلم اور جیلینا مریکوری کی اداکاری سے مزور متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے راسین کے المیے ”فیدرا“ کو خواہ میری طرح انگریزی ترجمے کے حوالے سے ہی پڑھا ہے۔ وہ یقیناً اس عظیم عالمی فن پارے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

ہیکلٹ

چوہل نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے برطانوی مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ دینے پر رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن ولیم ٹیکسپیئر کے حوالے سے برطانیہ کو جو فخر اور اعزاز حاصل ہے اس کے حوالے سے ٹیکسپیئر کو غیر بنانے سے انکار کر دیا تھا.....

ڈاشنگٹن اور ہنگ نے اس کی موت اور اس کے مقبرے کو حوالہ بناتے ہوئے لکھا تھا۔

A beacon towering amidst the gentle landscape to guide us
the literary priam of every nation to his Tomb.

میتھیو آرنلڈ نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔

Others abide our questions we ask and ask. Thou smilest
and art still out topping knowledge.

کونسا لکھنے والا ہے جس نے ولیم ٹیکسپیئر کو نہیں پڑھا۔ کونسا سنجیدہ قاری ہے جس نے ٹیکسپیئر کے مطالعے کے بغیر اپنے مطالعے کو مکمل سمجھا ہو۔ ٹیکسپیئر واحد لکھنے والا ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ بتنا کچھ اس کے بارے میں لکھا گیا۔ کسی دوسرے کے بارے میں نہیں۔ جتنی قوموں نے اسے اپنا پڑھا اور اس کے ڈراموں کو کھیلا۔ کسی دوسرے ڈرامہ نگار کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ ولیم ٹیکسپیئر ایک واحد ایسا لکھنے والا ہے جس نے اتنے انسانوں اور انسانوں کے تخلیق کردہ ادب

کو متاثر کیا۔ وہ ایک ایسا نام ہے جو ساری دنیا میں صدیوں سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس کے ڈراموں کے کردار۔ زندہ اور لازوال کردار بن چکے ہیں۔ اس کے بارے میں جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے بارے میں جتنا کھسکا گیا کم ٹھہرا۔۔۔

۱۹۸۳ء کے ابتدائی عہدوں میں ہٹلر کی جعلی ذاتی ڈائریوں کا جو ڈرامہ دنیا کے سامنے آیا۔ اس کے حوالے سے "نیوزویک" کے ایک کالم نگار نے لکھا کہ دو ایسے افراد ہیں جن سے پوری دنیا اثر لیتی ہے۔ ان کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جائے، کہا جائے اسے لوگ گہری بلکہ مجنونا نہ دلچسپی سے سنتے ہیں۔ ایک ٹیکسیڈیر۔ دوسرا ہٹلر، ٹیکسیڈیر کو سمجھے بغیر ان کو سمجھنا خاصا دشوار سمجھنا ہے اور ہٹلر کو سمجھے بغیر موجودہ دنیا کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی۔

ٹیکسیڈیر پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود ہمیں آج تک اس کے پورے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ ٹیکسیڈیر جو بلاشبہ چارلس لیب کے الفاظ میں

Outstanding Literary Glory of the World.

ہے۔ وار وکٹ ٹرکے ایک گاؤں سٹراٹفورڈ، اڈن، ایرلینڈ میں اگست ۲۳، ۱۵۶۱ء کو پیدا ہوا۔ اس کے والدین کو اسے ان پڑھ سمجھتے۔ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ ٹیکسیڈیر جس کمرے میں پیدا ہوا آج بھی وہ اس کی یادگاہ کے طور پر محفوظ ہے۔ اس گاؤں کے دیہاتی اور بے علم ماحول میں ٹیکسیڈیر کا بچپن اور جوانی کے ایام بسر ہوئے قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے مفت طے والی گرامر سکول کی تعلیم ضرور حاصل کی۔ تعلیمی اعتبار سے وہ اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے اور اس کے شاہد ملتے ہیں کہ اس نے نصاب کا پیشہ سیکھنے کے لیے کچھ عرصہ تربیت بھی حاصل کی تھی۔

وہ بڑا ڈرامہ نگار اور شاعر کیسے بنا؟ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہم جہلیوں کے ساتھ تھیٹر میں کام کرنے والے فنکاروں کو بڑی دل چسپی سے بچپن ہی میں دیکھا کرتا تھا۔ ان میں وہ ایک خاص کشش محسوس کرتا تھا۔ یہی وہ عمر تھی جس میں اس دلچسپی کی بنا پر اس کی حس مشاہدہ تیز ہوئی۔ اسی عمر میں اس نے لپٹے ڈھن میں مواد کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس عمر میں وہ سبب نوع انسان میں دلچسپی لینے لگا تھا چر بعد میں اس کے ڈراموں کا طرہ امتیاز بنی۔

ٹیکسیڈیر کے بارے میں جو ریکارڈ ملتا ہے وہ اس کے گاؤں کی میونسپل کمیٹی میں موجود ہے۔

اس کی شادی اس کے تین بچوں سوزانا اور جردواں ہیمنٹ اور جوڈیٹھ کی پیدائش کا ریکارڈ اور خود اس کی موت کا اندراج موجود ہیں۔

جب منظر بدلتا ہے اور وہ سٹراٹفورڈ سے لندن پہنچتا ہے تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ مستند کوائف معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے ہم عصر جن میں بین جانسن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہمیں بتاتا ہے کہ ٹیکسپیئر متحمل، نرم مزاج، دوستانہ، خور کھنے والا آدمی تھا جسے لوگ Sweet will Shakespeare کہا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ درمیانے قد کا متوسط اور گتھے ہوئے جسم والا تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری اور بال سُرخ رنگ کے تھے۔

ٹیکسپیئر اٹھارہ برس کا تھا کہ اس کی شادی ایسی ہیٹھا دے سے ہوئی۔ اسی زمانے میں ٹیکسپیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے ایک جاگیر دار کے کچھ ہرنوں کو خرید لیا تھا جس سے خاصا ہنگامہ پیدا ہوا تھا۔ اس کی حقیقت کیا ہے اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بعد پھر ایک عرصہ اس کی زندگی میں آتا ہے۔ جس کے بارے میں بہت قیاس آرائیاں کی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب کا آج تک علم نہیں ہو سکا جن کے حوالے سے کہا جاسکے کہ ٹیکسپیئر ایک لمبی مدت تک اپنے خاندان اور گاؤں سے کیوں غائب اور غیر حاضر رہا۔ بہر حال یہ طے شدہ امر ہے کہ اسے اپنی بیوی سے محبت نہ تھی۔ وہ اچھا شوہر اور باپ بھی نہ تھا۔ لیکن اسے اپنے عزیز اور تباہ حال والد کا بے حد خیال رہتا تھا۔ ولیم ٹیکسپیئر ایک اچھا بیٹا ضرور تھا۔

وہ بیس برس کے لگ بھگ تھا جب وہ لندن پہنچا۔ لندن پہنچ کر وہ پہلے کیا کرتا رہا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ۱۵۹۲ء میں گنہمی کی دھند سے نمودار ہوتا ہے۔ ایک اداکار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ... اور وہ ایسے انداز میں سامنے آتا ہے کہ اپنی ذہانت، مقبولیت اور فطانت کے حوالے سے اپنے کئی حاسد پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے ایک ہم عصر رابرٹ گرین نے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کی اہانت کرتے ہوئے اسے

The only shake - scene in a country. لکھتا ہے۔ گرین کی

موت کے بعد جب اس کا کام جمع ہوا تو اس کے مرتب نے معذرت کی۔ گرین نے حسد کی وجہ سے ٹیکسپیئر کی اہانت کی تھی اور جوڑنے دمی تھی وہ ستر پانچ غلط تھی۔

ٹیکسپیئر کی مشہور زمانہ نظمیوں 'ویفیس اینڈ اوڈنلس' (غالباً ۱۵۹۳ء) اور 'ریپ آف لیڈ کرٹیس' (۱۵۹۴ء) میں شائع ہوئیں۔ اس کے سائٹ ۱۶۰۹ء میں شائع ہوئے۔

۱۵۹۴ء میں ولیم ٹیکسپیئر اداکاروں کی چیئرمین کمپنی کا ممبر بن چکا تھا۔ اس کے نام ان اداکاروں کی فہرست میں ملتا ہے جنہوں نے شاہی دربار کے ڈراموں میں حصہ لیا اور ان کو معاوضہ ادا کیا گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ سہیلٹ میں اس نے سہیلٹ کے والد یعنی GHOST کا کردار ادا کیا تھا۔ ASYOU LIKE IT میں بھی اس نے آدم کا کردار کیا لیکن بحیثیت اداکار وہ زیادہ منفردیت یا کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے حاصل کر لی تھی۔ لیکن وہ اپنے بارے میں کبھی لاف نہ مارتا تھا اور کہا کرتا تھا۔

My nature is subdued tow hat it works in.

اس نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ گلوب تھیٹر میں اسے حصہ دار بنایا گیا۔ وہ سٹرٹفورڈ آنا جاتا رہتا تھا ۱۵۹۶ء میں اس کے بیٹے ہیمینٹ کا انتقال ہوا۔ ۱۵۹۷ء میں ٹیکسپیئر نے سٹرٹفورڈ میں کچھ باغات اور ایک مکان خریدا۔ ۶۰ میں وہ یہاں مستقل طور پر رہنے کے لیے آ گیا۔ اب وہ ایک تھکا کا ماندہ آدمی تھا۔ جو باقی ماندہ زندگی آسودگی سے گزارنا چاہتا تھا۔ جیمز رسل کوویل نے لکھا ہے۔ اس نے اپنے وہ اپنے مکان کے دروازے کے باہر کھڑا اکثر اپنے ہمسایوں سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتا تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس کو محترم گردانتے تھے۔ ڈرائیڈن اور مین جانسن اسے دلہاں طے کرتے تھے۔ مارچ ۱۶۱۶ء میں اس نے اپنا وصیت نامہ مرتب کیا جس کی عالمگیر شہرت ہے۔ اپنی بیوی کے لیے اس نے 'Second best bed' ترکے میں چھوڑا۔ اپریل ۱۶۱۶ء میں ٹیکسپیئر بخانکے عارضے میں مبتلا ہوا۔ اور اپنی سیدائش کی تاریخ یعنی ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء کو وہ اس جہان فانی سے اٹھ گیا۔ دو دن بعد اس کو اس کے قصبے کے خوب صورت قبرستان میں دفن دیا گیا۔

ٹیکسپیئر کے ڈرامے

ٹیکسپیئر کے ڈراموں کی فہرست اس ترتیب سے دی جا رہی ہے جس کے بارے میں یقیناً کبھی غلب ہے کہ انہیں اس ترتیب سے لکھا گیا تھا۔

ہنری ہشتم (تین حصے)	_____	لڈو جنٹا مین آف ویرونا	_____	کامیڈی آف ایررز
رچرڈ ڈوون	_____	رچرڈ سوم	_____	لوز لیبر لاسٹ
مرچنٹ آف وینس	_____	اسے ڈسٹرنا ٹینٹس ڈریم	_____	رومیو اینڈ جولیٹ
گنگ جان	_____	ٹینگ آف دی شریو	_____	ہنری چہام (دو حصے)
ہنری پنجم	_____	ایزیو لائیک اٹ	_____	مچ آڈر، اباؤٹ ٹھنک
ہیلٹ	_____	میری ڈائوڈ آف ونڈرس	_____	سر ڈیویس اینڈ کرسٹینا
میشرفار میشر	_____	ہنری ہشتم	_____	ادو تھیلو
گنگ لیٹر	_____	آرڈویل ریٹ اینڈ زویل	_____	میبلکھ
جولیس سیزر	_____	ٹولیفقہ نائٹ	_____	انٹونی اینڈ قلوپٹرو
گبیلین	_____	ٹاممن آف ایٹھنر	_____	کورڈیلو ٹینس
ڈسٹریٹل	_____	دی ٹپسٹ	_____	

ہیری کلیر اور ٹینٹس اینڈ نیلکس دو ایسے کھیل ہیں جن کے بارے میں اس ٹیک و شبے کا شدید انعام کیا جاتا ہے کہ ٹیکسپیر کی تصانیف نہیں ہیں۔

ٹیکسپیر کے تراجم

ٹیکسپیر ایک ایسا ڈراما نگار ہے جس کے ڈراموں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہوئے ہیں صدیوں سے وہ دنیا کی سٹیج پر اپنی عظیم اور لازوال تصانیف کے حوالے سے زندہ ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں سٹیج ہے ٹیکسپیر موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ڈرامے کو جانے کتنی بار دنیا کے ہر ملک میں کھیلا گیا اور کتنی بار کھیلا جائے گا۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلم کے ذریعے اس کے ڈرامے بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔ دنیا میں اس فنکار کو خاص قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس نے ٹیکسپیر کے کسی کھیل میں کوئی اہم کردار ادا کیا ہو۔ ٹیکسپیر میں ایکسٹری کی ایک اپنی ہی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

ٹیکسپیر کے کھیلوں کو ہر ملک میں کھیلا گیا اور کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا ریکارڈ رکھنا بھی دشوار ہے

دنیا کی ہر زبان میں اس کے تراجم ہوئے۔ اردو زبان میں اس کے سب سے بڑے مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی ہیں جنہوں نے اس کے متعدد دورے اردو میں منتقل کیے۔ مرحوم صوفی تبسم نے ٹیکسپیئر کے ایک کھیل اے ڈیسٹائنٹس ڈریم کو سادہ زبان کا سپنا کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ سید قاسم محمود اور سید تجیز رضوی کے میکیتھ کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سید قاسم محمود نے میکیتھ کا انٹرا میں ترجمہ کیا ہے۔ جبکہ سید تجیز رضوی نے اسے شہنہ کی بحر میں منظوم ترجمہ کر کے ایک نیا اور خوشگوار تجربہ کیا ہے۔ رومی جو لیت کے دو تراجم ہیں۔ ایک مرحوم عزیز احمد کا ترجمہ ہے جو بے حد قیاس ہے اور سادہ ہر کا جو آزاد نظم کے قالب میں کیا گیا ہے۔

برصغیر ہندوپاک کی علاقائی زبانوں میں بھی ٹیکسپیئر کے تراجم موجود ہیں۔ ہمارے ہاں ٹیکسپیئر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور انگریزی کے نصاب میں ٹیکسپیئر صدیوں سے پڑھا جا رہا ہے۔

”ہیملٹ“ کیوں

میر کے کلام میں بہتر شہرت ہی تو نہیں۔ ان نشریوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ٹیکسپیئر کا صرف ایک ایسا ڈراما ہی تو نہیں کہ جس کو بقائے دوام حاصل ہوا اس کے کتنے ہی ایسے شاہکار ہیں جنہیں لوگ صدیوں سے پسند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تاریخی اور کامیڈی کھیلوں میں ہی ایسے کتنے کھیل ہیں جنہیں لوگ صدیوں سے پسند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ المیوں میں بھی رومیو اینڈ جولیت ہے اور جولیت تو وہ کردار ہے کہ جس سے زیادہ خوب صورت، وفا شعار، نرم دماغ، کردار بعض نقادوں کے خیال میں پوری دنیا کے ادب میں موجود نہیں۔

اوتھیلو میں تو آج کا تجربہ بھی شامل ہے اور پھر حسد کا نیلی آنکھوں والا اشد عا تو ہر دور میں انسانوں کو ڈستا چلا آیا ہے۔ پھر بھی حاسد اوتھیلو سے ہمیں ٹیکسپیئر محبت کرنا سکھاتا ہے۔ کیونکہ اوتھیلو زندہ نہیں۔ ان ہے جو لیس سیزر کے کردار کتنے عظیم ہیں اور اس کے حوالے سے جو ٹیکسپیئر نے کہا ہے اس کی معنویت کب دھنلا سکتی ہے۔ گنگ ریر کا المیہ انسانی رشتوں کی ایسی تفسیر سامنے لاتا ہے جو اس سے پہلے اس موثر انداز میں شاید ہی پیش کی گئی ہو اور پھر میکیتھ۔ جس میں لیڈی میکیتھ اپنے ہاتھوں سے خون کے حصے دھونے کے لیے سارے سمندروں کے پانی کو کھجی سمجھتی ہے۔ یہی

لیڈی میکیٹھ ہے جسے محمد حسن عسکری مرحوم نے جدید عورت کی پرزانی قرار دیا ہے اور پھر مرحیٹ آف ویس اور اس کا شانی لاک۔

کاشش یہاں گنجائش ہوتی اور میں تفصیل سے لکھ سکتا کہ صیہونیت کے دباؤ کی وجہ سے آج یورپ کے بعض ممالک اور امریکہ میں، مرحیٹ آف ویس کو سٹیج پر پیش کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اس پر کوئی ردِ فلم نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس میں شانی لاک کے حوالے سے ٹیکسیپیئر نے یہودیوں کی اس ذہنیت کو آشکار کیا ہے جو حقیقی، دائمی اور سچی ہے (اور موبو جولیٹ، میکیٹھ گنگ لیسر، ادتھیلو، جولیسی سیزر، انٹونی اینڈ ٹولویپرو، وغیرہ کیسے کیسے کردار ہیں جو ٹیکسیپیئر کے حوالے سے لازوال ہو چکے ہیں۔ ان کرداروں کے ادا کرنے والے بعض فن کاروں نے عالمی شہرت اور اعزاز حاصل کیے ہیں۔ لیکن ہیملٹ۔ ہیملٹ پرنس آف ڈنمارک ہی اب کیوں المیہ ہے جس کو ٹیکسیپیئر کا سب سے بڑا شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لازوال ڈراموں میں اسے کونسی خصوصیت حاصل ہے کہ لازوال ڈراموں میں بھی اسے سب سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

”ہیملٹ۔ ہی کیوں دنیا کی سوعظیم تخلیقی کتابوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔

مجھے ابتدا ہی میں اس کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ٹیکسیپیئر اور پھر اس کے عظیم ایسے ہیملٹ پر مختلف مستند حوالوں کے باوجود میں اس کی عظمتوں کو پوری طرح اُجاگر نہ کر سکوں گا۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ... ایک مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ ”ہیملٹ کو پوری گہرائیوں کو سمجھنا اور پھر اس کو تخریر کرنا میرے جیسے طالب علم کے لیے ناممکن ہے بہر حال ایک مخلصانہ کاوش ضرور کروں گا کہ ”ہیملٹ کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ اور یہ واضح ہو سکے کہ ٹیکسیپیئر کے کھیلوں میں سب سے اہم کھیل ”ہیملٹ ہی کیوں ہے۔“

ٹیکسیپیئر کے بیشتر ڈراموں کی طرح ”ہیملٹ“ کے کردار اور واقعات کو بھی مختلف ڈراموں کے حوالے سے حاصل کر کے ٹیکسیپیئر نے المیہ لکھا ہے۔

بارہویں صدی کے آدھریں ایک ڈینش وقائع نگار اپنے ملک کے ماضی پر تحقیق کر رہا تھا کہ اس نے ایلمتھ پرنس آف جٹ لینڈ کے واقعات کو دریافت کیا۔ اور وقائع نگار اور محقق کا نام ساکو گرامٹیکس تھا۔ ساکو پوتا ہے کہ پرنس ایلمتھ نے اپنے چچا فنڈیگ کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا

بدلہ چکاتا تھا جسے فینیک نے بڑی عیاری سے قتل کر دیا تھا اور اس کی بیوی شہزادہ ایملتھ کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ ساکسو بتاتا ہے کہ ڈنمارک کی تاریخ میں یہ واقعہ لیجنڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیجنڈ میں شہزادہ ایملتھ ہیملٹ کی طرح ہلاک نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بڑی ہوشیاری سے انتقام لے کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لیجنڈ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پرنس ایملتھ نے اپنے آپ کو جزئی اور پاگل بنا دیا تھا۔ یہ اس کی ایک چال تھی تاکہ وہ انتقام لے سکے اور اس کی تکمیل کر سکے اور اس کی تکمیل کے بعد زندہ رہ سکے۔

یہ لیجنڈ مختلف انداز سے سفر کرتا ہوا ٹیکس پیئر پنچتا ہے۔ ٹیکس پیئر وہ مسیحا فی کار ہے جو مردہ بڑوں جیسے مواد کو اپنے فن سے زندہ کر دکھاتا ہے۔ اس نے یہ جادو اپنے اکثر ڈراموں میں جگایا ہے۔ ساکسو ہیں جو کہانی پرنس ایملتھ سنانا ہے۔ وہ ہیں بے حد بچکانہ لگتی ہے لیکن اسی کہانی کو نامی کرداروں سے ٹیکس پیئر نے انسانی زندگی اور تقدیر کی تفسیر بنا دیا ہے۔

ساکسو کے حوالے سے یہ کہانی دوسرے تاریخ دانوں کے ہاں بھی ملتی ہے فرانکو بیلے فورسٹ جیسے فرانسیسی مصنف کی کتاب کے حوالے سے یہ کہانی انگریزی میں منتقل ہوئی۔ انگریزی میں اسے History of the hamlet. کے نام سے شائع کیا گیا۔

ساکسو نے جو کہانی بیان کی سنی اس میں اس نے ایملتھ کی ماں اور مقتول بادشاہ کی بیوی کو مظالم بے شطا اور سازش کا شکار بتایا تھا لیکن فرانکو بیلے فورسٹ نے اسے مجرم ذالغیر اور اپنے شہرہ کے قتل کی مشربک گردانا۔ پرنس ہیملٹ کا قصہ ٹیکس پیئر کے ہم عصروں کے لیے بھی دل چسپی کا باعث رہا اور ٹیکس پیئر سے پہلے بھی اسے ڈرامے کا موضوع بنایا تھا۔

اگر ہم بہت پیچھے ماضی میں چلیں اور اس فباید کا سراغ لگانے کی کوشش کریں تو ہم پر ایک خوشگوار لیکن حیران کن انکشاف ہوگا۔ ٹیکس پیئر اور قدیم یونانی ڈرامے میں زمین آسمان کا فرق ہے یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن ایسکلیس کے شاہکار ایملے اور ہیٹا کا ڈکلاگ نیز ہے ہیملٹ کی طرح اور ہیٹا بھی ایک ایسا کھیل ہے جس کو انتقام کا کھیل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ ٹیکس پیئر کسی طرح بھی ایسکلیس کے اس عظیم ایملے سے متعارف نہ تھا۔ ایسکلیس ٹیکس پیئر کی رسائی سے دور تھا لیکن وہ اور ہیٹا اور یونانی دیوالہ سے اچھا خاصا تعارف رکھتا تھا۔ اور ہیٹا دراصل ایک ایسا المیہ ہے جو تین حصوں میں

منقسم ہے۔ اس کا پہلا کھیل "ایگمنان" ہے جس میں ہیلٹ کے والد کی طرح ایگمنان جیسے بڑے بادشاہ کو اس کی بیوی اپنے چاہنے والے کے لیے قتل کرتی ہے۔ ہیلٹ کی طرح یہ اور سٹیس کا بھی مقدر ہے کہ وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ چکائے یہ مشابہت بہت سے سوالوں کو جنم دیتی ہے لیکن یہاں اس مشابہت کا ذکر ہی کافی ہے۔

انتقام۔ جسے سکن نے Wild justice کا نام دیا ہے۔ ایک ایسا موضوع ہے جو ہمیشہ سے تخلیق کاروں کو مغرب رہا ہے۔ ایسکلیس کے بعد یورپیڈیز بھی اس موضوع کو ایسے کی شکل دیتا ہے اور اس کا المیہ "اورلیٹس" ۱۷۰۵ء میں کھیلنا ہے۔ ٹیکسپیڈ براہ راست یونانی ڈرامے اور لیٹا کے ان ڈراموں سے متعارف نہ تھا جی کو تقسیم کے اعتبار سے ARRANGE PLAYS کہا جاتا ہے لیکن وہ اس ضمن میں سڈکا کے ڈراموں سے براہ راست معارف تھا۔

۱۶۰۰ء میں برطانیہ میں ایسے کھیل لکھنے کا خاصا رواج تھا۔ جن میں اس انتقامی جذبے اور انتقام کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ "پگنگ" (۱۵۶۷ء) اور "نورٹن" (۱۵۶۲ء) کے ایسے کھیل مل چکے ہیں جو اس سجان کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ٹیکسپیڈ کے "ہیلٹ" کا سرشپہ الزبتھ دور کا ایک ایسا ڈرامہ ہے جو گذرہ کی ذیل میں آتا ہے اس کا نام ur Hamlet kyd تھا اور اس کا مصنف تھا مس کڈ (MSD) بتایا جاتا ہے۔ ۱۵۸۹ء میں یہ ڈرامہ موجود تھا۔ اور ۱۵۹۰ء تک اسے سیٹج کیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں ٹیکسپیڈ کے مورخوں، نقادوں اور معتقدوں نے بہت تحقیق کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹیکسپیڈ کے ہیلٹ کا مانند بنیادی طور پر یہی ڈرامہ ur Hamlet kyd تھا جسے اس نے زمین سے اٹھایا اور آسمانی رفعتوں سے بکھار کر دیا۔ اور ٹیکسپیڈ نے اسے وہ کچھ بنا دیا کہ جس کے بارے میں بڑے وثوق سے بتایا جاسکتا ہے کہ قدیم یونانی المیہ نگاروں کے بعد ہیلٹ وہ المیہ ہے جو بہت دور ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد لکھا گیا اور اس کا موازنہ یونانی المیہ کے شاہکاروں سے کیا جاسکتا ہے۔

"ہیلٹ" ٹیکسپیڈ کا سب سے طویل کھیل ہے۔ اس کے دو مستند مسودے دستیاب ہو چکے ہیں۔ ان دونوں مسودوں میں بھی خاصا فرق ہے۔

ہیلٹ کے بلے میں نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ایک بالکل فانی کھیل ہے ایسا

المیر جے ٹیکسپیئر نے دراصل اپنی خوشنودی کے لیے تحریر کیا۔ دنیائے ادب میں ایسی کتنی ہی لازوال تخلیقات موجود ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہیں ان کے خالق نے صرف اپنی ذات کی خوشنودی اور مسرت کے لیے قلم بند کیا۔ ڈی۔ ایس ایلیٹ نے تو یہاں تک حکم لگا دیا ہے کہ اس میں ٹیکسپیئر نے اپنے لاشعور کو بیان کیا ہے۔ فرائنڈ نے اپنی جگہ سہیلٹ کو حراج تحسین پیش کیا اور اس کی نفسیاتی توجیہ کی ہے جو ایک فکر انگیز مطالعہ ہے۔

دنیا بھر کے لوگ جو ٹیکسپیئر کے صدیوں سے مداح چلے آ رہے ہیں وہ گنگ لیئر، اوتھیلو، برٹس، میبکٹھ اور فلاسٹا کو بھی اپنے ذہنوں پر انٹ نقوش کی حیثیت دے چکے ہیں لیکن یہ سہیلٹ ہی ہے جس کے حوالے سے وہ صدیوں سے اپنی شناخت کرتے چلے آ رہے ہیں۔

سہیلٹ جدید انسان ہے اور اس میں جدید انسان کی تمام صفات طئی ہیں، متشکک، پھیچہ الجھا ہوا، دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں غیر یقینی، فیصلہ کرنے کی قوت کے توازن سے محروم فرزانگی اور دیوانگی کا مجموعہ۔

سہیلٹ، ٹیکسپیئر کے فن کا سب سے عظیم شاہکار ہے۔ اس کی اپنی روایت میں ہونے کے باوجود۔ یہ اس کے سب ڈراموں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔

پرنس سہیلٹ، ٹیکسپیئر کے ڈراموں کا واحد مرکزی کردار ہے جو غیر شادی شدہ ہے جو جسم سے آشنا نہیں۔ محمد حسن عسکری نے سہیلٹ کے حوالے سے بتایا ہے کہ سہیلٹ ایک ایسا المیر ہے جس میں جنس کا ذکر تک نہیں مگر سارا المیر جنس کے گرد گھومتا ہے۔

پرنس سہیلٹ سادہ، خوب صورت، نیک خو، لوجوان ہے وہ تعلیم یافتہ ہے۔ فن ڈرامہ سے اسے نا صاف متعفن ہے۔ یہ المیر اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب قلعے کے کچھ محافظ سپاہی

ایک بھوت (GHOST) کو دیکھتے ہیں۔ سہیلٹ تک اس کی خبر پہنچتی ہے سہیلٹ پہلے ہی رنجور اور دل گرفتہ ہے۔ کیونکہ اس کا باپ شاہ سہیلٹ سانپ کے ڈسے جانے سے مر گیا ہے اور اس کی ماں نے اپنے دلور اور سہیلٹ کے چچا کلا ڈیس سے شادی کر لی ہے۔ کلا ڈیس کے بادشاہ بننے سے سہیلٹ کا حق مارا گیا ہے لیکن سہیلٹ کو اس کا رنج نہیں۔ اپنے باپ سے اسے جو محبت بھنی اور ماں کے لیے اس کے دل میں جو تقدس بھرا پیار متبادہ شدت سے جردوج ہوا ہے۔ ماں کی دوسری شادی اور

مچھ کلا ڈیس جیسے بد وضع اور بد جو کو اپنا شوہر بنا لینے سے ہیلٹ کو بہت زیادہ رنج سہا ہے۔ اس کے دل میں بہت سے شہوات ہیں، ماں کے طرز عمل کو وہ بالکل نہیں سمجھ سکا۔ اس کا دوست ہو لیٹو لے سمجھاتا ہے لیکن وہ بھوت سے جو اس کے باپ کا ہے، ملنے کے لیے بضد ہے۔ رات کو وہ اس سے ملتا ہے باپ لے بتاتا ہے کہ اسے ایک خاص زہر دے کر قتل کیا گیا ہے۔ سازش میں اس کی بیوی بھی شریک ہے اور وہ ہیلٹ سے کہتا ہے کہ وہ اس قتل کا انتقام لے۔ اپنی ماں کا معاملہ خدا پر مھوڑ دے لیکن چچا سے ضرور بدلہ چکائے۔

ہیلٹ کو سکو اور تشکیک کا شکار ہے۔ کیا وہ بھوت بد روح تو نہیں۔ کیا واقعی اس کی ماں اتنے گھناؤنے گناہ میں شریک ہوئی؟ ہیلٹ او فیلیا سے محبت کرتا ہے جو دربار شاہ کے سب سے بااثر شخص پولو ہنس کی بیٹی ہے۔ وہ سوگ کا لباس نہیں اتارتا۔ وہ ایسی حرکات کرتا ہے جو بادشاہ اور ملکہ کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہیلٹ ایسی کیفیت میں ہے جو دیوانگی اور فرزانگی کا عجیب سا امتزاج ہے۔ بعد میں اس کی حالت کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس حد تک دیوانہ ہے اور کس حد تک فرزانہ۔ وہ اگرچہ قدیم کردار ہے لیکن ایسا کردار جو شیکسپیر کے ہاتھوں میں آکر ایک ایسا نفسیاتی کردار بن جاتا ہے جو انسانی ذہن، تقدیر، اعمال کی پراسراریت کی نمائندگی کرتے ہوئے عمد جدید کے ان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے وہ دربار میں ایک ڈرامے کا اہتمام کرتا ہے۔ ڈراما ایسا ہوتا ہے جو اس کے والد کی موت اور سازش کے قصے سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ اس کا جواثر ملکہ اور بادشاہ پر ہوتا ہے اس سے ہیلٹ جان لیتا ہے کہ وہ بد روح نہ بنتی بلکہ اس کے باپ کی بے چین روح بنتی۔ ہیلٹ سے پولو ہنس اپنی مجبور کے باپ کا قتل ہو جاتا ہے۔ او فیلیا کی موت کا بھی ایک طرح سے وہی ذمہ دار ہے۔ وہ ڈوب کر مر گئی ہے۔ اس کا غلط چچا لے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔ ایک نئی سازش جزم لیتی ہے۔ انتقام میں چچا کلا ڈیس اور ماں کے ساتھ پرنس ہیلٹ بھی لہاک ہو جاتا ہے کہ یہی اس کا مقصد ہے۔ یہ اس عظیم المیے کا ایک بہت ہی سرسری سا خاکہ ہے جس سے کسی طور پر بھی اس المیے کی حقیقی عظمتوں اور ضمنیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس ڈرامے کے ہر کردار کا ایک اپنا مزاج ہے۔ او فیلیا۔ ہیلٹ کی مجبور۔ اس کے ڈراموں کی تمام ہیروئنوں سے مختلف ہے۔ خود ہیلٹ لیتا ہے۔

اس کا کوئی مشیل نہ ٹھیکسپیر کے ہاں ملتا ہے نہ کسی دوسرے ڈرامے میں۔

اس ڈرامے میں ہیٹل کے جنون اور دیوانگی کا مسئلہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ پاگل پن اور بہرپ کے سرے ایک دوسرے سے اس طرح سے گھٹ گئے ہیں کہ یہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں ہیٹل سچ دیا ہے اور کہاں وہ اس کا صرت بہرپ بھر رہا ہے۔

ادنیلیا کا کردار بے حد نازک ہے۔ وہ مطلق دو تیز ہے۔ اس کا باپ اسے اپنے انداز میں استعمال کرتا ہے اور ہیٹل اسے کبھی محبت کا لائق نہ دلاتا ہے کبھی بے اعتنائی کا۔ وہ جس انداز سے برتا ہے۔ وہ خود کشی ہے۔ ایک مختصر سے عرصے کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہیٹل کو ادنیلیا کی موت کا شدید صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اسے بالکل سہول جاتا ہے۔ اصل میں اپنی ماں کے طرز عمل نے ہیٹل کو عورت ذات سے بد لگان کر دیا ہے۔ وہ عورت اور کمزوری کو ایک ہی چیز سمجھنے لگا ہے۔ مگر آئروڈ کی بے وفائی کا عذاب۔ ادنیلیا کو برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہیٹل کی فکر میں جو تہیلبلی آئی۔ اس کی تمام تر ذمے داری اس کی ماں آئروڈ پر عائد ہوتی ہے۔

اس ڈرامے کا ہر کردار انسان ہے۔ حتیٰ اگر سازشی، ظالم اور اپنے بھائی کے قاتل ہیٹل کا چچا بادشاہ۔ کلاڈیس بھی، وہ بھی تنہائی میں اپنے گناہ پر پچھتا رہا ہے۔

نقادوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے کہ سیمی تعلیمات میں ذاتی انتقام کی یہ حیثیت ہے اور ہیٹل کا انتقام کی معنی رکھتا ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بڑی اہم ہے لیکن جب ٹھیکسپیر نے ہیٹل کو تخلیق کیا تو وہ یقینی طور پر اس کے خالص سیمی پہلو کو ذہن میں نہ رکھتا تھا۔ نہ ہی اسے اس کی ضرورت تھی۔ وہ تو ایک ایسا انسان ایک ایسا کردار تخلیق کر رہا تھا جو اس سے پہلے موجود تھا لیکن وہ اسے نہی اور ابدی زندگی دے کر ایک ایسا انسان بنا رہا تھا جو ہر دور کے انسان کے باطن کی پراسراریت کی نمائندگی کر سکے اور پھر ایسا انسان جو بڑا فطری ہے۔ جو تشکیک کا شکار ہے۔ جو اپنی شناخت کے کرب سے بھی دوچار ہے۔ وہ انتقام لینے میں عجلت نہیں برتا۔ بلکہ اپنے آپ کو مسلسل اذیت دیتا رہتا ہے۔ وہ بہت کچھ سمجھنا چاہتا ہے اور جو کچھ سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ بہت مشکل بہت گہرا اور بہت پیچیدہ ہے اور انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ جس ذہنی عذاب غمگشاہ، پاگل پن اور فرزانگی سے ہیٹل دوچار ہوتا ہے۔ اس کی مثال نہ عصری ڈراموں میں ملتی ہے نہ بعد کے ڈراموں میں اس کردار ہیٹل کو انسانی

ذات کی پراسراریت کا استعارہ بنا دیا ہے۔ انتقام کی آگ میں جلتا پھکتا ہسپلٹ اپنی ذات کی شناخت کی
تفتیش کے عمل سے گزرتا ہے اور انسان کا اس معاشرے میں کیا مقام ہے۔ ایسے بنیادی سوال سے
دوچار ہوتا ہے۔

ہسپلٹ بے مثل کردار ہے۔ لاثانی۔ یکتا۔

وہ ایسے ایسے سوال اٹھاتا ہے جو اس سے پہلے سٹیج پر کسی نے نہ کیے تھے۔ وہ گورکن سے

پوچھتا ہے۔

ایک آدمی کب تک زمین کے نیچے برقرار رہتا ہے اور پھر سرٹونے لگتا ہے (آئیٹھ - سین ۱۹۱)
وہ شخص جس کا دماغ گداگر کا ہودہ کتنا عرصہ بادشاہت کر سکتا ہے؟ (چوٹھا آئیٹھ - تیسرا سین)
ہسپلٹ ایسا شاہکار ہے جس کی کتنی ہی لائیں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

All the lives must die, passing through nature to eternity.
How weary stale, flat and unprofitable.

Seemed to me all the uses of this world.

Frally thy name is Woman.

Give everyman the ear, but few thy voice.

Take each man's censure, but reserve thy judgement.

More greif to hide than hate to utter love.

Bervity is the soul of wit.

For there is nothing either good or bad but thinking made it so.

Whata piece of work is man, how noble in reason how infinite in
ulties. in form and moving how express and admirable. in action
w like an angel in apprehension, how like a God, the beauty of the

world, the paragon of animals and yet to me what is this quintessence
of dust. To be or not to be that is the question.

Give me that man, that is not passions slave.

ہیلٹ دنیائے ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے اسکے بارے میں صدیوں سے لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا
رہا ہے۔ یہ انسانی ذات کو سمجھنے کی ایک ایسی تخلیقی کاوش ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

فاؤسٹ

گلشن دہلی میں ابدی نیند سونے والا۔ گوٹے عالمی ادبی تاریخ کا وہ عظیم معمار اور نام ہے کہ جس کی تخلیقات نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ انگریز جوشیکسپیر کی محبت میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے وہ بھی اس کی عظمت کے معترف ہوئے۔ سی ڈبلیو فیلڈ نے گوٹے پر اپنی کتاب میں لکھا تھا:

وہ کسی طرح شیکسپیر سے کم نہ تھا جو شیکسپیر جانتا تھا وہ گوٹے بھی جانتا تھا۔ اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات سے سیکھا اور یہ وہ بات ہے جو شیکسپیر کے سوانح نگار اس کی زندگی میں تلاش نہیں کر سکے۔

جرمان دولت کا تہنگ فان گوٹے۔ صرف جرمنی ادب کا ہی عظیم نام نہیں ہے۔ بلکہ آج وہ ساری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں اس کی تخلیقات کا ترجمہ نہیں ہوا۔ اس کے عظیم المیے "فاؤسٹ" کو جو عالمی شہرت حاصل ہے وہ دنیا کے بہت کم فن پاروں کے نصیب میں آسکی۔

گوٹے ڈ فرینکفرٹ اورن دی مین میں ۱۴ اگست ۱۷۷۹ء کو پیدا ہوا۔ گوٹے اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ اس کا والد شاہی دربار سے تعلق رکھنے والا خوش حال لیکن سخت گیر انسان تھا۔ لیکن گوٹے کی ماں ایک نرم خور موسیقی اور فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھنے والی خاتون تھی۔ جس سے گوٹے نے بہت فیض اٹھایا اور اس کے کردار کی تشکیل میں سب سے نمایاں حصہ اس کی مہربان ماں کا تھا۔ گوٹے نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی کہتے ہیں کہ

کہ وہ سولہ برس کا ہونے سے پہلے چھ زبانوں پر خاصا عبور حاصل کر چکا تھا۔

گوئے سولہ برس کی عمر میں لائپزگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس کا ازادہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ لیکن اس کا دل تو فنون لطیفہ اور شاعری میں اٹکا ہوا تھا۔ گوئے کی زندگی کا یہ دور بہت ہیجان انگیز اور طوفان بدوش تھا۔ جوانی کے اس خاص عرصے میں اس نے دل کے ارمان لگانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شراب اور خوبان شہر سے ابستگی جسم و جان کے کتنے ہی تذکرے اس دور میں اس کے نام سے منسوب ہوئے۔ اس بے اعتدالی نے اسے بیمار کر دیا۔ ۲۱ برس کا تھا کہ جب اس کی زندگی کا رُخ بدلا۔ اب وہ بے اعتدالیوں چھوڑ کر سنجیدگی سے علم و فن اور دیگر معاملات کی طرف راغب ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب اس نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے سنجیدگی اختیار کی۔ اس کی بعض نظمیں اور کچھ غنائی ڈرامے مشہور ہو چکے تھے۔ وہ اپنی شکل و صورت اور دانش کی وجہ سے اعلیٰ حلقوں میں بے حد مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔

۲۱۔ برس کی عمر میں وہ سٹرازبرگ پہنچا تاکہ قانون کی تعلیم مکمل کر سکے۔ لیکن قانون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ کیمسٹری، علم طب، فن تعمیر اور کلاسیک ادب کے مطالعے میں بھی گہری دل چسپی لیتا رہا۔ اس زمانے میں اس نے پھر ایک زوردار عشق کیا، لیکن اس میں کامرانی نہ ہوئی۔

۲۲۔ برس کی عمر میں اس نے قانون کی ڈگری حاصل کر لی لیکن قانون کے شعبے میں اس کی دلچسپی برائے نام تھی۔ ۱۷۷۴ء میں اس کا شاہکار ناولٹ "در تعتر کی داستان الم" - *SOR - RONS OF WERTHER* - شائع ہوا۔ اس ناول کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ در تعتر کے نام سے یورپ اور جرمنی میں کئی کلبیں قائم ہوئیں۔ نوجوان اس المناک رومانی ناول سے اتنے متاثر ہوئے کہ خود کشی کرنے لگے۔ اس ناول نے پورے یورپ کو ہلکا کر رکھ دیا۔ ۱۷۷۵ء میں اس کا دوسرا عظیم تخلیقی کارنامہ *GÖTL VON BERLICHINGEN* شائع ہوا ہے۔ اس کے اس شہکار کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انگریزی میں اس کا ترجمہ *والٹر سکاٹ* نے کیا۔

یہی وہ دور ہے جب اس نے اپنا عظیم ترین تخلیقی شہکار فاؤسٹ، لکھنا شروع کیا جو مختلف وقتوں میں لکھا اور کئی برسوں کے بعد مکمل ہوا۔

۱۷۷۵ء میں وہ اپنے مرلی گریڈ ڈویک آف سیکس ویمر کی دعوت پر ویر میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک دانشور اور سیاسی مشیر کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ اور وزیر کا عمدہ بھی پایا۔ اس کی تخلیقی اور علمی سرگرمیاں جاری رہی۔ اس دور میں گوٹے علم و شعر کی تعلیم کے بے تاج حکمران کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اس کے دور کے لکھنے والے اسے حراج تحسین پیش کرنے آتے ہیں۔ سارمی دنیا میں اس کی شہرت پھیل رہی ہے۔ اس کی زندگی میں کئی جذباتی طوفان آئے وہ ۱۸۱۵ء میں وزیر بنا۔ جب جرمن اور فرانس کی لڑائی ہوئی تو وہ اس سے پہلے یورپ کے کئی ممالک کا دورہ کر چکا تھا۔ اس جنگ کو اس نے اپنی یادداشتوں میں قلم بند کیا ہے۔

۱۸۲۸ء میں گوٹے نے اپنے آپ کو ویگز مصروفیات سے آزاد کر لیا۔ اب وہ اپنے آپ کو علم و شعر کے لیے وقف کر چکا تھا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۳۲ء کو چوراسی برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا اور وہ ویر میں دفن کیا گیا۔

جب وہ مر رہا تھا تو اس نے جو آخری الفاظ کہے وہ یہ تھے۔۔۔ روشنی... روشنی....

وہ دلچسپ اور مزے دار آدمی تھا۔ جب اس نے بے اعتمادی کی زندگی ترک کی تو اس نے اس زمانے کے رواج کے مطابق دگ پہننا چھوڑ دیا۔ اس طرح اس نے کافی پینے کی عادت بھی ترک کر دی اور چہرہ ساری عمر کافی کو منہ سے نہ لگایا۔ اس کی محبتوں کے قصے بھی عجیب تھے۔ ایک دور الیسا تھا کہ وہ بیک وقت دو عورتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک ایسی جو کھاتی پیتی عورت ہوتی اور دوسری بالکل نا تجربہ کار اسے نچلے طبقے کی عورتوں سے بھی خاص دلچسپی تھی۔

۱۷۸۶ء میں اس کی ملاقات کرٹسٹین سے ہوئی جو پھول بنانے والی ایک فیکٹری میں ملازم تھی۔ یہ عورت تھدیٹر، شراب اور گوٹے کی ریا تھی وہ گوٹے کے ساتھ مرتے دم تک

رہی گوٹے اسے اپنی زندگی کی توانائی کہا کرتا تھا۔ پندرہ لکھو برس تک وہ اس کے ساتھ شادی کیے بغیر رہی ۱۸۰۶ء میں انہوں نے شادی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کرٹین تھی جس نے فرانسیسی یلغار کے زمانے میں گوٹے کی جان دو فرانسیسی سپاہیوں سے بچائی تھی جو اسے گولی کا نشانہ بنانے والے تھے۔ وہ ۱۸۶۵ء میں انتقال کر گئی اس کی موت کا صدر گوٹے کے لیے بے حد شدید تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ۷۷ برس کی عمر میں گوٹے نے پھر ایک عشق کیا اور اس میں ناکام رہا۔

گوٹے کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی اس کے کسی شاہکار مستقل ہو چکے ہیں۔ ہادی حسین کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دور تھر کی داستان الم اور فاؤسٹ کے اردو میں کسی تراجم ہوئے جن میں فضل حمید کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔

گوٹے بہت بڑے ذہن کا مالک تھا۔ ایک عظیم معجزی مختلف علوم سے اسے گہرا شغف تھا۔ مذہب اور فلسفے سے بھی اسے خاص تعلق رہا۔ وہ حافظ سے بے حد متاثر تھا اور اس کا مداح بھی تھا۔ اپنے دیوان میں اس نے حافظ کی مدح کی ہے اور عقیدت کا بھرپور اظہار گوٹے کو تصوف اور علم باطن سے بھی دل چسپی رہی جس کی جھلکیاں اس کے کلام میں ملتی ہیں ایسا ہلکا سا رنگ فاؤسٹ میں بھی موجود ہے۔

علامہ اقبال گوٹے کے عظیم مداح تھے۔ انہوں نے پیام مشرق، جمعی تصنیف گوٹے سے بے حد متاثر تھے۔ جس کا ثبوت کلام اقبال سے ملتا ہے۔ جس سے تاثر ہو کر اسکے جواب میں کتاب لکھی۔ گوٹے کا عظیم ترین شاہکار فاؤسٹ کا پہلا حصہ ہے۔ فاؤسٹ نے اسے لافانی بنا دیا یہ اس کا ایک عظیم فن پارہ ہے۔

فاؤسٹ

کوئی چیز ہے جو فاؤسٹ میں نہیں ملتی عظیم شعری تجربہ انسانی دانش اور شعریات کا عظیم ترین امتزاج حقیقت شناسی، طنز، تشبیہ و تمثیل، استعارہ و کنایہ، سبج، رنچ، والہ صحت و ریاض

منقبت و کرم سفاکی اور رقت اور پھر گوٹے کا خاص اسلوب۔
انسانی لغزشوں اور خطاؤں کی ایسی تعبیر و تفسیر شاید ہی کسی تخلیقی فن پارے میں اس انداز میں ملتی ہو۔ گوٹے انسانی خطاؤں اور لغزشوں کے حوالے سے انسانی فطرت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ ہمدردی اور خیراندیشی کو سامنے رکھتا ہے۔ ان محرکات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے جن کی بدولت انسان لغزش کھاتا اور خطا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

میفسٹوفلس۔ جرمن دیومالا کا ابلیس ہے۔ گوٹے نے فاؤسٹ میں ارادی طور پر شیطان یا ابلیس کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ وہ اپنے شیطان میفسٹوفلس کو انجیل کے شیطان سے وابستہ تصورات سے آزاد رکھتے ہوئے ہمہ گیر معنویت کا حامل بنانا چاہتا تھا۔ میفسٹوفلس ایک ایسا کردار ہے جو شیطان یا شیطانی فطرت کی علامت بنتا ہے۔

گوٹے کے فنی نظریات بھی بے حد نکرا ٹیکز ہیں وہ فن کی کسوٹی معواض اور باذوق لوگوں کے حسن قبول کو قرار دیتا ہے۔ عام لوگ کسی فن پارے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ ان کی لے کچھ پرواہ نہیں گوٹے کا عقیدہ تھا کہ لکھنے والے کو نفع و نقصان اور واہبیدا سے بے نیاز ہو کر فن کی بے لوث خدمت کرنی چاہیے۔

شاعری کے بارے میں گوٹے کا نظریہ یہ ہے کہ شاعری کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے اور اس کے افراد کی زندگی میں ہم آہنگی اور سازگاری کا وسیلہ بنے۔

میفسٹوفلس۔ شیطان کا تصور

گوٹے، فاؤسٹ کے حوالے سے شیطان کی ذات سے بحث نہیں کرتا۔ نہ ہی الہیات یا بالبعدا الطبیعیات کے حوالے سے شیطان کی کوئی توجیہ یا تفسیر پیش کرتا ہے۔ اسے شیطان کی فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں سے زیادہ دل چسپی ہے۔

گوٹے کا شیطان نارمی ہونے کے باوجود ٹھٹھے ہوئے جذبات کا مالک ہے۔ یہ شیطان خود کسی طرح کی برائی یا جنسی معصیت کی استعداد سے محروم ہے۔ جتنی خواہشات اس میں سر سے سے موجود نہیں۔ یہ شیطان ان کی انار (EGO) کو بھرا کاتا ہے اور اس وسیلے سے اپنا کام لگاتا۔

ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان الجھنوں میں گھرارہے۔ اس میں وہ مسرت محسوس کرتا ہے۔ انسان کی سر بلندی اسے منظور نہیں۔ وہ انسان کا سب سے بڑا حریف ہے۔ وہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسروں کی جھلانی اور جذبات کو نظر انداز کر کے خود لذت دنیاوی میں مصروف رہے۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل میں کسی اخلاقی قدر کو رکاوٹ نہ بننے دے۔

”فادُرسٹ“ میں شیطان جب فادُرسٹ سے معاہدہ کرتا ہے تو اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے لیے دنیا کی ہر چیز فراہم کرے گا۔ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ اس کے بدلے میں وہ فادُرسٹ سے نصیبِ آخرت طلب کرتا ہے

شیطان دردمندی اور لطیف جذبات سے عاری ہے۔ انسانوں کے مصائب و آلام کا اس پر کچھ ردِ عمل نہیں ہوتا۔ اس کی سرشت میں حیرت اور استعجاب کا عنصر بھی غائب ہے۔ شیخی، بے ریا عمل سے اسے کوئی علاقہ نہیں جہاں لوگ انس و محبت اور یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ شیطان وہاں رخنہ انداز ہی کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خیر کے جذبات اور احساسات سے محروم ہو جائے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ انسانی ترقی کے امکانات کی سحر یک بھی یہی شیطان دیتا ہے۔ جب فادُرسٹ ایک جگہ میفسٹو فلس کو لعنت ملامت کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے:

”اے زمین کے لاپچار اور بے بس بیٹے ذرا سوچ تو میرے بغیر تو زندگی کے دن کس طرح گزارتا۔ زندگی کے سوز و ساز اور ذوق و شوق کا سامان کہاں سے لاتا۔ یاد رکھ اگر میں نہ ہوتا تو اس کرۂ ارض پر تیرا وجود نہ ہوتا۔ تو اسے چھوڑ کر مہاگ چکا ہوتا۔“

علامہ اقبال بھی اس تصور کو پیش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

مزے اندر جس لئے کور ذوق

کہ یزداں ، دارو و شیطان ندارد

نہ دیدہ درد زنداں یوسف او

ز سنجائش دلِ نالوں ندارد

کجا آں لذت عقل غلط کار

اگر منزل رہ چھپاں مدارد

گوٹے فاؤسٹ اور مذہب اور خدا

گوٹے مذہب کے بارے میں منفرد خیالات رکھتا ہے۔ وہ مذہب کا مفکر بھی نہیں لیکن کسی ایک مذہب کو حق و صداقت کا واحد اجارہ دار بھی نہیں سمجھتا۔ گوٹے کے نزدیک مذہب وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان خدا تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ انسانی علم اتنا مکمل اور جاندار نہیں کہ وہ کسی دوسرے مذہب کی صداقت کی قطعی نفی کر سکے۔

فاؤسٹ میں مذہب اور خدا کے بارے میں مکالمہ مارگریٹ اور فاؤسٹ کے درمیان ہوتا ہے وہ گوٹے کے عقیدے کی نشاندہی کرتا ہے۔

مارگریٹ مذہب کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟ میرے خیال میں آپ نیک

طینت اور رحمدل ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو عبادت سے کوئی دل چسپی نہیں۔

فاؤسٹ:- ان باتوں کو رہنے دو۔ میں جن سے محبت کرتا ہوں ان کے لیے بڑی سے

بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔

مارگریٹ:- لیکن کیا آپ مادہ مقدسہ کا احترام نہیں کرتے؟

فاؤسٹ:- احترام؟ ہاں کرتا ہوں۔

مارگریٹ:- لیکن آپ ایسا ایمان اور احتیاج کے تحت نہیں کرتے۔ آپ کلیسا کی دعائیں

شامل نہیں ہوتے۔ خدا سے غافل ہیں۔ اچھا کیا۔ آپ خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟

فاؤسٹ:- ڈارلنگ یہ کہنے کی بھلائی ہے کہ وہ یقین رکھتا ہے۔ کسی سے پوچھ

کر دیجئے۔ کیا کوئی صاحب معرفت دانا ہوا یا اللہ کا بھیجا ہوا بندہ۔ اس کے جواب میں تمہیں

ایک خاص انداز کا مضحکہ پن دکھائی دے گا۔

مارگریٹ:- تو آپ ایمان رکھتے ہیں؟

فاؤسٹ:- میری پیارمی اغلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایمان ایک

ایسا لفظ ہے جسے زبان پر لانا آسان نہیں۔ کون ہے جو یہ دعوے کر سکتا ہو کہ اس کا ایمان حق یقین

کی حد تک پہنچ گیا اور کون ہے جسے وحی والہام سے کچھ ہی وجدانی احساس ہوا اور وہ اسے ڈھونڈ کر اور فریب سے تعبیر کر سکے۔ وہ جس کی وجہ سے تمام موجودات قائم ہیں اور جو تمام کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کیا وہ مجھے اور تمہیں اپنے دامن میں لیے ہوئے نہیں؟ تم اسے جو نام چاہے دو۔ اسے نور کو، سرور کو، محبت کو، دل کو، اپنا خدا کو، میں تو اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ سب کچھ احساس ہے۔ ناموں کی حیثیت غل غبارے اور گردوغبار سے زیادہ نہیں۔ یہ نور عرش اور ہمارے درمیان حجاب بن جلتے ہیں۔

فاؤسٹ کا انتخاب

اپنے شہکار کا انتخاب گوٹے نے اپنے مرحوم دوستوں کے نام کیا ہے۔ وہ کتا ہے پیاری یاد اور محبوب سائیو۔ اٹھو کہ ایام خوش تہی میں آئینہ دار ہو۔ وہ ہجوم و مجمع فہ جو ش تمہیں آئینہ دار ہو۔ وہ ہجوم و مجمع جو جو ش محبت کی گرمی رکھتا تھا، بکھر اور شخصت ہوا اور ان کی تحسین قدر شناس ہی مرچکی ہے۔ میرے نئے کے الم انگیجہ موضوع کا یہ مقدمہ ہے کہ اسے اجنبی نہیں اور اس طرح کی تحسین ناشناس کریں جو مجھے نیم جان کر دیتی ہے۔ اس انتخاب میں گوٹے نے معنوی اور جسمانی قرب کا فرق بھی واضح کرتا ہے۔ وہ قرب معنوی کو جسمانی قرب سے زیادہ طاقتور اور موثر سمجھتا ہے۔

”میں آنسو بہاتا ہوں۔ میں لڑزہ برانداز ہوں۔ وہ سب جو میرے پاس ہے وہی مجھے دور ہے، وہ سب جو میں کھو چکا ہوں وہی میرے لیے صبر سے بڑی حقیقت ہے۔ وہی میرا رہنما ستارہ ہے۔“

عرش پر تمہیدی مکالمہ

آخر میں گوٹے کے عظیم شہ پارے فاؤسٹ کے ابتدائی حصے، عرش پر تمہیدی مکالمے کے کچھ ٹکڑے پیش ہیں۔ اس منظر میں خداوند قدسیاں عرش اور شیطان کے علاوہ اسرائیل، جبرائیل اور میکائیل کرداروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ شیطان (منصفوٹفس) کتا ہے۔

اس سے پہلے آپ کی منظرِ عیانت مجھ پر رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس کا روبرو
میں ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہو جاؤں۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اگر میری زبان متبذل
ہو۔ اصل میں یہاں میری وضاحت و ملائمت کا جوابِ حقارت سے دیا جائے گا۔ میرے
صوڑ گدماز پر قہقہے لگائے جائیں گے۔

آپ کے سورج اور آپ کے عالم میری نظر و ادراک سے ماورا ہیں۔ میں تو انسانوں
کی زبونی حالت کو کچھ شرم غور دیکھتا ہوں۔
زمین کا یہ ناقص دیوتا وہی خلیثِ روح والا ہے۔
جو روز ازل یا نور کی تجلیِ اول میں تھا۔

اس بے چارے کی زندگی آپ کے فیضِ سماوی کی ضدِ فکی کے بغیر کم دشوار ہو سکتی تھی۔
وہ اسے عقل کا نام دیتا ہے اور اس فکی روشنی کو صرف اس لیے استعمال کرتا ہے کہ ہمیت
میں بہانہ کو پس پشت ڈال دے۔

یہ مخلوق، یہ آدمی، مجھے ایسا لگتا ہے۔ میں حضورِ اقدس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے
عرض کرتا ہوں کہ یہ انسان جھینگہ کی طرح ہے۔ اپنی جگہ پر پھیلنا لگتا ہے اور اپنی لمبی ٹانگوں سے
پرداز کے لیے جبت لگتا ہے۔ اور پھر گھاس پر گر کر پرنے راگ الاپنے لگتا ہے۔
مگر یہ گھاس کے میدانوں پر آرام کرنے پر وہی قناعت نہیں کرتا، بلکہ گندگی کے ڈھیر
تلاش کرتا ہے تاکہ اس کے اندر اپنی ناک کھیسر سکے۔

خداوند! ... کیا روئے زمین پر تمہیں کوئی چیز پسندیدہ دکھائی نہیں دیتی ...
شیطان! ... خداوند! آدمی ... قباحتوں میں عرق ہو جاتے ہیں۔ یہ ناقص وجود ٹھے
تو اب انہیں ستا رہی بارِ خاطر اور عذابِ جان معلوم ہوتا ہے۔

خداوند! کیا تم فائرسٹ کو جانتے ہو۔

شیطان! وہ صاحبِ علم، وہ علامہ

خداوند! ہاں وہی پیرِ خدمت گار۔

شیطان! واقعی خداوند۔ وہ ایک عجیب گرم جوش تہمی دامن ہے۔ غرور و لوٹوش کے

کے ارضی سامان سے دست کش ہو گیا ہے جو بخار سے لاتی ہے وہ اسے کسی اونچی سطح پر لیے جا رہا ہے۔ وہ زمین سے مسرت و فن کی طلب کرتا ہے۔ دور و نزدیک جو بھی باعث جذب و انبساط ہے۔ اس کے دل کی بے چینی کے لیے ناکافی ہے۔

خداوند!۔ وہ میرا خدمت گزار، سرگراں و پریشان ہے۔ لیکن جلد ہی میرا نورا اس کی یاسیت کو ختم کر دے گا۔

شیطان!۔ کیا آپ شرط لگاتے ہیں کہ آپ اسے ضائع نہ ہونے دیں گے، اگر آپ مسترض نہ ہوں تو میں اسے اپنی پسندیدہ راہوں پر چلانے کی ہدایت کروں گا۔

خداوند!۔ تمہیں یہ اجازت دی جائے گی کہ اپنی من مانی کرتے رہو۔ اور جب ہم اس انسان زمین کا سکونتی رہے گا۔ انسان کے لیے سنی لازم ہے اور اس سنی میں خطا کا سزا ہو جانا ناگزیر ہے۔ تمہیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر ہو سکے تو اس کی روح کو بھلا پھسلا کر اس کے خالق حقیقی سے الگ کر دو۔

کسی ہلاکت آفریں لمحے میں اگر تم اسے حتمی طور پر اپنی قوت کا تابع بنا سکتے ہو تو اسے اپنے ساتھ پستیوں میں گھسیٹ کر لے جاؤ لیکن شرم و ندامت سے اس وقت کھڑے ہونا جب تمہیں اعتراف کے لیے بلایا جائے کہ ایک اچھا آدمی اپنے تیرہ سرگرداں سفر ہستی میں راست بازی اور نیک کرداروں کی راہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

شیطان

مجھے منظور ہے۔ میرا معاملہ تو بازی جیتنے والے گھوڑے کی طرح ہے۔ مجھے اپنی کامیابی پر کوئی شبہ نہیں پھر بھی میں جیت گیا تو میرے لیے زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا ہو گا۔ مناسب جشن فتح و کامرانی ورجون بگل جو بچ رہے ہوں۔

خداوند

نفی دانکار کی جگہ جلد توڑوں میں شیطان کا بار سب سے کم گراں ہے۔ آدمی کی سنی اس کے

کے مقام کی مناسب سطح سے کم تر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ غیر مشروط اور لامحدود راحت و عافیت کا طالب رہتا ہے۔

میں تجھ ایسی بدذات کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ تو آدمی کو ستائے اور اکسائے اور خدمت خلق کے لیے لعنت کرے۔ باوجودیکہ یہ شیطان ہے۔

لیکن تم عالم بالا کے فرزندانِ باوفا زندہ حسن کے نظارہ کی بھرپور دولت سے مسرور ہو جاؤ گے۔ تمہاری عقل مجروح کو عشق کی لافانی تہوں کے درمیان لپیٹ لیا جائے گا۔ اور ان تمام چیزوں کو جن کی بیتی ہوئی و تمثیلی مشابہت حیات کی آئینہ دار ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والے خیال میں جا بگفتا سے قائم و دائم رہے گی۔

عرشِ بند ہو جاتا ہے۔ ملائکہ مقررینِ رخصت ہوتے ہیں۔ شیطان (اپنے آپ سے مکلام ہے) میں چاہتا ہوں کہ حاکمِ اعلیٰ سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی رہے۔ یوں باہمی تعلقات شائستہ خوشگوار رہیں گے۔ یہ صد در اول کی مہربانی اور عنایت تھی کہ شیطان کے سامنے بھی اس نے مطلق سے گفتگو کی۔

اے ڈالز ہاؤس

۱۸۷۹ء میں پہلی بار ابسن کا کھیل "اے ڈالز ہاؤس" رگڑیا گھر، سٹیج کیا گیا۔ یوں تو ابسن کے قریباً سبھی کھیل بحث کا موضوع بنے اور وہ جدید ڈرامے کا وہ آدمی ہے جس کے ڈراموں پر شاید سب سے زیادہ لکھا گیا اور بحث ہوئی لیکن "اے ڈالز ہاؤس" پر جتنی بحث ہوئی اتنی شاید ابسن کے کسی دوسرے کھیل پر نہ ہوئی۔ ابسن کے مداحوں کی تعداد اس کے دور میں بھی بہت کثیر تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور فنی عظمت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ جارج برنارڈشا جو ٹیکسپیئر کا حریف سمجھا جاتا ہے اور خود شا کا بھی دعوے اٹھا کہ وہ ٹیکسپیئر سے بہتر ڈرامہ نگار ہے۔ وہی شا ابسن کا پُر جوش مداح تھا۔ اس نے ابسن کے ڈراموں پر ایک کتاب بھی لکھی۔ اور ابسن کے کھیل "اے ڈالز ہاؤس" کے بارے میں ایک جملہ ایسا کہا تھا جس کی بازگشت آج بھی سنانی دیتی ہے۔ کیونکہ اس جملے میں شانے جس رمزیہ اور فنکارانہ انداز میں ابسن لہذا اس کے کھیل "اے ڈالز ہاؤس" کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ابسن کے اس کھیل "اے ڈالز ہاؤس" کی میری دن کا نام نورا ہے۔ آخری سین کا اتمام کریں ہوتا ہے کہ لوزا دروازہ کھول کر اپنے شوہر کے گھر سے نکل جاتی ہے اور جاتے وقت کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پردہ گر جاتا ہے۔ شانے جو جملہ کہا تھا وہ اس پس منظر کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ شانے نے کہا تھا،

• فوراً جب اپنے دروازے کو بند کر کے نکلتی ہے، اس کے ساتھ ہی سٹیج کی دنیا میں کئی نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔“

ابسن نے ڈرامے کی دنیا میں کئی دروا کیے۔ ناروے کے اس ڈرامہ نگار کے ڈراموں نے ڈرامہ نگاری کی صنف کو عالمی سطح پر متاثر کیا اور ڈراموں میں ریٹیکلزم - REA LISM - کا ایک خاص عنصر ابسن کے فن کے حوالے سے عالمی ڈرامے میں نمایاں ہونا نظر آتا ہے۔

ابسن ۲۰ مارچ ۱۸۷۸ء کو ناروے کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد بارسوخ اور کھانا پینا آدمی تھا۔ لیکن ابسن ابھی لڑکپن میں ہی تھا کہ اس کے والد کے حالات خراب ہو گئے۔ پورے گھنے کو قصبہ میں چھوڑ کر ایک گاؤں میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔ تاکہ نامساعد حالات میں زندہ رہا جاسکے۔ چند برسوں کے بعد یہ گھنہ واپس اپنے آبائی قصبے (SKJEN) آ گیا۔

ابسن کی زندگی پرالم و مایوسی کے سائے بہت گہرے تھے۔ وہ افسر وہ دل نوجوان تھا جو زپانی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس زمانے میں اس نے مصوری کا شغل بھی اپنایا۔ وہ حالات کے ہاتھوں سکول میں بھی پوری تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ اسی زمانے میں اس نے شعر کہنے شروع کیے۔ اور اپنا ادبی مقام بنانے کے لیے طویل جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۲۲ برس کی عمر میں وہ اپنا گھر چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لیے کرشیا نیا چلا آیا اور پھر ۱۸۵۰ء میں اس نے ایک المیہ کھیل - کیٹیلینا - شائع کرایا۔ جسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ پانچ برس تک ایک تھیٹر میں ادبی مشیر کی حیثیت سے ملازم رہا۔ اس زمانے میں اس نے کئی ڈرامے بھی پروڈیوس کیے۔ بعد میں وہ ایک نئے تھیٹر میں ہدایت کار بن گیا۔ لیکن یہ تھیٹر بونہ چل سکا۔ لہذا وہ ایک دوسرے حریف تھیٹر میں ملازم ہو گیا۔ یہ زمانہ ابسن کی زندگی کا تاریک دور تھا۔ وہ اپنے لیے جو تخلیقی اور ادبی منصوبے بندی کرتا تھا۔ اس میں اسے ناکامی ہو جاتی۔ وہ سرکاری مدد اور ملازمت کا خواہاں تھا۔ لیکن سرکاری مشینری اور اس کے نظام پر طنز یہ کھیل۔ اس کی راہ میں رکاوٹ

بن جاتے حکومت اس سے خوش نہ تھی اسکے موضوعات سے کسی طرح کی مفاہمت نہ کرتے تھے۔ اس کے بیشتر کھیلوں کا موضوع سماجی مسائل ہیں۔ ان سماجی مسائل کو کرداروں اور ڈرامائی رکش کمش اور تدبیر کاری کے حوالے سے البسن جس انداز سے پیش کرتا تھا۔ اس پر ہی لوگ سٹپٹا اٹھتے تھے۔ کیونکہ انہیں ان میں اپنا عکس دکھائی دیتا تھا۔

البسن کے ڈرامے اس دور کے سطحی ڈراموں کے خلاف ایک احتجاج بھی تھے۔ وہ بہت بڑا فنکار تھا۔ اپنے ڈراموں میں وہ جو کردار اور ڈرامائی واقعات پیش کرتا۔ وہ بحث کا گرما گرم اور نزاعی موضوع بن جاتے تھے۔ سماجی مسائل کو ایسے منفرد اور حقیقی انداز میں پیش کرتے ہوئے البسن فن کی تمام نزاکتوں اور قدروں کا پورا خیال رکھتا تھا وہ ان ڈراموں کو اصلاحی "کھیل نہیں بنے دیتا تھا۔ وہ مصلح نہیں۔ ایک سچا اور عظیم فنکار تھا وہ بہت حد تک قنوطی بھی تھا۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کے ڈراموں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ اس کے ہاں مایوسی اور قنوطیت کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ اس کی وجہ یقیناً اس کی اپنی زندگی کی ناکامیاں اور محرومیاں تھیں۔ تاہم وہ اپنے عہد کی سوسائٹی کے بارے میں شک میں مبتلا تھا۔ وہ اس نظام کو ناپسند کرتا تھا۔ اسکے ہاں سوسائٹی کی جو تصویر بنتی ہے وہ قنوطیت اور مایوسی کا تاثر مرتب کرتی ہے۔ اس کے کھیلوں میں مزاج نہیں ملتا۔ لیکن طنز اتنی کاٹ دار اور گہر ہے کہ جو انسان کے اندر تک کو کاٹ دیتی ہے۔ وہ اپنے ہر کھیل میں "حقیقت" کا پورا خیال رکھتا ہے۔ وہ سچائی اور حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کے بعض کھیل اپنے موضوعات کی وجہ سے اسی عہد میں مقید دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن البسن کے بیشتر کھیل آفاقی موضوعات پر مبنی ہیں۔

البسن کو ایک خاص انفرادیت حاصل ہے۔ البسن سے پہلے اور البسن کے بعد شاید ہی ڈرامہ کی دنیا میں کوئی ایسا ڈرامہ نگار گزرا ہوگا جو خالص انفرادیت، تخلیقی صلاحیت اور ہنرمندی کا مالک ہو۔ اس نے سماجی مسائل، برائیوں اور سیاسی مکر لہجہ کے موضوعات کو ایسی ہنرمندی اور صلاحیت سے برتا ہے کہ نہ اسے "اصلاح" کے قریب آنے دیا۔ نہ

پروپیگنڈے کے۔ ان سیاسی اور سماجی برائیوں اور کرکٹن کو وہ تشعلیقی انداز میں پیش کرتے
اگر مگر طرہ جیسے عظیم ڈرامہ نگار نے اسے اس حوالے سے زبردست حراج تحسین پیش کرتے
ہوئے منفرد و یکتا ڈرامہ نگار کہا ہے۔

”اے ڈالز ہاؤس“ البسن کا سب سے اہم مقبول اور نزاعی کھیل سمجھا گیا ہے اس
کھیل کی ہیروئن لوزاشا دی شدہ ہے۔ وہ اپنے خاوند کے لیے ایثار کرتی ہے جو ایک
جرم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ قرصن رقم لیتی ہے وہ اپنے شوہر سے اس بات کو چھپاتی ہے۔
اور اس کا شوہر اس کے ایثار کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

البسن کو جو حاملی ملا وہ ناخوشگوار اور ناسازگار تھا۔ اسے تبدیل کرنے کے لیے
اس نے بہت جتن کیے لیکن جب کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس نے ۳۸ برس کی عمر
میں اپنا وطن چھوڑ کر رضا کارانہ جلا وطنی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ۲۵ برس تک
اپنی مرضی سے جلا وطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ اس کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کو جرمنی
اور اٹلی میں چھپنے چھولنے کا موقع ملا۔

نورا۔ کے اندر ایک ایسی انقلابی باعنی تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو کسی ہیروئن کے
ہاں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ گھر بار اور شوہر کو چھوڑ کر اپنی انفرادیت اپنی آزادی اور اپنی
ثقافت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔

جب یہ کھیل میٹج ہونے والا تھا تو اس وقت بھی اس پر بہت لے دے ہوئی
اور بعد میں بھی اس پر بہت بحث ہوئی۔ کیونکہ یورپی معاشرہ عورت کو آزادی دینے
کے حق میں نہ تھا۔ وہ عورت کو مخصوص حدود میں پابند دیکھنا چاہتا ہے خاندانی نظام کا
تقدس برقرار تھا۔ نورا اسے توڑتی ہے۔ وہ مرد کی برتری کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ نئے عہد
کی آزاد اور طاقتور عورت بن کر نمایاں ہوتی ہے۔

نورا۔ عالمی فداے کا منفرد اور یکتا کردار ہے
”اے ڈالز ہاؤس“ کی عظمت اور معنویت کا موقع ملا۔ وطن سے باہر جا کر اس کا ستارہ
چمکا۔ اٹلی میں اس نے ”پیر جنت“ اور ”براند“ جیسے کھیل لکھے۔ جنہوں نے اسے شہرت

سے ہٹا کر دیا۔ ان کھیلوں کی شہرت اس کے ملک پہنچی اور اس کی قدر بھی ہوئی۔ اس کے لیے پیش بھی حکومت کی طرف سے جاری کر دی۔ یوں مدتوں کے زخم مندمل ہو گئے۔

ا۔ بسن ۲۹ برس کا تھا۔ جب اس کا عظیم طرز یہ شاہکار "دی لیک آف یوحنا" منظر عام پر آیا۔ ۱۸۷۷ء میں اس کا ایک اور شاہکار "پلرڈ آف سوسائٹی" شائع ہوا اور کوپن ہیگن میں کھیلا گیا۔ اس کھیل کو ایسی بے مثال کامیابی حاصل ہوئی کہ ایک ماہ کے اندر اندر یہ کھیل یورپ کے کسی ملکوں کی سٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔

اور پھر ۱۸۷۹ء میں "لے ڈان ہاؤس" سامنے آیا۔ جس نے ایک ہنگامہ اور عرفان بپا کر دیا۔ مصہوت (GHOST) ۱۸۸۱ء میں کھیلا گیا۔ اس کے بعد ا۔ بسن نے جو ڈرامے لکھے ان میں "عوام کا ایک دشمن" AN ENEMY OF THE PEOPLE اور ایڈیٹور، مہمراز عظیم THE MASTER BUILDER وغیرہ شامل ہیں۔

۱۸۹۱ء میں ا۔ بسن وطن واپس آیا اور کرسٹینیا میں رہائش پذیر ہوا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور اسے خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اب ہم ا۔ بسن کو عالمی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ملکوں ملکوں اس کے کھیل سٹیج ہو چکے تھے اور کسی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتے تھے۔

ا۔ بسن کی سترویں سالگرہ ایک تہوار کی طرح منائی گئی۔ اب واقعی ا۔ بسن کے دل سے اپنے ہم وطنوں کی بے اعتنائی اور ناقدر شناسی کا داغ مٹ چکا تھا۔ وہی تھیٹر جس میں ملازمت کرتے وہ مایوسی کا سامنا کرتا تھا اور اپنا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ کرسٹینیا کے اسی تھیٹر کے سامنے اس کی زندگی میں اس کا مجسمہ نصب کیا گیا۔

۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو ا۔ بسن کا انتقال ہوا، تو پورے ملک میں اس کی موت کا سوگ منایا گیا اور پوری دنیا نے رنج اور غم کا اظہار کیا۔

ا۔ بسن کا فن اور "اے ڈان ہاؤس"

ا۔ بسن کا سارا کام انگریزی اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے اردو میں

اس کے کھیل ترجمہ ہوئے ہیں۔ وہ میری یادداشت کے مطابق مندرجہ ذیل ہیں۔ اے ڈالز ہاؤس "کا ترجمہ قدسیہ زیدی کر چکی ہیں اور برصغیر پاک و ہند میں پکھیل سیلج بھی ہوا ہے۔ کناڈا اور تامل زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں۔ اور اس کو کھیلا بھی گیا ہے۔ وائیلڈ ڈک کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ "ادب لطیف" میں شائع ہوا تھا۔ اغلباً کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ اہلسن کے اہم ترین کھیلوں میں سے ایک کھیل "وسی ماسٹر بلڈر" ہے۔ یہ اہلسن کی زندگی کے آخری دور کا کھیل ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی ذہنی اور تخلیقی کشمکش کا بھی مظہر ہے۔ اردو میں اس کھیل کا ترجمہ ایک مبسوط دیباچے کے ساتھ مرحوم عزیز احمد نے کیا تھا جو شائع ہوا اور ان دنوں نایاب ہے۔

ہمارے عہد میں تو اہلسن کے کھیل کو سمجھنا اور قبول کرنا کوئی رسمہ نہیں رہا۔ لیکن اہلسن کے دور میں اس کے ہر کھیل پر اختلاف رائے کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ اس کا ہر کھیل لوگوں کو جھنجھوڑتا تھا۔ اس کے کھیل لوگوں میں اشتعال پیدا کرتے تھے۔ کیونکہ اہلسن کا کھیل۔ جدید ہوتا تھا۔ وہ حقیقت پسندی کا مظہر ہوتا۔ اس میں ایسی بے باکی اور طنز ہوتی تھی کہ جو اپنے ہدف کو تھملا نے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے کھیل کی موضوعات کا صحیح اڈاک تو کھیل پر لٹھ کرنا دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے لیکن اس کھیل کے حوالے سے پکھیا ہٹیں کرنے سے پہلے میں اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے عہد میں یہ کھیل۔ ایک برہمی فلم کی صورت میں پیش ہو چکا ہے، اس فلم میں نوراکا کردار، ہمارے عہد کی انتہائی ذہین اور عورتوں کی آزادی کی علمبردار اداکارہ جین فونڈا نے ادا کیا تھا۔ میری طرح جن لوگوں نے اس فلم کو دیکھا ہو گا وہ یقیناً اہلسن کے عظیم کھیل کی معنویت اور جین فونڈا کی پرتاک سے بے حد متاثر ہوئے ہوں گے۔

اے ڈالز ہاؤس "کا موضوع اپنے عہد کے اور سماج کے تقاضوں اور پابندیوں کے بالکل برعکس اور متضاد تھا۔ بلکہ یہ اس دور کی سماجی احمالیات اور رشتوں کو لٹکا رہا ہے۔ اس کھیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کھیل مجید عظیم ہے۔ لیکن اس کا موضوع اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اے ڈالز ہاؤس "ساری

دینا کی پس ماندہ اور کچلی ہوئی عورتوں کے اندر کی نرمانی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی کھیل کا مجموعہ اور اس میں جو مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ کھیل سے عظیم تر ہے۔
”اے ڈالز ہاؤس“ دینا کے تمثیل کا بے شکل شاہکار ہے۔ افسانہ کا فن پارہ۔
عالمی ادب کا ناقابل فراموش اور لازوال شاہکار ہے۔

ڈیکرون

دنیا کے کسی ملک کی ادبیات کا جائزہ لے کر دیکھیں۔ وہاں ہمیں حکایتوں اور داستانوں کی فراوانی ملے گی۔ ان حکایتوں اور داستانوں کی کئی صورتیں ہیں۔ اساطیری، تاریخی، دیومالائی اور پھر لوک داستانیں۔ ان میں بعض ایسی لوک داستانیں بھی ملتی ہیں۔ جن کا مطالعہ بے حد دلچسپی اور تعجب کا باعث بنتا ہے کہ ایسی بیشتر کہانیاں اور لوک داستانیں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں جو بہت سے ملکوں میں تقریباً ایک ہی طرح سے معمولی ترمیم و اضافے کے ساتھ صدیوں سے سنانی جا رہی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ بنتا ہے کہ ایک ہی لوک کہانی، جو ایک خاص خطے اور تہذیب کا نمونہ ہونے کے ساتھ اس خطے کے لوگوں اور تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسے دوسری آنجان زبان اور دور دراز کے ملک تک کس طرح رسائی حاصل ہو گئی۔

تاریخی، دیومالائی، لوک اور اساطیری داستانوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ملکوں اور زبانوں میں ہمیں داستانی ادب بھی ملتا ہے۔ جو کہیں تو لوک یا تاریخی کہانیوں سے اخذ اور استفادہ کر کے لکھا گیا ہے یا پھر خود طبع آزمائی کی گئی ہے۔

ایسی ہی داستانوں میں اٹلی کے مصنف گیودانی بوکیچو کی کتاب ”ڈیکرون“ ہے جو داستانوں کا مجموعہ ہے اور اس مجموعے کی کہانیوں کو پوری دنیا میں شہرت حاصل ہے اور تقریباً ہر ایسی زبان میں ان کا ترجمہ ہوا ہے۔ اور ان کہانیوں سے ان گنت مصنفوں نے فیض اٹھایا ہے۔ گیودانی بوکیچو کی ”ڈیکرون“ کے عالمی ادب پر اثرات بے حد گہرے ہیں۔ چارلس کیکنز بریٹینز ”ہویا ٹیکسپیڈر کے ڈرامے۔ سب ڈیکرون“ سے واضح طور پر متاثر اور فیض یاب ملے ہیں۔

اٹلی اور اطالوی زبان کا یہ عظیم مصنف گیووانی بوکیچیو ۱۲۱۳ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ گیووانی بوکیچیو (GIVONNI BOCCACCIO) کا والد فلورنس کا ایک خوشحال اور دولت مند تاجر تھا۔ اس کی والدہ کا تعلق فرانس کی اشرافیہ سے تھا۔

دنیا کے بیشتر خلاق اور طباع لوگوں کی طرح بوکیچیو بھی ابتدائی عمر میں ہی شاعری اور ادب میں دل چسپی کا اظہار کرنے لگا تھا۔ اس کا یہ شوق اس کے والد کو مطلقاً پسند نہ تھا۔ اور وہ اکثر اس کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ والد کی خواہش یہ تھی کہ وہ تاجر بنے۔ اس لیے ابھی بوکیچیو کی عمر دس برس تھی کہ اس کے والد نے اسے اکاڈمی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیپلز بھیج دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بیٹے کو حساب کتاب اور ہندسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو اس نے اسے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لے دیا۔ بوکیچیو کا جی اس میں بھی نہ لگا۔ وہ تو ادب و شعر پر جان چھڑکتا تھا۔ جب وہ ذرا بڑھی عمر کا ہوا تو اس نے والد کی ناراضگی کی پروا نہ کیے بغیر شعر لکھنے شروع کر دیے۔ لیکن اس کی کسی جانب سے حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ اس نے اطالوی اور لاطینی زبان میں شعر لکھنے کا آغاز کیا تھا۔

اس زمانے میں نیپلز کے بادشاہ ابرٹ کا دربار علم و فنون کا مرکز بن چکا تھا۔ بوکیچیو نے اس دور کے بڑے لکھنے والوں، دانشوروں سے اپنے تعلقات استوار کر لیے اور انہی لکھنے والوں اور دانشوروں میں سے کسی نے بوکیچیو کی نثر کی بڑی تعریف کی۔ اور اسے مشورہ دیا کہ وہ نثر لکھا کرے۔

اسی زمانے میں بوکیچیو نے دانٹے کو پڑھا اور پھر وہ ساری عروائے کا پر خلوص اور پرجوش قاری رہا۔

بوکیچیو کو ایک اور شوق بھی بھی تھا۔ نادر اور گھایسی کتابوں کے مسودے جمع کرنے کا۔ کہنا جاتا ہے کہ اس نے بھاری قیمت پر "ایلیڈ" اور "اولیسی" کے اولین نسخوں کو خرید لیا تھا۔ یونان کے ساتھ اسے خصوصی دل چسپی پیدا ہوئی۔ تو اس نے دیوتاؤں کا شجرہ نسب لکھنا شروع کیا جو پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اس کام کے بارے میں بعض محققوں اور نقادوں کا کہنا ہے کہ اب تک کسی نے دیو مالا پرانا ضخیم اور تفصیلی کام نہیں کیا ہے۔

بوکیچو بڑی تخلیقی صفات کا مالک، بڑا فاضل عالم اور آزاد خیال مفکر تھا۔ دنیا میں اس کی داستانوں کے مجرمے "ڈیکرون" کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کے دوسرے بڑے کام اور خوبیاں اس شہرت کے سائے میں دھندلا کر رہ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ جن دنوں وہ نیپلز میں تھا۔ اس کو ایک ایسی خاتون سے عشق ہو گیا جس کے بارے میں یہ افواہ یقین کی حدوں تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ خاتون نیپلز کے بادشاہ رابرٹ کی ناجائز بیٹی ہے۔ اس خاتون کے عشق میں بوکیچو نے ایک رومان نثر میں لکھا اور پھر ایک رزمیہ نظم۔

۱۳۴۲ء میں بوکیچو فلورنس چلا آیا۔ مگر وہاں اس کا جی نہ لگا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر نیپلز واپس آ گیا جہاں اس نے بعض اور کتابیں اور طویل نظمیں لکھیں۔ اور پھر اسی دور میں اس نے "ڈیکرون" کو لکھنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے اسے عالمگیر اور ابدی شہرت حاصل ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بوکیچو نے "ڈیکرون" کی داستانیں بادشاہ رابرٹ کی بیٹی اور راپٹ جو آنا کی خوشنودی طبع کے لیے تحریر کی تھیں۔

"ڈیکرون" میں جو داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے لیے بھی بوکیچو نے ایک پس منظر تخلیق کیا ہے۔ یہ پس منظر یہ ہے کہ فلورنس میں طاعون پھیل جاتا ہے۔ سات خواتین اور تین مرد بھاگ کر ایک دیہاتی مکان میں جمع ہوتے ہیں اور وہاں وقت کٹی کے لیے وہ ایک دوسرے کو ہر روز ایک نئی کہانی سناتے ہیں۔

۱۳۵۰ء کے لگ بھگ بوکیچو دوبارہ فلورنس واپس آیا۔ جہاں اس کو کسی سفارتی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ اس کا شمار صحراؤں میں جو تین شہریوں میں ہونے لگا۔ نیپلز سے واپس آ کر اعلیٰ سفارتی عہدوں پر فائز ہونے والا بوکیچو ایک عرصے تک ذہنی بحران کا شکار رہا۔ نیپلز میں اس نے جو زندگی گزار رہی تھی۔ اس پر وہ شدید مذمت کا اظہار کرتا تھا۔ نیپلز میں بے اعتدالی اور عیش و عشرت میں گزرنے والے دنوں کی تلافی کر کے اپنے ذہنی بحران کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب ضمیر انسان تھا۔

۱۳۵۳ء میں اسے ایک اور اعزاز سے نوازا گیا اور اسے فلورنس میں دانٹے پر سند سمجھتے

ہوئے دانتے۔ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ یہ منصب اس کو بہت عزیز تھا۔ وہ دانتے کو پڑھانے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ دانتے کے شارح کی حیثیت سے اسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بیماری کے باعث اس نے ایک گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔ اور یہیں ۱۶ دسمبر ۱۳۷۵ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

ڈیکرون ایک بڑا تخلیقی کارنامہ ہے۔ صدیوں سے پڑھنے والے اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اور بلاشبہ صدیوں سے دنیا کے بعض بڑے لکھنے والوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جس کے حوالے سے شیکسپیر اور چامر کا ذکر آچکا ہے۔ نثر نگاروں، کہانی نویسوں اور ڈراما نگاروں نے ڈیکرون سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

۱۳۴۸ء سے ۱۳۵۳ء تک مکمل ہونے والی ڈیکرون کی تاشیر اور ادبیت کا اصل راز یہ ہے کہ یہ کتاب دراصل عوام کی کتاب ہے۔ خواص نے تو اس سے جو استفادہ کیا۔ وہ اپنی جگہ، لیکن ان داستانوں میں ایک ایسی اپیل ہے کہ اسے دنیا بھر کے عوام نے سراہا اور پسند کیا۔ اس کتاب کی داستانوں نے اٹلی سے سفر کیا اور ساری دنیا کے لوگوں اور ملکوں میں پھیل گئیں۔

ڈیکرون کی دلچسپی کا ایک بڑا باعث یہ بھی ہے کہ ان داستانوں کا موضوع عورت اور مرد کے تعلقات ہیں۔ اس کی بعض کہانیوں کا لہجہ اور تاثر قدرے درشت بھی بنتا ہے۔ ایک زمانے میں بعض قدامت پسند تنگ نظر نقادوں نے ان پر فحاشی کا الزام بھی لگایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع کے حوالے سے یہ بنی نوع انسان کی داستانیں بنتی ہیں اور ان میں بہت نرمی اور گھلاوٹ ہے۔

مثلاً ڈیکرون میں بیان کی جانے والی دسویں دن کی کہانی جو فلوسسٹر لوگی کہانی ہے بے عرضی اور ایثار کی ایک بے مثل داستان ہے۔ جسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پہلے دن بیان کی جانے والی فیو مینا کی داستان۔ ایک دلچسپ اور ذکاوت سے پڑھی کہانی ہے۔ اس میں کچھ ٹنک نہیں کہ یہ کہانی جدید کہانی قرار دی جاسکتی ہے۔ مذہبی بردباری اور تحمل کو جس تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ اس کہانی کی خاص قوت ہے۔

ڈیکورن کی بیشتر داستانوں میں عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے بیان کے ساتھ ساتھ جو خوش ذوقی، بہجت اور مزاج پیدا ہوتا ہے۔ اس نے ان داستانوں کو خاص معنویت، تاثیر اور چمک دمک عطا کی ہے۔ کتاب کا مجموعی تاثر پرمزاج اور شگفتہ ہے۔ اس سلسلے میں چھٹے روز بیان کی جانے والی نینحائل کی کہانی کو خاص طور پر بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ نقادوں نے خاص طور پر ڈیکورن کی نشر کی تعریف کی ہے۔ ڈیکورن کے تراجم دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں اس کا متعدد بار ترجمہ اور انتخاب شائع ہوا ہے ہیرٹ الیکسٹر کا ترجمہ اور انتخاب خاص طور پر مشہور ہے۔

اردو زبان میں اگرچہ ڈیکورن کی داستانیں کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکیں۔ تاہم بعض داستانوں کا ترجمہ ہوا ہے اور وہ بعض رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ ایک کہانی کی تلخیص پیش ہے۔

دسواں دن - فلورسٹرٹو کی کہانی

فلورسٹرٹو کی کہانی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ کہانی ہے جو دسویں دن فلورسٹرٹو نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو سنا لی۔

ملک ختا میں ایک معزز خاندان اور حسب نسب کا معزز انسان رہتا تھا۔ وہ اتنا دولت مند تھا کہ کسی کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا نام ناہتن تھا۔ وہ سخی اور فیاض تھا۔ انسانوں کے کام آتا تھا۔ ناہتن نے شاہراہ عظیم پر جہاں سے لوگ مشرق سے معزب اور معزب سے مشرق جانے کے لیے گزرتے تھے۔ ماہر کار بیگروں اور معماروں کی کثیر تعداد کی خدمات حاصل کر کے عالیشان محلات تعمیر کرائے۔ ان محلات کی تعمیر کے بعد ان کو سبایا اور سوزا را گیا۔ ان محلات میں دنیا بھر کی چیزیں یکجا کر دی گئیں۔ اور ہر چیز جسکی انسان کو کسی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی وہاں فراوان مقدار اور تعداد میں موجود تھی۔ دن رات وہاں مسافروں، ضرورت مندوں اور ممالوں کا تانتا بندھا رہتا، ناہتن کے دروانے سے کبھی کوئی شخص مایوس نہ لوٹا تھا جو جس نے مانگا اس نے اسے دے دیا۔ جس نے جتنے دن

وہاں رہنا چاہا اسے وہاں قیام و طعام اور کام کی سہولتیں فراہم کر دی گئیں۔ نامتھن کی شہرت پورے ملک اور ملک سے باہر بھی پھیل گئی۔ اس کی فیاضی اور سخاوت کی داستانیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔

نامتھن کے محلات اور مہمان خانوں سے بہت دور ایک معزز خاندان کا ایک نوجوان رہتا تھا۔ جس کا نام میٹھر ڈینز تھا۔ جب اس کے کالوں تک نامتھن کی شہرت پہنچی تو وہ اس شہرت سے حسد کرنے لگا۔ میٹھر ڈینز بھی اپنے آپ کو نامتھن جتنا دولت مند سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب میں بھی اتنا دولت مند ہوں تو پھر یہ شہرت جو نامتھن کو حاصل ہے مجھے ملنی چاہیے۔ اس نے دولت کو پانی کی طرح بہانا شروع کیا۔ اس نے بھی نامتھن کی طرح محلات اور مہمان خانے تعمیر کرا دیے۔ وہ بھی لوگوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنے لگا۔ بلاشبہ کچھ عرصے کے بعد اسے بھی غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی۔

کرناڈا کا ایسا ہوا کہ ایک دن ایک گداگر عورت اس کے پاس آئی۔ اس نے اسے خیرات دی۔ وہ پھر دوبارہ آئی۔ میٹھر ڈینز نے اسے دوبارہ خیرات دی وہ پھر آئی۔ بار بار آئی رحتی کہ جب وہ تیرہویں دفعہ پھر واپس آئی تو مجھ سے بھیک مانگنے ایک ہی دن میں اس کے سامنے آئی۔ تو میٹھر ڈینز نے اس سے کہا۔ "اے بوڑھی عورت تو تو میرے لیے دوسری گئی ہے گداگر عورت رُک گئی۔ اور بولی۔ فیاضی اور سخاوت تو بس نامتھن پر ختم ہے۔ دنیا میں کوئی نامتھن کا مثیل نہیں ہو سکتا۔ میں نے ایک دن میں تیس بار اس سے خیرات حاصل کی اور اس کے ماتھے پر بل نہ آیا بلکہ ہر بار اس نے مجھے پہلے سے بڑھ کر خیرات دی ہر بار وہ پہلے سے زیادہ خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے پیش آیا اور تمہارے پاس میں ابھی صرف تیرہویں بار آئی ہوں اور تمہارا جی مجھ سے اکتا گیا ہے۔ تمہاری فیاضی اور سخاوت تھک گئی ہے... بس فیاضی میں تو نامتھن ہی بے مثل ہے۔"

میٹھر ڈینز جواب تک یہ سمجھتا تھا کہ شہرت اور فیاضی میں وہ نامتھن سے آگے بڑھ چکا ہے اس بوڑھی گداگر عورت کی گفتگو سن کر جل جہنم گیا۔ اس نے اپنے دل میں حسد کے شعلے کو بجھوڑتے ہوئے محسوس کیا اور اس کی آنچ کو پوری شدت سے محسوس کر کے اپنے آپ سے

کہا۔ یہ نامتھن میری شہرت کے راستے میں دیوار بن گیا ہے۔ وہ وقت کب آئے گا جب میرا مقابلہ نامتھن سے نہ کیا جائے گا بلکہ میں اپنی مثال خود ہی قرار پاؤں گا۔ یہ تو ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے میں نامتھن کا نام و نشان ہی مٹا دوں گا۔

میٹھن ڈینز جو ان عقائد و جملہ بازوہ سچ سچ نامتھن کو اپنی راہ کا پتھر سمجھنے لگا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ نامتھن کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دے گا۔ اور اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں بھی تاخیر نہ کرے گا۔

اس نے اپنے اس منصوبے کا کسی سے ذکر نہ کیا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا چند خادم اپنے ساتھ لیے اور نامتھن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے سفر پر روانہ ہوا۔ تیسرے دن نامتھن کے علاقے میں جا نکلا۔ نامتھن کے تعمیر کردہ محلات کو دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا کیونکہ اس کے بنائے ہوئے محلات کے مقابلے میں بہت خوب صورت اور پرکشش تھے۔ اس بات نے بھی اس کے ارادے کو پختہ کر دیا کہ وہ نامتھن کو ختم کر کے ہی دم لے گا۔

جب وہ محلات کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ وہ جدا جدا ہو کر وہاں محض رہائیں اور کسی کو علم نہ ہونے دیں کہ وہ میرے ساتھی ہیں۔ شام کا وقت تھا جب وہ نامتھن کے ایک محل کے قریب پہنچا اتفاق سے اس وقت بوڑھا نامتھن چھڑی کا سہارا لیے سیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ میٹھن ڈینز نے کبھی نامتھن کو دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے وہ پہچان نہ سکا اس نے اس بوڑھے سے کہا۔

”مجھے نامتھن کے محل پہنچا دو۔“

بوڑھا جو خود نامتھن تھا اس نے میٹھن ڈینز کو خوش آمدید کہا اور بولا۔

”حضرت شریف لائیں۔ مجھے اپنا خادم سمجھیے۔ میں آپ کو نامتھن کے محل تک پہنچا دوں گا۔“

نامتھن نے کہا۔

”بڑے میاں اگر تم مجھے نامتھن کے محل میں اس طرح سے لے چلو کہ نامتھن مجھے دیکھ نہ

سکے اور نہ ہی میری آمد کا سے پتہ چلے تو میں تمہارا بہت احسان مند ہوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے بات بنانے کے لیے کہا۔

”میں اس کی شہرت سن کر آیا ہوں اور اس کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔“
 ناتھن نے میسٹر ڈینز سے کہا۔

”حضور جو حکم دیں گے میں وہ بجالاؤں گا۔ ناتھن کو آپ کی آمد کا بالکل علم نہ ہوگا۔“
 میسٹر ڈینز بہت مسرور ہوا کہ اس کی قسمت بہت اچھی ہے۔ یہاں پہنچنے ہی اسے اپنے
 ڈھب کا ایک آدمی مل گیا ہے۔ وہ ناتھن کے ساتھ چل دیا جو بڑے ادب اور احترام سے
 اپنے مہمان کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔ جب ناتھن کا محل سامنے آیا تو وہ چند قدم آگے بڑھا۔
 اس نے میسٹر ڈینز کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اپنے ایک ملازم کو تھماتے ہوئے کہا۔
 ”جلدی سے محل میں جا کر سب کو مطلع کر دو کہ اس نوجوان مہمان کے سامنے کوئی یہ
 ظاہر نہ ہونے دے کہ میں نامتقن ہوں بلکہ اگر میرے بارے میں یہ نوجوان اور معزز مہمان سوال
 کرے تو اسے یہی جواب دیا جائے کہ میں یہاں کا ایک خدمت گزار ہوں۔“

ناتھن کے ملازم نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔
 ناتھن اپنے دلچسپ مہمان میسٹر ڈینز کو بے کرمحل کے اندر پہنچا۔ اس کو ایک شاندار اور
 خوبصورت کمرے میں ٹھہرایا۔ پھر اس کی خاطر مدارت اور ادب و بھگت میں دل و جان سے
 مصروف ہو گیا۔ اس نے نوجوان میسٹر ڈینز کے ہر حکم کی تعمیل خود کی۔ اس کی ضرورت کی ہر
 چیز خود اس کے سامنے پیش کی۔ خود اس کے لیے کھانا لایا۔ میسٹر ڈینز اس کے اخلاق اور
 خدمت سے بہت متاثر ہوا اور اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

ناتھن نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

”میں پسپے آقا ناتھن کا ایک ادنیٰ خدمت گزار ہوں۔ اس کی خدمت کرتے ہوئے
 بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے مالک نے مجھے پوری آزادی دے رکھی ہے۔ دوسرے ملازم بھی
 اس بڑھاپے کی وجہ سے میری عزت کرتے ہیں اور میں جو چاہے کروں۔ اس میں کوئی مداخلت
 نہیں کرتا۔“ پھر وہ توقف کر کے بولا۔

”مگر میں حضور کا بھی خادم ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے بلاخوف و خطر بجالاؤں گا۔
 اس کے بعد ناتھن نے نوجوان میسٹر ڈینز سے اس کے بارے میں غیر محسوس انداز میں

گنگو شروع کر دی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں میٹر ڈیڑھ منزلیہ محسوس کرنے لگا کہ بڑھا اس کا راز دار بن سکتا ہے۔ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس نے بڑھے کو قسم دی کہ وہ راز کی بات کبھی افشا نہ کرے گا۔ پھر جھپکتے ہوئے، ہچکچاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس نے نامتھن ہی کو بتا دیا کہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور کیا لینے آیا ہے۔ نامتھن کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ فوجوان اسی کو قتل کرنے آیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے ردِ عمل چہرے پر کسی تاثر اور کسی حرکت سے یہ ثابت نہ ہونے دیا کہ وہ یہ منصوبہ سن کر بددل ہوا ہے یا اسے اس سے کوئی تکلیف پہنچی ہے۔ اس نے اسی مودب لہجے میں کہا۔

”میرے محترم فوجوان۔ آپ بہت معزز انسان ہیں۔ آپ نے بھی فیاضی کا راستہ چنا ہے۔ اور پھر اس عمر میں۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ آپ کی شہرت کی راہ میں نامتھن کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ فوجوان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کہ وہ فیاضی اور نیکی کی راہ میں آزادی سے بلارکاوٹ چل سکیں۔ میں اس بات کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کر لوں گا اگر آپ کی خواہش ہے تو مجھے حکم دیں تو میں آپ کی مدد کے لیے بھی تیار ہوں۔“

میٹر ڈیڑھ منزلیہ کا دل باغ باغ ہو گیا جیسی تو وہ چاہتا تھا۔ بڑھے کی شکل اتنی معصوم اس کا اخلاق اس کے اطوار اتنے شائستہ تھے کہ وہ اس پر اعتماد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”محترم بزرگ! مجھے اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لیے بلاشبہ آپ کی اعانت کی ضرورت ہے۔“

نامتھن نے جواب دیا۔

”مشرق کی طرف یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ ہے جہاں نامتھن ہر روز صبح میرے لیے جاتا ہے اس وقت وہاں وہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔ آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے والا موجود نہ ہوگا۔ آپ صبح وہاں پہنچ جائیں اور اپنے اسادے پر عمل کر کے نامتھن کو ہلاک کر دیں۔ آپ وہیں سے سیدھے اپنے گھر کی راہ لیں۔ اس جھنڈ کے داہنے ہاتھ سے ایک راستہ نکلتا ہے وہ آپ کو کسی کی نگاہوں میں لائے بغیر سیدھا آپ کی منزل تک پہنچا دے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی کہ نامتھن کی موت کا

ذمہ دار کون ہے ؟

نامتھن کے اس مشورے کو میٹھر ڈینز نے مان لیا۔ اس کے بعد نامتھن دیر تک اپنے لڑ جوان مہمان کی خاطر مدارت اور خدمت میں لگا رہا۔ اور پھر اس کی اجازت سے شہب بیچر کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے دن صبح صبح میٹھر ڈینز نے اٹھ کر اپنے خادموں کو ہدایت کی کہ وہ نکلان راستے پر جا کر رُک کر اس کا انتظار کریں۔ اس کے بعد وہ نامتھن کو ختم کرنے کی تیاری کر کے کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔

نامتھن صبح کا ذب کے وقت ہی اٹھ کر درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔۔۔ جہاں کا پتہ اس نے خود میٹھر ڈینز کو دیا تھا۔ اس کے ارادے یا فیصلے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہ اپنے معزز اور جوان مہمان کے ہاتھوں ہلاک ہونے کے لیے بجزوشی تیار ہو چکا تھا۔

میٹھر ڈینز مقررہ مقام سے کچھ دور تھا کہ اس نے وہاں کسی کو موجود پایا۔ وہ سمجھ گیا کہ بڑھنے اسے صبح اطلاع دی تھی۔ یہ شخص نامتھن ہے۔ نامتھن نے اس وقت سر پر گڑھی باندھ رکھی تھی۔ اور اس کے پلو سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ حسد کی آگ میں جلنے والے میٹھر ڈینز نے کہا۔۔۔ میں اسے قتل کرنے سے پہلے اس کی صورت دیکھوں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ میں اسے کیوں قتل کر رہا ہوں۔ نامتھن کے پاس پہنچ کر اس نے تلوار نیام سے نکالی اور چیخ کر بولا۔۔۔

۔۔۔ نامتھن چند منٹوں کے بعد تم ایک لاش ہو گے۔ اور یہ کہہ کر اس نے تلوار کی نوک سے اس کی گڑھی زمین پر اچھال دی۔

اس کے سامنے وہی بڑھا کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا:

۔۔۔ میرے معزز مہمان اگر تم میری موت سے خوش ہو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔

۔۔۔ میٹھر ڈینز شہد را در ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔

تجربہ حسد چھیننا شروع ہو گیا۔ نامتھن کی بے مثل عنفیت اس پر عیاں ہونے لگی تو وہ ندامت کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں اور وہ نامتھن کے قدموں میں جھک کر کہنے لگا:

میرے معزز اور مقدس بزرگ! میں تیری عنفیتوں کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ تیرے

سامنے کھینچ اور حقیر ہوں۔ تم بے مثل ہو۔ میں تم سے تمہاری جان لینے کے منصوبے پر باتیں کرتا رہا اور تم بچے دل سے میری خدمت کرتے رہے۔ تم نے مجھے مشورہ دیا اور پھر میرے ہاتھوں ہلاک ہونے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ حسد نے میرے باطن کی جن آنکھوں کو بند کر دیا تھا۔ تم نے ان کو اپنی عظمتوں سے کھول دیا۔ مجھ سے انتقام لو۔ میری روح کو شامتی دے دو۔ یہ تلوار اٹھا کر مجھ جیسے بیچ اور کینے کا سر کاٹ دو۔

ناتھن نے اسے اپنے قدموں سے اٹھایا۔ اسے شفقت سے سینے سے لگا کر کہا۔ میرے عزیز، میرے فرزند! تمہارے منصوبے کو نہ میں بُرا کہوں گا، نہ تم سے انتقام لوں گا۔ یقیناً تم مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ مسکریوں؟ اس لیے کہ تم نے بھی نیکی، فیاضی اور سخاوت کا راستہ اپنایا ہے اور تم چاہتے تھے کہ تمہیں ایسی شہرت اور نیک نامی ملے جو مجھ سے برتر اور بڑھ کر ہو۔ تمہارا بنیادی جذبہ قابل ستائش ہے۔ میرے عزیز اس عمر میں تم نے فیاضی کی راہ اپنائی۔ میرے دل میں تمہارے لیے تکریم اور تحسین ہے۔ نفرت نہیں۔ دولت کو عزیزوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے کا حوصلہ کتنے لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرے عزیز، میرے فرزند! تم بہت عظیم ہو۔ اس دنیا میں لوگ دوسروں کے حقوق سب کرتے ہیں۔ جنگ کرتے ہیں۔ دوسرے ملکوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ ان کی ہوس زر کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ اس دنیا میں اس زمانے میں اگر کوئی اپنی دولت نیکی اور سخاوت کے کاموں میں لگا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی شہرت اور نیک نامی سب سے بڑھ جائے تو میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔

اس نے میٹھنڈینز کو دلاسا دیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ میٹھنڈینز نے پوچھا؛
میرے محترم اور مقدس بزرگ! جان بہت قیمتی ہوتی ہے پھر تم اتنی جلدی اپنی زندگی کو میرے ہاتھوں ختم کرانے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔

ناتھن نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا اور بولا؛
میرے محلات سے آج تک کوئی مایوس نہیں ہوا۔ جس نے جو مانگا اسے دے دیا گیا۔ اگر تم سے پہلے کوئی میری جان مانگتا تو میں اسے دے چکا ہوتا۔ میرے فرزند! تم نے مجھ سے میری زندگی میری جان مانگی تھی۔ بھلا میں اپنی روایت سے کس طرح انحراف کر سکتا تھا۔

میں تمہیں کیسے خالی ہاتھ لوٹاتا؟ اس لیے میں نے اپنی جان دیئے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ میں تمہیں کیسے ناخوش کر سکتا تھا۔؟ پھر ذرا سوچو تو میں اتنی برس کا ہو چکا ہوں اس عمر میں موت بہت قریب ہوتی ہے۔ اتنا کتنا جی سکتا ہے؟ یہی ناکہ زیادہ سے زیادہ سو برس۔ اتنی برس کا میں ہو چکا اور پانچ چھ برس میری عمر ہوگی۔ اس عمر کی بھلا کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ میں تو دل ہی دل میں تمہارا احسان مان رہا تھا کہ تم نے اس بوڑھی اور بے وقعت جان کو طلب کر کے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا تھا۔

”میٹھر ڈینز پھر رونے لگا۔“ کتنا عظیم تھا یہ شخص وہ بولا۔

”آپ کی زندگی کتنی عزیز ہے؟ یہ نہیں جانتا ہوں۔ کاش میرے بس میں ہو تو میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ آپ کی عمر میں اضافے کے لیے دے دوں۔“
ناحق شہقت سے مسکرایا اور بولا۔

”میرے فرزندو! ایسا ہو سکتا ہے۔ تم یہاں رہو میری جگہ ناحق بن کر۔ میں تمہاری جگہ چلا جاتا ہوں۔ تم اس طرح ناحق بن جاؤ گے، اور ساری شہرتیں تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گی۔ میں تمہاری جگہ جا کر اپنی عمر کے آخری برس کم شہرت میں بسر کر لوں گا۔“
میٹھر ڈینز کا قلب تبدیل ہو چکا تھا۔ حمد کا اثر دہا ناحق کی عظمت نے قتل کر دیا تھا۔
اس نے کہا:

”نہیں میرے بزرگ! تم جیسا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں تم جیسا بننے کی کوشش کروں گا۔“
ناحق نے اسے دعا دی اور میٹھر ڈینز کو بڑے احترام سے رخصت کیا۔

ڈیوائن کامیڈی

دانتے کی شہرہ آفاق، بے مثل تصنیف ”ڈیوائن کامیڈی“، دنیا کی ان کتابوں میں سے ایک ہے۔ جو بڑی شاعری کا عظیم تخلیقی اور شعری کارنامہ بھی ہیں اور فلسفہ حیات بھی اپنے منفرد انداز میں پیش کرتی ہیں بلاشبہ شعریت کی عظیم خوبیوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ”ڈیوائن کامیڈی“ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے پڑھنے والوں سے خاصا ذوق، علم، پس منظر اور تاریخ و دینیات کے بارے میں بھی بہت کچھ جاننے کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب تک پڑھنے والا بہت سی معلومات کا مالک نہ ہو اور بہت اچھا شعری ذوق نہ رکھتا ہو۔ وہ اس عظیم فن پارے سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا بڑی شاعری کے مطالبے بھی یقیناً بڑے ہوتے ہیں۔

۱۶۶۴ء میں جب والٹیر کی کتاب ”فلوسیفکی ڈکشنری“ شائع ہوئی تو اس میں والٹیر نے دانتے کی ”ڈیوائن کامیڈی“ کے حوالے سے اپنے مخصوص انداز میں جو رائے دی تھی وہ قابل ذکر ہے۔

”اطالوی اسے ”مقدس“ قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک چھپا ہوا مغربی تقدس ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کے معنوں کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اس کے شاعرین کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہے جس سے یزنا بہت ہوتا ہے کہ اسے پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔ اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہے گا کیونکہ مشکل ہی کوئی اسے پڑھتا ہے“

ٹی ایس ایلٹ کی رائے والٹیر سے بے حد مختلف ہے ایلٹ کا کہنا ہے کہ دانتے کی ”ڈیوائن کامیڈی“ نے انسانی نفسوں اور ہر دور کے لکھنے والوں اور شاعروں کو متاثر کیا ہے

اور متاثر کرتی رہے گی۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ ”ڈیوائن کامیڈی“ بلاشبہ دنیا کے عظیم ترین تخلیقی فن پاروں میں سے ایک ہے جن کی شہرت اس حوالے سے بہت ہے کہ اسے پڑھا کم گیا ہے۔ بڑی اور عظیم کتابوں کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی شہرت کی وجہ سے ان کا نام تو زبانوں پر ہوتا ہے۔ مگر پڑھنے کی زحمت کم لوگ ہی گوارا کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں اسے بہت کم پڑھا گیا۔ حتیٰ کہ بہت کم پڑھنے والوں کے علم میں یہ بات ہے کہ مرحوم عزیز احمد نے اس کا ایک مستند اور جامع ترجمہ بھی کیا تھا جو انجمن ترقی اردو نے قیام پاکستان سے پہلے شائع کیا تھا۔ علامہ اقبال کے ”جاوید نامہ“ میں اقبال کی رہنمائی کا فریضہ مولانا رومی ادا کرتے ہیں ”ڈیوائن کامیڈی“ میں یہ فرض ورجل نے نبھایا ہے۔

ورجل (دہم تا ۱۹ ق م) لاطینی زبان کا عظیم شاعر گزر رہا ہے۔ اس کی عظیم ایک ”اینیڈ“ بلاشبہ عظیم شاہکار ہے اور اس کا موازنہ ہومر سے بھی کیا جاتا ہے۔ ورجل بے پناہ شغری صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی قوتِ تخیل اور شعوریت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ورجل نے رومن شہنشاہ آکٹویس کی فرمائش پر ”اینیڈ“، سحر برکی تھی ”اینیڈ“ کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے۔ جب رٹائے کی لڑائی ختم ہو چکی اور جنگجو سورا واپس لوٹ رہے ہیں انہی میں ”اینیاس“، بھی تھا جو اپنے بوڑھے والد کو اپنے کندھوں پر اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ گویا وہ ماضی کا عظیم ورثہ اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ اینیاس اور اس کا خاندان ایک نئی دنیا ایک نئے ملک، ایک نئے تمدن اور تہذیب کی بنیادیں رکھتے ہیں۔ ”اینیڈ“۔ اینیاس کا رزمیہ ہے جو رومہ البکری کی بنیادیں رکھتا ہے۔ ”اینیڈ“ میں ورجل نے ایسے کرداروں کی دنیا آباد کی ہے جو آج علامتوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ورجل نے جو PASTORAL نظمیں لکھیں۔ ان کا شمار دنیا کی بہترین تخیلاتی اور غنائی شاعری میں ہوتا ہے۔ تاہم اسے لازوال شہرت ”اینیڈ“ سے ملی۔ جس کے لئے وہ ایک طویل سفر پر بھی نکلا اور واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ ورجل کی آرزو تھی کہ ”اینیڈ“ کو جلا دیا جائے۔ اگر اس کی آرزو پوری ہو جاتی تو دینا بعتاً ایک عظیم شغری فن پارے اور مذہم سے محروم ہو جاتی ”اینیڈ“، نامکمل ہونے کے باوجود ایک طویل رزمیہ ہے۔

اس شاعر کو دانستے اپنا رہنما کیوں بناتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ مولانا نے روم کو اقبال
 اکبر "جاوید نامہ" میں اپنا رہنما بناتے ہیں تو اس کی اپنی وجوہات ہیں جن کا ذکر "جاوید نامہ"
 کے حوالے سے تفصیل سے اس کتاب میں آئے گا۔ ورجل - ایک تو اطالوی زبان کا بے مثل شاعر تھا۔
 اس وجہ سے بھی دانستے نے اس سے فیض اٹھایا تھا لیکن اس روحانی اور پراسرار سفر کے لئے
 اسے ورجل کے علاوہ زمانہ قدیم یا اپنے دور کا کوئی شاعر یا فن کار اس لئے پسند نہ آیا کہ ان میں ورجل
 کی ہی خصوصیات تو تھیں مگر ایک خاص خوبی سے وہ دانستے کی نگاہوں میں نہ بیچے۔

”ڈیوان کا میڈی“ ایک ایسی نظم ہے۔ جس میں دینیات اور کیتھولک عیسائیت کے عناصر بے حد
 قوی ہیں۔ بعض نقادوں نے تو اسے خالص مذہبی نظم بھی قرار دیا ہے۔ جہنم، بہشت اور اعراف کے اس
 سفر میں ورجل اس لئے دانستے کا رہنما بنتا ہے کہ ورجل — مسیح کی پیدائش سے پہلے کا شاعر ہونے
 کے باوجود ایک انتہائی شائستہ، متحمل مزاج، نیکو کار اور نیک نفس انسان تھا، ورجل کے
 بارے میں جو معلومات ہمیں ملتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ورجل بے حد نیک طبیعت انسان تھا
 اس کی یہ شخصی خوبی دانستے کو دیگر وجوہات کے علاوہ خاص طور پر اپنا رہنما بنانے پر مجبور کرتی ہے۔
 دانستے کی زندگی کا بھی اس کی اس عظیم تصنیف سے گہرا تعلق ہے۔

دانستے عہد وسطیٰ کا شاعر ہے۔ وہ فلورنس میں ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا۔ فلورنس کے معنی ہیں۔
 پھولوں کا شہر مگر دانستے پھولوں کے شہر — فلورنس میں ایسے دور میں پیدا ہوا اور اس نے ورجل
 ایسی زندگی گزاری جو بے حد کو بناک اور جدوجہد رقابتوں اور مخالفتوں سے بھری ہوئی تھی۔
 دانستے ایک تنہائی پسند روح تھی۔ لیکن خارجی عوامل کے میدان میں بھی وہ بڑا نمایاں تھا۔ دانستے
 کے اپنے بیان کے مطابق اس کا خاندان حسب نسب کے اعتبار سے بڑا معزز خاندان تھا۔ اس
 کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ دانستے ابھی کسب ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔
 اس کی والدہ نے اسے بہترین تعلیم دلوائی اور اس دور کے ایک عظیم استاد بروٹولائی فی کی خدمات
 حاصل کیں۔ بروٹولائی فی، ایک سیاستدان اور بڑا شاعر تھا۔ دانستے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا
 ہے کہ اس نے فلسفہ کی تعلیم یونگوتہ اور پاڈوایونیورسٹی اور دینیات کی تعلیم پیرس سے حاصل کی۔
 گیورانی کی کیمپورڈی ٹیکمرون کا خالق اور دانستے کا شاعر (بتاتا ہے کہ دانستے انگلینڈ بھی گیا۔ دانستے

سنے ایک زمانے میں فلورنس کی فوج میں بھی اہم خدمات انجام دیں اور ۱۲۹۰ء میں جب کیرونا کا قلعہ فتح ہوا تو وہ اس معرکے میں موجود تھا۔ دانٹے حکومت کے کئی اعلیٰ اہم عہدوں پر بھی فائز رہا۔ فلورنس اس وقت سیاسی رسکینی کا اگھاڑہ بنا ہوا تھا۔ سفید اور سیاہ گوبلیف دو فریق تھے۔ جن میں شدید حد تک اختلافات بڑھ چکے تھے اور گہری ٹھنی ہوئی تھی۔ آزادی اور خود مختاری۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو اس وقت اظاہرہ کو درپیش تھا۔ دانٹے سیاسی نظریات کے اعتبار سے پاپائیت کا شدید مخالف تھا۔ وہ شاہ پسند تھا اور بادشاہت کا حامی تھا۔ دانٹے نے اپنے سیاسی خیالات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ بات اس کے بعض پڑھنے والوں کے لئے بڑی حیران کن ثابت ہو سکتی ہے کہ گہری مذہبیت میں ڈوبا ہوا یہ شخص پاپائیت کا مخالف تھا۔ حالات ایسے ہیں کہ دانٹے کے مخالف طبقے کو عروج حاصل ہوا اور دانٹے کو ۱۳۱۲ء میں فلورنس سے جلا وطن کر دیا گیا۔ اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اس کے بعد دانٹے کو پھر کبھی اپنے پیارے شہر۔ فلورنس میں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اس کی یاد میں ترپتا اور آہیں بھرتا رہا۔ ”ڈیولوائن کامیڈی“ میں بھی وہ جس سوز و گداز اور محبت سے فلورنس کا ذکر کرتا ہے وہ دل کو بے حد متاثر کرتا ہے۔

کارلائل نے لکھا ہے کہ حکومت وقت دانٹے کے بارے میں اتنی انتہا پسند ہو گئی تھی کہ یہ حکم جاری کر دیا گیا تھا کہ دانٹے پکڑا جائے تو اسے زندہ جلا دیا جائے۔ دنیا کا یہ عظیم شاعر اب ایک آوارہ گرد تھا۔ نگہ نہ وطن وہ کئی جگہ گیا۔ کئی لوگوں کا ہمان ہوا۔ جو ظاہر ہے کہ اس کی حالت پر ترس کھاتے تھے۔ دانٹے اس رہتا تھا۔ وطن کی یاد میں ترپتا رہتا۔ اپنی اس جلا وطنی کے زمانے میں اس نے اپنا وہ شاہکار لکھا۔ جسے ”ڈیولوائن کامیڈی“ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور ۱۳۲۱ء میں وہ جلا وطنی میں ہی انتقال کر گیا۔ اس کی تاریخ وفات ۴ ستمبر ۱۳۲۱ء ہے۔

دانٹے کے انتقال کے نصف صدی بعد فلورنس میں سرکاری سطح پر اس کی عظیم تصنیف ”ڈیولوائن کامیڈی“ کو سراہا گیا اور اسے فلورنس کا عظیم شاعر اور سپریم تسلیم کر لیا گیا۔ دانٹے کی زندگی صرف انہی واقعات، حالات اور اس کن کیفیات سے عبارت نہیں اس کی زندگی میں ایک ایسا کردار بھی آتا ہے۔ جس کو دانٹے کی طرح عالمی شہرت حاصل ہوئی اور یہ کہا جا

سکتا ہے کہ مانتے اور بیاترچے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

دانتے نے اپنی زندگی میں صرف ڈیوائن کامیڈی ہی نہیں لکھی بلکہ کئی دوسری تصانیف کا بھی وہ خالق ہے۔ ایک تو اس کی سیاسی کتاب تھی جس کا ذکر ہو چکا۔ اس کی ایک اہم ترین تصنیف VITA NUOVA ہے یعنی LA THENEWLIFE (حیات نو) دانتے کی یہ تصنیف "حیات نو" اس کی آپ بیتی ہے جس کے بارے میں بلاسٹیہ پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کی عظیم آپ بیتیوں میں سے ایک ہے۔ اپنی اس آپ بیتی میں دانتے بتاتا ہے کہ اس نے حیات نو کس طرح پائی اور اسے حیات نو بنانے والی بیاترچے ہے۔

بیاترچے اور دانتے کا عشق۔ دنیا کا ایک انوکھا عشق ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ بیاترچے کو وہ عظیم روح، تقدس اور حسن کامل کا نام دیتا ہے۔ بیاترچے نو برس کی تھی جب دانتے نے اسے پہلی بار دیکھا اور اس پر زلف بٹہ ہو گیا دانتے کا قازیہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ نوکا ہندسہ دانتے کو بے حد پسند ہے۔ اس نو کے ہندسے کا ذکر بار بار اس کے ہاں آتا ہے۔ یہ محبت خاموش تھی لیکن بہت گہری، بہت عیسیت اور ہمیشہ زندہ رہنے والی۔ ایک عرصے کے بعد (پھر نو برس بعد) بیاترچے سے اس کی ملاقات ایک تقریب میں ہوتی ہے، کچھ خواتین دانتے کی محبت کا فراق اڑاتی ہیں۔ دانتے کو دکھ ہوتا ہے جس کا اظہار وہ بعد میں اپنے کئی سانیٹ میں کرتا ہے۔ بیاترچے اور دانتے کی محبت میں بیاترچے دانتے کو دیکھتی ہے اور اسے خاموشی سے سلام کر کے آگے بڑھ جاتی ہے یہ سلام کرنے کا انداز۔ دانتے کی زندگی کا حاصل ہے۔ دانتے کی محبت نے، دانتے کے اپنے اعتراف کے مطابق اس کی کائنات، زندگی اور رول کو بدل دیا۔ وہ حیات نو پا گیا۔ بیاترچے کی شادی ایک معزز اور دولت مند سامن ڈی بارڈی سے ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد وہ جوانی کے عالم میں ہی فوت ہو گئی۔ دانتے نے بعد میں ایک خاتون سے شادی کی جس سے اس کے چار بچے تھے۔ لیکن وہ دانتے کی طویل جلا وطنی کے زمانے میں اس کے ساتھ نہ تھی۔

دانتے نے اپنا خود محبت کو اپنی آپ بیتی LA AVITANOUUA اور "ڈیوائن کامیڈی" میں لازوال کر دیا ہے۔ اس محبت نے اسے شاعری میں وہ انداز بخشا۔ جسے وہ خود "طرز لطیف و نو" کا نام دیتا ہے۔ یہ بیاترچے ہی تھی کہ اس کے دیدار کی آرزو نے اس کے تخیل کو وہ وسعت بخشی کہ جس کی

مثال اس سے پہلے پوری دنیا کی شاعری میں نہیں ملتی اور شاعر جمع اور بہشت کا سفر کرتے ہیں اور نوات اولیٰ کو بھی اپنی تجویز بیا ترچے کے توسط سے دیکھتا ہے۔

دانٹے کی اس تصنیف LAVI TANOUUA کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسا تھوڑا عشق ہے کہ جس کی مثال دنیا سے اوپر پیش کرنے سے قاصر ہے اپنے اسلوب، طرز احساس اور گہرے خیالات کی بنا پر یہ ایک عظیم احساساتی دستاویز ہے۔ بعض عشقوں ناقصوں نے لکھا ہے کہ بیا ترچے کا کوئی وجود نہیں یہ بھی دانٹے کی عظیم ویب مثل قوت متجملہ کا ایک شاہکار ہے یہ ایک فینٹسی ہے۔ ٹی ایس ایلٹ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ بیا ترچے حقیقت بھی ہے اور افسانہ بھی۔ اس کا وجود حقیقی ہے اس کے ساتھ دانٹے کی محبت سچا واقعہ ہے جسے اس نے فینٹسی کا انداز دے دیا ہے۔

ڈیوائن کامیڈی دانٹے اور اسلام

ہمارے ہاں کے عشقوں اور عالموں کو تو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ دانٹے اور اس کے لازوال شاہکار ”ڈیوائن کامیڈی“ پر اسلام کے گہرے اثرات کا سراغ لگاتے اور اس پر تحقیق کرتے۔ لیکن پچھلی آٹھ نو دہائیوں سے بعض یورپی مستشرقین نے اس پر شاندار اور قابل قدر کام کیا ہے اس ضمن میں سب سے اہم کتاب پروفیسر میگوئل آسین کی ”اسلام اینڈ ڈیوائن کامیڈی“ ہے پروفیسر آسین کی تحقیق یہ ہے کہ دانٹے نے ڈیوائن کامیڈی کے نفس مضمون اور اس کی بیشتر تفصیلات اسری اور معراج نبویؐ کی روایتوں سے مستعار لی ہیں۔ ”جہنم“ کا جو نقشہ دانٹے نے کھینچا ہے۔ وہ ابن عربی سے بہت ملتا جلتا ہے۔

دانٹے نے ڈیوائن کامیڈی میں جس شہر کا ذکر کیا ہے۔ عیسائی تصورات میں اس سے پہلے اس تصور کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جب کہ اسلامی روایات میں ایک شہر آتیش کا ذکر موجود ہے۔ اور دانٹے نے اسی تصور سے استفادہ کیا ہے۔

رسول کریم صلعم جب معراج پر گئے تو جبرئیلؑ ان کے ہم رکاب تھے۔ دانٹے درجہ کو اپنا رہنا بتاتا ہے۔ لیکن جنت میں وہ بیا ترچے کو اپنا رہنا ہی کا فرض سوچتا ہے معراج نبویؐ میں ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ جب جبرئیلؑ ایک مقام پر رک کر مولانا نے روم کی زبان میں کہتا ہے کہ

” اس سے آگے میں جاؤں تو میرے پر جل جائیں گے“

اور اس کے بعد حضور نبی کریم صلعم اکیلے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ڈیوانن کا میڈی میں بھی دانستے۔ بیاترچے کے ساتھ ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جس سے آگے بیاترچے نہیں جاتی۔ بلکہ واپس کو اکیلے ہی جانا پڑتا ہے۔ پروفیسر آسین کی تحقیق ہے کہ یہ مماثلت اتفاقی نہیں بلکہ واقعہ معراج سے لئی گئی ہے۔

شیخ اکبر حنی الدین ابن عربی کی دو تصانیف کا بھی ”ڈیوانن کا میڈی“ پر گہرا اثر ہے۔ ایک تو ”الاسرالی مقام الاسری“ ہے دوسری ”فتوحات مکیہ“،

ابن عربی اور دانستے کے درمیان صرف ۸۰ برس کا زمانہ حائل ہے۔ اس عرصے میں ابن عربی کی شہرت وقت تک پھیل چکی تھی اور دانستے اس سے بے خبر نہ تھا۔

نظریات کے اعتبار سے بھی بعض اہم امور پر ابن عربی اور دانستے کی ہم آہنگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ابن عربی اور دانستے دونوں جہنم اور فردوس کے سفر کو اس دنیا میں روح کے سفر کی تمثیل سمجھتے ہیں۔ دونوں کا عقیدہ ہے کہ خالق جیفنی نے اس دنیا میں روح کو اس لئے بھجا کہ وہ اس مقصد اعلیٰ اور آخر کی نیاری کرے اور وہ مقصد دیدار خداوندی ہے اور اس سے کامل مسرت کوئی اور نہیں ہے۔ ابن عربی اور دانستے میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ تائید نبوی اور شریعت کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ انسان اس مقصد کو حاصل کر سکے۔ عقل (جس کی علامت ڈیوانن کا میڈی ہے) اور جبل ہے، دو تک ساتھ نہیں دے سکتی۔

ڈیوانن کا میڈی اور فتوحات مکیہ، کا اسلوب بیان اور بیشتر تفصیلات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ خاص طور پر ڈیوانن کا میڈی کا حصہ بہشت تو فتوحات مکیہ سے بے حد متاثر دکھائی دیتا ہے۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ فتوحات مکیہ کی طرح ڈیوانن کا میڈی کا لب و لہجہ بھی بعض مقامات پر بڑا پڑا سراہ ہو جاتا ہے۔

یعنی امر ہے کہ دانستے پر شیخ اکبر ابن عربی کا بے حد اثر ہے۔ دانستے کی ایک کتاب ”CONUITO“ پر ابن عربی کی ”ترجمان الاشواق“ کا اثر تو بہت واضح ہے (عربی سے ناواقف قارئین کے لئے اطلاع ہے کہ ابن عربی کی ”ترجمان الاشواق“ کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر مکلسن

کر چکے ہیں)

ابن عربی بتاتے ہیں کہ شیطان کو یہ سزا دی گئی ہے کہ وہ برف میں جما ہوا گل رہا ہے چونکہ وہ آتشِ مخلوق ہے۔ اس لئے اس کے لئے اس سے سخت سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ڈیوائن کامیڈی کے جہنم میں دانستے بھی شیطان کو برف میں دھنسا اور گلٹا ہوا دکھاتا ہے۔

پروفیسر آر۔ اے نکل (R. A. NYKLE) کی تحقیق یہ ہے کہ دانستے پر ابن عربی کے علاوہ ابوالعلماء عمری کی تصنیف ”رسالۃ الغفران“ کا بھی گہرا اثر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دانستے جو عربی سے نا آشنا تھا اس کی رسائی ابن عربی کی تصانیف تک کیونکر ممکن ہو سکی مستشرقین اور محققین نے اس سلسلے میں بتایا ہے کہ اس زمانے میں فلورنس ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ عرب تاجر اطالیہ تک پہنچ چکے تھے۔ عربی فتوحات اور علم و دانش کا شہرہ ساری دنیا میں تھا۔ فریڈرک نے نیپلز میں ایک یونیورسٹی قائم کی جہاں عربی مسودات کا ترجمہ ہو رہا تھا۔ طلیطلہ کے شاہ الفانسو کے عہد میں تو خاص طور پر کئی اہم عربی کتابوں کا ترجمہ ہوا اس زمانے میں یورپ پھر میں فارابی، امام غزالی اور ابن رشد کو وہی مقامِ توفیر حاصل تھا جو قدیم یونانی حکماء کو تھا۔ معراجِ نبوی کی روایات سپین کے عیسائیوں میں پھیل چکی تھیں۔

دانستے کا استاد برنولائی فی۔ بہت بڑا سفارت کار، سیاست دان اور عالم و شاعر تھا۔ ۱۲۶۰ میں وہ فلورنس کا سفیر بن کر شاہِ طلیطلہ الفانسو کے دربار میں گیا جہاں یقینی طور پر وہ ابن عربی سے متعارف ہوا اور اس عظیم استاد کے توسط سے ابن عربی کے خیالات دانستے تک پہنچے۔

ڈیوائن کامیڈی شاعری اور فکر کے اعتبار سے بے مثل کارنامہ ہے۔ دانستے سے پہلے عموماً اطالوی شعراء لاطینی اور فرانسیسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اور اطالوی میں بہت کم لکھا جاتا تھا۔ ڈیوائن کامیڈی میں دانستے نے اطالوی زبان کو جن وسعتوں سے آشنا کر لیا۔ یہ اس کا ایک الگ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک شعری زبان کے شعری امکانات کو ظاہر کیا جسے پہلے تو جس کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا۔ دانستے سے پہلے یقینی طور پر اس کے کچھ پیش روؤں نے اس کے لئے

زمین ہموار کر دی تھی۔ لیکن دانستے نے اسے عروج تک پہنچا دیا اور اپنے طرزِ لطیف و نوسے ڈیوائن کامیڈی کو تمثیل اور شعریت کا ایک ایسا فن پارہ بنا دیا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی شاعر — دانستے کی ہمسری کا

دعوے کر سکتا ہو۔ دانستے جلاوطنی کے پرصعوبت ایام میں ڈیوائن کامیڈی کو مکمل کیا۔ اس کی اداس روح نے ایک ایسے نغمے کو تخلیق کیا جسے حسن کا نام دیئے بغیر چارہ نہیں۔ ڈیوائن کامیڈی کا مطالعہ ایک عظیم شعری تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی بہت سی شریں لکھی گئی ہیں۔ میں ذاتی طور پر ڈیوائن کامیڈی کے اس انگریزی ترجمے کو ترجیح دیتا ہوں جس کے مترجم لارنس بینن اور جس کے حواشی سی۔ ایچ گرانڈ جنٹ نے تحریر کیے ہیں۔ دانستے کی ڈیوائن کامیڈی اور اس کے سائٹ کے علاوہ LA VITA NOVA کو ایک طویل مقدمے کے ساتھ پاؤلو میلانوں نے بھی مرتب کیا ہے۔ جس کی آج کے قارئین کے مطالعے کے لئے خصوصی سفارشات کی جاسکتی ہے۔

ڈیوائن کامیڈی ایک طویل نظم ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جہنم، اعراف اور بہشت۔ جہنم میں ۳۳ کینٹوز، اعراف میں ۳۳ کینٹوز ہیں اور بہشت میں ۳۳ کینٹوز۔ یہ ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے ذیل میں ڈیوائن کامیڈی کے پہلے حصے "جہنم" کی ایک تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ ایک سرسری سا خلاصہ ہے۔ ایک جھلک جو اس کی روح اور عنق کو کسی طرح بھی پیش نہیں کر سکتا۔ تاہم اس سے ایک اندازہ اردو کے قارئین کو ہو سکتا ہے کہ دانستے کا جہنم کیا ہے؟

دانستے نالیوسی کے گرداب میں پھنسا ہے کہ اسے درجہ دکھائی دیتا ہے جو دانستے کی مجموعہ بیا ترچے کی آرزو پر دانستے کی راہنمائی کے فرائض انجام دینے کے لئے دوسری دنیا سے آیا ہے...

ادبوں سفر متروک ہوتا ہے۔

دانستے اور درجہ ایک بڑے دروازے کے سامنے پہنچے۔ دانستے نے اس دروازے پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔ ٹھہرے گزر کر تم آہوں کے شہر میں داخل ہو گے مجھ سے گزر کر تم بادی دکھوں کے قریے میں پہنچو گے۔ بڑھ سے گزر کر لوگ ہمیشہ کے لئے اپنا آپ کھو بیٹھے۔

"اے یہاں سے گزرنے والو! اپنی تمام امیدیں ترک کر دو"

"جہنم کا علاقہ متروک ہو گیا۔ یہ وہ دنیا تھی۔ یہاں انسان ابدی محبت کے خلاف اپنے گناہوں کی سخت ناز میں سزا جھگت رہا ہے۔

جہنم کا پہلا حصہ دیا ہے ایکروں کے نشیبی حصوں میں واقع تھا اس حصے میں وہ فرشتے تھے جنہوں نے زمین پر جا کر اپنا اصلی مقام گنوا دیا پھر یہاں وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں تشکیک کے عالم

میں گزار دیں۔ انہوں نے رضا کا اقرار کیا نہ انکار یہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھے والے بے رنگ لوگ تھے۔ گناہ اور ثواب کی رمت سے محروم وہ ہوا تھے باندھے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ناقابلِ فہم آوازیں نکال رہے تھے۔ ان کی آوازیں گہری، دہیز تار ایک ہوا کو داغدار کر رہی تھیں۔

دانتے نے ان بلکتی ہوئی روجوں کو دیکھا اور پھر ورجل کی معیت میں آگے بڑھا۔ اب ان کے سامنے دریاٹے ایکرونی کی پانچ ندیاں تھیں۔ سامنے شارون ملاح اپنی کشتی لئے کھڑا تھا۔ جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کی کشتی پر وہ روجیں لدی ہوئی تھیں۔ جنہیں شارون ملاح نے جہنم کے مختلف حصوں میں بچانا تھا اور وہ انہیں اپنی انگارہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

ورجل نے شارون کو بتایا کہ وہ حکم اعلیٰ کے تحت ایک فانی انسان کی رہنمائی کے لئے مامور کیا گیا ہے تو شارون نے دانتے کو کشتی پر سوار کر لیتے پر رضامندی کا اظہار کیا یوں وہ جہنم کے پہلے دائرے سے گزرے جہاں وہ روجیں نو حکمتیں تھیں جنہوں نے یسوع کو نہیں دیکھا تھا۔

یہاں سے گزر کر وہ جہنم کی ڈھلوانوں سے گزرنے لگے۔ یہاں وہ لوگ سزا بھگت رہے تھے جو شعوری طور پر گناہ کے مرتکب ہوئے تھے یہ ایک عجیب و غریب دنیا تھی ٹیڑھے میڑتے نگ و تاریک راستے جو آہ و بیکاسے گونج رہے تھے اس دنیا کے عین وسط میں شیطان کھڑا تھا۔ چہرے پر وہ عضد امیز کرب جو پیچھے ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ رالوں تک جھیل میں ڈوبا ہوا تھا۔

اور یہاں وہ لوگ تھے جو زمانا کے مرتکب ہوئے تھے ان کے اندھے اور سبباہ شہوانی جذبول نے انہیں اپنے غلبے میں لے لیا تھا۔ اب زانی اور زانیہ دونوں ہوا میں لٹکے ہوئے تھے ان کی اس سزا کا کوئی خاتمہ نہ تھا۔ ایک جڑا ہوا میں لٹکتا ہوا دانتے اور ورجل کے سامنے آیا۔ دانتے نے ان کا گناہ پوچھا۔ وہ پاؤ لو اور فرانسچسکا تھے۔

فرانسچسکا کی شادی اس کے باپ کی رضامندی سے راونیل کے حاکم کائیڈ ڈیوینٹیا سے ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ پھر محروم اور بہادر انسان تھا لیکن جسمانی اعتبار سے اپنے چھوٹے بھائی پاؤ لو سے کمزور تھا اس کے علاوہ نئی دامن فرانسچسکا اور پاؤ لو کا ذوق بھی مشترک تھا۔ رومان پڑھنا اور ان پر اظہار خیال کرنا انہیں بے حد پسند تھا یوں انہوں نے زنا کیا اور جب فرانسچسکا کے تنہا کو بیوی اور بھائی کے گناہ کا علم ہوا تو اس نے دونوں کو قتل کر دیا۔ اور اب یہ گناہ بگڑا جوڑا جہنم کے

اس دائرے میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ دانستے اور درجل آگے بڑھتے ہیں یہاں گندے پانی اور پیپ کی بارش ہو رہی ہے۔ یہاں وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو بھلا کر منرا با میں ڈبو دیا وہ دانستہ نہیں رہے تھے اور جہڑے ہلا رہے تھے ان کے چہرے مسخ ہو رہے تھے، ان پر غلیظ پانی اور پیپ کی بارش ہو رہی تھی جسے وہ پی رہے تھے وہ پینا نہ چاہتے تھے مگر پئے بغیر چارہ نہ تھا۔

اور پھر ایک دائرے میں انہیں دولت کا دیوتا پلاٹو دکھائی دیا جہاں وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا میں دوسروں کا حق غصب کر کے دولت جمع کی۔ ان میں وہ بھی تھے جو صرف دولت کے ہی ہوتے مگر وہ گئے یہاں وہ بھی سزا بھگت رہے تھے۔ جنہوں نے عیاشی اور فضول خرچی میں نام پیدا کیا دولت مندوں کو دولت کے انباروں نے جکڑ رکھا تھا وہ ان میں پس رہے تھے یہ سچ رہے تھے اور ان کی سزا کا کوئی خاتمہ نہ تھا۔

• آگے جا کر دلتے نے دیکھا کہ ننگی مخلوق پانی کی سطح سے اوپر اٹھتی ہے ان کے جسم کچھڑ اور غلاظت سے لٹھڑے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کو نوح رہے تھے پانی میں بڑے بڑے بلبے اٹھ رہے تھے۔ درجل نے ان کی طرف اشارہ کر کے دانستے کو بتایا، یہ ان روجوں کی آہیں ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گناہوں کی دنیا میں مصروف رکھا کہ باہر کی دنیا اور فطرت کے حق سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔

سلنے جہنم کا دار الحکومت۔ لوسی فر تھا۔ یہ شہر ان لوگوں کی روجوں سے آبا د تھا کہ جنہوں نے درندوں کی طرح خلاف فطرت گناہ کئے تھے تین خوفناک بلائیں کہ جن کے سر میڈوسا کی طرح تھے کہ جو انہیں دیکھے پتھر کا بن جٹے ان کی طرف جائیں مگر اس سے پہلے کہ وہ دانستے اور درجل پر فار کر تیں ایک فرشتے نے آگے بڑھ کر ان کو روک دیا۔

جہنم کے دار الحکومت کے دروازے بند تھے اور یہ بند ہی رہے۔ کیونکہ یہی خداوند کی رضا ہے۔ کہ یہ دروازے ہر اس شخص پر بند رہیں گے جس کے جسم پر گوشت ہے دھرتی کی مٹی جس کے جسم پر موجود ہے۔ لوسی فر کے دروازے کے اندر سے آنے والی گناہگاروں کی آہ و بکا دوزخ ان کا پتھچھا کرتی رہی۔ ابدی عذاب سننے والی روجیں مسلسل رو رہی تھیں۔

جہنم کا چھندا درتہ۔ ابلتے ہوئے خون کی ندی کے اس پار تھا اس ندی کو پار کئے بغیر آگے

جاننا ممکن نہ تھا۔ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے دانستے کو اس راہ تک جانا تھا جو اوپر چڑھا ہی ہوئی
ستاروں سے جا ملتی تھی۔

وہاں کوئی ملاح دکھائی نہ دے رہا تھا اور اُبلتا، ہوا خون آنکھوں کے سامنے تھا اور سے
کنا رے پر قنطور دکھائی دے رہے تھے اور گھوڑے بھاگ رہے تھے جن پر آدمی سوار تھے بگھوڑے
ان لوگوں کو پھر سے خون کے دریا میں گرا دیتے تھے جو خون کے دریا سے نکل کر کنا رے پر آنا
چاہتے تھے یہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ خون کے دریا سے نکلنے کے لئے بے چین روہیں رو رہی
تھیں چیخ رہی تھی۔

ورجل کو خصوصی احکامات کے تحت خصوصی اختیارات ملے تھے۔ اس نے ایک قنطور کو
آبادہ کر لیا کہ وہ انہیں اپنی پیٹھ پر سوار کر کے دریا پار کر دے جب وہ قنطور پر سوار خون کا دریا
پار کر رہے تھے تو ورجل نے بتایا۔

” یہاں وہ روہیں غذاب سے رہی ہیں جنہوں نے اپنے ہمسایوں، اپنے عزیزوں، شتے داڑوں
یا خدا کے خلاف تشدد سے کام لیا یہاں وہ قاتل بھی سزا بھگت رہے ہیں جنہوں نے ان کی
زندگیوں کے خون سے ہوئی کھیلی اور اب نانا ابد ہمیں خون کے دریا میں رہیں گے۔“
پھر ورجل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
” ادھر دیکھو“

دانستے اس طرف دوسرے کنا رے کی طرف دیکھتا ہے۔ وہاں آگ کے شعلے ریت پر چل رہے تھے
ورجل نے بتایا:

” وہاں وہ لوگ ہمیشہ اس گرم ریت اور آگ کے شعلوں میں جلتے رہیں گے جنہوں نے
خدا کے خلاف یا خدا کی تخلیق، فطرت کے خلاف کوئی گناہ کیا،“
پھر ورجل نے ایک اور حصے کی طرف اشارہ کر کے کہا

” یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جنہوں نے سود خوری سے اپنی ناجائز کمائی پیدا کی
سود خوروں کو سدومیوں، دھوکہ بازوں، قاتلوں اور فریبیوں کے درمیان جگہ دی
گئی ہے۔ خدا نے آدمی کو کہا تھا کہ وہ دنیا پر ہل چلائے، فصل کاٹے، چیزیں بنائے

اور اپنی محنت کی کمائی سے اپنا رزق پیدا کرے۔ مگر سود خوروں نے اپنے لئے
 نا بانٹ کر کمائی کی راہ نکالی اور وہ گناہگار بھٹھے،
 قنطورہ نے انہیں دریائے خون کے ایک اندرونی کنارے پر اتار دیا اور وہ دونوں
 پڑا سرا دھند کے جنگل میں داخل ہوئے یہ جنگل ان روجوں سے آباد تھا۔ جنہوں نے اپنی جان پر
 خود تشدد اور ظلم کو روا رکھا تھا اور خودکشی کی تھی:

”ہم ایک ایسے جنگل میں داخل ہوئے جہاں کبھی کسی کے قدموں نے کوئی راستہ
 نہ بنایا تھا۔ یہاں روشنی نہ تھی۔ بس ٹہنیاں اور شاخیں تھیں اور اندھیرا، جہاں
 درختوں پر ایک پھل بھی دکھائی نہ دیا۔ پھلوں کے بجائے کانٹے تھے جو ہر سے
 بھرے تھے“

دانٹے اس جنگل کے ایک درخت کی ٹہنی توڑ بیٹھتا ہے اور پھر خوف سے کانپنے لگتا ہے
 جہاں سے اس نے ٹہنی توڑی تھی۔ وہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ درخت تے آہ و بکا کرتے
 ہوئے کہا۔

”تم نے مجھے زخمی کیوں کیا؟“

اس جنگل میں وہ لوگ درخت بنا دیئے گئے تھے۔ جنہوں نے خودکشی کی تھی روز حساب
 جب ہر انسان پھر اپنے اصل وجود میں آجائے گا۔ ان لوگوں کو لباس نصیب نہ ہوگا کیونکہ انہوں
 نے اپنے آپ کو خود ہی اپنے جسموں سے محروم کیا تھا۔ روز حساب فیصلہ ہو چکے کے بعد ان کے
 جسم ان ٹہنیوں سے لٹکا دیئے جائیں گے تاکہ رو میں ہمیشہ نوحہ کنان رہیں۔ اپنے جسم کو دیکھ دیکھ
 کر عذاب سہتی رہیں۔

جنگل سے گزر کر وہ ایک ندی کے منبع تک پہنچے ہیں۔ جہاں ریت جل رہی تھی اس بلتی
 ہوئی ریت میں دھوکے بازوں کے جسم بھن رہے تھے۔ سودینے والوں نے اپنے چہرے لٹکا رکھے
 تھے اور جل رہے تھے۔

پانگوں کی طرح یا ستائے بغیر بگٹ بھاگ رہے تھے ان کے تلو سے بلتی ہوئی ریت پر
 مسلسل بھاگنے سے پھٹ چکے تھے بھاگتے بھاگتے وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام کر کبھی دائرہ

بنالیتے اور اسی میں تھوڑی سی مسرت حاصل کر لیتے تھے۔

اگلے دائرے کی حفاظت میب ناک درندے کر رہے تھے کہ ایک درندے کو درجل نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر وہ دونوں اس کی کمر پر سوار ہو گئے اور نیچے اترنے لگے۔ یہاں دانٹے نے دس بڑی بڑی عجیب ریگھا ریاں دیکھیں جنہوں نے جہنم کے مرکزی پاتال کو اپنے حصاروں سے رکھا تھا۔ یہاں سے شیطان نظر اُڑا رہا تھا۔ جو محمد جھیل میں گرہا ہوا تھا۔

اس کے اوپر ایک اور دائرہ تھا جو بڑے پستے کی طرح تھا۔ وہاں اوپچی اوپچی چٹانیں تھیں ہوا میں گوشت کے جلنے کی بو اُسی تھی اور دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اس دھوئیں سے بچتے ہوئے دانٹے اپنے رہنما درجل کے ساتھ ان دس ریگھا ریلوں سے گزرا۔ جہاں انہی قسم کے فریبی اور دھوکے باز اپنی اپنی سزا بھگت رہے تھے۔ یہاں دانٹے نے بھڑووں اور خوشامدیوں کو دیکھا اور ان کو جنہوں نے کام کرتے ہوئے اپنے اداروں اور دفاتر میں بے ایمانی کی تھی۔ وہ سوراخوں میں سر دیئے بیٹھے تھے وہاں بوجھل ہوا میں ننکی غلوں چل رہی تھی۔ جن کے پاؤں پھیل پائیوں کی طرح تھے۔ سر پشت کی طرف شانوں پر لگے تھے۔ چہرے سے بستے ہوئے آنسو ان کے چوڑوں پر گر رہے تھے۔ ان کی سزا ان کے اعمال کے عین مطابق تھی۔ انہیں دیانت اور تقدیس کے فرائض سوچنے گئے تھے اور انہوں نے بے ایمانی کی تھی۔ ان کے چہرے ان کی پشت پر تھے۔ اور پاؤں مر گئے تھے۔ ان کے پیروں کے نیچے جلتی ہوئی زمین تھی وہ اپنے منہ اور نتھنے یلوں کھولتے تھے جیسے مینڈک ہوں۔

وہاں وہ چور تھے۔ جنہوں نے دوسروں کے گھروں سے مال اڑایا تھا اور اب وہ ساپنوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور انہی ساپنوں کے ساتھ انہیں ہمیشہ رہنا تھا۔ سانپ اور چور ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔

آنکھوں دیکھا ہی میں مذا بسنے والی رو میں اپنی شبہت کھو چکی تھیں اور پہچانی نہ جا رہی تھی۔ اپنے بڑے منہ کے شعلوں میں لپیٹ ہوئی گمراہ رہی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بڑی دامنمدی سے برائی کو اپنایا تھا اور خدا کی محنتی ہوی دہانت کا عطا استعمال کیا تھا۔

اس سے آگے جہاں ہوا تک تار یک ہو جاتی تھی۔ آخری ریگھا رسی تھی۔ یہ جہنم کا مجددی مرد

حصہ تھا۔ جہنم کا وسطی پاتال۔ یہاں گندی اور غلیظ بیماریوں سے داغدار روحیں بس رہی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے ملاوٹ کی تھی۔ دھوکے باز، فریبی، ملاوٹ کرنے والے کی میا دان وہ اس وقت بھی ایک دوسرے پر فقرے اچھال رہے تھے، ایک دوسرے کو زبانی کلامی رگید رہے تھے۔ اپنے اپنے اعضا کو نوچتے کھسوتے وہ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جہنم کے وسطی حصے میں۔ کوئٹیس جھیل برف کی طرح مجمد تھی۔ جہنم کے تمام دریا یہیں سے نکلنے اور یہیں واپس آکر ختم ہو جاتے تھے۔ بڑے بڑے جمانی سائے دھند میں لہر رہے تھے۔ ان میں نمرود بھی تھا اور وہ سب تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کو قدیم زمانوں میں درغلا یا تھا کہ وہ فطرت اور فطرت کے خالق سے منہ پھیر لیں۔

وسطی جہنم کے دائرے کی چار سطحوں میں مجمد پاتال میں شیطان کھڑا تھا۔ وہ رانوں تک مجمد ہو چکا تھا وہ مسلسل اس کوشش اور ننگ دوو میں مصروف تھا کہ کسی طرح یہاں سے بل سکے مگر اس کے پر بھی برف جسم چکی تھی۔ جسم کا پچھلا حصہ رانوں تک مجمد تھا۔ شیطان کے سر پر انلی اور ابدی، انکار کا سایہ تھا۔ اس کے سائے کے نیچے وہ روحیں تھیں جنہوں نے دغا بازی سے دوسروں کو دھوکا دیا۔ اپنے عزیزوں کو قتل کیا اپنے ملک سے غداری کی۔ اپنے آقاؤں اور محسنوں کے اعتماد کو دھوکا دیا۔

اس حصے کے نیچے ایک دائرہ تھا جس کا نام ”جوڈیکا“ ہے یہاں وہ یہود اسقروطی بھی تھا۔ جس نے حضرت عیسیٰ سے غداری کی تھی۔

دانتے جہنم کے نظارے سے اوسان کھو چکا تھا۔ نا امیدی یا یوسی اور دکھ نے اس کے دل کو تشکیخوں میں کس لیا تھا۔ مگر اس کا رہنما درجل اسے دلا سہ دیتا ہوا اوپر لے جاتا ہے۔ اب وہ اس راستے پر گامزن ہیں جو اونچے آسمان اور ستاروں کی طرف جاتا ہے۔
درجل اور دانتے جہنم سے باہر نکل آتے ہیں جب دانتے اوپر پہنچ کر مہربان سورج کی کرنوں کو دیکھتا ہے جو اس کا دل امید سے جگمگا اٹھتا ہے۔

فصوص الحکم

میں نے ایک خواب ۶۲۷ ہجری کے ماہ محرم کے آخری عشرے میں دیکھا۔ ان دنوں میں دمشق میں مقیم تھا۔ جو ملک شام کا دارالخلافت ہے۔ اس خواب میں مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ حضور کے دست مبارک میں ایک کتاب تھی اور حضور نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

”یہ کتاب لے لو۔ اسے خلق خدا تک پہنچا دو تاکہ وہ اس سے فیض اٹھا سکے۔“ میں نے سر نیازاً حبیبا دیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب میں جن مطالب و معانی سے مجھے سرفراز فرمایا تھا۔ میں نے انہیں پوری دیانت اور اخلاص سے تحریر کر کے خلق خدا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کتاب کی تالیف کے پورے عرصے میں میں ہمیشہ خدا کے سامنے دعا کرتا رہا کہ خدا کی عنایت میرے شامل حال رہے۔ شیطانی دوسوں اور اہام سے خدا میری حفاظت کرے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے جود و کرم سے نوازتا رہے تاکہ میں جو کچھ ضبط تحریر میں لاؤں وہ حضور نبی کریم کے خیالات کی ترجمانی ہو اور اس میں میری اپنی کوئی رائے اور بات شامل نہ ہو۔“

یہ خواب شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اپنی بے مثل اور لاثانی تصنیف ”فصوص الحکم“ کے دیباچے میں لکھا ہے اور اس خواب کو انہوں نے اس کتاب کی تحریر و تالیف کا سبب بتایا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جب یہ تصنیف مکمل کر چکے تو انہیں پورا اطمینان تھا کہ انہوں نے اس میں وہی کچھ لکھا ہے جو حضور نبی کریم نے ان کو عطا کیا تھا۔

فصوص الحکم، الہیات اور فلسفہ، تصون پر ایک گرانقدر اور بے مثل تصنیف ہے۔ یہ کتاب شیخ ابراہین عربی کے مشہور نظریہ وحدت الوجود پر عرف اہل عربی کی حیثیت رکھتی ہے اور شیخ ابراہین عربی کے تمام خیالات و افکار کا جوہر اور سچوڑ ہے۔

اپنے عالمگیر شہرت یافتہ نظریہ وحدت الوجود کے لیے شیخ ابراہین عربی نے تمام فلسفوں اور مذاہب سے استفادہ کیا تھا اور قرآن پاک اور سنت نبویؐ سے خاص فیض پایا تھا۔ شیخ البرہمی الدین ابن عربی نے افلاطون کے فلسفہ اشراق، فلسفہ رواقیہ، مسیحی افکار اور نیون تک کے نظریات و فلسفہ کو کھنگالا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرقہ باطنیہ، قرامطہ کے اعتقادات اخوان الصفا کے نظریات و تعلیمات اور بہت سے دوسرے مکاتب سے خیالات اخذ کئے۔ شیخ البرہمی الدین ابن عربی کا کمال یہ ہے کہ وہ ان سب فلسفوں اعتقادات اور نظریات کو اپنے نظریہ وحدت الوجود کی تائید میں استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے نظریے کو کسی مکتب فکر کے تابع نہیں ہونے دیتے۔

شیخ البرہمی الدین ابن عربی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے نظریہ وحدت الوجود نے نہ صرف پوری اسلامی دنیا کے افکار کو متاثر کیا بلکہ اس نظریے کی آفاقیت نے پوری دنیا کے افکار کو متاثر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ البرہمی الدین ابن عربی کی تصنیف فصوص الحکم کے بعد جو فلسفی، دانشور، شاعر اور ادیب اس دنیا میں سامنے آیا حواہ وہ کسی رنگ ملت ملک اور قوم سے تعلق رکھتا تھا وہ شیخ البرہمی الدین ابن عربی کے نظریہ اور فلسفہ وحدت الوجود سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

شیخ البرہمی الدین ابن عربی کی تصانیف میں 'فتوحات مکیہ' کو بھی عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ فصوص الحکم کی طرح اس کے بھی دنیا کی کئی زبانوں میں تراجم ہوئے اور موجودہ صدی میں مغرب میں خاص طور پر شیخ البرہمی الدین ابن عربی کے فلسفہ الہیات پر بڑا گرانقدر کام ہوا ہے۔ فتوحات مکیہ کی اپنی عظمت اور آفاقی تاثیر ہے۔ اس میں کچھ نکتے نہیں کہ فتوحات مکیہ میں تصون کے تمام پہلوؤں اور افکار کو سمودیا گیا ہے۔ مگر فصوص الحکم میں شیخ البرہمی الدین ابن عربی نے تصون کی مباحثات کو جس جامعیت سے بیان کیا اور مسائل تصون کو حل کر کے اس کی افادیت

کو ثابت کیا ہے وہ بات شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی کی کسی تصنیف میں بھی اس درجہ کمال تک پہنچتی ہوئی نہیں ملتی۔

شیخ اکبر ابن عربی نے اپنے نظریہ حیات وحدت الوجود کے انظار کے لیے صرف عقل و منطق سے ہی کام نہیں لیا بلکہ اس کی بنیاد وجدان اور ذوق باطنی پر رکھی ہے اور اسے کشف کا درجہ دے کر اس کا رشتہ مابعدالطبیعیاتی سائنس سے جوڑ دیا ہے جو اتنا بڑا کام ہے کہ اسے شیخ اکبر ابن عربی ہی انجام دے سکتے تھے۔

جن حقائق کا ادراک اور شعور بہت بعد میں جا کر بعض اکابر کو حاصل ہوا۔ شیخ اکبر ابن عربی نے صدیوں پہلے ان موضوعات و مسائل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

فلسفے کے طالب علم جانتے ہیں کہ کانٹ جیسے فلسفی کے اس نظریے کو عالمی فلسفے میں کتنی اہمیت دی گئی ہے کہ علم حاصل کرنے کے ذرائع صرف عقل و دانش اور منطق نہیں ہیں اور صرف مادی اشیاء اور حواس خمسہ کے ذریعے ہی حصول علم ممکن نہیں بلکہ ذوق اور وجدان بھی حصول علم کے لیے بے حد ضروری ہیں جو صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں اور عقل و منطق اور دانش کی طرح ذوق اور وجدان پر بھی پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ کانٹ کے اس نظریے کو عالمی فلسفے میں بڑا اہم مقام دیا گیا ہے جبکہ شیخ اکبر ابن عربی کانٹ سے صدیوں پہلے اس حقیقت کو پا چکے تھے اور اس کا انظار بھی کر چکے تھے۔ شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی اس علم کو خدا کی خاص عطا سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

”میں پیغمبر یا نبی نہیں ہوں۔ تاہم میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ میرے قلب پر الہام کی طرح نازل ہوتا رہا ہے کیونکہ میں علم انبیاء کا وارث ہوں اور مجھے جو درتہ ملا ہے وہ علوم ظاہری تک ہی محدود نہیں بلکہ علوم باطنی بھی عطا ہوئے ہیں جو انبیاء کے علم کا حصہ ہوتے ہیں۔“

شیخ اکبر ابن عربی کا یہ ارشاد بھی قابل توجہ ہے وہ لکھتے ہیں:-

”جہاں تک علم و دانش کا تعلق ہے ان کا نزول ہمیشہ دلوں پر ہوتا ہے

عقل پر نہیں۔“

فصوص الحکم کے حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی کے مشہور زمانہ نظریہ وحدت الوجود پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ شیخ اکبر ابن عربی کے سوانح حیات کو اجمالاً بیان کر دیا جائے۔

فصوص الحکم اور فتوحات مکہ کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ کو پیر کے دن سپین کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ مرسیہ باغوں اور مساجد کے میناروں کی دجہ سے سپین کے دوسرے شہروں سے ممتاز تھا۔ مرسیہ میں وہ آٹھ برس تک رہے اور یہیں قرآن پاک حفظ کیا۔ ۵۶۸ھ میں وہ استنبول کی آگے جہاں انہوں نے ۵۹۸ھ تک بڑے بڑے نامور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ اور تمام علوم پر دسترس حاصل کی۔

۵۹۸ھ میں وہ اندلس سے نکلے اور پھر انیس واپس اندلس آنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ اور جہاں گئے علم حاصل کرتے رہے۔ اسی زمانہ سیاحت میں انہوں نے حدیث کا درس حدیث کے آئمہ کرام سے حاصل کیا۔ جنہوں نے ان کو درس حدیث دینے کی سند مرحمت فرمائی۔ ان کے اساتذہ میں ابن الجوزی اور ابن عساکر جیسے آئمہ محدثین کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عالم اسلام کے عظیم اکابر و مشائخ میں امام غزالی اور ابوعلی سینا کا مقام بلے حد بلند ہے ان کے ساتھ شیخ اکبر ابن عربی کا موازنہ بھی مقصود نہیں۔ صرف ایک خاص حقیقت کی طرف نشاندہی کرنا مقصود ہے کہ جتنی تالیفات و تصانیف ابن عربی نے اپنے پیچھے چھوڑیں۔ وہ تعداد و کثرت میں ان اکابر کی تصانیف و تالیفات سے کہیں زیادہ ہیں۔ جب شیخ اکبر ابن عربی کی تصانیف کی طرف دھیان جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر دینی اور دنیاوی مصروفیات اور سفر و سیاحت کے باوجود اتنا کچھ کس طرح لکھ لیا۔ شیخ اکبر ابن عربی صوفیے کرام کے مسلک کے پابند تھے۔ عبادت و ریاضت، مجاہدہ، مذاکرہ، امداد و خلافت و لٹمنی و نبوی و دنیوی اور لڑاؤں میں ان کا بیشتر وقت صرف ہوتا تھا۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود شیخ اکبر نے ایسی تصانیف تحریر کیں جو دہزار صفحات سے سچاس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی نے قرآن پاک کی جو تفسیر قلم بند کی اس کی ۹۵ جلدیں تھیں اور یہ تفسیر بھی نامکمل

ہے اور سورہ کعفت تک ہے۔ فتوحات کیر دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

جرمن مترشح جبروکلان نے شیخ اکبر ابن عربی کو دنیا کا سب سے بڑا ذرخیز ذہن اور دماغ قرار دیا۔ وہ شیخ اکبر ابن عربی کو سب سے بڑا وسیع النیال اور وسیع المشرب عالم قرار دیتا ہے۔

اور شیخ اکبر ابن عربی کی ایسی ڈیڑھ سو تالیفات و تصانیف کا ذکر کرتا ہے جو مطبوعات یا مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔ مولانا جامی نے شیخ اکبر ابن عربی کی تصانیف کی تعداد پانچ سو بتائی ہے

۶۳۲ ہجری میں اپنی وفات سے چھ برس قبل شیخ اکبر ابن عربی نے اپنی تصانیف کی تعداد دو سو لاسی لکھی ہے۔ ان کا انتقال ۲۸ ربیع الثانی ۶۳۸ھ بمطابق ۱۲۴۰ء کو جمعہ کی شب ہوا۔

شیخ اکبر ابن عربی کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان کی تمام تالیفات تصانیف کا سرچشمہ اور موضوع ایک ہے اور موضوع ہے "فلسفہ تصوف" اسی ایک موضوع پر انہوں نے سینکڑوں کتابیں تحریر کیں۔ وہ تمام علوم ظاہری اور باطنی پر دسترس رکھتے تھے

مگر اپنے لیے انہوں نے ایک موضوع کا انتخاب کیا اور اسی کے سب گوشوں اور امکانات کو اپنی بے مثل علمیت اور وجدان کے ساتھ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر پیش کرتے رہے۔

فصوص الحکم دو سو صفحات کے قریب ہے۔ اردو میں اس کا ناقص ترجمہ ہو چکا ہے۔ فارسی

فرنیسی اور انگریزی میں یہ منتقل ہو چکی ہے۔ "فصوص الحکم" دراصل شیخ اکبر ابن عربی کے پختہ شعور، بصیرت اور اجتہادی کمالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ اکبر ابن

عربی کی سب سے عظیم تصنیف فصوص الحکم ہی ہے کیونکہ فتوحات کیر کی طوالت اور دوسری کتابوں میں جتنا مواد موجود ہے۔ فصوص الحکم ان سب کا جوہر اور خلاصہ ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی کا نظریہ وحدت الوجود "فصوص الحکم" کے حوالے سے،

وحدت الوجود کے فلسفے کے پیچھے معانی اور اسرار کا ایک ایسا جمان پوشیدہ ہے کہ بیشتر مسائل نازک ہونے کی وجہ سے بعض ذہنوں کو الجھا بھی دیتے ہیں اور مشکلات پیدا کرتے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ الہیات و تصوف کے مسائل کی گہرائیوں تک پہنچنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے نہ ہی ہر شخص کی رسائی ہو سکتی ہے۔

سادہ ترین الفاظ میں وحدت الوجود کے نظریے کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کائناتِ رنگ و بوی میں ہمیں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ دراصل وہ سب کچھ صفاتِ الٰہیہ کا عکس ہے باری تعالیٰ نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ وہ ساری کائنات سے بے نیاز ہے اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو موجودات کی کیا ضرورت آپڑی تھی۔ ذاتِ باری تعالیٰ اپنے اندر شانِ فردیت رکھتی ہے۔ لیکن اس ذاتِ برتر و بالا کی ان گنت صفات بھی ہیں۔ صفاتِ الٰہیہ کا ظہور کائنات کے معرضِ وجود میں آنے سے ہوا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک انسان جیسے بوقلموں اور ہر جہت وجود کا ظہور نہ ہوتا صفاتِ الٰہیہ کا بھر پور اظہار ممکن نہ ہوتا۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر تخلیق کیا۔ گو یہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی صورت گری صفاتِ الٰہیہ کے عین مطابق کی گئی۔

شیخ اکبر ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ خدا نے ذوالجلال نے اس کائناتِ رنگ و بوی کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس کائنات کے آئینے میں اپنی تجلیات و صفات کا مشاہدہ کرے۔ حدیثِ قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ:-

”میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ خود کو بھی اپنی تمام صفات کے حوالے سے پہچان لوں اور دنیا بھی میری عظمتوں کی شاسا ہو۔ چنانچہ میں نے لوگوں کو تخلیق کیا اس کے ذریعے لوگوں نے میری معرفت حاصل کی۔“

وحدت الوجود کے اس نظریے کو سمجھنے میں وقت اس لیے پیش آئی کہ ذاتِ خداوندی کی صفات میں غلط بحث پیدا کر دیا گیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ اتنا نزید و تقدیس کے پردوں میں مستور ہے اور اس کی ذات کے مانند کوئی شے نہیں ہے۔ لیکن وہ بصیر بھی ہے۔ سمیع بھی ہے، علیم بھی ہے یہ سب صفات جس درجہ کمال کی اس ذاتِ باری تعالیٰ میں ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ مگر یہ بہر حال صفاتِ الٰہیہ ہیں۔ جن سے انسان کو بھی منتصف کیا گیا ہے۔ ابن عربیؒ بتاتے ہیں کہ ہر اچھا نام خدا کا ہے۔ خوبی و کمال کی ہر صفت سے ذاتِ باری تعالیٰ متصف ہے۔ شیخ اکبر ابن عربیؒ معجزانہ کی طرح صفات کو غیر ذاتِ حق نہیں سمجھتے۔ تاہم ذاتِ تشبیہ سے منزہ ہے۔ مگر صفات کی تشبیہ قرآن پاک میں

موجود ہے۔ اس لیے صفات کا جلوہ آرا ہونا۔ اگرچہ اس کی ذات کی تجلیات کا نمود ہے۔ لیکن چونکہ ذات باری تعالیٰ تشبیہ و تمثیل سے ماوراء الوجود ہے۔ اس لیے اس آئینہ خانہ ہستی میں جو کچھ ہے وہ اس کی صفات کا ہی عکس ہے۔

”فصوص الحکم“ پر ایک نگاہ اور مطالب و مفہام حکیم کا خلاصہ

فصوص الحکم کے حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی کے اسلوب کے بارے میں علامہ اردمشاخ نے فرمایا ہے کہ اس کا اسلوب طرز نگارش، انداز استدلال اپنی جگہ بے حد انفرادیت کا حامل ہے۔

فصوص الحکم کے کل ۲۰ ابواب ہیں۔ ہر باب کسی نہ کسی پیغمبر کے نام سے معنون و منسوب ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے ہر پیغمبر کو انسان کا دل کے روپ میں پیش کیا ہے جو معرفت حق اور اسرار الہی سے آگاہ ہے۔

فصوص الحکم کے ہر باب کا آغاز قرآن پاک کی کسی آیت مبارکہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد شیخ اکبر ابن عربی اس کو کسی حدیث نبوی سے مزین کرتے ہیں۔ اس کے بعد شیخ اکبر قرآن و سنت کے اس مفہوم و معنی کو جگہ دیتے ہیں جو اہل علم کے حلقوں میں متداول ہے۔ اس کے بعد وہ صاحب عنوان پیغمبر کے حوالے سے وہ توجیہات پیش کرتے ہیں جو ان کے موقف کی تائید میں جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا دل اور خدا کے باہمی رشتے پر اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی ایسی کوئی کتاب آج تک معرض وجود میں نہیں آسکی۔ جس میں انسان کی عظمت پر اتنا مواد جمع کر دیا گیا ہو۔

فصوص الحکم کے پہلے باب میں شیخ اکبر ابن عربی آدم کی خلافت اور نبیابت خداوندی کا تذکرہ کرتے ہوئے عام لوگوں سے صریحاً اختلاف کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ تشریح و تفسیر کی جاتی ہے کہ چونکہ آدم کو ذات باری تعالیٰ نے علم سے نوازا تھا۔ آدم کو علم و ولایت بہا تھا۔ اس لیے اسے خداوند کریم نے اپنا نائب بنایا۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ آدم اس لیے خلافت کا

مستی ٹھہرا کہ اسے صفاتِ الہیہ کا آئینہ خانہ بنا لیا گیا تھا اور آدم کو خلافت پر اس لیے مامور کیا گیا کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت میں جلوہ گر کیا تھا۔

کتاب کے دوسرے باب میں جو حضرت شیت کے متعلق ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے انکشاف کی ہے جو آج کے حالات کے مطابق بے حد چونکا دینے والا ہے ان کے اس انکشاف کا حرف بحرف ترجمہ یوں ہے :-

”حضرت شیت کے نقش قدم پر نسلِ انسانی کا وہ آخری فرد ظہور پذیر ہوگا جو حضرت شیت کی مانند اسرارِ خداوندی کا محرم ہوگا۔ حالمین اسرارِ الہی میں یہ سچ بھنڈ نہ خاتمِ الاولیاء کے ہوگا اس کے بعد کوئی ایسا سچ پیدا نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ اس کی ایک بہن بھی پیدا ہوگی۔ جس کی دلاوت اس بچے سے پہلے ہوگی۔ اس بچے کا سراپا اپنی بہن کے قدموں کے پاس ہوگا۔ اس بچے کی دلاوت ملکِ چین میں ہوگی اور وہ اس ملک کی زبان میں اسرارِ الہیہ کو منکشف کرے گا۔“

شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ سچ پیدا ہوگا اس وقت آبادی بہت کثیر ہوگی اور وسائلِ معیشت محدود ہو جائیں گے وہ لکھتے ہیں کہ :-

”مردوں اور عورتوں میں بانسجہ پن کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ نکاحوں کی کثرت کی وجہ سے اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔“

یہ صاف اور واضح اشارہ ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی طرف۔ یعنی اس زمانے میں خاندانی

منصوبہ بندی پر بڑی شدت سے عمل کیا جا رہا ہوگا۔

فصوص الحکم میں ایسی کسی چونکا دینے والی باتیں موجود ہیں جو ان کے زمانوں کے بارے میں پیش گوئی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مٹا ہر ہے کہ یہ انکشافات کسی نجومی یا ستارہ شناس کے نہیں نہ ہی ان میں کوئی راتعلیٰ ملتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شیخ اکبر ابن عربی اسرار اور رموز کو جانتے تھے اور ان کو علمِ لدنی حاصل ہوا تھا۔ اس لیے وہ ان میں سے بعض اسرار کا انکشاف بھی کر دیتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اس زمانے میں ان اسرار اور رموز کو سمجھنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن اب سائنسی تحقیق کے اس دور میں ان انکشافات کی سچائی ثابت ہو گئی ہے اور بہت سی سچائیوں کو ثابت کیا جائے گا۔

شیخ اکبر ابن عربی کے بعض افکار و نظریات کی بنا پر ایک زمانے میں ان پر بڑی تنقید کی گئی اور ان کو گمراہ کرنے والا بھی کہا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے افکار و نظریات میں ظاہری صورت بعض امور میں واقعی مشکل میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن اگر شیخ اکبر ابن عربی کے افکار و نظریات پر غور کیا جائے تو پھر کوئی توجیہ و تفسیر باقی نہیں رہتی۔ ایک خاص مسئلے کی وجہ سے ان پر بہت تنقید کی گئی۔ جس کا ذکر ضروری ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی بظاہر نبوت غیر تشریحی کے اجراء کے قائل نظر آتے ہیں یہ ایک ایسا مسکہ ہے جو بہت جلد جذباتی بنا دیتا ہے اور اس نظریے کی طرف پوری توجہ دینے کے قابل نہیں چھوڑتا۔

فصوص الحکم سمیت شیخ اکبر ابن عربی کی جملہ تصانیف پڑھ لیجیے کہ غیر تشریحی نبوت کے اجراء کے قائل ہونے کے ساتھ اپنے بے پناہ علم کے باوجود ان کے ہاں ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ وہ خود اس منصب پر فائز ہونے کا رتی بھر بھی شوق رکھتے ہوں۔ راوی ہر زمانے کی بات یہ ہے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو جھوٹی نبوت کا دعوے کرتے دیکھا جو علم میں صغیر تھے، شیخ اکبر ابن عربی ختم نبوت کے دل سے قائل تھے۔ وہ غیر تشریحی نبوت کے اجراء کے صرف اس حد تک قائل تھے کہ جس حد تک انہیں اسلام کی تعلیمات میں اس کی گنجائش ملتی ہے شیخ اکبر ابن عربی غیر تشریحی نبوت کے اجراء کی جو تعریف پیش کرتے ہیں وہ نہ تو خلاف شرع ہے نہ الحجا دینے والی ہے وہ علماء کو دار ثمن نبوت قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمائے سابقین بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔ لیکن شیخ اکبر ابن عربی اس سلسلے میں جو شرط عائد کرتے ہیں۔ وہ ہر شے کو دور کر دیتی ہے۔ وہ علماء کو مذکورہ بالا حیثیت دینے کے باوجود ان کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ اس کا دعوے کریں۔ کیونکہ وہ اہل علم کے لیے ایسے دعوے کو ناپسند سمجھتے ہیں۔

مشیت الہی کے باب میں وہ "فصوص الحکم" میں سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ وہ جبریت کے قائل ہیں۔ مگر ان کا عقیدہ حضور نبی کریم صلعم کے اس ارشاد کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ عمل سے کبھی نہ راہ کشی اختیار نہ کرو۔ ہر شخص کو اس امر کی توفیق نصیب

ہوگی۔ جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

”فصوص الحکم“ میں وہ حضرت ایوبؑ کی تکالیف اور اذیتوں کے حوالے سے یہ تو جہمہ پیش کرتے ہیں کہ یہ اذیتیں دراصل جسمانی نقصان۔ انوار تجلیات الہیہ اور حضرت ایوبؑ کے ماہی جو پروے حاصل ہو گئے تھے اور ان حجابات کے حوالے سے حضرت ایوبؑ کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑی اسے وہ ابتلا و آزمائش سے تعبیر کرتے ہیں۔

”فصوص الحکم“ میں وہ ایک اور چیز کا دینے والے نظریے کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ

اکبر ابن عربی فرماتے ہیں:-

”دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں تنازع کی جڑیں مضبوط نہ ہوں۔

تنازع کے عقیدے کے سلسلے میں وہ ہندومت کی تشریحات کو مطلق خاطر میں نہیں لیتے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے خیال میں تنازع مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور پیروکاروں میں قدر مشترک تو ضرور ہے۔ لیکن ہر شخص کو اس معاملے میں اپنی ذاتی اور منفرد رائے رکھنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اپنے اس نظریے کے استدلال میں انہوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کا البتال کم از کم میرے نزدیک ان علماء کے بس میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا جو علم و دانش بصیرت اور اسرار و رموز کے کشف میں شیخ اکبر ابن عربی کے مقابلے میں بہت کمزور درجے پر فائز ہیں۔

”فصوص الحکم“ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضور نبی کریمؐ کی محبت ایک ایک سطر میں جھلکتی ہے۔ ”فصوص الحکم“ کے مطالعے سے اس حقیقت کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف فانی الرسول کی منزل سے گزر کر وحدت الوجود کی منزل تک جا پہنچتا ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی۔ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کامل کی تلاش و جستجو کا حاصل قرار دیتے ہیں کہ جو اس کا ادراک حاصل کر لیتا ہے اسے حقیقت الہیہ تک رسائی میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جس نے نبی آخر الزماں صلعم کو پایا۔ اس نے خدا کو پایا۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں۔

”اس کوہ ارض پر ہی نہیں بلکہ پوری وسعت کائنات میں اگر کوئی بندہ مومن ہے کہ جس کا قلب عارف مصارف بیزدانی ہو۔ تو وہ صرف اور صرف محمد عربی صلعم ہیں۔ کسی دوسرے کی

کیا مجال کردہ اس مقام کی رفعتوں اور عظمتوں سے ثنا سا ہو سکے۔
 شیخ اکبر ابن عربی کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انسان کامل یعنی انبیائے کرام گزرے
 ہیں۔ ان کے لیے اسوۂ کامل اگر کوئی ذات ہے تو وہ نبی آخر الزماں محمد صلعم کی ذات مبارک
 اقدس ہے۔ جس نے مشاہدہ حق کے ہفت خواں کو سر کرنا ہوا، اسے اپنا دامن تجلیات محمد صلعم
 سے بھرنا چاہیے۔

توحید باری تعالیٰ کے عقیدے کو جس طرح شیخ اکبر ابن عربی نے پیش کیا ہے اس کی
 مثال کسی دوسرے کے ہاں شاید ہی ملتی ہے۔ توحید الہی کا تصور اس صورت میں جامع ہوگا
 کہ جب اس حقیقت کا وجدان حاصل ہو جائے کہ تنہا اس کی ذات ہے جو اس انجمن نیست و
 نابود میں حقیقت ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ لاشعور ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے بارے میں
 دنیا بھر میں پھیلے ہوئے افکار و نظریات کو شیخ اکبر ابن عربی نے فصوص الحکم میں اس طرح ترتیب
 دیا ہے کہ توحید کا اثبات سامنے آ گیا ہے۔

فصوص الحکم کے تالیف البواب کا ایک جائزہ

پہلا باب "حکمت الہیہ" ہے جس کا تعلق حضرت آدمؑ اور بنی نوح آدم سے ہے۔ اس
 باب کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:-

"جب خداوند بزرگ و برتر نے اپنے اسماء حسنیٰ کے ساتھ کہ جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہ
 چاہا کہ وہ ان صفات کے اعیان و مظاہر کا خود مشاہدہ کرے۔ یعنی آپ اس بات کو یوں بھی
 کہہ سکتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے اپنے عین ظہور کو دیکھا چاہا کسی ایسی مخلوق کے روپ
 میں جو اپنے اندر جامعیت رکھتی ہو اور پورے امر کا حاطہ کر سکتی ہو تو اس نے آدم کو پیدا کیا۔"
 اس پہلے باب میں شیخ اکبر ابن عربی نے انسان کی خلافت اور نیابت پر بحث کرتے
 ہوئے انسان کی اہمیت کو پوری طرح اجاگر کیا ہے کہ وہ اس کائنات میں کیا حیثیت رکھتا
 ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ یوں تو باری کائنات ہی تجلیات خداوندی کا آئینہ
 ہے مگر انسان اس کائنات میں سب سے برتر ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد خداوندی کے

مطابقت حق تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ خدا ہی اول اور وہی منہا ہے۔ اس کے ساتھ وہ بشر کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ انوار و تجلیات الہیہ کا آئینہ ہے اور اس میں خود رب لا یزال نے اپنی روح پھونکی ہے شیخ اکبر ابن عربی لکھتے ہیں :-

”دنیا میں مخلوق تو بہت تھی، لیکن جسے خلافت سے نوازا گیا ہو جو کچھ اس کے حصہ جامعیت میں آئے گا۔ وہ کسی اور کے نصیب میں کہاں؟“

فصوص الحکم میں آئینہ اور صورت کی اصطلاحوں کے حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی نے بڑی مدلل بحث کی ہے اور مسائل تصون کو بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسائل تصون محض فکر و نظر کے ذریعے عقل انسانی حل نہیں کر سکتی۔ ”بلکہ اس کا سر شہ کشف الہی ہے۔“

۴۔ دوسرا باب حضرت شہید علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ جس کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس باب میں انہوں نے کشف الہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ تفصیل سے اس باب میں خاتم الانبیاء کے موضوع پر دلائل دینے میں اور ایک نئی اصطلاح ”خاتم الاولیاء“ کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن عربی لکھتے ہیں :-

”آدم علیہ السلام سے لے کر آخری پیغمبر تک ہر پیغمبر کو حضور خاتم الانبیاء صلعم کے مشکوٰۃ نبوت سے کسب من اللہ الکتاب فیہن کرنا پڑے گا۔ خواہ پیدائش کے اعتبار سے وہ حضور نبی آخر الزمان کا وجود متاخر ہی کیوں نہ ہو۔“

خاتم الاولیاء کی بھی یہی حیثیت ہے کہ اس کی دلالت سے استفادہ کیے بغیر کسی کی دلالت مستحق نہیں ہو سکتی۔

۵۔ تیسرا باب حضرت نوحؑ کے بارے میں ہے۔ اور اس کا عنوان ”حکمت سبحیہ“ ہے اس باب میں وہ ایک بہت چوںکا دینے والی بات لکھتے ہیں :-

”ذات الہی کی تنزیہ اہل حقیقت کے نزدیک تجوید و تقید ہی کی صورت ہے۔“

اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص ذات خداوندی کی تنزیہ کرتا ہے۔ وہ یا تو جاہل محض ہے یا بڑا بے ادب ہے۔ ”حق کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کائنات ارضی و

سادگی کی صورتوں کی تحدید ممکن نہیں ہے تو پھر حق کی تحدید کس طرح ممکن ہوگی۔
ابن عربی فرماتے ہیں کہ اگر تنزیہ کے ساتھ تشبیہ کی رعایت ملحوظ کی جائے اور تشبیہ کو
تنزیہ کا پابند کیا جائے تو پھر عرض گفتگو کا یارا ہو سکتا ہے۔

۴۔ جو مقاباب حضرت ادیس کے بارے میں ہے جس کا عنوان "حکمت قدوسیہ" رکھا
گیا ہے۔ چونکہ حضرت ادیس کی عام شہرت علم نجوم و افلاک اور ہیئت کے زبردست عالم کی
حیثیت سے ہے۔ اس لیے اس باب میں قرآن مقدس کی ان آیات مقدسہ کو موضوع زیر
بحث بنا کر جو حضرت ادیس کی شان میں ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی نے نجوم و فلکیات کی مصطلحات
پر بحث کی ہے۔ اس باب سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم نجوم پر شیخ اکبر ابن عربی کو کتنی دسترس حاصل
تھی۔ شیخ ابن عربی لکھتے ہیں۔

"یہ مقام رفیع و بلند جس پر حضرت ادیس صمکن ہیں سورج کا فلک ہے۔ یہی وہ فلک ہے
جو تمام نظام افلاک کا مدار و محور ہے۔"

وہ ہیں بتاتے ہیں کہ اس فلک شمس کے اوپر بھی سات فلک ہیں اور نیچے بھی۔ یہ فلک
شمس ہے۔ اس کے اوپر جو ہفت افلاک ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ فلک احمر۔ ۲۔ فلک مشتری۔ ۳۔ فلک کیوان۔ ۴۔ فلک منزل۔ ۵۔ فلک اہلس
۶۔ فلک کرسی۔ ۷۔ فلک عرش۔

اس فلک شمس کے نیچے جو سات فلک ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ فلک زہرہ۔ ۲۔ فلک کاتب۔ ۳۔ فلک قمر۔ ۴۔ فلک ایثر یعنی ایقرا۔ ۵۔ کرۃ ہوا
۶۔ کرۃ آب۔ ۷۔ کرۃ خاک۔

اس باب میں شیخ اکبر ابن عربی لکھتے ہیں۔

"عمل سے ارتفاع کا مکان نصیب ہوتا ہے۔ جبکہ علم سے علوم مرتب حاصل ہوتا ہے۔
اُمتِ محمدیہ کو علم و فن دونوں کے اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے دونوں مرتبے اس
کے قدموں کے نیچے ہیں۔"

۴۔ پانچواں باب حضرت ابراہیم کے بارے میں ہے جس کا عنوان انہوں نے "حکمت مہینہ"

نہ رکھا ہے، اس باب کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اس لیے کہا گیا کہ ان تمام صفات کمال کو اپنے اندر سمو چکے تھے

جزواتِ الہی کی خاص صفات ہیں۔

۱۔ چھٹا باب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ہے جس کا عنوان ہے "حکمتِ حقیر"

یہ باب عذاب کے موضوع پر مبنی ہے۔

۲۔ ساتواں باب حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے۔ عنوان "حکمتِ حلیہ" ہے۔ اس باب

میں حضرت اسماعیلؑ کے "صادق الوعدہ" ہونے پر بحث کی گئی ہے۔

۳۔ آٹھواں باب حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ہے جس کا عنوان "حکمتِ نوریہ" ہے

اور اس باب میں نیند اور خواب، خوابوں کی تعبیر اور خوابوں کی حقیقت پر ایک ایسی بحث کی گئی ہے

جو انتہائی پُر مغز ہے۔

۴۔ دسواں باب حضرت ہودؑ کے بارے میں ہے۔ اس کا نام "حکمتِ اجدید" ہے۔

۵۔ گیارہواں باب حضرت صالحؑ کے بارے میں ہے۔ نام "حکمتِ فتوح" رکھا گیا ہے۔

۶۔ بارہواں باب حضرت شعیبؑ سے متعلق ہے۔ اس باب کا عنوان حکمتِ قلبیہ ہے۔

۷۔ تیرہواں باب حضرت لوطؑ کے بارے میں ہے اور اس کا عنوان "حکمتِ ملکیت" ہے۔

۸۔ چودھواں باب حضرت عزیز علیہ السلام سے متعلق ہے۔ اس کا نام "حکمتِ قدریہ"

ہے اور تقدیر کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

۹۔ پندرہواں باب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے جس کا نام "حکمتِ نبویہ" ہے۔ یہ

باب حقیقتِ روح اور حقیقتِ نبوت کے موضوع پر ہے۔

۱۰۔ سولہواں باب حضرت سلیمانؑ سے متعلق ہے۔ عنوان "حکمتِ رحمانیہ" ہے۔

۱۱۔ سترہواں باب حضرت داؤدؑ کے بارے میں ہے۔ عنوان ہے "حکمتِ وجودیہ"۔

۱۲۔ اٹھارہواں باب حضرت یونسؑ کے متعلق ہے۔ عنوان حکمتِ نفیہ ہے۔

۱۳۔ انیسواں باب حضرت ایوبؑ کے بارے میں۔ نام ہے "حکمتِ غیبیہ"

۱۴۔ بیسواں باب حضرت سحیٰؑ کے متعلق ہے۔ عنوان "حکمتِ جلالیہ" رکھا گیا ہے۔

۶۔ اکیسواں باب۔ حضرت ذکریا سے متعلق ہے۔ عنان۔ حکمت پاکیزہ ہے۔

۷۔ بائیسواں باب۔ حضرت ایاس کے بارے میں ہے۔ عنان۔ حکمت الیاسیہ ہے۔ شیخ

اکبر ابن عربی کے نزدیک حضرت ایاس اور حضرت ادریسؑ ایک ہی پیغمبر کے دو نام ہیں۔

۸۔ تیسواں باب۔ حضرت لقمان کے بارے میں ہے جس کا عنان۔ حکمت احسانہ ہے۔

۹۔ چوبیسواں باب۔ حضرت ہارون کے بارے میں ہے اور عنان امامیہ ہے۔

۱۰۔ پچیسواں باب۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں ہے۔ نام۔ حکمت علویہ رکھا گیا ہے

اس باب میں فرعون کے بارے میں شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ اس کی منفرد آخری لمحوں

میں کر دی گئی تھی اور وہ تائب ہو گیا تھا۔

۱۱۔ چھبیسواں باب۔ جسے۔ حکمت حمدیہ کا نام دیا گیا ہے۔ وہ حضرت خالد بن سنان سے

تعلق رکھتا ہے۔ جنہیں سنان نبوت و وحی میں پیغمبر قرار دیا گیا ہے۔ یہ شیخ اکبر ابن عربی کی اپنی

تحقیق ہے۔ وہ خالد بن سنان کی نبوت کو نبوت برزخیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ خالد بن سنان

کا زمانہ حضور نبی کریم صلعم سے یا تو بہت قریبی عہد ہے یا حضرت عیسیٰ اور حضور نبی کریم صلعم

کے ماہین کسی وقت مدت میں ان کا ظہور ہوا ہے۔ بعض اکابر علماء کی رائے میں ان کا زمانہ

حضرت عیسیٰ سے بھی بہت پہلے کا ہے۔

تاریخ و سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ خالد ابن سنان کی اولاد میں سے ایک لڑکی ایک

بار حضور نبی کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضور نبی کریم صلعم نے ارشاد فرمایا۔

خوش آمدید! لے نبی کی بیٹی۔ اس کی قوم نے اُسے ضائع کر دیا۔

تیسواں اور آٹھویں باب حضرت محمد صلعم سے متعلق ہے اور شیخ اکبر ابن عربی نے اس عنان

کا نام "حکمت فدویہ" رکھا ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی حضور نبی کریم صلعم کی حکمت کو حکمت فدویہ سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں

کہ نسل انسانی میں اکمل موجودات حضور کی ہی ذات ہے۔ اس کمال ذات ہی کے سبب امر

الہی کا آغاز بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہوا اور اختتام بھی حضور ہی کی

ذات اقدس پر ہوا۔

فصوص الحکم (یعنی حکمت کے نگینے) علم و عرفان اور وحدت الوجود اور عقیدت رسول اقدس صلعم کا ایک ایسا خزینہ ہے کہ جس سے تاریخ کا دامن و دل مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کے مطالب و مضامین کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔

شیخ اکبر ابن عربی نے اپنی اس عظیم و بے مثل تصنیف میں "من ویزوال" کے سارے راز و نیاز کر دیے ہیں۔ انسان۔ دریاؤں، ناپید انکار کا ایک قطرہ ہے کہ وہ دریا کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ یہی فلسفہ وحدت الوجود ہے!

کشف المحجوب

”کتاب کی تصنیف و تالیف اور جمع کرنے سے سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ مصنف کا نام زندہ رہے اور پڑھنے اور تعلیم پانے والے اس کے لیے دعا کرتے رہیں۔“ یہ الفاظ صاحب کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخشؒ کے ہیں۔ انہوں نے کتاب کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے جو بات کہی ہے اس میں یہ نکتہ بے حد اہم ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ اسے پڑھنے اور اس کتاب کے ذریعے سے تعلیم پانے والے مصنف کے لیے دعا کرتے رہیں۔ یعنی وہ کتاب انسانِ فلاح اور انسان کی ذہنی اور باطنی تربیت کے لیے اتنی مفید اور اہم ہو کہ اسے جو پڑھے اس کے دل سے مصنف کے لیے دعا لکھے کہ اس نے ایسی کتاب تصنیف کی کہ جو انسان کو بھلائی، خیر اور سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشف المحجوب ایسی ہی ایک کتاب ہے جو اس کے مصنف کے اپنے قائم کردہ معیار پر پورا اترتی ہے اور یہ کتاب زمانوں پر حاوی ہے اپنے موضوع پر بے مثل ہے اور سرسبز پھیر ہے جو سدا جاری رہے گا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کا مزار لاہور میں ہے اسی نسبت سے لاہور داتا کی گھر کا کہلاتا ہے اور صدیوں سے یہ مزار مزاج خاص و عام ہے اور صدیوں سے اس کتاب سے لوگوں نے فیض اٹھایا ہے اور ہمیشہ فیض اٹھاتے رہیں گے۔

سید ابوالحسن علی المعروف داتا گنج بخشؒ محمود غزنوی کے دور میں غزنی کے ایک محلے

ہجیر میں ۴۰۰ھ کے ماہ ربیع الاول میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی دینی تعلیم حاصل کرنے لگے اور مختلف مدارج اور منازل طے کرنے کے بعد حضرت ابراہیم الفضل کو پسر طریقت بنایا انہی کے حکم پر تبلیغ و تشہیر اسلام کے لیے عازم لاہور ہوئے۔ آپ نے اکیلے ہی کٹھن اور جاں نسل منزلیں طے کیں اور لاہور پہنچے۔ جہاں اس وقت کوئی اسلام کا نام لیوانہ تھا ایک ویران جگہ پر چھوٹی بنکر ڈیرہ ڈالی دیا اور تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ بلاشبہ ان گنت انسانوں نے آپ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر دین حق کو قبول کیا ان میں لاہور کا نائب حاکم رائے راجو بھی شامل تھا۔ خواجہ انا صاحب کے مزار کے احاطے میں دفن ہے۔ اس کی اولاد ہی مجاہد اور جانشین بنی۔ انا صاحب کی حیات اور ان کے وصال کے بعد ان گنت لوگوں نے آپ سے فیوض حاصل کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین ہشتی نے بھی یہاں احکامات کیا اور وہ شعر کہا جو آج زبانِ نوحام ہے ج

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پر کمال کا مل را رہنا
حضرت داتا گنج بخش کا سن وصال ۴۶۵ھ ہے۔

کشف المحجوب - فارسی زبان میں تصوف پر پہلی کتاب ہے اور تصوف کی کتب میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی دوسری تصنیف یہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخش کے ایک عزیز شاگرد ابو سعید ہجیری آپ سے بسلسلہ تصوف سوالات کیا کرتے تھے۔ انہی سوالوں کے جواب اور وضاحت کے ضمن میں یہ کتاب معرض تخلیق میں آئی اور یہ وہ کتاب ہے جس کو ہر دور کے صوفیاء کرام نے حجازِ تحسین پیش کیا ہے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے تو یہاں تک فرمایا کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کتاب کشف المحجوب کی برکت سے اسے مرشد مل جاتا ہے کشف المحجوب کے قلمی نسخوں اور اشاعت کا احوال بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اسے جے آر بری نے انڈیا آفس لائبریری کی فارسی کتب کی فہرست مرتب کی تھی۔ اس حوالے سے اس کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ موجود ہے جس کا اس فہرست میں یوں اندراج ہے۔

کشف المحجوب - از ہجیری - صفحات ۲۶۷ - لیٹھو۔ مطبوعہ لاہور ۱۸۷۲ء کشف المحجوب کا پہلا اردو ترجمہ مولوی فیروز الدین نے کیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن نے

اس کا پہل بار انگریزی میں ترجمہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ سمرقندی نسخے کی اشاعت ملائید عبدالمجید مفتی بن ملائید عبداللہ مدرس الحنفی نے ۱۹۱۲ء میں کرائی۔ سمرقندی نسخے کے کئی ایڈیشن مختلف ممالک سے شائع ہو چکے ہیں۔

کشف المحجوب کا مستند ترین ایڈیشن روسی ماہر شرعیات والعتین ژوکوفسکی کا مرتب کیا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں ژوکوفسکی کا طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔ ژوکوفسکی نے اسے ترتیب دینے پر کئی برس صرف کیے۔ ۱۹۰۵ء میں کتاب کا متن ترتیب دے کر بعد سات ضمیمہ جات شائع کر دیا۔ آٹھواں ضمیمہ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ مگر روس کے اندرونی انتشار اور سیاسی حالات کی بنا پر اس کی جڑبندی نہ ہو سکی۔ اور یہ منصفہ شہود پر نہ آسکا۔ ۱۹۰۸ء میں ژوکوفسکی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں جب روس میں کچھ امن ہوا تو سوویت حکومت نے ۱۹۱۴ء میں تیار ہونے والے نئے ایڈیشن کو ۱۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو دو صفحات کے پیش لفظ کے اضافے کے ساتھ شائع کر دیا۔ ژوکوفسکی نے کشف المحجوب کے اس نسخے کی تکمیل و تدوین کے لیے متعدد قلمی نسخوں سے مدد لی تھی۔ بہر حال یہ نسخہ مستند ترین تسلیم کیا جاتا ہے۔

کشف المحجوب کے کئی قلمی نسخے لینن گراڈ، سمرقند، تاشقند، لندن، پیرس کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ایل۔ ایس ڈگن نے اس سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ بہت اہم ہے۔

اردو میں جن لوگوں نے کشف المحجوب کا ترجمہ کیا ہے ان میں مولوی فیروز الدین، شاہ ظہیر احمد ظہیری، مخدوم شیدا احمد مصمام، محمد الدین بن منشی میراں بخش مرنگومی، محمد حسین مناظر اور میاں طفیل محمد شامل ہیں۔

کشف المحجوب کی مقبولیت کے بارے میں کچھ لکھنا بے معنی ہو گا کہ اس کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ اس ایک کتاب نے انسانوں کی زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کیے ہیں۔ یہ کتاب فیض و برکت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔

کشف المحجوب کا ایک انتخاب پیش خدمت ہے۔

کشف المحجوب سے اقتباسات

۱۔ جس شخص کو معرفت کا علم نہیں اس کا دل سبب جہالت بیمار ہے۔

- ۛ۔ علم اگرچہ بے عمل ہی ہوا باعثِ عورت اور مشرف ہوتا ہے۔
- ۛ۔ علم اس صفت کا نام ہے جس کے پالینے سے ایک جاہل عالم ہو جاتا ہے۔
- ۛ۔ علم کا ترک کرنا بھی جہالت ہے۔
- ۛ۔ آگ پر قدم رکھنا آسان ہے، علم کی صحیح مطابقت اور موافقت مشکل ہے۔
- ۛ۔ فقیر وہ ہوتا ہے جس کی کوئی چیز نہ ہو۔
- ۛ۔ غمی خدا کا نام ہے، مخلوق اس نام کی مستحق نہیں ہو سکتی۔
- ۛ۔ عورت و حقیقت وہ ہوتی ہے جو بندے کو خدا کے دربار میں حاضر کر دے اور ذلت وہ ہے جو بندے کو خدا سے غائب اور غافل کر دے۔
- ۛ۔ درویش اپنے تمام معانی میں غیر اللہ سے بے تعلق اور تمام اسباب سے بیگانہ ہے
- ۛ۔ جب دل دنیا کے علائق سے آزاد ہو تو اس کی تمام کمورت جاتی رہے گی اور یہ صفت ایک حقیقی صوفی میں ہوتی ہے۔
- ۛ۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے فانی اور حق کے ساتھ باقی ہو۔ تصوف کا حقیقی تقاضا ہے کہ صوفی مشاہدہ ذات حق کے لیے عالم ظاہر اور عالم باطن دونوں میں سے کسی کو نہ دیکھے۔
- ۛ۔ گدڑی پہننا صوفیوں کا نشان ہے نیز گدڑی پہننا سنت بھی ہے مگر آداب فقر کی بجائے آدمی کے لیے گدڑی لازمی شے بھی نہیں ہے۔
- ۛ۔ مشائخ و لوگوں کے طعیب ہوتے ہیں۔
- ۛ۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ملامت کے لیے مخصوص ہوا کرتے ہیں۔
- ۛ۔ تقدیر کا انکار اہل قدر کا مذہب ہے اور معاصی کو اللہ تعالیٰ کے ذمے لگانا اہل جبر کا طریق ہے پس بندہ اللہ کی طرف سے اپنی استطاعت کے مطابق اپنے سب فعل میں مختار ہے۔ اور ہمارا مذہب قدر اور جبر کے درمیان ہے۔
- ۛ۔ باطل پر راضی ہونا باطل ہوتا ہے۔
- ۛ۔ جب مصیبت آتی ہے تو غافل لوگ کہتے ہیں کہ الحمد للہ جسم پر نہیں آئی اور دوستان

اللہ کہتے ہیں کہ الحمد للہ میں پرانی اور دین پر نہیں آئی۔

پ۔ توفیق قبضہ الہی میں ہے۔

پ۔ محبت کو نفاق سے کچھ واسطہ نہیں۔

پ۔ غفلت اس کے دوستوں پر حرام ہے۔

پ۔ جو شخص ہوائے نفسانی سے آشنا ہو وہ خدا تعالیٰ سے جدا ہوتا ہے۔

پ۔ مخلوق کا مخلوق سے مدد مانگنا بالکل ایسے ہے جیسے قیدی سے قیدی مدد مانگے۔

پ۔ ایک سالس عبادت الہی میں بہتر ہے کہ خلقت تمنازی فرمان برداری کرے۔

پ۔ حقیقت میں علم عمل کی نسبت زیادہ بزرگ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کو علم سے پہچان

کئے ہیں عمل سے اسے پانہیں کئے۔

پ۔ دل کے اعمال اعضاء کے اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں۔

پ۔ زبان کی حفاظت کر سچ بولنے سے، نظر کی عبادت کو عبرت حاصل کرنے سے۔

پ۔ دوست دوست کے فرمان کو حقیقہ نہیں سمجھتے اور اس فرمان کا اونے درجہ اختیار

نہیں کرتے۔

پ۔ درویشی کی عروت کو خلقت سے پوشیدہ رکھ۔

پ۔ درویش کی غذا حالت وجد ہے، اس کا لباس تقویٰ ہے اور مسکن غائب ہے۔

پ۔ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے نفس کے عارف، سوان کا شغل مجاہدہ اور

ریاضت ہوتا ہے۔ دوسرے عارف حق، ان کا شغل مجاہدہ اور اس کی عبادت اور

رضا جملی ہوتا ہے۔

پ۔ ثواب حق سے حجاب کا محل ہے۔

پ۔ شوق اور خوف ایمان کے دوستوں میں سے ہیں۔

پ۔ جس نے تمام اشیاء کو اللہ کی طرف سے جانا وہ ہر چیز میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے

نہ کہ چیزوں کی طرف۔

پ۔ محبت سے براہ کر کوئی چیز نازک نہیں۔

- ۛ۔ جب کوئی شخص یوں کہے کہ میں فاضل ہوں یا ولی تو وہ شخص نہ فاضل رہتا ہے نہ ولی۔
- ۛ۔ ولی کرامت سے آپ (رسول کریم) کی نبوت کو بھی ثابت کرتا ہے اور اپنی ولایت کو بھی۔
- ۛ۔ جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا۔ اس کا کلام کم ہو گیا اور اسکی حیرت ہمیشہ کے لیے ہو گئی۔
- ۛ۔ ولی کی طہارت کا طریقہ دنیا کی حیرانی میں تدبیر اور تفکر کرنا ہے۔

ۛ۔ دوست دوست کی بلا سے بھاگا نہیں کرتے۔

- ۛ۔ محبت تو یہ ہے کہ تو اپنے کو بہت تھوڑا جانے اور اپنے دوست کے تھوڑے کو بہت۔
- ۛ۔ ولایت کی شرط سچ بولنا ہے۔ جھوٹا ولی نہیں ہو سکتا۔
- ۛ۔ کرامت کی شرط پوشیدہ رکھنا اور معجزے کی شرط ظاہر کرنا ہے۔
- ۛ۔ عذر کرنا بے گانگی کی شرط ہے اور محبت میں بے گانگی ظلم ہے۔
- ۛ۔ اچھا کلام اگرچہ سخت ہوا اچھا ہوتا ہے۔

ۛ۔ آدمی سامان کی زیادتی سے دنیا دار نہیں ہو جاتا اور اس کی کمی سے درویش نہیں ہو جاتا۔

ۛ۔ شریعت کا رو کرنا الحاد اور حقیقت کا رو کرنا شرک ہے۔

ۛ۔ جب عالم بگڑ جائے تو عبادتِ الہی اور شریعت کے امور میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ جب امیر بگڑ جائے تو انتظامِ معاش بگڑ جاتا ہے۔ اور جب فقیر بگڑ جائے تو مذہب اور اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔

ۛ۔ لقمے کا دوسروں پر ایشا کرنا تو کتوں کا کام ہے۔ مردانِ حق تو اپنی جان اور زندگی ایشا کرتے ہیں۔

ۛ۔ بندہ سوائے مخالفتِ نفس کے حق تعالیٰ کی طرف راہ نہیں پاسکتا۔

ۛ۔ بہشتِ رضائے تاشیر اور دوزخِ اس کے غضب کا نتیجہ ہے۔

ۛ۔ حق کی تدبیر درست ہے اور عواہش کی تدبیر خطا۔

ۛ۔ جیسے مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے حاصل نہیں ایسے ہی مجاہدہ بھی بغیر مشاہدہ کے محال ہے۔

۲۴۲

- ۛ۔ کرامت کا اظہار جھوٹے کے ہاتھ پر محال ہے۔
- ۛ۔ دنی کرامت سے مخصوص ہوتا ہے، نبی معجزہ سے۔
- ۛ۔ علم الیقین مجاہد سے ہوتا ہے۔
- ۛ۔ عین الیقین عارفوں کا مقام ہے، اس لحاظ سے کہ وہ موت کے لیے بالکل مستعد ہوتے ہیں۔

شاہنامہ

”شاہنامہ“ فردوسی کا شمار دنیا کی عظیم ترین رزمیہ شاعری میں ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاہنامہ فردوسی کا وہ عظیم شعری فن پارہ ہے جو بقلے دوام حاصل کر چکا ہے۔ فارسی زبان نے عظیم فن پائے تخلیق کیے ہیں۔ ان میں شاہنامہ کی حیثیت بے حد منفرد ہے۔ شاہنامہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کے بارے میں صدیوں سے لکھا جا رہا ہے اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں شاہنامہ فردوسی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سر جارج ہیٹن کے بارے میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی کے سوانح نگار اور شاہنامہ کے مترجم کی حیثیت سے انگریزی میں جو کام کیا ہے اس کے حوالے سے ساری دنیا میں فردوسی کا شاہنامہ مقبول اور مشہور ہوا۔

فردوسی ایک ایسی شخصیت ہے جسے اس کے اپنے دور میں اختلافی قرار دیا گیا تھا۔ شاہنامہ پر بھی خاصی لے دے جوتی رہی ہے۔ پھر سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کے حقیقی یا فرضی واقعہ کے حوالے سے بھی ایک طویل ترین بحث صدیوں سے جاری ہے۔ فردوسی کی زندگی کے حالات اور نظریات پر بھی خاصی بحث ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں اردو زبان میں حافظ محمود شیرانی نے فردوسی پر گراں قدر کام کیا ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق و تدقیق سے فردوسی کے بارے میں پھیلے ہوئے غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی ایک کتاب ”فردوسی پر چہار مقالے“ کے عنوان سے شائع

ہو چکی ہے۔
شاہنامہ کیسے لکھا گیا۔ اس کی شان نزول بہت دلچسپ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر فردوسی

کی زندگی میں ایک رات نہ آتی تو شاید شاہنامہ کبھی لکھنا نہ جاسکتا۔ فردوسی عجیب طرح کی بے صبری محسوس کر رہا تھا۔ نیند نہ آرہی تھی۔ بیوی کو آواز دی۔ جس نے چراغ لاکر روشن کیا حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:-

العرض چراغ اور چراغ کے ساتھ کسی قدر میوے اور ایک جام شراب بھی لایا گیا۔
کچھ دیر شراب اور موسیقی ساز سے دل بہلایا گیا۔

(فردوسی پر چار مقالے ص ۳)

اس کے بعد فردوسی کی بیوی نے کہا:

- اگر تمہاری خوشی ہو تو دفترِ پاستاں سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم و بزم، فریب اور محبت کے واقعات پر مشتمل اور سنجیدہ اور خود مند لوگوں کے ذکر سے مملو ہے اور جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیز گئیوں پر حیرت ہوگی۔ فردوسی نے اصرار سے کہا:- لے ماہر و آج رات یہ داستان تم حضور سناؤ۔ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہوگا۔ بیوی نے کہا:- میں یہ داستان سنانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم اقرار کر لو کہ سننے کے بعد اس کو نظم کر دو گے۔ فردوسی نے جواب دیا۔ مجھے منظور ہے۔

(فردوسی پر چار مقالے ص ۳)

اس رات فردوسی نے اپنی بیوی سے جو داستان سنی وہ داستانِ بیشرن ہے۔ جس کا ذکر خود فردوسی نے کیا ہے کہ اس نے جس پہلی داستان کو شاہنامہ کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے نظم کیا۔ وہ یہی داستانِ بیشرن ہے۔ یہ داستان اسی زمانے میں شاہنامہ سے پہلے شائع ہوئی۔ مشہور ہوئی اور شاہنامہ کی تکمیل کا محرک بنی۔

دفترِ پاستاں "یا نامہ خسرواں" فردوسی کے زمانے سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی جس میں قدیم ترین شاہانِ ایران کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ بعد میں اس کا اصل نسخہ غائب ہو گیا۔ مگر اس کے اجراء سلامت رہے۔ جنہیں ۳۴۸ ہجری میں ابو منصور العمری نے دوبارہ ترتیب دیا۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض واقعات فردوسی نے دیگر ذرائع سے حاصل کیے۔ لیکن دراصل دفترِ پاستاں ہی شاہنامہ کا اصل ماخذ ہے

فردوسی کو ایک خاص شہرت یہ بھی حاصل رہی ہے کہ وہ اختصار پسندی اور ایجاز گوئی میں کمال رکھتا ہے۔ اس کے ہاں بے جا طوالت دکھائی نہیں دیتی۔ جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو اس کی عمر چالیس اور پچاس برس کے درمیان تھی۔ شاہنامہ مکمل کرنے کے لیے وہ اصل نسخہ دفترِ پاستاں کی تلاش میں سبھارا، ہرات اور مردھچی گیا۔

شاہنامہ کا آغاز کتب ہوا۔ اس سلسلے میں ختمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شاہنامہ کے خاتمے پر فردوسی خود بیان کرتا ہے کہ اس نے شاہنامہ پر ۲۵ برس صرف کیے۔ شاہنامہ ۱۰۰ ہجری میں مکمل ہوا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:-

اس لیے ظاہر ہوا کہ ۳۶۵ ہجری میں شاہنامہ کا پہلا سنگ بنیاد قائم کیا گیا ہوگا۔ اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے۔

لے رنج بروم دریں سال سی

عجم گرم کردم بدیں پارسی

تو ۳۰۰ ہجری شاہنامہ کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہے۔ ۲۸۸ء میں سلطان محمود غزنوی کی

تخت نشینی کے ایام میں جب وہ چھیا سٹھ سال کا ہے۔ لکھتا ہے۔

سخن رانگہ داشتم سال بیت

بداں تا سزا دار این گنج کیست

اس حساب سے ۲۶۸ ہجری پہلا سال ہے۔

(حافظ محمود شیرانی۔ فردوسی پر چار مقالے ص ۱۱)

اس بحث و تحقیق کے بعد حافظ محمود شیرانی ۳۰۰ ہجری کو شاہنامہ کی باقاعدہ ابتدا کا پہلا

سال قرار دیتے ہیں۔

شاہنامہ کے حوالے سے سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کے قصے کو بڑی شہرت ہوئی۔

اسے تاریخ کا ایک اہم حصہ بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک

روایت عنصری سے منسوب ہے کہ عنصری کے حوالے سے فردوسی سلطان محمود غزنوی کے

دربار میں پہنچا۔ محمود غزنوی سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہزار ابیات پہلے سے لکھے ہوئے تھے جن

کے بدلے میں فردوسی کو ایک ہزار طلائی درہم ادا کر دیے گئے۔ بعد میں بادشاہ کا ارادہ بدل گیا کہ ساتھ ہزار اشعار کے عوض ساتھ ہزار طلائی درہم دینے پڑیں گے۔ جب شاہنامہ مکمل ہوا تو اسے چاندی کے ساتھ ہزار درہم بھجوائے گئے۔ فردوسی اس وقت حمام میں مقف۔ اسے رنج ہوا۔ اس نے اسی وقت جس ہزار درہم حمال کو بیس ہزار نفاعی کو اور بیس ہزار درہم لانے والے کو بطور انعام دے دیے۔ بھر متقارب میں بھوکھی۔ سلطان محمود غزنوی کے مقرب ایاز کے حوالے کی اور روپوش ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی کی نگاہ سے وہ بھوکڑی تو وہ طیش میں آ گیا اس نے اس کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر دیا۔

تفصیلی عرضی کی روایت اس سے بالکل مختلف ہے کہ شاہنامہ طوس میں مکمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے کم انعام دیا۔ فردوسی نے اسے بانٹا۔ سو ابیات پر مشتمل بھوکھی۔ طبرستان بھاگ گیا۔ طبرستان کے والی شہر بارے کما کہ تمنا سے آباد اجداد کے کارنامے نظم کیے ہیں اسے تمنا سے نام معنون کرتا ہوں۔ والی طبرستان نے کہا۔ "نہیں اسے سلطان محمود غزنوی کے نام ہی رہنے دو۔ البتہ بھو میں عزیز بنا چاہتا ہوں۔ اس نے ایک لاکھ درہم فردوسی کو بھجوا دیے۔ بھوکو دھو ڈالا۔

ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ انعام اس لیے کم دیا گیا کہ فردوسی سے مذہبی نقطہ نظر کا اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ معتزلی ہے۔

"شاہنامہ" میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں فردوسی نے سلطان محمود کی مدح کی ہے فردوسی سلطان محمود غزنوی کو "ترجمہ پیل" اور "روح جبرائیل" اور "دل دریائے نیل" کہتا ہے۔ حقیقت کچھ یوں ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے شاہنامہ کی تکمیل کی کوئی اخلاقی ذمہ داری قبول نہ کی تھی۔ فردوسی نے اسے کسی بھی سرپرستی اور اعانت کا وعدہ لیے بغیر خود ہی شروع اور مکمل کیا تھا۔ فردوسی مال و دولت کا بھی رسیا نہ تھا۔ بقول حافظ محمود شیرانی فردوسی "غنا، لباس اور بستر" ان تین اشیاء کو ہی ضرورت زندگی سمجھتا تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے خیال میں فردوسی کا یہ اپنا ذاتی رد عمل تھا۔ سلطان محمود غزنوی قصور دار نہ تھا۔

اسی ضمن میں حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "فردوسی پر چارہ مقالے" میں تفصیل سے

بحث کی ہے۔ اس میں ایک مقالہ ”ہجو سلطان محمود غزنوی“ خصوصی مطالعے کی چیز ہے۔ فردوسی پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے عربوں کی فتوحات کا ذکر جان بوجھ کر گھٹا کر دیا ہے۔ اس طرح اسلامی جذبات کو مجروح کیا ہے۔ مذہبی حلقوں میں اس حوالے سے شاہنامہ پر بڑی تنقید ہوئی۔ حالانکہ یہ طرز فکر سراسر غلط تھا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:-

”حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی۔ جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزامات کے عالی شان قعر تعمیر کر لیے گئے۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایران مرحوم کی عظمت اور شکوہ کی افسانہ خوانی کر رہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی۔ جس کا تمام نقطہ نظر ایران بلکہ یوں سمجھو ساسانی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جب قومی فخر و مہابت کا صنم کہہ تعمیر ہو رہا ہے تو پھر دوسری قوموں کے کارناموں کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ جس صورت میں کہ رقابت کی آگ بھی زیر خاکستر ہو... فردوسی صنایع و عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا۔ ساسانی ایران اور کیانی ایران کی مرثیہ خوانی کر رہا تھا۔ وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس معاملے میں اس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی۔“

(فردوسی چار مقالے ص ۱۲۶)

شیخ سعدیؒ نے شاہنامہ کے بارے میں فرمایا ہے

سخن گوئے پیشہ دانائے طوس
کہ آراستہ لہئے سخن چوں عروس

ایک بار امام غزالیؒ نے اتنا لہو و عطر فرمایا۔ ”اے مسلمانو! تم کو وعظ و نصیحت کرتے مجھ کو چالیس برس کا زمانہ گزرا۔ اس دراز زمانے میں جو چند نصیحت میں نے تم کو کی ہے فردوسی نے اس کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے

ز روز گزر کردن اندیشہ کن
پرستیدن دادگر پیشہ کن

اگر اس پر عمل کرو تو پھر تم کو کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں۔“

ساتھ ہزار اشعار پر مشتمل قدیم ایران کی تاریخ کو لکھنے والا یہ عظیم شاعر فردوسی ۳۰۰ ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کا نام منصور تھا۔ حکیم لقب اور ابوالقاسم کنیت۔ طوس کا ایک گاؤں۔ شاداب اس کا مولد ہے اس کا باپ ایک فاضل مذہبی پیشوا تھا۔

شاہنامہ فردوسی سے داستان "ضحاک فریدون"

شاہ جمشید کا قتل ہو چکا ہے۔ ایران کے تخت پر ضحاک جیسا ظالم و ستم گر حکمران بن بیٹھا ہے۔ ضحاک کے دونوں شانوں پر دو سانپ ہیں جن کی غذا انسانوں کے معزز ہیں۔ ضحاک اپنے سانپوں کی پرورش اور زندگی کے لیے ظلم و ستم کی انتہا کر دیتا ہے۔

دو بے گناہ انسانوں کو ہلاک کر کے ضحاک کے شانوں پر موجود سانپوں کی غذا بنا دیا جاتا ہے۔ ایران میں لوگ ضحاک کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ضحاک کو قتل کر کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر سکے۔

ضحاک کا ظلم و ستم اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے۔ اہل ایران یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ضحاک ان کا مقدر بن چکا ہے۔ اس تصور سے وہ اپنی جان کسی طرح نہیں بچا سکتے۔

ایک رات ضحاک ایک خواب دیکھتا ہے۔ اس خواب میں تین افراد دکھائی دیے ان میں دو بڑے اور ایک جوان تھا۔ اس جوان کے ہاتھ میں ایک انوکھا، بھاری اور شاندار گرز تھا۔ اس لوجان نے اس کے ہاتھ پاؤں رینوں میں جکڑ دیے اور اس پر اس انوکھے اور بھاری گرز سے حملہ آور ہوا ہے۔

ضحاک یہ خواب دیکھ کر ڈر گیا۔ خوف کے مارے اس کی چھینیں نکل گئیں۔ اس نے سارے محل کو سر پرائٹھایا۔ سب جاگ گئے۔ ضحاک نے حکم دیا کہ اس وقت سارے شناسوں اور نوجویوں کو حاضر کیا جائے۔ اس خواب نے اس کے چین اور قرار کا خاتمہ کر دیا تھا۔

سارے شناس اور نوجویوں کا اجتماع ہوا۔ ضحاک نے اپنے خواب بیان کر کے حکم دیا کہ اسے اس کی تعبیر سے آگاہ کیا جائے۔ سارے شناس اور نوجویوں نے حساب لگایا۔ غور کیا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔ تین دنوں تک وہ ہال مٹول کرتے رہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس خواب کی

سچی تعبیر سننے کے بعد ضحاک کہیں ان پر ہی ظلم و ستم توڑنا شروع نہ کرے۔ جب ضحاک نے ان کو یقین دلایا کہ وہ سچی تعبیر سننے کے باوجود ان ستارہ شناسوں اور نجومیوں کو کوئی مگر زندہ پہنچائے گا۔ تو انہوں نے اس خواب کی تعبیر بیان کر دی اور کہا۔

بادشاہ۔ فریدون نام کا ایک شخص پیدا ہوگا۔ ایک بہت دودھ دینے والی گائے کے دودھ پر وہ پلے گا۔ وہ طاقت و شہرت میں بے مثل ہوگا۔ اس کے پاس جوانی میں ایک شاندار اور انوکھی شکل کا گرز ہوگا۔ جس کی شکل گاؤں سے ملتی ہوگی۔ وہ تیرے سر پر لے مارے گا اور تجھے ایران کے تخت سے محروم کر دے گا۔

اے بادشاہ۔ تیرے ہاتھوں اس فریدون کے باپ کا قتل ہوگا۔ اور ایک اور آدمی جس کو تم نے بڑی عمر کا اپنے خواب میں دیکھا ہے وہ فریدون کا ساتھی بنے گا۔ جب ضحاک نے اپنے خواب کی یہ تعبیر سنی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو۔ فریدون کو تلاش کیا جائے۔

نجومیوں نے اسے بتایا کہ ابھی فریدون پیدا نہیں ہوا۔ اس کا باپ تیرے ہاتھ سے قتل ہوگا۔ وہ بڑا ہو کر اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے نکلے گا۔

ضحاک کی نیند اڑ گئی۔ وہ شب و روز بے چین رہنے لگا۔ اس کی ایک ہی آرزو تھی کہ کسی طرح فریدون کا پتہ چل جائے اور اسے ہلاک کر کے اپنے انجام سے بچ جائے۔ ضحاک نے اپنے آسمیوں کو فریدون کی تلاش میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ وہ نسل کہاں سے تعلق رکھنے والے جس بچے کو دیکھیں اس کو ہلاک کر دیں۔

فریدون۔ شاہ ظہورث کی نسل میں واحد و تنہا باقی رہ گیا تھا۔ اس کے باپ اور ماں کو ہر دم یہی فکروں رہتی تھی کہ ضحاک کہیں ان کے تخت جگہ کو تلاش نہ کر لے۔ اس خوف کے پیش نظر وہ فریدون کو گھڑ سے باہر لے کر نہ جاتے تھے۔ فریدون ابھی شیر خوار ہی تھا کہ ایک دن اس کے باپ نے اس کی ماں سے کہا کہ اب تو گھڑ میں رہتے رہتے دم گھٹنے لگا ہے۔ کیوں نہ کچھ دیر کے لیے ہم دشت کی سیر کو چلیں۔

قسمت اور ستاروں کا حساب پورا ہوا تھا۔ ادھر وہ جنگل میں پہنچے، ادھر ضحاک کے

وہ آدمی ادھر آنکھوں سے فریڈون کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ فریڈون کے باپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ جس طرح ہو سکے وہاں سے نکل جائے۔ دل گرفتہ اور پریشان خاتون اپنے لخت جگر کو سنبھالے وہاں سے نکل بھاگی۔ فریڈون کے باپ کو آدمیوں نے جکڑا اور اسے ضحاک کے حضور پیش کر دیا۔ ضحاک کو جب معلوم ہوا کہ یہ نسلِ کبان سے تعلق رکھتا ہے تو اس نے اسی وقت اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا۔ یوں خواب کی تعبیر کا ایک حصہ پورا ہوا کہ ضحاک فریڈون کے باپ کو قتل کرے گا۔

فریڈون کی ماں اسے لے کر دور نکل گئی۔ وہ ایک مرغزار میں پہنچی۔ جہاں ایک بزرگ رہتا تھا۔ جس کی ایک گائے تھی جو بہت زیادہ اور بہت شیریں دودھ دیتی تھی۔ اس مرد بزرگ نے فریڈون کی ماں کو پناہ دی۔ فریڈون کو گائے کا دودھ پیٹ بھر کر پلایا گیا۔ رات ہوئی تو اس عورت نے اپنی بے بسی کا ماتم کیا۔ دل میں دوسوسوں نے گھر کیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے پہچان یا گیا تو اس کا بیٹا بھی مارا جائے گا۔ جس طرح سے بھی ہو دل پر جبرانی کا پتھر رکھ کر مجھے اپنے بیٹے کی جان بچانی چاہیے۔ وہ اس بزرگ کے پاس گئی۔ اسے سارا ماجرا سنایا اور درخواست کی کہ وہ اس بچے کو اپنی پناہ میں رکھے۔ اور اس کی پرورش اس گائے کے دودھ سے کرے۔ وہ اگر وہاں رہی تو پتھر ضحاک ستم گر کو سرخ مل جائے گا۔ اور اس کے بچے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ مرد بزرگ نے اسے تسلی دی۔ اس کے شیر خوار بچے کو اپنے سایہٴ معافیت میں لے لیا۔ ماں بے چاری دل پر جبرانی کا پتھر رکھ وہاں سے چلی گئی۔

یوں تین برس کا عرصہ گزر گیا۔ وہ مرد بزرگ فریڈون کو باپ کی شفقت دیتا رہا۔ اسے گائے کے دودھ پر پالا۔ اور اس کی حفاظت کی۔ تین برس کے بعد فریڈون کی ماں کی محبت نے جوش مارا اور وہ اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے اس مرغزار میں پہنچی جہاں وہ اپنے بیٹے کو اس مرد بزرگ کے پاس سوئپ آئی تھی۔ بزرگ نے ماں بیٹے کی ملاقات کرائی۔ اور پھر فریڈون اپنی ماں کے پاس کوہ البرز چلا گیا جہاں اس کی ماں کا ایک مکان تھا۔ ضحاک اور اس کے مخبروں کو فریڈون کی خبر ملی تو وہ مرغزار میں مرد بزرگ کے پاس پہنچے۔

مگر وہاں سے فریدون جا چکا تھا۔ ضحاک نے اس مرد بزرگ کے ساتھ اس گائے کو بھی ہلاک کر دیا۔ جس کا دودھ پنی کر فریدون نے پرورش حاصل کی تھی۔ ضحاک اور اس کے آدمی فریدون اور اس کی ماں کی کھوج میں نکلے۔ فریدون کی ماں کے دل کو دھرکا تو رنگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو کوہ کی چوٹی پر رہنے والے ایک بزرگ کے پاس لے گئی۔ اپنے بیٹے کو اس کے قدموں میں ڈال کر اس نے درخواست کی کہ وہ اس کے بیٹے کو پناہ دے۔ بزرگ نے شفقت سے فریدون کو قدموں سے اٹھالیا۔

ادھر ضحاک اور اس کے آدمیوں نے فریدون کی ماں کے گھر کو تاخت و تاراج کر دیا، لیکن وہ اس چوٹی تک نہ پہنچ سکے جہاں فریدون اس مرد بزرگ کی پناہ میں تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس مرد بزرگ نے فریدون کی ماں سے فریدون کے سامنے کہا۔ یہ لڑکا بڑا نطفہ مند و خوش اقبال ہے۔ یہ ظلم کا سر کھل دے گا۔ فریدون ضحاک کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔ فریدون کی قسمت میں ایران کا بادشاہ بننا لکھا ہے۔ فریدون کی ماں نے فخر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ضحاک نے فریدون کے باپ کو ہلاک کیا تھا۔ اب بیٹا اس کا انتقام لے گا۔ فریدون ابھی بچہ تھا لیکن وہ جوش میں آگیا۔ اس نے ماں سے کہا۔ میں ضحاک کا سر قلم کرنے جاتا ہوں۔ ماں نے اسے سمجھایا کہ بیٹے تو ابھی کم سن ہے۔ ابھی بڑا ہو لے۔ پھر خدا ایسا سامان پیدا کر دے گا کہ تو بھی فوج جمع کر سکے۔ ضحاک کا مقابلہ کر سکے۔ ماں کے سمجھانے بھانے پر فریدون کا جوش کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔

خلق خدا ضحاک سے آزر دہ ہو چکی تھی۔ صبح و شام اس کے سانپوں کے لیے غذا فراہم کرنے کو انہوں کو ہلاک کیا جاتا۔ ضحاک کو ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح فریدون مل جائے وہ اسے ہلاک کر کے اپنے انجام سے بچ جائے۔ اس کے آدمیوں نے اسے خبر کی کہ اگرچہ فریدون ابھی کم سن ہے۔ لیکن ابھی سے وہ بہادری میں بے مثل ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ فریدون کی جان بچانے کے لیے اسے ملک ہندوستان بھیج دیا گیا ہے۔ ضحاک نے ارادہ ہاندھا کہ وہ ایک بھاری فوج جمع کرے اور ہندوستان بھی بھیج کر لے اور فریدون کو بھی تلاش کر کے قتل کر دے۔ اپنی ایساں کی حکومت کو محفوظ رکھنے کے لیے ضحاک نے حکم دیا کہ تمام امیر

غریب ایک محض نامے پر دستخط کریں۔ اس کی وناداری کی قسم کھائیں۔ اس کے بارے میں تحریر کریں کہ وہ عادل و منصف ہے۔ سب امرا اور لوگوں نے اس کے ظلم و ستم کے خوف سے اس محض نامے پر دستخط کر دیے۔

ایک آہن گر بھی وہاں رہتا تھا۔ نام اس کا کاہہ تھا۔ ضحاک کا ارادہ تھا کہ وہ اس کے بیٹے کو ہلاک کرے اور اپنے شانوں پر چھوڑنے والے سانپوں کو اس کی غذا کھلائے۔ کاہہ آہن گر کو علم ہوا کہ بادشاہ اس کے بیٹے کی جان کے درپے ہے تو وہ فریاد لے کر دربار میں پہنچا۔ کاہہ نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ شاہ کو اس کے مظالم سے آگاہ کیا ضحاک نے موقع کے مطابق یہ حکمت عملی اختیار کی کہ کاہہ آہن گر کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس کے بیٹے کو ہلاک نہ کرے گا۔ وہ عادل ہے اور کاہہ آہن گر کو بھی اس محض نامے پر دستخط کرنے چاہیے جب کاہہ آہن گر نے وہ محض نامہ پڑھا۔ اس نے حامدین کو مخاطب کر کے ان کو بزدل قرار دیا۔ اس نے سب کو خوب لعن طعن کی۔ اس محض نامے کو چاک کیا اور اپنے بیٹے کو لے کر اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کاہہ آہن گر فریادوں کے پاس پہنچا۔ اس کا اطاعت گزار ہوا۔ اس کا حامی بنا۔ اس نے لوگوں کو ضحاک کے ظلم و ستم کے خلاف جمع کرنا شروع کیا۔ فریادوں کے لیے ایک فوج ترتیب دینے لگا۔ لوگ جو پہلے ہی ضحاک کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے وہ جوق در جوق اس فوج میں جمع ہونے لگے۔

اس کاہہ آہن گر نے فریادوں کے لیے گلوں گز تیار کیا۔ اس نے آہن گردوں کے پرچم میں تبدیلی کی اور فریادوں کے لشکر کے لیے ایک پرچم تیار کیا۔ جسے درفش کاویانی کے نام سے ابدی شہرت حاصل ہوئی۔ اس پرچم کے نیچے فریادوں کی تاج پوشی ہوئی۔ اس رسم کے بعد فریادوں اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے دعا کرے کہ وہ ضحاک کو ختم کر کے ظلم و ستم کا نشان مٹا دے۔

ضحاک ہندوستان کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ اپنے پیچھے وہ فریادوں کی ہلاکت کے لیے کئی جادوگر اور افسوں کا رجسٹر لگیا تھا کہ اگر فریادوں ایران میں مل جائے تو وہ اسے ختم کر دیں۔ مگر ایک مرد بزرگ و درویش نے فریادوں کو ایسے فسوں سکھا دیے کہ جو ہر ظلم

کارتڑ تھے۔ فریدون تمام غلسمات کو توڑتا ہوا ضحاک کے محل میں پہنچا۔ اس کے خزانے پر قبضہ کیا جو فوج وہاں موجود تھی اس کو شکست دی۔ محل پر قابض ہوا اور اس تخت پر جا بیٹھا جو ضحاک کا تخت تھا۔

ایک شخص جان بچا کر کسی طرح خبر دینے ضحاک کے پاس پہنچ گیا۔ اسے بتایا کہ اس کے محل پر قبضہ ہو چکا ہے اور تخت پر فریدون جا نشین ہو گیا ہے۔ ضحاک کو خوف لاحق ہوا کہ اگر اس کی فوج کو حقیقت معلوم ہو گئی تو وہ بنا دت کر دے گی۔ کیونکہ اب اس کے فوجی بھی اس کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔ ضحاک نے یہ بات پھیلائی کہ اس کے محل میں اس کا کوئی دشمن نہیں گیا بلکہ اس کا ایک فرماں روا دست وہاں بطور مہمان ٹھہرا ہے۔

جب وہ ایران پہنچا تو وہاں اس کی فوج اس سے بد دل ہو گئی۔ ہزاروں سپاہی فریدون کی فوج سے جا ملے۔ ضحاک نے سوچا کہ ایک ہی راستہ ہے کہ وہ چوری چھپے محل میں داخل ہوا اور فریدون کو ہلاک کر دے۔ اس نے رات کی تاریکی میں فصیل پر کت پھینکی اور محل میں جا اتر۔ لیکن فریدون نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنا گاد سرگراٹھایا اور پوری قوت سے ضحاک کے سر پر دے مارا۔ اس کے بعد ضحاک کو ہوش نہ رہا۔ جب فریدون نے دوسری ضرب لگانے کا ارادہ کیا تو غیب سے صدا آئی کہ ابھی یہ زندہ ہے۔ اسے کوہ دماوند کی ایک غار میں لے کر قید کر دو۔ وہاں اڑھے ہیں جو اس کا کام تمام کر دیں گے۔ اس کا یہی انجام لکھا ہے۔ اس ندائے غیب پر عمل کرتے ہوئے فریدون نے ضحاک کو اس غار میں لاپھینکا اور وہیں اس کا کام تمام ہوا۔

فریدون نے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ رعایا کے دل شاد ہو گئے۔ فریدون نے لمبی عمر پائی۔ ایران پر حکومت کی پھر اس نے اپنی حکومت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔

گلستان

شیخ سعدیؒ کو اپنی تصنیف "گلستان" پر خود بھی ناز تھا۔ وہ لکھتے ہیں،

بچہ کار آیدت ز گل طبعے
از گلستان من بسر درتے
گل ہمیں پنج روز و شش باشد
دیں گلستان ہمیشہ خوش باشد

ایک اور جگہ گلستان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"برخے از عمر گر اں مایہ برود خریج کردیم"

شیخ سعدیؒ کی تصانیف میں جو شہرت "گلستان" اور "بوستان" کو حاصل ہوئی ہے وہ فارسی زبان میں لکھی جانے والی چند کتابوں کا ہی مقدر بن سکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلستان اور بوستان مقبولیت اور شہرت کے علاوہ اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اتنی اہم ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسری کتاب پر ترجیح دینا خاصا کٹھن کام ہے لیکن چند ایسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر گلستان کو "بوستان" پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو خود شیخ سعدیؒ کو گلستان بے حد عزیز تھی اور اس پر انہیں سجا طور پر ناز بھی تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی زبان کی شاعری میں "بوستان" سے پہلے بھی ایسی عظیم شعری تخلیقات وجود میں آچکی تھیں جن کی اپنی اہمیت اور شہرت ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا حالی اپنی کتاب "حیات سعدیؒ" میں لکھتے ہیں۔

”فارسی نظم میں ہوتاں کے مساو اور بھی ایسی کتاہیں موجود ہیں جو ہوتاں سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں۔ بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اس سے بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہر آکونی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو۔“

(حیات سعدی - حالی ص ۴۳)

شیخ سعدی کے ایک سوانح نگار اور شارح سرگورادسلی نے لکھا ہے:۔
 ”سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو مشہور ناصح اعینٹس نے لاطینی میں کیا تھا۔ اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم وادب کو شیخ سعدی کا فریفتہ بنائے رکھا۔“
 فارسی زبان میں جن چار کتابوں نے ایران، برصغیر پاک و ہند اور دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی ان میں ”شاہنامہ فردوسی“، ”مثنوی مولانا نے روم“، ”گلستاں دیوان حافظ شیرازہ“ اور ”رباعیات عمر خیام“ کا کوئی سرلیفٹ نہیں، ان کتابوں کی شہرت اور مقبولیت کی اپنی اپنی وجوہات ہیں لیکن ایک خوبی ان سب کتابوں میں مشترک ہے۔ وہ ہے بیان اور اسلوب کی دلآویزی اور سادگی۔

یہ مطالعہ اپنی جگہ بے حد دلچسپ ہے کہ گلستاں کو یہ بے مثل مقبولیت کیسے حاصل ہوئی۔ جبکہ شاہنامہ فردوسی میں رزم و بزم کے شایانہ اور ڈرامائی واقعات ہیں۔ مثنوی تصوف اور اسرار و رموز کا بحر بیکراں ہے۔ حافظ کا دیوان عشق و جوانی اور زندگی کے شدید جذباتی موضوعات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے برعکس گلستاں، ایک تو نثر میں ہے۔ دوسرے اس میں نہ زندگی ہے نہ رزم و بزم کی چاشنی نہ تصوف کے اسرار و رموز۔ یہ سادہ اخلاقی حکایتوں پر مبنی ہے۔ لیکن ان اخلاقی حکایات میں معنی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اگر مجھے اجازت دے دی جائے تو میں ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ گلستاں کا موضوع اس کی حکایات کا جو براہ راست تعلق عوام سے بنتا ہے۔ وہ اس کتاب کی روح ہے۔ یوں تو اس سے ہر عمر اور ہر مزاج کا آدمی مستفید ہوا ہے لیکن ان حکایات میں جو ایک خاص مخاطب اور اپر دچ ہے وہ اس کا طرہ امتیاز ہے۔

وہ عام انسانوں کے دلوں کو چھو لیتی ہے
 - گلستان، نثر میں اخلاقی حکایات کی سب سے عظیم کتاب ہے لیکن شیخ سعدی نے اخلاقیات
 کا درس جس موثر اور دلنشین انداز میں دیا ہے وہ دلوں پر بوجھ نہیں ڈالتا نہ ہی وہ وعظ
 کا رنگ اختیار کرتا ہے۔"

لگ بھگ سات سو برس سے "گلستان" اور "بوستان" دنیا بھر میں پڑھی جا رہی ہے
 ایران اور برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے اسے ابتدائی تعلیم کا جزو بنایا گیا۔ اب بھی اس کی
 یہی اہمیت برقرار ہے۔

- بوستان کے مقابلے میں "گلستان" کے تراجم دنیا کی زیادہ زبانوں میں ہوئے اور
 بار بار ہوئے۔ مولانا حالی "حیات سعدی" میں لکھتے ہیں:-

"گلستان" کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر
 زبانوں کا لباس اس کتاب کو چننا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب
 نہیں ہوا۔ (ص ۷۶)

"گلستان" کے اکثر قطعات و ابیات کا ترجمہ عربی زبان میں شیخ سعدی کی زندگی میں
 ہی ہونے لگا تھا۔ پھر کئی صدیوں تک اس کے مختلف تراجم مختلف ادوار میں ہوتے رہے
 ترکی میں بھی اس کا ترجمہ ابتدائی زمانے میں ہی ہوا۔ اردو، ہندی، گورکھی اور پنجابی۔
 برصغیر کی کتنی ہی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مغرب میں اجینٹس نے سب سے پہلے گلستان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ ڈورائے نے
 فرانسیسی میں اسے پہلی بار منتقل کیا۔ یہ فرانسیسی ترجمہ ۱۶۲۴ء میں پہلی بار پیرس میں
 شائع ہوا۔ ۱۷۸۹ء اور ۱۸۴۴ء میں بھی اس کے دو فرانسیسی تراجم ہوئے جن کے مترجم
 گاڈین اور سیلیٹ تھے۔ جرمنی میں اس کے کئی تراجم ہوئے جن میں اولی اپریس کا
 ترجمہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۶۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے ادراکل
 میں گرائٹ نے بھی گلستان کا جرمنی ترجمہ چھپوایا ہے۔ فوج زبان میں بھی گلستان کا ترجمہ
 ہو چکا ہے۔ انگریزی میں گلستان کے متعدد تراجم ہو چکے ہیں۔ جن میں گائیڈن

SIR ROSS - اور ایڈٹک کے تراجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
 اردو میں میر شیر علی افسوس کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں حصہ نشر کا ترجمہ نشر میں
 اور حصہ نظم کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔
 گجراتی، بنگالی اور بھاشا میں کئی کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

شیخ سعدی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔
 گلستاں، بوستاں، کریا، دیوان غزلیات، مجموعہ قطعات و رباعیات، قصائد
 عربی و فارسی، تاریخ عباسیہ، تاریخ بغداد (آٹھ جلدوں میں)، جزائر افریقہ (چار جلدوں
 میں) کتاب ہیئت، قصوں میں چند رسائل، (شیخ سعدی نے ہزلیات بھی لکھیں،
 جس میں فحش و ہزل درج کمال پر ہے۔)

شیخ سعدی کی حیات اور ان کی تخلیقات پر جو اہم کتابیں لکھی گئیں اور میرے مطالعے
 سے گزری ہیں۔ ان کے لکھنے والوں میں مولانا حالی، شبلی نعمانی، مرزا حیرت دہلوی،
 براؤن، لی جانسن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ سعدی کا نام مشرف الدین تھا۔ بعض روایات میں مشرف الدین بتایا گیا ہے ان
 کا لقب مصلح الدین اور تخلص سعدی تھا۔

شیخ سعدی کی جائے ولادت اور سن پیدائش کے بارے میں بھی اختلاف رائے پایا
 جاتا ہے۔ مورخین اور محققین نے اپنے اپنے انداز میں خاصی تحقیق کی ہے۔ تاہم ان کا
 سن پیدائش ۵۷۵ھ اور ۶۰۶ھ کے درمیان ہے۔ جائے پیدائش میں بھی اختلاف ہے
 بعض شیراز بتاتے ہیں اور بعض طوس بتاتے ہیں جو شیراز کے قریب ہی ایک مشہور قصبہ
 تھا۔ شیخ سعدی کے والد بزرگوار شیخ عبداللہ تھے۔ آباؤ اجداد ملوکوں پہلے عرب سے ہجرت
 کر کے ایران میں آئے تھے۔ شیخ عبداللہ ایک عالم اور صاحبِ طہارت بزرگ تھے ابتدائی
 عمر میں ہی سعدی نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ گھر کا ماحول دینی اور بڑی ہی تھا وہ بھی اس
 رنگ میں سربس گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ سعدی کم عمر ہی تھے دیکھا کہ برس عمر بھی بتائی جاتی
 ہے، اگر ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری

ان کی والدہ محترمہ کے کندھوں پر آن پڑی۔ جو خود بڑی زاہدہ اور عابدہ خاتون تھیں۔ ان کا نام فاطمہ بیان کیا جاتا ہے۔ بوستان میں شیخ سعدی نے اپنی یتیمی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

مرا باشد از در و طفلان خبر
کہ در طفلی از سرگز ششم پدر
من آنکہ سرتا جو در ششم
کہ سر دلہ کنار پدر دہ ششم

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ سعدی نے اپنا پہلا حج اپنے والدین کی صحبت میں کیا تھا۔ ان کے والد محترم حج سے واپس آنے کے بعد فوت ہوئے۔

شیخ سعدی نے جس دور میں ہوش منجمالا۔ یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ تاج و تخت کے دعوے داروں میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شیراز علماء اور فضلا کا مرکز تھا لیکن اس بدامنی نے شیخ سعدی کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ شیراز سے بغداد روانہ ہوئے۔ وہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد بغداد پہنچے۔ اس زمانے میں عالم اسلام کی سب سے بڑی ریگاہ مدرسہ نظامیہ بغداد میں تھی۔ شیخ سعدی مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے اور کئی برس تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ قیام بغداد کے زمانے میں ہی انھوں نے امام ابن جوزی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض اٹھایا۔

شیخ سعدی بغداد سے سیر جہاں کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ بغداد میں کتنے برس رہے۔ کس برس بغداد سے روانہ ہوئے اور کتنا عرصہ سیر و سیاحت میں صرف کیا۔ اس کے بارے میں مستند معلومات حاصل نہیں ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ سعدی جہاں گشت تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت میں صرف کیا۔ وہ درویش تھے، صوفی تھے۔ کسی سے نفرت نہ کرتے تھے۔ سیر و سیاحت کے اس طویل زمانے میں وہ ہر طرح کے لوگوں سے ملے اور ہر طرح کے مقامات پر ٹھہرے۔ اپنی طویل سیر و سیاحت کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

در اقصائے عالم بگشتم بسے

بسر بردوم ایام باہر کے تمتغ زہر گزشتہ یافتہ زہر حزمے خوشہ یافتہ

شیخ سعدی نے اپنے زمانہ سیاحت میں عراق، یمن، عمان، عرب، مصر، شام، فلسطین، برکچک ہند، آرمینیا، حبش، طرابلس، چین، کاشغر، جملہ ایران، خراسان وغیرہ کی سیر کی۔ کئی بار بحری سفر بھی کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں چودہ بار پایادو حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے اہل عام طور پر عام حلقوں اور کچھ پڑھے لکھوں میں بھی یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ شیخ سعدی نے علم چالیس برس کی عمر گزرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ یہ بات سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ سعدی اور حضرت امیر خسرو کی ملاقات ہولی بھتی۔ یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ شیخ سعدی ہندوستان ضرور آئے اور سومات کے مندر میں جانے کا واقعہ بھی وہ بیان کرتے ہیں لیکن امیر خسرو کے ساتھ ان کی ملاقات کا واقعہ بالکل غلط ہے۔

شیخ سعدی جب طویل سیر و سیاحت کے بعد اپنے وطن پہنچے تو ملک میں امن و امان قائم ہو چکا تھا۔ طوائف الملوک کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اپنی بقایا عمر انہوں نے شیراز میں بسر کی۔ وہ عوام خاص کی محبت اور عقیدت کا مرکز بن گئے۔ وہ صوفی تھے اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ "گلستاں" اور "بوستان" سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں ایک حلب میں۔ دوسری صنعا زمین میں۔ ان کی متابعت زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں۔ ایک بیگم سے ان کی اولاد ہوئی۔ سچو بچپن میں ہی انتقال کر گئی۔

آخری عمر میں شیخ سعدی نے شیراز سے باہر ایک زاویہ تعمیر کروایا تھا۔ رات دن وہیں عبادت میں مصروف رہتے۔ بادشاہ اور امراء وہیں سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ شیخ سعدی کی عمر کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ ایک سو دو اور بعض کے نزدیک ایک سو بیس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کا سن وفات ۶۹۱ھ ہے۔

گلستانِ سعدی سے چند حکایات

ایک مصری امیر کے دو بیٹے تھے۔ ایک نے طلبِ علم کی راہ انتخاب کیا اور دوسرے نے جاہ و مرتبے کی۔ نتیجہ یہ نکلا طلبِ علم کی راہ میں نکلنے والا علامہ اور استاد بن گیا اور دوسرا بھائی ترقی کرتے کرتے مصر کا وزیر۔ دولت مند وزیر نے ایک دن اپنے عزیز عالم بھائی سے کہا "فراویکو تو تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میں عاصب منصب اور مالدار ہوں۔ تم قتلِ اعوز ہی بنے رہے۔ عالم نے جواب دیا۔ "میں بھی اپنی اور آپ کی حالت پر غور کرتا ہوں اور جو نتیجہ نکلا ہے وہ سنے کے قابل ہے۔ میں نے پیغمبروں کی میراث حاصل کی اور آپ نے ذرغونہ ہامان کی۔"

سکندر سے لوگوں نے پوچھا کہ مشرق و مغرب کے ممالک تو نے کیسے فتح کر لیے حالانکہ پہلے بادشاہِ خزائن اور عمر، ملک اور لشکر میں تجھ سے کہیں برتر نہ تھے۔ لیکن اتنی عظیم فتوحات ان کو بھی حاصل نہ ہوئیں۔ سکندر نے جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ملک میں نے فتح کیا اس کی رعایا کو میں نے کبھی نہ ستایا۔ پرانے زمانے کی عمدہ اور اچھی رسموں کو بھی منسوخ نہ کیا اور گذشتہ بادشاہوں کو ہمیشہ اچھے انداز میں یاد کیا ہے

نام نیک رفتگار صنایعِ ممکن
"تا بماند نام نیکت برستار"

حجاج بن یوسف کے زمانے میں ایک مقبول حق بزرگ بغداد میں تشریف لائے۔ یوسف بن حجاج نے بھی ان سے استدعا کی کہ وہ اس کے لیے دعا فرمائیں۔ بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، یا خدا، اس کی جان لے لے۔ حجاج نے کہا۔ "حضرت یہ آپ کیا دعا فرما رہے ہیں۔" بزرگ نے فرمایا۔ "اصل میں تمہارے اور تمہاری رعایا کے لیے یہی بہترین دعا ہے تاکہ رعایا تمہارے ظلم سے اور تم اپنے ظلم کی سزا سے بچ سکو۔"

ایک بے انصاف اور ظالم بادشاہ نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ میرے لیے کوئی افضل عبادت تجویز فرمائیں۔ بزرگ نے جواب دیا۔ "تمہارے لیے دوپہر کے ٹھیک سونا سب عبادتوں

سے اچھا ہے۔ تاکہ تم اس وقت تک کسی پر ظلم نہ کر سکو۔“
 لوگوں نے دیکھا کہ ایک لومڑی بڑی گھبرائی ہوئی بھاگتی جا رہی ہے۔ اسے روک اس کے
 اضطراب اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو بولی۔ ”بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ تمام اونٹوں کو بیگار
 کے لیے پکڑا جائے۔ اس لیے جان بچانے کے لیے بھاگ رہی ہوں۔“ لوگوں نے کہا۔
 ”لومڑی تو بھی عجیب ہے۔ بھلا تجھے اونٹ سے کیا نسبت اور اونٹ کی تجھ سے کیا مشابہت
 لومڑی نے جواب دیا۔ ”لوگو! حاسدوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔ اگر کسی حاسد نے بادشاہ
 سے یہ جانگالی کر میں اونٹ کا بچہ ہوں تو مجھے بے گار میں پکڑا جائے گا۔ بھلا بادشاہ سے کون
 کسے گا کہ تحقیق کریں۔ اور اگر تحقیق کا ڈول ڈالا بھی گیا تو جب تک فیصلہ ہو گا میں تو ختم
 ہو چکی ہوں گی۔“

لوشیرداں عادل کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ وہ شکار گاہ میں سخاکر کباب بنانے کے لیے
 نمک کی ضرورت پڑ گئی۔ لوشیرداں نے غلام سے کہا کہ گاؤں جا کر نمک لے آئے۔ لیکن
 نمک کی قیمت ادا کر کے نمک لینا۔ ورنہ گاؤں اجڑ جائے گا۔ غلام نے حیرت سے پوچھا۔
 ”مختصر تمہارا نمک مفت لینے پر بھلا گاؤں کیسے اجڑ جائے گا۔ لوشیرداں نے جواب دیا
 ”مختصر! اس نمک مفت لینے پر بھی بڑا اثر گاؤں پر پڑے گا۔ حزب یاد رکھو کہ دنیا پر پہلے ظلم
 بہت کم کیا جاتا تھا۔ جو کوئی بڑا یا اس نے ظلم میں زیادتی کی اور اب تم دیکھ رہے ہو کہ لذت
 کمان تک پہنچ چکی ہے۔ اگر رعیت کے باغ سے بادشاہ ایک سیب توڑ کر کھالے تو اس کا
 لشکر اور اس کے غلام درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیں گے۔ اگر سلطان ایک انڈہ مفت
 میں کھالے تو اس کا لشکر ہزاروں مرغیوں کو چب کر جائے گا۔“

ایک پہلوان فنی کشتی میں بڑا ماہر اور مشہور تھا وہ اپنے ایک شاگرد پر خاص توجہ دیتا
 تھا۔ اور دوسرے شاگردوں کے مقابلے میں اسے زیادہ داؤ بیچ سکھاتا تھا۔ جب وہ جوان
 شاگرد سب داؤ بیچ کھینچ گیا تو وہ بادشاہ وقت کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ حضور۔ استاد اب
 بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں سب داؤ بیچ جان گیا ہوں اور اس کے مقابلے میں شہ زور اور قوی
 بھی ہوں۔ بادشاہ نے ثبوت کے لیے استاد اور شاگرد کی کشتی کرانے کا فیصلہ کیا۔ کشتی کا دن

مقرر ہوا۔ بادشاہ، امراء اور وزراء کشتی دیکھنے تشریف لائے۔ استاد شاگرد کے مقابلے میں واقعی کمزور ہو چکا تھا۔ محکومہ پھر بھی استاد تھا۔ اس نے ایک ایسا داد استعمال کیا جو اس نے شاگرد کو کبھی نہ سکھایا تھا اور شاگرد کو چت کر دیا۔ بادشاہ نے استاد کو انعام و اکرام سے نوازا۔ شاگرد کو لعنت ملامت کی کہ اس نے اپنے محسن اور استاد کا مقام لینے کی کوشش کی تھی۔ شاگرد نے عرض کیا حضور!۔ استاد پہلوان زور اور طاقت کے بل بوتے پر مجھ پر غلبہ نہیں آیا بلکہ وہ ایک داد استعمال کرنے کی وجہ سے جیت گیا ہے۔ جو اس نے مجھے نہ بتایا تھا۔ استاد پہلوان نے کہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے وہ داد اسی دن کے لیے بچا کر رکھا تھا کیونکہ داناؤں کا قول ہے کہ دوست کو اس قدر طاقت نہ دینی چاہیے کہ دشمن ہو کر تمہیں نقصان پہنچا سکے۔

ایک مرید نے مرشد سے تصوف کی حقیقت پوچھی۔ مرشد نے جواب دیا۔ اب سے پہلے جو لوگ بغاوت پر اگندہ اور باطن جمع تھے انہیں صوفی کہا جاتا تھا۔ لیکن آج جو لوگ ظاہری طور پر جمع اور باطن طور پر اگندہ ہیں۔ وہ صوفی کہلاتے ہیں۔ ایک زاہد کسی بادشاہ کا مہمان ہوا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو زاہد نے چند تھمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ جب نماز کا وقت آیا تو بڑے ظاہری خضوع و خشوع کے ساتھ بڑی لمبی نماز پڑھی۔ تاکہ بادشاہ کے دل پر اس کے زہد کا خاص اثر ہو۔ دعوت سے فارغ ہو کر وہ گھر آئے۔ اور آتے ہی کھانے کا تقاضا کیا۔ کیونکہ بادشاہ کو دکھانے کے لیے جان بوجھ کر بھوکا رہے تھے۔ اس زاہد کے بیٹے نے پوچھا۔ کیا بادشاہ کی دعوت میں کھانا نہ تھا۔ زاہد نے فرمایا۔ تھا تو بہت کچھ لیکن میں نے خود ہی نہ کھایا کہ بادشاہ پر میری نفس کشی کا سکہ جم جائے۔ اسی لیے میں نے نماز لمبی پڑھی تاکہ بادشاہ کے دل پر زہد کا اثر ہو جائے۔ بیٹے نے کہا، آپ اب کھانا کھا کے نماز کی قضا بھی پڑھیے۔ جس طرح وہاں کا کھانا آپ کا پیٹ نہیں بھرسکا۔ ویسے ہی آپ کی نماز بھی اپنا حقیقی فرض ادا نہیں کر سکی۔

حلب کے بازار میں ایک گداگر صدادے رہتا تھا۔

بے دولت مند اگر تمہیں انصاف اور ہمیں قناعت کی عادت بیٹنی تو دنیا سے

رسم سوال ہی اٹھ چکی ہوتی۔

ایک دفعہ میں ایک مکان خریدنے کے لیے دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک سود خور بھی آ نکلا بولا۔ "حضرت یہ مکان بڑا مبارک، بہت عمدہ اور نفیس ہے۔ آپ اسے ضرور خرید لیجیے۔ میں اس مکان کے پاس رہتا ہوں۔ آپ کا پرلوسی ہوں۔ آپ کو ہر طرح کا آرام رہے گا۔ میں نے کہا، معاف کیجیے۔ اس مکان کی بُرائی رکا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم اس کے پاس رہتے ہو۔"

میں دیار بکر میں ایک بڈھے رئیس کا مہمان ہوا۔ اس کی بہت سی دولت اور جائیداد کا وارث اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس بوڑھے رئیس نے مجھے بتایا کہ ہمارے علاقے میں ایک بہت قدیمی درخت تھا۔ جہاں لوگ غلتیں مانتے اور دعائیں مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ میں نے کسی راتیں اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر دعائیں مانگی تھیں۔ تب جا کر میری مراد پوری ہوئی اور لڑکا پیدا ہوا۔ مگر اب سن ہے کہ صاحبزادہ اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ مجھے بھی وہ درخت دکھاؤ۔ اس کا پتہ بناؤ تاکہ میں دعا کروں کہ میرا بوڑھا باپ جلد ہی مٹھکانے لگ جائے۔"

ایک امیر زادہ اپنے باپ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا ایک درویش زادے سے بڑے فخر سے کہہ رہا تھا۔ "ذرا دیکھو تو میرے والد کی قبر کتنی شاندار ہے، کتنی مضبوط ہے، کتبہ کتنا عالی شان اور مضبوط ہے کیسا پختہ فرش بنا ہے۔ ایک تمباکے باپ کی قبر ہے کہ بس دو اینٹیں رکھ دیں اور مٹی ڈال دی گئی۔ درویش زادے نے کہا: بات تو ٹھیک ہے۔ مگر قیامت کے دن جب سب امیر و غریب کا بلاوا آنے کا تو جب تک آپ کے والد محترم اس پختہ قبر کو کھڑے رہتے رہیں گے۔ میرے والد محترم آرام سے مٹی ہٹا کر حساب کتاب سے فارغ ہو کر بہشت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔"

ایک بادشاہ کسی شدید الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے دعا کی اللہ تعالیٰ مجھے اس الجھن سے نجات دے۔ میں تیری راہ میں ایک خطیر رقم زاہدوں میں تقسیم کر دوں گا۔ جب بادشاہ کی وہ الجھن رفع ہو گئی تو اس نے رقم اپنے غلام دے کر کہا جاؤ اور جا کر زاہدوں

میں تقسیم کر دو۔ غلام واپس آیا تو رقم اس کے پاس جوں کی توں موجود تھی۔ بولا۔ جہاں پناہ میں نے بہت تلاش کی۔ مگر اس رقم کو لینے والا مجھے کوئی نہیں ملا۔ بادشاہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ یہ جھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو اس شہر میں چار سو زاہد رہتے ہیں۔ غلام نے دست بردستہ عرض کی۔ حضور جو زاہد ہیں وہ تو درپہ چھپتے نہیں اور جو زاہد نہیں ہیں ان کو میں نے روپیہ دیا نہیں۔“

حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کو دیکھا گیا کہ آپ کعبۃ اللہ کے منگ ریزوں پر سرکھے ہوئے کہہ رہے تھے، الہی، مجھے اپنی رحمت سے بخش دیجئے۔ اگر بخشش کے قابل نہ سمجھیں تو قیامت کے دن نابینا اٹھائیں تاکہ نیکیوں کے سامنے شرمساری نہ ہو۔

ایک درویش نے جنگل میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ ایک دن وہاں بادشاہ کی سواری آ نکلی۔ درویش نے بادشاہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ کے پندار کو بڑی تکلیف ہوئی کہ ایک معمولی انسان نے اسے سلام تک نہیں کیا۔ اس نے وزیر کو اشارہ کیا۔ وزیر نے درویش سے کہا۔ اے درویش کتنے افسوس کا مقام ہے کہ بادشاہ وقت تیرے سامنے ہوا اور تو اسے سلام نہ کرے اس کی تعظیم کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو۔

درویش نے جواب دیا۔ ”وزیر صاحب، بادشاہ سلامت کو بتائیے کہ وہ سلام و تعظیم کی امید اس سے رکھیں، جسے ان سے مال و دولت کی توقع ہو۔ پھر انہیں سمجھائیے کہ بادشاہ رعایا کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اس لیے اس کی بندگی کی جائے۔“

بادشاہ درویش کا کلام سن کر خوش ہوا اور بولا حضور کچھ طلب فرمائیے۔ درویش نے جواب دیا، بس اتنا کہم کیجئے کہ پھر دوبارہ اگر تکلیف نہ دیجئے گا۔ بادشاہ نے کہا۔ کوئی رخصیت فرمائیے۔“

درویش نے کہا۔ ہاتھ میں دولت ہو تو نیکی کا ڈیرہ کیونکر یہ دولت و حکمرانی ہاتھوں ہاتھ چلی جاتی ہے۔ یہ دغا دار نہیں۔“

مثنوی

مثنوی مولانا نے روم کے بارے میں عقیدے کی حد تک کہا جاتا اور تسلیم کیا جاتا ہے کہ

بہت قرآن در زبان پسلمی

یوں رومی نے کسی کتاب میں لکھیں۔ جن میں ان کا دیوان جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے لگ بھگ پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک تصنیف 'فیہ ما فیہ' بھی ہے جس کا ترجمہ اردو میں عبدالرشید تبسم نے کیا ہے۔ لیکن جو شہرت اور ابدیت رومی کی مثنوی کو حاصل ہوئی۔ وہ دنیا میں بہت کم کتابوں کا مقدر رہی ہے۔

"کشف الظنون" کی روایت کے مطابق مثنوی کے اشعار کی تعداد ۲۶۶۶ ہے۔ چہنچہ

دفر نامکمل رکھا اور رومی نے لکھا ہے

باقی آیں گفتہ آید بے گماں

در دل ہر کس باشد نور جاں

بہت لوگوں نے کوشش کی کہ نامکمل کو مکمل کریں۔ مگر ناکام رہے۔ رومی بیماری

سے صحت یاب ہوئے تو خود اس کو پورا کیا۔ مثنوی کا ایک ساتواں دفتر بھی ہے جس کا مطلع ہے۔

اے ضیا الحق حسام الدین سعید

دولت پائندہ عمرت بر مزید

مولانا شبلی نے رومی کی سوانح میں لکھا ہے۔

”شیخ اسماعیل قیصری جنہوں نے مثنوی کی بڑی شغنیہ شرح لکھی ہے۔ ان کو اس دفتر کا ایک نسخہ ۸۱۴ء کا لکھا ہوا ہوتا آیا۔ انہوں نے تحقیق اور تنقید کی ثوابت ہوا کہ خود مولانا کی تصنیف ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے سامنے اس کا اظہار کیا۔ اس پر تمام اربابِ طریقت نے مخالفت کی اور اس کی صحت پر بہت سے شبہات وارد کیے۔ اسماعیل نے ان تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب لکھا۔ اب تمام شام دروم میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ دفتر بھی مولانا نے روم ہی کے نتائج طبع سے ہے۔

(سوانح مولانا روم۔ شبلی نعمانی ص ۶۰)

بہر حال اب بھی مثنوی کے ساتویں دفتر کو مشکوک و غیر مستند سمجھا جاتا ہے۔ سلاطین میں آلِ سامان اور سلطان محمود کو یہ ذوق پیدا ہوا کہ ان کے آباد اجداد یعنی شاہانِ عجم کے کارنامے نظم کیے جائیں۔ تاکہ شعر کی صورت میں لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔ اس بنا پر مثنوی کی صنف وجود میں آئی۔ جو واقعات تاریخی کے ادا کرنے کے لیے اصنافِ نظم میں سب سے بہتر صنف تھی۔ (شبلی نعمانی سوانح مولانا روم ص ۷۷) اس کے بعد مثنوی کے موضوعات میں تبدیلیاں ہوئیں۔ فرید الدین عطار کی مثنویا تصدیق سے لبریز ہیں جہاں الدین چلی نے مولانا رومی سے درحزارت کی کہ وہ بھی فرید الدین عطار کی مثنوی ”منطق الطیر“ کی طرز پر مثنوی لکھیں۔ رومی نے کہا کہ انہیں خود یہ خیال آچکا ہے اور چند اشعار اسی وقت موزوں کر دیے۔ جن میں وہ مطلع بھی ہے جو مثنوی مولانا نے روم کا سراغ دیا ہے۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

پہلا دفتر مکمل ہوا۔ ادھر حسام الدین چلی کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہ سوگ میں ڈوب گئے اور مولانا رومی سے اصرار جاری نہ رکھ سکے۔ دو برس کے بعد وہ پھر مُصر ہوئے تو رومی نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ دوسرے دفتر کا آغاز ۶۶۲ھ میں ہوا۔ چھٹا دفتر زیر تصنیف تھا کہ رومی بیمار ہوئے۔ عام روایت یہی ہے کہ چھٹے دفتر کو پورا کرنے کی نوبت نہ آئی۔

رومی کا نام محمد اور لقب جلال الدین تھا۔ عرف مولانا نے روم ۶۶۱ھ میں بلخ میں پیدا

ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد محترم سے حاصل کی۔ پھر سید برہان الدین سے جو ان کے والد کے شاگرد خاص تھے۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی کہ تونہ منتقل ہوئے۔ سات برس دمشق میں بھی رہے۔ مولانا نے روم کی زندگی کا پہلا دور وہ ہے جب وہ فتوے دیتے۔ وعظ کرتے اور سماع سے پرہیز کرتے تھے۔

ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ شمس تبریز سے ان کی ملاقات ہے۔ حضرت شمس تبریز سے ان کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی۔ اس سلسلے میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے بہر حال کہا جاتا ہے کہ یہ ملاقات ۶۴۲ھ میں ہوئی۔ ایک روایت ہے کہ روم، ایک تالاب کے کنارے کتابیں لیے محو مطالعہ تھے کہ شمس تبریز اُدھر آئے۔ علم پر بات ہوئی تو شمس تبریز نے کتابیں پانی میں پھینک دیں۔ رومی اس نقصان پر تاملائے تو شمس تبریز نے تالاب سے کتابیں دوبارہ اس حالت میں نکال دیں کہ وہ خشک تھیں۔

مولانا روم کے ایک شاگرد سپہ سالار نامی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس ملاقات کے بعد چھ ماہ تک دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں حلیہ کشی کرتے رہے مناقب العارفین میں یہ مدت تین ماہ بتائی گئی ہے۔ اب مولانا روم میں ایک تغیر پیدا ہوا۔ ظاہر داری اُٹھ گئی۔ سماع سے لطف اندوز ہونے لگے۔ درس و تدریس، وعظ و کلام کا سلسلہ ترک کر دیا۔ شہر میں شورش مچا ہوئی کہ ایک درویش ان کو درغلا کر راہِ راست سے ہٹا رہا ہے۔ رومی کو لمحے بھر کے لیے بھی حضرت شمس تبریز کی جدائی گوارا نہ تھی۔ شہر میں شورش برپا تھی۔ حضرت شمس تبریز کو یہ بدامنی گوارا نہ تھی وہ ایک دن چپکے سے کمپن چلے گئے۔

ان کے فراق کا درد رومی کو اس حد تک ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سب سے قطع تعلق کر لیا۔ حتیٰ کہ مریدان خاص سے بھی کنارہ کر لیا۔ مدت گزرنے کے بعد شمس تبریز نے دمشق سے ان کو خط لکھا۔ اب اہل شہر کا ایک وفد حضرت شمس تبریز کو منانے کے لیے دمشق روانہ ہوا۔ رومی نے منظوم خط ان کے ہاتھ روانہ کیا۔ حضرت شمس تبریز وفد کی گزارش اور رومی کی خواہش کے احترام میں تونہ چلے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت شمس تبریز نے مولانا روم کی پروردہ ایک کینز سے شادی کر لی۔ جس کا نام کیمیا بتایا جاتا ہے۔

حضرت شمس تبریزی کے لیے رومی نے ایک خیر اپنے مکان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ رومی کے ایک صاحبزادے علاؤ الدین چلیپے تھے۔ جو رومی سے ملنے آتے تو اس خیمے سے ہو کر گزرتے۔ حضرت شمس تبریزی کو یہ حرکت ناگوار گزری۔ منع کیا۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ علاؤ الدین چلیپے۔ رومی کے صاحبزادے نے ایک بار پھر حضرت شمس تبریزی کے بارے میں افواہوں کا بازار گرم کر دیا۔ قونیہ کے لوگ پھر برا فوجتہ ہوئے۔ حضرت شمس تبریز چاہک غائب ہو گئے۔ رومی تلاش کر دیا۔ خود تلاش میں نکلے لیکن حضرت شمس کا کچھ نشان نہ ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شمس تبریز رومی کے پاس قونیہ میں ہی تھے۔ مولانا روم کے مریدوں نے ان کو قتل کر دیا۔ نغمات الانس میں مرقوم ہے کہ حضرت شمس تبریز کو قتل کرنے میں خود مولانا روم کے صاحبزادے کا ہاتھ تھا۔

مولانا روم، بجز فراق میں تڑپنے لگے۔ حضرت شمس تبریزی کی جدائی وہیں گھر سے نکلے تو راہ میں صلاح الدین زکوب کی دکان آگئی۔ وہ چاندی کے ورق کوٹ رہا تھا۔ ورق کوٹنے والی ہتھوڑی کی آواز نے سماع کا اثر کیا۔ وہی مولانا روم پر دھڑلاری ہوا۔ زکوب نے رومی کی یہ حالت دیکھی تو وہ ورق کوٹتے چلے گئے۔ بہت چاندی صنایع ہوئی۔ جب مولانا روم ہوش میں آئے تو صلاح الدین زکوب نے وہیں کھڑے کھڑے دکان نشادی اور مولانا روم کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ تو بیکس تک صلاح الدین زکوب سے صحبت رہی۔ مولانا روم نے صلاح الدین زکوب کی مدح اور شان میں غزلیں بھی کہیں ہیں۔

مطربا اسرار مارا باز گو
قصہ ہائے جاں فزا را باز گو
چوں صلاح الدین صلاح جان مست
آں صلاح جاں ہارا باز گو

اب مولانا روم کے مریدان دشاگرد صلاح الدین زکوب سے حسد کرنے لگے کہ وہ ان پڑھ اور جاہل ہے مگر مولانا روم نے اسے اپنا رکھا ہے۔ مولانا روم نے اس مخالفت کی کوئی پروا نہ کی اور اس تعلق کو قائم رکھا۔ ۶۶۲ھ میں صلاح الدین زکوب

کا انتقال ہو گیا تو حسام الدین چلیپی جو مولانا نے روم کے معتد خاص تھے۔ انہیں اپنا ہدم و ہراز بنا لیا۔ یہی حسام الدین چلیپی ہیں جن کی درخواست پر مولانا نے روم نے مثنوی لکھنی شروع کی مولانا روم کا انتقال ۵ جمادی الثانی ۷۷۲ھ کی شام کو ہوا۔ صبح جنازہ اٹھا۔ ایک دنیا معنی جو جنازے کے ساتھ اشکبار جا رہی تھی۔ یہودی اور عیسائی بھی رو رہے تھے۔ ہزاروں لوگوں نے کپڑے بچھاڑ ڈالے۔ قونیہ میں ان کا مزار ہے۔

آج تک فارسی کی کسی کتاب کو وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جو مثنوی مولانا نے روم کو حاصل ہے۔ ہر دور میں اس کی ضخیم شرحیں لکھی گئیں۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے خالق اور مثنوی پر ان گنت کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان گنت عظیم شعرا نے اس سے فیض اٹھایا ہے۔ جن میں علامہ اقبال بھی ہیں۔

مثنوی کے بارے میں یہ دعوے ابھی کیا جاتا ہے کہ یہ قرآنی تعلیمات کی تفسیر ہے اور اسی لیے اس کی ایک مذہبی اور دینی حیثیت ہے۔ انتہائی دقیق اور نازک موضوعات کے باوجود اس کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ مثنوی میں روایات اور حکایات بھی ہیں دراصل ان کے پردے میں بہت کچھ کیا گیا ہے۔ مثنوی ہی میں مولانا نے روم کا یہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرنے والا یہ شعر ہے۔ جو مثنوی پر پورا اترتا ہے

خو شتر آں باشد کہ سر دلبراں

گفتہ اکید در حدیث دیبکراں

مثنوی میں جو روایات و حکایات ملتی ہیں۔ ان کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔
"جو اگرچہ فی الواقع غلط ہیں۔ لیکن اس زمانے سے آج تک مسلمانوں میں بڑا حصہ ان کو مانا آتا ہے۔ مولانا ان روایتوں سے بڑے بڑے نتیجے نکالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو نکال دیا جائے تو مثنوی کی عمارت بے ستون رہ جاتی ہے۔" (سوانح مولانا نے روم ص ۱۵۰)

مثنوی معنوی کا ایک انتخاب اور تلخیص

صحرائے جانوروں اور شیر میں معاہدہ ہوا کہ شیر جانوروں کا شکار نہ کرے گا اور اس کی دنا

کی خوراک اسے پہنچا دی جائے گی۔ معاہدہ پر عمل درآمد کا پہلا دن ہی آیا تو جو خرگوش شیر کی خوراک بننے کے لیے آنے والا تھا۔ دو گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا۔ شیر نے خشکی کا اظہار کیا تو خرگوش نے عرض کیا کہ وہ تو وقت پر ہی روانہ ہوا تھا۔ لیکن راستے میں ایک دوسرے شیر نے روک لیا۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر میدان تک پہنچا ہے۔ شیر نے دوسرے شیر کی موجودگی اور اس حرکت کو اپنی توہین سمجھا اور خرگوش سے کہا کہ چل اور مجھے اس شیر کے پاس لے چل۔ خرگوش شیر کو کنویں کے پاس لے گیا۔ شیر نے کنویں میں جھانکا تو پانی میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ وہ اسے اپنا مرین اور دشمن شیر سمجھا۔ بچہ کر حملہ آور ہوا اور کنویں میں کود کر مر گیا۔

عکس خود را او عددے خویش دید
 لاجرم بر خویش شمشیر کشید
 اے بسا عیبی کہ بینی در کس
 خوں تو باشد در ایشان لے فلان
 اندر ایشان تاختہ ہستی تو
 از نفاق و ظلم و بد مستی تو
 آں تویی داں زخم بر خود می زنی
 بر خود آں دم تار لعنت می تنی
 در خود ایس بد را منی بینی عیاں
 در نہ دشمن بودہ خود را جہاں
 حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد
 ہچو آں شیرے کہ بہ خود حملہ کرد

گاؤں کے ایک بڑا آدمی مؤذن سے اہل گاؤں بہت تنگ تھے۔ لوگوں نے ان سے چپٹکارا پانے کے لیے روپے جمع کر کے ان کے سپرد کیے کہ وہ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے چلے جائیں۔ مؤذن سفر پر روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک گاؤں آیا۔ جہاں مسجد تھی۔ مؤذن نے اذان دی۔ اذان کے تھوڑی دیر بعد ایک عجیبی شیرینی اور کپڑے لے کر آیا اور مؤذن کے

نذر کیے۔ وجہ پوچھی تو بتائے لگے کہ اس کی ایک بیٹی ہے۔ عاقل و بالغ، نیک طبع وہ مذہب اسلام کی طرف راغب تھی۔ بہت قائل کرنے کی کوشش کی پر نہ مانی۔ بہت سمجھا یا گیا مگر ایک نہ سنی۔ آج مؤذن کی یہ اذان سنی تو پوچھنے لگی۔ یہ کیسی مسکروہ آواز ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمانوں کا شعار ہے کہ عبادت سے پہلے اذان دیتے ہیں۔ اس نے یقین نہ کیا جب اسے یقین دلایا تو وہ سلام سے متغیر ہو گئی ہے۔ اس لیے میں مؤذن کے لیے شیرینی اور کھٹے لے کر آیا ہوں کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکا۔ ان کی بدولت ہو گیا۔

مثنوی مولانا نے روم کے اشعار کا ترجمہ،

عشق جو رنگ و آب سے ماؤس ہے

وہ عشق ہرگز نہیں اک رنگ ہے

عشق اس سے کہ جس سے بقا ط

اس سے کہ جو شراب جانفزا پلاتا ہے

ذات باری تعلق کے ثبوت میں مثنوی کے چند اشعار کا ترجمہ،

قلم کھ رہا ہے لیکن ہاتھ دکھائی نہیں دیتا

سوار کا پتہ نہیں لیکن گھوڑا دوڑ رہا ہے

ہر سمجھ دار یہ یقین رکھتا ہے کہ

جو چیز حرکت کرتی ہے اس کا کوئی حرکت دینے والا ضرور ہے

تم اس کے اثر کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے

تو اس کے اثر کو محسوس کر کے سمجھ جاؤ۔

بدن جو حرکت کرتا ہے جان کی وجہ سے کرتا ہے۔

تم جان کو نہیں جان سکتے

تو بدن کی حرکت سے جان کو جانو

لیک آرجنیدین تن حیاں بدیاں

گر چکے نیت ایں ترتیب چلیت

ادل نگر ہے پھر عمل ہے۔ عالم کی افتاد اسی طرح کی ہے۔ دیوار اور چھت کی صورت جو معمار کے خیال کا سایہ ہے۔ صورت جس چیز سے پیدا ہوتی ہے اس کی خاص صورت نہیں ہوتی۔ جس طرح آگ سے دھواں۔ بے صورتی سے تم کو حیرت پیدا ہوگی کہ سیکڑوں قسم کے آلات، بیڑا کہ کیونکہ پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس علت سے معلولی کو کچھ مشابہت ہے۔ کوٹھے پر کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ ان کا سایہ زمین پر پڑ رہا ہے۔ وہ لوگ جو چھت پر ہیں گویا افکار و فکر ہیں اور عمل گویا ان کا سایہ ہے۔

جسم ظاہر اور رُوح پوشیدہ ہے۔

جسم گویا آستین ہے اور جان گویا ہاتھ۔

پھر عقل رُوح سے بھی زیادہ مخفی ہے۔

کیونکہ جس رُوح کو جلد دریافت کر لیتی ہے۔

تم کسی چیز میں حرکت دیکھ کر یقین کر لیتے ہو۔

کہ وہ زندہ ہے۔

لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ اس میں عقل بھی ہے۔

عقل کا یقین اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے جسم سے موزوں

حکمتیں سرزد نہ ہوں۔ اور یہ حرکت جو مس ہے۔ عقل کی وجہ سے سونا نہ بن جائے۔

جب مناسب اعمال سرزد ہوتے ہیں تو

تمہیں یقین ہوتا ہے کہ اس میں عقل بھی ہے۔

اے دوست، عالم رُوح جہت سے منزہ ہے۔

تو عالم رُوح کا خالق اور بھی منزہ ہوگا۔

آفتاب کی روشنی کے علاوہ آفتاب کے وجود کی۔

اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

سائے کی کیا ہستی ہے کہ دلیل آفتاب بن جائے

اس کے لیے یہی بہت ہے کہ وہ آفتاب کا غلام ہے۔

حضرت موسیٰ کا ایک جگہ سے گزر رہا تو ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے "اے خدا تو کہاں ہے۔ تو مجھے ملتا تو میں تیرے بالوں میں کنگھی کرتا۔ تیرے کپڑوں سے جوئیں نکالتا۔ تجھ کو مزے مزے کے کھانے کھلاتا۔" حضرت موسیٰ اطمینان میں آکر اسے سزا دینے کے لیے بڑھے تو وہ بھاگ گھڑا ہوا۔ حضرت موسیٰ پر وحی آئی۔

مولانا نے روم کے الفاظ میں ہے

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
 بندہ مارا چرا کردی جدا
 تو برائے وصل کردن آمدی
 یا برائے فصل کردن آمدی؟
 ہر کسے را سیرتے بنیادہ ایم
 ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
 در حق او مدح و در حق تو ذم
 در حق او شہد و در حق تو سم
 موسیٰ! آداب دانان دیگرا ند
 سوخته جاں درد دانان دیگرا ند
 در درون کعبہ رسم قبلہ نیست
 چہ غم از خواص پاچہ نیست
 عاشقان را ہر زمانہ عشرت نیست
 بردہ دیراں عراج و عشرت نیست
 خون شہداں از آب روی تراست
 ای گناہ از حد ثواب اولی تراست
 قلت عشق از ہمد قلت جداست
 عاشقان را ملت و مذہب خداست

چار افراد سفر میں یکجا ہوئے۔ ایک رومی، ایک عرب، ایک ترک، ایک ایرانی۔ کسی نے ان چاروں کو ایک سکہ دیا۔ ایرانی بولا۔ "اس کے انگوٹھنگواؤ۔" عرب نے کہا۔ "اس سے عنب خریدو" ترک بولا۔ "اس کا روزم لو۔" رومی نے کہا۔ "سکے کے عوض اٹنا خیل لو۔" چاروں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے۔ اس لیے جھگڑنے لگے۔ مولانا نے روم اس حکایت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی ایسا شخص ہوتا جو زبان دان ہوتا تو وہ ان کے سامنے انگوٹھا رکھ دیتا۔ کیونکہ وہ اپنی اپنی زبان میں سب انگوٹھا ہی کہہ رہے تھے اور ان میں جھگڑا کبھی نہ ہوتا۔

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک

نقش ہائینی بروں از آب و خاک

پانی میٹھا ہو یا کڑوا۔ دونوں کا رنگ صاف ہوتا ہے۔

بھڑا اور شہد کی مکھی دونوں ایک پھول کو چوستی ہیں۔

لیکن اس سے فیسق اور اس سے شہد پیدا ہوتا ہے۔

دونوں قسم کے ہرن گھاس کھاتے اور پاتی پیتے ہیں۔

لیکن اس سے میٹگنی اور اس سے مُشک پیدا ہوتا ہے۔

ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے سُجھل اور حسد پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا آدمی جو کھاتا ہے اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے۔

یہ پاک زمین ہے اور وہ شور۔

یہ فرشتہ ہے اور وہ شیطان

شیریں اور تلخ سمندر طے ہوئے ہیں۔

لیکن دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔

جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔

کھرے اور کھولے روپے کی تمیز کسوٹی کے بغیر ممکن نہیں۔

نیک اور بدکار کی صورتیں ملتی جلتی ہیں۔

آنکھیں کھولو تو تمیز ہوگی۔
 جس شخص کے دل میں لطف حق ہے۔
 اسی کے لیے پیغمبر کا چہرہ اور اس کی آواز معجزہ ہے۔
 جب پیغمبر باہر سے آواز دیتا ہے۔
 تو اس شخص کا دل اندر سے سجدہ کرتا ہے۔
 لکھنے کے لیے سادہ کاغذ تلاش کیا جاتا ہے۔
 بیچ اس زمین میں ڈالا جاتا ہے جو بن لہری ہوتی ہے۔
 ہستی نیستی میں دکھائی سجاتی ہے۔
 دولت مند فقیروں پر سخاوت کا استعمال کرتے ہیں۔
 تم جس دن سے کہ وجود میں آئے۔
 پہلے آگ یا خاک یا ہوا تھے۔
 اور تمہاری وہی حالت قائم رہتی۔
 تو یہ ترقی کیونکر نصیب ہوتی۔
 بدلنے والے نے پہلے ہستی بدل دی۔
 پھر اس کی جگہ دوسری ہستی قائم کر دی۔ اسی طرح
 ہزاروں ہستیاں بدلتی چلی جائیں گی یکے بعد دیگرے۔
 یہ باقی قائم نے فنا کے بعد حاصل کی ہے۔ پھر فنا سے کیوں جی پھرتے ہو۔
 ان فناؤں سے تمہیں کیا نقصان جواب بقا سے چمٹے جاتے ہو۔
 جب دوسری ہستی پہلے سے بہتر ہے تو فنا کو ڈھونڈو اور انقلاب کشندہ کی پرستش
 کرو۔

تم سینکڑوں قسم کے حشر دیکھ چکے۔ ابتداءئے وجود سے اب تک۔
 تم پہلے جمادات تھے پھر تم میں قوت نو پیدا ہوئی۔ پھر تم میں جان آئی۔
 پھر عقل و تمیز۔ پھر جو اس جُملے کے علاوہ بھی کچھ جاسے۔

جب فنا میں تم نے یہ بقا دیکھی تو پھر جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو۔
نیا لو اور پرانا چھوڑ دو۔ (مازہ می گیر و کسن رامی سپار)
کیا کوئی لکھنے والا کوئی 'تخریر' محض تخریر کی غرض سے لکھے گا۔؟
نہیں بلکہ پڑھنے کے لیے لکھے گا۔
دنیا میں کوئی معاملہ اپنے لیے آپ نہیں کیا جاتا۔
بلکہ اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ ہو۔

دیوان

فارسی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود میں نے حافظ کے دیوان کو کئی بار پڑھا ہے اور اس کی شرحوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ حافظ کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت حد تک نظر سے گزرا ہے اس کے باوجود میرے لئے یہ ایک دلچسپ مطالعہ رہا ہے کہ وہ حافظ جس کی شاعری ہستی، دنیا کی ناپائیداری اور زندگی کی عظیم ترین نمائندہ شاعری ہے۔ اس کا دیوان کن وجوہات کی بنا پر ایک طویل عرصے سے فال نکالنے کے کام آ رہا ہے۔

حافظ ایک سرسخت اور زند شاعر تھے۔ علامہ اقبال نے ان کی شاعری کے تباہ کن اثرات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی ذہن میں رکھئے اور پھر میری طرح سوچنے کی کوشش کریں کہ وہ کون سے اسباب، عناصر اور عوامل ہیں جنہوں نے حافظ شیراز کو "سان ایغیب"، کار تیر بھی دے رکھا ہے۔ یہ دلچسپ عقدہ حل ہو یا نہ ہو۔ لیکن حافظ کی شاعری کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جو اس کی عالمگیر شہرت اور شعری اہمیت کی غمازی کرتا ہے۔

فارسی زبان کے بڑے شاعروں میں حافظ، فردوسی، فرخ سمدی اور عریضام ایسے شاعر ہیں جن کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے جن کے تراجم دنیا کی بڑی زبانوں میں ملتے ہیں جن کا کام دنیا کے عظیم تخلیقی کار ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جن کی شہرت ابدیت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ذہنوں اور بڑے لکھنے والوں کے علاوہ کئی نسلوں کو ان فارسی شعراء نے متاثر کیا ہے اور رہتی دنیا تک ان کا کام آنے والی نسلوں کو متاثر کرتا رہے گا۔ ان کی حیثیت محض تاریخی یا دستاویزی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ہاں زندگی کے وہ عناصر وہ پہلو انسانی نفسیات کا مشاہدہ اور شعر کا وہ لازوال متاثر کرنے والا حسن پایا جاتا ہے جو زندگی کی طرح ہے۔ جاری و ساری رہنے والا، ولوں کو ہمیشہ چھونے والا۔۔۔۔۔۔

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

”تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہو سکتا کہ خواجہ حافظ کے حالات زندگی اس قدر معلوم ہیں کہ تشنگانِ ذوق کے لب بھی تر نہیں ہو سکے۔ اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اس کی سوانح عمریاں لکھی جاتیں کہ اس کی تصویر کا ایک ایک خدو خال آنکھوں کے سامنے آجاتا لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا۔ ان سب کو جمع کر دیا جائے تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہو کر نظر نہیں آتا۔ جس قدر تذکرے ہیں۔ سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں اور وہی چند واقعات ہیں۔ جن کو بہ اختلاف الفاظ میں نقل کرتے آئے ہیں۔“

(شعرا لجم، حصہ سوم، ص ۱۱۷)

خواجہ حافظ شیراز کے جو حالات میسر ہیں۔ وہ مختصر اور جہ ہیں۔ حافظ کے دادا اصغران کے مصافات کے رہنے والے تھے۔ شیراز منتقل ہوئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ حافظ کے والد کا نام بہا الدین تھا اور وہ تاجر پیشہ دولت مند انسان تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو تین بیٹے اور بڑا بچہ چھوڑا۔ لیکن بیٹوں میں سے کوئی بھی کاروبار تجارت کو نہ چلا سکا اور حالات بگڑ گئے خواجہ حافظ نے بچپن میں ایسی غربت دیکھی کہ ان کی والدہ نے انہیں فاقوں سے بچانے کے لئے غلے کے ایک آدمی کو سو روپے دیا کہ وہ خواجہ حافظ سے خدمت لے اور اس کو معاوضے میں روٹی دے لکھتے ہیں کہ وہ شخص بد طریق اور بد اطوار تھا۔ خواجہ حافظ نے ہوش سنبھالتے ہی اس سے تعلق توڑا۔ اور خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔ پاس ہی مکتب تھا۔ ول میں پڑھنے کا شوق اٹھا۔ خمیر سازی سے جو حاصل ہوتا۔ اس کا ایک حصہ اپنی والدہ اور اپنے خرچ کے لئے رکھتے، دوسرا حصہ مکتب میں دے دیتے اور تیسرا خیرات کر دیتے۔ یوں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ مکتب میں ہی انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا اور کچھ معمولی پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا۔

شیراز اس وقت شعر و سخن کا گورا تھا۔ غلے میں ایک شاعر تھا جس کے ہاں شعر و سخن کی غنچیں گرم ہوتی تھیں۔ حافظ بھی اس سے متاثر ہوئے اور یوں شاعری کا آغاز ہوا۔ وہ شخص جس کا شمار آنے والے زمانوں میں دنیا کے بڑے شاعروں میں ہونا تھا۔ اس کی شاعری کا آغاز یوں ہوا کہ وہ طبع موزوں نہ رکھتا تھا اور جوائنٹ ٹلٹ اور لٹو کرتا۔ اس پر لوگ اس کا مذاق اڑاتے خواجہ حافظ

اہل شیراز کے لئے ایک مذاق بن گئے۔

”مذکروں میں ہر قوم ہے کہ دو برس یونہی گزر گئے، جب لوگوں کے استہزائیں اور اہانت آمیز بیانیے کی انتہا ہو گئی تو خواجہ حافظ کو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے مذاق تضحیک اور اہانت کا نشانہ بننے موئے ہیں سکتے ہیں کہ وہاں بابا کو پی کا ایک مزار تھا حافظ وہاں گئے اور بہت روئے، اسی رات انہیں خواب میں ایک بزرگ دکھائی دیئے جو انہیں ایک لغت کھلاتے اور کہتے ہیں اب تم پر سارے علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ جناب علیؑ ہیں۔

حافظ صبح اٹھے تو ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے یہ

دوش وقت سحر از غصہ سنجہ تم دادند

وندراں ظلمت شب آب جیاتم دادند

اس غزل کے ساتھ ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ کئی امتحانوں سے گزرنا پڑا کہ لوگ شک کرتے تھے کہ یہ خود ایسا کلام نہیں کہہ سکتے۔ کسی سے لکھواتے ہیں۔ بہر حال ان کی شہرت اب پورے ایران میں پھیلنے لگی اور پھر سرحدوں کے پار تک پہنچ گئی۔

حافظ شیراز کے زمانے میں شیراز میں کئی بار حکومتیں تبدیل ہوئی۔ ان میں سے شاہ ابواسحاق کا ذکر بطور خاص ضروری ہے۔ اس کے دور میں شیراز ایک ایسا خطرناک تھوڑا سا تھا۔ جہاں شراب و عیش نے گھر گھر ڈیرے ڈال دیئے۔ شاہ ابواسحاق انتہا کا عیش پسند تھا۔ خواجہ حافظ کی شاعری پر اس دور کا اثر بہت گہرا ہے۔ ۷۷۰ھ میں محمد مظفر نے شیراز پر لشکر کشی کی۔ فوجیں شہر پناہ کے اندر تک داخل ہو گئیں۔ لیکن شاہ ابواسحق عیش و عشرت میں مگن رہا اور کوئی اسے یہ خبر بد سننے کی جرأت نہ دکھتا تھا کہتے ہیں کہ امین الدین جو اس کا خاص مقرب تھا۔ اس نے شاہ ابواسحاق سے کہا حضور ہمارے شہر کو چمنستان بنا دیا ہے۔ آئیے درانظارہ تو کیجئے ابواسحق نے باوجود غصے پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف دشمن کی فوجیں دکھائی دیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ جب بتایا گیا کہ دشمن کا لشکر ہے تو شاہ ابواسحق نے کہا کیسا احمق ہے۔ ایسے موسم میں وقت ضائع کر رہے پھر یہ شعر پڑھا اور بالانسانے سے نیچے اتر آیا۔

بیاتایک امشب تماش کنیم

چو فردا غنود فسکیر فردا کنیم

محمد مظفر نے شہر فتح کیا۔ شاہ ابواسحق قتل ہوا۔ حافظ کو شاہ ابواسحق کی ہلاکت کا شدید صدمہ ملا

نظف کے حکمران ہوتے ہی تمام میکدے بند کروا دیئے اور عقیب آگئے۔ خواجہ حافظ کا ردعمل اس غزل میں ملتا ہے۔

اگرچہ بادہ فرح بخش دبا و گلبریز است
یہ بانگ چنگ بخورے کہ عقیب تیر است
فداستین مرقع پیار پینہاں کن
کہ چچو چشم صراحی زمانہ فو نیز است
زرنگب بادہ بیستونید خرقہا از شک
کہ موسم درع و روزگار پر ہیز است

دیوان میں ایک غزل جس کا مطلع یوں ہے۔

بود آیا کہ در میکدہ ما بکشت اند؛
گرہ از کار فریبست ما بکشت اند

اسی زلمنے کی یادگار ہے۔ اس دور کے بعض دوسرے حافظ کہ ہم عصر شاعروں نے بھی میکدوں کے خاتمے اور عقیبوں کے ظلم کا اپنی شاعری میں اظہار کیا ہے۔ لیکن جس انداز میں خواجہ حافظ نے اسے باندھا ہے اس نے اسے آفاقی تاثیر کا حامل بنا دیا ہے۔ بہر حال عہدِ نظف کے بعد شاہ شجاع کا دور آیا تو میکدے پھر کھل گئے اور نئے خواروں کو آزادی مل گئی۔ دیوانِ حافظ میں ایک غزل ایسی ہے جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے مطلع ہے۔

گمزدہ باقت غنیمت رسیدہ مزوہ گوشت
کہ دور شاہ شجاع است می و میر خوش

اسی غزل کا مطلع ہے جو مزب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا عرض

لیکن... ایک فقیہہ خواجہ عماد تھے جن کی شاہ شجاع بڑی تکریم کرتا تھا۔ یہ خواجہ عماد بھی دلچسپ آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بلی سدھا رکھی تھی کہ جب خواجہ عماد نماز پڑھتے تو یہ سدھائی ہوئی بلی بھی ان کی تقلید کرتی۔ خواجہ حافظ کو ایسی ریاکاروں سے ہمیشہ سے چڑھ رہی تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک غزل لکھی جس میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

اے ایک خوش غرام کہ خوش می روی بناد
عزہ مشکو کہ گریہ عابد مناز کرد

بس یہیں سے فقہیہ شہر اور سلطان شہر نے خواجہ حافظ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ شاہ شجاع نے ایک بار حافظ کو طلب کیا اور محقر کے انداز میں کہا۔ آپ کی غزل ہموار نہیں ہوئی ایک شعر میں تصنیف ہے۔ دوسرے شعر میں سے پرستی تیسرے میں شاہد بازی..... خواجہ حافظ نے جواب دیا۔ ان سب خامیوں کے باوجود میری غزلیں میری زبان سے نکل کر دنیا میں پھیل جاتی ہیں۔ جب کہ دوسرے شاعروں کا یہ حال ہے کہ ان کے اشعار شہر کے دروازے تک نہیں پہنچ پاتے۔ شاہ شجاع جو خود بھی شعر کہتا تھا جل جہنم کہہ گیا۔ خواجہ حافظ کے ایک شعر کے حوالے سے فقہیہ اور سلطان شہر نے ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ قیامت کے منکر ہیں یا کم از کم اس میں شک کرتے ہیں۔ خواجہ حافظ نے یہ مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔

حافظ کی شاعری اور طرز زلیست سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ زند اور آزاد انسان تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ وہ شادی شدہ تھے۔ ان کی اولاد بھی تھی۔ ایک بیٹا شاہ نعمان تھا جس نے برہان پور رہندوستان آکر رہائش اختیار کی اور یہیں انتقال کیا۔

شاہ شجاع کا انتقال ۷۸۳ھ میں ہوا۔ اس کے بعد منصور بن محمد مظفر بلخشاہ ہوا جس نے امیر تیمور کا جان بولا کہ بڑی شجاعت سے مقابلہ کیا۔ میدان میں ہلاک ہوا۔ اور شیراز امیر تیمور نے فتح کر لیا۔

کہتے ہیں کہ امیر تیمور نے حافظ شیراز کو بلا کر کہا۔ میں نے ایک عالم کو اس لئے تاخت و تاراج کیا کہ اپنے وطن سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ ادھر تم ہو کہ ان کو ایک تل کے بدلے دے رہے ہو امیر تیمور کا اشارہ حافظ کے اس شعر کی طرف تھا۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بنجال ہندویشن سہم قند و بخارا را

حافظ نے جواب دیا تھا۔ ایسی ہی فضول جزی کی وجہ سے تو فقر و فاقہ کی نوبت پہنچی ہے۔

حافظ اب ایک ایسے شاعر تھے جن کا کلام دنیا میں پھیل رہا تھا۔ ان کا ایک شعر ہے

ہر شعر و حافظ شیرازی گویندوی قصد

سچہ پشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

خواجہ حافظ کے دور کے اکثر سلاطین اور حکمرانوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ خواجہ حافظ شیراز کو اپنے دربار سے متعلق کر لیں حافظ کو کئی سلاطین اور حکمرانوں کی جانب سے دعوتیں ملیں۔ ان کا بھی جی چاہا کہ وہ بعض سلاطین کے دربار سے منسلک ہو جائیں لیکن وہ گنگے کسی کے پاس نہیں۔ اصل میں رکن آباد کی خاک ان سے چھوٹی نہ تھی

بہی ذہند اجازت میرا بہ سیر و سفر
نیرم باد مصنےا و آب رکن آباد

اصلی خواجہ کو بہت محبوب تھا۔ یہیں ۷۹۳ھ میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں ان کو دفن کیا گیا۔ غلام معانی نے جو سلطان بابر بہادر کا معتد خاص تھا۔ حافظ کا مقبرہ تعمیر کرایا جو اب تک قائم موجود ہے۔ انہی کے نام کی نسبت سے اس جگہ کو اب 'حافظیہ' کہا جاتا ہے۔ یہاں تب سے اب تک ایک طرح سے میلے کا سماں بندھا رہتا ہے۔ لوگ وہاں جاتے، دربار لیس کرتے ہیں اور مزار کی زیارت کرتے ہیں۔

بر سر تریبت ماچوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت کہہ رندان جہاں خواہ بود

دیوان حافظ، انتخاب اور کچھ اشارے

خواجہ حافظ شیراز کی زندگی و شاہد بازی کی بے مثل شاعری میں کیٹا اور عالم میں مشہور ہوئے وہ بڑے خوش الحان واقع ہوئے تھے۔ قرآن مجید حفظ تھا اور اس پر بہت فخر کرتے تھے کہ ان کو قرآن کا فہم حاصل ہے۔

ندیدم خوشتر از شغرتو حافظ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

کہتے ہیں کہ حافظ کا یہ معمول تھا کہ وہ بڑے جمعہ کی رات کو مسجد کے منصورہ میں ساری رات خوش الحانی سے تلاوت قرآن پاک کیا کرتے تھے۔

حافظ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ تاہم تمام شعری اصناف میں ان کا کلام ملتا ہے۔ فارسی میں غزل کے ہانی شیخ سعدی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ امیر خسرو نے اسے آگے بڑھایا۔ بھی کے بعد سلمان ساؤچی، خواجہ محمد رفیع، کاہلوی اور کمال چغتایا۔

عزل میں اس سے پہلے یہ اندازِ سرسستی، جوش نہ تھا، نہ ہی حافظ سے پہلے غزل کا دامن مضموعات کے اعتبار سے اتنا متنوع تھا۔ ناقدوں نے کہا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ تاریخ اتنا بڑا عزل گو پیدا نہیں کر سکی۔

حافظ کی شاعری کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے بارے میں پوری امتیاط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جس فلسفہ اور طرزِ حیات کو پیش کرتے ہیں۔ وہی فلسفہ ہے جسے صدیوں پہلے یونانی فلسفی اپنی قورس نے پیش کیا تھا۔ یعنی خوش عیشتی کا فلسفہ اس ضمن میں حافظ کے کچھ اشعار سے

عید است ساقیا قلعے پر شراب کن

دور فلک درنگ ندارد و شراب کن

بنوش بادہ کہ ایام غمم نخواہد ماند

چشاں نمائند چہنیں نیست ہم نخواہد ماند

خوشتر از فکری و جام چہ خواہد بودن

چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

ای کہ بازلف درخ یار گزاری شب روز

فرقت باد کہ خوش عیشتی دلمے داری

مسند یہ گلستاں بر شاہد و ساقی را

لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

زاہد و عالم کے ہاں جو ریاضت پائی جاتی ہے اس کا انکشاف اور اس پر طنز۔ فارسی شاعری کی ایک روایت رہی ہے لیکن خواجه حافظ نے اسے جس شدت اور بے باکی سے باندھا اور پیش کیا ہے وہ امنی کا حصہ ہے۔ خواجه حافظ کے کلام کا یہ حصہ بطور خاص بہت اہمیت رکھتا ہے چند اشعار اس حوالے سے دیوان سے پیش ہیں۔

گر چہ بر واعظ منہرائیں سخن آساں نہ نشود

تاریا و رزدو سالوس، سلمان نہ نشود

بانہ نوشی کہ دو بیچ ریائے نہ بود

بہتر از نہد فروشی کہ در و روی دریا ت

من از پیرمفاں دیدم کرامت ہائے مردانہ
 ایں کہ دلتی ریائے رابہ جامی ودغی گیرد
 بادہ بہ غلبہ شہرہ نوبختی زہنہار
 کہ خورد با تو می و منگ بہ جام اندازد
 زاہد شہرچو مہر ملک و شخسہ گزید
 من ہم از مہر نگار سے بگریم چہ شود
 ایں خرقہ کہ من دارم قدر مین شرب اولی
 دیں دختر بے ملتی عرق سے ناب اولی

دیوان سے انتخاب

ذیل میں حافظ کے دیوان سے کچھ اشعار پیش ہیں حافظ کا انتخاب آسان کام نہیں ان اشعار کے حوالے سے ان کا رنگ خاص اور موضوعات کا تنوع بہر طور کسی حد تک سامنے آجائے گا۔

پدرم روضہ رضواں بزد و گندم بفرودخت
 ناظمت بانتم اگر من بہ چومی نقر و ششم
 واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند
 قول ماینز ہمیں است کہ او آدم نیست
 صوفیاں جملہ حریف اند نظر بازو لے
 زان میاں حافظ سودہ رده بدنام افتاد
 عاشقان بندہ ارباب امانت باشد
 لاجرم چشم گیر با ہماں است کہ بود
 مشاطہ را جمال تو دیوانہ می کند
 کائینہ را خیال پر ہی خانہ می کند
 اعتماد سے نیست بر دور جہاں
 بلکہ برگرہ دون گرہاں نینہ ہم

بدہ ساقی می دانی کہ در جنت نہ خواہی یافت
 کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلّا را
 مے صنباگر بہ جوانان چمن باز بسی
 خدمت از ما برساں سرو گل بریمان ما
 نہ سم اں قوم کہ برد و کشاں می خوانند
 در سرکار طراہات کنند ایمان را
 ہر چہ ہست از خاصت ساز بنے اندام است
 در نہ تشریف تو بالای کس کوتاہ نیست
 فرصت نگہ کہ فتنہ در عالم او افتاد
 عارف بہ جامہ زود از غم گراں گرفت
 میان گریہ می خندم کہ چون شمع اندرین مجلس
 زبان آتشیم بست لیکن در نمی گیرد
 من و انکار شراب این چو حکایت باشد
 غالباً این قدم عقل کفایت باشد
 شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد
 زویم بر صحت زنداں او بر چہ بادا باد
 درد مندان بلا نہ ہر ہلاہل نوشند
 قتل این قوم خطا شد ماں تا نہ کنی
 مرادند ازل کار سے بجز زندگی نافر موند
 ہر آن قسمت کہ آں جاشد کم وافر دل نخواستند
 برق عزت کہ چنین می جہانز پرہ غیب
 تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کم
 در نماز خم ابروی تو ام باد آمد
 طالتے رفت کہ شراب بہ فر باد آمد

بادہ موز غم مخور و پند متقلد مشن
 اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن
 می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد
 شراب ابروی تو حضور من از من
 گریچہ پیریم تو شے تنگ در آغو شتم گیر
 تا سحر کہ ز کنار تو جواں بیریشم
 سوز آہ سیدہ سوزان من
 سوخت ای افسردگانِ حنم را
 بیاتان گل بر افشانیم دے در ساغر اندازیم
 فلک در سستف بشکافیم و طرح نود اندازیم
 ساقی یہ نور بادہ ویر افروز جبارم ما
 مطرب بگو کہ کار جہاں نند بکلام ما
 مادہ پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
 اے بے خبر نلذت ثنرات شراب ما
 ساقیا بر خیز و دودہ جام را
 خاک بر سر کن غم ایام را
 عاقبت منزل ما دادی خلد تان است
 حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز
 مژغدا کہ عارف و سالک یکن گفت
 در میرزم کہ بادہ فروش از کجا شنید
 من ترک عشق بازی دساغر زنجی کنم
 صد بار تو بہ کردم و دیگرہ معنی کنم
 گدائے میکہ ام بیک وقت مستی ہیں
 کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

زان پیشتر کہ عالم فانی شود خراب
 مارا بہ جام بادہ نگلوں خراب کن
 مئی دو سالہ و محبوب چارہ دو سالہ
 ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر
 دو یار زیرک فاذ بادہ کن مینے
 فراغتی و کتابے و گوشہ بیچنے
 من این مقام بہ دنیا و آخرت ندوم
 کہ چہ در پیہم افتند خلق اسبچنے
 نفس بادہ صبا مشک نشان خواهد نند
 عالم پیر و گر بارہ جواں خواهد شد
 ہر کس کہ برید چشم او گفت
 کہ محبتے کہ مست گیر و
 قاش می گوئیم و از گفتہ خود دلشادم
 بندہ عشقم داز بر دو جہاں آزادم
 ترسم کہ صرفہ نہ بر دروز بازخواست
 نان حلال شیخ ز آب حرام ما
 بیار بادہ نخور زان کہ پیر بیکدہ دوش
 بے حدیث غفور و رحیم و رحمان گفت
 در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست
 ای بادشاہ حسن سخن یا گدا بگو
 گر چہ بد نامی است نزد عاقلان
 مانجی خواہیم ننگ و نام را
 ہزار بکتہ در دین کار و بار ولاری است
 کہ نام آن ز لب و لعل و خط ز نگاری است

کرشمہ کن کہ بازار ساحری بشکن
نہ غم زہ رونق بازار سامری بشکن
برباد وہ سرودستار عالمے یعنی
کلاہ دگوشہ بہ آئین دلبری بشکن
چہ سالی شد زلف منیل از دم باد
تو تیش بر سر زلف عنبری بشکن
گر دبا از عنزہ دلدار تابیے بر دبرد
در میاں جان و جانان مایہ لٹے رفت رفت

یوٹوپیا

منفکوں، علما اور شاعروں، ادیبوں، مصلحوں، رہنماؤں، فلسفیوں اور دانشوروں کی ہمیشہ یوٹوپیا ہی رہی ہے کہ انسان جس دنیا میں جنت سے نکالا جانے کے بعد آباد ہوا ہے۔ یہ دنیا ایک مثالی دنیا بن جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں انسان ایک دوسرے کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ایک دوسرے کے کا دکھ بانٹ سکیں۔ اور اس دنیا میں ایک ایسی حکومت، ایک ایسا نظام قائم ہو جائے جو انسانوں کی فلاح اور بہبود کے تمام تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔ اس آرژو، اس خواہش کی تکمیل کے لیے صدیوں سے انسان جدوجہد کر رہا ہے اور صدیوں سے دنیا کے بڑے اور خلاق ذہن لکھ رہے ہیں۔ انسانی دنیا کو جنت بنانے کا خواب جن لوگوں نے دیکھا ان میں ایک مقامس مور بھی تھا جس کی کتاب 'یوٹوپیا' کو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اپنے موضوع کی وجہ سے اس کتاب کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کی اشاعت کے بعد سے اب تک اس کو ان گنت انسان پڑھ چکے ہیں اور ہمیشہ اُسے پڑھتے رہیں گے۔ اس کتاب کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔

مقامس مور کی اپنی زندگی بہت دلچسپ، تجربوں سے بھرپور اور ڈرامائی تھی۔ پھر جس طرح وہ اپنے انجام کو پہنچا اس کی وجہ سے بھی مقامس مور کو ابدی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ مقامس مور شاعر بھی تھا اور مفکر بھی تھا۔

مقامس مور جس عہد میں پیدا ہوا وہ انگلستان کی تاریخ کا ایک اہم ترین دور ہے۔

یورپ میں نشہ نشانیہ کا آغاز ہو گیا تھا۔ امریکہ اسی دور میں دریافت ہوا۔ چھاپرخانہ کو فروغ ہوا۔ کتابیں چھپنے لگیں۔ صنعتی آلات میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ برطانیہ میں جاگیرداری دور اپنے اقصیٰ کو پہنچ رہا تھا۔ اور ہنزی ہشتم اپنی تمام تر برائیوں اور تضادات کے باوجود بعض ایسے اقدامات بھی کر رہا تھا جنہوں نے برطانیہ پر بالخصوص اور ساری دنیا پر بالعموم بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ ہنزی ہشتم نے برطانوی کلیسا کو پاپائے روم کی غلامی سے آزاد کیا اور ایک خود مختار چرچ آف انگلینڈ قائم کیا۔ جس کا سربراہ وہ خود بن بیٹھا۔ ہنزی ہشتم کے ان اقدامات کے پھر ذالی اسباب بھی تھے۔ جن سے تاریخ کا طالب علم پوری طرح آگاہ ہے تاہم اس کے جو مثبت نتائج سامنے آئے اس نے پوری دنیا کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔

تھامس مور ۱۴۷۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ لندن کے دولت مند گھرانوں میں سے ایک تھا۔ باپ وکالت کرتا تھا۔ بچپن ہی میں تھامس مور نے اپنی علمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ یونانی فلسفہ، ادب اور مذہب اس کے پسندیدہ مضوعات تھے۔ بعد میں وہ اپنے زمانے کے اقتصادی اور معاشی امور میں بھی گہری دل چسپی لینے لگا۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے مقابلے میں تھامس مور کو تاجر طبقے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ طالب علمی میں ہی وہ افلاطون کی رومی سبک "کامراج بن گیا تھا۔ وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ اس نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔

وہ انیس برس کا تھا کہ جب اس کی ملاقات اپنے دور کے عظیم دانشور اور فلسفی ایراسمس سے ہوئی۔ ایراسمس کا اثر مور پر تھامس مور پر ساری زندگی رہا۔ ۱۵۰۴ء میں تھامس مور پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ عہدوں اور حیثیتوں پر فائز ہوتا چلا گیا۔ وہ لندن کا نائب میئر رہا۔ پریوی کونسل کا رکن بنایا گیا اور پھر ۱۵۲۳ء میں اسے پارلیمنٹ کا سپیکر بن لیا گیا۔ اس کے بعد اسے بادشاہ ہنزی ہشتم نے اپنا وزیر بنایا۔ ۱۵۲۹ء میں اسے وزیر اعظم کا عہدہ سونپ دیا گیا۔

ہنزی ہشتم کی زندگی کے بعض واقعات کو ڈرامہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ کتنے ہی ایسے ڈرامے آج کل سیک میں شمار ہوتے ہیں جن کے

کردار ہنری ہشتم اور این بولین تھے۔ ہنری ہشتم اپنی ملکہ کیتھرائن کو طلاق دے کر این بولین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ دونوں کیتھوک عقیقہ کے لوگ طلاق کو ناجائز سمجھتے ہیں اور اس کی حیثیت کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ تھامس مور کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ہنری ہشتم سمجھتا تھا کہ اگر اسے اپنے وزیرِ عظیم کی حمایت حاصل ہو جائے تو پادریوں کے اعتراضات اور مخالفت کی گنجائش نہیں رہے گی۔ لیکن تھامس مور نے بادشاہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا وہ مذہبی امور میں ناجائز طور پر حصہ لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ مانگے دیا۔ ہنری ہشتم کو بہت غیظ آیا۔ انتقام کی آگ اس کے دل میں سلگتی رہی۔ کسی اور طرح سے تو وہ تھامس مور کو سزا نہ دے سکتا تھا۔ اس نے سر تھامس مور پر رشوت اور خیانت مجرمانہ کا الزام لگایا جو سراسر جھوٹا تھا۔ سر تھامس مور کو ٹاور آف لندن میں قید کر دیا گیا اور یہیں جب وہ اپنی ضد پر قائم رہا تو اس کو قتل کر دیا گیا۔ یہ ۱۵۳۵ء کا واقعہ ہے۔

تھامس مور کی اس موت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے نکشن اور شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں رابرٹ بولٹ کے ڈرامے A MAN FOR ALL SEASONS کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ ہمارے ہند میں سر تھامس مور پر لکھا جانے والا یہ ڈرامہ ایک عظیم فن پارہ ہے۔ اس ڈرامے پر مبنی ایک خوب صورت فلم بھی بن چکی ہے۔ سر تھامس مور بلاشبہ "لے مین فار آل سیزنز" تھا۔ اس دور میں بھی اس کی کتاب "یو یو پیا" پڑھی جاتی ہے۔ موضوع بحث بنتی ہے۔ اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں اور ان گنت انسان اسے پڑھ چکے ہیں۔

یو یو پیا۔ پس منظر، جائزہ اور تلخیص

"یو یو پیا" کا بڑا حصہ انٹورپ (طبعمیم) میں ۱۵۱۶ء میں لکھا گیا۔ یو یو پیا سفر نامے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نقادوں اور محققوں نے کہا ہے کہ یو یو پیا پر بعض سفر ناموں کا اثر ہے۔ ۱۵۰۶ء میں شائع ہونے والا گودس پوچی اور ۱۵۱۱ء میں شائع ہونے والے پٹریارک کے سفر نامے تھامس مور کی نگاہ سے گزر چکے تھے۔ اور ان دونوں سفر ناموں کے یو یو پیا پر

اثرات کا سراغ لگایا جا چکا ہے۔

سرتھامس مور نے یوٹوپیا کو لاطینی زبان میں لکھا ہے جو اس دور کی تہذیبی زبان تھی ۱۵۱۶ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اور بہت جلد مقبول ہو گئی۔ اسی زمانے میں دوسری زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہونے لگے۔ انگریزی زبان میں یوٹوپیا کا ترجمہ ۱۵۵۱ء میں یعنی مور کی موت کے مولد برس بعد شائع ہوا۔ انگریزی میں اس کے ترجمے میں جو تاخیر ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ مور کا سرتھامس ہو چکا تھا۔ وہ بادشاہ کی نگاہوں میں مجرم تھا۔ اس لیے کسی کو جرأت نہ ہو سکی کہ وہ یوٹوپیا کا ترجمہ انگریزی میں شائع کر سکے۔ جب ہنری ہشتم اس دنیا سے اٹھ گیا تو پھر خوف بھی دور ہو گیا اور انگریزی میں ترجمہ شائع کرایا گیا۔ انگریزی کے حوالے سے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہونے اور ہوتے رہیں گے۔

یوٹوپیا - ایک فرضی سیاح کے فرضی سفر نامے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ رافیل ایک سیاح ہے جس کی ملاقات تھامس مور سے ہوئی ہے۔ وہ اسے اپنے سفر نامے کے قصے سنانا ہے۔ ایسے ملکوں کے سفر کے قصے، جن کا نام اور وجود دنیا کے کسی نقشے میں نظر نہیں آتا۔ یوٹوپیا بھی ایک ایسا ہی فرضی اور تخیلاتی ملک ہے۔ خود یوٹوپیا کے لفظی معنی بھی فرضی کے ہیں۔ رافیل کی زبان سے سرتھامس مور اس فرضی اور شمالی دنیا کا نقشہ کھینچتا ہے۔

یوٹوپیا میں اس دور کے برطانیہ کے قوانین پر بھی کڑی تنقید کی گئی ہے۔ اس نسلنے میں برطانیہ میں چور کو موت کی سزا دی جاتی تھی یہ دلچسپ تقابل ہے کہ چور کو موت کی سزا دینے والا معاشرہ آج چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو ظالمانہ اور غیر انسانی قرار دیتا ہے۔ اس کے باوجود چوری کی دادرما توں میں کمی نہ ہوتی تھی۔ اور آئے دن چوروں کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ سرتھامس مور رافیل کی زبانی لکھتا ہے

”چوری کی سزا موت دینے سے تو چوری میں کمی نہ آئی۔ اگر ان ضرورت مندوں کی ضرورتوں اور روزگار کا بندوبست کرایا جائے تو چوری کی دادرما توں خود بخود کم ہو جائیں۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پہلے تو انسان کو اس حالت پر پہنچا دو کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو جائے اور پھر اسے پھانسی پر لٹکا دو۔“

”سرٹھامس مور۔ رمی پبلک کا مداح ہونے کے باوجود اس پر دلچسپ طنز یہ انداز میں تنقید بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ فلسفی حکمران بن جائے تو افلاطون کے خیال میں ملک خوشحال ہو جاتا ہے لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں۔ کوئی بادشاہ فلسفی نہیں بن سکتا اور فلسفی مشیروں کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ بادشاہوں کو تو خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

ٹھامس مور لکھتا ہے، جہاں معیار دولت ہو وہاں عوام پر انصاف سے حکومت نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ہی عوام خوشحال اور آسودہ ہو سکتے ہیں جہاں دولت پر چند افراد قبضہ کر لیں وہاں سب کی ضرورتیں کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔ ایشیا کی حقیقی اور منصفانہ تقسیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ذاتی ملکیت کا رواج اور نظام باقی ہے۔

رائیل کی زبانی سرٹھامس مور ہیں ”یوٹوپیا لے جاتا ہے۔ یہ ایک جزیرہ ہے، جو جنوبی امریکہ میں کہیں واقع ہے۔ اس کا طول پانچ سو میل دور عرض دو سو میل کے گنگ بنگ ہے۔ پہلے وہاں وحشی لوگ آباد تھے۔ پھر ایک بادشاہ یوٹوپس نے اسے فتح کیا اسی کے نام پر اس جزیرے کو ”یوٹوپیا“ کہا جانے لگا۔

نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے ”یوٹوپیا“ کو ۱۵۴ صلاخ میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یعنی وہاں ۵۴ شہر ہیں، یوٹوپیا کا صدر مقام اماروت ہے۔ یہ ریاست ایک جمہوری وفاق کی مملکت ہے۔ ہر ضلع کو یکساں حقوق اور اختیار حاصل ہیں۔ وفاق کا انتظام ۱۸۲۔ ارکان پر مشتمل ایک مجلس کرتی ہے۔ ہر ضلع سے تین نمائندے چنے جاتے ہیں ضروریات زندگی کی پیداوار اور ان کی تقسیم کے ذرائع یہی مجلس ادا کرتی ہے۔

ہر ضلع چھ ہزار گھرانوں اور چھ ہزار کھیتوں پر مشتمل ہے۔ تیس گھرانوں پر ایک نمبردار مقرر کیا گیا ہے جس کو یہ گھرانے مل کر چلنے ہیں۔ دس نمبرداروں پر ایک مہماندار ہوتا ہے یوں تو ہر ضلع میں ۲۰۰ نمبردار ہوتے ہیں جو خفیہ رائے شماری کے ذریعے اپنے حاکم کا انتخاب کرتے ہیں۔ ضلع کی انتظامیہ کیسی بڑے نمبرداروں اور حاکم پر مبنی ہوتی ہے۔ ہر سب سے دو بار اس کمیٹی کا اجلاس لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں دو نمبردار بھی مشورے

کے لیے بلائے جاتے ہیں۔

”یوٹوپیا“ کے لوگ زراعت پر مشتمل ہیں۔ عورت یکامرد اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ زراعت کے تقاضوں سے واقف ہو۔ جو لوگ شہروں میں رہتے ہیں ان کی ایک مقررہ تعداد کو ہر برس دیہات میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ دیہاتی زندگی کا عملی تجربہ کر سکیں ان شہریوں کی جگہ اتنے ہی دیہاتیوں کو شہر بھیج دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ شہری زندگی سے مانوس رہیں۔ یوں شہروں اور دیہات کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ زراعت کے علاوہ ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرا سنبھالیے۔ صحت مند مرد اور عورت ہر روز چھ گھنٹے کام کر لیں، بچے اور علمی کام کرنے والوں کو اس نئے داری سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ اس ریاست یوٹوپیا میں علمی اور تخلیقی کام کرنے والوں کو مملکت کی طرف سے وظیفہ جاری کیا جاتا ہے۔

”یوٹوپیا“ کے لوگ زراعت کے لیے بیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ والیں، سبز پھل اور گندم اگاتے ہیں۔ انگور، سیب اور ناشپاتی پسندیدہ پھل ہیں۔ ہر برس وہ اتنا اناج پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ پوری آبادی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ دیہاتی اور غلہ اگانے والے اس اناج کے عوض شہر میں بننے والی چیزیں حاصل کرتے ہیں۔

لوگ مشترکہ طور پر خواہ وہ گاؤں میں ہو یا شہر میں، کھانا پکاتے ہیں۔ ان کا نمبر داران کے ساتھ کھانا کھانا ہے۔ البتہ کوئی چاہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی کھانا کھانا چاہتا ہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں۔

لوگ خواہ شہری ہوں یا دیہاتی ان کا لباس سادہ ہے۔ کسواری اور شادی شدہ عورتوں کے لباس میں ایک فرق قائم رکھا جاتا ہے۔

شہروں کی آبادی ہزار سے بڑھنے نہیں دی جاتی۔ آبادی بڑھنے کی صورت میں فاضل آبادی کے لئے نئی بستی بنائی جاتی ہے۔ شہر کے بازاروں میں ضرورت کی ہر چیز کثرت سے ملتی ہے۔ پیداوار جمع کر کے محفوظ کر لی جاتی ہے۔

”یوٹوپیا“ میں مکان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہر گھر کے پیچھے ایک چھوٹا

باغ ہے مکانوں کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ انہیں مقفل نہیں کیا جاتا چونکہ گھر ذاتی ملکیت نہیں ہوتے۔ اس لیے لوگ ہر دس برس کے بعد قرعہ اندازی کر کے گھر بدل لیتے ہیں تیس گھرانوں کے لیے ایک وسیع طعام گاہ ہوتی ہے۔ برتن مٹی اور شیشے کے ہوتے ہیں البتہ کوٹو، اگالداں سلفیجی وغیرہ سونے اور چاندی کے ہوتے ہیں۔

”یوٹوپیا“ میں کثرت ازدواج کی قطعاً اجازت نہیں۔ شادی کرنے سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو برہنہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ انسان گھوڑا خریدے تو اس کی زین اتار کر اچھی طرح اس کے جسم کا معائنہ کرتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی زخم تو نہیں تو پھر جس کے ساتھ توہمی عمر بسر کرنی ہے اس کے جسم کو شادی سے پہلے دیکھنے میں کیا بُرائی ہے۔ اگر مایاں بیوی مشترکہ طور پر عدالت سے رجوع کر کے طبیعتوں اور مزاج کے اختلاف کی وجہ سے کامیاب شادی شدہ زندگی بسر کرنے سے معذوری کا اظہار کریں تو طلاق مل جاتی ہے اور دوسری شادی کی اجازت بھی۔

یوٹوپیا۔ میں بچوں کی تعلیم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ تعلیم لازمی اور مفت ہوتی ہے۔ تعلیم مادری زبان میں دی جاتی ہے۔

یوٹوپیا میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ کوئی رکسی کے عقیدے میں دخل نہیں دیتا۔ مذہبی کو ذبردستی اپنا ہم مذہب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جسمانی اذیت، افاتے اور ریاضت کو اس مملکت میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ جنگ اور خون خرابے کے یہ لوگ شدید مخالف ہیں۔ وہ مسرت اور شادمانی سے زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں۔

بیاروں کے علاج پر بڑی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر مرض لا علاج ہو جائے تکلیف ناقابل برداشت بن جائے تو مریمینوں کو خودکشی کی اجازت ہے۔

دولت کی ہوس سے آزاد ہو کر یوٹوپیا کے باشندے کتنی ہی الجھنوں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ دولت کی ہوس نہ ہو تو سیاہ کاری اور خباثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یوٹوپیا۔ ایک ایسی ریاست ہے جس میں کوئی رکسی کا کسی طرح استحصال نہیں کر سکتا کیونکہ اس مثالی ریاست میں وہ تمام برائیاں اور خامیاں سرے سے موجود ہی نہیں جو استحصال

کے امکانات کو پیدا کرتی ہیں۔ جب سر تقاضا مور را فیل کو مشترکہ ملکیت کے خلاف دلیل دیتا ہے تو اس وقت اسے مطلق علم نہ تھا کہ اجتماعی معیشت اور اجتماعی ملکیت کے فوائد کتنے دور رس اور آسودگی سے بھرپور ہیں۔ جب اس یوٹوپیا کا پورا نقشہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کا مدح خزاں بن جاتا ہے۔

یوٹوپیا کے حوالے سے سر تقاضا مور نے غریبوں، ناداروں اور محنت کش طبقے کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ امیر اور غریب میں جو علیحدگی ہو چکی ہے وہ اسے پائنا چاہتا ہے۔ وہ نئے لوگوں کی نفی کرتا ہے۔ لیکن محنت کشوں کو ان کا پورا حق والو نونا چاہتا ہے وہ کتنا پیار محنت کش اور مزدور ہی نہیں جن کے سہارے ملک چلتے ہیں لیکن انہی سے ان کے حقوق چھین لیے جاتے ہیں۔

یوٹوپیا میں ہر چیز سب کی ہے اور کسی کی بھی نہیں۔ وہاں کسی کو یہ فکر نہیں کہ اگر ذاتی استعمال کی چیز نہ ملی تو کیا ہوگا۔ کیونکہ یوٹوپیا کے ہر شہری کے علم میں یہ بات ہے کہ دو کام ہیں اور گودام و انزاشیا سے اٹے ہوئے ہیں۔ وہاں کی ہر چیز سب کے لیے ہے اور ان میں مساوی تقسیم کی جاتی ہے۔

یوٹوپیا میں کوئی گداگر ہے نہ حاجتمند۔

یوٹوپیا میں کسی کے پاس اس کا کسی قسم کا ذاتی اثاثہ نہیں۔ اس کے باوجود ہر شخص مطمئن اور آسودہ ہے۔ اسے فکر معاش میں جان گھلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اس کے لیے کام کا تعین ہو چکا ہے وہاں ہر شخص کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس لیے نہ تو کسی کو یہ خوف ہوتا ہے کہ بیوی، تنگی اور غربت کا طعنہ دے گی۔ نہ بیٹے کی برباد کاری کا غم۔ کہ اسے ملازمت مل ہی جائے گی اور اسے کام کرنا پڑے گا اور نہ ہی وہاں کسی کو یہ غم ہلکان کرتا ہے کہ بیٹے کا جہیز کیسے تیار کیا جائے گا۔ کیونکہ وہاں جہیز کی رسم ہی سرے سے موجود

نہیں۔ !!

نیواٹلانٹس

فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کی تحریک کے بانی دیدرو نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا تو اس کا سہرا ان اثرات کے سر باندھا جو بکین کی تصانیف نے اس پر چھوڑا تھا۔ خاص طور پر بکین کی کتاب نیواٹلانٹس، کلاثر تو بہت گہرا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بکین کی تحریروں (بالخصوص نیواٹلانٹس) نے صرف اس کے اپنے عزم و طنون اور ہم زبانوں کو ہی متاثر نہ کیا، بلکہ پوری دنیا کی فکر پر اس کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کے بانی دیدرو نے اس منصوبے کے حوالے سے فرانسس بکین کو یوں مزاج تھین پیش کیا تھا:

”اگر ہمارا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو اس کا سہرا بکین کے سر ہو گا۔ جس نے ایسے زلزلے میں سائنس اور آرٹ کی ایک بین الاقوامی لغت کی تجویز پیش کی تھی جب دنیا میں سائنس کا وجود تھا نہ آرٹ کا۔ اس غیر معمولی دانشور نے علم کی ضرورت کے بارے میں اس وقت لکھا۔ جب معلومات کی تاریخ لکھنا ممکن نہ تھا“

فرانسس بکین بڑے خاندان کا بڑا فرد تھا۔ ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین اپنے عہد کے سر برآوردہ لوگ تھے ۲۶ کے والد سر نکولس نے ہنری ہشتم ایڈورڈ ہشتم اور ملکہ الیزبتھ کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں کو زینت بخشی اور نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ علم کی پیاس اور علم سے محبت، بکین کو بطور خاص دلچسپ بنی تھی۔ کم عمر ہی میں وہ علمی انہماک کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ خاص علمی وقار رکھتا تھا۔ بھی وہ جوان ہی تھا کہ ملکہ الیزبتھ اس سے اتنی متاثر ہوئی کہ ”YOUNG LORD KEEPER“ کہہ کر پکارتی تھی۔ بکین تیرہ برس کی عمر

میں کیمبرج داخل ہوا۔ لیکن وہاں کا انتظام اسے پسند نہ آیا۔ تین برسوں کے بعد اس نے کیمبرج چھوڑ دیا۔ وہ پیرس چلا گیا۔ جہاں برطانوی سفارت خانہ میں ملازم ہو کر ڈپلومیسی کی تربیت و تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۱۸۷۹ء میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو اسے لندن واپس آنا پڑا۔

سائنس کے ساتھ بیکن کو گہرا شغف تھا۔ لیکن جب اسے مناسب سہولتیں اور سرکاری امداد حاصل نہ ہوئی تو اس نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کا چچا لارڈ برے اس وقت شاہی خاندان میں خاص اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ لیکن کا خیال تھا کہ وہ اس کے ذریعے سائنس کی تعلیم کے لئے شاہی خاندان سے مدد حاصل کر سکے گا۔ لیکن بیکن کا چچا زاد بھائی بیکن کی ذہانت اور صلاحیت سے بہت خارکھاتا تھا۔ اس لئے چچا اس کے کام نہ آسکا۔ ایل آف ایلیکٹریسیٹی جو اس کے چچا کا حرفت تھا اس نے فرانسس کی مدد کی اور اسے ایک اچھی خاصی جاگیر ڈیولپمنٹ نامہ بخش دی۔ افسوس کہ بیکن نے ایل آف ایلیکٹریسیٹی کی اس فیاضی کا صلہ خود غرضی اور ناشکرہ گزاری کی صورت میں دیا۔ جب ایل آف ایلیکٹریسیٹی پر مصیبت بنی اور اس پر مقدمہ چلا تو اس کے خلاف جس شخص کی آواز سب سے زیادہ زہریلی اور بلند تھی۔ وہ بیکن کی آواز تھی؛ لیکن نے صرف اس کی مخالفت ہی نہیں کی۔ بلکہ اپنے غصے کو سزا دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا دیا۔ وہ لوگ جو اس ضمن میں بیکن کی طرف سے معذرت کرتے ہیں کہ بیکن نے احساس فرض کی وجہ سے اپنے غصے کی مخالفت کی۔ وہ ایک بات بھول جاتے ہیں کہ بیکن کو خود ایک زمانے میں رشوت لینے کے الزام میں سزا ہوئی جس سے اس کے کردار اور فرض شناسی کا خاصا پول کھل جاتا ہے۔

۱۸۹۰ء میں بیکن ملکہ الیزبتھ کا منیر بنا۔ وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی بن گیا۔ بادشاہ جیمز اول کے عہد میں اس نے مزید ترقی کی اور اعلیٰ ترین عہدوں پر نامزد ہوا۔ وہ آثار فی جنرل بنا دیا گیا اس کے بعد وہ لارڈ چانسلر بنا۔ اسے لارڈ وولپولم کا خطاب ملا۔ پھر اسے وائیکاؤنٹ آف سینٹ البان کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

بیکن۔ شاہ پرست تھا اور راشی۔ وہ رشوت میں کھلے دل سے تحفے وصول کرتا۔ وہ بے حد فضول خرچ تھا۔ شاہانہ مٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے کا عادی، اگرچہ اس کی اپنی اور اس کی بیوی کی جاگیر سے ملنے والی آمدنی بہت معقول تھی۔ اس کے باوجود وہ اکثر مقروض رہتا اور

قرض آمانے کے لئے رشوت لیتا وہ اپنے شاہانہ طرزِ زلیت کو بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔
 بیکن اپنے دور میں اسی حوالے سے ایک بڑے سیکنڈل کامر کزی کردار بھی بنا۔ بیکن پر رشوت لینے کے الزام میں مقدمہ چلا اس نے خود اعتراف کیا کہ وہ ۲۴ ہزار رشوت لینے کا مرتکب ہوا تھا۔ اس کو اس مقدمے میں چالیس ہزار پونڈ جرمانہ کیا گیا۔ اس کے تمام عہدوں سے اسے معطل کر دیا گیا۔ سزائیں یہ بھی حکم شامل تھا کہ اب وہ شاہی دربار میں کبھی حاضر نہ ہو سکے گا۔ بیکن کو اصل سزا ندامت اور شرمساری کی ملی۔ اب اس کے عظیم نام پر دھبہ لگ گیا تھا۔ اس کا جرمانہ معاف کر دیا گیا۔ اسے زندان میں بھی صرف دو دن رہنا پڑا۔ اسے پارلیمنٹ میں اپنی نشست سنبھالنے اور دربار میں حاضری کی بھی اجازت دے دی گئی، لیکن بیکن اپنے نفس اور ذات کا محاسبہ کر چکا تھا۔ باقی ماندہ زندگی میں اس نے کوئی ایسا کام نہ کیا جس پر اسے شرمسار ہونا پڑا ہو۔ بادشاہ نے اس کے عہدوں کو بحال کر دیا تھا۔ لیکن اب بیکن نے سب کچھ چھوڑ کر تنہائی میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حکومت کی نیشن پر گزارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی آرٹ ادب اور بالخصوص سائنس کے لئے وقف کر دی۔

جدید سائنس اور فکر کی دنیا میں بیکن کو بڑے عجیب الفاظ اور اعزاز سے یاد کیا جاتا ہے
 اس کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ وہ سائنس اور فلسفے کی دنیا میں - **GREATEST**

WISEST AND MEANEST OF MANKIND

تھا۔ ۱۵۹۷ء میں اس کے "مضامین" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو شہرہ آفاق حیثیت رکھتے ہیں ۱۶۵۰ء میں ایڈوانسمنٹ آف لرننگ اور ۱۶۱۰ء میں وڈوم آف اینسینٹس شائع ہوئی۔ اس کے مضامین چونکہ نسبتاً عام فہم ہیں اس لئے بار بار شائع ہوئے، ۱۶۲۰ء میں اس کی ایک شہرہ آفاق تصنیف "WORLD OF RUMOR" شائع ہوئی۔ ۱۶۲۷ء میں "نیو ٹائٹس" منصفہ شہور پرائی۔

بیکن کا انتقال ۹ اپریل ۱۶۲۶ء کو ہوا۔ اس کی موت سردی لگنے سے واقع ہوئی۔ ان دنوں وہ گوشت کو برف کے ذریعے محفوظ کرنے کے تجربات میں مصروف تھا۔
 بیکن کو جدید مادی فلسفے اور تجربات سائنس کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مادیت کے بانی

میں لیکن کے نظریات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بعض بنیادی نکات کا ذکر کیا جائے اور
دیوینقراطس کا بھی جن کا لیکن معتقد اور مداح تھا۔

پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مادیت کیلئے ہے۔ نظریہ مادیت کی رو سے سورج، چاند زمین،
پہاڑ، دریا، درخت، پودے، جانور حتیٰ کہ اس کائنات کی تمام اشیاء خارج میں اپنا وجود رکھتی ہیں
اور محض ہمارے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ اشیاء انسان کے وجود سے لاکھوں برس پہلے ہی
موجود تھیں۔ نظریہ مادیت میں انسان اور اس کا دماغ بھی دوسری تمام اشیاء کی طرح مادے کی
ہی پیداوار ہیں ہم جسے خیال یا روح کہتے ہیں۔ اصل میں وہ انسان کے دماغ کا ہی عمل ہے۔
دماغ سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔ مادہ ہر دم متحرک اور متغیر رہتا ہے اسے فنا نہیں۔ تاہم اس
کی ماہیت اور حیثیت میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اقبال نے اسی حوالے سے کہا تھا۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آئیڈیل ازم (یعنی تصوریت) مادیت کی ضد ہے تصوریت کے مطابق خیال یا روح مقدم
ہے اور کائنات انسان کے ذہن کی تخلیق یا ہمارے خیالات کا ہی عکس ہے یہ وہ بات ہے۔
جسے غالب نے یوں بیان کیا ہے۔

عالم تمام حلقہ و ام خیال ہے!

مادیت کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسانی شعور، یونان قدیم کے تقریباً تمام فلسفی
مادیت پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن یہ فلسفی اتنیغیر اور اسپارٹا کے یونانی نہ تھے۔ بلکہ ایشیائے
کوچک کے ساحلی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

طالیس (۶۲۳-۵۴۶ ق م) آگنسی ماندر (۶۱۱-۵۴۷ ق م) کے علاوہ اس سلسلے میں
سب سے قابل ذکر ہر اقلطیس (۵۳۵-۵۶۰ ق م) ہے ہر اقلطیس کو یہ اعزاز حاصل ہے۔
کہ اسے جدلی مادیت کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایضاً سکس (سڑکی) کا رہنے والا تھا۔ اس کی زندگی
کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں، وہ شاہی خاندان کا فرد تھا اور اپنے بھائی کے
حق میں سخت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس نے جو کتاب لکھی وہ تین حصوں میں منقسم ہے پہلا
حصہ کائنات، دوسرا ایسیات اور تیسرا مذہبیات سے متعلق ہے۔ یہ کتاب معدوم ہے۔ اسے کسی

نے نہیں دیکھا، لیکن ہر اقلطیس کے ڈیڑھ دو سو کے قریب مقولے یونانی فلسفیوں نے اپنی تصانیف میں نقل کئے ہیں۔ جن میں سے چند ایک —

- تمام موجودات عالم ایک وحدت ہیں۔
- آپ ایک ہی دریا میں دوبارہ نہیں نہا سکتے اس لئے کہ ہر لمحہ تازہ پانی آپ پر سے گزرتا رہتا ہے۔
- انسان کے لئے تضاد میں خیر ہے۔ خیر اور شر ایک ہیں۔
- لوگ نہیں جانتے کہ اجتماعِ ضدین کیا نفع ہے یہ متضاد سناؤ کا آہنگ ہے جیسے کمان یا بربط۔
- اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔
- دائرہ کی ابتدا اور اہمیت ایک ہی ہوتی ہے۔

- ہم ایک ہی دریا میں اترتے بھی ہیں اور نہیں بھی اترتے۔ ہم میں بھی اور نہیں بھی ہیں۔
- انسان کا کردار ہی اس کی تقدیر ہے۔

اس کے بعد دیمقراطس آتا ہے جس کا زمانہ ۴۶۰، ۳۷۰ ق م ہے کارل مارکس نے اسے ”یونانیوں میں پہلا قاموسی داع کہا ہے۔“

دیمقراطس ایٹمی فلسفے کا موجد بھی ہے اور دیمقراطس وہ فلسفی ہے جس نے سب سے زیادہ دنیا کی خاک چھانی اور علم حاصل کیا وہ تنہائی پسند تھا اور اس نے افلاطون یا ارسطو کی طرح اسے قائم نہ کئے۔ لیکن اس کی تعلیمات و نظریات ساری دنیا میں پھیل گئیں ارسطو کا سائنس اور ذمکتہ چین فلسفی بھی اس کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ دیمقراطس کے نظریات کا خلاصہ یوں بنتا ہے۔

- یہ کائنات ایٹموں مادے کا سب سے چھوٹا جزو اسے مل کر بنی ہے۔
- کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی اور جو موجود ہے وہ معدوم نہیں ہو سکتی۔
- تغیر کیا ہے۔ ایٹموں کی ترتیب و تفریق۔
- کوئی واقعہ اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ ہر واقعہ کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ ہر حرکت قانونِ قدرت کے تابع ہے۔

۱۔ ایٹم لاتعداد ہیں۔ ان کی شکلیں ان گنت ہیں۔ وہ لامحدود خلا میں مسلسل گرتے رہتے ہیں۔ جو وزن میں بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے آنے کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ بڑے ایٹم اپنے سے چھوٹے ایٹموں سے ٹکراتے اور اس حرکت سے دنیاؤں کی تشکیل ہوتی ہے بہر لحاظ بے شمار دنیاؤں بن اور بگڑ رہی ہیں۔

۲۔ انسانی ذہن بھی مادے ہی کی ایک شکل ہے۔

مادی فلسفے اور نظریات کے اس پس منظر میں فرانسس بیکن کے افکار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بیکن دیکر اٹلیس کا معتقد تھا۔ اس سے بیکن نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔

بیکن سائنس اور مادی نظریات کا مبلغ ہے۔ وہ انسان کو سب سے پہلے روایتی تصورات اور تصریحات و توجیہات سے چھٹکارا پانے کی ہدایت کرتا ہے وہ دوسروں کے خیالات کو بلاسوچے سمجھے قبول کر لینے کا بھی شدید مخالف ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ سچا علم ان بری ذہنی عادتوں کو ترک کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ علم کی بنیاد تجربے کی سچائی کو قرار دیتا ہے وہ استخراجی طریق استدلال کی بجائے استقرائی طریقہ اختیار کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔

بیکن کا اہم ترین تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مادی فلسفے کی قدیم روایت کو بحال کیا۔ مروجہ نظریات کی پرکھ مادی اصولوں کی کسوٹی پر کی۔ آئیڈیل ازم کی خامیوں کو اس نے اجاگر کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

نیو اٹلانٹس، اس کی آخری تصنیف ہے اس کے ذہن پر سائنس ہمیشہ حاوی رہی۔ اس لئے اس کی یہ خیالی جنت۔ ایک بڑی سائنسی تجربہ گاہ لگتی ہے۔ اٹلانٹس کی اصطلاح بھی اس نے۔ یونانی دیولام سے مستعار لی۔ قدیم یونانیوں کے خیال میں اٹلانٹس مغربی سمندر میں ایک جزیرہ تھا۔ جو زلزلے کی وجہ سے ڈوب گیا تھا۔ افلاطون نے اس کا ذکر اپنے مکالمات میں کیا ہے اور افلاطون کا دعویٰ تھا کہ اٹلانٹس کے باشندوں کی تہذیب انتہائی ترقی یافتہ تھی۔ بیکن نے نیو اٹلانٹس کو ایک خوشحال اور روشن خیال معاشرے کے لئے بطور علامت استعمال کیا ہے۔

بیکن ہمیں اٹلانٹس کے حوالے سے بتاتا ہے۔ وہاں کے لوگ اپنے دانش مند بادشاہ کی وجہ

سے بہت خوش حال ہیں۔ اس معاشرے کی بنیاد سائنس پر قائم ہے۔ جزییرے کا دار الحکومت ذہن سالم،

ہے۔ جہاں شہر کے وسط میں ایک کالج ہے۔ جس کا نام ریٹ سیلیمان ہے یہ وہ کالج ہے، جہاں ایشیا کے اسباب اور مخفی حرکات کے علم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس تعلیم کا مقصد انسانی ذہن کی حدود کو وسعت بخشنا ہے تاکہ انسان تمام ایشیا اور موجودات کو اپنے استعمال میں لائے، یہاں تجربات کے لئے ہر طرح کے آلات موجود ہیں۔ زمین کے اندرونی حالات بنانے کے لئے گہرے غار کھودے گئے ہیں۔ خلا کی تحقیق کے لئے اونچے مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔ طبی تحقیق اور نامیاتی مادے کی تیاری کے لئے تجربہ گاہیں موجود ہیں اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے زرعی مرکز اور اوزار بنانے کے کارخانے موجود ہیں۔

اس دنیا میں سائنس کی بدولت نہ کوئی محتاج ہے نہ مفلس۔ نیوٹن، ڈیوٹن، کارل لیبیچ، ساری دنیا سے قائم ہے۔ ساری دنیا کی ترقی پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ و فوڈ بیرون ملک جلتے ہیں سائنسی امور پر غور و فکر کے لئے کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔

لیکن نیوٹن، ڈیوٹن، کی اس فرضی ریاست میں بلوکیت کا علمبردار ہے۔ اس ریاست کا ائین ناقابل ترمیم ہے۔ اس دنیا میں طبقات بھی موجود ہیں۔

یہ اس نئی دنیا کا ابتدائی خاکہ ہے۔ جس کے آثار و اشکال ہمارے زمانے میں سائنس کی ایجادات کی وجہ سے بہت نمایاں ہو چکے ہیں۔ اس ریاست میں اس کے باشندوں کو نہ تنظیم و نسق میں شریک کیا گیا ہے، نہ ہی معاشی امور میں، ایشیائے ضرورت کی پیداوار ان کی تقسیم کے فرائض چند سائنسدان اور ماہرین سائنسی مشینوں کے ذریعے انجام دیتے ہیں۔

لیکن نے اس کتاب میں آنے والی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔ اپنے تخیل سے خوب کام لیا ہے۔ نیوٹن، ڈیوٹن، نئے سائنسی عہد (جس کی شکل سامنے آچکی ہے) کا خاکہ ہے۔ نیوٹن، ڈیوٹن، سائنس کی سر بلندی کا ترجمان ہے۔ آنے والے دور کی نشاندہی کرتا ہے جب سائنسدان مشینوں کے ذریعے دنیا کا سارا انتظام سنبھال سکیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی اہمیت میں گزشتہ چند دہائیوں میں خاص اضافہ ہوا ہے۔ اس کے تراجم نئے سرے سے دنیا کی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ نیوٹن، ڈیوٹن کے حوالے سے فلیس بنی ہیں۔ اس سائنسی دنیا کے پس منظر میں جو مادی فلسفہ کام کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کی بنا پر یہی کتاب

لافاغانی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی بڑی کتابوں میں سے ایک۔!

نیواٹلانٹس، کی تصنیف کے کچھ اور محرکات بھی تھے۔ بادشاہ جمیز اول کی خوشنودی جس کے حوالے سے بیکن سائنس کالج کی تعمیر کے منصوبے کو عملی صورت دینا چاہتا تھا۔ لیکن بیکن ایک معنوی شخص تھا۔ اس کے نام کو دھبہ لگ چکا تھا۔ اس کے اپنے زمانے میں تو ایسا نہ ہوا لیکن یہ کتاب اپنا اثر دکھا کر رہی۔ ۱۶۲۵ء میں پارلیمنٹ کے حکم سے لندن میں ایک کالج آف فلاسفی قائم ہوا۔

جس کے بانی سیموئیل ہارٹ نے واضح الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ

”اس کالج کی محرک بیکن کی تصنیف نیواٹلانٹس ہے“

۱۶۶۲ء میں اسی کالج کو ترقی دی گئی اور اسے رائل سوسائٹی کی شکل دے دی گئی۔ اس کے

بانیوں نے بھی بیکن کو خراج تحسین پیش کیا اور نیواٹلانٹس کے بیت سلیمان کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”ہم اصل نیواٹلانٹس میں بیان کردہ بیت سلیمان کے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش

کر رہے ہیں۔ جسے بیکن نے پیش کیا تھا۔“

پرنسپیا

پرنسپیا دنیا کی وہ عظیم تصنیف ہے جس نے اکتشافاتِ عالم کے نئے منطوقوں کی نشاندہی کی اور کوششِ نقل کے قانون و اصول کو منضبط انداز میں پیش کیا یہ ایک ایسی بنیادی کتاب ہے جس پر شتمل نظریات و اکتشافات پر آنے والے زمانوں میں بہت کام ہوا، ہم جن دنیا میں رہ رہے ہیں اس کے بارے میں جو علم و عرفان ہمیں حاصل ہے اس میں پرنسپیا کا بڑا حصہ ہے اور نیوٹن کے بعد آئینِ ستائین تک ایسا جہتم بالشان علمی اور سائنسی کام ہوا ہے کہ جس نے اس کا منہ کی گتھیاں سلجھا دی ہیں اور ہمارا دنیا کی نئی صورت گری ہوئی ہے۔

نیوٹن کی اس عظیم کتاب کا پورا نام

PHILOSOPHIA NATURALIS

PRINCIPIA

MATHEMATICA

یعنی دی میتھیٹیکل پرنسپلز آف نیچرل فلاسفی۔

ہے جو اختصار میں "پرنسپیا" کے نام سے چارونگ عالم میں مشہور و مقبول ہوا ہے۔

۱۶۸۷ء میں گیلیلیو کی موت کے بعد یورپ میں سائنس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ جسے ہم دانشورانہ بحران کا نام دے سکتے ہیں۔ کوپرنیکس کے ماننے والوں کے خلاف کلیسیا نے جو کاروائیاں کیں۔ تعزیر و سزا کا بازار گرم کیا اور خود گیلیلیو کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک طویل داستان ہے۔

سائنس دان فطرت اور اس کے اکتشافات کے بارے میں کام اور بات کرتے گھبراتے

تھے۔ کلیسیا کا خوف دلوں پر حاوی ہو چکا تھا۔

وہ شخص جس نے اس بحران کو دور کیا اور دنیا کو بدل دینے والے نظریات کا موجد اور خالق بنا۔ وہ نیوٹن تھا۔ نیوٹن اسی برس پیدا ہوا جس برس گیلیلیو کا انتقال ہوا تھا کہ ہمس کے

دون ۲۱۶۴ میں نیوٹن لیکن شائر میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اس کی ماں صدے سے بے مال تھی۔ نیوٹن کی پیدائش بھی پورے دنوں سے پہلے ہوئی وہ بہت لاغر اور کمزور بچے کی صورت میں اس دنیا میں آیا۔ وہ خاتون جو دوڑائی لانے کے لئے گاؤں کے کسی معالج کے پاس بھیجی گئی اس کا خیال تھا کہ اس کی واپسی تک یہ نومولود بچہ مرجھا ہو گا لیکن یہ لاغر و کمزور بچہ اپنی ماں کی شفقت اور محبت کے ساتھ میں پروان چڑھا۔ ماں نے اس کی دیکھ بھال کا فریضہ اس طرح سے ادا کیا کہ اس کی صحت بہتر ہونے لگی نیوٹن کو اسی لئے اپنی ماں سے بے محبت تھی۔ وہ اپنے وجود کا تصور اپنی ماں کے بغیر نہ کر سکتا تھا۔ لیکن جب وہ چار برس کا ہوا تو اسے اپنی ماں سے جدا ہونا پڑا۔ اس کی ماں نے دوسری شادای کر لی اور اپنے نئے خاندان کے پاس چلی گئی۔ نیوٹن کو اس کی ماں ساتھ لے کر نہیں گئی بلکہ اسے اس کی نانی کے پاس چھوڑ گئی۔

نیوٹن ایک نرم و نازک لڑکا تھا۔ بے حد حساس، خاموش، طبع، ماں کی جدائی کا دکھ بھی کسی سے بیان نہ کرتا تھا لیکن وہ ایک پیدائشی اور فطری نابغہ تھا۔ اپنی ابتدائی عمر میں ہی اس نے ایک کاک بنایا اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی مشینیں جن میں ایک آٹا پیسنے والی چکی تھی۔ نیوٹن لڑکپن سے مطالعے کا دلدادہ تھا۔ لڑکپن سے جوانی کی عمر میں پہنچا تو وہ مس سٹوری کی محبت میں گرفتار ہو گیا جس کے ساتھ اس کی منگنی بھی ہو گئی۔ نیوٹن کی والدہ کا دوسرا ناناوند بھی فوت ہو گیا۔ نیوٹن نے فارم کا انتظام سنبھال لیا۔ ماں کے امور میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ملکن ہے اس کی ساری مزدوریاں اور ایسے کاموں میں ہی گزار جاتی۔ لیکن اس کے رشتے کے ایک ماموں پادری ولیم الیکٹ نے یہ بھانپ لیا کہ نیوٹن کو خدائے فطری صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر وہ گاؤں میں ہی رہا تو اس کی یہ تمام صلاحیتیں بے کار رہیں گی اس بزرگ نے نیوٹن کی والدہ کو ترغیب دینی شروع کی کہ نیوٹن کو تعلیم کے لئے یونیورسٹی بھجوا یا جائے۔ اس کی ان کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیوٹن کو کیمبرج کے ٹریینیٹی کالج میں تعلیم کے لئے بھجوا دیا گیا۔ وہ ایک ایسا طالب علم تھا جسے اس وقت کی اصطلاح میں 'Sizar' کہا جاتا تھا یعنی ایک ایسا طالب علم جو اپنی تعلیم اور ضروریات کے لئے چھوٹی اور حقیر خدمات انجام دیتا تھا۔ اس وقت نیوٹن کی عمر ۱۹ برس تھی۔!

نیوٹن کا کبزنار تھا یہی وجہ ہے کہ مس سٹوری جس سے نیوٹن محبت کرتا تھا اور جو اس

کی منگیتر بھی تھی اس کے ساتھ یہ رشتہ قائم نہ رہ سکا۔ نیوٹن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اور مس سٹوری بھی ناخار تھی۔ دونوں جلد ہی اس فیصلے پر پہنچے کہ ان کی شادی ناکام ہوگی۔ یوں یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ کیمبرج میں اپنی تعلیم کے پہلے تین برسوں (۱۶۶۱، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳) میں نیوٹن کی کسی مصروفیت یا حرکت سے اندازہ نہ ہوا کہ وہ غیر معمولی طالب علم ہے۔ تاہم ریاضی میں اس کا شغف اس کے استاد بارو (BARROW) کو متاثر کر چکا تھا۔ اس زمانے میں کیمبرج میں تعلیمی سرگرمیاں عروج پر نہ تھیں۔ خانہ جنگی کی وجہ سے یونیورسٹی کے مالی معاملات خاصے خراب ہو چکے تھے اور پھر ۱۶۶۴ء میں جب مشہور زمانہ پلئیک پھیلا تو کیمبرج یونیورسٹی کو بند کر دیا گیا۔

پلئیک کی یہ وبا جو ان گنت انسانوں کی موت کا سبب بنی جس نے لندن کو ہلا کر رکھ دیا۔ نیوٹن کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ نیوٹن نے اپنی عمر کے آخری حصوں میں لکھا تھا:

”میں نے جو کچھ کیا اس کی ابتدا طاعون کے انہی دو برسوں (۱۶۶۵ء اور ۱۶۶۶ء) میں ہوئی یہی وہ دن تھے جب میں نے اپنی اختراع پر کام شروع کیا۔ ریاضی اور فلسفے نے جس طرح ان دو برسوں میں میرے ذہن و دماغ پر اپنا غلبہ قائم رکھا، اس سے پہلے اور اس کے بعد پھر کبھی ایسا استغراق اور انہماک نصیب نہ ہوا“

ان دنوں نیوٹن اس مسئلے پر غور و فکر کر رہے تھے کہ وہ کیا چیرہ ہے جو چاند اور سیاروں کو دائرے کی صورت میں گردش میں متحرک رکھتی ہے۔

اور پھر وہ مشہور و معروف واقعہ رونما ہوا۔ جس نے نیوٹن کو کشش ثقل کی تھیوری کا موجد و بانی بنا دیا۔

انہی دنوں میں ایک دن وہ ایک سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا انہی خیالوں میں گم اور مستغرق تھا کہ جب سیب کے درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ سیب کے گرنے کی آواز سے اس کی یکسوئی اور انہماک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ کیلپہر کے نظریات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک لمحے میں ایک سیب کے گرنے سے اس کا مسئلہ حل ہو گیا یہ اتفاق انسانی علوم اور ترقی کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیوٹن نے اس ”مقتناطیسیت“ کو دریافت کر لیا تھا جو سیب کو زمین پر گرانے کا باعث بنی تھی۔

بہر حال اس واقعہ کی جتنی بھی اہمیت ہو۔ سائنس دانوں اور محققوں نے کہا ہے کہ نیوٹن جس نتیجے تک پہنچا تھا اس تک گلیکریٹ کے مشہور مفروضہ، مقتناطیسیت سے لاعلم ہو کر

نہ پہنچ سکتا تھا۔ سبب گرنے کے واقعہ کا راوی والیئر ہے جیسے یہ واقعہ نیوٹن کی ایک عزیز بہرہ کینکھرائن بارٹن نے سنایا تھا جو ایک عرصہ تک نیوٹن کے ساتھ رہی تھی۔

مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا اب نیوٹن یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کشش کا وہ کونسا اصول ہے جو اس کا محرک بنتا ہے یہاں پھر اس نے اپنے پیش رو کیپلر سے مدد لی اور اہم سائنس دانوں کے نظریات سے استفادہ کیا۔ یوں نیوٹن دوڑ تک دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ خود نیوٹن نے اعتراف کیا ہے:

”میں اتنی دوڑ تک دیکھنے میں اس لئے کامیاب ہو سکا کہ میں بعض قد آور اور عظیم سائنسدانوں کے کندھوں پر کھڑا تھا۔“

نیوٹن نے کچھ عرصہ اپنے اس مسئلہ پر کام کیا اور پھر اسے التوا میں ڈال دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اسے خیرا ہم سمجھتا تھا بلکہ اس کے ذہن میں کئی دوسرے متعلقہ اور غیر متعلقہ مسائل اور سوالات نے قبضہ کر رکھا تھا۔ سائنس کی تبدیلی ہوتی ہوئی رفتار کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ ایسے مسائل کے حل کے لئے ایک نئے ریاضیاتی نظام کی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ مسائل حل نہ ہو سکتے تھے۔ پرائما الجبرا اور ریاضیاتی نظام صرف ان چیزوں سے بحث کرتا تھا جو غیر تبدیل تھیں۔ نیوٹن نے پہلے اس مسئلے کو سر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نیوٹن نے جسے FLUXIONS کا نام دیا اور جسے ہم آج کی اصطلاح میں INFINITESIMAL CALCULUS کہتے ہیں۔ علم ریاضی میں یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو قدیم یونانیوں کے بعد نیوٹن نے انجام دیا تھا۔ یہ سب کچھ جانے، حاصل کرنے اور دریافت اور ایجاد کرنے کے باوجود نیوٹن نے اپنے نظریات کو شائع کرنا پسند نہ کیا جو بعد میں اس بڑے علمی شاخسانے اور تنازعے کا سبب بنا جو جرمن فلسفی اور ریاضی دان ویلیہلم فان لیبنز (LEIBNIZ) سے چھڑا اور جس نے بڑی بے عزگی پیدا کی۔

طاعون کے ان دو برسوں میں تیسرا اہم مسئلہ جس پر نیوٹن نے غور و فکر کیا وہ روشنی کی حقیقت تھی اس ضمن میں نیوٹن نے کئی تجربات کے کئی غلط نتائج اخذ کئے جو بعد میں جا کر صحیح ہوئے لیکن وہ اپنے کام میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ اس نے ایک چھوٹی سی دور بین بھی بنائی جس سے وہ سیاروں اور آسمان کا نظارہ کرتا رہتا۔

دو برس بعد ۱۶۶۷ء میں جب پلگ کی وبا ختم ہوئی تو نیوٹن دو لاکھ روپے سے واپس

کیمبرج آیا اب وہ چوبیس برس کا ہو چکا تھا اپنی زندگی کے سب سے بڑے اور لافانی کام کی بنیادیں رکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود اپنے نظریات اور عظیم کام کے بارے میں اس کا رویہ بڑا لاپرواہانہ تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی افتادِ طبع ہو۔ وہ نظریات میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ شہرت سے اسنے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہ نہی تھی۔ دو برس کے بعد اس کے استاد نے سیاروں میں تبدیلی اور رفتار کے بارے میں مسائل کا ذکر کیا تو نیوٹن نے زبان کھولی اور بتایا کہ وہ ان مسائل پر کام کر چکا ہے۔ اس پر باد نے اس کا کام دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نیوٹن نے اسے اپنے نوٹس دے دیئے۔ نیا ریاضیاتی سسٹم جو نیوٹن نے بنایا تھا اس سے پروفیسر بارو کو کتنا متاثر ہوا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تاہم اس نے نیوٹن سے کہا کہ وہ اپنے ان اشارات اور نوٹس کو ایک مقالے کی صورت دے۔ نیوٹن نے مقالہ قلم بند کیا۔ اس کی متعدد نقلوں اہم ریاضی دانوں کو بھجوا دی گئیں۔ لیکن اس کی افشاعت چالیس برس بعد ہوئی۔

پروفیسر بارو بھی خوب آدمی تھا وہ اپنی پروفیسر شپ چھوڑ کر دینیات کی طرف جانا چاہتا تھا جسے وہ ہر علم پر ترجیح دیتا تھا۔ نیوٹن کی ذہانت کو دیکھ کر اس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ اس کے بعد اس کا جانشین کون ہو گا۔ نیوٹن شاہیں برس کا تھا۔ جب اسے کیمبرج میں ریاضی کا استاد مقرر کیا گیا اس کے تین برس بعد نیوٹن کو رائل سوسائٹی کا فیلو بھی بنا لیا گیا۔

آنے والے برسوں میں نیوٹن اپنے نظریات و اکتشافات پر کام کرتا رہا۔ اس نے اس غیر سرئی تار، کو دریافت کر لیا جو ستاروں کو سورج کے گرد بھولا بھلائے رکھتی ہے اس نے ثابت کر لیا کہ اگر لاپ کے گولہ کو کسی خاص نشانے پر داغا جائے تو توپ کا گولہ تبدیل سرج زمین کی طرف گرتا چلا جاتا ہے چونکہ وہ قوت جو اسے زمین کی طرف کھینچ رہی ہے اس قوت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جو اسے دور فاصلے پر نشانے تک پہنچا رہی ہے۔ سیارے کی کششِ ثقل اسے ایک دائرے میں گردش میں رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی اتنی قوت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ گر کر پھٹ جاتا ہے (جیسے کہ ایک دن چاند کو زمین پر گر کر پھٹنا ہے)

بلاشبہ نیوٹن پر یہ حقیقت واضح ہوتی تھی کہ خلا میں موجود تمام اجسام توپ کے گولوں کی طرح ہیں جو ایک بہت بڑے دھماکے سے پھٹ کر ٹوٹ کر، باہر کی طرف جھکے پٹے آتے ہیں۔ نیوٹن اپنے تمام تجربات اور نظریات کو ابھی تک شائع کرنے کے حق میں نہ تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں اسے علمِ کیمیا سے بہت گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی وہ ریاضی

۴ اور کیما کا ایک خاص سنگم بھی پیدا کرنے کا خیال رکھتا تھا۔ نیوٹن کو اس پر بھی اعتقاد تھا کہ ”فلاسفرز سٹون“ حقیقت ہے کہ جس کے چھوٹے سے ہر دھات سونے میں تبدیل ہو جاتی ہے نیوٹن نے اس پارس کو پانے اور تلاش کرنے میں بھی بہت وقت صرف کیا۔ اسی زمانے میں وہ تصوف کی طرف بھی مائل ہوا۔ نیوٹن کی زندگی کا یہ پہلو خاصا چھپا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تصوف میں بڑا شغف رکھتا تھا اور انگریزی کے مشہور عالم صوفی شاعر بلیک کی طرح تصوف کا قائل تھا۔

۱۶۸۴ء کا ایک دن تھا۔ اب نیوٹن اکتالیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس کا ایک دوست ایڈمنڈ ہیلے سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ ایک مسئلے کے حل کے لئے نیوٹن کی مدد چاہتا تھا۔ یہ ہیلے تھا۔ جس نے ایک خاص انداز میں نیوٹن سے پوچھے بغیر رائل سوسائٹی میں یہ اعلان کر دیا کہ نیوٹن سیاروں کے مابین کام کرنے والی قوت کے بارے میں ایک مقالہ پڑھے گا اور اس سلسلے میں خاص شواہد اور ثبوت پیش کرے گا۔ رائل سوسائٹی نے اس میں دلچسپی کا اظہار کیا کہ اگر مقالہ ایسا ہی ہوا تو اسے دوبارہ منائے بھی کیا جئے گا۔

یوں نیوٹن کو یہ مقالہ لکھنا پڑا۔ اس نے پارس کی تلاش کو ترک کیا اور اپنے برسوں کے کام اکتشافات، تجربات، نظریات اور اختراعات کو منضبط صورت میں قلم بند کرنے لگا۔ یوں پرنسپیا کا پہلا حصہ مکمل ہوا۔ دوسرے حصے میں اس نے مختلف اجسام کی حرکت کے حوالے سے اپنے کام کو تکمیل صورت دی۔

نیوٹن کے ایک ہم عصر سائنسدان رابرٹ ہوک (Hooke) نے اس پر الزام لگایا کہ نیوٹن نے اس کے نظریے کو چور لیا ہے اس نے دعویٰ کیا کہ چھ برس پہلے نیوٹن کو اپنے اس نظریے سے متعارف کرایا تھا۔ نیوٹن نے یہ بات ملنے سے انکار کر دیا کہ ۲۰ برس پہلے یہ نظریہ قائم کیا تھا اور یہ اس کے اپنے تجربات اور افکار کا حاصل ہے۔ نیوٹن کو اس الزام اور یادہ گوئی کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے اعلان کیا کہ وہ پرنسپیا کا تیسرا حصہ اب کبھی نہ لکھے گا لیکن نیوٹن کے دوست ایڈمنڈ ہیلے اسے ترغیب دیتا، قائل اور مشورہ کرتا رہا اور یوں ”پرنسپیا“ کا تیسرا حصہ بھی مکمل ہو گیا۔ یوں پرنسپیا۔ ستمبر ۱۶۸۷ء میں مکمل ہو گئی۔ نیوٹن کی یہ کتاب جس نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا تین برسوں میں مکمل ہوئی۔

اب اس کی اشاعت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ رائل سوسائٹی کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ اسے

بتائے کر سکے۔ یہاں پھر ایڈمنڈ ہیٹلے نے فیاضی کا ثبوت فراہم کیا۔ اگرچہ وہ خود کو فی دولت مند شخص نہ تھا لیکن اس نے پرنسیا کو چھاپنے کا اہتمام کیا اور ۱۶۸۷ء کے موسم خزاں میں یہ کتاب شائع ہو گئی جو ایک بڑے سائنسی اور فکری انقلاب کا سبب بنی۔ ایڈمنڈ ہیٹلے نے مشہور ادیب سیمونل پیٹری (PEPYS) کا نام بطور پرنٹر دیا۔ پیٹری کو لندن کے پبلنگ کے زمانے میں لکھی جانے والی ڈائری کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔

پرنسیا، انسانی ذہانت کا عظیم ترین کارنامہ ہے اس کی تصنیف نے نیوٹن کو تھکا اور گھلا کر رکھ دیا۔ اس کی تصنیف کے زمانے میں وہ جنوبی اٹلی کی شہرت حاصل کر گیا، پرنسیا، اس کے ذہن پر اس طرح چھا چکی تھی کہ وہ ہر چیز بھول چکا تھا۔ کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتا اور سمجھتا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے۔

پرنسیا، کی اشاعت نے اسٹراٹونہ کو سائنس کا درجہ بخش دیا۔ پرنسیا کی اشاعت نے نیوٹن کو یورپ اور پھر پوری دنیا میں شہرت بخشی۔ لیکن اس کی یہی شہرت اس کے لئے باعث آزار بھی بنی۔ لوگ اس سے حسد کرنے لگے۔ بہت سے الزام لگانے جانے لگے کوئی کہتا کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں صرف نظریات پیش کئے گئے ہیں اور ثبوت فراہم نہیں کیا گیا۔ نیوٹن کے کارٹون بنائے جانے لگے اس کے نظریات کا مذاق اڑایا گیا۔

نیوٹن بہت حساس تھا۔ اسے شہرت کی کبھی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ اسی لئے اسے لوگوں کے لیے رویے سے بہت صدمہ اور دکھ پہنچا۔ حتیٰ کہ وہ تقریباً دماغی توازن کھو بیٹھا۔

بہر حال آنے والے دور میں اسے پارلیمنٹ کا رکن بنا لیا گیا۔ جان لاک جیسے فلسفی سائنس کی دوستی ہو گئی۔ تصوف سے دلچسپی لینے والا نیوٹن مذہبی گہرائیوں میں اترا تا چلا گیا۔

۱۶۹۶ء میں نیوٹن کے ایک سرکردہ دوست چارلس مونٹیگمو کی وجہ سے اُسے شاہی نمکسال میں وارڈن کا عہدہ مل گیا۔ تین برس کے بعد اُسے نمکسال کا اسپتال بنا دیا گیا۔ ۵۰ء میں اسے ملکہ این نے سر کے خطاب سے نوازا۔ اس کی زندگی اب پڑ سکون تھی کہ جرم فلسفی اور ریاضی دان لیمز نے دعویٰ داغ دیا کہ C A L C U L U S کو اس نے پہلے دریافت کیا تھا۔ نیوٹن نے نہیں جس نے اسے پھر خاصا صدمہ پہنچا۔

آخری عمر میں نیوٹن کو بائبل سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس نے بائبل کے ادوار کی ترتیب پر بھی بہت کام کیا۔ ۱۷۲۷ء میں جب اس کی عمر چوراسی برس تھی اس کا انتقال

ہوا۔ اسے ویسٹ منسٹر ایجے میں دفنایا گیا۔

پرنسپیا کے علاوہ اس نے کئی دوسری کتاہیں بھی لکھیں جن میں OPTICS بطور خاص قابل ذکر ہے لیکن یہ پرنسپیا ہے جس نے اسے شہرت و وام بخشی اور انسان پر علم کے نئے دروازے کھولے ہیں۔

اصل الانواع

باپ کی خواہش کہ وہ کلیسیا سے رشتہ قائم کرے اور پادری بنے۔ لیکن اس کے مقدر میں کچھ اور بنا لکھا جا چکا تھا۔ اس پر مذہب دشمنی، الحاد اور انسان کی قدر و قیمت گھٹانے کے الزامات اور فتوے لگے۔ جب وہ اصل الانواع "لکھ رہا تھا تو اس کی بیوی نے اس کے نظریات کا خلاصہ لکھ کر لوبلی "مگر یہ تو صرف الحاد اور مذہب دشمنی ہے۔ چارلس کیا تم خدا کو نہیں مانتے؟ تمہارے نظریات سے تو خدا ایک ظالم اور بے حس بن کر سامنے آتا ہے۔

چارلس ڈارون نے اپنی بیوی کو جواب دیا تھا۔ یہ جواب اسے بار بار دہرانا پڑا۔ اس نے کہا تھا۔

"میں خدا کو مانتا ہوں۔ میں اس سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ میں مذہب ہی آدمی ہوں۔ مگر جے عبادت کے لیے جاتا ہوں۔"

اس کے نام کے ساتھ ارتقاء کا منظر یہ وابستہ ہے۔ اس نظریے کی بدولت اس نے لاطینی شہرت حاصل کی اور اپنی کتاب *THE ORIGIN OF SPECIES BY MEANS OF NATURAL SELECTION OR THE PRESERVATION OF FAVOURED RACES IN THE STROGGLE OF LIFE*

۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تو ساری دنیا میں ایک ہلکے بچ گیا۔ اصل الانواع "نظری انتخاب" انتخاب ارتقاء اور جد اللہ بقا کے نظریات نے دنیا بھر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مذہبی حلقوں نے اس پر بائبل اور عیسوی مذہب کی توہین کے فتوے جاری کیے اور تب سے اب تک اس کی تعریف و تہلیل

کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے نظریات کو اس زمانے سے اب تک ہر دور میں پرکھا گیا اور اسے رد کیا گیا۔

دنیا کا یہ عظیم ماہر فطرت ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو شروپری انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس کے زمانے میں ہی اس کے نظریات کو ڈارون ازم کے نام سے شہرت و رسوائی حاصل ہوئی۔ وہ ڈاکٹر رابرٹ ڈارون الین آر کا بیٹا تھا۔ اس کے دادا اپرا سمس ڈارون نے ایک معالج شاعر اور فطری علوم کے فلسفی کی حیثیت سے بڑا نام کمایا تھا۔ ڈارون نے ابتدائی تعلیم شروپری میں حاصل کی اس کے بعد ایڈنبرگ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ رہا اور پھر کرائسٹ کالج کیمبرج میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے بی۔اے کی ڈگری لی۔ وہ سچپن سے ہی فطری عوامل اور مظاہر میں بے حد دل چسپی لیتا تھا۔ اور اس حوالے سے اس کے بعض استاد اسے بے حد پسند کرتے تھے۔

اس زمانے میں شاہی برطانوی بحریہ نے ایک جہاز۔ بیگل کپتان فرنر زمانے کی قیادت میں جنوبی امریکہ اور پھر ساری دنیا کے مطالعاتی دورے کے لیے روانہ کیا۔ ڈارون کو بطور نیچر سٹ اس مشن میں شامل کر لیا گیا۔ پانچ برس تک وہ دنیا کا چکر لگاتا، حشرات الارض، پودے، نباتات اور نوادرات اور ارضیاتی نمونے جمع کرتا رہا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کی محبوبہ نے دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ڈارون نے اس طویل بحری مشاہداتی اور مطالعاتی سفر کے دوران میں جو ڈائری لکھنی شروع کی۔ اس کی اشاعت نے اس پر شہرت کے دروازے کھول دیے۔ یہ سفر ۱۸۳۱ء میں شروع ہوا اور ۱۸۳۶ء میں اپنے اہتمام کو پہنچا۔ سفر کے دوران میں وہ ان گنت نمونے لندن بھیجا تا رہا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ ایک مشہور آدمی بن چکا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں اس کا جنرل شائع ہوا جس کا نام JOURNAL OF THE RESEARCHES INTO THE GEOLOGY AND NATURAL HISTORY OF THE VARIOUS COUNTRIES VISITED BY H.M.S BEAGLE, ZOOLOGY OF THE VAGAGE OF H.M.S BEAGLE ہے اس کی اشاعت نے متعلقہ علوم کے نئے دروازے داکر دیے۔ ۱۸۴۳ء میں اس کی دوسری اہم تحقیقی کتاب

JOURNAL OF THE RESEARCHES INTO THE GEOLOGY AND NATURAL HISTORY OF THE VARIOUS COUNTRIES VISITED BY H.M.S BEAGLE, ZOOLOGY OF THE VAGAGE OF H.M.S BEAGLE

شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کی کئی دوسری اہم تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں جنہوں نے نیچرل سائنس کی دنیا میں نئے رُکشف اور دریافتوں کے دروازے کھولے۔ اس کی ان کتابوں نے علمی اور سائنسی

حلقوں میں اسے بڑی شہرت بخشی۔ لیکن اس وقت کوئی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ اس شخص کا نام ساری دنیا میں ہمیشہ کے لیے لافانی ہو جائے گا۔ پوری دنیا اس کے افکار سے فیضیاب ہو گی۔ اور خود اس وقت چارلس دارون کو بھی یہ وہم و گمان نہ تھا کہ دنیا میں اسے کیا مقام حاصل ہونے والا ہے۔

۱۸۴۳ء میں اس نے اپنے مہتمم بالشان کام برطانیہ ایک رسالہ مکمل کر لیا تھا۔ اپنے اس عظیم اور منفرد کام کو اس نے کئی بار التوا میں ڈالا تھا۔ اور کسی دوسرے تحقیقی کام کو مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ”قدرتی انتخاب کے اصول پر“ اس کا کام خدا اس کے لیے خاصا پریشان کن ثابت ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس پر بہت لے دے ہوگی۔ اسے کافر و ملحد اور لادین گردانا جائے گا۔ کلیسا اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ درست اور حقیقی ہے۔ اس لیے اسے ایک نہ ایک دن یہ کام دنیا کے سامنے لانا ہی پڑے گا۔ ۱۸۵۸ء میں جب الفریڈا ویلس نے اس موضوع پر اپنا مسودہ بھیجا تو ڈارون چونکا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے کام کو دنیا کے سامنے لائے۔ اس نے اپنے قریبی اصحاب سے مشورہ کیا اور پھر اپنے مسودے کو مکمل کرنے میں جُت گیا۔

۱۸۵۹ء میں اصل الانواع کا مسودہ شائع ہوا اور ڈارون نے دیکھا کہ اس کے بہت سے علاج اب اس کے خلاف تنقیدی اور مخالفانہ مضامین لکھ رہے تھے لیکن عوام اور خاص حلقوں میں اس کے کام کی شاندار پذیر ہوئی۔

”اصل الانواع“ میں جانوروں، پودوں کی حیاتیاتی نشوونما کے حوالے سے ڈارون نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا اور فطری اخذ و انتخاب کے اصول کو بھی دنیا کے سامنے لایا۔ بقایاے اصل اور جہد البقاء جیسے نظریے جنہوں نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اسی کتاب کی دین ہیں۔

اسی کتاب کے حوالے سے الٹائی نسل اور انسان کے حیاتیاتی ارتقاء کا باقاعدہ مطالعہ شروع ہوا۔ جس پر ڈارون کے حوالے سے آج تک تنقید و تخریص کی جاتی ہے۔ لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ڈارون کے نظریات پر اعتقاد رکھنے والوں کی ہمیشہ سے ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے۔ مذہبی اور قدامت پسند حلقوں میں اب بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے کہ انسان

کا ارتقار ایک خاص قسم کے بندر کی نسل سے ہوا ہے۔

”اصل الانواع“ کے بعد ڈارون کی کچھ اور اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ جن کی اشاعت اور مقبولیت سے ڈارون کو ایک خاص مسرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان کتابوں ”فرٹیلٹیزیشن آف آرچیزڈ“ وغیرہ کی اشاعت پر لوگوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد جب اس کا دوسرا عظیم ترین کام ”دی ڈیسینٹ آف مین“ شائع ہوا۔ جس کا پورا نام: *THE DESCENT OF MAN: OR THE EXPRESSION OF THE EMOTIONS IN MAN AND ANIMALS*۔ شائع ہوا تو پھر طوفان اُٹھا۔ اگرچہ اب اس میں ”اصل الانواع“ جیسی مخالفت کی شدت نہ تھی۔

ڈارون نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ علالت میں بسر کیا۔ اس کی بیوی ایما برٹی محبت والی اور شفیقہ خاتون تھی۔ جس نے اسے کام اور غور و فکر کے مواقع فراہم کیے۔ ڈارون کی زندگی کے آخری چالیس برس علالت میں گزرے اور انہی چالیس برسوں میں اس نے اپنی زندگی کے عظیم کارنامے انجام دیے۔ انسان کے اعتبار سے وہ بڑا دھیمہ، سوسش مزاج بہادر اور فراعقل انسان تھا۔ وہ اپنے نام آنے والے خطوط کے جواب خود دیتا تھا۔

۱۹ اپریل ۱۸۸۲ء کو اس کا انتقال ہوا اور اس کا خاندان اسے قصبے کے قبرستان میں اس کے مہبالی اور بچوں کی قبر کے پاس دفن کرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن اس کے مداحوں اور دوستوں نے اسے دارالعوام سے ویسٹ منسٹر ایبے میں دفنانے کی اجازت حاصل کر لی۔ جہاں انگلستان کے مشاہیر دفن کیے جاتے ہیں۔

ڈارون کو اسی جیسے ایک خلاق اور عظیم سائنسدان نیوٹن کے پہلو میں دفن کیا گیا اس کے جنازے میں مختلف ملکوں کے سفارت کار اور سائنسدان شریک ہوئے۔ اس کے ہزاروں مداحین اس کے جنازے کے ساتھ سوگوار چل رہے تھے۔

اس نے اپنی زندگی میں کئی اعزاز اور ڈگریاں حاصل کیں لیکن اسے حکومت برطانیہ نے سر کے خطاب سے نوازا حالانکہ اس کا عظیم کام اس خطاب کا پورا استحقاق رکھتا تھا۔ رابرٹ مورلے نے اس حوالے سے ایک دلچسپ بات لکھی ہے جس پر یقین کر لینے کو بے

اختیارجی چاہتا ہے۔ رابرٹ مورلے نے لکھا،
 "کلیسیا اس کے نظریات کا شدید دشمن تھا برطانوی حکومت پر اس وقت
 ملکہ وکٹوریہ کی عملداری تھی جسے علوم و فنون کا بڑا سرپرست تسلیم کیا جاتا ہے۔
 لیکن ملکہ وکٹوریہ بھی کلیسیا کی مخالفت مولیٰ لے کر اسے سر کا خطاب دینے سے
 ساری عمر بچکچاتی رہی اور بالآخر ڈارون یہ خطاب حاصل کیے بغیر ہی دنیا سے
 اٹھ گیا۔"

دنیا بھر کے کارٹونسٹ، مزاح نگار، مذہبی علماء، سائنسدان، مفکر اور شاعر ڈارون
 کا اب تک خاکہ اڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی علماء اور شاعروں نے اس کے
 نظریات کی خوب مہم اڑائی ہے لیکن ایک سائنسی اور علمی کام کا جس طرح سے سنجیدگی اور
 استدلال کے ساتھ رویا دیکھا جاسکتا ہے وہ ہمارے ہاں کسی نے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔
 موجودہ دور میں بعض ایسے امکانات بھی ہونے لگے ہیں کہ جن کے حوالے سے یہ ثابت
 کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ڈارون کا پیش کردہ نظریہ ارتقاء اور اصول فطری انتخاب
 خام اور غلط تھا۔ اس کے باوجود ڈارون کے نظریات کو نہ تو پوری طرح جھٹلایا جاسکا ہے
 اور نہ ہی اس کے اثرات میں ہی کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔

ذیل میں میں نے "اصل الانواع" DESCENT OF MAN اور ڈارون
 کی دوسری تحریروں سے بعض ایسے اقتباسات جمع کیے ہیں جن سے اس کے نظریات پر
 خاصی روشنی پڑتی ہے۔

ڈارون نے بیگل میں سفر کے بعد ہزاروں خول، پودے، پڑیاں، حشرات الارض
 وغیرہ محفوظ کر لیے تھے۔ وہ ان کے مطالعے اور مشاہدے میں مصروف رہتا تھا۔ اپنے خیالات
 اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتا رہتا تھا۔ اپنی ڈائری میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

آخر زندگی اتنی مختصر کیوں ہے؟ انسان کیوں مر جاتے ہیں؟ انسان بچپن سے لے کر
 بڑھاپے تک ایک سا کیوں نہیں رہ سکتا۔

ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے۔

”اگر کوئی جاندار مٹے اپنی الگ ہیئت اور شکل و صورت لے کر پیدا ہوئی ہے تو بہت سے لوگوں کے لیے یہ اپنی موت تک اسی شکل و صورت میں رہے گی۔ لیکن یہ لازمی ہے کہ برہا برس یا صدیاں گزرنے کے بعد اس کی شکل و صورت یا ہیئت میں کچھ تبدیلی ہو جائے گی اور اسے اس کے پہلے روپ اور چلیے کے حوالے سے پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔

”ستارہ نناک کہتے ہیں کہ خدائے کائنات میں جتنے سیارے اور دیگر اجرام فلکی بنا رکھے ہیں۔ انہیں ان کے اپنے راستوں پر چلنے کا حکم دے رکھا ہے اور یہ خالق کے حکم کے تابع ہیں۔ اسی طرح خدا مختلف مخلوقات کو ایک دوسرے سے الگ مختلف شکلوں اور رنگ روپ میں پیدا کرتا ہے۔ ان مخلوقات کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں اپنی الگ شکل و صورت میں سینکڑوں، ہزاروں برس جیتی مرتی رہتی ہیں اور اتنے طویل عرصوں کے دوران ان کی ہیئت اور رنگ و روپ میں تدریجاً غیر محسوس طریقے سے تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی اصلی ہیئت اور شکل و صورت سے یکسر مختلف قسم کی مخلوقات بن جاتی ہیں۔

”جب انسان کی دونوں آپس میں ملتی ہیں تو ایک دوسرے کی جانب ان کا ردیہ جانورانہ کی دونوں جیسا ہوتا ہے یہ آپس میں لڑتی ہیں۔ ایک دوسرے کو کھا جاتی ہیں۔ ایک دوسرے پر دہائی امراض مسلط کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب ان کے درمیان بقا کی فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے۔۔۔ اس قسم کی جنگیں صرف انسانوں کے درمیان ہی نہیں لڑی جاتی ہیں۔ بلکہ خشکی اور پانی کے جانور حتیٰ کہ حشرات الارض اور پودے وغیرہ بھی یہ جنگ لڑتے ہیں۔ اس جنگ میں ان سب چیزوں کی ایک نسل بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہے اور دوسری نسل خوب پھیلتی پھولتی ہے اور یہ قانونِ عظمت کے عین مطابق ہے۔

”ہر چیز اپنی پیدائش کے وقت اپنی ایک الگ ہیئت و صورت رکھتی ہے۔ آگے چل کر اس میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس کا سبب حالات ہوتے ہیں جن میں سے اسے گزرنا ہوتا ہے اور حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ پس حالات کی تبدیلی بھی مختلف اشیاء

کے تغیر و تبدل میں ایک اہم محرک ثابت ہوتی ہے۔

”یہ جانور جو ہمیں روئے زمین پر پلٹے پھرتے دکھائی دیتے ہیں یہ اپنے ابن ہم جنسوں سے بدرجہا خوب صورت طاقتور اور جاندار دکھائی دیتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے روئے زمین سے نیست و نابود ہو چکے ہیں اور اب محض ہڈیوں کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ یا سخت چٹانوں اور مٹی کے مادوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔“

”موت، قحط، مہلک وبائی امراض اور فطرت کے خفیہ ہتھیار یعنی زلزلے، طوفان وغیرہ کسی بھی نوع کی ایک نسل کا صفایا کر کے دوسری نسل کی پیدائش کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں قابلِ قدر کام سرانجام دیتے ہیں۔“

”ہماری زمین قدرت کے ایک لگے بندھے اصول کے مطابق حرکت کرتی ہے اسی طرح انسانی اور حیوانی زندگیوں میں بھی قدرت کے ایک لگے بندھے قانون کے تحت اس زمین پر محض وجود میں آتی ہیں اور اپنا کام کر چکنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔“

”نوع حیوانات کی مختلف نسلوں کی فنا و بقا کا انحصار ان حالات پر بھی ہوتا ہے جن میں انہوں نے جنم لیا ہوتا ہے اور پرورش پالی ہوتی ہے۔ موسم آب و ہوا اور ماحول اور وقت ان کی نشوونما اور ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ اس عمل نشوونما اور ترقی پر کچھ اس طرح فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ ان حیوانات کی جسمانی ساخت اور شکل و صورت پہلے جیسی نہیں رہتی بلکہ اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان تبدیلیوں اور تغیرات کی ذمہ داری وقت اور حالات پر عائد ہوتی ہے۔“

”انسان نے اپنی موجودہ جسمانی ساخت، شکل و صورت سب اپنے تجرباتی مراحل سے گزرنے کے بعد حاصل کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان پہلے اپنی جسمانی ساخت اور شکل و صورت کے لحاظ سے اپنی موجودہ حالت سے قطعی مختلف ہوا کرتا تھا۔“

”قیاس و خیال کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ براہِ راست اس نتیجے پر پہنچے گا کہ چند مخصوص حیوانات اور انسانوں کا سرچشمہ ابتدائے پیدائش ایک ہے۔ اب یہ صرف معلوم کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ آخر کن وجوہات اور اسباب کی بنا پر انسانوں نے اپنی حیرانِ جسامانہ ساخت

اور شکل و صورت تبدیل کر کے موجودہ ترقی یافتہ جسمانی ساخت اور شکل و صورت اختیار کر لی ہے
 ”حیوانات اور پرندوں کی جو اقسام قدرت کی پسندیدہ ہوتی ہیں وہ فنا سے محفوظ رہتی
 ہیں اور جو قدرت کی ناپسندیدہ ہوتی ہیں وہ مکمل فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ (مالخوس کا بھی
 بعض نسلوں کی فنا و بقا کے بارے میں نظر یہ تھا۔ س۔ ط)

”الزاع کی تبدیلی بعض مخصوص حقائق و اسباب کی مرہون منت ہوتی ہے۔ جیولوجیکل
 ہسٹری، مخلوقات کی جزیئیاتی تقسیم اور پھیلاؤ، ابتدائی حصے، مبادیات پیدائش۔ بعض
 جانور اپنی پیدائش کے ابتدائی حصوں میں کچھ اور ہوا کرتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے
 ہیں مثال کے طور پر ڈیپل مچھلی پہلے جب وہ اپنے بچپن کے ابتدائی زمانے سے گزرتی ہے۔
 تو اس کے منہ میں دانت ہوتے ہیں مگر جب وہ مکمل بلوغت کو پہنچتی ہے تو اس کے منہ
 میں دانت نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایک نوزائیدہ بچھڑے کے اور پری جڑے میں بھی دانت
 نہیں ہوتے حیرت انگیز نظر یہ انتخاب ہمیں سے جڑ لیتا ہے۔ یعنی جب فطرت چیزوں کو
 زندہ رکھنے کے لیے انتخاب کر لیتی ہے تو وہ روئے زمین پر ہزاروں برس تک اپنا وجود
 برقرار رکھتی چلی آتی ہیں اور جو چیزیں فطرت کی ناپسندیدہ ہوتی ہیں وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتی
 ہیں اور ہمیشہ کے لیے روئے زمین سے نابود ہو جاتی ہیں۔

”یہ نظریہ خلاف مسیحیت نہیں۔ کلیسا کی نظریات محض مفروضات اور من گھڑت اور
 افسانوی قیاسات پر مبنی ہیں جبکہ سائنس حقائق کو کھوجتی ہے۔ ہر نظریے کو عملی تجربات کی کسوٹی
 پر پرکھنے کے بعد فیصلہ کن قرار دیتی ہے۔ یہ تمام سائنسی نظریات خدا کے وجود کو باطل نہیں
 قرار دیتے۔ خدا کا پسندیدہ مخلوق کو زندہ اور ناپسندیدہ مخلوق کو فنا کر دینا خدا کے بے انصاف ہونے
 پر دلالت نہیں کرتا بلکہ خدا کا یہ کام مبنی پر انصاف دکھائی دیتا ہے۔ اگر بعض مخلوقات کی فنا
 بقا کا سلسلہ یونسی ہزاروں سال سے جاری نہ رہتا تو اس وقت روئے زمین پر تو کوئی مخلوق
 موجود نہ ہوتی یا پھر ہر مخلوق اتنی تعداد میں ہوتی کہ یہاں پر انسان کے قدم دھرنے کی جگہ بھی
 موجود نہ ہوتی۔

”بیج بھی مختلف اقسام کے ہوتے ہیں اور مٹی بھی۔ بیج ہر طرح کی مٹی کے اندر نہیں چھوٹ

مکتا۔ موائی اور ناموائی حالات اور موسم بھی ان کی افزائش میں رکاوٹ بنتے ہیں بہت سی اقسام کے بیج پرندوں کے پسندیدہ ہوتے ہیں جنہیں وہ کھا جاتے ہیں۔ بہت سے بیج ایسے ہوتے ہیں جنہیں کھڑا لگ جاتا ہے۔ وہ کھڑے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

پودوں میں بھی اصول وراثت کام کرتا ہے۔ ڈارون نے اس اصول وراثت کے لیے ایک لفظ PANGENESIS استعمال کیا ہے۔ پودوں کا یہ اصول وراثت اس طرح کا ہے کہ یہ علیحدہ یونٹ یا غلیہ آئندہ اگنے والے پودوں کے بیج یا جراثیم کی پیدائش میں اپنا ایک حصہ رکھتا ہے اور مستقبل کے اگنے والے پودوں میں یہ حصہ موجود ہوتا تھا اور اپنے طور پر چھلتا چھوکتا تھا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان اپنی جسمانی ساخت اور شکل و صورت کے لحاظ سے اپنی موجودہ حالت سے خاصا مختلف تھا۔ پہلے اس کے جسم پر لمبے لمبے بال ہوا کرتے تھے۔ اس کے کان ٹوکیلے ہوتے تھے اور اس کی دم بھی ہوا کرتی تھی۔ اس قدیم مخلوق کے ڈھانچے پر اگر تحقیقات کی جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ مخلوق قدیم بندروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتی تھی۔ جسے MADRUMANA کہا جاتا ہے اور یہ اونچے درجے کے میل دو دھریے والا MAMMAL شاید ایک بے حد قدیم MARSUPIAL جانور کی نسل سے ہیں۔ اس جانور سے ANADRUM نامک پہنچنے میں اس مخلوق کو بے شمار ارتقائی مدارج سے گزرنا پڑا ہے۔ کبھی یہ ریگنئے والے جانور بنتے ہیں تو کبھی مچھلی کی مخلوق تو کبھی زمین اور پانی دونوں میں زندہ رہنے والی AMPHIBIAN مخلوق گہری تحقیقات اور چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر آج کل چھتھی بھی ریڑھ کی ہڈی رکھنے والی مخلوقات بشمول انسان موجود ہیں وہ اپنے ابتدائی زمانے میں ایسی مخلوق ہوا کرتی تھیں جو خشکی و تری دونوں میں زندہ رہنے پر قادر تھی۔ اس مخلوق میں نر اور مادہ دونوں کے جنسی اعضا ایک ساتھ موجود ہوتے تھے۔ البتہ یہ مخلوق دماغی طور پر کمزور ہوا کرتی تھی۔ اور اس کا دل بھی صحیح طور پر کام نہ کرتا تھا۔

چارلس ڈارون کے بارے میں آغز میں دو باتیں :-

”اصل الانواع کا پہلا ایڈیشن صرف ساڑھے سات سو کاپیوں پر مشتمل تھا جو ہاتھوں

ہاتھوں تک گیا۔

پہلا ایڈیشن پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کی جلد سبز رنگ کی تھی۔
 چارلس کی زندگی میں ہی اس کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے۔
 ایک وقت ایسا آیا کہ کلیسا کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ "اصل الانواع کو نذر
 آتش کر دیا جائے کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے ڈارون کو مر کا خطاب نہ مل سکا۔
 اور آخر میں ایک دلچسپ واقعہ

چارلس ڈارون کو کیمبرج یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دینے
 کا فیصلہ کیا۔ ڈارون اپنی بیوی کے ہمراہ کیمبرج پہنچا۔ سینٹ ہاؤس کی گیلری کھینچ بھری تھی
 ڈارون کے ہال میں داخل ہوتے ہی طالب علموں اور مہمانوں نے پر جوش تائیاں بجا کر اور
 نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔ ڈارون نے مسکرا کر سب کو دیکھا۔ وائس چانسلر کی آمد آمد
 تھی۔ ان کا اترغار ہو رہا تھا کہ اچانک ایک بندر اچھلنا کو دتا سیٹیج پر آیا چند تھلا بازیاں لگا کر
 غائب ہو گیا۔ ہنسی قہقہوں کا ایک طوفان اُٹ پڑا۔

طالب علموں نے اپنی دانست میں بندر کو ان کا مورث اعلیٰ قرار دینے والے ڈارون
 کے ساتھ خوب مذاق کیا تھا !!

مقدمہ

ابن خلدون - فلسفہ تاریخ کے بانی اور عمرانیات کے امام اور پیشرو سمجھے جاتے ہیں۔ ابن خلدون کو ان کے مقدمہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی زندگی کے پورے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ یوں تو ابن خلدون نے بھی ایک کتاب اپنے ذاتی حالات و واقعات پر لکھی ہے۔ لیکن اس سے بھی ان کی پوری زندگی کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں۔

ابن خلدون - کے بارے میں یہ بات اب بھی وثوق سے کسی جاسکتی ہے کہ ان کی جو شہرت اور وقعت اسلامی ممالک میں ہوئی چاہیے سختی وہ انہیں آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔ مغرب کا ایک یہ بھی احسان ہے کہ اس کے علمائے ابن خلدون کے صحیح مقام کا تعین کیا۔ اور ابن خلدون کی عظمت و علمی برتری کو پھیلایا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خود ابن خلدون کی اپنی زندگی میں اور اس کے بعد عالم اسلام کے علما اور فقیہوں نے جیسے جیسے الزامات اس پر تراشے اور اس کے عظیم کام کو دفن کرنے کی کوشش کی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو آج ابن خلدون کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔

ابن خلدون کی تصنیف - مقدمہ - ایک ایسی تصنیف ہے جو دنیا کی سب سے بڑی کتابوں میں اگر شامل نہ کی جائے تو یہ فہرست ناممکن رہے گی۔ مقدمہ نے ابن خلدون کو فلسفہ تاریخ کے بانی کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کے اس مقام کا کوئی معرینہ نہیں ہے۔ اس طرح وہ عمرانیات کے امام اور پیشرو تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ابن خلدون کا پورا نام - ابو زید ولی الدین عبدالرحمان بن ابی بکر محمد بن ابی عبداللہ محمد بن الحسن بن محمد بن جعفر بن محمد بن ابراہیم ابن عبدالرحمن بن خلدون ہے۔ وہ ۷۳۲ ہجری میں تیونس میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر طرہ حسین نے ابن خلدون پر مقالہ لکھ کر سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر طرہ حسین کی علمی فضیلت اور اختیار سے انکار محال ہے لیکن ابن خلدون پر ان کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہونا ہے کہ وہ جہاں ابن خلدون کے بے پناہ قائل دکھائی دیتے ہیں وہاں ان کا مضحکہ اڑانے میں بھی سب سے آگے ہیں۔ ڈوڑھی، شمشیدٹ وغیرہ نے ابن خلدون پر کام کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر طرہ حسین کے کام سے کہیں زیادہ دقیق ہے۔ خاص طور پر شمشیدٹ کی کتاب جسے مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

ابن خلدون کی ابتدائی تعلیم قرآن پاک سے ہوئی۔ انہوں نے قرآن پاک کا درس ساتوں قرأتوں کے ساتھ لیا۔ اس کے بعد احادیث کا درس لیا۔ وہ سترہ برس کے تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو گیا۔

ابن خلدون کے مزاج کی دو خصوصیات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ جوانی میں ہی اتنا علم حاصل کر چکے تھے کہ وہ کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو ان کی اقتدار اور جاہ پسندی ہے۔ انہوں نے جیسی زندگی گزاری وہ بے حد حیران کن اور غیر معمولی نوعیت کی ہے۔ اقتدار اور مرتبے کے حصول کے لیے ابن خلدون کسی رشتے اور پیمان کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

تیونس کے امیر اسماعق الحصفی کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ انہیں کاتب کا عہدہ ملا۔ جو ابن خلدون کو پسند نہ تھا۔ امیر ابو زید کے خلاف جب امیر اسماعق کا لشکر لڑائی کے لیے روانہ ہوا تو ابن خلدون بھی ہمراہ ہو گئے۔ ارادہ تھا کہ اس طرح امیر اسماعق کی ملازمت سے بھاگ نکلیں گے اور امیر ابو زید کو فتح ہوئی۔ تو اس کا ساتھ دے کر اعلیٰ رتبہ حاصل کریں گے۔ لیکن لشکر کو شکست ہوئی۔ ابن خلدون نے ایک گاؤں میں پناہ لی اور پھر بہت عرصے تک یوں ہی چھپے رہے۔ ابو عنان امیر مراکش کو ان کی موجودگی کی خبر ملی تو

ابن خلدون کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ ان کو سیکرٹری (امیر اسرار) تک عہدہ ملا۔ مگر ابن خلدون اس سے بھی مطمئن نہ تھے۔

ابن خلدون جس دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور میں عالم اسلام کی مرکزیت بہت حد تک ختم ہو چکی تھی۔ آپس میں اقتدار کی جنگیں ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف بڑی بڑی سازشیں کی جاتی تھیں۔

بجایہ کادالی ابو عبد اللہ۔ امیر مراکش ابو عنان کی قید میں تھا۔ ابن خلدون نے ایک سازش تیار کرنی شروع کر دی کہ ابو عبد اللہ کو ابو عنان کی قید سے نکال کر بادشاہ بنایا جائے۔ ابن خلدون اور ابو عبد اللہ کے درمیان طے پایا کہ اگر ابن خلدون کی سازش کامیاب ہوئی تو ابو عبد اللہ ان کو اپنا وزیر بنائے گا۔ لیکن ابن خلدون کی سازش کھل گئی۔ اور ابن خلدون کو زندان کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہیں اس وقت رہائی نہ ہوئی جب ابو عنان کا انتقال ہو گیا۔ نئے حکمران الحسن بن عمر نے ابن خلدون پر خاص احسان کرتے ہوئے ان کو رہا کیا تھا۔ مگر ابن خلدون نے اس کے خلاف بھی سازش میں حصہ لیا۔ ابو المنصور حکمران بنا۔ مگر اس سے بھی ابن خلدون کی زیادہ دیر نہ بچ سکی۔ ابوسلم تخت کا دعوے دار ہوا تو ابن خلدون اس کے ساتھ ہو لیے۔ سازش کامیاب رہی۔ ابوسلم نے ابن خلدون کو اپنا مشیر خاص اور وزیر بنا لیا۔ لیکن ابن خلدون کو یہ منصب جلیلہ بھی راس نہ آیا۔ حکومت کے دوسرے عمال اس کے خلاف ہو گئے اب ابن خلدون نے اپنے ایک ساتھی سے مل کر ابوسلم کی حکومت کا تختہ الٹا دیا۔ لیکن ابن خلدون اقتدار سے محروم رہا۔ اس کا دوست تخت پر قابض ہو گیا۔ ابن خلدون تیونس سے بھاگے اور ہسپانیہ چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عزناطہ کے ابو عبد اللہ خامس کو اقتدار سے الگ کیا جا چکا تھا۔ ابن خلدون نے پھر ایک نئی سازش اور ایک نیا منصوبہ تیار کیا۔ ابو عبد اللہ خامس کو عزناطہ کا تخت دلانے کے لیے ابن خلدون نے اپنی سازشیں اور کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۳۶۶ء میں ابو عبد اللہ تخت پر براجمان ہو گیا۔ اس نے ابن خلدون کی خدمات کے عوض اپنا مقرب خاص بنایا اسے وزیر کا عہدہ بھی ملا۔ مگر ابن خلدون اپنی عادت یا طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وہ پھر اقتدار میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ جب ابو عبد اللہ کے چچیرے

بھائی نے حکمران کے خلاف سازش کی تو اعانت کرنے لگے۔ ابو عبد اللہ غامس اپنے چچ پر سے
 بھائی امیر عبدالعباس کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اب امیر عبدالعباس ابن خلدون کا مدد و تحمیر
 لیکن اب بھی جی کو قرار نہ آیا ان کی ذہانت اور سازشوں کی وجہ سے ان کی مخالفت کا بازار
 گرم ہوا۔ ابن خلدون نے بھاگنا چاہا لیکن گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد رہائی
 نصیب ہوئی۔ وہ افریقہ بھاگ نکلے۔ کچھ عرصہ سلطان ابوحمود کے ساتھ بھی رفاقت کی
 لیکن ابن خلدون کی دلی آرزو کہ وہ پورا اقتدار حاصل کر سکیں۔ کبھی پوری نہ ہوئی۔ انہوں
 نے سیاست کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر میں زندگی بسر کرنے کی خواہش قوی ہوئی۔
 لیکن ان کے اس فیصلے اور کنارہ کشی کے باوجود ان کی سابقہ شہرت کی وجہ سے حکام اور
 حکمران ان سے خائف رہے کہ وہ پھر کسی نئی سازش کا ڈرل نہ ڈال دیں۔ ان کے علمی کام
 کی تیونس کے مفتی اعظم اور فقیہ نے شدید مخالفت کی۔ ان کے خلاف بادشاہ کو بھرا لیا
 ان پر کفر و الحاد کے الزام لگائے۔ ابن خلدون اب تیونس سے بھاگے تو مصر جا کر دم لیا۔
 یہاں ان کی شہرت پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ کچھ عرصہ جامعہ ازہر میں درس دیا پھر ملک النظار
 نے ان کو قضا کا عہدہ سونپ دیا۔ رشوت ستانی اور بدعنوانی کے خلاف ابن خلدون
 نے ایسے سخت احکام اور اقدامات جاری کیے کہ عمال اور حکام ان کے مخالف ہو گئے ایک
 بار پھر ابن خلدون نے عدالت نشینی اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اس کی بدبختی اپنی انتہا
 کو پہنچ گئی۔ بیوی بچے تیونس سے مصر آ رہے تھے کہ جہاز راہ میں عرق ہوا اور وہ سب
 ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ جب ابن خلدون کو خبر ملی تو اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا۔
 "اس حادثے سے میں مالی خوش بختی اور اولاد سب سے محروم ہو گیا۔"

دل شکستہ ابن خلدون نے حج کیا۔ مدینہ منورہ گئے۔ مصر واپس آ کر پھر قاضی کا عہدہ
 سنبھالا پھر اس سفارت میں شریک ہوئے جو امیر تیمور کو یہ سمجھانے گئی تھی کہ وہ مال دولت
 لے کر دمشق سے چلا جائے اور تباہی نہ پھیلے۔ دغدغہ کو ناکامی ہوئی مگر ابن خلدون نے
 امیر تیمور سے علیحدگی میں ملاقات کی۔ امیر تیمور بے حد متاثر ہوا اور فرمائش کی کہ وہ اس
 کے لیے افریقہ کی تاریخ رقم بند کر دے۔ ابن خلدون نے یہ دعوت قبول کی اور ایک

میں نے امیر تمبور کا مہمان رہ کر کتاب مکمل کر دی۔ ابن خلدون کی بے حسمی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہ بھول ہی گئے کہ وہ کس مقصد کے لیے امیر تمبور کے پاس بھیجے گئے تھے امیر تمبور ان کا قدردان بن گیا تھا اس کے باوجود ابن خلدون نے اپنے اثر و رسوخ سے کام نہ لیا۔ شاہی مہمان بنے عیش کرتے رہے اور بڑا انعام حاصل کیا۔ امیر تمبور نے دمشق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابن خلدون کو مطلق احساس ہوا نہ دکھ۔ مصر واپس آ کر ابن خلدون کا انتقال ہو گیا۔

ابن خلدون - فلسفہ و تاریخ کا بانی اور عمرانیات کا پیشرو امام

مشہور عالم، مقدمہ اور تاریخ ابن خلدون کے علاوہ بھی ابن خلدون نے کئی تصانیف رقم کیں۔ جن میں شرح قصیدہ بُردہ ابن رشد کے بعض رسائل کی تلخیص، المحصل کی تلخیص، منطق اور ریاضی پر کتا بچے اور رسالے۔ وہ شاعر بھی تھا۔ حکمرانوں کے قصیدے بھی لکھتا رہا۔ ایک فرزند اسے اس کی جتنی خط و کتابت ہوتی اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ شاعری میں ہوتی۔

مورخ کی حیثیت سے ابن خلدون کا مقام بے حد بلند ہے۔ وہ کشادہ دل وسیع الفہم مورخ ہے وہ پہلا مسلمان مورخ ہے جو مغرب کی تاریخ و حالات سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، ناروے، ڈنمارک وغیرہ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔

وہ فلسفہ و تاریخ کا بانی تھا۔ اس کے بارے میں ہمارے بعد عظیم معترف ٹائٹل نے اپنی کتاب *A STUDY IN HISTORY* میں لکھا ہے۔

”جہاں تک اس علم کا تعلق ہے عربی لٹریچر ایک ہی نام سے روشن ہے۔ وہ ہے ابن خلدون۔ عیسائی دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ افلاطون اور ارسطو اور آگسٹن بھی اس کے ہم پلہ نہ تھے۔ ابن خلدون نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ تاریخ صرف واقعات و احوال تذکرہ نہیں، اس کا اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ ابن خلدون تسلسل زمانی کا قائل ہے۔ اس کا نظریہ ہے۔“

”ماضی مستقبل سے اس طرح مشابہ ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دوسرے قطرے“
 ابن خلدون معاشرے کو ایک کلیت سمجھتا ہے۔ ہر دور اور زمانہ ایک اکالی ہے
 جس کا ایک مخصوص سیاسی اور اقتصادی مزاج ہے اور اس کے تقاضے معین ہوتے ہیں۔
 ابن خلدون مقدمہ میں ہمیں بتاتا ہے کہ فلسفہ تاریخ دو محوروں کے گرد گھومتا ہے۔
 ۱۔ تاریخ میں بھی اسی طرح تعلیل اور استنباط کا قاعدہ موجود ہے جس طرح فقہ میں۔
 ۲۔ واقعات کی تصحیح کے لیے محض روایات کا سہارا اور اعتماد کافی نہیں بلکہ اس
 عمد کے تمدنی اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ ناگزیر ہے۔

ابن خلدون کا نظریہ ہے۔

قومیں مختلف سیاسی کردلوں سے بدلتی رہتی ہیں۔ ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتی
 ہیں۔ مزاج عوامل اور رسم و رواج ان تبدیلیوں میں اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ گویا بالکل
 ایک نئی قوم معرض وجود میں آگئی ہو۔

عمرانیات کا پیشرو

عمرانیات کا علم بمشکل ڈیڑھ دو صدی پرانا ہے۔ سوشیالوجی کی اصطلاح میں سب
 سے پہلے آگسٹ کومٹ کے ہاں ملتی ہے۔ مگر ابن خلدون کی عظیم عمد آفرین اور تاریخ سنا
 تصنیف ”مقدمہ“ میں عمرانیات کے بارے میں وہ اظہار خیال کرتا ہوا ملتا ہے۔ وہ ہمیں
 بتاتا ہے کہ معاشرہ کس طرح تشکیل پاتا ہے اور پھر کس طرح ریاست کا روپ اختیار کرتا
 ہے۔ مقدمہ میں ابن خلدون بتاتا ہے۔

”انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اکیلا اور تنہا نہیں رہ سکتا۔ انفرادی زندگی دراصل

حیوانات کا حصہ ہے۔“

تمدن کی دوسری بنیاد دفاعی ضرورت پر استوار ہوتی ہے۔ ابن خلدون بتاتا ہے کہ
 حیوانوں کو ان کے دفاع کے لیے قدرت نے سینگ، پنجے، خونخوار دانت اور وحشت دی
 ہے جس سے وہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ انسان بے ہتھیار ہوتا ہے اس لیے انسان

ایکلا نہیں رہ سکتا۔ گروہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یوں انسانوں کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان اجتماعیت کا آغاز کرتا ہے تو مختلف طبائع، مزاج اور کرامت کی وجہ سے اختلافات رونما ہوتے ہیں جو فسادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔
ابن خلدون کہتا ہے:-

”انسان نظام اطاعت کا دل سے قائل ہے۔“

حشرات الارض میں جو اطاعت پالی جاتی ہے وہ ان کی جبلت کا تقاضا ہے انسان جس اطاعت کو قبول کرتا ہے وہ تقاضائے سیاست ہوتی ہے۔

ایک معاشرہ ابن خلدون کے خیال میں تین بڑے عوامل کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایک گروہ۔ دوسرا اجزائیاتی حالات۔ تیسرا اسباب حیات کی فردانی۔

ابن خلدون حکمائے یونان اور بالخصوص ارسطو کا ہم خیال ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے ہے کہ انسان اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ابن خلدون محنت کو انسانی اعمال کی قیمت اور حاصل قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

”عمل و محنت کے بغیر تو ہم قدرتی ذرائع سے بھی استفادہ نہیں کر سکتے۔“

وہ رعایا پر کم سے کم بار محنت ڈالنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ حکمائے یونان سے کہیں زیادہ آگے اور انسانی احترام کا قائل ہے۔ اس لیے وہ بے گار اور غلامی کو غیر طبعی قرار دیتا ہے۔

عمرانیات میں ابن خلدون کا سب سے بڑا انگشت اور دریافت یہ ہے کہ وہ معاشرے کو ساکن و جامد نہیں سمجھتا۔ اس سلسلہ میں وہ یہ نظریہ ”مقدمہ“ میں پیش کرتا ہے۔

معاشرے کے اصول و شرائط اور صلاحیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو قوم برتر تھا رہے۔ دوسری قوموں پر تغویق رکھتی ہے۔ اس کی برتری اور فوقیت ہمیشہ قائم رہے۔ جس طرح انسان کی ایک طبعی عمر ہوتی ہے۔ تندرستی اور اعصابی قوت کے باوجود اسے آخر ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح قومیں اور ملتیں بھی ایک طبعی عمر رکھتی ہے جس سے آگے جانا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ایک نہ ایک دن ان کو بھی ختم ہوتا ہے۔ جیسے اشخاص کی قمری حساب سے ایک عمر ہوتی ہے جو تین۔ ارباب۔ سے تجاوز نہیں ہو پاتی۔ ارباب۔ جمع جیل۔ ایک جیل

جس میں ایک قوم اپنے مخصوص تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

”مقدمہ“ ابن خلدون کی تلخیص

”مقدمہ“ کا پہلا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا تھا۔ اسی کے تراجم فرانسیسی، اطالوی، لاطینی جرمن، اردو اور انگریزی میں ہو چکے ہیں۔ مقدمہ ایک تصنیف ہے جو فلسفہ تاریخ کی بنیادی کتابوں میں سرفہرست تسلیم کی جاتی ہے۔ اور ہر دور میں علماء تاریخین مؤرخوں اور غالب علما نے اس سے استفادہ کیا ہے اور استفادہ کرتے رہیں گے۔ ذیل میں ابن خلدون کی اس ہمیشہ زندہ رہنے والی شہرہ آفاق تصنیف کی تلخیص دی جا رہی ہے۔

۱۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ محض نقال نہ ہو بلکہ تاریخ سے متعلقہ تمام علوم سے متعارف ہو۔ مورخ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ حکمران اور سیاست کے اصول اور قواعد کیا ہیں۔ مختلف قوموں کے مزاج اور طبائع میں کیا فرق ہے۔ مورخ کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ مختلف مذاہب میں کیا اختلافات ہیں۔ اور ان سب میں کونسی قدر مشترک اور یکساں پائی جاتی ہے۔

۲۔ تاریخ کا ہر واقعہ محض ایک واقعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس ایک واقعہ کے اندر کئی پہلو مستور ہوتے ہیں۔ صرف تاریخ ایک خاص دور کے واقعات اور مخصوص لوگوں کے ذکر سے ہی عبارت نہیں۔ صرف واقعات و حوادث کی تفصیل پیش نہیں کرتی بلکہ اس عہد کے تمام حالات، جغرافیہ اور جزئیات پر نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ ورنہ غلطی کا احتمال رہ جاتا ہے۔ ۳۔ کسی کلچر کی حقیقت اور جہدوں کا سراغ لگانا ہوتا اس کے دیہات کے کلچر کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ تہذیب و تمدن کے تعلقات کا منبع اور سرچشمہ دیہات والوں کی تہذیب اور تمدن ہے۔ کیونکہ یہی لوگ انسانی آبادی میں بحیثیت اصل اور جہد کا درجہ رکھتے ہیں دیہات کی ارتقائی شکل کا نام ہی شہر ہے۔

۴۔ انسان اپنے حالات کا نتیجہ ہے وہ جن حالات کا حامل ہے وہی اس کی طبیعت اور جبلت بن جاتے ہیں۔

وہ کوئی شخص اپنے طور پر آزاویا اپنا ہلک نہیں۔ زندگی بسر کرنے کے لیے وہ دوسروں کی پیروی کرنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ عدل و انصاف کے احکام کی اطاعت کرتا ہے تو اس کے نفس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ کیونکہ حق و انصاف کی پیروی کی راہ میں سے اپنی خودداری سے دست بردار نہیں پڑتا۔ اس کی شجاعت مجرد نہیں ہوتی۔ لیکن اگر احکام کی سجا آوری اور اطاعت کے لیے جبر و اختیار سے کام لیا جاتا ہے انسان عفت اور جبر کی وجہ سے ان کی اطاعت کے لیے مجبور ہوگا۔ یوں اس کا جویش اور قوت مداخلت کمزور ہو جاتے ہیں۔

۴۔ اللہ نے انسان میں خیر اور شر کے دونوں پہلو رکھے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے :-

”ہم نے انسان کو نیکی اور برائی دونوں کی راہیں سمجھائیں۔“
شر انسان کے زیادہ قریب ہے۔ اگر تربیت اچھی نہ ہو تو اس کی ننگائی نہ کی جائے تو پھر انسان کے لیے بڑا نقصان ہے۔

”بدویت اور سادگی میں بہادری کی صلاحیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کا فروغ اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شجاعت کی وقعت ماند پڑنے لگتی ہے جن قوموں میں بدویت برقرار رہتی ہے اور جو تہذیب و تمدن کے تکلفات کا بوجھ اپنے اوپر نہیں لادتی ہیں ان کی دفاعی قوت اور توانائی دوسری قوموں سے بہتر اور زیادہ ہوتی ہے۔ ایک قوم جو اپنی سادگی اور بہادری کی وجہ سے آج غالب ہے وہ عیش و عشرت کا شکار ہو کر کل مغلوب ہو جاتی ہے۔“

”مغلوب اقوام ہمیشہ غالب اور فاتح اقوام کی تقلید انہ پیروی کرتی ہیں۔ یہ دراصل انسانی نفسیات کی کمزوری ہے کہ جن غالب لوگوں کی تقلید و اطاعت پر وہ مجبور ہوتا ہے۔ ان میں غیر شعوری طور پر ایک غیر معمولی کمال کو ماننا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ کمال اس مغلوب انسان میں منتقل ہو جائے۔ مغلوب افراد اور قومیں یہ نہیں سمجھتے کہ جو ہم پر غالب اور فاتح ہوئے ان کے غلبے کے پس منظر میں ایک خاص قانون کارفرما ہے۔ بلکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ غالب قوم کمالات میں ہم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہ غلط فہمی مذہب و اعتقاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر غالب قوم کے تمام خیالات و انکار بلا سوچے سمجھے اپنا ضروری سمجھ لیا جاتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوب قومیں کھانے پینے، لباس پہننے اور اسلحہ تک کے استعمال میں ان قوموں کی تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیتی ہیں اور یہ بھی نظر انداز کر دیتی ہیں کہ ان کی اپنی تہذیب غالب قوم کی تہذیب سے برتر ہو سکتی ہے۔

جب کسی سلطنت کے ساتھ عصبیت کے علاوہ مذہبی خیال اور عقیدے کا ملاپ بھی ہو جاتا ہے تو اس کی قوت و شوکت میں قبائلی عصبیت سے کہیں زیادہ استوار سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مذہبی جوش و عقیدت لفظ نظر کو تمام دوسرے پہلوؤں سے ہٹا کر ایک ہی جگہ مرکوز کر دیتی ہے۔ خزاہشیں اور آرزوؤں میں بھی حق کا رخ کر لیتی ہیں۔ اس طرح ان میں ایک خاص طرح کی بصیرت پیدا ہوتی ہے جس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔

”اعراف سلطنت کو وسعت دینے کی بجائے حکومت کے مرکز کو مستحکم بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ کسی حکومت کا مرکز دل ہوتا ہے۔ جس سے زندگی اور توانائی دوسرے اعضاء میں منتقل ہوتی ہے۔ اگر یہ استوار و مستحکم رہے تو دوسرے اعضاء بھی استوار و مستحکم رہتے ہیں۔ اگر یہ کمزور ہو جائے تو دوسرے اعضاء بھی کمزور جاتے ہیں۔“

”کسی بھی ریاست میں اتنی لچک نہیں ہو سکتی کہ اسے جتنی چاہیں وسعت دے سکیں۔ اس کے پھیلاؤ اور وسعت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ حکومت چلانے والا ایک گروہ ہوتا ہے جو کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، مختصر و محدود ہوتا ہے۔ اگر اس گروہ کی قوت منقسم کر دی جائے تو پھر اس کے لیے اپنی حدود کے اندر بھی حکومت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

پچھلی قوموں کی دیوار پیکل عمارتوں، بلند و بالا محلات اور عظیم الشان ایوانوں کو دیکھ کر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس زمانے میں ان عمارتوں کے بنانے والے ہم سے کہیں زیادہ توانا، بلند و بالا اور مضبوط تھے۔ اور ہم سے بڑا بڑا کرتے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی ہم جیسے تھے۔ ہم سے مختلف نہ تھے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جو بڑی بڑی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بلند و بالا لوگوں کی ہنرمندی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی تعمیر میں حکومت نے دولت صرف کی تھی۔“

بادشاہ اور حکمران کے اختیارات ایسے ہونے چاہئیں کہ اس پر کوئی عصبیت مسلط نہ ہو تاکہ کوئی اس پر حکمرانی نہ کر سکے۔ اسے متاثر نہ کر سکے۔ اور وہ رعایا کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔

ٹیکس وصول کرنے میں اسے کوئی وقت نہ ہو۔ سرحدوں کی حفاظت کے لئے فوج اس کے احکام کی تعمیل کر سکے۔“

ذہنی اور عقلی اعتبار سے حکمران کو غیر معمولی طور پر ذہین اور عاقل نہ ہونا چاہیے۔ حکمران اور بادشاہ کی اصل خوبی رحم اور شفقت ہے۔ زیادہ عاقل بادشاہ اپنے اقتدار کے حوالے سے دور کی کورامی لاتا ہے۔ مختلف اندیشوں اور پیش بندیوں میں مبتلا رہتا ہے جو کبھی معترضہ درجہ میں نہیں آتے۔ وہ رعایا پر اعتماد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ان پر شک کرتا ہے اور پھر ظلم کرنے لگتا ہے۔“

حکومت کی تین شکلیں ہیں۔ ملوکیت، سیاست عقلی اور خلافت۔

ملوکیت میں بادشاہ کا عادل ہونا ضروری ہے جو مکہ وہ عصبیت کے بل بوتے پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس لیے ایسا ممکن ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی ایسا نکل آئے جو اس سے زیادہ عصبیت رکھتا ہو جس کا نتیجہ فساد اور بدامنی کی صورت میں نکلے گا۔ اس لیے یہ نظام بہتر نہیں۔ دوسرا نظام ایسے دنیاوی اور سیاسی قوانین کی بنا پر قائم ہوتا ہے جسے سب مانتے ہیں یعنی جمہوریت اس کے قوانین اور دستور کو قوم کے اکابرین مل جل کر بناتے ہیں۔ جب تک ان قوانین کا احترام باقی رہتا ہے۔ نظم و نسق چلتا رہتا ہے۔ لیکن جو نبی یا حرام اٹھتا ہے سارا نظام درہم برہم ہوتا جاتا ہے۔ یہ نظام سیاست عقلی کا نظام ہے۔

تیسرا نظام حکومت شرعی قوانین اور بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اس میں انسان کا بھلا ہے۔ اسی میں اس کی دنیاوی اور دنیوی بھلائی ہے۔ حکمران اور رعایا دونوں کے لیے اس میں ایک مساوی نظریہ فراہم کیا جاتا ہے۔ نری بادشاہت۔ عصبیت پر مبنی ہونے کی وجہ سے چل نہیں سکتی۔ سیاست عقلی نظام میں وہ روشنی موجود نہیں جو دین پیدا کرتا ہے اس لئے دہری نظام بہتر ہے۔ جو دینی ہے۔ اس نظام کو انبیاء علیہم السلام چلاتے ہیں اور ان کے بعد ان کے خلفاء ان کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ یہ نظام خلافت ہے۔

ظلم کی متعدد صورتیں ہیں۔ ظلم ہی نہیں کہ کسی کا مال یا سبب اور جائداد چھین لی جائے یا کسی کے قبضہ و اقتدار پر چھاپا مارا جائے۔ یہ بھی ظلم ہے کہ کسی شخص سے کسی کام کا نایب کسی

استحقاق کے مطالبہ کیا جائے۔ سب سے بڑا انظم یہ ہے کہ لوگوں سے بیگار لی جائے۔ ان کی پوری محنت ادا نہ کی جائے۔

• عمل اور محنت کے بغیر نہریں، چشمے اور قدرتی سونے تک خشک ہو جاتے ہیں کیونکہ یہاں بھی کھدائی کے لئے محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ زمین کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔ اگر تھنوں میں دودھ ہو لیکن دودھ دوہنے والا نہ ہو تو تھن سوکھ جاتے ہیں۔

• علوم و فنون کا حاصل کرنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔

تحصیل علم میں جو بات سخت مضر اور نقصان رساں ہے وہ کتابوں کی کثرت اصطلاحات کی رنگارنگی اور نظریات کی بوقلمونی ہے۔

علم الکلام کا منصب و مقصد یہ ہے کہ عقائد ایمانی کو عقل کے ذریعے ثابت کیا جائے اہل بدعت کی تردید کی جائے۔

• ایمان کی بشارت جب دلوں سے آشنا ہوتی ہے تو پھر ارتداد و انحراف کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ایمان کی یہ کیفیت فطرت و جبلت کا روپ دھار لیتی ہے۔

• فقہاء اور صوفیاء میں اعمال کا ایک باریک فرق ہے۔ فقہاء اعمال کو اطاعت کی ترازو میں تولتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ عبادات صحیح طریقے سے ادا ہوئیں یا نہیں۔ صوفیاء عبادت کو ذوق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ روح کو اس سے لذت اور ارتقا نصیب ہوئی ہے یا نہیں۔ گویا ان کا طرز عمل سراسر عمارتِ عمارتِ نفس پر مبنی ہے۔

ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر

ایڈورڈ گبن کے اس عظیم کارنامے "انحطاط وزوال رومۃ الکبریٰ" کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے وہ بیان اس کی خودنوشت کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ گبن نے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھا ہے:-

"میں نے ایک سچے عاشق کی طرح آپہں بھریں اور ایک مطیع اور فرمانبردار بیٹے کی طرح باپ کا حکم مان لیا۔"

بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے اور اس سے دل چسپی ہے کہ گبن کی زندگی میں وہ کونسا ایسا دور آیا تھا کہ جب اسے ایک عاشق کی طرح آپہں بھرنی پڑیں اور اسے اپنے باپ کے حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ لیکن آج کی دنیا کا ہر محقول لکھا پڑھا شخص گبن کے عظیم ترین تاریخی شاہکار "ڈیکلائن اینڈ فال آف وی رومن ایمپائر" کے حوالے سے اسے جانتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گبن تاریخ کے شعبے میں ایک بے مثل مقام رکھتا ہے۔ اس کی عظیم اور ضخیم تصنیف دنیا کی معدودے چند بڑی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اور مدتوں سے پوری انسانیت اس کی اس فقید المثال کتاب سے فیض یاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

گبن اپنی خودنوشت میں لکھتا ہے:-

۱۵ اکتوبر ۱۷۶۴ء کا ذکر ہے۔ میں روم میں تھا اور قدیم دارالخلافہ کے کھنڈروں

میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا۔ جب میں نے ننگے پیروں والے لوگوں کو جو میٹر کے معبد میں مناجات گاتے دیکھا۔ یہ میرا تصور تھا جو مجھے اس دور میں لے گیا۔ تب میرے دل میں یہ کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال گہن کے جی میں آیا۔ یہ عظیم الشان کتاب جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۴ جون ۱۹۸۷ء کو اپنی تکمیل تک پہنچی کتاب مکمل ہوئی۔ تو گہن نے عجیب طرح کا سکون محسوس کیا۔

آدھی رات کا وقت تھا جب اس نے اس کتاب کی آخری سطور لکھیں۔ کتاب کے آخری پیرے میں اس نے لکھا کہ اس کا یہ کام اب مکمل ہو چکا ہے۔ اس کی تکمیل میں اس کی زندگی کے تیس برس صرف ہوئے۔ اب وہ اپنا یہ کام دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اتنے بڑے کام میں یقیناً کچھ غامیاں رہ گئی ہوں گی۔ وہ بڑے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قارئین سے درگزر سے کام لینے کی استدعا کرتا ہے۔ یہ آخری سطور لکھنے اور ۲۴ جون ۱۹۸۷ء کی تاریخ ڈالنے اور اپنے دستخط کرنے کے بعد گہن اپنا قلم ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ وہ اب اپنا عظیم ترین کارنامہ انجام دے چکا تھا۔

دنیا کا یہ عظیم مصنف، سکالر اور مؤرخ ایڈورڈ گہن ۲۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو مٹنی (برطانیہ) میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ اس کے چھ بھائی بہن تھے جو سب انتقال کر گئے۔ زندہ رہنا صرف ایڈورڈ گہن کے مقدر میں لکھا تھا۔ کیونکہ اسے علمی دنیا میں ایک عظیم کارنامہ انجام دینا تھا۔

گہن نے اپنی زندگی کے حالات اپنی خودنوشت میں تحریر کیے ہیں۔ اس کی زندگی کی داستان ڈرامائی سنسار سے محروم ہے۔ لیکن وہ ایسا صاحب طرز لکھنے والا تھا کہ اپنی خاصی حد تک بے کیف زندگی کو کبھی اس نے اس انداز میں لکھا ہے کہ اس کا مطالعہ بے حد دلچسپ بن جاتا ہے۔ اس کی سوانح عمری کا سب سے بڑا وصف اس کی حقیقت بیان ہے۔ وہ کہیں مبالغے سے یا اخفا سے کام لیتا ہوا نہیں ملتا۔ اپنی اس خودنوشت میں گہن ایک جگہ لکھتا ہے: ”میرے بارے میں غواہ کچھ لکھا جاتا رہے لیکن ایک بڑی حقیقت نے میں پوری طرح واقف ہوں۔ وہ یہ شہور ہے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو جس بہتر انداز میں میں بیان کر سکتا

ہوں ایسا کرنا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔
اس کا یہ دعوے تعلق اور بالآخر نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے اور اس کی گواہی اس کی خود نوشت سے ملتی ہے۔

بچپن میں گبن کی صحت زیادہ اچھی نہ رہی۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنی والدہ سے حاصل کی۔ جسے وہ اپنے ذہن کی والدہ کا نام دیتا ہے۔ اپنی اس خاکہ کی شفقت اور محبت کو وہ کبھی فراموش نہ کر سکا۔ بہر حال پندرہ برس کی عمر میں وہ میڈی لین کالج آکسفورڈ میں داخل ہوا۔ یہاں اس کا جی نہ لگا۔ بندھے ہوئے کانٹوں کا نصاب اور طرز تعلیم اسے پسند نہ آیا۔ بہر حال یہاں اس نے دینیات میں خاصی دلچسپی لی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی عمر کے سولہویں برس میں اس نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا۔ وہ پیدائشی اعتبار سے پروٹسٹنٹ تھا۔ اس نے کیتھولک عقیدے کو اپنا لیا۔ جس کا اس کے باپ کو خاصا صدمہ ہوا۔ اور اس کے باپ نے اسے

سوئٹزرلینڈ بھیجا دیا۔ یہاں ایک بورڈنگ ہاؤس میں اُسے رکھا گیا۔ ایک سال کے عرصے میں اس مذہبی بورڈنگ ہاؤس میں اسے پھر اپنے اندر تبدیلی محسوس کی۔ یوں اس کا والد جو چاہتا تھا وہ پورا ہوا۔ ایڈورڈ گبن نے کیتھولک عقیدے کو خیر باد کہا اور پھر سے پروٹسٹنٹ بن گیا۔ اسی زمانے میں گبن نے بطور خاص اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ بے تماشاً پڑھتا تھا۔ تاریخ سے اُسے خاص شغف تھا۔ اس عرصے میں اس نے تاریخ کے بارے میں جو مواد جمع کیا وہ حیرت انگیز تھا۔ امی ایم فارسٹر نے گبن پر ایک مضمون لکھا ہے جو امی ایم فارسٹر کے مجموعے ABINGER HARVEST میں بھی شامل ہے۔ امی ایم فارسٹر لکھتا ہے:

”اس نے اس دوران میں جو کتابیں پڑھیں، جنوئلس تیار کیے، ان کی تعداد حیران کن ہے۔ تاہم اس زمانے میں اسے مطلق علم نہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں پڑھ رہا ہے۔“
گبن نے جتنا مطالعہ کیا اور پھر جس انداز میں اپنی مستم بہانہ کتاب اسخطاط و زوالی رومرٹ اکبر ہی میں اسے برتا۔ یہ اس کیلئے شخص کا اپنا ذاتی کارنامہ ہے۔ کیونکہ وہ کسی کی رہنمائی کا قائل نہ تھا کسی نے اس کی رہنمائی کی۔ کسی شخص کو گبن کے بارے میں یہ کہنے کی

جرات نہ سہلی لڑکھن نے زندگی کے کسی مرحلے میں اس سے کچھ اکتساب فیض کیا تھا۔ وہ اپنے عظیم اور تعقید امثال کام کا تنہا سزاوار ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب زندگی میں پہلی اور آخری بار گبن کے دل میں محبت نے اپنا جادو جگایا۔ وہ ایک جوان اور بہت معزز خاتون تھی۔ جس کا نام سوزان تھا۔ یہ خاتون ایک پادری کی بیوی تھی۔ گبن نے اس سے ٹوٹ کر عشق کیا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں پھر اس کے والد نے اس کی شادی کی شدید مخالفت کی۔ ایک سچے عاشق کی طرح آپہن بھرنے والے گبن نے اپنے والد کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور پھر وہ ساری عمر غیر شادی شدہ رہا۔ اس خاتون کی شادی ایک ممتاز فرانسیسی ایم۔ بنگ سے ہوئی۔ اور یہ خاتون ایک بیٹی کی ماں بنی جو آج عالمی ادب میں مادام ڈی سٹیل کے نام سے مشہور ہے۔

انگلستان واپس آکر گبن بریٹ شاریٹیشیا میں کیپٹن بن گیا۔ اس کے اس دور کے بارے میں امی۔ ایم فارسٹر نے دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ جس کا حوالہ اور پوچھا جا چکا ہے۔ جب بریٹیشیا فوج ٹوڑ دی گئی تو گبن سیر و سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اٹلی میں اسے اپنی پرشہرہ آفاق کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ اور پھر وہ اس کتاب کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ سیر و سیاحت کے بعد وہ انگلستان آکر آٹھ برس تک پارلیمنٹ کارکن بھی رہا۔ اپنی اس پارلیمانی زندگی کے بارے میں گبن نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

”میں اپنے دور کے نامور معترضوں سے بے حد بااوس ہوا اور بڑے معترضوں کی تقریروں

سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اور میں نے کبھی پارلیمنٹ میں تقریر نہ کی۔“

۱۷۷۹ء میں جب اس کی عمر ۲۹ برس تھی۔ اس کی زندگی بھر کے کام کا نتیجہ لوگوں کے سامنے آیا۔ یہ ڈیپلکٹن اینڈ وی فال آف دی رومن ایمپائر کی پہلی جلد تھی۔ اس کتاب کی آمد تنگہ خیز ثابت ہوئی۔ اسے نقادوں، مورخوں اور قارئین نے ایک عظیم کارنامہ قرار دیا۔

پارلیمنٹ سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد گبن نے نوزان کا رچ کیا۔ نوزان۔ جہاں اس نے

اپنی نوجوانی کے دن گزارے تھے۔ جہاں اس نے عشق کیا تھا۔ اب اس نے اپنے آپ کو دنیا سے بالکل الگ تھلگ کر لیا۔ اور اپنی کتاب کی تکمیل میں دن رات جُٹ گیا۔ یہیں اس نے

اپنی اس عظیم تصنیف کو ۲۷ جون ۱۷۸۷ء کو مکمل کیا۔ اور یہ کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔
یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ میں نے اس کتاب کا جو ایڈیشن پڑھا وہ موثرن لائبریری
ایڈیشن ہے اور اسے سب سے مستند تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ تین جلدوں میں گبن کے پورے
کام کو سمیٹے ہوئے ہے۔

گبن کی اس بے مثل کتاب کی آخری تین جلدیں ۱۷۸۸ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۷۹۳ء
میں گبن نورمان سے انگلستان پہنچا۔ اور یہیں لندن میں ۱۷۹۴ء کو اس کا انتقال ہوا۔
گبن کا یہ عظیم اور نقیدہ انشائی شاہکار ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دنیا کے چند بڑے
اور ضخیم کاموں میں سے ایک ہے۔ روم کی ابتداء سے روم کے زوال تک کی داستان اس کے
صفحات پر اس طرح سے سمولی ہوئی ہے کہ کوئی لگوشہ نشہ اور ناممکن محسوس نہیں ہوتا۔ وہ
بہت بڑا صاحب اسلوب بھی تھا۔ اس کی کتاب کا مطالعہ ایک بڑے تجربے کی حیثیت رکھتا
ہے۔ اور یہ تجربہ ایسی زبان میں لکھا گیا ہے جو بے حد موثر اور خوب صورت ہے۔ عام طور پر
مورخین کی زبان اتنی سادہ اور اتنی موثر نہیں ہوتی۔ لیکن گبن کی زبان بہت موثر اور تخلیقی
نوعیت کی ہے۔

ابن خلدون یا دوسرے عظیم مورخوں کی طرح گبن نے فلسفہ تاریخ بیان کرنے کی کوشش
نہیں کی۔ نہ ہی اپنے نظریہ تاریخ پر کوئی خاص کتاب یا مقالہ لکھا ہے۔ لیکن اس کی اس متمم انشائی
تصنیف کا مطالعہ کرنے والا ہر باشعور قاری اس کے نظریہ تاریخ سے آشنا ہو سکتا ہے۔
دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا آغاز اور پھر زوال کی داستان لکھنے والے گبن کو عام انسانی
تجربات اور اجتماعی علم سے بے حد دل چسپی تھی۔ وہ اس اجتماعی انسانی علم کا بہت بڑا قدر دان
تھا۔ اس کے اپنے الفاظ یوں ہیں۔

"BUT WHAT I VALUE MOST IS THE KNOWLE-
-DGE IT HAS GIVEN ME OF MANKIND IN GE-
-NERAL."

اگرچہ وہ کسی رہنمائی کے بغیر ساری عمر پڑھا اور حاصل کرتا رہا۔ لیکن اس کا علم ہی نوع

انسان پر انحصار کرتا تھا۔ یہ اس کا زادیہ فکر اور عقیدہ تھا۔ گنبن سمجھتا ہے کہ محض پڑھ لینے سے ہی ماضی کی تشریح اور تفسیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ نہ جذبہ ہی کافی ہوتا ہے۔ بلکہ گنبن سمجھتا ہے کہ ایک مورخ کو ایک تعمیری صفت کا بھی مالک ہونا چاہیے۔ اور وہ صفت یہ ہے کہ ایک مورخ کے پاس یہ تصور بھی ہونا چاہیے کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ وہ لوگ جو خود مورخ نہ تھے۔ ان کا ان زمانوں میں کیا رویہ تھا۔ اگر مورخ اس خوبی سے متصف نہیں تو پھر وہ محض مردہ زمانوں اور لاشوں میں سفر کرتا ہے۔ ایک مورخ یہ تیسری خوبی کس طرح اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ گنبن کے خیال میں یہ خوبی اس کے ذاتی تجربے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لیے ایک مورخ کا جینس ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔

اور گنبن بلاشبہ ایک جینس تھا۔

اپنی اس عظیم تصنیف میں گنبن نے اپنے ذاتی علم، ذاتی تجربے کی بنیاد پر صدیوں کا سفر کیا ہے۔ یہ سفر مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور انسانی تاریخ کے انتہائی اہم مراسل کا سفر ہے۔ اس سفر میں کیسے کیسے انسان اور کیسے کیسے معاشرے دامن لڑجھک کھینچتے ہیں اس سفر میں وہ کتنے ہی گرد آلود چہروں سے گرد جھاڑتا ہے۔ کتنے ہی ناممکن واقعات کو تکمیل کی صورت بخشتا ہے۔ کتنے ہی علوم کو سامنے لاتا ہے۔ یہ سفر صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ سفر جس کا اختتام ۱۲۵۲ء میں ہونے لگا ہے جب روم کا زوال مکمل ہو چکا ہے۔

اپنی عظمت اور ایک بے مثل علمی اور تاریخی کارنامے کی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ ہر باشعور انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن آج کے دور میں فوقی مطالعہ کم ہو چکا ہے اور پھر اتنی ضخیم کتاب پر کون سرکھپانے کو تیار ہوتا ہے۔ ان وجوہات کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم ہم مسلمانوں، تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے عالموں اور قارئین کو کم از کم اس عظیم کتاب کی آخری جلد کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

یہ آخری جلد ایجوکیشن لائبریری کے ایڈیشن کی تیسری جلد ہے، وہ ہے جس میں گنبن نے اسلام کے آغاز سے لے کر روم کے زوال تک مسلمانوں کے کارناموں اور تاریخ کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم تاریخ کو سمجھنے کے لیے

گہن کی کتاب - ڈیٹا اینڈ فال آف وی روڈ بن ایماٹر کے اس آغزی حصے کا مطالعہ
بے حد ناگزیر ہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں ہم دنیا کے ایک عظیم مورخ کے عظیم
کارنامے سے متعارف ہوں گے وہاں اسلام کے حوالے سے اسلامی فتوحات اور
اسلامی تہذیب کے بارے میں بھی اس کے بے مثل اور غیر حبا بندارانہ نقطہ نظر سے
بھی مستفید ہوں گے۔

اے سٹڈی آف ہسٹری

ہزاروں صفحات اور دس جلدوں پر مشتمل آرنلڈ ٹوئین بی کا عظیم کارنامہ اے سٹڈی آف ہسٹری "عہد حاضر کی ایک عظیم ترین کتاب ہے۔ انسانی تاریخ کا یہ مطالعہ صدیوں پر محیط ہے۔ اور بیسیوں انسانی تہذیبوں کا تجزیہ اور محاکمہ ہے۔ ٹوئین بی کی اے سٹڈی آف ہسٹری کے اثرات تاریخ کے فلسفے، نظریات پر بہت گہرے ہیں اور اس کتاب نے تاریخ کے بارے میں انہوں کو نئے نظریات اور انکشافات سے متعارف اور روشناس کرایا ہے۔

آرنلڈ جے ٹوئین بی ۱۴ اپریل ۱۸۸۹ کو لنڈن میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک معروف سماجی کارکن اور ٹوئین بی کی والدہ کو بیرونی اعزاز حاصل تھا کہ وہ انگلستان کی ان چند اولیٰ خواتین میں سے ایک تھی جنہوں نے کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کی۔ ٹوئین بی اے نے پرائے انداز کی تعلیم حاصل کی۔ آکسفورڈ میں لاطینی اور یونانی کلاسیک کا مطالعہ کیا۔ پھر وہ ایک برس کے لیے یونان چلا گیا۔ یونان میں ایک برس کے قیام کے دوران میں ٹوئین کو دو چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک تو امور خارجہ اور دوسرے قدیم تہذیبیں۔

انگلینڈ واپس آکر اس نے اپنی دونوں ولی چھپیوں میں عملی اظہار کیا۔ اس نے آکسفورڈ میں قدیم تاریخ پڑھانے کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے بین الاقوامی حالات پر لکھنا شروع کیا۔ اس نے اس زمانے میں انگلستان کے جدیدہ جدیدہ اخبارات و جرائد میں مضامین شائع کرائے۔ ۱۹۱۵ء میں اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک کا نام "دی نیو یورپ" تھا اور دوسری کا "نیشنلسٹی اینڈ دی وار"۔

۱۹۱۵ء میں ہی ٹوئین بی نے برطانوی محکمہ خارجہ کے شعبہ پولیٹیکل انٹیلیجنس میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس حوالے سے اسے درمائی کے امن معاہدے میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ بعد میں ٹوئین بی لندن یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گیا۔ وہ بازنطینی، یونانی زبانوں کے ادب اور تاریخ کا درس دینے لگا۔ ۱۹۲۵ء تک وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا رہا۔ بعد میں اسے یونیورسٹی نے بین الاقوامی تاریخ کے ریسرچ پروفیسر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس دوران میں ٹوئین بی نے یونانی اور ترکی کی جنگ کی وقائع نگاری، مائیکسٹرا گارہین کے لیے کی۔ اور بعد میں اس نے اس جنگ کے حوالے سے ایک کتاب **THE WESTERN QUESTION IN GREECE AND TURKEY** بھی لکھی۔

ٹوئین بی لکھی دیگر کتابوں کا بھی مصنف ہے۔ بین الاقوامی امور اور خارجہ معاملات کے ضمن میں اس نے جو سترہ مرتب کیے اور کتابیں تحریر کیں ان کی ایک اپنی اہمیت اور افادیت ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اسے اہم ترین منصب سونپا گیا اور ٹوئین بی نے اپنے وطن کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

اے سٹڈی آف ہسٹری

۱۹۲۲ء میں ٹوئین بی نے اپنی اس مہتمم بائبل کتاب کے لیے نصف صفحے پر پرنسپل سے ابتدائی خاکہ تیار کیا۔ اس کے بعد وہ مسلسل نو برس تک اس کام کے سلسلے میں تحقیقات اور مطالعے میں مصروف رہا۔ اس کی پہلی تین جلدیں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد پانچ برس تک وہ مزید کام کرتا رہا۔ اور پھر ۱۹۳۹ء میں اس کی مزید تین جلدیں شائع ہوئیں اب چھ جلدوں میں یہ عظیم کام ۱۹۳۹ء میں مکمل ہوا تو یہ تین ہزار چار اٹھاسی صفحات پر مشتمل تھا۔ بقایا چار جلدیں ایک طویل وقفے کے بعد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئیں اور یوں ٹوئین بی کی یہ عظیم اور معرکتہ آرا تصنیف ۲۶ برسوں میں مکمل ہوئی۔

جب اس کی پہلی چھ جلدیں شائع ہوئیں تو عوامی سطح پر ان کا خاص نوٹس نہیں لیا گیا۔ علماء کے طبقے میں اس کی اشاعت نے البتہ کچھ سنسنی سی پیدا کی۔ دراصل اتنے بڑے

اور ضخیم کام کا مطالعہ بھی ہر کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ تاہم اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اس عظیم تصنیف کا چرچا ہونے لگا تھا اور محدود ہی سہی۔ اس کو موضوع بنا لیا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ڈی۔ سی سومویل نے ان پہلی چھ جلدوں کی تلخیص شائع کرائی۔ یہ تلخیص بھی بہت ضخیم تھی۔ لیکن اس تلخیص کے چھپتے ہی اس کا شہرہ مچ گیا۔ ۱۹۴۶ء-۱۹۴۷ء کے سالوں میں اے سٹڈی آف ہسٹری کا پبلیکیشن اتنا مقبول ہوا کہ اس عہد کے بڑے بڑے لکھنے والے ناول نگاروں کے ناولوں سے کہیں زیادہ شائع ہو کر فروخت ہوا۔

ٹوئین بی کو روزانہ لکھنے کی عادت تھی۔ وہ جب تک جیسا۔ ہر روز لکھتا رہا۔ اے سٹڈی آف ہسٹری میں ٹوئین بی نے انسانی تاریخ کی چھبیس تہذیبوں کا مطالعہ اور کیا پیش کیا ہے۔ یہ چھبیس تہذیبیں ٹوئین بی کے خیال میں وہ تہذیبیں ہیں جنہوں نے چھ ہزار برس میں انسانی تاریخ اور دنیا کی صورت گری کی۔

اس طویل و بسیط مطالعہ کا نتیجہ ٹوئین نے اپنی اس عظیم کتاب اے سٹڈی آف ہسٹری میں یہ نکالا ہے کہ:-

”تمام تہذیبیں ایک ہی دھلچنے کی تقلید کرتی ہیں اور نہ تہذیب کی نشوونما

اور اس کے زوال کے اسباب تقریباً ایک سے ہیں۔ اور یہ اسباب وہ چیلنج ہیں۔ جن کا ان معاشرہ اور تہذیبوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

اس ضمن میں ٹوئین بی نے تاریخ سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ اے سٹڈی آف

سٹڈی میں وہ لکھتا ہے:-

”ایک دور میں شمالی افریقہ کے صحراؤں میں خطے تھے۔ جو شکاریوں کی ایک کثیر آبادی

کی کفالت کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ خشک ہوتا چلا گیا۔ شکار وہاں سے بھاگ نکلا اور شکاریوں کو اپنے زمانے کے سب سے بڑے چیلنج کا سامنا کرنا

پڑا کہ اب وہ کس طرح زندہ رہیں گے؟ ان شکاریوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو

اس چیلنج کو نہ سمجھ سکا۔ وہ اپنے آپ میں کوئی تبدیلی لانے سے قاصر تھے۔ انہوں نے

حالات کو سمجھنے بغیر شکاری رہنے کا ہی فیصلہ کر لیا۔ یوں وہ لوگ جو اپنے زمانے میں تہذیب

یافتہ تھے، بعد میں محض "وحشی" بن کر رہ گئے۔

وہ لوگ جنہوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کیا اور انہوں نے مکمل طور پر اپنی زندگیوں کو تبدیل کر لیا وہ نیل کی واومی کا رخ کرنے لگے۔ انہوں نے وہاں جنگلوں کو صاف کیا۔ زمین کو قابل کاشت بنایا اور یوں اعلیٰ قسم کی زراعت کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجے میں وہ حوش حال ہو گئے۔ اور انہوں نے اس عظیم تہذیب کی بنیادیں رکھیں جو چار ہزار برس تک زندہ رہی۔

"اے سڈھی آف ہسٹری" میں ٹوئین بی لکھتا ہے کہ ایک معاشرے اور تہذیب کو کسی طرح کے چیلنج ہوتے ہیں۔ جن کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب ایک چیلنج کے مقابلے میں سرحدوں حاصل ہو جاتی ہے تو ایک دوسرا چیلنج اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ٹوئین بی تاریخ سے مثالیں بھی فراہم کرتا ہے۔ ٹوئین بی لکھتا ہے۔

مثلاً اہل ایٹھنز کو یونانیوں نے پہلے پہل انہیں جس چیلنج کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ ان کی زمین ناقص تھی اور آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ اہل ایٹھنز نے اس چیلنج کا حل یہ نکالا کہ انہوں نے سمندر پار نئی کالونیوں کو بسنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد اسی حوالے سے ایک نیا چیلنج ان کے سامنے پیدا ہو گیا کہ اہل ایٹھنز اپنی ان نوآبادیوں اور اہل سپارٹا کے ساتھ کس طرح کے تعلقات قائم کریں۔ چونکہ اہل ایٹھنز اپنے اس مسئلے کو حل نہ کر سکے۔ اس لیے یہ عظیم تہذیب زوال سے دوچار ہوئی۔

قوموں اور تہذیبوں کی نشوونما، عروج و زوال کے حوالے سے ٹوئین بی نے جو نظریات اپنی اس عظیم اور عمدہ فرس تصنیف میں پیش کیے ہیں عمدہ جدید کے بعض موضوع اور تاریخ کے طالب علموں نے ان کے حوالے سے ٹوئین بی اور ابن خلدون کے نظریات میں خاصا اہم اشتراک پایا ہے۔ خود ٹوئین بی ابن خلدون کا بہت معترف اور مداح ہے۔ بعض مورخوں اور نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ کے بعد جو سب سے بڑا کام تاریخ کے علم و تجزیہ کے حوالے سے ہوا ہے۔ وہ ٹوئین بی کی تصنیف لے سڈھی آف ہسٹری ہے۔

وہ قارئین جنہوں نے سو عظیم کتابوں کے اس سلسلہ مضامین میں ابن خلدون کی عظیم تصنیف مقدمہ پر شائع ہونے والا مضمون پڑھا ہے۔ وہ مقدمہ اور اے سڈی آف ہسٹری پر چھپنے والے اس مضمون کے تقابلی مطالعہ سے ابن خلدون اور ٹوٹین بی کے اشتراک نظریات کا ایک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ٹوٹین بی نے اے سڈی آف ہسٹری میں بتاتا ہے کہ تہذیبوں کو جن مشکلات اور چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ عسکری نوعیت کے کم ہوتے ہیں۔ بلکہ بیشتر چیلنج اس لیے جنم لیتے ہیں کہ انسانی استعداد ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوتی ہے۔ انسانی استعداد۔ قابلیت، فہم و شعور کو ٹوٹین بی انسانی تہذیبوں کے عروج اور استقرار کے لیے بہت اہمیت دیتا ہے۔

کسی بھی تہذیب میں ہر چیز عمل، 'SOURCE OF ACTION' فرد کی تخلیقی صلاحیت میں ہوتا ہے یا پھر چند افراد میں۔

ٹوٹین بی نے مغرب کے زوال کی بھی نشاندہی کی ہے اور آخری عمر میں مشرق سے اُمیدیں وابستہ کر بیٹھا تھا۔ مغربی تہذیب کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ یہ اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد اب زوال آشنا ہو چکی ہے۔ یہ اپنے عہد کے روحانی مطالبات کو پورا نہیں کر سکی۔ ٹوٹین بی کے نظریات پر اس کے معاصر اور بعد کے مؤرخوں اور ناقدوں نے خاصی تنقید بھی کی ہے۔ لیکن اے سڈی آف ہسٹری کے بارے میں یہ متفقہ فیصلہ دیا جا چکا ہے کہ مدتوں کے بعد ایک ایسی تصنیف شائع ہوئی ہے جس کے اثرات دیر پا اور بہت گہرے ثابت ہوئے ہیں۔

ٹوٹین بی نے انسانی تہذیبوں اور تاریخ کے طویل سفر کا مطالعہ اور تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ تاریخ کے مطالعے سے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ تاریخ سے کوئی سبب حاصل نہیں کیا جاتا۔

لیویاتھن

تھامس ہوبز کا سن ولادت ۱۵۸۸ء ہے۔

وہ ان فلسفیوں اور مفکروں میں سے ایک ہے جو ایک طرف تو اصولوں کی دنیا میں جھٹک رہے تھے اور بعض اصولوں پر سختی سے عمل پیرا تھا اور دوسری طرف انہی اصولوں کے بانے میں شدید قسم کی تشکیک میں مبتلا تھے۔ تھامس ہوبز جسے اس کے اپنے زمانے میں روکیا گیا اور جسے آج بھی روکیا جاتا ہے۔ دنیا کے ان فلسفیوں میں سے ایک ہے جن کی پیش کردہ سچائیوں کو دنیا کسی طور بھی جھٹلا نہیں سکتی۔

بیسویں صدی میں اس کی اہمیت میں خاص اضافہ ہوا۔ ۱۶۵۱ء میں اس کی سب سے اہم کتاب "LIVIAATHAN" شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت نے ایک ایسی بحث کا آغاز کیا جو آج بھی جاری ہے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود ہماری اجتماعی فکر اور سیاسی نظریات حالات میں اتنی تبدیلی نہیں ہوئی کہ ہوبز کی "لیویاتھن" کی اہمیت کو کم کیا جاسکے یا اس کے افکار کو کسی طور نظر انداز کیا جاسکتا ہو۔ وہ بعض ایسی مطلق سچائیوں کو پیش کرتا ہے جو بے حد خوفناک اور لرزہ خیز ہیں۔ لیکن بنی نوع انسان کا مقدر بن چکی ہیں۔

ہوبز کو جیومیٹری سے بے حد شغف تھا۔ یہ شغف اتفاقی طور پر پیدا ہوا۔ اور پھر اسے جنون کی حد تک اس علم سے محبت ہو گئی اس علم کے اثرات کا سراغ اس کے نظریات اور خاص طور پر "ٹیوری آف ABSOLUTISM" پر بہت واضح ہے۔

ہوبز نے سیاسی افکار کو کئی بار مختلف کتابوں میں قلم بند کیا۔ لیکن "لیویاتھن" اس کا

شہکار ہے۔ اور اس ایک کتاب میں اس کے تمام افکار و نظریات کیجا ہو گئے ہیں اور یہ وہ واحد کتاب ہے جو صدیوں سے آج تک اپنی فکری اور نظریاتی اساس کی بنا پر انسانی فکرو خیالی کا ایک اہم حصہ بن کر رہ گئی ہے۔

تمام تراخلافات کے باوجود لیوی بائٹن "کا آج بھی مطالعہ کریں تو ہم محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ یہ کتاب آج کے حالات پر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔

ہوبز کی پوری کوشش تھی کہ اس کی اس شہکار تصنیف میں کوئی خامی دکھائی نہ دے اس لیے اس کتاب کا آغاز، سیاسی حقیقتوں کے بیان سے نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کے اظہار سے کیا جاتا ہے۔ ہوبز کا نظریہ ہے کہ حقیقت - اہدان کی حرکت پر مشتمل ہے۔ آسان پڑاؤ تھے ہونے پر مدے کی پرواز اور انسانی ذہن میں آنے والے خیال کو انہی بنیادوں اصطلاحات میں ان کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

ہوبز بڑا کٹر مادہ پرست ہے۔ حتیٰ کہ وہ خدا کے بارے میں بھی یہ سمجھتا ہے کہ خدا ایک خاص طرح کا جسم ہے۔ اس کے نظریے کی وجہ سے اس کی بہت مخالفت ہوئی اور اس پر ملحد اور دہریہ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔

انسانوں کے بارے میں ہوبز کا خیال ہے کہ وہ انتہائی عمدہ مشینوں کی طرح ہیں۔ اس انسانی مشین کا رماغ پانچ حواس کے ذریعے اس کو معلومات فراہم کرتا اور اس کو زندگی بنا تا ہے۔ اس نے انسانوں کو پیچیدہ مشین قرار دے کر اس کا جو موازنہ مشینوں سے کیا ہے وہ خاص دلچسپ ہے۔ وہ سترہویں صدی کی صنعتی ایجادات اور مشینوں کو سامنے رکھ کر انسانی اعضاء کی مثالیں دیتا ہے۔ مثلاً ہوبز کہتا ہے "دل کیا ہے؟ ... ایک سپرنگ۔ اعصاب اور پٹھے کیا ہیں بہت سی تاریں ... انسانی جسم کے جوڑے۔ پیسے ہیں۔ یہ سب مل کر انسانی جسم کو متحرک رکھتے ہیں۔"

انسانی جسم کو اب بھی ایک جدید مشین ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کے اس دور میں البتہ اب اس کی مطابقت جدید ترین مشینوں کے پرزوں اور حصوں سے کی جاسکے گی سترہویں

صدی کے پرزے اور آفات تو بہت حد تک متروک ہو گئے لیکن ہوبز کا خیال زندہ ہے۔ ہوبز کا اعتقاد یہ ہے کہ انسان کی حرکات و اعمال پر ان کے جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ وہ جذبات کو اندرونی سحرکات کا نام دیتا ہے۔ وہ ان جذبات کا ایک مفید اور کارآمد خام مادی تلسس کر لیتا ہے جس کا نام وہ عقل رکھتا ہے۔ ہوبز کے نزدیک انسان اپنے اس خصوصی خام، عقل کی وجہ سے ہی دوسرے جانداروں سے ممتاز اور متمیز قرار پاتا ہے اور اسی خام کی بدولت انسان نے زبان ایجاد کی ہے۔ منطقی فلسفے اور سائنس کا بانی نیکو جہد منہر ہے۔ لیویا تھن کے چند مختصر الجواب میں وہ فلسفے کے روایتی مسائل کا تذکرہ کرتا ہے۔ فلسفے اور انسانی نفسیات کی نئی تشریح کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی اصطلاحات بڑی سادہ ہیں۔ ان میں کسی طرح کا ابہام نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دلائل اور نظریات کو نہ صرف سچے بالکل راسخ سمجھتا ہے۔

ہوبز کے نزدیک انسان اپنے اندر بند ہے اپنے سانس میں مقید۔ وہ دوسرے انسانوں کو نہ سمجھ سکتا ہے نہ ان کے مقاصد کو ہی پاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو یہ شعور حاصل ہے کہ وہ زبان جس سے وہ دوسروں تک اپنی بات پہنچاتا ہے جو اس کے لیے ابلاغ کا اظہار ہے یہی زبان دوسروں کو دھوکہ دینے کے کام بھی آتی ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا جذبہ ہے جس سے اسے بے پناہ مسرت ہوتی ہے یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی کبھی تشفی نہیں ہو سکتی یہ جذبہ تفاعل ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں مقابلے میں برتر سمجھنے کا جذبہ اور اس وقت تو اس جذبے کی ظلمیت اور شادابی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا جب تک کہ وہ بھی اس کی برتری کو پہچان لیں۔

اب یہی وہ بات ہے جسے ہم جدید زمانے کی اصطلاحات میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا انسان جذبہ مسابقت میں بڑی طرح مبتلا ہے وہ دوسروں پر ہر طرح سے چھانے کی کوشش میں ملکان ہو رہا ہے۔

انسان کے بارے میں ایسے تصورات اور اعتقادات کو تسلیم کر لینے اور اس کے مطالعہ میں بعض نظریات کو نافذ بنالینے کے بعد ہی ہوبز انسان کے حوالے سے ایک ریاست کا

ٹھانچ تیار کرتا ہے اور یہی بتاتا ہے کہ ریاست کیا ہوتی ہے اس ریاست کا سربراہ کیسا ہونا چاہیے۔

فلسفے کی تاریخ میں جس انسانی ریاست کا نقشہ اور تصور ہوبز نے پیش کیا ہے وہ تمام تصورات سے زیادہ ہوناک اور لڑا دینے والا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر ریاست کا وجود نہ ہو تو فرد روحانی اور مادی طور پر نادار و مجبور ہو کر رہ جائے۔ انسانوں کے خوف ان کے اوہام اور ان کی ضرورتیں انسانوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ریاست کو تشکیل دیں وہ لکھتا ہے:

”ریاست نہ ہو تو پھر نہ فنون ہوں نہ تحریر و تصنیف اور پھر ان سب سے بدتر یہ مسلسل صورت حال کہ انسان سدا خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ عدم تحفظ کا ڈر، تشدد کا خطرہ بے وقت ناگہانی، بغیر فطری موت اور پھر ریاست کے بغیر انسان کی زندگی، تنہا، ناکارہ، سٹرائیکز، وحشیانہ اور مختصر، چند روزہ“

سترہویں صدی کے فلسفی، علم الاہان کے ماہر، دانشور اور مفکر جوب انسان کی بات کرتے تھے تو بعض وجوہات کی بنا پر عورت کو انسان کے حوالے سے منہا کر دیتے تھے۔ وہ عورت کو مرد کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے لیکن ہوبز کو اپنے پیشروؤں اور ہم عصروں سے اس ضمن میں شدید اختلاف ہے وہ لکھتا ہے۔

”بہتر جنس اور صنف ہونے کی صورت میں مرد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مرد کی برتری کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ غلطی کرتے ہیں۔ کیونکہ مرد وزن کے درمیان طاقت کا توازن ہمیشہ مرد کے حق میں نہیں ہوتا۔ مرد وزن کیساں ہیں جو حق مرد کو حاصل ہے کسی تنازعہ اور اختلاف کے بغیر وہی حق عورت کو بھی حاصل ہے۔“

ہوبز سے پہلے اور اب بھی یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ بعض انسان اپنے حسب نسب اپنی بعض خوبیوں، صلاحیتوں اور قدامت پسند ہونے کی وجہ سے حکمرانی کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ہوبز اس نظریے کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اس کا اظہار اس نے اپنی اس فکر انگریز اور زندہ رہنے والی کتاب میں کیا ہے۔ ہوبز کے خیال میں تمام انسان مساوی ہیں یہ وہ نظریہ ہے جو اس سے پہلے کے بعض بڑے فلسفیوں

کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اور بعض لوگ اسے سیاسی نعرہ بازی کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ لاکھ پین، روسو اسی نظریے کے علمبردار تھے۔ لیکن انسانوں کے مساوی اور ہم سر ہونے کی جو دلیل..... ہو بڑھتی ہے وہ سب سے علیحدہ منفرد اور چونکا دینے والی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ انسان اس لیے مساوی ہیں کہ ان کو فطرت نے مساوی پیدا کیا ہے اور خدا نے ان کو ایک سا بنایا ہے بلکہ ہو بڑھائی انسانی مساوات کی جو توضیح کرتا ہے وہ لڑاؤ دینے والی ہے۔ وہ کہتا ہے انسان اس لیے مساوی ہیں کہ انسانوں میں سے سب سے بڑے احمق اور کمزور ترین انسان کو بھی اگر مناسب مواقع ملیں تو وہ طاقتور ترین انسان کو قتل کر سکتا ہے۔ "اس لیے سب انسان مساوی ہیں۔"

اپنی اس انوکھی، حیران کن، ہوشربا توضیح کے باوجود وہ انسانی مساوات کا قائل ہے۔ وہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ انسانی عادات قائم و دائم رہ سکیں چاہئیں۔ اس سے ریاست اور معاشرے میں امن برقرار رہ سکتا ہے۔

ہو بڑھ ریاست کی فطری نشوونما میں یقین نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود حکومت اور ریاست کے بغیر انسان دنیا کے مایوس ترین انسان ہوتے ہیں۔ آخالیبا کیوں ہے؟ ہو بڑھ اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ دنیا میں ایشیا کی کمی ہے اور۔ وہ لکھتا ہے:-
"اور اگر دو انسان ایک ننگ چیز کے طالب ہوں اور وہ دونوں اس سے استفادہ نہ کر سکتے ہوں وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔"

یا پھر اس کے الفاظ میں اس چیز کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یا پھر ایک دوسرے کو۔ جہاں وہ یہ نظریہ قلت پسند کرتا ہے اس کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے بہت سے مفکر اور فلسفی اس سے آفاق کرتے ہوئے ملیں گے کہ ایشیا کی قلت اور کمی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے اپنے طور پر اس کی تاویل میں اور اس کا حل بھی پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہو بڑھ کہتا ہے کہ یہ صرف ایشیا کی قلت ہی نہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بناتی ہے۔ بلکہ انسانوں کا جذبہ تفاعل۔ انسانوں کا احساس برتری بھی ان کے درمیان۔

منافقت اور تنازعہ پیدا کرتا ہے ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو خطرہ سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ دوسرا پہلے وار نہ کر جائے ہو بڑا انسان کو ایک مضطرب اور بے سکون وجود قرار دیتا ہے وہ اس حقیقت کو سامنے

لاتا ہے کہ

”انسان کو جو کچھ اور جتنا کچھ حاصل ہے وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا وہ تو شان و شوکت اور بے پایاں کرد و فر کے علاوہ کسی چیز سے اطمینان حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حوالے سے ہو بڑا نہیں بتاتا ہے اس انسانی صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو پھر۔

”زندگی ایک ایسی دوڑ کی طرح ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ ایک

مذختم ہونے والی دوڑ۔“

”اس دوڑ کا نہ خاتمہ ہے نہ اس میں کوئی لمحہ آرام آتا ہے۔“

ہو بڑا کے ان نظریات اور ایسے دوسرے نظریات کے حوالے سے اس کے قارئین اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہو بڑا بنی نوع انسان کی تبدیلی اور تہنگ کامرنگ ہو رہا ہے۔ لیکن اسے کیا کیسے کہ جب سے لیویا تھن ”شائع ہوئی اور جب تک یہ کتاب کھڑے میں کھڑی رہی اور ہر بار انسانی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ وقت نے دیا کہ یہ کتاب اور اس کا مصنف - بے قصور ہے۔“

ہو بڑا کہتا ہے کہ انسان خوف کی حالت میں اپنے جذبہ تفاعل اور برتری کو بھول جاتا ہے۔ پھر وہ امن و سکون اور تحفظ کا خواہاں ہوتا ہے۔ لیویا تھن کے چودھویں اور پندرہویں باب میں ہو بڑا نے وہ انیس اصول وضع کیے جن سے انسان امن حاصل کر سکتا ہے۔

ان انیس اصولوں میں دوسرا اصول یہ ہے کہ انسان اپنے تحفظ کے خیال سے دستبردار ہو جائے۔ وہ اس حق کو ذہن سے نکال دے۔ اس کے ذہن میں ذاتی تحفظ کا خیال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا مخالف اور حریف سمجھتا ہے اس سے جو خطرہ اُسے ذہنی طور پر لاحق ہے وہ پیش بندی کرتا اور اس کے اندر تحفظ

کا قری اور ذاتی جذبہ ابھارتا ہے۔ گویا جب انسان اپنے ذاتی تحفظ کے خیال کو دل سے نکال دے گا تو گویا وہ دوسرے انسان کے خشتِ ذہنی عناد اور خوف کو ہی نکال دے گا یوں وہ سکون اور امن سے رہ سکتا ہے۔

اور وہ کتا ہے کہ انسانوں کے تحفظ کا حق۔ ایک تیسرے فریق کو سوچ دینا چاہیے۔ تیسرا فریق حکمران ہے یا حکمران طبقہ۔!

یوں حکمران یا حکمران جماعت کا ہر عمل۔ گویا ہر فرد اور انسان کا عمل بن کر رہ جائے گا۔ کیونکہ حکمران یا حکمران جماعت کا وجود انسانوں کے تحفظ کے لیے معرض وجود میں آیا ہے۔ لیویا تھن کے قاری کو کتاب پڑھتے ہوئے کتنے ہی ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سوالات یقیناً ایسے ہی جن کا جواب ہوبز کی اس کتاب میں موجود نہیں۔

ہوبز کتا ہے کہ حکمران یا حکمران جماعت۔ جو "حکم" دیتی۔ جس چیز پر عمل پیرا ہوتی ہے وہ "جائز" ہے اور وہ حکمران یا حکمران جماعت کا عمل نہیں رہ جاتا۔ بلکہ وہ "برا عمل" بھی ہے۔ گویا اگر حکمران یا حکمران جماعت مجھے سزا دیتی ہے تو دراصل میں خود ہی اس سزا کا سزا دار ہوں۔ ہوبز کے ان خیالات اور اس منطق سے یقیناً شدید اختلافات کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ لیویا تھن "پڑھتے ہوئے بار بار ذہن کو شدید دھچکے لگاتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنے پڑھنے کو چوڑا کرنا اور صدمہ پہنچانا۔ خود ہوبز کے پیش نظر تھا۔ اور وہ پڑھنے والوں کے اس ردِ عمل سے معظوظ رہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے باوجود اس کتاب میں جو انسانی صورت حال پیش کی گئی ہے۔ وہ اتنی بولنگ اور تکلیف دہ نہیں ہے کہ بنی نوع انسان سے یکسر مایوس ہو جایا جائے۔ لیویا تھن "میں ہوبز جس ریاست کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہاں انسان محض ایک دوسرے سے حسد کرنے، جذبہ مسابقت کی تسکین کے لیے نہ ختم ہونے والی بے منزل دوڑ میں مصروف دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ انسان اس میں حالت امن اور سکون میں بھی رہیں گے اور یہی وہ

مدعا اور مقصد ہے۔ جو ہوبز ہمارے سامنے اس کتاب کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ وہ حکمران اور حکمران جماعت کی افادیت کو انسان اور ریاست کیلئے ناگزیر اور لازمی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ صرف براہِ علم پیشہ اور ملک کے غدار ہی ہوتے ہیں جو حکمران یا حکمران جماعت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ عام شہری تو حکمران اور حکمران جماعت کو اپنا محافظ قرار دیتے ہیں۔ یہ علمیدہ بات ہے کہ ہوبز "حق" اور "جائز" کی اصطلاح کو اپنے ہی معنی میں استعمال کرتا ہے۔ جو خاصے پیچیدہ بھی ہیں اور چونکا دینے والے بھی۔

ہوبز کے نظریے کے مطابق انسان اپنے حقوق سے محض اس لیے دستبردار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگیں اور صحیح تحفظ تو حکمران یا حکمران جماعت ہی فراہم کر سکتی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ریاست کا وجود لازمی اور ناگزیر ہے۔ ریاست ہی اس کی بقا کی ضمانت دیتی ہے اور امن و سکون کی بھی، اور انسانی فنون، علوم اور فلسفے کی بھی۔

ہوبز کے پاس ریاست کا نہ تو فطری تصور ہے نہ مسائل کا کوئی فطری حل۔ وہ تو حکمران کو بے پایاں اختیارات سے نوازتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ حکمران کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون سی کتاب شائع ہونی چاہیے اور کون سی نہیں اور یونیورسٹیوں کا نصاب کیا ہونا چاہیے۔ اور کیا پڑھایا جائے۔

اصل میں ہوبز آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب سے بڑا غیر مطمئن اور ناخوش تھا حتیٰ کہ وہ بعض کلاسیکی کتابوں کو بھی طالب علموں کے لیے ضرر رساں سمجھتا تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کی اپنی کتابیں بہتر نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں اور سیاسی تعلیمات کے حوالے سے تو اس کی کتابوں سے بہتر کتابیں بھی ہی نہیں۔

یونیورسٹیوں کی اشاعت پر نہ صرف اس کے ہم عصروں نے اس کے نظریے کی مخالفت کی بلکہ آکسفورڈ نے اس کی کتاب کو نصاب میں شامل کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بہتر تھی۔ بلکہ یونیورسٹیوں کو ایک محرب اخلاق گمراہ کن اور جعلی خیالات پر مبنی کتاب قرار دے کر اس کو سرعام نذرِ آتش بھی کیا گیا۔

ہوبز کی لامنت کا بازار اس حد تک گرم ہوا کہ ۱۶۶۶ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے لندن کی عظیم آتشزدگی کے واقعہ کے جو اسباب دریافت کیے ان میں ایک سبب ہوبز کی اساد پرستی بھی تھا!

خدا کے بارے میں "یو یو یو" میں ہوبز کے تصور کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی کچھ وضاحت ضروری ہے۔ ہوبز منکر خدا نہیں تھا۔ وہ خدا کی تجسیم کا قائل تھا کہ کٹر مادہ پرست تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

"خدا ہے۔"

"لیکن ہمارے پاس وہ آلات و ذرائع نہیں کہ ہم یہ جان سکیں کہ وہ کیسا ہے؟ اور جب ہم خدا کے بارے میں اس کی ذات پر بات کرتے ہیں تو ہم اس کی تعریف و ستائہ کرتے ہیں۔ اسے پوری طرح جان نہیں سکتے۔"

معجزوں اور خارق العادات کے بارے میں بھی ہوبز کے نظریات نے مذہبی حلقوں اور عام انسانوں میں اس کے مخالفین اور دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔

"یو یو یو" میں ایک لڑخہ حقیقت کو بڑے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کا صحیح شعور تو ہم بیسویں صدی کے انسانوں کو ہی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے میں نے کہا تھا کہ ہوبز آج کا فلسفی ہے۔ وہ قدیم بھی ہے اور جدید ترین بھی۔ ہوبز کی راست فکری سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ جو سمجھتا تھا اس پر پروردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرتا تھا وہ کسی طرح کی جوس نہی میں مبتلا نہیں تھا۔ نہ ہی وہ جھوٹی امیدوں کے چراغ جلاتا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ ہم اپنے تحفظ کے لیے کسی حکومت یا حکمران کی پناہ لیتے ہیں۔ لیکن تمام تر اصولوں اور تحفظات کے باوجود حکمران یا حکمران جماعت کی بے انصافی کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ یہ فطری حقوق، صورت حال کا مناسب اور اس طرح کی تمام پیش بندیاں اور تحفظات بے معنی ہیں۔ کیونکہ ظلم اور تشدد، بے انصافی اور جبر کے خلاف کسی طرح کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

"POWER TENDS TO CORRUPT AND ASOLUTE POWER
CORRUPT ABSOLUTELY"

ہوبز کے نظریات زندہ ہیں۔ انہیں بیسویں صدی کی عالمی سیاست نے سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ اس کے اثرات عالمگیر ہیں۔ جب ولیم گولڈنگ کا ناول "LORD OF THE FLIES" چند دہائیاں پہلے شائع ہوا اور اسے عالمگیر شہرت نصیب ہوئی تو تقاضوں نے اس پر جو تبصرے کیے ان میں لکھا کہ اس پر ہوبز کے فلسفے کا شدید اثر ہے۔ اور ہوبز کے نظریات اس دور کی صحیح عکاسی اور تفسیر پیش کرتے ہیں۔

"لیویاتھن" مارکس کے ماننے والوں کیلئے بھی ایک چیلنج ہے۔ کیونکہ موجودہ عالمی سیاسی صورت حال میں اگر ہوبز کے نظریات صحیح قرار پاتے ہیں تو پھر مارکس نے جس ریاست کا تصور پیش کیا وہ ایک حجاب کے سوا کچھ نہیں۔

اسی طرح "لیویاتھن" جمہوریت پسندوں کے لیے بھی ایک چیلنج ہے۔ کیونکہ ہوبز نہیں بتاتا ہے کہ ہمارے موجودہ جمہوری معاشرے ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور متضادم ہیں کہ یہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑ نہیں سکتے۔

ڈیکٹس تھیالوجی کو پوپس

۲۴ برس کی عمر میں وہ دنیا میں تنہا اور اکیلا رہ گیا تھا۔

اس کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ بینائی زائل ہو رہی تھی۔ دنیا کا یہ ایک اہم ترین فلسفی عدسوں (LENSES) کی رگڑائی اور چمکائی سکر کے اپنی روزی کھاتا تھا۔ ایسے حالات میں بھی جب اسے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں فلسفے کے شعبہ کی سربراہی کی پیش کش کی گئی تو اسپینوزا نے اسے مسترد کر دیا۔

وہ کسی کا احسان اس لیے نہ لینا چاہتا تھا کہ اپنی سوچ، اپنے نظریات پر وہ کسی بھی طرح کی پابندی کو پسند نہ کرتا تھا۔

بینڈ کیٹس ڈی اسپینوزا۔ ڈچ فلسفی ۲۴ نومبر ۱۶۳۲ء کو ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ وہ پرتگیزی یہودیوں کے خاندان کا فرد تھا۔ پیدائشی یہودی۔ پرتگال میں اس زمانے میں یہودیوں پر مسیحیوں نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس کا باپ سزا سے بچنے کے لیے نیدر لینڈ بھاگ آیا تھا۔ یہودیوں کی صعوبت، سخت گیر اور راسخ روایات کے تحت خالص یہودی انداز میں اسپینوزا کی تعلیم کا آغاز ہوا لیکن لڑکپن میں ہی اسپینوزا نے کٹھ اور راسخ العقیدہ خیالات کی بجائے آزادانہ فکر کو اپنا لیا۔ وہ بڑا بے باک اور نڈر تھا۔ اس نے طالب علمی کے زمانے میں ہی اپنے ساتھی طالب علموں میں ایسے خیالات کا پرچار شروع کر دیا۔ جو یہودی مذہب اور عقائد کی شدید ترین نفی کرتے تھے۔ اس نے یہودیوں کے بڑے بڑے مقدس عالموں اور دینی رہنماؤں کی تعلیمات پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ان

بڑے یہودی دینی اور مذہبی عاملوں سے زیادہ تو ایک طالب علم دینیات اور طبیبیات کے بارے میں علم رکھتا ہے۔

چونکہ اسپینوزا نے منافقت اختیار نہ کی تھی اس لیے اس کے خلاف تاویسی کارروائی کرتے ہوئے اسے یہودیوں نے اپنے دین اور حلقے سے خارج کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اسپینوزا نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ورٹے میں ملنے والی سرسبز اور آسودگی سے محروم ہونے کے باوجود وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی دنیا میں یہودیوں کو سرے سے شہری حقوق حاصل نہ تھے۔ یہودی اپنی جماعت کے فرد کی حیثیت سے ہی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اسپینوزا نے ہر مخالفت کا وار سہا۔ اس کے ہم مذہبوں نے عیسائی حکام کو رشوتیں دیں کہ کسی طرح اسپینوزا کا منہ بند کیا جاسکے۔ لیکن وہ ناکام رہے اصل میں اس زمانے کے یہودیوں کو اسپینوزا سے دہرا نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ یہودی ہونے کے باوجود یہودیوں کے عقائد کا مذاق اڑا رہا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ جن خیالات و نظریات کا اظہار کر رہا تھا وہ عیسائیت کے بھی خلاف جاتے تھے۔ یہودی جن کی سماجی حیثیت اس زمانے میں صفر کے برابر تھی۔ انہیں خطرہ تھا کہ عیسائی کہیں اسپینوزا کے خیالات کو یہودیوں کے نظریات سمجھ کر یہودی جماعت کے خلاف نئے نئے کھڑے ہوں۔ اس لیے انہوں نے اسپینوزا کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اسپینوزا کی دُھائی دیکھیے کہ وہ یہودی عبادت گاہوں میں جانا اور وہاں اپنے نظریات اور خیالات کا پرچار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہودی اسے اپنی جماعت سے خارج نہ کریں۔ بلکہ اس کے نظریات کو قبول کر لیں۔ چونکہ ایسا نہ ہوا اور اسپینوزا کا کوئی بیان صفائی اس کے کام نہ آیا تو اسے یہودی مذہب سے خارج کر دیا گیا۔

اب وہ اکیلا، تنہا انسان تھا۔ اس وقت اس کا ایک مسیحی دوست فرانسس دان ڈیمن اینڈن اس کے کام آیا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ کیونکہ اسپینوزا کا اب کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے اسے صلاح دی کہ وہ بچوں کو پڑھایا کرے۔ پھر عدسوں (LENSES) کی گرگڑائی اور چمکانی کا کام بھی اسپینوزا نے سیکھ لیا اور وہ اسی پیشے سے منسلک رہ کر

روزی کہتا رہا۔

وہ فلسفے کا مطالعہ کرتا رہا۔ عبرانی زبان پر پوری دسترس حاصل کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے ارد گرد دینیات کے کچھ طالب علموں کو جمع کر کے ایک حلقہ بنا لیا۔ جہاں فلسفے اور دین کے موضوعات پر بات چیت ہوتی۔ لیکن یہاں بھی اسپینوزا کی بڑی مخالفت ہوئی۔ ۱۶۶۶ء میں وہ رنزبرگ چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنے نظریات پر طبعی کچھ رسالے لکھے جو خدا، آدمی اور خدا کے وجود کے بارے میں تھے۔ پھر اس نے وہیں اپنی کتاب ETHICS (اخلاقیات) کا ایک بڑا حصہ مکمل کیا۔ ۱۶۷۰ء میں وہ دوربرگ آٹھ آیا۔ ۱۶۷۰ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب "رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات

(TRACTATUS - THEOLOGICO - POLITIENS) شائع کیا۔ اس پر کسی کا نام درج نہ تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد وہ ہیگ چلا آیا جہاں اب اس کے ہم خیالوں کا ایک معقول حلقہ پیدا ہو چکا تھا۔ رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات کی اشاعت نے بڑا تہلکہ پیدا کیا۔ اس کے پانچ ایڈیشن یکے بعد دیگرے پانچ برسوں میں شائع ہوئے یورپ میں اس کا شہرہ ہوا۔ اس کی حمایت اور مخالفت میں ایک طویل بحث کا آغاز ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

۱۶۷۲ء میں جب فرانس نے ہالینڈ پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اسپینوزا نے اس قتل و غارت گری کے خلاف آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک بڑا بورڈ بھی تیار کیا جسے نصب کر کے اس کے پاس کھڑا رہ کر وہ قتل و غارت گری کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے دوست ڈان ڈر سپانگس نے نہ صرف اسے اس ارادے سے باز رکھا بلکہ اسپینوزا کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر اس کے کمرے میں بند کر دیا۔ لازمی بات ہے کہ اگر اسپینوزا احتجاج کے لیے نکلتا تو ہلاک کر دیا جاتا یوں اس کے دوست نے اپنی حکمت عملی سے اس کی جان بچالی۔ اس کے رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات کو سرکاری اور اجتماعی طور پر مذمت کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ جو یہودی مذہب کا ناقد تھا۔ اس کی اس کتاب کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ایک یہودی اور شیطان کی تصنیف ہے۔

اس کی دوسری تصنیف اخلاقیات ہے۔ جسے وہ مختلف ادوار میں مکمل کرتا رہا۔ اسپینوزا کو ہائیڈل برگ میں شعبہ فلسفہ کے سربراہ بننے کی دعوت دی گئی۔ لیکن اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ اسپینوزا نے ساری عمر مصیبتیں سہتے ہوئے کاٹ دی۔ اپنی روٹی نمکھانے کے لیے اس نے جو پیشہ اختیار کیا۔ اس نے اس کی صحت پر بڑا اثر ڈالا۔ لیکن وہ ساری عمر کسی کا احسان مند نہ ہوا۔ ۲۰ فروری ۱۶۷۷ء کو وہ انتقال کر گیا اس کی عمر صرف پینتالیس برس تھی!

اس نے جو رسالہ صرف سیاسیات کے بارے میں لکھا تھا وہ اس کے مرنے کے بعد شائع ہوا۔

اسپینوزا کا فلسفہ

اسپینوزا کو اس کی تصنیف "اخلاقیات" اور "رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات" کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے بہت کم عمر پائی۔ اور جتنا عرصہ زندہ رہا لوگ اس کی مخالفت کرتے اور مصائب میں اضافہ ہی کرتے رہے۔ اس کے باوجود اس کے نظریات اور انکار کو بہت طویل عمر حاصل ہوئی۔ اور آئے والے ہر دور میں فلسفے کے شعبے میں اس کے نظریات و انکار کے حوالے سے بات ہوتی رہے گی۔ اس نے اپنے بعد کی نسوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ دنیا کے عظیم ترین فلسفیوں میں شمار ہوا۔ اس کی کتابوں کے دنیا کی ہر بڑی زبان میں تراجم ہوئے۔ "اخلاقیات" اور "رسالہ دربارہ دینیات" سیاسیات نے انسانی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ جس کے اثرات موجودہ دور کے انکار پر بے حد واضح ہیں۔ اسپینوزا سے اختلاف کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اتنا بڑا فلسفی ہے کہ اسے رد نہیں کیا جاسکتا۔

اسپینوزا ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اپنی ناپائیداری اور باہمی دشمنیوں کے باوجود کس طرح پُر امن زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انسان اس کے نزدیک جذبات سے سب سے زیادہ اثر لیتا ہے۔ لیکن جذباتی ہونے کے باوجود انسانی قوانین کی پابندی کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان جذباتیت کو ترک کر دے۔ منطقی اور سائنسی انداز فکر کو اپنائے۔ اسپینوزا

کا نظریہ ہے کہ اخلاقیات اور مذہب - انسان ترقی میں بہت کم اور حقیر کردار ادا کرتے ہیں صحافت اور سماج کو سمجھنے کے لیے اقدار کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ریاست ایک ایسا فن ہے جو اطلاقی نفسیات کی پیداوار ہے۔ استعمار کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو ان لوگوں کے عقلی رویوں اور تجربات کے مظہر بنوں۔

انسان - خواہشات کا پلندہ ہے۔ انسان جنگ سے بھاگتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ایک فطری ریاست قائم کرے۔ وہ اس فطری ریاست میں اپنی ذات کا تحفظ چاہتا ہے ذاتی مفاد کی بنیاد پر عقل پر ہوتو پھر ان لوگوں کا اجتماعی رویہ ایک خود مختار ریاست کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے انفرادی مفاد اور اجتماعی رویے کے اظہار کے باوجود انسان اپنے حقوق کو کھونے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ ایک دانا سربراہ حکومت اپنی رعایا کے مفادات کا نگہبان ہوتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ ذہنوں کے اتحاد اور یکجہائی کو حاصل کر سکے۔

اسپیوزا کا - فطری قانون کا نظریہ بے حد اہم ہے۔ وہ خدا کو عالمی فطرت کے مساوی قرار دیتا ہے۔ اس میں انسان کا فطری حق، فطری اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرتا ہے۔ وہ قوانین جو فطری انسان کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ وہ عقل پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسپوزا کے ہاں عقل (REASON) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وہ زور دیتا ہے کہ کسی بھی سیاسی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو یہ آزادی دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عقل کا استعمال و اظہار کرے۔ اسپوزا کے نزدیک اور قابل اطمینان اور سیاسی بخشش ریاست وہ ہے جو نہ صرف انسان کو تحفظ فراہم کرتی ہے بلکہ اسے دانشورانہ آزادی بھی بخشتی ہے۔ اگر روشن خیال شہریوں کی ضرورت ہے تو پھر کسی بھی شخص کی رائے کو دباننا اور کچلنا نہیں چاہیے۔ ایک ایسا شخص جو عقل و شعور اور روشنی سے بہرہ مند ہے۔ وہ یقیناً اس آزادی سے بہتر ہے۔ جسے اپنی حالت کا مناسب احساس نہیں اور وہ صرف اپنے جذبات کے رحم و کرم پر زندہ ہے۔

اسپیونز اسمگل، برہاداری، مذہبی آزادی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ریاست اور مذہب کو یکجا کرنے کا مخالف ہے وہ انہیں علیحدہ علیحدہ حیثیت دیتا ہے۔ وہ مذہبی توہم پرستی، ضعیف عقائد کو ظلم و جبر اور عدم تحمل کا سرسپہ قرار دیتا ہے۔

اسپیونز کی تصانیف اخلاقیات اور رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات نے بطور خاص انسانی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسپیونز نے مذہبی عنصر کو بے وقعت تو قرار نہیں دیا لیکن وہ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ عقل (REASON) کو اہمیت دیتا ہے۔ وجدان کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ بڑی جذباتیت اور ناقابل اعتماد ہے۔

”رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات“ نے فلسفے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اس کتاب کے نظریات و افکار اپنی اشاعت کے وقت بھی فکرائیگز اور تسلک خیر ثابت ہوئے تھے۔ اور آج جب کہ اسپینوز اکو دنیا کے عظیم معماروں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے افکار و نظریات زیر بحث رہتے ہیں۔ فلسفے کے نظریات کی تاریخ میں اس کے نظریات اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ فلسفے کی دنیا میں اسپینوز کو ایک لازماً مقام اور مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔

ذیل میں اس کے فکرائیگز رسالہ دربارہ دینیات و سیاسیات کی تلخیص

دی جا رہی ہے۔

”ٹریکیٹس ٹھیا کو جبیکو۔ پولیٹیکس“ کی تلخیص

فطرت کو یہ مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی قوت۔ فطرت کی قوت ہے۔ خدا جسے کہ تمام چیزوں پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس لیے ہر فرد کو یہ مکمل حق حاصل ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک فرد کے حق کی حدود بے پایاں ہیں۔ ان کو مشروط نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مطلق قانون اور حق فطرت ہے

کہ انسان جیسا چاہے، اپنے آپ کو اس حالت میں برقرار رکھے۔ اپنے تحفظ کے لیے اس کے لیے کسی دوسری چیز کا خیال کرنے کی۔ ماسوائے اپنے۔ ضرورت نہیں ہے۔ یہ مطلق قانون اور حق فطرت ہر فرد پر اطلاق کرتا ہے کہ وہ جسے اور فطری صلاحیتوں کے تحت عمل کرے۔

فرد کے اس فطری حق کا حصول معقول عقل کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ خواہشات اور طاقت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ فطری طور پر تمام انسان اس کے اہل نہیں ہیں کہ وہ قوانین اور عقل کے اصولوں پر عمل کر سکیں۔ ہر شخص لاعلم اور بے شعور پیدا ہوتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر سکیں۔ اور اپنے اندر عقل پیدا کر سکیں تو خواہ ان کی تربیت اور پیدائش اچھے حالات میں ہی کیوں نہ ہوئی ہو، وہ اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ بسر کر چکے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ انسان کا مقصد ہے کہ وہ اپنے آپ کو نادمہ رکھے اور جس حد تک ممکن ہو سکے جذباتیت کے بغیر اپنی حالت کو برقرار رکھے فطرت انسان کو جو اس کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں بخشتی۔ عقل کے تحت زندگی بسر کرنے کی بجائے انسان فطری طور پر خواہشات اور اقتدار سے متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ انسانوں کا ذہن منور نہیں ہوتا۔ وہ قانون فطرت کے تحت زندہ رہتے ہیں۔ اس لیے ایک بلی بھی مجبور ہے کہ وہ اسی طرح قانون فطرت کے تحت زندگی بسر کرے جس کے تحت ایک شیر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

اس کے باوجود۔ خواہ کچھ ہی ہو ایک فرد اپنے لیے کارآمد اور مفید باتیں سوچ سکتا ہے۔ خواہ اس کی یہ سوچ فطرت کی بخشی ہوئی ہو یا اس کی خواہشات کے دباؤ کا نتیجہ ہو۔ بہر حال فرد کا یہ مطلبی حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہترین حالت میں زندہ رکھ سکے اس کے لیے وہ چالاک، فریب اور طاقت سے بھی کام لیتا ہے فرد ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھتا ہے جو اس کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

انسانوں کے لیے یہ ناگزیر اور لازم ہے کہ وہ محفوظ اور پرسکون زندگی بسر کرنے کے لیے اس پر متعلق ہوں کہ فطرت نے فرد کی حیثیت سے ان کو جو حق دیا ہے وہ اس کا احترام کریں۔ اس طرح انسان ایک بہتر اجتماعی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انسانوں کے لیے ضرور

ہے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کریں کہ ان کی زندگی پر کسی دوسرے فرد کی خواہشوں اور طاقت کا اثر نہ ہو۔ اگر انسان خواہش اور آرزو کو اپنا رہنما بناتے ہیں تو وہ کبھی پرسکون اور بہتر زندگی بسر نہ کر سکیں گے۔ اگر ایسا کیا گیا تو چہرہ ہر شخص کی اپنی ہی سمت ہوگی۔ اس لیے انسانوں کو انفرادی طور پر فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ ہر معاملے میں عقل کو اپنا رہنما بنائیں گے اور ہر ایسی خواہش کو کچل دیں گے جس سے ان کے ہم جنسوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے انہیں اپنے ہمسائے کے حقوق کا بھی اسی طرح تحفظ کرنا چاہیے۔ جس طرح وہ اپنے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔

جمہوریت ایک ایسی سیاست ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سماج اور معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام تر اختیارات کا استعمال اجتماعی اور یک کی صورت میں کرتا ہے۔ لیکن خود مختار قوت کو کسی قانون کے تحت زور کا نہیں جانا بلکہ ہر شخص ہر معاملے میں اس کی استطاعت کرتا ہے۔ یہ فطری اختیار جو ہر انسان کو حاصل ہوا ہے اسے انسان عقل کے ذریعے اس معاشرے کے سپرد کر دیتا ہے وہ اسے تقسیم نہیں کرتا تاکہ ریاست تباہ نہ ہو جائے۔ اس فطری اختیار کے حوالے سے فرد عقل کی احتیاج کو معاشرے کی ضرورت کے مطابق پورا کرتا ہے۔ احکام کی اطاعت میں جو اعمال رونما ہوتے ہیں وہ بہت حد تک آزادی کو متاثر کرتے ہیں لیکن یہ احکام کسی انسان کو غلام نہیں بنا سکتے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ تمام اعمال کی عرض و دعوت کی ہے۔ اگر مقصد ریاست کی جھلانی کے لیے ہوتا ہے اور اس کے ایجنٹ کی جھلانی اس کا مقصود نہ ہو تو پھر ایک ایجنٹ ایسا غلام ہے جو اپنی جھلانی نہیں چاہتا ہے۔ وہی ریاست آزاد ترین ہوتی ہے جس کے قوانین عقل پر استوار ہوں اس لیے اس معاشرے کا ہر فرد اگر چاہے۔ اگر ارادہ کرے تو وہ آزاد رہ سکتا ہے۔

اسی طرح کہ وہ عقل کی ممکن رہنمائی میں اپنی زندگی کو ڈھالے۔

کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنا اختیار، قوت اور حق کسی دوسرے کو منتقل کر دے کیونکہ ایسا ہونے سے وہ انسان ہی نہیں رہتا۔ اس طرح کوئی طاقت کبھی اتنی خود مختار اور مطلق نہیں ہوتی کہ جس کے بل بوتے پر ہر خواہش ممکن ہو سکے۔ اس لیے کسی شخص کے دل میں اس چیز سے نفرت پیدا نہیں کی جاسکتی جسے وہ پسند کرتا ہے اور نہ ہی

اس کو وہ چیز پسند کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے جو اسے ناپسند ہو۔ فطرت کا قانون اور اصول انسانوں کو ہر خوف سے آزاد کرتا ہے اور جو قانون فرد کے دل میں خوف پیدا کرے وہ فطری نہیں ہوتا۔ کسی ریاست کے استحکام کا دار و مدار اس کے باشندوں کی وفاداری پر ہے کہ وہ تسلسل اور مستقل مزاجی سے ان احکام کی اطاعت کرتے ہیں جو غیر مبہم اور واضح ہونے کے ساتھ ساتھ سچے اور عقل پر استوار ہوتے ہیں۔ شہریوں اور باشندوں کو یہ سکھانا کہ وہ کس طرح احکام کی اطاعت کرتے ہوئے اس سے وفادار رہ سکتے ہیں۔ کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ حکمران اور رعایا دونوں انسان ہوتے ہیں اور ان دونوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ لالچ سے اجتناب کریں۔ وہ ان گنت لوگ جو آسودہ اور مطمئن زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل کی بجائے جذبات کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ یہ جذبات ہی ہیں جو ہر ادارے کو اخلاق باختہ اور رشوت خور بناتے ہیں اور جذبات کی رہنمائی میں ہی انسان عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی تحریک حاصل کرتا ہے جب انسان سو دوزیاں کو معیار بنا کر سوچنے لگے تو وہ جذبات کا اسیر ہوتا ہے۔ جذبات ہی اسے اکساتے ہیں کہ وہ اپنے جیسے انسانوں سے وفا کرے اور ان کی رہنمائی حاصل کرنے سے انکار کر دے۔ اپنے سے بڑے اور اونچے عہدوں پر فائز لوگوں کی شہرت اور رتبے سے حسد کی وجہ سے اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کی تباہی کا سبب بنے۔

ان تمام برائیوں کے خاتمے اور ہر طرح کے دھوکے کے غلبے سے بچنے کے لیے ہمیں اپنے لیے ایسے اداروں کو تشکیل دینا ہوگا۔ جن سے متعلق ہر وہ شخص خواہ کسی بھی رتبے پر فائز ہو وہ اپنے ذاتی فائدے کی بجائے اجتماعی بھلائی کو ترجیح دے۔ کسی شخص کا وزن اور دماغ مکمل طور پر کسی دوسرے کی تحویل میں نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ کسی بھی فرد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ عقل آزاد اور اپنے فیصلے کے فطری حق کو دوسرے کی طرف منتقل کر سکے یا کسی کو اس کے لیے مجبور کر سکے۔ اس لیے وہ حکومت جو لوگوں کے ذہنوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے ظالم و جابر ہے۔ غیر فطری ہے اور وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے اپنے باشندوں کے حقوق کو سلب کرتی ہے۔ فرد کے اپنے اعتقادات خواہ کیسے ہوں۔ وہ خدا کی جس

طرح چاہے عبادت کرتا ہر اس میں مداخلت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اگر ان پر کوئی چیز ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ ان کے حقوق کی نفی کے مترادف ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان خود بھی چاہتے تو اپنے فطری رجحان کو یکسر ختم نہیں کر سکتا۔

ایک حکمران کی قوت اور اس کا اختیار خواہ کتنا ہی لامحدود اور بے پایاں کیوں نہ ہو خواہ وہ قانون اور مذہب کا معتقد ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن کسی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ فرد جو فیصلہ اپنی دانش کے ذریعے یا حتیٰ اگر اپنے جذبات کے حوالے سے کرتا ہے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا کرے یہ درست ہے کہ ایسے تمام لوگوں اور رعایا کو حکمران اپنا دشمن سمجھے گا جو اس کی رائے اور فیصلے سے متفق نہیں ہیں۔ لیکن ہم اس وقت فرد کی آزادی کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ فرد کے فیصلے اور رائے سے جتنا اختلاف حکمران کو ہو وہ اپنی جگہ لیکن حکمران کو فرد کی رائے اور فیصلے کو کچھنے کا کوئی فطری حق اور اختیار حاصل نہیں۔ ایک حکمران تشدد کے حکومت کر سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ایک حکمران کو جو اختیار ملے ہیں وہ اس کی قوت کے مطابق محدود ہوتے ہیں۔

ہر شخص اپنے خیالات کا مالک ہے۔ یہی اصول فطرت ہے کسی حکومت کا مقصد اور غایت یہ نہیں ہوتی کہ وہ حکمرانی کرے اس بات سے خوفزدہ رہے کہ احکام کی پوری تعمیل نہ ہوگی، تو لوگ مطیع نہ ہو سکیں گے۔ حقیقت میں ایک حکومت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کو ہر طرف سے آزاد کر دے تاکہ وہ ہر ممکنہ تحفظ کے ساتھ زندگی بسر کر سکے یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہ فرد اپنے فطری حق کو تو انا کر سکے۔ اور اس طرح زندگی بسر کرے کہ نہ اسے خود اپنے آپ سے تکلیف پہنچنے نہ دوسرے کو۔ حکومت کی غرض وغایت کسی بھی عقلیت پسند فطری انسان کو جانور یا کھڑکی بنانا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کو اس قابل بنانا ہوتا ہے کہ وہ پورے تحفظ کے ساتھ زندہ رہتے ہوئے اپنی عقل و دانش کو بروئے کار لاسکیں اور مل حکومت کا منشا و مقصد ہی آزادی ہے۔

... چونکہ انسان کے آزادانہ فیصلے عموماً متضاد ہوتے ہیں اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک ہی سب کچھ جانتا ہے۔ اس لیے گفتگو اور احساسات میں کبھی اتحاد اور یک رنگی

پیدا نہیں ہوتی۔ یوں امن کو برقرار رکھنا مشکل اور ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا یہ حق خود ہی ترک کر دے کہ اسے سب کچھ اپنی آزادانہ رائے اور فیصلے کے مطابق کرنا ہے لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ وہ اپنی آزاد عقل کو بھی ترک نہ کرے۔ اس کی مثال کچھ اس طرح دی جا سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص ہے جو سمجھتا ہے کہ فلاں قانون عقل کے منافی ہے۔ اس لیے اسے تبدیل کیا جانا چاہیے۔ ایسا سوچنا اور ایسا کرنا چاہیے۔ اس کا فطری حق ہے اسے چاہیے کہ وہ متعلقہ قانون سازوں اور منصفوں تک اپنی بات مناسب انداز میں پہنچائے۔ وہ اس دوران میں قانون کے برعکس اپنی زندگی بسر کرتے ہوئے وہ غیر عقلی انداز اختیار نہ کرے جب ایسا شخص ریاست کے احترام کو برقرار رکھے تو حکومت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے شخص کا احترام کرے اور اس کے احترام پر عقل کے مطابق غور کرے لیکن وہی شخص حکومت پر بے انصاف ہونے کا الزام لگانے لگے۔ اور لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکانے لگے اور وہ کسی بھی رائے سے پہلے ہی اس قانون کو توڑ دے تو میرے نزدیک وہ شخص محض ایک احتجاجی اور باغی ہے۔ اس طرح ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کس طرح اپنی آزادی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے نظریے کی اس طرح تبلیغ کر سکتا ہے نہ تو ان حکمرانوں کے اختیار کو مجروح کرے اور نہ ہی امن عامہ کو متاثر کرے۔

اپنی فطری حالت میں جو شخص عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے وہی بے حد توانا اور آزاد شخص ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے باشندوں اور رعایا پر مشتمل حکومت ہی توانا اور آزاد ترین ہوتی ہے جس کی رہنمائی عقل کرتی ہو۔

انہوں کی اکثریت اندھے جذبات کی تابع ہوتی ہے عقل کی نہیں اس لیے انسان کا وہ فطری اختیار اور حق محدود ہو جاتا ہے جو فطرت کی دویت ہے۔ !!!

رمی پبلک

”انحصار میں بنیادی کوتاہ کر دیتا ہے۔ کہ انصلوں کو غارت کر دیتا ہے اور گھن لکڑی کو کھٹا جاتا ہے اسی طرح عجیب و غریب خامیاں انسانی روح کو تباہ کر دیتی ہیں۔ یہ خامیاں بے انصافی غیر معتدل مزاجی، بزدلی اور جہالت ہیں۔ کیا یہ خامیاں اور بُرائیاں انسانی روح کو تباہ کر سکتی ہیں؟ نہیں، یقیناً نہیں، یہ روح کی لازوال صفت کو کبھی تباہ نہیں کر سکتیں۔ یہ اس طرح روح کو نہیں گھٹا سکتیں۔ جس طرح بیماریاں انسانی جسم کو تباہ کر دیتی ہیں لیکن یہ خامیاں انسانی وجود کی موت کا سبب ضرور بن سکتی ہیں۔ برائی روح کو تباہ نہیں کر سکتی کیونکہ روح لازوال ہے۔“

”انصاف۔ یہی انسان کے لیے بہترین انعام اور صلہ ہے انسانی تقدیر پر خواہ وہ کتنی ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو وہ بھی دراصل انسان کی بہتری کے لیے ہوتی ہے۔ دیوتا انسانوں کو چاہتے ہیں موت کے بعد کی زندگی جو انسان کا انتظار کرتی ہے وہ انسان کے لیے سب سے بڑا صلہ اور سب سے بڑا انعام ہے۔“

افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”رمی پبلک“ میں ایک فلسفی حکمران کا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ انصاف اور علم کو سب سے بڑی خوبی اور صفت قرار دیتا ہے۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ رمی پبلک کے حوالے سے ہمارے لیے ایک ایسی مثالی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے جہاں انصاف اور علم کی حکمرانی ہے۔

افلاطون دنیا کا وہ فلسفی ہے جس کا نام ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود دنیا

کے ہر خطے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اپنے دور افتادہ دیہات میں نکل جائیے وہاں بھی لوگ باتوں باتوں میں کسی کا ذکر کرتے ہوئے کہیں گے کہ وہ بڑا افلاطون ہے۔ اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ یہ افلاطون کون تھا؟ تو وہ اس کا جواب نہ دے سکیں گے۔

افلاطون کے مکالمات اور بالخصوص "ری پبلک" کو جو مشہرت حاصل ہوئی ہے اس کو تفصیل سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں "ری پبلک" کا ترجمہ نہ ہوا ہو اور "ری پبلک" کے حوالے سے فلسفیوں اور دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو۔ برٹنڈرسل نے لکھا تھا کہ اتنی صدیاں بیت گئیں لیکن انسانی فکر و دانش پر افلاطون اور اسطو کے خیالات و افکار اتنے گہرے ہیں کہ انہیں انسانی فکر کی مرکزیت حاصل ہو چکی ہے۔

افلاطون کی "ری پبلک" اور خود اس کی اپنی ذات اور اس کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس دور کے یونان کے عمومی حالات اور بالخصوص سقراط کے بارے میں جاننا ناگزیر ہے۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا ان ریاستوں میں کارنتھ، سپارٹا اور ایٹنز کی ریاستیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایٹنز علم و ادب اور تہذیب کا مرکز تھا۔ اس کا رقبہ سات سو مربع میل تھا۔ اور آبادی ساڑھے تین لاکھ کے قریب تھی۔ ایٹنز کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا کی یا کم از کم یورپ کی پہلی جمہوری ریاست تھی۔

۴۲۱ ق۔ م میں سقراط کی عمر ۷۰ برس تھی۔ اس وقت ایٹنز پر سپارٹا، کارنتھ اور مکیڈون نے حملہ کیا تھا اور ایٹنز ایک چھوٹی سی ریاست رہ گئی تھی۔ یہ جنگ ۴۰۴ ق۔ م سے ۴۰۳ ق۔ م تک لڑی گئی۔ اس دوران میں ایٹنز کا دستور کئی بار بدلا گیا۔ ایٹنز میں پہلے ایک مستدل چندر سری (OLIGARCHY) حکومت بنی پھر معدود جمہوریت کا دور آیا۔ جس کے بارے میں اسطو کا خیال ہے کہ اس سے بہتر جمہوریت ایٹنز کو پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ یہ معدود جمہوریت۔ غیر معدود جمہوریت میں تبدیل ہوئی۔ اس طرح کے الٹ پھیر کا نتیجہ یہ نکلا

کرسوفسطالی طبقے کو عروج حاصل ہوا یہ سونسطالی حکما رمعا و ضد لے کر لوگوں کو درس اور لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا ایک ہی نام تھا پرانے خیالات پر تنقید اور نئے خیالات کو بغیر تنقید و تحقیق کے تسلیم کر کے ان کی مدح کرنا۔

یہ وہ ماحول اور پس منظر تھا جب ۴۳۱ ق۔ م میں افلاطون پیدا ہوا۔ اس وقت سقراط چالیس برس کا ہو چکا تھا۔ افلاطون کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس حیران کن انداز میں وہ صدیوں سے دنیا بھر میں مقبول ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس کے بارے میں پوری معلومات سہنی چاہیے۔ مگر افلاطون کے بارے میں بھی سہی پوری تفصیل سے حالات معلوم نہیں۔ بہر حال۔ وہ ایک بڑے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ باپ کی طرف سے اس کا رشتہ ایتھنز کے بادشاہوں اور ماں کی طرف سے سولن سے جا ملتا تھا۔ سولن کو قانون سازی اور حکمرانی کے اصولوں کو ترتیب کرنے کے ضمن میں عالمگیر لائٹانی شہرت ملی ہے۔

افلاطون پہلے تو کرٹیس کاشا گورہا جو سہرا کلیٹس کے فلسفہ و تغیر کا مقلد تھا۔ اس کے بعد افلاطون نے کچھ عرصہ ابن الوقت سونسطائیوں سے بھی تعلیم حاصل کی وہ ان کے علم میں گرفتار رہا۔ مگر بعد میں وہ ان کا شدید مخالف بن گیا۔ جس کا ثبوت "مکالمات" میں ملتا ہے۔ جب سقراط سے افلاطون کا رابطہ ہوا تو افلاطون کی دنیا ہی بدل گئی۔

سقراط کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یونان کے لوگ اسے خطی اور سنی سمجھتے تھے مگر نوجوانوں میں وہ بے حد مقبول تھا۔ سقراط کا مخصوص انداز تعلیم بھی ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ علمی استدلال اور جرح۔ سقراط زمانہ سازی سے کوسوں دور تھا۔ وہ مردہ مذہب پر بھی اندھا اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ وہ ساری عمر جن گوی "اور جن" پرستی کا سچا رہا افلاطون کی زندگی اور افکار کو سقراط نے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ مگر حقیقی معنوں میں افلاطون ذہنی اور روحانی طور پر سقراط کا اس کا وقت معترف اور سچا مداح بنا جب سقراط نے زہر کا پیالہ پیا۔ سقراط پر الزام تھا کہ وہ مردہ مذہب کا قائل نہیں تھا اور سنگین ترین الزام یہ تھا کہ وہ نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ سقراط چاہتا تو زندگی بچانے کے لیے معافی مانگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کیا۔

جب سقراط نے زندان میں زیرِ پناہ تو افلاطون بیار تھا۔ سقراط کی موت کے بعد افلاطون اتنا بد دل ہوا کہ وہ ایستخضر میں نہ ٹھہر سکا۔ اور جگا را چلا گیا۔ کئی برس تک اہلی، سارین، بسلی اور مصر میں گھومتا رہا۔ اس زمانے میں اسے غلام بنا کر بیچ دیا گیا اور بڑی مشکل سے اس کی رہائی اور آزادی ہوئی۔ ایستخضر واپس آکر افلاطون نے ایک اکادمی کی بنیاد رکھی۔ جہاں ہم برس تک فلسفہ اور ریاضی کا مفت درس دیتا رہا۔ وہ ساٹھ برس کا تھا جب اس نے روحی ہلکتے لکھی جس میں اس نے فلسفی حکمران کا تصور پیش کیا۔ اس تعلیم اور افکار کو آزمانے کا اسے موقع بھی ملا۔ پراکونڈ میں ان دنوں ڈیویو سنس ایک نوجوان حکمران تھا۔ ۳۰ برس کی عمر میں وہ بادشاہ بنا تھا۔ افلاطون کو دعوت دی گئی کہ وہ سسلی آکر نوجوان حکمران کو تعلیم دے اور اس کا اتالیق بنے افلاطون بڑی خوشی سے سسلی گیا مگر نوجوان بادشاہ ڈیویو جلد ہی علمی دماغ سوزی سے گھبرا گیا۔ افلاطون کو واپس آنا پڑا۔ دوسرے برس وہ پھر سسلی گیا۔ مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد افلاطون کی زندگی اپنی اکادمی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے گزر گئی۔ ۵۱ ق۔ م میں ۸۱ برس کی عمر میں افلاطون کا انتقال ہوا۔

افلاطون کا فلسفہ جو سچر بے کنار کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ابتداء میں ایک دریا کی طرح تھا سقراط کی سیرت اور افکار کو سمجھنے بغیر افلاطون کو سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ سقراط کے بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔

۴۱۱ ق۔ م میں سقراط کی عمر ۶۰ برس تھی۔ اس کی بیوی ڈان تھییب کی بد مزاجی کا شہرہ آج سائے عالم میں ہے۔ وہ زیور علم سے عاری تھی۔ سقراط کی گھریلو زندگی ناخوشگوار تھی۔ سقراط کی کچھ ذاتی ملکیت تھی۔ جس کی آمدنی سے گھر چل رہا تھا۔ سقراط کا سارا وقت تحقیق و تعلیم میں گزرتا تھا۔ وہ کتابوں کا رسیا تھا نہ ہی اسے لکھنے سے کوئی دلچسپی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علوم سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ چلتے ہوئے، ٹہلتے ہوئے، بازاروں میں، جننازیم اور تفریح گاہوں میں نوجوانوں کو تعلیم دیتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے ابن الوقت سوسفٹائیوں کا سب سے بڑا حریف تھا۔ جو پیسے کو غلط تعلیم دیتے تھے جب کہ سقراط کوئی معاوضہ نہ لیتا تھا۔ سقراط کی تعلیمات کو اس کے اپنے ذواتوال میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے :

”اپنے آپ کو پہچانو۔“

”نیکی علم ہے۔“

سقراط مدحتی تھا۔ وہ بے پناہ اخلاقی جرأت کا مالک تھا۔ ۳۹۹ ق۔م میں اہل ایٹھنز کی جیوری کے سامنے پیش کیا گیا جو ۵۰۰ افراد پر مشتمل تھی۔ تین اشخاص خطیب لائمن ایک معمولی شاہ ولیٹس اور بارٹر رہنما اناکسس نے سقراط پر الزام لگایا تھا کہ وہ پرانے دیوتاؤں کا قائل نہیں اور نئے دیوتاؤں کو مانتا ہے اور نوجوانوں کا اخلاق بگاڑتا ہے جیوری کے پانچ سو افراد میں سے بیشتر سقراط کی علمی استدلال پر مبنی جرح کے زخم خوردہ تھے۔ فیصلہ سقراط کے خلاف ہوا اور تعجب ہے کہ صرف ۲۰ افراد کی اکثریت سے ہوا۔ ایٹھنز کے دستور کے مطابق سقراط کو صفائی کا موقع دیا گیا۔ سقراط نے نہ تو الزام کی صداقت کو قبول کیا نہ معافی مانگی۔ سقراط نے اپنی سزا میں تخفیف کی اپیل کے بجائے یہ مطالبہ کیا کہ اس نے اہل ایٹھنز کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اس کے صلے میں اسے ایوانِ بلدیہ میں معزز مسلمان کا رتبہ دے کر رکھنا چاہیے۔ جیوری کے افراد اس مطالبے سے مزید برہم ہوئے۔ سقراط نے انتہائی بے پردائی سے اپنی موت کا حکم سنا، زمانہ میں سارے دن اطمینان سے گزارے اس کا شاگرد فوکرٹو زمانہ کے داروغہ سے سووا کر چکا تھا کہ سقراط کو فرزند ہونے دیا جائے۔ لیکن سقراط نے جان بچانے اور فرار ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی تعلیم اور قربانی کو یوں رائیگاں کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔

افلاطون نے سقراط کو لازوال شہرت بخشی وہ مکالمات افلاطون کا بنیادی اور مرکزی کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کو جو شہرت بخشی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ افلاطون سقراط کے حوالے سے فلسفے کا ایک شاندار نظام مرتب کرتا ہے۔ جس کا فیض پوری دنیا کو پہنچا اور ہمیشہ پہنچتا رہے گا۔ مسلمانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے افلاطون کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کر کے دوبارہ زندگی بخشی۔

افلاطون پر سقراط کی موت کا گہرا اثر ہوا۔ اس اثر کے تحت اس نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا اور غالباً افلاطون کے سامنے ابتداء میں یہ مقصد تھا کہ وہ اپنے استاد کے خیالات کی تفسیر

محفوظ رکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔

افلاطون کے مکالمات میں "بیان صفائی"، "کراٹو" اور "فیدو"۔ سقراط کے بارے میں ہیں۔ جن میں سقراط کا بیان صفائی اور اس کی زندگی میں زندگی کے آخری ایام اور موت کو پیش کیا گیا ہے۔

افلاطون کے دیگر مکالمات میں "لائیس" اور "پروٹوگورس" سقراط کے مخصوص اندازِ جرح کے پیش نمونے ہیں۔ ان مکالمات میں سقراط کے ان فلسفیانہ افکار و خیالات کی ترجمانی کی گئی۔ جنہیں افلاطون نے براہِ راست سقراط سے اخذ کیا۔ لائیس کا موضوع راستی ہے۔ پوتھیٹیفرو کا "دینداری" اور "پروٹوگورس" سوفسطائیوں کے فلسفے کے بارے میں۔

"سمپوزیم" میں افلاطون آگے بڑھتا ہے۔ وہ کلیات جن پر علم کی بنیاد ہے۔ اب محض منطقی تصورات نہیں رہتے بلکہ اعیان یعنی اشیا کے کامل نمونے بن جاتے ہیں جو محض ہمارے ذہن میں داخلی وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ عالمِ مثال میں بھی خارجی وجود رکھتے ہیں۔

یہ نظریہ اعیان۔ افلاطون کا اپنا نظریہ اور اپنا فلسفہ ہے اس کا کوئی تعلق سقراط کے افکار سے نہیں ملتا۔ افلاطون کہتا ہے کہ دنیا کی اشیا بذاتِ خود محض ان اعیان کی پرچھائیاں ہیں اور اسی حد تک اصلیت رکھتی ہیں جس حد تک ان میں اعیان کی جھلک ملتی ہے۔

افلاطون کا مکالمہ "فدباس" حسن و عشق کے بارے میں ہے اور سمپوزیم کا موضوع

بھی یہی ہے۔

افلاطون کے مکالمات میں سے اہم ترین "LAW" اور "REPUBLIC" ہیں۔

ارسطو۔ افلاطون کا شاگرد تھا جو دنیا کے فلسفہ میں بعد میں اس کا سب سے بڑا حریف

بنتا ہے۔

افلاطون شاعر بھی تھا اور ایک عظیم صاحبِ طرز ادیب بھی۔ اس نے اپنے افکار اور فلسفے کو مکالمے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ بعض ناقدوں نے افلاطون کے مکالمات میں یونانی ڈرامے کے بھرپور عناصر کو بھی تلاش کر کے سراہا ہے۔ بہر حال مکالمات کا انداز ڈرامائی ہے فلسفیوں میں جیسا اسلوب افلاطون کا ہے ایسا اسلوب کسی کے ہاں نہیں۔ افلاطون سمجھتا تھا

کہ سقراط کی تعلیمات و فلسفہ کا انکار خطبات اور عام نثری اسلوب میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سقراط جس عملی طریقہ استدلال سے جرح کرتا ہے اس نئے لیے تو مکالمے کی صنف کو ہی اختیار کئے۔ سقراط کی سیرت اور انکار سے انصاف کیا جاسکتا تھا۔

یوں افلاطون نے اپنے فلسفے کو مکالمات کے انداز میں پیش کیا جو ایک منفرد اور مانی اور موثر اسلوب ہے۔

افلاطون اور رمی پبلک "ہر دور میں موضوع بحث رہے ہیں۔ اردو میں اغلباً اس کا پہلا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا جو بعد میں بھارت کے صدر بھی رہے۔ عام قارئین کے لیے اس کا ایک ترجمہ سارطارہ کر کیا ہوا ہے جس میں یہ التزام برتا گیا ہے کہ ہر ذہنی سطح کا قاری اس سے استفادہ کر سکے۔

"رمی پبلک" دس ابواب یا حصوں پر مشتمل ہے جن کو کتابوں (Books) کا نام دیا گیا ہے۔ پہلی کتاب میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ انصاف کیا ہے؟ سقراط اپنے علمی استدلال پر مبنی جرح کو جاری رکھتا ہے۔ راستی، روح، بڑھاپے اور ایسے دوسرے موضوعات پر بھی انکار خیال ہوتا ہے۔ ان دس کتابوں میں افلاطون اپنے تمام بنیادی افکار کا انکار کرتا ہے۔ علم، جہالت، نیکی، بدی، مثالی ریاست، مثالی حکمران جو اس کے نزدیک صرف فلسفی ہو سکتا ہے علم اور انصاف کو وہ سب سے برتر درجہ دیتا ہے۔ علم و فنون، شاعری اور دیگر موضوعات بھی زیر بحث آتے ہیں۔ اور یہ بھی فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ ایک مثالی ریاست میں شاعر کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ شاعر ہومر جیسا ہو۔ شجاعت اور دیوتاؤں کی بزرگی کو موضوع بنانا ہو تو پھر اس کا وجود ریاست کے لیے ضرر رساں نہیں۔ ایک مثالی ریاست میں سچوں اور شہریوں کو کیسی تعلیم ملنی چاہیے۔ اس کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

نار کی وہ مشہور تشکیل جس پر صدیوں سے لکھا گیا اور جس کی کتنی ہی تفسیریں کی گئی ہیں وہ بھی "رمی پبلک" میں موجود ہے۔

افلاطون کے پورے فلسفے اور بالخصوص "رمی پبلک" میں افلاطون ہر ایسے سوال کو اٹھاتا ہے جس کا کسی نہ کسی صورت میں انسان کو اپنی زندگی میں سامنا کرنا پڑتا ہے

وہ حیات بعد الممات کے مسئلے کو بھی اپنی آعزى کتاب میں پیش کرتا ہے۔ افلاطون کے ساتھ اختلاف ممکن ہے اور اختلاف کیا بھی گیا ہے مگر افلاطون کا کمال یہ ہے کہ وہ جو سوال اٹھاتا ہے اس کا واضح ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ افلاطون ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم کس طرح صحیح معنوں میں فکری انداز میں اپنے آپ کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ رومی پبلک کے حوالے سے وہ انصاف کی روح کو تمام انسانوں میں زندہ کرنا چاہتا ہے۔ علم اور نیکی کی تلقین دیتا ہے اور ایک ایسی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے جو عملی طور پر تو کبھی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن جس کے خصائص اور عناصر کو اگر انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنایا جائے تو انسانی زندگیوں میں ایک مثبت تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ افلاطون کے زمانے میں یونان میں طبقہ امانت کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی تھی عوامین عموماً ان پڑھ اور علم سے محروم ہوتی تھیں۔ عورتوں کو کتر سمجھا جاتا تھا۔ مگر افلاطون جب اپنی مثالی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے تو وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ فوجی قیادت کے شعبے کو چھوڑ کر زندگی کے دیگر تمام شعبوں کے دروازے عورتوں پر کھول دیئے جائیں۔ افلاطون مرد اور عورت کو مساوی تصور کرتا ہے۔ وہ انہیں ایک دوسرے سے کتر یا برتر نہیں سمجھتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا اپنا شاگرد ارسطو اس سلسلے میں اس سے شدید اختلاف رکھتا ہے اور عورت کو مرد سے کتر دجو دیتا ہے۔

رومی پبلک کا مطالعہ ایک بہت بڑے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس نے بنی نوع انسان کے افکار پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور یہ بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ رومی پبلک کو پیشہ پڑھا جاتا رہے گا۔ اور اس سے دنیا ہمیشہ فیض اٹھاتی رہے گی۔

سیاسیات

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہوں نے پوری انسانیت کے ذہن کو غور و فکر پر آمادہ اور متاثر کیا ہوتا ہے ایسی کتابوں پر دنیا کی مختلف زبانوں میں ہمیشہ کام ہوتا رہتا ہے اور ان کتابوں کے بارے میں بڑے دلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتابیں لافانی ہیں اور ان کتابوں پر ہمیشہ نقاد، محقق اور اہل الرائے اپنے اپنے زمانوں میں کام کرتے رہیں گے۔ ایسی کتابوں پر مضامین کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے چاہتا تھا کہ ایک علیحدہ ابتدائی اور قہیدی مضمون لکھوں جس میں اپنی معروضات پیش کروں۔ بہر حال اس مضمون کے بغیر ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا اب مضمون کی تو گنجائش نہیں رہی لیکن چند معروضات مختصراً پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جن سو بڑی کتابوں کا میں نے انتخاب اس سلسلہ مضامین کے لیے کیا ہے۔ بلاشبہ ان کا شمار دنیا کی سو بڑی اور عظیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ بڑی اور عظیم کتابوں کی فہرست ایک سو سے بھی بڑھ کر ہو سکتی ہے مگر جو انتخاب میں نے کیا ہے اس کے بارے میں خاصے دلق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کتابوں کی بڑائی ابدیت اور عظمت کے بارے میں دورائیں نہیں ہو سکتی ہیں ان سو بڑی کتابوں پر مضامین لکھتے ہوئے اور لکھنے سے پہلے بھی مجھے از خود بعض دشواریوں کا احساس ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ ان مضامین کی حیثیت تعارفی مضامین کی ہوگی۔ ان کتابوں پر دنیا بھر میں جو کام ہوا ہے اس کا پورا احاطہ کرنا میرے لیے کسی طور بھی ممکن لیکن ان کتابوں کے حوالے سے جو اہم کام میری نظر سے گذرا ہے اس کی طرف اشارہ کرنا میں نے ضروری سمجھا ہے۔

ان مضامین کے حوالے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کتابوں کے موضوعات، ان کی اہمیت

ان کے اثرات اور ان کے مصنفین اور خالقوں کے مختصر حالات زندگی ان مضامین میں بنیادی عناصر کی حیثیت رکھیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ کتاب کا بنیادی موضوع اور اس کی روح پڑھنے والوں تک منتقل کرنے کی سعی کی جائے۔

ان مضامین کو لکھتے ہوئے میں نے دو خاص باتوں کی طرف دھیان دیا ہے اور اس میں ان مضامین کو لکھنے کا مقصد بھی یہی دو خاص نکات ہیں۔

ایک تو یہ کہ اردو پڑھنے والا ہر سطح کا قاری ان لافانی کتابوں سے بھرپور انداز میں متعارف ہو سکے اور دوسرے یہ کہ

ان مضامین کے حوالے سے ان قارئین کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ خود ان کتابوں کا مطالعہ کریں۔

اسلوب نے ان کی فکر و فلسفہ پر جو گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جس طرح سے ان کا فلسفہ صدیوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے اور بنا رہے گا۔ اس کے حوالے سے اس کی کسی ایک کتاب کا انتخاب خاصا کڑا کام ہے۔

اسلوب کی ایک تصنیف POETICS (لوبیٹیکا) ہے جو فن شاعری اور المیہ ڈرامے پر دنیا کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کتاب کو اسلوب کی اہم ترین تصانیف میں سے ایک سمجھا جاتا ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ لوبیٹیکا کا شمار بھی دنیا کی سب سے بڑی کتابوں میں ہونا چاہیے اس کتاب نے شاعری، ڈرامہ کے بارے میں صدیوں سے انسانی نفسوں کو غور و فکر اور اظہار رائے پر آمادہ کیا ہے۔ شاعری۔ فن شاعری المیہ ڈرامہ نگاری اور ان کی تنقید پر یہ کتاب دنیا کی اہم ترین کتاب ہے۔ لوبیٹیکا کی اس اہمیت کے باوجود میں نے اس کی کتاب "پائیکس" کا انتخاب کیا ہے۔ صدیوں سے دنیا کے حکمران سیاست دان، فلسفی، سماجی علوم کے ماہرین اس کتاب سے فیض اٹھاتے رہتے ہیں۔ سیاست کا پانچواں حصہ یعنی پانچویں کتاب جو انقلابات کے بارے میں ہے۔ وہ آج بطور خاص ہماری توجہ کا مستحق ہے اس نے شہریت کا جو تصور پیش کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ آج بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کی اتھل پھل سیاسی دنیا کے لیے یہ کتاب ہر دور کی طرح بطور خاص مطالعہ کی مستحق ہے۔

ان گنت نوجوان طالب علموں نے افلاطون کی اکیڈمی میں افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ان میں ایک ارسطو بھی تھا جس نے افلاطون کی طرح دائمی اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔ فکر و فلسفہ میں دونوں سے کون بڑا ہے۔ اس پر صدیوں سے بحث ہوتی چلی آ رہی ہے۔ مگر ایک بات طے ہے کہ ارسطو کو وہ انداز سخن اور اسلوب کبھی حاصل نہ ہوا جو افلاطون کا خاص طرہ امتیاز ہے۔

ارسطو ایک لڑاچی قبیلے سٹاگیرا میں پیدا ہوا۔ اس کا سن پیدائش ۳۸۴ برس ق۔ م ہے۔ اس کا والد مقدونیہ کے دربار میں شاہی طبیب تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ارسطو کی کتابوں میں ہمیں طبی اصطلاحات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ارسطو کے بارے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر اپنی رائے دیتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اس نے اپنے استاد افلاطون کو اپنے سوالوں سے خاصا متاثر اور زچ کیا تھا۔

ارسطو کے والدین کی وفات کے بعد اس کی پرورش میٹاگراٹے ایک شہری پریوکیٹوس نے کی۔ جب ارسطو اٹھارہ برس کا ہوا تو وہ ایٹنز پہنچا جو اس وقت دنیا کا تہذیبی مرکز تھا۔ ان دنوں افلاطون وہاں موجود نہ تھا اس لیے کچھ عرصہ ارسطو نے اپنے دور کے دوسرے اہم استادوں اور مفکروں سے تعلیم حاصل کی۔ جب افلاطون واپس ایٹنز لوٹ آیا تو وہ اس کی رہنمائی میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ افلاطون بہت جلد ہی اس نوجوان کی ذہانت اور صلاحیتوں سے متاثر ہو گیا۔ ارسطو کا خاندان طبیبوں کا خاندان تھا۔ اس لیے علم طب سے اس کی دلچسپی میں کبھی کمی واقع نہ ہوئی۔ حیوانات اور فرس کے ساتھ اس کی گہری دلچسپی کے شواہد بھی ہمیں ملتے ہیں اس میں ارسطو ایک سچا متجسس تھا۔ ہر موضوع پر مسئلے کے بائے میں اسے جستجو رہتی تھی۔ اس نے فن خطابت پر بھی کام کیا۔ اپنے دور کے کسی بڑے خطیبوں اور مقررین پر اس نے شدید نکتہ چینی اور تنقید بھی کی۔ ارسطو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر کتب فکر اور کتب علمی کا نقاد ہے۔

یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جب ۳۴۷ ق م میں افلاطون کا انتقال ہوا تو نوجوان فلسفی ارسطو کو اس کی موت کا شدید صدمہ پہنچا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ افلاطون نے اپنی وصیت میں اپنی اکیڈمی کا سربراہ اپنے عزیز پنیپس (SPENSIPPUS) کو مقرر کیا تھا جبکہ ارسطو کا خیال تھا کہ اس کو چونکہ اسے سب سے ذہین اور جیتا سمجھا جاتا ہے اس لیے وہ اس مرتے

پرانے نائز کرے گا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ارسطو سے زیادہ اس منصب کا کوئی اہل نہ تھا۔ لیکن افلاطون نے اس کے خلافت فیصلہ کیوں دیا۔ اس کی کوئی وجہ نہ تو سامنے آسکی ہے نہ ہی قیاس سے کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ارسطو اس سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اکیڈمی سے رشتہ منقطع کیا۔ اور ایشیائے کوچک کے ایک قصبے اٹارنفس کا رخ کیا۔ یہاں وہ ہرمپاس کے ہاں ٹھہرا جو ارسطو کے بے حد معتمد تھا۔ یہ ہرمپاس اس وقت ایک اعلیٰ احمدیہ پر نائز تھا اور یہ عمدہ اسے ایرانیوں نے سونپا تھا۔ جو اس وقت سارے ایشیائے کوچک پر حکمرانی کر رہے تھے۔ تین برس تک ہرمپاس اور ارسطو نے بڑی پرسکون علمی زندگی بسر کی۔ مگر جب ایک ایرانی افسر نے کسی وجہ سے ہرمپاس کو قتل کر کے اس کی جائداد بھگ پر قبضہ کر لیا تو ارسطو کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اور اس نے یسوس کے ایک جزیرے میں پناہ لی۔ ارسطو شاہ عزم بھی تھا اور اس کی وہ نظم آج بھی موجود ہے جو اس نے اپنے دوست میزبان اور شاگرد ہرمپاس کی موت پر لکھی تھی۔

ارسطو کی ایک اولاد تو بیٹھی تھی جو اس کی بیوی سے پیدا ہوئی جو ہرمپاس کی بیٹی تھی۔ ایک اس کا بیٹا تھا جو ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ارسطو نے اپنی مشہور تصنیف اخلاقیات (ETHICS) کو اپنے اسی بیٹے کے نام معنون کیا ہے۔

۲۲۲ ق م میں ارسطو کو مقدونیہ آنے کی دعوت دی گئی۔ مقدونیہ کے شاہ فلپ نے اسے اپنے چہرہ پندہ برس کے بیٹے کے لیے لے آتا ہوا مقرر کر دیا۔ ارسطو کا یہ شاگرد تاریخ میں سکندر اعظم کے نام سے لاثانی شہرت رکھتا ہے۔ سکندر اپنے استاد ارسطو کا ایک فرماں بردار اور سچا شاگرد تھا۔ تین برس تک وہ ارسطو سے علم حاصل کرتا رہا اور پھر سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ تنہا راجتھاں کو دنیا فتح کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ سکندر اعظم زندہ واپس نہیں آیا مگر اس کا اپنے استاد ارسطو سے منسلک رابطہ قائم رہا۔ وہ اپنے استاد کے لیے دنیا کے مختلف خطوں سے نایاب پرندے اور جانور جمع کرا کر لایا تھا۔ ارسطو۔ ایقنز واپس آگیا۔ جہاں اس نے یسینم کے نام سے اپنا دارالعلوم قائم کیا۔ اب وہ پچاس برس کا ایک پختہ کار انسان تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں ریخ و آلام کا مزہ چکھا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم اور فلسفی تھا۔ وہ اپنے یسینم کے باغ میں گھوم پھر کر اپنے شاگردوں کو درس دینے کا عادی تھا۔ صبح کے وقت

وہ اپنے خاص شاگردوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ مشکل اور ادنیٰ موضوعات کا درس دیتا شام کے وقت وہ ہر طرح کے لوگوں کو درس دیتا تھا۔ یوں ارسطو بارہ برس تک ایٹھ تھری پڑھایا رہا۔ جو اس وقت دنیا میں علم و دانش کا سب سے بڑا امر کہتا تھا۔ ارسطو درس و تدریس میں مصروف اور اس کا شاگرد نمکنتوں اور ملکوں کو فتح کرنا رہا۔ جب سکندر عظیم کی موت واقع ہوئی تو حالات نے پلٹا دکھایا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ آیا جو سکندر عظیم اور اہل مقدونیہ کے مخالف تھے۔ صاحب اقتدار لوگوں نے ارسطو پر بھی سقراط کی طرح یہ الزام لگایا کہ وہ گمراہ کن نظریات و افکار کا پرچار کرتا ہے۔ سقراط کی مثال ارسطو کے سامنے تھی۔ مگر وہ ارسطو تھا سقراط نہیں۔ اس لیے وہ بھاگ نکلا۔ یوہین میں وہ ۳۲۲ ق م میں پہنچا۔ اور وہاں پناہ لی اور یہیں اسی برس میں اس کی موت واقع ہوئی۔

ارسطو کے بارے میں ذکر ہو چکا ہے کہ حیاتیات، طبیعیات، نفسیات، منطق، جمالیات جیسے موضوعات پر بھی اسے دسترس حاصل تھی۔ اور اس کے افکار میں ان سب کے عناصر ملتے ہیں اخلاقیات پر کتب اب کی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ فن شاعری پر ’بولطیکا‘ کا ذکر ہو چکا ہے۔ ارسطو کی تصنیف ’سیاسیات‘ (POLITICS) کا مزاج افلاطون کی ’ری پبلک‘ سے بے حد مختلف ہے۔ ارسطو غیر جذباتی، ٹھنڈے، متوازن نرم اور دلائل سے پڑبجے میں بات کرتا ہے۔ وہ پرجوش بھی نہیں دکھائی دیتا۔ کسی خاص مسئلے کی حمایت میں بھی وہ زیادہ دکالت کرتا ہوا نہیں ملتا۔ اس کے باوجود ’سیاسیات‘ کے دو پہلوؤں کی نشاندہی ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ افلاطون کی طرح صاحب طرز اور منصف و لکھنے والا نہ تھا اور دوسرے یہ کہ اس کتاب میں ایک منتشر سہی منطقی کیفیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ’سیاسیات‘ ارسطو کے بہت سے لیکچروں کے نوٹس کی ایک شکل ہے اور اس میں بعض مستقل اور علمیہ نوعیت کے موضوعات پر بھی مضامین شامل ہیں۔ یوں گمانا چاہیے کہ ارسطو نے اس کتاب کو ایک کتاب کی طرح لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ارسطو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا فلسفی اور مفکر تھا جس نے پولیٹیکل سائنس کی تدریس وضع کیں اور علم ’سیاسیات‘ کو ایک درجہ دیا۔

’سیاسیات‘ میں وہ مختلف قسم کی حکومتوں اور حکمران جماعتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور ان کے

خصوصاً نصاب پر بحث کرتا ہے یہ ایسا موضوع ہے کہ جس پر ارسطو اور ریاست و حیاتیات کے حوالے سے آج تک ایک بحث جاری ہے اور سیاسیات سے اس سلسلے میں کب فیض کیا جاتا ہے۔ وہ ہمیں سیاسیات میں بتاتا ہے کہ انقلاب کیوں اور کس طرح آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسیات میں ارسطو یہ بھی بتاتا ہے کہ سیاسی نظاموں کو کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ اس نے سیاسیات میں جو اصول وضع کیے اور جو افکار پیش کیے آج بھی ان سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے۔

افلاطون کی طرح ارسطو بھی غلامی کا طرفدار اور حمایتی تھا۔ اور غلامی کے ادارے کو ایک اہم ادارہ قرار دیتا تھا۔ اصل میں جس زمانے میں افلاطون اور ارسطو اور اس کے بعد صدیوں تک حتیٰ کہ اسلام کی آمد کے بعد تک اگر غلامی کے ادارے کی حمایت جاری رہی اور اسے ختم نہ کیا گیا۔ تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان مختلف اداروں میں ان ملکوں اور قوموں کی معیشت اور اقتصادیات کا انحصار ہی غلامی پر تھا۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ ارسطو غلامی کا حامی تھا۔ افلاطون کے عکس وہ عہدوں کو مردوں سے کمتر سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ جڑنائل پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی جگہ۔ اس دور کی بعض ضرورتوں اور سماجی حالات کے تابع دکھائی دیتے ہیں۔ مظاہر کی نیچر کیا ہے۔ ان میں کس طرح تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ سیاسیات میں اس پر خاص توجہ فرمائی گئی ہے۔ ارسطو ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی کا دشمن اور اعمال کا حاصل خدشگوار ہونا چاہیے اور یہی سب سے بڑی تبدیلی ہے۔ ارسطو کے خیال میں انسان اپنے خدشگوار انجام کو ایک صورت میں حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات پر عقل و دلیل سے قابو پائے۔ ارسطو کے نزدیک کسی ریاست کا مقنا یہ ہے کہ وہ خود کفیل بن جائے جو صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ کوئی ریاست اپنے سرمائے، وسائل اپنے دستور اور حکموں طبقے میں توازن اور اعتدال اختیار کرے۔

ارسطو انسان اور ریاست کو ایک رشتے میں بندھا ہوا پاتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک سیاسی جانور ہوتا ہے جو اپنی تکمیل کر کے منصف بن کر ایک مکمل شہری کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ریاست ایک قدرتی مظہر ہے اور وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ ریاست اس لیے فطری ادارہ ہے کہ یہ

مختلف تنظیموں، قبائل، خاندانوں کی تبدیلی کے ادوار سے گزر کر تشکیل پاتی ہے اور انسان کے لیے ایک بہتر زندگی پیش کرتی ہے۔

ارسطو نے جمہوریت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی قابل توجہ ہیں۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اجتماعی فیصلے، انفرادی فیصلے کے مقابلے میں ہر حال میں زیادہ اطمینان بخش اور سود مند ہوتے ہیں۔

ارسطو سیاسیات میں قانون کی حکمرانی پر خاص زور دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ قانون کی برتری سے ریاست میں انصاف کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔ سیاسیات میں ارسطو نے انصاف کے حصول اور منصب، حکومت کے فرائض، ریاست کی مادی دولت کی اہمیت، آزادانہ تعلیم، تفریح کی اہمیت و مقصد شہریت کا صحیح مقصد اور تعریف، اور ایک پُرمرست زندگی کے بلے میں جو نظریات و افکار پیش کیے ہیں۔ وہ آج بھی متاثر کرتے ہیں۔

سیاسی افکار و نظریات جو ارسطو نے سیاسیات میں پیش کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو اپنے عہد کے کسی مکتب فکر سے متاثر نہ تھا۔ اور نہ ہی اس کے خیالات نظریات پر کسی کے اثرات ہی ملتے ہیں۔ آج بھی جب کہ سیاسیات کا علم انا پھیل گیا ہے ہے اور ارسطو کے بعد کتنے ہی بڑے بڑے فلسفیوں اور مفکروں نے اس موضوع پر اپنے پیش قیمت نظریات و افکار کو پیش کیا ہے۔ ارسطو ہمیں ان سے الگ تھلک کھرا نظر آتا ہے۔ اگر وہ قانون کی بالادستی اور اعتدال پر زور دیتا ہے تو بھی وہ نئے آئین سازوں کے لیے کوئی نہ رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ وہ دولت کی حدود کا تعین کرنے کے باوجود سوشلسٹ دکھائی نہیں دیتا۔ سیاسیات میں وہ بعض جگہ ہمیں بتاتا ہے مختلف ادوار میں بادشاہی بہترین طرز حکومت رہی ہے تو وہ بادشاہی کے ذریعے حکمرانی کی حمایت بھی نہیں کرتا۔

سیاسیات میں ارسطو جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیتا ہوا ملتا ہے وہ ہے دستور کا استحکام اور دستور کی پائیداری۔ وہ کسی بھی ریاست کے لیے دستوری استحکام اور پائیداری کو بنیادی شرط قرار دیتا ہوا ملتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر دستور کو استحکام اور پائیداری حاصل ہو تو ریاست کی اقتصادی قوت اور معاشی بنیادوں کو استحکام حاصل

ہوتا ہے۔

’سیاسیات‘ ایک ایسی تصنیف ہے جس کے حوالے سے ارسطو ہمیں سیاسیات کے سائنس بننے کے امکانات کا یقین دلاتا ہے اور آج علم سیاسیات باقاعدہ ایک سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ انسان کس طرح اور کس لیے ریاست کو تخلیق کرتے اور تشکیل دیتے ہیں اور ریاست کس طرح انسانوں کو خوشگوار زندگی بخش سکتی ہے یہ ایسا موضوع ہے جو ہر دور کا موضوع ہے اور ارسطو نے اسی موضوع پر ان انکار و نظریات کا اظہار کیا ہے جو آج بھی زندہ، قابلِ قدر اور موثر ہیں۔ !!

میڈیٹیشن

کوپرنیکس اور گلیلیو کی دریافت حرکت ارضی اور اکتشافات عالم نے جہاں سائنس کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا وہاں عیسائی کلیسیا کی بنیادیں بھی ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ارسطو کا وہ جادو جو صدیوں سے یورپ کے سرچرچہ کر بول رہا تھا۔ اس کی طاقت اور اثر میں کمزوری پیدا ہونے لگی تھی۔ یہ وہی دور ہے جب ڈیسی ڈیکارت کے فلسفے کا افق پر ظہور ہوا۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ ڈیکارت جدید فلسفے کا بانی ہے۔

فرانس نے اور دنیا نے آنا بڑا فلسفی پھر پیدا نہیں کیا۔ ڈیکارت ۱۵۹۶ء میں برٹینی (فرانس) میں پیدا ہوا۔ اس کا والد قانون دان اور خاندان بہت معزز تھا۔ اس کی پرورش طبقہ امرا کے بچوں کی طرح ہوئی اور تعلیم بھی امرا کے معیار کے مطابق دلوئی گئی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں وہ سبز محل کا لباس پہنتا اور نوابوں کی طرح تلوار کمر پر باندھتا رہا۔ دس سے اٹھارہ برس کی عمر تک اس نے ایک مشہور جیسویٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے زمانے میں وہ نصابی کتابوں کی سطحیت سے بیزار ہو گیا۔ نام نہاد سائنس، مذہبی نظریات نے اس کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا۔ اس نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ پڑھنا لکھنا کیسے ترک کر کے وہ سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ یقینی اور حتمی صداقت اور علم کی تلاش میں وہ ساری عمر مصروف رہا۔ صرف ایک علم تھا جسے وہ حتمی اور یقینی سمجھتا تھا۔ علم ریاضی۔

۱۶۱۸ء میں وہ فوج میں بطور رضا کار بھرتی ہوا۔ یہ اس کی اپنی مرضی اور خوشی تھی۔ ۱۶۱۹ء میں جب وہ لوبیریا کے ڈیوک کی کمان میں تھا تو نومبر ۱۶۱۹ء میں اسے جرمنی کے چھوٹے سے قصبے

اُم (Umm) میں محکم کی عزالی کی وجہ سے پورا ایک دن رُکنا پڑا۔ ایک پورا دن اس نے اپنے کمرے میں آتس دان کے سامنے گزار دیا۔ اس نے اس دن تنہائی میں اپنی شخصی اور فلسفیانہ حیثیت پر حزب غم کر لیا۔ اس رات خواب میں اُسے ایک خاص منظر دکھائی دیا۔ اس کی ڈائری میں یہ تاریخ کی تاریخ میں یہ اندراج ملتا ہے۔

میں جذبے اور اشتیاق سے شراہور ہو گیا۔ میں نے شاندار سائنس کی بنیادیں دریافت کر لیں اور مجھ پر میری زندگی کا مقصد منکشف ہوا۔ اس نے اپنی ڈائری کے اس اندراج میں لکھا کہ اب وہ اپنی رسمی عمر اسی مقصد کے لیے صرف کر دے گا۔ اور شکرانے کے لیے مقصد لورٹو کے مزار پر حاضر ہونے کا۔ اس نے اس خواب میں جو بصیرت پائی۔ وہ ایک متحد سائنس کا منصب اور نظریہ تھا۔ جس میں سارے تضادات اقداری مقصداری طور پر یکساں برتنے کا عمل شامل تھا۔ اور ریاضی کے ذریعے دنیا کے تمام مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا۔

افلاطون کا نظریہ تھا کہ تمام سائنسز متصوفانہ نظریہ خیر کے ذریعے وحدت بنتی ہیں۔ جس کے برعکس دیکھتے ہیں عقلیت اور ریاضی کو ان کی وحدت کا سبب قرار دیا۔ دیکھتے ہیں نظریہ نے بلاشبہ اسطو کے نظریات کو بکھیر کر رکھ دیا۔

اس کے بعد کے نو برس دیکھتے ہیں مختلف سائنسز کو وحدت بخشنے کا میتھ تلاش کرنے میں صرف کر دیے۔ اس دوران میں اس نے تر کے میں ملنے والی جامدات کو فروخت کر دیا۔ وہ کسی پریشانی اور کسی کمر سون منت ہوئے بغیر اپنی زندگی کا منصب پورا کرنا چاہتا تھا۔ بے فکری کی وجہ سے وہ دیر تک سویا رہتا۔ عموماً وہ دوپہر تک بستر میں ہی لیٹا آرام کرتا۔ یوں اسے ایک ایسے فلسفی کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہوئی جس نے اپنا بیشتر کام بستر پر ہی انجام دیا وہ اس بے فکری کو ذہنی اور علمی کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر قرار دیتا ہے۔ دیکھتے ہیں زندگی کا یہ شخصی پہلو بھی بہت اہم ہے کہ وہ اپنے عہد کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات سے بالکل بے نیاز رہا۔ اس نے تنہا زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس لیے اس نے شادی بھی نہ کی۔ وہ کہا کرتا تھا "دنیا کا کوئی حسن صداقت کے حسن سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ شادی کے بارے میں وہ دلچسپ خیالات کا مالک تھا۔ یہ دیکھتے ہیں

ہی تھا جس نے کہا تھا جب کوئی خاندان اپنی بری کی موت پر افسوس بہا رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی زوج کی گہرائی میں خفگیہ لذت اور مسرت بھی محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ تاہم دیکارت ایک ناجائز بچہ کا باپ بھی بنا جو اہل عمر میں مرگئی اور اس کا دیکارت کو بہت صدمہ ہوا۔ بہر حال تیس برس کی عمر میں دیکارت نے ہالینڈ میں رہائش اختیار کر لی اور بیس برس وہیں رہا۔

۱۶۲۲ء میں اس نے اسٹراٹزمی پر اپنا رسالہ مکمل کیا جس میں اس نے اپنے ریاضیاتی میٹھڈ سے کوپرنیکس کے نظریات کی تائید کی۔ جب وہ اپنے اس رسالے کو اشاعت کے لیے بھجوانے والا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ گلیلیو کو سزا سنادی گئی ہے اور اس کی کتاب جلالی بجا رہی ہے تو دیکارت نے اپنے رسالے کی اشاعت رکوا دی۔ اس سلسلے میں اس کا موقف یہ تھا۔ ”یہ اپنے ساتھ زیادتی ہے کہ انسان اپنی جان گنوا دے۔ جبکہ وہ اپنی زندگی کو بے وقار ہونے بجایا نڈاری سے بچا سکتا ہو۔“

اس زمانے میں دیکارت نے اپنے بارے میں یہ بات بھی پھیلادی کہ وہ مذہب کا احترام کرتا ہے۔ دیکارت کے شارمین اور ناقد اس بحث میں بہت الجھے ہیں کہ چرچ کے بارے میں اس کے انکار واقعی حقیقی تھے یا محض دکھاوا۔ اس ضمن میں خود اس کے اپنے ایک جملے کی بہت تعبیریں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔ دیکارت نے کہا تھا۔

”اب جبکہ میں اس دنیا میں محض ایک تماشائی نہیں رہوں گا۔ بلکہ اداکار کی طرح مجھے سٹیج پر ظاہر ہونا ہے اس لیے میں نے نقاب (ماسک) پہن لیا ہے۔“

ایک بات ضامن عیاں ہے کہ اس نقاب کی وجہ سے دیکارت نے اس زمانے کے

مذہبی احتساب کرنے والوں سے اپنی جان ضرور بچالی۔ گلیلیو کی تعزیر کے تین برس بعد دیکارت نے اپنے فلسفیانہ میٹھڈ کے بارے میں اپنی کتاب شائع کی جس کا نام DISCOURSE ON METHOD ہے۔ جسے فلسفہ کی دنیا میں آج بھی کلاسیک کام قرار دیا جاتا ہے۔ ۱۶۴۶ء میں اس نے اپنی شہرہ آفاق اور لازوال تصنیف شائع کی۔ MEDITATIONS ON

FIRST PHILOSOPHY اس کا نام ہے۔ اس کی اشاعت کے بیس برس بعد چرچ نے اسے ان کتابوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ جن کا پڑھنا عیسائیوں کے لیے مذہباً ممنوع قرار دیا

کیا ہے۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ زندگی کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ سویڈن کی ملکہ کرسٹینا نے اسے دعوت دی کہ وہ اسے اپنے فلسفے کی تعلیم دے۔ ڈیکارت سویڈن جانے سے ہچکچاتا تھا۔ وہ سویڈن کو برف اور رکھپوں کی سرزمین کا نام دیتا تھا۔ لیکن ملکہ کے اصرار پر اسے سویڈن جانا پڑا۔ ملکہ کرسٹینا کا خیال تھا کہ صبح پانچ بجے اس کا ذہن بہت تر و تازہ اور شاداب ہوتا ہے اس لیے دیکارت صبح پانچ بجے اسے اپنے فلسفے کی تعلیم دیا کرے۔ نومبر کے ایک سچ بستے دن جب دیکارت ملکہ کے دربار سے واپس آ رہا تھا تو اسے شدید سردی سے نمونہ ہو گیا اور اس کے ایک ہفتے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بیسویں صدی کے ایک فرانسیسی فلسفی ایٹینی لگیسوں نے دیکارت کی زندگی کو ایک جملے میں بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

”وہ ایسا فکر کے زیر اثر ایسا فکر کے لیے زندہ رہا۔ اس سے پہلے کبھی اتنا عظیم اور

شریف انسان پیدا نہیں ہوا۔“

دیکارت جدید فلسفے کا بانی ہے۔ اس نے فلسفے کی پرانی دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کے دل میں نام نہاد مذہبی اعتقادات اور معاشرے کے لیے شدید اہانت کے گہرے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ وہ تعلیمی درس گاہوں میں دی جانے والی تعلیم کو حقیر سمجھتا تھا۔ چرچ کے اقتدار اور بالا دستی کے خلاف اس کے دل میں نفرت تھی۔ وہ کہتا ہے کہ نصابی، تعلیمی اور ایسی کتابوں نے اس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا کیے۔ اس نے یونانی، تاریخ، ادب سائنس، ریاضی اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں سے صرف ریاضی نے اسے مطمئن کیا فلسفے کے لیے اس کے دل میں حقارت تھی۔ کیونکہ حریف فلسفی جس طرح ایک دوسرے کے افکار کی تکذیب کرتے وہ طرز فکر عمل دیکارت کے لیے اتنا ہی ناپسندیدہ تھا۔ وہ بڑے یقینی انداز سے کہتا ہے کہ صدیوں سے فلسفے کی تعلیم دی جا رہی ہے لیکن آج تک فلسفہ کوئی ایسی چیز پیدا نہ کر سکا۔ جو زامی نہ ہو۔ وہ سب پر شک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ سب کو پہلے رو کر تا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اسی طرح صداقت کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ صداقت کا حصول اور دریافت دیکارت کی زندگی کا مشن رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

”میرے دل میں ہمیشہ یہ آرزو اپنی انتہا پر رہی ہے کہ میں سیکھ سکوں کہ کس طرح جھوٹ کو سچ سے تمیز کیا جاسکتا ہے۔“

دیکارت یہ تعلیم دیتا ہے کہ خواہ نظریات و انکار کتنی ہی صدیوں سے چلے کیوں نہ آئے ہوں ان کو یکسر نظر انداز اور رد کرنا ضروری ہے۔ بعد میں یہ سٹلے کرنا ہوگا کہ کون سا نظریہ صحیح ہے کون سا غلط۔!

دیکارت جدید فلسفے کا بانی ہے اور میڈی ٹیشنرز اس کی بنیادی کتاب۔ اپنی اس کتاب میں وہ جو پہلا جملہ لکھتا ہے وہ اس طرح ہے۔

”اپنی زندگی میں مجھے ایک بار ہر چیز کو اٹھا کر پھینکنا ہوگا.... آج میرا ذہن

ہر طرح سے آزاد ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔“

آخر کار مجھے وقت مل گیا ہے کہ میں سمجھ سکوں اور آزادی سے اپنے تمام پرانے

نظریات کو طیامیٹ کر سکوں۔“

دیکارت ریاضی کو وسیلہ بناتا ہے۔ ریاضیاتی نظام کے تحت یقین کی منزل تک سالی ہو سکتی ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ ریاضی کے وسیلے سے فلسفے کے انتشار اور بے یقینی کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریاضیاتی میٹھڈ کو بروئے کار لا کر فلسفہ مطلق۔ تیقن حاصل کر سکتا ہے اس ریاضیاتی میٹھڈ میں وہ وجدان اور استخراجی عمل کو بنیادی قرار دیتا ہے شک و شبہ حقیقت کی طرف لے جاتا ہے۔ ”میڈی ٹیشنرز“ میں اس نے ان اشیاء کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے جن پر شک اور شبہ کیا جانا ضروری ہے پہلے وہ ان تصورات کا ذکر کرتا ہے جو حیاتی ہیں۔ ان کا محاکمہ ناگزیر ہے۔ یہ وہ تصورات ہیں جن پر عمومی طور پر اعتقاد رکھا جاتا ہے لیکن یہ دھوکا دیتے ہیں۔

دیکارت اس میٹھڈ۔ شک و شبہ کو انتہا تک لے جاتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی فکر کے حوالے سے اس مرحلے میں داخل ہوتا ہے جو فائنڈ ہے وہ کہتا ہے اگر میرے تمام نظریات مجھے فریب دیتے ہیں۔ اگر میں تمام نظریات و اعتقادات پر شبہ کرتا ہوں تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میرا وجود دھوکا کھا رہا ہے۔ میرا وجود و اعتقادات کو رد کر رہا ہے ایک نظریہ

اور عقیدہ ایسا ہے جس پر شک کیا جاسکتا ہے۔ نہ شہمہ۔ کہ چونکہ میں شک کر رہا ہوں۔ اس لیے میرا وجود ہے۔ اس لمحے جب میں سوچ رہا ہوں جب میں کسی پر شک کر رہا ہوں۔ تو میں ایک سوچنے والی چیز کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتا ہوں۔

یوں وہ اپنے فلسفے اپنے انکار کی بنیاد ایک جملے میں رکھتا ہے جو فلسفے کی دنیا کا مشہور ترین جملہ ہے۔ اس جملے کو اس نے لاطینی میں لکھا تھا۔

"COGITO, ERGO SUM"

انگریزی میں اس کا ترجمہ یوں بنتا ہے

THINK THERE FORE I AM

اُردو میں یوں چونکہ میں سوچتا ہوں۔ اس لیے میں ہوں !
دیکارت۔ اس حلقہٴ دام خیال کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس سوچ میں شک کرنا، سمجھنا تصدیق کرنا، انکار کرنا، ارادہ کرنا، انحراف کرنا، محسوس کرنا سب شامل ہیں۔ یہ انسانی وجود کی ضروریات ہیں۔

اپنے وجود کی تصدیق اور حقیقت کی بنیادیں رکھنے کے بعد دیکارت اس میٹھڈ کو اپنے پورے نظام فلسفہ پر پھیلاتا جاتا ہے اور اس سے وہ موضوعیت، یادداشت SHBUJECT- SM ۱۷۱۔ پر بات کو پہنچاتا ہے۔

علم و خبر کا جو نظریہ دیکارت نے اپنے نظام فکر میں پیش کیا ہے اس نے جدید فلسفے کی بنیادیں رکھی ہیں۔ وہ اس حوالے سے سوال پر سوال پوچھتا چلا جاتا ہے کہ کیا اس کے وجود کے باہر، خارج میں بھی کچھ وجود رکھتا ہے۔ یہ کس طرح سے جانا جاسکتا ہے کہ اس کے ذہن سے باہر بھی کوئی صداقت موجود ہے؟ اس کے بعد وہ لکھتا ہے
"اب مجھے موقع ملے ہی یہ جاننا ہے کہ کیا خدا کا وجود ہے۔"

اس کے بعد اپنے خاص ریاضیاتی میٹھڈ سے دیکارت خدا کے وجود کی تصدیق کرتا ہے اور یہاں سے وہ DEATH کی طرف پہنچتا ہے۔ دیکارت کے فلسفے میں آئیڈیالزم کا مقصد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو شعور سے تعلق رکھتی ہے محسوسات (غوشی، درد وغیرہ) حسیاتی تصورات

(جن کا تعلق بصیرت سے ہے) سورج، درخت، لوگوں کا ہجوم، اس کے بعد یادیں (دیکھنے کی جگہ کی، کسی عالیہ واقعہ کی، دانش مندانہ خیالات) سائنسی یا ریاضیاتی اور فلسفیانہ) اس طرح اس نے "آئیڈیاز" کی تقسیم کی ہے۔ ان پر تفصیل سے تحقیق کی ہے۔ ان کے حوالے سے وہ حقائق ہمک پہنچتا ہے۔

وجود باری کے بارے میں دیکارت کے افکار کا مطالعہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس کا پورا مفہوم تو "میڈی ٹیشنز" کے مطالعے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے تاہم چند نکات کا ذکر کرنا ہوں۔ دیکارت، تمام آئیڈیاز کو اسباب وعلل کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور پھر وہ ہمیں بتاتا ہے کوئی شے ... نیستی سے پیدا نہیں ہو سکتی وہ خدا کو مکمل قرار دیتا ہے۔ وجود باری کے بارے میں دیکارت نے جو شواہد اور ثبوت اپنے مخصوص نظام فکر کے تحت پیش کیے ان کے حوالے سے عیسائی مذہبی اجارہ دار البقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اس کتاب کا مطالعہ کیتھولک عیسائیوں میں مذہباً گناہ اور ممنوع قرار دیا گیا۔

اپنے وجود کو ثابت کرنے کے بعد دیکارت خدا کے وجود کا ثبوت فراہم کرتا ہے اس کے بعد اس کائنات کے نظام کا کھوج لگاتا ہے۔ روح اور جسم کو بھی اپنا موضوع بناتے ہوئے وہ بالحد الطبیعیاتی ثنویت پر اظہار خیال کرتا ہے۔ یوں وہ اپنے نظام فکر کے حوالے سے پوری کائنات اور اس کے مسائل پر غور کرتا ہوا ملتا ہے۔

دیکارت کا فکری نظام ریاضیاتی ہے۔ اس میں جذباتیت کا کوئی دخل نہیں۔ وہ اپنے نظام فکر کے ساتھ سچائی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ اس نے اپنے فلسفے کے حوالے سے پوری دنیا کی فکر کو متاثر کیا۔ دیکارت نے جدید فلسفے کی بنیاد رکھی اور اس جیسا فلسفی پھر دنیا پیدا نہ کر سکی۔ اور اس کی کتاب "میڈی ٹیشنز" نے انسانی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔

تقید بر عقل محض

شونپٹا نے کانٹ کے حوالے سے ہیگل کے فلسفے پر جو رائے دی ہے اسے پڑھ کر خاصا تعجب ہوتا ہے کہ شونپٹا نے ہیگل کے لیے خاصی توہین آمیز اور عامیانا زبان استعمال کی ہے اس نے ایک طرح سے ہیگل کو مجمع باز اور چھچھورا قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اصل فلسفی تو کانٹ تھا۔ جس نے نہ صرف ایک پورے دور کو بلکہ آنے والی نسلیں کو متاثر کیا ہے لیکن مجمع باز ہیگل نے بڑی شہرت حاصل کر لی جس کا وہ قطعی حقدار نہ تھا۔

۱۷۶۴ء میں پرورشیا کے شہر کوننگسبرگ میں پیدا ہونے والا عمانوئیل کانٹ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ خاموش طبع، پست قامت شخص تھا۔ جس نے اپنی ساری عمر اسی شہر میں گزار دی۔ اگرچہ وہ جبرانیہ کے موضوع پر لیکچر دینے کا عادی تھا۔ لیکن خود کبھی اپنے شہر سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکا۔ کانٹ کے آباء اجداد صدیوں پہلے سکاٹ لینڈ سے نقل وطن کر کے پرورشیا آئے تھے۔ اس کی والدہ کٹر مذہبی خیالات رکھنے والی خاتون تھی۔ بچپن میں کانٹ پر اپنی ماں کا اتنا شدید اثر تھا کہ وہ سختی سے مذہبی امور اور عقائد پر عمل کرتا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنی زندگی میں مذہب سے اتنا دور ہو گیا کہ کبھی گرجے کا رخ نہ کیا۔

کانٹ کا دور فریڈرک اعظم جیسے شہنشاہ اور ولتیر جیسے فلسفی کا دور ہے۔ اس دور میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ نوجوانی کے دنوں میں کانٹ کے دل میں بعض مسائل اور نظریات کے بارے میں شکوک پیدا نہ ہوتے۔ کانٹ کے سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ابتدائی عمر میں جن لوگوں کا اثر اس پر بہت گہرا رہا۔ بعد میں انہی لوگوں سے اسے شدید اختلاف پیدا ہوا اور کانٹ نے ان کی نئی کی ان میں برطانوی فلسفی ہیوم خاص طور

قابل ذکر ہے۔ یہی وہ ایک طرح سے اس کا محبوب دشمن بن گیا تھا۔

کانٹ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ لیکن جب ہم اس کے فلسفیانہ نظریات کے مختلف مدارج کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ روایت پرست اور کسی حد تک رجعت پسندانہ خیالات کا مالک کس طرح عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ آزاد خیال اور بے باک فلسفی کا روپ دھار گیا۔ اگر وہ اپنی آخری تصنیف کی اشاعت کے وقت ستر برس سے زائد عمر کا نہ ہو چکا ہوتا تو یقیناً اسے زمانہ میں ڈال دیا جاتا اور فلسفے کی دنیا کو ایک اور شہید مل جاتا لیکن عمر کی بزرگی کی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

کانٹ کا عظیم ترین کارنامہ اس کی کتاب Critique of pure reason

ہے یعنی تنقید بر عقل محض یہ سیدھا سادہ فلسفی اندر سے بہت جری تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ کوئی سرکاری تنخواہ دار ملازم ایسی کتاب شائع کر کے حکومت کے عتاب کا نشانہ بن سکتا تھا کانٹ نے اپنی کتاب تنقید بر عقل محض شائع کر دی۔

اس کتاب کی اشاعت فلسفے کی دنیا میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنقید بر عقل محض وہ تصنیف ہے جو اپنی اشاعت سے لے کر اب تک بحث اور غور و فکر کا موضوع بنا رہی ہے۔ کانٹ نے اس کتاب میں جو فلسفہ پیش کیا اس نے دنیا کے فکری اور فلسفیانہ نظام کو بڑی ہی شدت سے متاثر کیا۔ فلسفے کا ایک نیا مکتب اس کتاب کے حوالے سے معرض وجود میں آتا ہے ایسی عظیم لانانی کتاب کہنے والے کی زندگی کا ایک لمحہ تو یہ جھلک بھی اس کے فلسفے کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتی ہے۔

۱۷۵۵ء میں کانٹ نے پرائیویٹ لیکچرار کی حیثیت سے کوئنگسبرگ کی یونیورسٹی میں درس دینا شروع کر دیا۔ پندرہ برس تک وہ اسی حیثیت سے اس یونیورسٹی کے ساتھ منسلک رہا۔ وہ پروفیسر کے عہدے کا حقدار بھی تھا اور طلبہ گار بھی۔ اس سلسلے میں اس کی درسگاہوں کو مسلسل نام منظور کیا جاتا رہا۔ بالآخر ۱۷۷۴ء میں اسے مابعد الطبیعیات اور منطق کے مضامین کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس کی خاموش طبعی کی وجہ سے اس کے بارے میں کوئی یہ توقع نہ کر سکتا تھا کہ وہ فلسفے کی دنیا میں ہیجان پیدا کر دے گا۔ ایسا سیدھا آدمی انسانوں کی زندگیوں کو چرچا کرنے کی صلاحیت سے بظاہر محروم دکھائی دیتا تھا۔ وہ شرمیلا آدمی اندر سے بڑا شجاع تھا۔ خود کانٹ نے ایک بار لکھا تھا:

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں مابعد الطبیعیات کا عاشق ہوں لیکن میری

اس مجبور بنے میرے ساتھ بہت کم التفات کیا ہے۔"

وہ بالبعد الطبیعیات میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا جس کے بارے میں وہ خود کہتا ہے۔ میں بعد الطبیعیات کے تاریک پاتال میں پھنسا رہا۔ پھر وہ بالبعد الطبیعیات کے بارے میں کہتا ہے "یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا نہ کوئی کنارہ ہے نہ روشنی دکھانے والا مینار" لیکن اس کانٹ نے بالبعد الطبیعیات میں تھلکہ خیز انقلاب پیدا کر کے ساری دنیا کو چونکا دیا۔

اپنی زندگی کے خاموش زلزلے میں کانٹ، کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بالبعد الطبیعیات میں گہری دلچسپی لے رہا ہے۔ تب وہ بیاردوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں، ہواؤں کے بارے میں لکھا کرتا تھا۔

۱۷۵۵ء میں شائع ہونے والی اس کتاب "فیوری آف ہیروز کو ایک خاصی اچھی کتاب سمجھا گیا لیکن اس پر کوئی لمبی چوڑی بحث نہ ہوئی۔ ۱۷۹۸ء میں اس نے اپنے نظریات کو وسعت دی اور اس کی کتاب "ایٹھنر و لپو جی" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے لکھا کہ انسان کی زندگی سحر جٹکوں اور جانوروں کی معیت ہوئی۔ اس لیے ابتدائی دور کا انسان، آج کے انسان سے بے حد مختلف تھا۔ آج انسان کو تہذیب و ثقافت نے جو کچھ بنا دیا ہے ابتدائی انسان اس سے بے حد مختلف تھا کانٹ نے اس کتاب میں اعتراف کیا،

"قدرت نے پھر کسی طرح انسان کی ارتقائی نشوونما میں حصہ لیا اور کن اسباب

حوائل کی وجہ سے انسان موجودہ مقام تک پہنچا۔ اس کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں۔ ٹوارڈن نے انسانی انواع پر اپنا عظیم اور چوکا دینے والا کام کیا جس سے کانٹ کے ان خیالات و نتائج کی تائید ملتی ہے۔

کانٹ کے انکار و نظریات کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس معمولی اور سادہ انسان کے عظیم دماغ میں خیالات آہستہ آہستہ جمع ہونے اور پھر منظم صورت اختیار کرتے تھے۔ وہ بمشکل پانچ نطے کا شخص ہو گا۔ شرمیلا، سنا سنا یا لیکن اس چھوٹے قد کے فلسفی کا دماغ بڑا تھا۔ ایسے خیالات اور افکار کی اما بلاکہ جنہوں نے پوری فکر انسانی کو تبدیل کر دیا۔ اس کے ایک سوانح نگار نے اس کی زندگی کو چند افعال میں پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے،

کانٹ کی زندگی چند اعمال پر مشتمل تھی۔ بندھے لٹکے ادوات پر اس کے روزمرہ کے ان اعمال میں کبھی فرق نہ آیا۔ صبح بیدار ہونا، کافی پینا، کھانا، بیچر دینا، کھانا اور سیر کرنا اس کا ہر کام عین دقت پر ہونا تھا نہ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔

اور پھر جب عموذیل کانٹ اپنے بھورے رنگ کے کوٹ میں ملبوس، چھڑی ہاتھ میں لیے اپنے گھر کے دروازے میں نمودار ہوتا تو اس کے ہمسائے گھریاں ملاتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت ٹھیک ساڑھے تین بجے ہیں۔ ہر طرح کے موسموں میں وہ ٹھیک وقت پر اپنے گھر سے نکلتا پیدل چلتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ دبلا پتلا اور کمزور انسان تھا۔ لیکن اس کا ذہن اور دماغ بہت قوی تھا وہ اگر کبھی بیمار بھی ہوتا تو ڈاکٹروں کا احسان نہ اٹھاتا وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹروں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ اپنے انداز میں وہ اپنا علاج کر لیا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے اسی برس کی طویل عمر پائی اس نے ستر برس کی عمر میں ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ جس کا موضوع دماغی قوت اور بیماری کے احسان پر تاجر پانا تھا۔ اس کی پسندیدہ حرکات میں ایک حرکت یہ تھی کہ وہ طویل عرصے تک صرف ناک سے سانس لیتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ گھر سے باہر ہوتا تو کبھی منہ کھلا نہ رکھتا اور چلتے ہوئے ناک سے سانس لیتا۔

وہ ہر کام بڑی احتیاط سے کرنے کا عادی تھا۔ ہر بات کو پہلے سوچتا۔ اچھی طرح غور کرتا اور پھر کہیں اس پر عمل کرتا۔ زندگی میں دو بار اس نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پہلی بار یوں ہوا کہ جس خاتون سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا اس سے عرض مدعا نہ کر سکا اور اس خاتون نے ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ دوسری بار جس خاتون سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا وہ خاتون اس شہر سے ہی تھی۔ اور کانٹ کو اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ کانٹ ساری عمر کنوارا رہا غالباً وہ بھی نطشے کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ شادی شدہ آدمی کام کمانیں رہتا۔ ٹالیہ انڈے تو صحت کما تھا کہ شادی شدہ آدمی کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ وہ روپے کے لیے سب کچھ گر گزارتا ہے اور یقینی بات ہے کہ کانٹ ایسا آدمی تھا کہ جو اپنی زندگی کے اصولوں کو محض شادی کی مسرت پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنی عظیم تصنیف "تنقید بر عقل محض" پر کام کرتا رہا خاموشی سے... کسی کو علم نہ تھا کہ

وہ کیا لکھ رہا ہے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ ایک بڑے طوفان کی تخلیق کر رہا ہے وہ بار بار لکھتا اور نظر ثانی کرتا
 بالآخر اس کی یہ کتاب ۱۷۷۱ء میں مکمل ہو گئی۔ اس وقت کانٹ کی عمر ستاون برس ہو چکی تھی۔ دنیا کا کوئی
 فلسفی اس عمر میں جا کر ایسی کتاب کا خالق بنتا ہوا دکھائی نہیں دیتا جس نے سارے فکری نظام کو
 ہلکا کر رکھ دیا ہو۔

تنقید بر عقل محض

اس عنوان کا مفہوم کیا بنتا ہے کتاب کے عنوان سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ عقل محض پر
 تنقیدی حملہ کیا گیا ہے حالانکہ کانٹ ایسا نہیں کرتا یہاں نہ نیک کا لفظ تنقیدی سبب سے لگے
 معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس عظیم تصنیف میں کانٹ یہی بتاتا ہے کہ عقل ہے کیا اور عقل محض
 کیا ہے۔ اس کے امکانات کیا ہیں اس کی حدود کیا ہیں۔ عقل محض سے اس کی مراد علم ہے ایسا علم
 جو حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا جو ہر طرح کے حیاتی تجربات سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ علم
 مختلف ذہنی ساخت سے جنم لیتا ہے۔

اپنے اس فلسفے کا حوالے سے کانٹ برطانوی مکتب کے عظیم فلسفیوں بیوم اور لاک کو چیلنج
 کرتا ہے جو علم کا منبع حواس کو قرار دیتے ہیں۔ بیوم کا خیال تھا کہ نہ روح ہوتی ہے نہ سانس، بہن
 جو کچھ نصیب ہوتا ہے وہ حواس کے ذریعے ملتا ہے۔ کانٹ نے اس کی شدید انداز میں نفی کی۔ کانٹ
 نے اپنی کتاب میں لکھا:

میرا بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ہم عقل سے امید رکھتے ہوئے کیا حاصل کر سکتے

ہیں اور یہ سوال اس صورت میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ جب ہم تمام مواد اور تجربے
 کی اعانت کو ایک طرف رکھ دیں تب عقل کسی حد تک ہمیں کیا دے سکتی ہے۔

اپنے اس سوال کے حوالے سے کانٹ اپنی اس عظیم تملکہ خیز کتاب میں ذہنی دٹھانچے اور
 دماغ کے مختلف مدارج کو بیان کرتے ہوئے ایسے امکانات کی نشاندہی کرتا ہوا ملتا ہے جو پہلے
 کبھی ہمارے سامنے نہ آتے تھے وہ اپنی اس کتاب کے حوالے سے بہت بڑا دعوے کرتا ہے
 اتنا بڑا دعوے شاید ہی کسی فلسفی نے کبھی کیا ہو۔ وہ تنقید بر عقل محض میں لکھتا ہے۔

اس کتاب میں میں نے یہ مقصد سامنے رکھا ہے کہ تکمیل کو اپنا ہدف بناؤں میں نے

یہ کاوش کی ہے کہ کوئی بھی مابعد الطبیعیاتی مسئلہ یہاں نہ ہو جس کا جواب اور حل اس کتاب میں موجود نہ ہو یا پھر کم از کم اس مسئلے کے حل کے لیے اس کی کلید کو فراہم نہ کر دوں۔

کانٹ تنقید بر عقل محض " میں بتا ہے۔

"تجربہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس پر علم کا انحصار ہو تجربے کی بدولت ہم خالص علم حاصل نہیں کر سکتے۔ تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ "کیا ہے" ! لیکن یہ بتانا اس کے بس میں نہیں کہ کیوں ہے؟ اور پھر لازم نہیں کہ تجربہ ہمیں صحیح معنوں میں یہ بھی بتا سکے کہ کیا ہے؟ کی اصل کیا ہے۔"

۴۔ ان کے اندر کی سچائی " تجربے سے آزاد ہونی چاہیے۔"

۴۔ ہم تجربے کی بدولت کماں تک آگے بڑھ سکتے ہیں؟ اس کا جواب ریاضی سے ملتا ہے ریاضی کا علم یقینی بھی ہے اور ناگزیر بھی ہم مستقبل کے بارے میں ریاضی کے اصول کو توڑ کر محض تجربے کی بنا پر علم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم یہ یقین کر سکتے ہیں کہ مستقبل میں سورج مغرب میں طلوع ہو سکے گا۔ یہ بھی یقین کر سکتے ہیں کہ آگ لکڑی کو نہ گے گی لیکن ہم پوری زندگی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ دوا در دو چار کے علاوہ بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ یہ سچائی تجربے سے پہلی کی ہے لازمی اور ناگزیر سچائیاں تجربے کی محتاج نہیں ہوتی ہیں اور ایسی سچائیاں کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔"

۴۔ تجربے کا حاصل انفرادی اور منتشر ہیجان کے علاوہ کچھ نہیں۔

۴۔ سچائیاں ہمارے دماغ کی پیداوار ہیں۔ ہماری ذہنی اور دماغی ساخت سے جنم لیتی ہیں۔

۴۔ ذہن ایسا نہیں ہے کہ جیسے برطانوی فلسفیوں نے کہا ہے کہ اس پر موم رکھی ہو اور اسے حرارت ملے تو اس پر نقش بٹھیر جاتا ہے۔ ذہن مفعول نہیں فاعل ہے۔ ذہن مجرد احساسات اور کیفیت کا بھی نام نہیں۔ ذہن ایک فعال عنصر ہے جو ہیجانات کو خیالات (IDEAS) میں تبدیل کرتا ہے جو منتشر اور گراہ تجربات کے ذہرے پن کو منظم خیالات کی شکل دیتا ہے۔

کانٹ اپنے اس فلسفے کو TRANSCENDENTAL فلسفے کا نام دیتا ہے اور اسی نام سے اسے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے 'انسٹ' کو لازوال مقام حاصل ہوا ہے۔

وہ ان دو مراحل کا ذکر کرتا ہے جو ایک خاص لہجہ کار سے گزارتے ہوئے ہیجانات کے خم

مواد کو خیال کی شکل دیتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ہیجان کا وہ ہے جب زمان و مکان کا احساس اور تصور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں یہ تصور خیال کی صورت اختیار کرتا ہے۔

کانٹ اپنے فلسفے میں احساس زمان اور احساس مکان کو بے عداہمیت دیتا ہے کیونکہ تصور اور خیالات کی تشکیل میں یہ دونوں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ زمان و مکان کا صحیح احساس ہی خیالات کی تنظیم کرتا ہے۔

ہیوم اور لاک نے ذہن اور دماغ کو محض PASSION کا نام دیا تھا لیکن کانٹ نے دماغ کو خیالات اور عقل کا سرچشمہ اور گنجینہ ثابت کر دکھایا ہے۔ کانٹ کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس ٹیکوں کو غور سے پڑھیے جو اس کے نظریات کا پتھر ہے۔

Sensation is unorganised perception is organised sensation conception is organised perception. Science is organised knowledge, wisdom is organised life each is greater degree of order and unity.

وہ عقل کو منبع اور سچائی قرار دیتا ہے۔ اس کے ذریعے سے حاصل ہونے والے تجربوں کو غلط کہتا ہے۔ کیونکہ ان میں انتشار ہوتا ہے ان میں نظم اور وحدت کا فقدان ہوتا ہے کانٹ کا ایک جملہ ہے۔

Perceptions without conceptions are blind.

یہ ذہن اور دماغ ہے جو بحران کو دور کرتا ہے اور تجربے سے ماورا اصلی سچائیوں تک لے جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ جو قزاقین خیالات کے ہیں وہی قزاقین اشیاء پر لاگو ہوتے ہیں۔ کیونکہ اشیاء کا علم خیالات کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اس لیے اشیاء کے لیے ان قزاقین کی متابعت ناگزیر ہے۔

کانٹ کے فلسفے کے سمجھنے کے لیے شہنشاہ کی یہ رائے بھی بے حد مدد دیتی ہے۔ شہنشاہ نے کانٹ کے بارے میں لکھا تھا۔

“Kant's Greatest Merits Distinction of the Phenomenon from the thing in itself.”

کانٹ نے تنقید پر عقل محض میں ایک جگہ لکھا ہے،

”ہم کسی ایسے تجربے کا ذکر ہی نہیں کر سکتے جس کی وضاحت اور تشریح ممکن ازان اور اسباب علت سے نہ ہو سکتی ہو۔“

کانٹ کے فلسفے سے کلیسا اور مذہبی دنیا اور اس کے تعلقات میں انقلاب آیا۔ اختلافات کا ایک باب داہوا جو کبھی بند نہ ہو سکا۔ جو اس کو ترک کر کے عقل محض کو زندگی کے معنی و مقصد قرار دے کر کانٹ نے فلسفے کا ایسا نظام قائم کیا جس نے پہلے نظریات کو کبھی روک دیا۔

سائزبرجیوے عظیم منکر اور دانشور نے کانٹ کی شخصیت اور اس کے انکار کے تضاد کو بڑے موثر انداز میں نمایاں کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

یہ سیدھا سا دہ عام پر وقیعہ غائب اور باطن کے عظیم ترین تضاد کا حامل تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت درست کرتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس شخص نے ان کی زندگیوں کے ساتھ وابستہ تھا نہ کہ سفاکی سے قتل کر دیا ہے۔

کانٹ نے مذہب کو اخلاقی قرآین اور اصول۔ کے تابع کر دیا۔ اس نے اپنی بنیادی کتاب اور فلسفے ”تنقید بر عقل محض“ کو دوست دے کر اس کا اطلاق بعد کے دور میں دیگر موضوعات پر کیا۔ چھیا سٹو برس کی عمر میں اس کی کتاب ”کریٹیک آف جینٹل شائع ہوئی۔“ انتر برس کی عمر میں اس نے کتاب لکھی

Religion within the limits of pure reason.

یہ کتاب جو اس کے بنیادی فلسفے کا مذہب پر اطلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی بات کتاب کا درجہ رکھتی ہے اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اس کتاب کو اس نے انتر برس کی عمر میں لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مذہب کی بنیاد نظریاتی عقل کی منطق پر ٹکرا رکھی جائیے۔ بلکہ اس کی بنیاد عملی عقل اور اخلاقیات پر استوار کرنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائبل جیسی مذہبی کتاب کو اخلاقی قواعد پر جانچا جائے گا اس کی محض روحانی حیثیت کو سامنے نہ رکھا جائے گا۔ گرجے اور مذہبی عقائد اگر اخلاقی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے اور محض مذہبی ذمہ داری، اجارہ داری برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں تو پھر وہ اپنا فرض صحیح طور پر وہ نہیں کر رہے۔ کانٹ لکھتا ہے :-

”یسوع خدا کی آسمانی بادشاہت کو زمین کے قریب لے آیا تھا۔ لیکن یسوع کو غلط سمجھا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی بادشاہت قائم ہونے کے بجائے پادری کی بادشاہت دنیا پر قائم ہو گئی۔“

”مجھ پر کسی مذہب کی صداقت کو ثابِت نہیں کر سکے۔ کانٹ کے اس نظریے ”عقل محض“ اور اس کے مذہب پر اطلاق کی وجہ سے بڑی بے دے ہوئی۔ اس کے خلاف حکومت نے ایک بڑا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کی عماد بڑھاپے کی وجہ سے اسے منظر اُمراء کو دیا گیا۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی بقایا زندگی زندان میں بسر ہوئی۔ اس کتاب کو جو مذہب کے حوالے سے تنقید بر عقل محض سے تعلق رکھتی تھی۔ اس ناشر نے شائع کرنے سے انکار کر دیا جو اسے پہلے شائع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کانٹ نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور یہ کتاب JENA اپنے دوستوں کو بھیج دی JENA کا علاقہ جرمنی کی حدود سے باہر تھا۔ اس لیے اسے JENA یونیورسٹی نے شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر پروٹیسٹا کا بادشاہ بے حد ناراض ہوا۔ اس نے ایک شاہی فرمان کانٹ کے نام جاری کیا جس میں کانٹ کی شدید مذمت کی گئی کہ اس کے نظریات کی وجہ سے مقدس کتابوں کی بے حرمتی ہوئی ہے اور عیسائی اعتقادات کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ اسے متنبہ کیا گیا کہ وہ مستقبل میں ایسی کوئی تحریر لکھے اور اپنے فرانس کو اس طرح ادا کرے کہ اعتقادات پر حرف نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دی گئی کہ اگر اس نے آئندہ اعتیاد نہ برتی تو پھر نائنوش کو ارتاج پیدیا ہوں گے۔

کانٹ نے خاموشی اختیار کیے رکھی اصل میں وہ جو کچھ کسا چاہتا تھا وہ اپنی اس کتاب کے حوالے سے کہہ چکا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں کانٹ کا انتقال ہوا۔“

فلا سفیکل ڈکشنری

ڈرامہ، فلسفہ، رومانس، تاریخ، ادبی تنقید، شاعری والٹیر نے ہر صنف کو اپنی بے پناہ ذکاوت، بذلہ سنجی، طنز اور سماجی تنقید کا موضوع بنایا۔ دنیا والٹیر کو ایک اور حوالے سے بھی جانتی ہے کہ وہ مذہبی تعصب کا کٹر ترین نقاد تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں اور اپنے زمانے اور آنے والے دور کے فرانس کو بہی نہیں پوری دنیا کو متاثر کیا۔

اس نے ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ ایسی زندگی جس کے واقعات آج بھی ہمارے ذہنوں میں متحرک اور ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ اس کی زندگی ایسی بھرپور فونانی تھلکہ خیز ہے کہ کئی سوانح نگاروں نے اس پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کی زندگی کے کسی ایک عہد کو اپنا موضوع بنا کر ایک بھرپور کتاب لکھ دی ہے۔

والٹیر۔ ایک سچا انقلابی تھا۔ اپنی تحریروں سے، اپنے اعمال سے، جدوجہد سے، اپنی گفتار سے، طرزِ زیست کے اعتبار سے وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک انقلابی تھا۔ فرانس کا آخری لونی شہنشاہ انقلاب فرانس برہا ہونے کے بعد کہتا ہے

”انقلاب فرانس۔ کچھ بھی نہیں، سوائے والٹیر اور روسو کے۔“

والٹیر کی ہنگامہ خیز زندگی کی کچھ جھلکیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کیسا انسان تھا۔ اور اس نے کیسی زندگی بسر کی۔

وہ ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ سات برس کا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۷۰۴ء میں وہ لونی گرانڈ کے جمیوریت کالج میں داخل ہوا۔ ۱۷۱۱ء میں اس نے کالج کو خیر باد کہہ

دیا اس نے قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کیونکہ یہ اس کے والد کی بھراہش تھی۔ والیٹر کو اس نے زیادہ
 دلچسپی نہ تھی۔ ۱۷۱۵ء میں والیٹر نے اپنا پہلا ڈرامہ "اوٹوپسی" مکمل کیا۔ اب اس کی زبان کھل چکی تھی
 اس کے منہ سے نکلنے والے جملے فوراً پیرس اور پھر فرانس میں پھیل جاتے تھے۔ ۱۷۱۶ء میں
 اُسے سچائی اور طنز کی وجہ سے پیرس سے نکال دیا گیا۔ ۱۷۱۷ء میں پیرس واپس آکر اس نے اپنی
 ہجو اور طنز نگاری زیادہ شدت سے شروع کی تو اسے مشہور زمانہ بائیسٹل زندان کی ہوا کھانی پڑی
 یہاں اس نے "اوٹوپسی" کی نظر ثانی کی اور ہیریڈیکھنا شروع کیا۔ ۱۷۱۸ء میں اُسے بائیسٹل سے
 آزادی نصیب ہوئی۔ اسی برس اس کا کھیل "اوٹوپسی" سیٹج ہوا اور اس نے فقید المثل کامیابی
 حاصل کی۔ ۱۷۱۹ء میں برسرِ اقتدار طبقے کو پھر اس کی حق گوئی پسند نہ آئی تو اسے پیرس سے جلا وطن
 کر دیا گیا۔ اسی سال وہ پھر پیرس آگیا۔ ۱۷۲۱ء میں والیٹر کا والد فوت ہوا ہے اور ترکے میں اس کے
 لیے چار ہزار لیور کی سالانہ آمدنی چھوڑا تھا۔ ہیریڈیکھنے کی اشاعت پر فرانس میں پابندی لگی گائیڈ میں
 شائع ہوئی اور اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس نے شارل دوازدہم کی سوانح عمری
 لکھنی شروع کی۔ "انگلش لیٹرز" پر کام شروع کیا۔ ۱۷۲۹ء میں جب والیٹر موسم بہار میں فرانس
 واپس آیا تو قسمت اس پر ایک عجیب امداز سے مہربان ہوئی۔ لاٹری میں اسے ایک خلیفہ ترین رقم
 جیتنے کا موقع ملا۔ شارل دوازدہم کی پہلی اشاعت پر بھی فرانس میں پابندی لگی۔ لیکن کتاب منگل
 ہو کر فرانس پہنچ گئی۔ ۱۷۳۰ء میں اس کے کھیل "بروٹس" نے فقید المثل کامیابی حاصل کی ۱۷۳۳ء
 میں حکومت نے "لیٹرز" پر پابندی لگا دی۔ والیٹر کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری کر دیے گئے
 والیٹر پیرس سے چلا گیا۔ ۱۷۳۵ء میں جیورج کی موت، سکام کی اجازت کے بغیر شائع کی گئی۔ فرانس
 کا برسرِ اقتدار طبقہ اب والیٹر سے بے حد تنگ آچکا تھا اور اسے باقاعدہ دیکھائی ملنے لگیں۔ ۱۷۳۳ء
 میں اس کی کتاب "نیوٹن کے فلسفے کے عناصر" شائع کی گئی۔ ۱۷۴۱ء میں اس نے رسول کریم صلعم
 پر اپنا کھیل مکمل کیا اور اسی برس اسے ۱۷۴۲ء میں کھیلا بھی گیا۔ اور اسے شاندار کامیابی ہوئی۔ ۱۷۴۵ء
 سے پہلے وہ "میریڈائینڈ سپرٹس آف دی ٹیٹنڈ اور لوئی چہار دہم لکھ چکا تھا۔ مادام ہیاڈور کی وجہ
 سے اسے حکومت نے سرکاری سوانح نگار مقرر کر لیا۔ ۱۷۴۶ء میں وہ اکیڈمی آف فرانس کا رکن منتخب
 کر لیا گیا۔ وہ اس کا استحقاق تو برسوں پہلے سے رکھتا تھا۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اس کی مخالفت کرتا

رہا تھا۔ والٹیر اپنی صاف گزرتی اور بڑے سخی کی بنا پر ایک بار پھر معتوب ہوا۔ دربار سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا۔ دو ایک برس وہ فرانس چھوڑ کر برلن میں مقیم رہا۔ فریڈرک اعظم بگڑ گیا اور اس کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ کچھ عرصہ والٹیر جلاوطنی میں رہا۔

والٹیر نے ایک عجیب انداز کی زندگی گزاری۔ مالی اعتبار سے خوشحال رہا۔ باپ نے ترکہ چھوڑا۔ مہجانی مہرا تودہ بھی جائداد اس کے لیے چھوڑ گیا۔ لائٹھی میں خطیر رقم جمعیت لی ڈراموں سے خاصی آمدنی ہوتی۔ کسی نامور خواتین کے ساتھ اس کے برسوں تک تعلقات رہے حکومت اور مذہب کے اجارہ داروں سے مسلسل نہرواڑ مارا۔ کتنی ہی دفعہ پیرس سے جلاوطن ہوا۔ کتنی ہی کتابوں پر پابندی لگی۔ اور کتنی ہی بار اس کی کتابوں کے ضخیم ایڈیشن فرانس میں شائع ہوئے۔ کتنی ہی بار اس کی کتابوں کو حکومت اور مذہبی اجارہ داروں کے ایما سے جلا یا گیا۔ لیکن وہ اپنی حق گزرتی، بڑے سخی، طنز اور سچائی سے باز نہ آیا۔ اس نے فرانس میں ایک بڑی جائداد خریدی جہاں اس نے زندگی کے آخری میں برس گزارے۔ وہاں اس نے ایک مثالی بستی آباد کی۔ اور مسلسل لکھتا رہا وہ ایک ایسا چٹھہ تھا جو کبھی خشک نہ ہوا، رسالے، مخطوطات، مضامین اور کتابیں لکھتا رہا۔

۱۷۳۹ء میں اس کی کتاب 'نیچرل لائنڈر آف ٹیٹس' ہوئی۔ انسائیکلو پیڈیا کا کام رکھا دیا گیا اور اسی برس کینیڈیا شائع ہوئی۔ ۱۷۶۳ء میں اس کی تصنیف 'رسالہ دہرہ' شائع ہوئی۔ شائع ہوا جس نے پاپائیت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ ۱۷۶۲ء میں اس نے جب اس کی کتاب 'فلاسفیکل ڈکشنری' کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ فرانس میں اپنی جاگیر پر اس نے جنیوا کے گھڑی سازوں کو بگاڑ گھڑی سازی کی صنعت شروع کر دی۔

والٹیر کا دربار میں بھی بے حد تیز تھا۔ گھڑی سازی کے ساتھ ساتھ تیس سازی کا کام بھی شروع کر دیا۔ اسے لاکھوں فرانک کی سالانہ آمدنی ہوتی رہی۔ وہ پیرس سے نکال دیا گیا۔ بورڈھا ہو چکا تھا۔ فرانس میں ایک نئی بستی تعمیر کر چکا تھا۔ جو دنیا بھر کے فلسفیوں، شاعروں، حکمرانوں، سیاست دانوں، ہنرمندوں اور لکھنے والوں کے علاوہ انصاف کے طلب گاروں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ والٹیر نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بھی بے انصافی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور جہاد کیا۔

۲۰ آئریں • والیٹر کا آخری ڈراما تھا جو مارچ ۱۸۷۸ء میں پیرس میں کھیلایا گیا اس ڈرامے کے افتتاح کے وقت وہ پیرس آیا۔ ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو اس کا انتقال ہوا۔ مذہب کے اجارہ داروں کے خوف سے اس کی لاش کو خفیہ طریقے سے شہر سے نکالا اور جلد ہی سے دفن دیا گیا۔ کیونکہ مذہب کے اجارہ دار اتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں اس کی لاش پھر فرانس لاکر پوسے احترام سے دفن کی گئی۔

فلانسفیکل ڈکشنری

ان گنت ایسے طنزیہ اور شگفتہ جملے ہیں جو آج دنیا کی ہرزبان میں والیٹر کے حوالے سے منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ والیٹر جیسے آدمی کہہ ہی جرات حاصل تھی کہ وہ پاپائے روم کو لٹاکر کر کہہ سکتا تھا۔

”ہم بحث تو کر رہے ہیں لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم جو الفاظ استعمال کر رہے ہیں پہلے ان کے معانی کا تعین کر لیں۔“ ایک جملے میں اس نے پاپائے روم کی علیت کا خاتمہ کر دیا تھا۔

والیٹر نے بہت لکھا ہے، ڈرامے، فلسفہ، شاعری، تنقید، رسالے، مضامین وغیرہ

آج اس کا بہت سا کام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو ہنگامی نوعیت کی تھیں۔ اس زمانے کے برسرِ اقتدار افراد اور مذہبی اجارہ داروں کے خلاف لکھی گئی تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود فراموش کر دی گئیں۔ اس کے ڈرامے بھی اب بہت کم کھیلے جاتے ہیں تاہم اس نے اپنی زندگی میں بیس ہزار کے لگ بھگ خطوط لکھے تھے۔ جو جمع ہو کر شائع ہو چکے ہیں اور اس کی بعض کتابیں بار بار شائع ہوئی ہیں۔ کینڈیدیسی کتاب ہے جو اردو میں بھی اغلباً دوبار ترجمہ ہو چکی ہے جو بلاشبہ اس کا زندہ رہنے والا کام ہے۔

والیٹر اس اعتبار سے بڑا لکھنے والا ہے اور فلانسفیکل ڈکشنری میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ اسے دنیا کی سوعظیم ترین کتابوں میں شامل کیا جا رہا ہے؟

پہلے سوال کا معقول ترین جواب BEN RAY REDMAN نے دیا ہے اور اسی میں

دوسرے سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ بن رے ریڈمین لکھتا ہے:-

بلاتشبہہ ڈانٹے، ملٹن اور ٹیکسپیر کی صفحہ کا بڑا لکھنے والا نہ تھا نہ ہی وہ ٹالسٹائی، بالزاک
 دوستو ٹیفسکی، ڈکنز اور پردوست کی سطح کا مصنف تھا۔ اور اس نے کردار تخلیق نہیں کیے۔ ایسے
 مناظر پیش نہیں کیے جن میں زندگی چل رہی ہو اس نے انسانی فطرت کی برائیوں کو بھی دریافت
 نہیں کیا۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بھی عظیم نہ تھا۔ وہ ڈیپین ٹرڈوکاوت اور قابل تعریف ڈرامہ
 نگار تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مروجہ قواعد کے مطابق کامیاب کھیل کھنسا جاتا تھا۔ اس کے
 باوجود وہ بڑا ڈرامہ نگار نہ تھا۔ اس کے کھیلوں نے کبھی قومی اور لسانی سرحدوں کو عبور نہ کیا۔
 اور آج فرانس، مشکل ہی اس کے کھیلوں کو یاد کرتا ہے۔ والٹیر ڈیکارت اور لاک جیٹسوفی
 بھی نہ تھا۔ مورخ کی حیثیت سے بھی اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ گبن اس کا علاج
 تھا۔ اور والٹیر سے ملنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ گبن نے اپنے ویچے ایک بڑا کارنامہ DECLINE
 THE ROMAN EMPIRE چھوڑا ہے جب کہ والٹیر کی کوئی تاریخی کتاب اس مرتبے تک
 نہیں پہنچی۔ سائنسی تجربات کے میدان میں بھی والٹیر کا مرتبہ فرینکلن سے کتر بنتا ہے۔

پھر والٹیر اتنا اہم کیوں ہے؟ والٹیر اپنی صدی کی آواز ہے۔ عزم مندی روشن خیالی کے
 دور کا وہ سب سے اہم اور سب سے بڑا ترجمان اور نمائندہ ہے اور پھر اس کی دکاوت بذلتہ سخن
 اور اس کا اسلوب قطعی، پُر لطف غیر مبہم اور دل میں اتر جانے والا۔ والٹیر کو پڑھنے کے لیے
 زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسے سننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک بولنے
 والا آدمی ہے جو اپنی کتاب میں بولتا ہے۔

اس کی تمام تحریروں میں خواہ وہ پراپگنڈہ مپفلٹ ہی کیوں نہ ہو وہ خیالات ملتے ہیں
 جو ہنگامی مسائل سے جنم لیتے ہیں لیکن روشن خیالی اور عزم افزائی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ
 جانتا تھا کہ کس بے ریائی، کس بے رحمی، کس لڑمی، کس القباہتہ انداز اور کس غصیلے لہجے میں
 اسے کونسی بات کہنی ہے۔

والٹیر دراصل ایک معلم تھا۔ اور ایسے معلم دنیا نے کم ہی پیدا کیے ہیں۔ خود والٹیر کا اس
 پر ایمان تھا کہ جو لکھنے والا کچھ سکھاتا اور تعلیم نہیں دیتا وہ سرے سے لکھنے والا ہی نہیں ہے تاہم
 کوہ عقلی رویے کے رہنما کا درجہ دیتا تھا۔ اخلاقی فلسفے اور اخلاقیات اس کے خیال میں بے معنی

تھے جو فن معاشرے کی بہبود میں کام نہیں آتا اسے وہ سرے سے تسلیم نہ کرتا تھا۔ فریڈرک انکسٹر کے نام اس نے لکھا تھا۔

”وہ شاعری جو انسانوں کو ذہنی اور متحرک سچائیوں کی تعلیم نہیں دیتی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے پڑھا جائے۔“

پھر اس کی بذلہ سنجی، اس کی ذکاوت، اس کی طنز جو دنیا میں ضرب المثل بن چکی ہے والٹیر خرد افروزی اور روشن خیالی کے دور کا سب سے اہم لکھنے والا بن جاتا ہے اور اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے اپنی تصانیف اپنی زندگی اور اپنے رویوں سے انقلاب فرانس کے لیے زمین ہموار کر کے انقلاب کا بیج بویا جو باثر ثابہت ہوا۔

فلاسیفیل ڈکشنری، والٹیر کی وہ تصنیف ہے جو اس کے آخری زمانے کی چند کتابوں میں اہم ترین درجے کی حامل ہے۔ اس میں اس کی ذکاوت، اس کی بذلہ سنجی، روشن خیالی اور خرد افروزی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جب اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تو ناسازگار حالات کی وجہ سے والٹیر نے اس پر اپنا نام نہ دیا تھا۔ بلکہ یہ گناہ مصنف کی تخلیق کی حیثیت سے شائع ہوئی تھی۔ فلاسیفیل ڈکشنری نام سے ہی ظاہر ہے کہ خالص فلسفے کی کتاب نہیں۔ والٹیر کی پوری فکر، رجحانات، رویے اور اسلوب کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب اس کی نمائندہ ترین تصنیف قرار دی گئی ہے۔ فلاسیفیل ڈکشنری اپنی اشاعت سے لے کر دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے۔ اس کے کاٹ دار، تیز فکرانگیز جملے ضرب المثل بنے ہیں۔ جن زبانوں میں اس کا پورا ترجمہ نہیں ہوا (مثلاً اردو) ان زبانوں میں بھی اس کے ٹکڑے مختلف حوالوں سے موجود ہیں۔ فلاسیفیل ڈکشنری، اس والٹیر کی نمائندہ ترین تصنیف ہے جسکی فکر نے انقلاب فرانس کے لیے راہ ہموار کی اور انقلاب فرانس انسانی تاریخ کا وہ منفرد اور یکتا واقعہ اور موڑ ہے جس نے پوری دنیا کو تب سے اب تک متاثر کیا اور رہنمائی بخشی ہے۔

۔ فلاسیفیل ڈکشنری کی ایک مختصر سی تلخیص

۴۔ ہر دور میں ایسے منطقی ہوتے ہیں جن میں قدامت کے مقابلے میں نئے لوگوں کا کام بہتر

ہوتا ہے۔ سزا یہ نئے لوگ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں اور تعداد کی یہی کمی نہیں قدمہ کے مقابلے میں کتر بنا دیتی ہے۔

ۛ۔ وہ آدمی یقیناً بہت بڑا محنت اور جہل ہے کیونکہ اس سے جو سوال پوچھا جاتا ہے وہ اس کا جواب دیتا ہے۔

ۛ۔ تمام فلسفیوں کے خیال میں مادہ ازلی اور دائمی ہے لیکن فنون بالکل نئے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ردی بنانے کا فن تک موجودہ دور کی پیداوار ہے۔

ۛ۔ کھنے والے کو سچ بونا چاہیے اور اپنے قاری کو کبھی فریب نہ دینا چاہیے۔

ۛ۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ ایٹم ناقابل تقسیم ہے لیکن یہ بات اب ظاہر ہو رہی ہے کہ ایٹم کو فطرت کے قانون نے بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ تقسیم نہیں ہو سکتے۔

ۛ۔ اختیار اور اقتدار کیا ہے؟ سات کارڈ نیل، جن کی اعانت ان کے نائب کر رہے ہیں۔ انہوں نے اٹلی کے رہنے والے اپنے زمانے کے سب سے بڑے مفکر (گیلیلیو) کو زندگان میں پھینکوا دیا۔ اسے صرف ردی اور پانی پر زندہ رکھا گیا۔ اس لیے کہ اس نے انسانی نفسوں کی رہنمائی کی تھی۔ ان کو تعلیم دی تھی۔ جبکہ اس کو سزا دینے والے... جہل اور صاحب اقتدار تھے۔

ۛ۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مصنف اور کھنے والے بن بیٹھے ہیں۔ اپنے لوگوں کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ ان کے والدین نے ان کو کوئی ہنر نہیں سکھایا ہوتا۔ یہ ہمارے دور کا بہت بڑا المیہ ہے جس کا جی چاہے وہ صحافی بن جاتا ہے۔ وہ گھٹیا ترین ادب کی کاشت کرتا ہے اور اپنے آپ کو بڑے فخر سے مصنف کہلاتا ہے۔ اصلی اور سچے مصنف تو وہ ہیں جو انسانی نفسوں کو تعلیم دیتے اور ان کو محفوظ کرتے ہیں۔ جن بے ہنر کھنے والوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کی حیثیت آدمیوں میں وہی ہے جو چوگا دوڑ کی پمپوں میں ہوتی ہے۔

ۛ۔ ایک روز میں ایک المیہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے فلسفی نے کہا: "کتنا خوب صورت ہے۔" میں نے اس سے پوچھا: "تم نے اس میں خوب صورتی کو کیسے پایا؟" یہ خوب صورت ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کیونکہ اس میں مصنف جو کتنا چاہتا تھا اس

کامیاب رہا ہے۔“

دوسرے دن اس فلسفی نے ایک دوامی استعمال کی جو اسے فائدہ پہنچاتی تھی۔ میں نے کہا: یہ دوامی جس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس نے یہ مقصد پورا کر دیا۔ کتنی خوبصورت دوامی ہے۔“ وہ سمجھ گیا کہ کسی دوامی کو خوبصورت نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ خوبصورتی کچھ ایسی چیز ہے جو آپ میں تعجب اور مسرت کے جذبات پیدا کرے۔ اس فلسفی نے تسلیم کیا کہ اس المیہ کھیل نے اس میں یہ احساسات پیدا اور بیدار کیے تھے۔ اور یہی خوبصورتی کی صفت ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم انگلستان گئے، جہاں وہی کھیل انگریزی میں ترجمہ کر کے کھلایا جا رہا تھا۔ لیکن اس کھیل کو دیکھ کر لوگ جھانپاں لے رہے تھے۔ فلسفی نے کہا۔ اوہ۔ جو چیز فزانیسیوں کو اچھی لگی وہ انگریزوں کو پسند نہ آئی۔ تب وہ فلسفی اس نتیجہ پر پہنچا کہ خوبصورتی بیشتر صورتوں میں اضافی شے ہوتی ہے جسے جاپان میں نفیس اور عمدہ سمجھا جاتا ہے وہی روم میں ناپسندیدہ قرار پاتی ہے۔

بعض ایسے اعمال ہوتے ہیں جنہیں ساری دنیا خوبصورت تسلیم کرتی ہے میڈلز کے دو فوجی افسر ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پنڈر نے ان کو پینام بھیج کر چیلنج دیا کہ جو ایک دوسرے کا خون بہائے گا وہ بہادر نہیں ہوگا۔ بلکہ فلاں معرکے میں جو دشمن کے خلاف بہادری سے لڑے گا وہ بہادر تسلیم کیا جائے گا۔ ایک افسر دشمن کے مقابلے میں گھرا ہوا جب مرنے والا تھا تو اس کے حریف نے آگے بڑھ کر دشمن کو پھینکا کر اسے بچایا۔ یہ وہ عمل ہے جسے ساری دنیا خوبصورت کہے گی۔ ایک دوست اپنے دوست کے لیے جان دے دیتا ہے۔ ایک بیٹا باپ کے لیے جان دے دیتا ہے۔ یہ ایسے اعمال ہیں جن کی وہ توصیف کرتے ہیں۔ اور ان سے مسرت حاصل کرتے ہیں۔ خوبصورتی نفسیہ کا ہے۔ الفاظ میں یہ ہے۔ ”دشمنوں کو مجبور جاؤ۔ مہربانی کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ نیکی یہ ہے جس کو زلزلت نے یوں بیان کیا ہے۔ اگر ڈراما شبہ بھی پیدا ہو جائے کہ یہ کام غیر منصفانہ ہے تو کچھ پہٹ جاؤ۔“ گول آنکھوں، کالی چمڑی، پھلے ناک والا جیٹھی ہمارے دربار کی حسین ترین خواتین کو خوبصورت نہ کہے گا لیکن جن اعمال کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں

مذہب صورت تسلیم کرے گا۔ حتیٰ کہ دنیا کا مفسد اور بدترین شخص بھی اس دانا لی کو سراہے گا جس کی تقلید اس نے خود کو بھی نہیں کی۔

۷۔ آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ جب سے دنیا بنی ہے وحشی نفسوں کو چھوڑ کر، اس پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے۔

۸۔ مذہب اور اخلاقیات۔ قدرت کی قوت کو توڑ دیتے ہیں۔

۹۔ غور کر کے دیکھ لیجیے، مذاہب پر موسموں کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ گرم خطوں میں

مذہب یہ اصول بناتا ہے کہ ان غسل کرے اور اس کا غسل مذہبی رسم بن جاتی ہے۔

۱۰۔ زمانہ حال۔ حاملہ عورت کی طرح ہے جس کے پیٹ میں مستقبل پل رہا ہے۔

۱۱۔ اصول پر کھا جائے تو پھر بڑے آدمیوں کے جرائم۔ جو ہمیشہ اقتدار اور طالع آزمائی

کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور عوام کے جرائم میں کوئی مفرق نہیں جو ہمیشہ آزادی اور

مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک متمدن جمہوریہ کو سمجھنے کے لیے ایک سحر کی حکایت

سے بہتر کوئی مثال نہیں ہے۔

ایک اٹو دہا ہے جس کے کئی سر ہیں۔ ایک اور اٹو دہا ہے جس کی کئی ڈیں ہیں کئی سر۔

ایک دوسرے کو زخمی کرتے رہتے ہیں اور بہت سی ڈیں ایک بڑے سر کی اطاعت میں

ہلتی رہتی ہیں۔ جمہوریت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں بڑی بڑی تباہ کن غلطیاں، لیکن جمہوریت

اس سمندر کی طرح ہے جس میں نہ ہر طلایا جائے تو بھی سمندر کا کچھ نہیں بگڑتا۔

۱۲۔ یہ میری ضرورت ہے کہ میں لکھوں۔ یہ آپ کے اندر کی بھوک ہے جو آپ کو مجبور

کرتی ہے کہ آپ میری تحریر کو زور دیکریں۔ میں اور آپ۔ ہم دونوں یکساں سطح کے احسن ہیں۔

آپ کی فطرت میں نقصان پہنچانا ہے میری فطرت میں سچائی سے محبت کرنا شامل ہے اور

آپ کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے عام کرنا ہے۔ اٹو جو چاہے کھا کر پیٹ بھرتا ہے اس

نے بلبیل سے کہا۔ اس خوب صورت سایہ دار درخت کے نیچے چھپ کر مت گاؤ۔ میرے پاس

آؤ تاکہ میں تمہیں کھا جاؤں۔ بلبیل جواب دیتی ہے۔ میں یہاں گانے کے لیے پیدا کی گئی

اور تم پر ہنسنے کے لیے.....

۶۔ مذہب کا ادارہ اس لیے وجود میں آیا یعنی نوح انسان کو منظم کر سکے۔ اور ان میں یہ صحت پیدا کرے کہ وہ خدا کی شان اور خوبیوں کو اپنی دانائی بنا سکیں مذہب میں ہر وہ چیز جو اس مقصد کو پورا نہیں کرتی وہ غیر شے اور خطرناک ہے۔

۷۔ مذہب کو انسانوں پر صرف روحانی اختیار ہونا چاہیے۔

۸۔ انسان اگر ضرورتوں سے آزاد ہو جائیں تو بلاشبہ وہ ایک دوسرے کے مساوی ہو سکتے ہیں۔ انواع انسانی میں یہ غربت ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کا تابع بنا رکھا ہے۔ ناہمواری اور غیر مساوات ہماری بدقسمتی ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم دوسروں کے محتاج بننے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ ہماری اس رنجور دنیا میں انسانوں کے لیے یہ ناممکن بنا دیا گیا ہے کہ وہ خوش حال اور آسودہ زندگی بسر کر سکیں۔ کیونکہ انسانوں کو دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ امیر و محکم چلتا ہے اور غریب، جو خدمت بجالانے پر مجبور ہے۔ ان طبقوں کو ہزاروں طرح سے تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود تمام انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ خواہش ایک حق کی طرح موجود ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے برابر ہیں۔ اس کا فیصلہ یہ نہیں ہے کہ ایک مذہبی رہنما کا باورچی اسے یہ حکم دے کہ چونکہ ہم مساوی ہیں اس لیے تم میرے لیے کھانا تیار کرو۔ انسانوں کی مساوات کی صحیح تعریف یوں ہے کہ وہ باورچی اپنے عظیم مذہبی رہنما کے سامنے کہہ سکے کہ میں بھی اپنے آقا کی طرح انسان ہوں میں بھی اسی طرح چھینتا ہوا پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی اسی کرب اور درد میں مبتلا ہو کر مرے گا جو میں برداشت کروں گا۔ ہم دونوں ایک ہی طرح سے جانوروں کی سی حرکات کرتے ہیں اور ترک روم پر قبضہ کر سکتے ہیں تو پھر میں بھی مذہبی رہنما بن سکتا ہوں اور میرا وجود آقا۔ میرا خانہ ماں ہو سکتا ہے۔

۹۔ ادھر مذاہب دنیا میں آئے اور ادھر مضحکہ خیز رسموں نے جنم لینا شروع کیا۔

۱۰۔ وہ جس کے دل میں یہ خواہش ہے کہ اس کا وطن کبھی عظیم تر، حقیر، امیر ترین اور

غریب ترین ملک نہ بنے وہ عالمی شہری ہے۔

۱۱۔ دوستی روجوں کی شادی ہے اور اس شادی میں طلاق ہو سکتی ہے۔ یہ دوسرا

اور دانا انسانوں میں ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ بڑے لوگوں کو بُرائیاں مل جاتی ہیں۔ جو غرض لوگوں کو ساتھی نصیب ہو جاتے ہیں۔ سیاست دان اپنے ہمنواؤں کو جمع کر لیتے ہیں۔ شاہزادوں کو درباری ملتے ہیں اور آرام طلب لوگوں کو خوشامی۔ لیکن صرف حساس اور دانا شخص کو دوست نصیب ہوتا ہے۔

ۛ۔ بڑے آدمی پر کبھی کوئی حکمرانی نہیں کر سکتا۔

ۛ۔ لوگ بے شرمی کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم قتل و غارت کی داستانیں بڑی اونچی آواز میں دہراتے ہیں۔ دوسروں کو دکھ پہنچانے اور غداری کے قصے بلند آواز میں ملتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے لیکن صرف محبت کا اظہار اور اعلان ہم سرگوشیوں میں کرتے ہیں۔

ۛ۔ قوانین کا کیا ہے۔ چودوں کے درمیان بھی کچھ قوانین نافذ ہوتے ہیں اور تو اور جنگ کے لیے بھی قانون بنائے جاتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت نے ہر شخص کو یہ سوجھ بوجھ ودیعت کی ہے کہ وہ قانون بنا سکتا ہے۔ لیکن منصفانہ قانون بنانے والے کہتے ہیں۔ تم اس وقت تک احمق اور جاہل ہی رہو گے جب تک تم اپنے بے ہودہ قوانین کی اصلاح نہیں کر لیتے۔

ۛ۔ آپ کتابوں سے خوف کھاتے ہیں اس لیے ان پر پابندی لگاتے ہیں۔ سفور انسانوں کو پڑھنے اور ناپسنے دو۔ کتابیں اور قصے۔ دنیا کر کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

ۛ۔ خدا سے کس طرح محبت کی جلتے۔ خدا سے محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ان سوالوں پر اتنے جھگڑے اٹھے ہیں کہ انسانوں کے دلوں میں نفرت کے سوا کچھ بھئی باقی نہیں رہا۔ ایک دوسرے کے لیے!

ۛ۔ کبھی خدا سے سب سے زیادہ محبت کی جاتی تھی پھر... اقتدار، آسودگی، عیش و عشرت، مسرت اور دولت سے محبت کی جلتے الکی۔

ۛ۔ نباتات کی سطح سے اوپر اٹھنے اور خالص حیوانی حالت سے بچپن تک پہنچنے کے لیے آدمی کو بیس برس کی مدت لگتی ہے۔ اس کے بعد کہیں جا کر اس میں شعور کے آثار نمودار

ہوتے ہیں۔ انسانی ڈھانچے کے باسے میں تھوڑی سی معلومات تیس صدیوں میں جا کر حاصل ہو سکی ہیں۔ اس کی زوج کو ہانسنے کے لیے تو ابدیت کی ضرورت ہے لیکن اسے ہلاک کرنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے۔

ۛ۔ میں ایک بار پھر آپ جاہلوں کو بتاتا ہوں کہ یہ آپ کی جہالت ہے جس کی وجہ سے آپ محمدؐ کے مذہب کو شہوانی سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں ایک لفظ کی بھی سہمی نہیں ہے۔ اس بات پر بھی کتنی ہی دوسری سپائٹوں کی طرح آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔ تمہارے راہب، پادری، مذہبی رہنما کیا انسانوں پر یہ قانون لاگو کر سکتے ہیں کہ صبح چار بجے سے رات دس بجے تک نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا۔ اور روزہ رکھنا ہے کیا شراب ممنوع قرار دی جاسکتی ہے کیا جلتے ہوئے صحراؤں میں سفر کر کے تم ج کا حکم دے سکتے ہو کیا تم غریبوں کو اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ زکوٰۃ میں دے سکتے ہو۔ اگر تم اٹھارہ اٹھارہ عورتوں کی محبت سے لطف اٹھا رہے ہوتے اور حکم دیا جاتا کہ صرف چار بیویاں ہی رکھی جاسکتی ہیں تو کیا تم یہ حکم مان لیتے۔ کیا تم ایسے مذہب کو شہوانی کہہ سکتے ہو؟ محمدؐ صلعم، آسمان پر معراج کے لیے گئے اس معراج کے واقعہ کو ہم خرد ثابت کر چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے۔

مورخ جو مرضی بگو اس کرتے رہیں۔

ۛ۔ قدرتی قانون کیا ہے وہ جبلت جو ہمیں انصاف کو محسوس کرنا سکھاتی ہے۔

ۛ۔ وہ جو یہ کہتے ہیں کہ انقلاب فاموشی اور امن سے برپا کیا جاسکتا ہے۔

ۛ۔ وہ انقلاب کے معنی جانتے نہیں۔ اور مذہبی وہ دانائیں وہ محض احمق ہیں۔

ۛ۔ تعصب ایک ایسی رائے ہے جس میں انصاف کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ بیشتر تاریخی

واقعات اور قصے جن پر یقین کر لیا گیا ہے۔ ان کا بھروسہ یہ کہہ نہیں ہوا۔ یہ قصے تعصب کی پیداوار ہیں۔ مذہبی تعصب ظلم کو جسم دینا ہے۔ اور بردباری کو شتم کرتا ہے۔

ۛ۔ سقراط نے اس لیے زہر پیا کہ وہ خدا کی وحدت پر یقین رکھتا تھا۔ ایجنز کے

لوگوں نے اس کی موت کے بعد اس کی یاد میں ایک مندر تعمیر کر دیا۔ ہاں اس سقراط کی یاد میں جو ہر طرح کے معبدوں سے نفرت کرتا تھا۔

ۛ۔ اداہم پرست شخص مذہبی جنون کا غلام ہوتا ہے اور پھر خود مذہبی جنون بن جاتا ہے عیساؑ کے بارے میں دعویٰ تو بہت ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کے سب بڑے عابد کی حماقت کو مانتے تھے۔

ۛ۔ خدا پرست کو یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ خدا کس طرح سزا دیتا ہے۔ کس طرح تحفہ نازل کرتا ہے کیسے معاف کرتا ہے۔ کیونکہ خدا پرست میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ خدا کے اعمال کو سمجھنے کی کوشش کر سکے۔ وہ تو اتنا جانتا ہے کہ خدا قادر مطلق ہے اور قسمت کے باسے میں جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ خدا پرست کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتے کیونکہ محض دلائل کبھی شواہد کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

ۛ۔ تحمل انسانی فطرت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ہم سب خطا کے پتلے ہیں۔ اس لیے آئیے دوسرے شخص کی حماقت کو معاف کر دیں۔ یہی فطرت کا پہلا قانون ہے۔ ۛ۔ اگر صرف سچائی پر مبنی اور کارآمد باتوں کو کہی کتابوں میں محفوظ کیا جاتا تو ہمارے عظیم الشان کتب خانے سکڑا اور سمٹ کر بہت چھوٹے ہو جاتے۔

ۛ۔ دہریت اور مذہبی جنون دو ایسے وزن بے ہیں جو معاشرے کو پھیر بھار کر رکھ دیتے ہیں۔ دہریت کے پاس بہر حال کچھ دلیل اور سوچ بوجھ ہوتی ہے۔ وہ اس عقل اور سوچ بوجھ کو بردے کاڑھتا ہے جبکہ مذہبی جنون پاگل پن کے زیر اثر ہوتا ہے۔

ۛ۔ ہر وہ ملک جہاں لوگ بھیسکے، اٹکتے ہیں جہاں بے تعصبی نہیں وہاں بُری حکومت قائم ہے۔

ۛ۔ ہمیں مذہب کے معاملے میں اپنے نظریات کو زیادہ گہرائی میں نہیں لے جانا چاہیے خدا نے ہمیں اس سے باز رکھا ہے۔ ہمارے لیے سادہ مذہبی عقیدہ ہی کافی ہے۔ ۛ۔ تاریخ میں ہمیں محض ان لوگوں کا بیان ملتا ہے جنہوں نے دوسروں کی اٹلاک پر قبضہ کر لیا۔

ۛ۔ بالبعدا الطبیعات اور اخلاق کے باب میں قدماء یہ بات کہہ چکے ہیں۔ ہم محض ان کو دہراتے ہیں۔

ۛ۔ ہومر نے کبھی آفسوڈوں کو تخلیق نہیں کیا۔ اصل شاعر میرے نزدیک وہ ہے جو روح کو چھوٹا اور اسے گداز بھشتا ہے۔ یہ میری اپنی رائے ہے۔ مونیق نے کہا۔ میں اپنی رائے دیتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہتر ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ میری اپنی رائے ہے۔

ۛ۔ میرا ذہن یہ پوری طرح قبول کرتا ہے ایک لازمی، ناگزیر۔ ابدی، بلند ترین، ذہین ترین وجود موجود ہے۔ یہ عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ عقل تسلیم کرتی ہے۔

ۛ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی بھی حکومت اور ریاست کو کسی بھی فرقے کی برتری سے محفوظ رکھا جائے تو برو بارسی اور تحمل کا مظاہرہ کیجئے۔

ۛ۔ بڑی کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے بہتر ہے کہ آپ خاموش رہیں۔

ۛ۔ وہ لوگ کہاں ہیں۔ کہاں ملیں گے۔ جو سچ کا اظہار کرتے ہیں۔

ۛ۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اچھے قوانین بنائے جائیں تو پھر موجودہ تمام قوانین کو جلا دیجئے

ۛ۔ کسی مقبول عالم رائے کو تباہ کرنے میں عریں لگ جاتی ہیں۔

ۛ۔ میرا عقیدہ ہے کہ فلسفہ کے کسی نظام کا کوئی ایسا خالق نہیں ہے جس نے اپنی زندگی

کے آخری دنوں میں یہ اعتراف نہ کیا ہو کہ اس نے اپنا وقت ضائع کیا۔ یہ تسلیم کر لینا چاہیے

کہ عملی فنون کے موجد بنی نوع انسان کے لیے کہیں زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔

وہ جو صرف خیالات کو تخلیق کرتا ہے اسے اپنے خیالات کی تعبیر نہیں ملتی۔ لیکن جس نے

بحری جہاز کو بنانے کو ارادہ کیا وہ ایک دن بحری جہاز پر سوار بھی ہو گیا تھا۔

ۛ۔ شاعری کی ایک ایسی خوبی ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شاعری تھوڑے

لفظوں میں نثر کے مقابلے میں بھی زیادہ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ۛ۔ یہ کتابیں ہی ہیں جو ہمارے دلوں اور ذہنوں کو روشن رکھتی ہیں۔

ۛ۔ دریا اتنی تیزی سے سمندر کی طرف نہیں بہتے جتنی تیزی سے انسان غلطی کی

طرف لپکتا ہے۔

ۛ۔ میں تو سینٹ آف ڈائیٹیس کو اپنا روحانی مرشد مانتا ہوں جو اس بات پر

ہمیشہ اصرار کرتا تھا کہ جب تک تم ہاتھوں سے چھو کہ نہ دیکھو کہ کسی چیز یقین نہ کرو۔

پرنس

شیطنیت اور میکادولی - ایک ہی چیز کے دو نام اور ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ میکادولی کی کتاب "پرنس" کی اشاعت کے ساتھ ہی میکادولی کو مطعون کیا جانے لگا اور یہ سلسلہ تب سے اب تک جاری ہے۔ اس کے باوجود انسانی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو یوں لگتا ہے کہ جو درس میکادولی اپنے پرنس - اپنے بادشاہ کو پڑھا رہا ہے۔ وہ سبق تو اس سے پہلے کے حکمران اور پھر اس کے بعد کے حکمران اس سے استفادہ کیے بغیر خود ہی پڑھے ہوئے تھے۔

"پرنس" کی شاعت سے لے کر اب تک اس کتاب نے جو اثرات دنیا کی سیاست اور کاروبار حکمرانی پر مرتب کیے ہیں اس کتاب پر جو کچھ لکھا گیا اور میکادولی کو جو کچھ کہا گیا۔ اگر اس کا ایک مختصر سا بھی جائزہ لیا جائے تو ہزاروں صفحات پر مشتمل کسی کتاب میں مرتب کی جاسکتی ہیں۔

"پرنس" کا خالق - جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سیاست کو سائنس کا درجہ دیا اور وہ سیاست کو سائنس بنانے کا موجد اور بانی ہے۔ یقیناً ایسا شخص نہیں ہے کہ اس کے حالات زندگی کو صرف سینین کے حوالے سے بیان کیا جائے۔ اس کی زندگی اور زمانے کو سمجھنے سے اس کی کتاب جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

نیکولو ڈی برنارڈو میکادولی - صرف سیاسی مفکر نہ تھا، وہ مؤرخ، سیاست دان،

سفارت کار اور ڈراما نگار بھی تھا۔ ۳۰ مئی ۱۴۶۹ء کو وہ فلورنس (اٹلی) میں پیدا ہوا۔ اس کی جوانی کا دور بڑے ناخوشگوار حالات میں گزرا۔ فرانس نے اٹلی پر حملہ کیا تھا۔ اور اٹلی کا مشہور میڈیچی خاندان اقتدار سے محروم ہوا۔ اسے اٹلی سے نکال باہر کیا گیا۔ اٹلی میں نئی رمی پبلک کا قیام عمل میں آیا تو میکیا ویلی کو اہم عہدہ ملا۔ اسے فرسٹ سیکریٹری کا عہدہ ۱۴۹۸ء میں ملا جو حکومت کا اہم ترین عہدہ تھا۔ ۱۵۱۲ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔ جب فلورنس کی یہ رمی پبلک حکومت ختم ہوئی تو اس کا یہ عہدہ بھی ختم ہو گیا۔ میکیا ویلی نے کئی اہم سرکاری دفتروں میں سفارت کار کے فرائض انجام دیے۔ اس نے سفارت کے دوران جو تحریروں لکھیں وہ ان ملکوں کی سیاسی صورت حال کا بھرپور تجزیہ پیش کرتی تھیں۔

۱۵۱۲ء میں میڈیچی دوبارہ برسر اقتدار آئے۔ میکیا ویلی کا مرلی سابق صاحب اقتدار سٹورینی زیر عتاب آیا۔ اس کے ساتھ میکیا ویلی پر بھی سازش کا الزام لگایا گیا۔ ۱۵۱۳ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر تشدد بھی ہوا۔ بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا۔ آنے والے کئی برسوں میں وہ تحریروں تصنیف میں مصروف رہا۔ اس نے فلورنس کی تاریخ بھی لکھی۔ یہ زمانہ اس نے فلورنس سے باہر گزارا۔ ۱۵۲۱ء میں اسے دوبارہ سفارتی فرائض سونپے گئے۔ فلورنس آکر وہ بیارہوا۔ ابر ۲۰۔ جون ۱۵۲۷ء کو اس کا انتقال ہوا۔ ۱۵۰۲ء میں میکیا ویلی نے شادی کی تھی۔ وہ چھ بچوں کا باپ تھا۔

وہ صاحب طرز ادیب تھا۔ اس نے خاص تحقیقی کام بھی کیے۔ اطالوی زبان پر اس کا مطالعہ اور اس کے متعدد طریقہ ڈرامے اس کی شخصیت کے اس پہلو کو سامنے لیتے ہیں۔ جنہیں عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ میکیا ویلی کے ڈراموں کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ ان ڈراموں نے اطالوی سٹیج میں نئی زندگی اور توانائی پیدا کی۔

نظریات و افکار

میکیا ویلی کو اس کی جس کتاب کی وجہ سے عالمگیر شہرت یا رسوائی حاصل ہوئی۔ اس کا نام "پرنس" ہے۔ اس کا اصل اور پورا نام (DE PRINCI PUTIBUS) ہے۔ اس کتاب

کا موضوع بادشاہ اور حکمران کی حکمرانی کے قواعد کی تعلیم ہے۔

میکیا دلی نے جس زمانے میں یہ کتاب لکھی۔ اسے مغربی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ریاست کا ایک غیر جانب دارانہ اور غیر مذہبی تصور پیش کیا گیا ہے۔ یعنی حکومت کے فیصلوں اور تدابیر کا یہی کو مذہب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ نظریہ اس لحاظ سے مفرد ہے کہ اس سے پہلے سیاسی امور اور حکمرانی میں مذہبی عناصر اور مذہب اہم ترین کردار ادا کرتا تھا۔ اس زمانے میں یہ تصور پیش ہوا کہ ریاست اور حکومت کے فیصلے خالص سیاسی انداز میں کیے جانے چاہئیں۔ گویا ریاست بھی ایک آرٹ ہے۔ لیک سائنس ہے۔

اس نظریے کے حوالے سے سب سے زیادہ شہرت اور رسوائی میکیا دلی کو حاصل ہوئی اور اس کے نظریات و افکار کے اثرات تب سے اب تک دنیا کی سیاست و حکمرانی پر واضح انداز میں مرتب ہوئے۔

پرنس کی اشاعت میکیا دلی کی زندگی میں ممکن نہ ہو سکی۔ نہ ہی اس دور کی حکومت نے ہی اس کی اشاعت میں کوئی دلچسپی لی۔ ۱۵۳۲ء میں یعنی میکیا دلی کی موت کے پانچ برس بعد پرنس پہلی بار طبع ہوئی۔ اس نے اشاعت کے ساتھ ہی غیر معمولی کامیابی اور مقبولیت حاصل کر لی۔ آنے والے پندرہ برسوں میں میکیا دلی پر تنقید و تعریف کا بازار گرم ہوا تب سے آج تک اس کو اس کتاب کے حوالے سے مطعون کیا جاتا ہے۔ اس دور کے مذہبی حلقوں نے اسے شیطان کا نام دیا۔ ان گنت لوگوں نے ہر دور میں میکیا دلی اور پرنس کے خلاف کلمہ کرنا شروع کیا۔

ہزار اختلافات کے باوجود بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میکیا دلی ہی ہے جس نے سیاست کو آرٹ کا درجہ دیا۔ جو ریاست کو سائنس بنانے کا خالق ہے۔ اس نے اس کتاب کے ذریعے گویا ایک نیا دروازہ سیاست کی دنیا میں کھول دیا۔ اس نے سیاست سے اخلاقیات اور مذہب کو خارج کر دیا۔ وہ ایک غیر مذہبی اور لادینی ریاست کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس نے حکمرانی کے لیے جو اصول پیش کیے اور جو درس دیا وہ اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ نفرت اور قابلِ اعتراض کیوں نہ ہو۔ اس کا یہ بہر حال ایک کارنامہ ہے کہ اس نے یہ اصول

ہمیں دیا کہ سیاست کو خالص سیاسی معیار پر چھنا اور پرکھنا چاہیے۔ اس نے سیاست کو معروضیت سے ہٹا کر دیا۔

میکیا دلی کے نظریات و افکار کے نظام کو سمجھنے کے لیے اس کی ایک کتاب — (DISCOURSERS) کا مطالعہ بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب لیوی جیسے مورخ کی تصنیف "تاریخ کا تجزیہ اور تشریح ہے۔"

"پرنس" ایک نظر میں

ذیل میں "پرنس" کی تلخیص دی جا رہی ہے۔ یوں تو اس تلخیص میں میکیا دلی کی پوری کتاب کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم "پرنس" کے چھٹے، ساتویں، آٹھویں، نویں، پندرہویں، سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں ابواب کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے جو اس کتاب کی پوری روح کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

میکیا دلی بتاتا ہے کہ ایک ریاست کے قیام اور اس کے استحکام اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح کے ذرائع کو استعمال کرنا چاہیے۔ خواہ وہ کتنے ہی ظالمانہ، کھردرے اور پُر فریب کیوں نہ ہوں۔ ایک حکمران جو ظلم و فریب کاری کو اپناتا ہے وہ اس کا پورا مجاز ہے۔ رعایا اور عوام کی شتر پسندی اور دھوکہ دہی کے مقابلے میں حکمران کی فریب کاری اور جعل سازی افضل ٹھہرتی ہے۔ اقتدار کی بجالی کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ درست ہے اور حکمران کو اس کا حق حاصل ہے۔

میکیا دلی کا خیال ہے کہ انسانی فطرت پوری تاریخ میں ہمیں کسی بڑی تبدیلی کے بغیر دکھائی دیتی ہے۔ یہ فطرت ناقابل تبدیل ہے۔ صرف تاریخی واقعات و امکانات ہی اپنے آپ کو دہراتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ماضی کی تاریخ کو سامنے رکھ کر حکمرانی کے اصول وضع کریں۔ جب میکیا دلی تاریخ کی مثال دیتا ہے۔ جب وہ تاریخ کے زعماء کو پیش کرتا ہے تو وہ ماضی میں پلٹ کر قدیم یونانی عہد کو مثال نہیں بناتا بلکہ قدیم روم کو وہ کہتا ہے کہ ہمیں رومیوں کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔"

میکیا دلی کتا ہے کہ شر اور بدی کے ذرائع کو استعمال کر کے بعض اوقات اچھے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑی "مدلل" بحث کرتا ہے۔

میکیا دلی ظلم، دھوکہ دہی، تشدد، فریب کاری، وعدہ خلافی اور طاقت کے بے مہابا استعمال کو جائز قرار دیتا ہے وہ ایسے تمام اعمال کا تحفظ بھی کرتا ہے۔

میکیا دلی کے نزدیک بڑائی یا اچھائی۔ دونوں چیزیں سیاسی کامیابی اور حکمرانی کے لیے بے معنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل چیز اقتدار ہے۔ جسے ہر طرح سے قائم رکھنے کا حکمران کو حق حاصل ہے۔

یہ ایک عجیب حقیقت یا تضاد ہے کہ میکیا دلی آمریت یا بادشاہت کے مقابلے میں بری پبلک کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن پھر خود ہی وہ کہتا ہے کہ یہ اس کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔ جس کی کوئی مستند اور محسوس حقیقت اور بنیاد نہیں ملتی۔

میکیا دلی کو ان کے روحانی اور مذہبی مسائل سے مطلق کوئی دل چسپی نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ ایک بادشاہ یا حکمران کے لیے مذہبی آدمی ہونا ضروری نہیں لیکن اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو دھوکا دے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ مذہبی آدمی ہے۔ وہ مذہبی استحصال کو اقتدار قائم کرنے اور مستحکم بنانے کا ایک طاقتور وسیلہ بتاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح عوام کو دھوکا دے کر اقتدار کو مشکلات سے بچایا جاسکتا ہے اور فوج کے سپاہیوں کے عزم کو مذہبی حوالے سے مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔

وہ ایک قدیم زمانے کے راہب کا حوالہ دیتا ہے کہ وہ سیاست میں اس لیے کامیاب نہ ہوا کہ وہ جھوٹا، دوغلا یا ظاہری مذہبی انسان تھا۔ بلکہ وہ اس لیے کامیاب نہ ہوا کہ وہ اپنی مذہبیت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر عوام کو بے وقوف نہ بنا سکا۔

کلیسیا کے بارے میں میکیا دلی کا طرز فکر بڑا تلخ اور غصیلیا ہے۔ وہ کلیسیا کو قدیم رومی سلطنت کے زوال کا سبب قرار دیتا ہے۔ بتاتا ہے کہ کلیسیا انسان میں تمذیل و اہانت کے جذبات کو قوی کرتا ہے۔

میکیاولی ایک طاقتور فوج کے وجود کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ پرنس اور ڈسکورسنر دونوں میں وہ طاقتور فوج کے قیام اور ادائے کو اقتدار کے لیے سب سے بڑی طاقت قرار دیتا ہے۔ وہ قومی پیشگی ضرورت پر بھی زور دیتا ہے۔

میکیاولی لکھتا ہے:

وہ لوگ جو اپنی صلاحیتوں سے بادشاہ یا حکمران بنتے ہیں وہ یہ اقتدار اور اختیارات بڑی دشواری سے حاصل کرتے ہیں لیکن اسے آسانی سے کھو دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیارات کو مستحکم بنانے کے لیے جو نئی پالیسیاں اور قواعد متعارف کراتے ہیں وہی ان کی ناکامی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں اپنے اختیار کو جاری اور سجال رکھنے سے زیادہ مشکل اور دشوار کام کوئی اور نہیں ہے۔ نئی نئی چیزوں کو متعارف کرانا کامیابی کے لیے بے حد مشکوک اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو بادشاہ یا حکمران صرف اصلاح چاہتا ہے وہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد بڑھالیتا اور اپنے لیے خطرات پیدا کر لیتا ہے۔ یہ مخالفت اور دشمنی اس نئے نظام اور اقتدار سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایسے قانون پیدا ہو جاتے ہیں جو انہی لوگوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی فطرت میں ہے کہ وہ کسی بھی نئی چیز کو بہت مشکل سے قبول اور تسلیم کرتی ہے جب تک لوگوں کو خود اس کا ذاتی تجربہ نہ ہو جائے اس وقت تک ان میں ایک قوت مدافعت باقی رہتی ہے یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ ایسی نئی چیزوں کے حوالے سے حکمران یا بادشاہ کی حمایت یا تائید کرتے ہیں۔ وہ بھی نیم دلی سے کرتے ہیں۔ اس لیے بادشاہ یا حکمران کو ان پر نگہ بڑھ کرنا چاہیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکمران یا بادشاہ اپنے اوپر تکیہ کرے اور پوری طاقت کا استعمال کرے اس طرح خطرات کم ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ تمام پیمبر جو مسیح تھے وہ کامیاب ہوئے اور جو غیر مسیح تھے وہ ناکام۔ لوگوں کے کردار اور نفسیات میں تنوع اور تضاد ہوتا ہے۔ انہیں کسی چیز کے لیے راغب تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس ترغیب کو تا دیر برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لیے یہ

لازم و ناگزیر پٹھرا کہ جب وہ اس ترغیب کے شکیبے کو نرم کرنے لگیں تو پھر بے دریغ طاقت کے استعمال سے ان کو جکڑ دیا جائے۔

موسیٰ، سائرس اعظم، تھیوسس اور دوسرے جیسے عظیم حکمران تا دیر اس لیے کامیابی سے حکومت کرتے رہے کہ وہ طاقت کے بے دریغ استعمال کا گڑ جانتے تھے۔

کوئی حکمران یا بادشاہ صرف اپنی ذاتی غزبیوں اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے اقتدار اور اختیار کو قائم نہیں رکھتا طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔

وہ لوگ جو قسمت اور دوسروں کے بازوؤں کے بل بوتے پر سیزر بولرگیا کی طرح اختیار و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کو اسی طرح جرات مندی اور بے باکی سے اپنے اقتدار کو طاقت کے بل بوتے پر قائم رکھنا چاہیے۔ اقتدار اور اختیار کے حصول کے لیے طاقت کا استعمال اور فریب کا حربہ اختیار کرنا چاہیے۔

بادشاہ یا حکمران کو طاقت کے ذریعے کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ اور ان سب کو تباہ اور نیست و نابود کر دینا چاہیے جو اسے نقصان پہنچا سکتے ہوں۔ اسے قدیم رسم و رواج اور روایات کو پھر سے زندہ کرنا چاہیے۔ اسے بیک وقت نرم اور ظالم سنگدل اور آزاد خیال بن کر سامنے آنا چاہیے۔

وہ جو اقتدار اور اختیار حاصل کرتا ہے اسے چاہیے کہ اسے ایک ہی وقت میں تمام مظالم اور سختیوں کو فی الفور راج کر دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ایک ایک کر کے دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ایک ایک کر کے ایسے اقدام کے جائیں۔ کیونکہ بیک وقت اور فوری سختیوں اور مظالم کو روانہ رکھا گیا تو لوگوں کو مطیع کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور ان کے دلوں میں اس کا ان مرٹ اور گمراہی پیدا نہ ہو سکے گا۔ عوام کو مطیع بنانے کے لیے تمام بے انصافیاں اور مظالم ایک ساتھ شروع کر دیں۔ تاکہ وہ سنبھل ہی نہ سکیں۔ لوگوں کی سہولتوں اور بہبود کا سلسلہ قسطوں میں مکمل ہونا چاہیے۔ ان پر ایک دم تمام تر رعایتوں اور سہولتوں کو پنچا اور نہیں کرنا چاہیے۔ ان سہولتوں کی مقدار قلیل ہونی چاہیے تاکہ لوگ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اُمدوز ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ایک بادشاہ یا حکمران کو اپنی رہنمائی میں اس طرح اپنی زندگی بسر کرنی چاہیے کہ ہر قسمتی یا خوش قسمتی کا کوئی ذائقہ یا حادثہ اس کے

اختیار کی قوت کو کم نہ کر سکے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ بد قسمتی کے زمانے میں ہمیشہ حکمرانوں کی گئی اچھی اصلاحات اور نیکیاں ان کے کام نہیں آتی ہیں۔ بلکہ ان کی سختیاں ان کے اختیار کو قوت بخشتی ہیں۔

وہ بادشاہ یا حکمران جو اقتدار معززین اور شرفاء کے تعاون سے حاصل کرتا ہے اسے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں اس حکمران کے مقابلے میں زیادہ وقتیں پیش آئیں گی جس نے اختیار اور اقتدار عوام کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ یہ شرفاء اور معززین جو اس کے حامی ہوں گے وہ اپنے آپ کو اس کے مساوی سمجھیں گے اس لیے ان پر حکم چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ حکمران جو عوامی تائید سے اختیار حاصل کرتا ہے وہ اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لیے حکمران کو بیچ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اسے دونوں طبقوں کی طاقت سے فائدہ اٹھا کر ان پر سرجرہ استعمال کر کے اپنا اختیار برقرار رکھنا چاہیے۔ اشرافیہ اور معززین کا طبقہ بہت چالاک اور دور رس ہوتا ہے۔ اس پر مطلق اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ ان گنت عوام کو احسن اور مطیع بنانا آسان ہے۔ لیکن چند امراء اور شرفاء کو دھوکا دینا مشکل ہوتا ہے۔

ایک ایسا حکمران جو ہر کام اور تمام امور میں اچھالی چاہتا ہے۔ وہ ناکام ہوگا۔ کیونکہ اس کا سابقہ ان گنت ایسے عوام سے پڑتا ہے جو سارے اچھے نہیں ہوتے۔ اس لیے نیکی اور اچھالی کا وسیلہ اختیار کرنا خود اس کے لیے تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک ایسے حکمران یا بادشاہ کے لیے جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے یہ جاننا اور بھی ضروری ہے کہ کس طرح اچھالی کی راہ ترک کی جاسکتی ہے اور اس علم کو اسے استعمال بھی کرنا چاہیے۔

”میں جانتا ہوں کہ ہر شخص اس کی تائید کرے گا کہ مہنتی بھی عذریاں ہو سکتی ہیں وہ ایک حکمران میں مجتمع ہو جائیں۔ لیکن چونکہ ایسا ممکن نہیں کہ تمام عذریاں جن کا شروہ ہے وہ ایک شخص میں جمع ہو جائیں۔ کیونکہ انسانی فطرت اس استعداد سے محروم ہے۔ اس لیے ایک حکمران کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جو برائیاں ہیں اور جن کو رسوا کیا جاسکتا ہے۔ انہیں چھپا کر رکھے۔ ان کو کبھی ظاہر نہ ہونے دے۔ لیکن طاقت، دبدبہ، اختیار، سخت گیرئی اور بعض ایسی ”گتہ عذریاں“ یا برائیاں ہیں جن کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان کی تشہیر میں کوئی غامی نہیں۔ اس طرح عوام کے دلوں میں اس کا خوف اٹھتا ہو جاتا ہے۔

ایک حکمران کے لیے جو چیز سب سے اہم ہے اور جس سے اسے بچنا چاہیے۔ وہ ہے لوگوں کی نفرت۔ قابل نفرت ہونے سے بہتر ہے کہ لوگوں کے لیے اپنے آپ کو خوفناک بنایا جائے اگر کسی شخص کو کوجس کہا جاتا ہے تو لوگ اسے بُرا سمجھتے ہیں لیکن اس سے نفرت نہیں کرتے اسی طرح حکمران سے اگر لوگ خوفزدہ ہوں تو یہ اس کے لیے بہتر ہے کہ لوگ اسے قابل نفرت سمجھتے ہوں۔ یہاں خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں پسندیدہ یا محبوب بننا بہتر ہے۔ یا لوگوں کے دلوں پر اپنے خوف کو مسلط کرنا کسی حکمران کے لیے بہتر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک حکمران ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس سے محبت کریں اور خوف بھی لکھائیں۔ لیکن چونکہ ان دونوں کی یکجائی عموماً ناممکن ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ حکمران سے لوگ خوفزدہ رہیں۔ جب تک حکمران کا خوف اس کے لوگوں کے دلوں پر قائم رہتا ہے اس کا اختیار اور اقتدار مستحکم رہتا ہے۔ وہ اس خوف کی بدولت اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ انسان بنیادی طور پر ناشکرا اور غلط کار ہے۔ وہ اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرے تو خطرے کو ٹالنے کے لیے وہ اپنا خون، اپنا مال و اسباب حتیٰ کہ اپنی جان بھی دے سکتا ہے اور خود کو خطرے سے بچانے کے لیے اپنے بچوں کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ یہ انسانوں کی فطرت ہے کہ وہ اپنے اندر بغاوت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ بغاوت کے اس جذبے کو سختی سے کچل دینا چاہیے۔ عنایات اور داد و دہش سے حاصل کردہ وفاداریاں اور دوستیاں ناپائیدار ہوتی ہیں۔ ان کو دوسرا بھی خرید سکتا ہے۔ جو حکمران اپنے جی اُپر ہل کی باتوں پر یقین کرتا اور دوسری تیاریاں نہیں کرتا۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

”محبت۔ تشکر اور احسان کے جذبوں کی زنجیریں بندھی ہوتی ہے چونکہ انسان خود غرض واقع ہوا ہے۔ اس لیے وہ اس زنجیر کو توڑ دیتا ہے لیکن خوف ایک ایسا جذبہ ہے جو قومی ہوتا ہے۔ خوفزدہ آدمی سزا سے ڈرتا ہے اور وہ خوف کی وجہ سے مایوس رہتا ہے۔“

ایک بادشاہ اور حکمران کو چاہیے کہ وہ ایسا رویہ اختیار کرے کہ لوگ اس سے خوف بھی لکھائیں اور اس سے نفرت بھی نہ کریں۔ نفرت کے بغیر خوف کا تسلط ایک قابل عمل اور پائیدار چیز ہے۔ ایک ایسا حکمران جو اپنی رعایا کی جاگیر اور ملکیت میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ وہ اس نفرت سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن اس کا خوف دلوں پر مسلط رہتا ہے۔ دشمن کو ہلاک کر دینا

بستر ہے لیکن اس کی جائیداد کو ضبط کرنا نقصان دہ ہے۔ کیونکہ لوگ اپنے باپ کے قتل کو نظر انداز کر دیتے ہیں، بھول جاتے ہیں لیکن جائیداد کی ضبطگی کا دکھ کبھی دل سے نہیں نکلتا۔ اور نفرت کا سبب بنتا ہے۔

”ایک بادشاہ یا حکمران کو کس حد تک ایماندار اور دیندار ہونا چاہیے؟ ہمارے زمانے نے ثابت کر دیا ہے کہ انہی حکمرانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ اقتدار پر قابض رہے۔ جو صاحب ایمان نہ تھے۔“

”لڑائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک قانونی۔ دوسرا طاقت۔ پہلا راستہ انسانوں کا ہے اور دوسرا زندگیوں کا لیکن چونکہ پہلے طریقے کو اپنا کر کبھی مشکل کامیابی حاصل نہیں ہوتی اس لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے حکمرانوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بیک وقت کس طرح انسان اور زندگی کی خصوصیات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں دونوں خصوصیات حکمرانی کے اہل لوگوں کو سکھائی جاتی تھیں۔ اور قدیم زمانے کے مصنفین یہ فریضہ انجام دیتے تھے جس کی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ یہ کوئی رنسی یا نادربات نہیں ہے۔ ایک حکمران کے لیے یہ جاننا اور سیکھنا لازمی ہے کہ کس طرح انسان اور زندگی کی فطرت کو یکساں کیا جاسکتا ہے۔ اور جس میں کسی ایک کی کمی ہوگی وہ ناپائیدار اختیار کا مالک ہوگا۔“

”ایک حکمران کو اپنے اندر شیر اور لومڑی کی خصوصیات یکساں کرنی چاہئیں۔ کیونکہ شیر اپنے آپ کو کبھی بھندوں اور جالوں سے محفوظ رکھنے کا نہیں جانتا۔ جبکہ لومڑی اپنا تحفظ بھیر لویوں سے نہیں کر سکتی۔ اس لیے ایک حکمران لومڑی کی یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ بھندوں اور سازشوں کو بھانپ سکے اور دوسری خوبی حکمران میں شیر کی ہونی چاہیے کہ وہ بھیر لویوں کو خوفزدہ کر سکے۔ وہ حکمران جو صرف اپنے آپ کو شیر بنانا چاہتے ہیں وہ محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لومڑی کی چالاکی اور فریب کاری بھی ضروری ہے۔ اس لیے ایک بادشاہ کے لیے اس وقت صاحب ایمان۔ ثابت ہونا ضروری نہیں کہ جب مذہب اور دینداری اس کے مفاد میں نہ جاتی ہو۔ لیکن اگر دینداری اور ایمان کا ڈھونگ اس کے مفاد میں ہو تو اس سے ظاہر کرنا چاہیے۔“

”وہ حکمران کبھی صاحب اختیار اور اقتدار نہیں رہ سکتا جو خودیہ اغراض ان کرنے لگے کہ اس

نے اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ وعدے سے انحراف اور وعدہ شکنی اختیار کے مفاد میں ہے تو اس کے اعتراف کی ضرورت نہیں۔ حکمران کو اپنے اصل ارادوں اور عوام کو چھپا کر رکھنا چاہیے۔ عوام ان سب بات سیدھے اور سادھے ہوتے ہیں وہ آسانی سے فریب کھا جاتے ہیں اور جب تک حکمران جو بصورتی اور سلیقے سے ان کو فریب دیتا رہے گا۔ وہ فریب کھاتے رہیں گے۔ حکمران کو چاہیے کہ وہ مذہب، انسانی وقار، ایمان و اعتقاد اور انسانیت کے خلاف اپنی زبان سے کوئی لفظ نہ نکالے۔ اسے یوں ظاہر کرنا چاہیے کہ وہ سراپا عفور رحم ہے۔ عفور رحم کا پیکر دکھائی دینا بے حد ضروری ہے۔ عوام کی اکثریت صرف دیکھتی ہے۔ صرف ظاہر تک ہی پہنچ سکتی ہے۔ وہ چھپو کر محسوس نہیں کر سکتی۔ اس لیے ظاہر مکمل ہونا چاہیے۔ اکثریت حکمران کو اس کے ظاہر کی وجہ سے اپناتی ہے۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ اصلیت کیا ہے؟

پرنس "کایر خالق میکاؤلی۔ جو اپنی ان تعلیمات اور نظریات کی وجہ سے شیطان قرار پایا۔ اس کے بارے میں آخری دو باتیں۔ وہ سچا محب وطن اور اٹلی کی آزادی کی تڑپ اس کے دل میں تھی۔ اور آخری بات۔

کیا جو نظریات اس نے اقتدار، اختیار اور حکمرانی کے لیے پیش کیے۔ کیا ان کو قابلِ نفرت اور گھناؤنا سمجھنے کے باوجود۔ دنیا کے بیشتر سیاست دان اور حکمران۔ ان ہی پر عمل نہیں کرتے؟؟؟

معائنہ عمرانی

انسان آزاد پندیا ہوا تھا۔ لیکن دیکھو آج وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے۔ روسو کے اس جملے اور نظریات کی گونج ساری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ اس کے افکار و نظریات پر صدیوں سے بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ انسانوں کی کتنی ہی نسلوں کے اذہان، فکر و عمل، تصورات و نظریات کو روسو نے متاثر کیا ہے۔

اسے اپنے دور میں ہی اپنے نظریات کی وجہ سے تصنیفیک و طعن کا نشانہ بننا پڑا حکومت اور مذہب کے اجارہ داروں کی تنقید اور تعزیر کا سلسلہ جاری رہا اور آج بھی اس کے خیالات و افکار کو قبول اور رد کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

وہ سچا اور کھرا ہے۔ آج کے آزادانہ اور کھلے ڈھلے بے باک معاشروں میں بھی بہت کم لوگوں کو یہ جرأت حاصل ہے کہ وہ روسو کی طرح اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں سے پردہ اٹھا لگیں۔ اس کی خود نوشت 'اعترافات' (CONFESSIONS) کو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔
 اس نے ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین پر وٹسٹنٹ تھے۔ روسو کی ماں اسے جنم دے کر مر گئی۔ اس کا باپ اسے دس سال کی عمر میں کچھ عزیزوں کے حوالے کر کے فرار ہو گیا۔ پھر باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہو سکی۔ روسو نے اپنی زندگی میں کسی کام کیے۔ اس نے جی بھر کر ادارہ گردی کی۔ چھوٹے موٹے کام اور ملازمتیں کرتا ہے۔
 کسی خواہش میں نے اسے اپنی سرپرستی میں لیا اور کی کفالت کرتی رہیں۔

۱۷۴۱ء میں وہ پیرس میں رہنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ موسیقی سزیر کر کے

ایک نئے نظام کے تحت روزگما سکے گا۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ اسے یہ بھی شرف حاصل رہا ہے کہ دالٹیئر کی اجازت سے لونی پانزدہم کے دربار میں دالٹیئر کے ڈرامے پیش کرنے کے لیے ان کو اپنے انداز میں لکھتا رہا۔ وہ اس دور کے فرانس کے عظیم دانشوروں اور لکھنے والوں کا دستِ ممتا۔ ۱۷۶۹ء میں اس کی کتاب *DISCOURSES ON ARTS AND SCIENCES* شائع ہوئی۔ جس میں اس نے بڑے خیلبانہ لہجے میں تمام فنونِ سائنس اور کلچر کو مسترد کر کے انہیں سماجی کرپشن کا سبب قرار دیا۔ ۱۷۵۳ء میں اس نے ایک آپیرا لکھا جو دربار میں پیش ہوا۔ روسو کا تعلق دربار قائم ہو گیا۔ اسی برس اس کی کتاب *عدم مسادات کا سرچشمہ* شائع ہوئی اور ایک مفکر اور سنجیدہ لکھنے والی حیثیت سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ ۱۷۶۲ء میں اس کی عظیم کتاب "سوشل کانٹریکٹ" (*SOCIAL CONTRACT*) شائع جس نے اسے عالمگیر اور ابدی شہرت سے ہمکنار کیا ہے۔

روسو کو جینیوا کے باشندوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان کو خاص صفات کا حامل سمجھتا تھا لیکن جب اس کا ناول (*EMILE*) شائع ہوا اور اہل جینیوا نے اسے پسند نہ کیا تو اس نے سٹی کونسل پر شدید حملے کیے۔ اس کی تصنیف "لیٹرز فرام دی مونٹین" (*LETTERS FROM THE MOUNTAIN*) اس کی ناصحی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ روسو کو اپنے افکار کی وجہ سے حکمرانوں اور چرچ کے اجارہ داروں کی مخالفت کا کئی بار سامنا کرنا پڑا۔ اس نے برطانوی فلسفی ہوم کی دعوت پر کلچر عرصہ برطانیہ میں گزارا۔ تاکہ عقاب کا زمانہ گزر جائے۔ اپنے *CONFESIONS* اس نے برطانیہ میں اپنے قیام کی اٹھارہ ماہ کی مدت میں ہی مکمل کیے۔

روسو بڑا بشکی مزاج تھا۔ اس لیے ہر کسی سے جھگڑا بیٹھا۔ اس نے اپنے نسکی مزاج اور جھگڑا لوہن سے بھی اپنی زندگی کو خاصا بے چین اور نا آسودہ بنایا۔ وہ اپنے خیالات اور افکار کے مطابق خود بھی سادہ زندگی گزارتا رہا۔ اور جنسی تعلقات کے سلسلے میں بھی بہت آزاد تھا۔ اس کی کئی محبوباؤں سے بچے پیدا ہوئے۔ جن کی نگہداشت اور پرورش کی ذمہ داری روسو نے کبھی قبول نہ کی۔ ۱۷۶۷ء میں وہ فرانس واپس آیا۔ خود جلا وطنی کا زمانہ گزارنے کے

بعد وہ فرانس آیا تو اس کی ذہنی حالت خاصی ابتر تھی۔ اس نے فرانس آکر مراد اور پرنس ڈمی کونٹی کے ہاں پناہ لی۔ ۱۷۷۰ء میں وہ پیرس واپس آیا۔ ایسی حرکات کرنے لگا جو اس کی ذہنی اور دماغی بیماریوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ وہ کچھ عرصہ ہسپتال میں بھی رہا۔ پھر مارا نریل میں ایک جھونپڑے میں رہنے لگا۔ جہاں اچانک ۲ جولائی ۱۷۷۶ء کو اس کا انتقال ہوا اس کی موت جس انداز میں ہوئی۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ روسو نے خودکشی کی تھی۔ اسے ایک جزیرے میں دفن کیا گیا۔ ۱۶ برس کے بعد اس کی لاش کو فرانس کے عظیم آدمیوں کے قبرستان میں دوبارہ دفن کیا گیا۔

روسو، شخص، انکار اور معاہدہ عمرانی

روسو سے پہلے لاک اور ہیوم جیسے عظیم فلسفی بھی معاہدہ عمرانی پر اپنی کتابیں لکھ کر اپنے انکار و نظریات کا انہماک رکھ چکے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات و انکار بھی قابل فکد اور فکر انگیز ہیں۔ لیکن — روسو حقیقی معنوں میں پہلا عظیم اور جدید سیاسی فلسفی ہے۔ یہ کوئی ایسا دعوے نہیں جس میں مبالغہ شامل ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ اس کے سیاسی نظریات کا اثر اتنا ہمہ گیر اور دور رس ہے کہ اس کے بعد جتنے بھی فلسفی آئے ہیں وہ سیاسی اور عمرانی موضوعات پر اس سے استفادہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ روسو۔ وہ فلسفی ہے جس کا موجودہ دور کے انکار پر سب سے زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔

روسو کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کا سمجھنا بے حد ضروری۔ کیونکہ روسو کا فلسفہ بے حد ذاتی ہے۔ وہ شخص آزادی اور اجتماعی آزادی پر اصرار کرتا ہے۔ یہ اس کا وہ عقیدہ ہے۔ جس پر وہ بہت آتش بیانی اور جذباتیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ روسو خود بہت جذباتی مشعل مزاج، مخلص اور حساس انسان تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس کا اسے بہت شدت سے احساس تھا کہ انسان فطرت میں گر چکا ہے۔ انسانی مداخلتوں اور مخصوص اسباب نے آدمی سے اس کی آدمیت چھین لی ہے۔ اس کی روح کو تباہ کر دیا ہے وہ انفرادیت اور انفرادی آزادی کا بہت قائل ہے۔ وہ بے انصافی کا شدید احساس رکھتا تھا

اس کی شخصیت کے بعض تضادات بھی اس کے فلسفے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ روسو نے اپنی زندگی کے کچھ برس دولت مند عورتوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہر طرح کی آسودگی سے سبک دیا۔ لیکن وہ فرانس کے شاہی دربار سے کوئی بھی تعلق رکھنے سے صاف کتراتا اور انکار کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب اس کا آپر اور بار میں پیش ہوا اور بادشاہ نے اسے دربار میں پیشی کا حکم دیا۔ تو روسو نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

روسو کی شخصیت کا یہ تضاد بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے نبی نوح انسان سے شدید محبت تھی۔ لیکن اس نے اپنے ہر دوست سے جھگڑا لیا وہ انسانوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ اس کے افکار اور شخصیت پر اس کی زندگی میں حملے ہوتے رہے۔ والٹیئر نے اسے ریگیدا۔ ویڈرو نے اسے خوب کوسا ہے۔ اس کے باوجود اس کے افکار کی چمک دمک سے کوئی بھی آنکھیں نہ چرا سکا۔ مادام ڈی سٹیل نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔ "اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی لیکن ہر چیز میں آگ لگادی۔"

یہ روسو ہی تھا۔ جس کے معیار اور نصب العین اتنے شدید تھے اور خود اتنے شدید اور انوکھے مزاج کا مالک تھا کہ میری انٹرمینٹ ملکہ ہونے کے باوجود اپنے محل میں چرداری کا کردار ادا کیا کرتی تھی۔ کیونکہ روسو بدویت کا مداح اور پرچارک تھا۔ روسو کے ناول بالخصوص EMILE نے جس انداز میں فرانس کی فیشن ایبل خواتین کو متاثر کیا ہے اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں لیکن اتنا لکنا کافی ہے کہ جو جدید تہذیب میں رچے بے تھے۔ وہ روسو کے افکار کے ایسے امیر ہونے کی طرح سوچنے اور رویے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عیش و عشرت دولت کچھ کی جس طرح روسو نے مذمت کی ہے وہ اس کے شدید ترین جذباتی ردیوں کی ترجمانی کرتا ہے وہ سادگی، فطری رویوں اور بے تکلف، آزاد زندگی کا پرچار کرتا ہے۔ اس کے ان افکار و نظریات نے ان پر بھی اثر ڈالا جو اس کے موید ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ جنہوں نے اس کے ان افکار و نظریات کی مخالفت کی۔ وہ بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ روسو کے بعد آنے والے فلسفیوں اور سیاسی مفکروں کو اس کے افکار و نظریات ایسے درتے کی صورت میں ملے ہیں جسے قبول کرنے

سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ سادگی، جمہوریت، آزادی، عالمی امن، انفرادی آزادی، رومانویت، حب الوطنی کا بھی نمائندہ ہے۔ اور اسے مطلق العنان آمرانہ جمہوریت کا پیغمبر بھی سمجھا جاتا ہے۔

روسو — شدید نظریات و افکار کا مالک ہے۔ وہ تمام ملکیتوں کو خالصتاً قرار دیتا ہے۔ دو دولت کو جرم کی پیداوار کہتا ہے۔ تمام حکومتوں کو ظالم سمجھتا ہے۔ تمام سماجی قوانین کو بے انصافی قرار دیتا ہے۔

یہ روسو ہی ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ شخص بنی نوع انسان کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جس نے ایک حلقہ زمین کے لئے درگزر حصار باندھ کر کہا کہ یہ میری زمین ہے۔ بعض فلسفیوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ اپنے افکار کے ساتھ جس انداز سے وہ زندہ رہا اور جس انداز سے وہ اپنے افکار میں خودیقین رکھتا تھا۔

اور جس انداز سے وہ اپنے افکار کو پیش کرتا ہے اس کے حوالے سے وہ نئے دور کا انقلابی ہے! روسو اخلاقیات کی فطری حیثیت، آزادی کی تعریف اور اس کی ضرورت، زندگی کا صحیح تصور، تعلیم کا صحیح نظام اور فطرت کی طرف واپسی کے امکان اور ضرورت۔ جیسے اہم مسائل پر اپنے افکار کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ ایک نئے معاشرے کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو انسان کی فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہو اور انسان کی فطرت کو زندہ رکھتا ہو۔ وہ صحیح حکمرانی کی ضرورت کا شدید احساس دلاتا ہے۔ وہ ایسی حکومت چاہتا ہے جہاں ایک آدمی مؤثر ترین انداز سے سیاسی زندگی میں حصہ لے سکے اور اس پر اثر انداز ہو سکے۔

۱۷۶۲ء میں اس کی عظیم کتاب "سوشل کانٹریکٹ" (معاہدہ عمرانی) شائع ہوئی۔

اس میں اس نے GENERAL WILL کا تصور پیش کر کے سیاسی فکر میں بیش بہا اضافہ کیا۔ جسے وہ جائز اور درست اختیار و قوت کا صحیح سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ اس نظریے میں وہ ایک ایسے قانون ساز کو دریافت کرتا ہے جو ایک سیاسی نظام کو صحیح ضرورت کا احساس دلا سکے روسو ایک "شہری مذہب" پر زور دیتا ہے۔ جو انسانوں کو ایک عقیدے میں منسلک

رکھے۔ اور ایب نظام تعلیم بھی دیتا ہے جو اچھے شہری پیدا کرنے کے علاوہ ان کو محب وطن بھی بنا سکے۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اپنے ان نظریات کی وجہ سے وہ آج کے دور میں بھی تنقید و تخریض کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔ جس سے صحت عیاں ہے کہ اس کے افکار زندہ ہیں۔ متاثر کرتے ہیں۔ اور ان کو پوری اہمیت معنی یا مثبت دی جا رہی ہے۔

ذاتی طور پر فلسفے اور روسو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے روسو کے ایسے تصورات سے شدید اختلاف ہے۔ جس میں وہ یہ اصرار کرتا ہوا ملتا ہے کہ اگر ایک فرد کا مفاد جنرل دل کے مفاد سے بالکل مختلف اور آزادانہ ہے تو اسے مجبور کیا جائے کہ وہ عمومی ارادے کی مطابقت کرے۔ روسو جنرل دل سے پیدا ہونے والے اظہار اور فیصلے کو ہر حال میں منصفانہ قرار دیتا ہے۔

اس اختلاف کے باوجود روسو کی فکری عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ پہلا جدید سیاسی فلسفی ہے۔ وہ زیریں سطح پر کام کرنے والی مساوات کا قائل ہے۔ وہ ایک ایسے معاشی نظام کا جویا اور داعی ہے جو انسانوں کو مساوی کر دے۔ ایک سطح پر لاکھڑا کرنے ایک ایسا نظام اخلاق کا وہ تصور پیش کرتا ہے جو انسانوں میں مقصدیت کا احساس اور شعور پیدا کر دے۔ ایک ایسے سیاسی نظام کا تصور پیش کرتا ہے جہاں ہر فرد آزادانہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔

آزاد خیال مفکروں میں سب سے زیادہ اثرات روسو کے ہی نظریات کے ہیں۔ سوشل کانٹریکٹ و معاہدہ عمرانی کی اشاعت تھلکے خیز ثابت ہوئی۔ اسے ایسٹریٹیم میں پہلی بار شائع کیا گیا۔ کیونکہ روسو کو جوزف تھا کہ فرانسیسی حکومت کا عائدہ کر دہ سفیر اس کی فرانس میں اشاعت کی اجازت نہ دے گا۔ تب سے اب تک اس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر زبان میں بار بار اس کے تراجم ہوئے ہیں اور اردو میں بھی اس کا ایک دقیق ترجمہ موجود ہے۔ مترجم ڈاکٹر محمود حسین تھے۔

”معاہدہ عمرانی“ کی تلخیص

۔ مسئلہ ایک ایسی ہیئت کو دریافت کرنے کا ہے جو فرد کی ساری توانائی اور عقلانی کے ساتھ منسلک ہو اور جس کے حوالے سے ہر فرد کل کے ساتھ اشتراک و عمل کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کی متابعت نہ کر سکے۔ اور جس طرح وہ پہلے آزاد تھا۔ اسی طرح آزاد رہ سکے۔ یہ وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل روسو کا معاہدہ عمرانی پیش کرتا ہے۔

اس معاہدے کی شرائط کیا ہیں؟ ان سب کو ایک ہی شرط میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ فرد تمام تر حقوق سے معافیت اختیار کر کے ”کل“ میں شامل ہو جائے۔ اس طرح کوئی ایک دوسرے پر بوجھ بھی نہ بنے گا۔ کیونکہ سب اپنے حقوق کو سچ کر معاشرے کے مفاد میں متحد و یک جان ہو جائے ہیں۔ یہ اتحاد و اشتراک اتنا مکمل ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی بھی فرد دوسرے سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اس معاہدہ میں ایک فرد کو اپنا تمام کل کے حوالے کرنا ہے۔ گویا وہ کسی ایک کے سپرد اپنے آپ کو نہیں کرتا۔ یوں وہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے متبادل اور مساوی حاصل بھی کر سکتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے۔ اس کا وہ بہتر انداز میں تحفظ کر سکتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک اپنی ذات اور پوری توانائی کو اشتراک و اجتماعیت میں برقرار رکھنے میں شامل کرتا ہے۔ جو عمومی ادارہ (GENERAL WILL) سے حاصل ہوتی ہے اور اپنی ذاتی استعداد اشتراک کے طفیل۔ ہم میں سے ہر ایک۔ کل کا ایک ناقابل تقسیم جزو اور حصہ بن جاتا ہے۔

اس طرح اس معاہدے میں شریک ہر فریق کی انفرادی شخصیت۔ اس اشتراک سے ایک اخلاقی اور اجتماعی تجسیم کو جنم دیتی ہے۔ یہ اتنے ہی ارکان سے منظم و تجسیم ترتیب پاتی ہے جتنے کہ ایک سہلی کے دو درڑ۔ اس طرح وہ متحدہ ہوتے ہیں۔ ان کی شناخت ایک ہوتی ہے۔ ان کی زندگی اور ارادہ ایک ہوتا ہے۔ یہ عوامی فرد (PUBLIC PERSON) دوسرے تمام افراد کے ساتھ مل کر متحد ہو کر مدنیت۔ شہر کا نام پاتا ہے اور ری پبلک بنتا ہے

یا ایک سیاسی جسم اس کے ارکان اسے سیاست کا نام دیتے ہیں۔ جب وہ فعال ہوتا ہے تو حکمران کہلاتا ہے اور اس وقت طاقت بنتا ہے جب اس کا موازنہ دوسروں سے ہوتا ہے اور وہ جو اجتماعی طور پر اس معاہدے کے تحت مشترک و متحد ہوتے ہیں۔ شہری کہلاتے ہیں جیسے ایک خود مختار قوت کے تحت۔ رعایا کہلاتا ہے۔ یعنی وہ ریاست کے قوانین کے تابع ہوتے ہیں۔

اشتراک و تعاون کا یہ عمل پہلے اور افراد کے درمیان ایک باہمی سمجھوتہ ہوتا ہے اور ہر فرد اپنے آپ کے ساتھ ایک معاہدہ کرتے ہوئے دوسری صلاحیت اور استعداد میں بندھ جاتا ہے۔ قوت و حکمرانی کا رکن ہوتے ہوئے وہ افراد کے ساتھ بندھا ہوا ہے ریاست کا فرد ہونے کی حیثیت سے اقتدار و اختیار کے ساتھ ان کا معاہدہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے شہری حقوق میں آزاد ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ فرد انسان ہونے کی صورت میں ایک خاص ارادے کا ہی مالک ہو سکتا ہے جو عمومی اور اجتماعی ارادوں سے مختلف اور متضاد ہو سکتا ہے۔ اس کا اپنا خاص ارادہ۔ عمومی ارادے کے برعکس اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی مطلق اور فطری آزادی اسے یہ سمجھا سکتی ہے کہ اس کا ارادہ اس کی مرضی اور ارادہ دوسروں کے لیے کم نقصان دہ اور اس کے لیے ہارگراں ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک اخلاقی فرد اور انسان ہونے کے ناطے سے وہ شہریت کے حقوق سے اس وقت تک لوری طرح لطف اندوز نہ ہوگا۔ جب تک وہ ان ذمہ داریوں کی تکمیل نہ کرے جو اس پر عائد ہوتی ہیں۔

فطری حالت اور فطری ریاست سے شہری ریاست تک کے سفر میں آدمی میں غیر معمولی تبدیلیاں اور انقلاب آئے ہیں۔ انصاف کی جگہ اس کی جبلت میں رویہ کے بہترین اظہار نے لے لی ہے۔ اور اس کے اعمال میں وہ اخلاقی برتری پیدا کی ہے جس کا پہلے فقدان تھا۔

اس معاہدہ میں انسان جو چرچکھوتا ہے۔ وہ اس کی فطری آزادی ہے۔ یہ وہ آزادی ہوتی ہے جو بے پایاں اور غیر محدود ہونے کی وجہ سے وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس فطری آزادی کے بدلے اسے شہری

آزادی حاصل ہوتی ہے اور جو کچھ اس کا ہے۔ اس کا وہ مالک بن جاتا ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے خلاف اپنے وزن اور برتری کو نظر انداز کر دیں تو ہم واضح طور پر فطری آزادی کو عمیز کر سکتے ہیں جو کہ صرف اور صرف فرد کی قوت کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ مدنی آزادی عمومی ارفاق اور مرضی کی وجہ سے محدود اور پابند ہوتی ہے۔

ہمیں جانتا چلیے کہ اس شہری ریاست میں اخلاقی آزادی نمایاں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ اخلاقی آزادی ہی ہوتی ہے جو صحیح معنوں میں انسان کو اپنا آقا بناتی ہے۔ محض احساسات اور جذبات کی مہجوک غلامی ہے۔ جبکہ ان قوانین کی اطاعت جو ہم اپنے لیے بناتے ہیں آزادی ہے۔

آج تک ہم نے جتنے قوانین اور اصول وضع کئے ہیں انہیں ایک طرف رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ صرف عمومی ارادے اور اجتماعی مرضی کو ہی یہ شرٹ حاصل ہے وہ ریاست کی اس منزل کی طرف رہنمائی کرے جس کے حصول کے لیے یہ ارادہ تشکیل پاتا ہے اور وہ مقصد ہے۔ اجتماعی بہبود۔ خاص اور مخصوص آزادی کے تصادم سے کبھی ریاست تشکیل نہیں پاسکتی۔ نہ ہی ان کو استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے مجموعی اور اجتماعی ارادہ سے ہی یہ ممکن ہے کہ مختلف مفادات و مقاصد کو ایک سماجی معاہدے میں باندھ دیا جائے۔ اگر انسانوں میں اجتماعی ارادہ اور اجتماعی مقاصد کی قدر مشترک نہ ہو تو پھر کوئی معاشرہ بھی معرض وجود میں نہیں آسکتا۔ یہی مشترکہ اور اجتماعی مفادات ہیں جن کی بنیادوں پر ہر معاشرہ ترتیب پاتا ہے اور اس کو چلایا جاتا ہے۔

ذاتی اور خاص ارادہ (PARTICULAR WILL) اپنی تمام تر افادیت کے باوجود اپنی نظرت میں جانبدارانہ ہوتا ہے جبکہ مجموعی ارادہ مساوات کا مظہر ہوتا ہے اجتماعی اور عمومی ارادہ اور مرضی ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے اور اس کا جھکاؤ عوامی مفاد کی طرف ہوتا ہے لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ عوام کی رائے ہمیشہ مساوی طور پر صحیح ہوتی ہے ہمارا ارادہ اور مرضی ہمیشہ ہمارے اپنے وقار اور بھلے میں ہوتا ہے لیکن ہم ہمیشہ اسے اس طرح سے نہیں دیکھ سکتے کہ وہ ہے کیا؟ لوگوں کو ہمیشہ کرپٹ نہیں کیا جا

سکتا ہے لیکن اکثر ان کو دھوکہ دیا جاتا ہے اور یہاں یہیں معلوم ہوتا ہے کہ ارادے میں کیا خرابی تھی۔ تمام افراد کے ارادے اور مرضی اور اجتماعی اور عمومی ارادے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اجتماعی اور عمومی ارادہ اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ جبکہ افراد کا ارادہ ذاتی مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کی حیثیت خاص ارادوں اور مرضی سے مختلف نہیں ہوتی۔ افراد کی ان خواہشوں اور ارادوں میں جمع اور تفریق کر کے دیکھیں ایک سے دوسرے ارادے کو منسوخ کریں تو حاصل میں اجتماعی اور عمومی ارادہ ہی رہ جاتا ہے۔

یہ بنیادی امر ہے کہ اگر عمومی ارادے کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنا اظہار کر سکے تو پھر ریاست میں جردمی اور جانب دار معاشرے کا وجود نہیں ہونا چاہیے۔ عمومی ارادے کے تحت ہر فرد اپنے خیالات پر غور کر سکتا ہے لیکن جانبدار معاشروں میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ معاشرے کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اس کے افراد مساوی اور یکساں ہوں۔ تب عمومی ارادہ زندہ و متحرک اور سندرہتا ہے۔

بادشاہ صرف اور محض ایک روایت اور بننے بنائے ڈھانچے کی پیروی کرتا ہے۔ جبکہ قانون ساز اس ڈھانچے اور روایت کو ختم کرتا ہے۔ قانون ساز ایک ایسا انجینئر ہے جو ایک مشین ایجاد کرتا ہے اور بادشاہ صرف ایک مکینک جو اس مشین کی مرمت کر کے اسے چلتے رہنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ جو عوام کے لیے ادارے بنانے کا فرض اپنے ذمہ لیتا ہے۔ وہی قانون ساز ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اس قابل ہو کہ وہ ان فنطرت کی تبدیلیوں اور انقلابات کو محسوس کر سکتا اور ایک فرد کو اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود علیحدہ اور کٹا ہوا ہوتا ہے عظیم تر کل میں منتقل کر سکے۔ اس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ ان فنطرت اور احمیتا جان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لیے ایسا مشورہ اور قانون بنا سکے۔ جس میں فرد و اجتماع اور معاشرے کا حصہ بن کر سہی اپنی آزادی کے حق کا استعمال کر سکے۔ اس قانون ساز کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یہ استعداد ہو کہ وہ ان سے اس کے ذاتی ذرائع کو واپس لے کر اسے نئے ذرائع دے سکے۔

وہ دانا افراد، جو عام انسانوں کی زبان چھوڑ کر اپنی خاص زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کبھی اپنی بات دوسروں کو نہ سمجھا سکیں گے۔ دنیا کے بڑے بڑے انسانوں اور قانون سازوں نے مقدس انسانوں کے منہ میں اپنی زبان دے کر قوانین بنائے ہیں۔ جو قوانین۔ عوام کے لیے مفید نہ ہوں۔ ان کے شعور و فہم سے بالاتر ہوں۔ وہ ان سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جنہیں وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہوں جو ان کی اپنی زبان اور اجتماعی ارادے کی مدد میں آتے ہیں۔

اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ وہ کونسی چیزیں ہیں جو سب کے مفاد اور مصلحتی میں جاتی ہیں جو ہر نظام اور قانون کا منشا اور مدعا ہوتی ہیں۔ تو ہم تفصیل میں جائے بغیر کہہ سکتے ہیں آزادی اور مساوات۔

ریاست مختلف الطبع عناصر، افراد، اذہان پر مشتمل ہوتی ہے۔ جنہیں آزادی ملنی چاہیے۔ اور مساوات کے بغیر آزادی کبھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔

مدنی آزادی میں دولت اور طاقت کو ہر شخص میں مساوی بانٹنا مشروط نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اختیار۔ قوت۔ کبھی اتنی زیادہ نہ ہونے پائے کہ وہ تشدد کی شکل اختیار کر سکے۔ اور اسے ہمیشہ فائلی اور قانون کے تحت رکھ کر عمل میں لایا جائے۔ اور دولت کی فراوانی کی یہ حد ہونی چاہیے کہ دولت کبھی دوسرے شخص کو نہ خرید سکے۔ نہ ہی کوئی آسانا دار اور غریب ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے یہ غیر عملی نصب العین ہے اور عملی طور پر معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ چلیے ایسا ہی سہی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم کوشش ہی نہ کریں۔ ایسے قوانین ہی نہ بنائیں۔

حالات و واقعات کی قوتیں تسلسل سے مساوات کو تباہ کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی چاہیے کہ ہم ایسے قانون بنائیں کہ قانون کی طاقت اس مساوات کو برقرار رکھنے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔

ہر ریاست بین قانون سازی کا نظام اس ملک کے حالات کے مطابق تیار ہونا چاہیے مفاد ہی صورت حال اور انسانوں کے مزاج کو سامنے رکھ کر قانون بنانے چاہئیں۔ لیکن خاصی

ارادہ کے تحت منیں بلکہ عمومی اور اجتماعی مرضی اور ارادے کے مطابق۔ جوہر ریاست کی منزل :
اور وجود کا مقصد ہے۔

کسی ریاست کے آئین کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ یہ بات
نگاہ میں رکھی جائے کہ مناسب اور جائز کیا ہے۔ تاکہ فطری تعلقات ہمیشہ قوانین کے ساتھ ہر
نکتے پر اشتراک کر سکیں اور قانون اس رشتے کو مستحکم اور پائیدار بنائے۔ اگر قانون سازان مقاصد
کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے ایسے اصولوں کو اپناتا ہے جو حقائق اور حالات سے مختلف ہوتے ہیں
اگر وہ آزادی کی جگہ غلامی کو خوش حالی کی جگہ دولت مندی کو امن کی جگہ فوج کو اپنا مطیع نظر بنالینا
ہے تو پھر ایسے قانون اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں۔ آئین بدل جاتا ہے۔ ریاست اس وقت تک قائم
نہیں رہ سکتی جب تک تباہ ہو جائے یا اسے بدل نہ دیا جائے۔ فطرت اپنی ناقابل تسخیر قوت
پر اچھ نہیں آنے دیتی۔

ذاتی مفاد کے اثرات سے زیادہ خطرناک کرلی چیز نہیں۔ کیونکہ یہ اجتماعی مفادات کو
تباہ کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگ جن پر غلط طریقے سے حکمرانی نہیں کی جاتی وہ اپنی آزادی کا کبھی غلط استعمال
نہیں کرتے۔ جن لوگوں پر اچھے انداز میں حکومت کی جاتی ہے ان پر حکومت کرنے کی ضرورت ہی
محسوس نہیں ہوتی۔

ہم لوگ دیوتا نہیں اگر دیوتا ہوتے تو ہماری حکومت مشکل طور پر جمہوریت ہو سکتی تھی لیکن ہم
انسان ہیں انسانوں کے لیے کبھی کوئی مشکل حکومت نہیں بن سکتی۔ حالات و واقعات حکومتوں
پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک ملک کو جمہوریت کا گوارہ بنانے کے لیے قانون سازوں کے لیے
ضروری ہے کہ وہ جمہوریت کی فضا اور روح کو جائز قوانین کے حوالے سے ہمیشہ قائم و برقرار رکھے۔
ایک بہتر منشور کی حامل ریاست میں قوانین ہمیشہ تو انالی حاصل کرتے رہتے ہیں اور
کمزور نہیں پڑتے۔ ایک غیر آئینی اور بڑے منشور کی حامل ریاست میں ہی قانون کمزور پڑتے
اور مردہ ہو جاتے ہیں۔ اور حکومت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

حکمران کے پاس۔ صحیح معنوں میں قانونی اختیارات کے علاوہ دوسری طاقت نہیں ہوتی۔

وہ قانون کے ذریعے عمل کرتا ہے۔ اور تو این۔ عمومی اداوے کے مستفاد اعمال پر معنی عہدے ہیں۔ عوام کے سامنے حکمران بے اختیار ہے۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ اسمبلی میں موجودہ ارکان عجیب الخفقت اور موہمی مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ آج ایسا ہی ہوگا۔ لیکن دو ہزار برس پہلے وہ ایسے نہ تھے کیا ان کی فطرت تبدیل ہو گئی ہے؟

”اخلاقی امور میں امکانات کے رشتے۔ ہمارے تصور سے زیادہ محدود اور تنگ ہوتے ہیں۔ یہ ہماری کمزوریاں، ہماری برائیاں اور ہمارے تعصبات ہیں جو ہمیں محدود اور تنگ، دل بناتے ہیں۔ جبلی روجوں کا عظیم انہوں پر اعتقاد نہیں ہوتا۔ بذمہ نش غلام آزادی کے نام پر مکاری سے مسکراتے ہیں۔“

عوامی خدمت کے ادارے جو نئی شہریوں کے مقاصد کو پورا کرنے کے بجائے اپنی دولت اور اختیار کی ترقی کی راہ کو اپناتے ہیں تو ریاست تباہی کے کنارے پہنچ جاتی ہے۔ عوامی خدمت کے یہ نام نہاد ادارے اور ان کے حکمران جنگ چھڑے تو فوجیوں کو محاذ پر بھیجتے اور ان کو تنخواہ دے کر خود گھروں میں رہتے ہیں۔ جب عوام کی کونسل میں ان کی شرکت ضروری ہو تو یہ اپنے نائبوں کی نامزدگی کر کے خود گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ دولت اور عیش و آرام کی راہ اختیار کر کے۔ وہ فوج بناتے ہیں جو انہی کے ملک کو غلام بنا لیتی ہے۔ اور انہی کے نمائندے ملک بیچ دیتے ہیں۔

شہارت اور فتنوں میں فائدے اور ذاتی مفاد کے لالچ سے ریاست تباہ ہوتی ہے۔ دولت۔ خزانہ۔ روپیہ ایسے الفاظ ہیں جو غلامی کے مظہر ہیں، جو ایک سچی آزاد ریاست میں گم نام ہوتے ہیں۔ یہاں شہری سب کچھ اپنے زور بازو سے کرتے ہیں۔ دولت سے نہیں۔ وہ دولت دے کر اپنے فرائض سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ آزاد ریاست کے آزاد شہری دولت دیکر ریاست کے مقاصد کی تکمیل میں حصہ لیتے ہیں۔ آزادی کے لیے میں جبری مشقت کی، ٹیکسوں سے کم مخالفت کرتا ہوں۔

اکثریت کے ووٹ سب کو پابند بنا لیتے اور اپنے اندر شامل کر لیتے ہیں۔ اس نظریے پر بہت اعتراض کیے جاتے ہیں۔ عوام کی اکثریت سے جو فیصلے ہوتے ہیں انہیں وہ

لوگ بھی قبول کرتے ہیں۔ جو ان کی مخالفت کر چکے ہوتے ہیں۔ ریاست کے تمام شہریوں کی مستحکم مرضی اور ارادہ ہی عمومی ارادہ کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ آزاد ہوتے ہیں۔ اور شہری بھی ایک عوامی اسمبلی میں جب ایک قانون تجویز کیا جاتا ہے تو لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ اسے منظور کیا جاتا ہے۔ یا نا منظور بلکہ ان کی دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ یہ قانون عمومی ارادے کے تابع اور اس کا مظہر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہر شخص ووٹ دے کر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور عمومی ارادے اور مرضی کا نتیجہ دوڑوں کی گنتی سے ہوتا ہے۔

ورلڈ ایزول اینڈ آئیڈیا

شوہنہار کو قنوطی اور مایوسی کرنے والا انسان اور فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ طبقہ انات کے بارے میں اس کی رائے اور نفرت کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ ایک دلچسپ اور عجیب انسان تھا لیکن یہی وہ انسان ہے جس نے فلسفے کی دنیا کو ایک ایسی کتاب اور ایسا نظریہ دیا جو اسے رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا۔ شوہنہار کی یہ عظیم کتاب "THE WORLD AS WILL AND IDEA" ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب دائرہ لوکی جنگ لڑی جا چکی تھی۔ نپولین قید ہو چکا تھا۔ اور انقلاب فرانس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ دنیا پر ایک عجیب طرح کی آداسی اور قنوطیت یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔ جب شوہنہار نے اپنا لائٹنی شاہکار شائع کر لیا۔

شوہنہار ۲۲ فروری ۱۷۸۸ء کو ڈینزنگ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد خاصا کامیاب اور معزز ناما جرتھا۔ وہ آزادی سے محبت کرنے والا ایک مستقل مزاج آدمی تھا۔ جب آرٹھر شوہنہار پانچ برس کا تھا تو کینڈ ڈینزنگ سے ہمبرگ منتقل ہو گیا۔ شوہنہار نے کاروباری دنیا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ جس کے اثرات اس کی طبیعت پر ساری عمر چھلنے رہے۔ ۱۸۰۵ء میں شوہنہار کے والد کا انتقال ہوا۔ یہ بھی کما جاتا ہے کہ اس نے خود کشی کی تھی۔ شوہنہار کی داوی بھی پاگل پن میں ہی مری تھی۔

شوہنہار نے بعد میں لکھا کہ کیریکچر یا "دل" انسان کو اپنے والد کی طرف سے اور ذہنات اپنی ماں کی طرف سے ورثے میں ملتی ہے۔ شوہنہار کی والدہ اپنے زمانے کی مقبول ناول نگار

خاتون مہتی۔ وہ بہت نازک مزاج مہتی۔ شوپنہار کے والد کو وہ ناپسند کرتی تھی۔ جب اس کی موت واقع ہوئی تو شوپنہار کی والدہ نے آزاد محبت کی براہ اختیار کی اور وائس کراؤنگ کیا جہاں رنگ رلیاں منانے کے لیے ماحول بے حد سازگار تھا۔ اس کے گونٹے سے بھی مراسم تھے۔ شوپنہار کو اپنی ماں سے نفرت تھی۔ اس کی ماں نے جو راہ اختیار کی اس کا شوپنہار پر وہی اثر ہوا جو ہیلٹ پر ہوا تھا۔ وہ عورت ذات سے ہی متنفر ہو گیا۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کی تو یہ نفرت زیادہ پختہ ہو گئی۔ ماں کے ساتھ اس کی ٹھن گئی۔ جھگڑے ہونے لگے۔ ان جھگڑاؤں کی بدولت اس نے طبقہ اناٹ کے بارے میں ان آدمی سچائیوں کا شعور حاصل کر لیا جو بعد میں اس کے فلسفے کا حصہ بنیں۔ اس کی ماں بھی اس سے خار کھانے لگی تھی۔ ماں بیٹے کے درمیان جو خط و کتابت رہی وہ لوک جھونک سے بھری ہوئی ہے۔ ماں بیٹا دونوں علیحدہ ہونے لگے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجنبیوں کی طرح ہی ملے۔ گونٹے جو مادام شوپنہار کو پسند کرتا تھا۔ وہ شوپنہار کی صلاحیتوں کا بھی معترف تھا۔ گونٹے نے ہی اس سے کہا تھا کہ ایک دن آئے گا کہ جب اس کے بیٹے کا شمار دنیا کے نامور انسانوں میں ہوگا۔ لیکن شوپنہار کی ماں کو اس پر یقین نہ آیا۔ وہ اپنی شہرت پر نازاں مہتی اور سمجھتی تھی کہ ایک گھرانے یا کنبے میں دو افراد کبھی نامور نہیں ہو سکتے۔ اسے علم نہیں تھا کہ آنے والے دور میں کوئی اس کے نادلوں کا نام تک نہ جلنے گا۔ اور اس کے بیٹے کا نام ساری دنیا میں ابد تک کے لیے مشہور ہو جائے گا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مادام شوپنہار نے غصے میں آکر اپنے بیٹے کو صیرلہ سے دھکا دے دیا۔ اس کے بعد شوپنہار کی ماں چوبیس برس تک زندہ رہی لیکن شوپنہار اس سے ملنے ایک بار بھی نہ گیا اور اس نے وائس کو چھوڑ دیا۔

شوپنہار نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسا آدمی بھی بن گیا جو قنوطی، اشکی اور یاسیت پسند تھا۔ وہ اپنے پائپ کو مقفل کر کے رکھتا اسے نقب زلوں اور چوڑوں کا خوف لاحق رہتا۔ اس لیے وہ رات کو اپنے سر لانے کو بھرے ہوئے پستول رکھتا۔ جہاں پر رشک کرتا کہ حجامت بناتے وقت اس کی گردن پر استرانہ پھیر دے۔ وہ شور سے بے حد عاٹ تھا اور کہا کرتا تھا کہ شور تمام دانشوروں کے لیے تشدد

کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماں کے ہوتے ہوئے وہ ماں کے بغیر تھا۔ باپ مر چکا تھا۔ اس کی بیوی، تھا نہ بچہ کہ وہ عورت ذات سے نفرت کرتا تھا۔ اس لیے شادی ہی نہ کی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ وہ اکیلا رہتا۔ ڈنٹا رہتا اپنے وہ معمول، خوف اور شکوک کا شکار۔ ۱۸۱۳ء میں اس نے اپنی پہلی کتاب لکھی جس کا نام ہے *ON FOURFOLD ROOT OF SUFFICIENT REASON* اس نے اپنی ساری توانائی اپنی عظیم ترین کتاب "دی ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا" کے لکھنے پر مرکوز کر دی۔ اس نے پبلشر کو یہ مسودہ بڑے وعدوں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اس کتاب کے حوالے سے فلسفے کے تمام بنیادی سوالوں کا حل تلاش کر لیا ہے لیکن ۱۸۴۱ء میں جب کتاب شائع ہوئی تو کسی نے بھی اس پر توجہ نہ دی۔ اس کتاب کی اشاعت کے سولہ برس بعد شوپنہار کو اطلاع دی گئی کہ اس کی کتاب کے پہلے ایڈیشن کا بڑا احصہ رومی میں بکاپے شوپنہار کو اپنے اس عظیم شاہکار پر پناز تھا لیکن کتاب کو کسی نے پڑھا ہی نہیں۔ قابل توجہ رہی نہ گردانا تو اس نے ایک بار زنج ہو کر کہا:-

"میری کتاب جیسی تصانیف ایک آئینے کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر کوئی

گدھا اس میں دیکھے گا تو آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اس آئینے میں اسے
فرشتے کی شکل دکھائی دے گی۔"

اپنی کتاب کی ناکامی کی وجہ سے شوپنہار ایک طرح سے انسانوں سے ہی مایوس ہو گیا۔ اس کی یہ مایوسی اس کے مخصوص حالات اور مزاج کے عین مطابق تھی۔ لیکن یہ کتاب اس کے حواس پر سوار رہی۔ اپنی اس شاہکار تصانیف کے بعد اس نے جو کچھ لکھا۔ وہ گویا ایک طرح سے اسی کتاب "دی ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا" کی ہی تشریحیں اور تفسیریں ہی۔ ۱۸۴۴ء میں اس نے اپنی کتاب *ON THE WILL IN NATURE* شائع کرائی۔ اس کتاب کا صلہ سے دس کاپیوں کی صورت میں ملا۔ اس کے بعد اس نے دو اور کتابیں لکھیں جن کو کچھ پذیرائی حاصل ہوئی لیکن اس کے اس شاہکار کو مسلسل نظر انداز کیا گیا۔

۱۸۶۲ء میں اسے برلن یونیورسٹی میں استاد رکھ لیا گیا۔ یہاں بھی شوپنہار نے ایک

عجیب فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے لیکچروں کے لیے وہی اوقات جان بوجھ کر رکھے جن اوقات میں اسی یونیورسٹی میں ہسٹریل درس دیا کرتا تھا۔ شوپنہار کا خیال تھا کہ طالب علم اس کی طرف کھینچے چلے آئیں گے۔ لیکن وہ ہسٹریل کے عروج کا دور تھا اور شوپنہار کو خالی نشستوں اور کمرے سے خطاب کرنا پڑا۔ اس سے وہ اتنا بددل ہوا کہ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ہسٹریل کا کٹر مخالف بن گیا۔ برلن میں پلیگ پھیلا تو ہسٹریل بھی وہاں سے بھاگ نکلا اور شوپنہار بھی۔ ہسٹریل تو کچھ عرصے کے بعد مر گیا لیکن شوپنہار ہتھ برس کی عمر تک جیا اور اس نے برلن سے بھاگنے کے بعد اپنی بقایا زندگی فریہنگفرٹ میں گزار دی۔

اپنے والد کے ترکے سے اسے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ وہ ساری ہوا آسانی گزار سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک کتے کی رفاقت میں بسر کی۔ جس کا نام اس نے آتما رکھا ہوا تھا لیکن ستم ظریف اس کتے کو چھوٹا "شوپنہار" کہتے تھے۔ وہ انگریزی طعام خانوں میں کھانا کھاتا۔ کھانا کھانے سے پہلے سونے کا ایک سکھ لکال کر میز پر رکھ لیتا۔ اور کھانے کے بعد اسے جیب میں ڈال لیتا۔ ایک ملازم نے ایک بار اس سے اس کی اس عادت کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا: "ہر روز میں کھانے سے پہلے سونے کا سکھ اس نیت سے باہر رکھتا ہوں کہ آج اسے کسی غریب کو دے دوں گا لیکن میری شرط پوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ انگریز کھانے کے دوران میں گھوڑوں، کتوں اور عورتوں کے علاوہ کسی موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرتے۔"

دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے اسے اور اس کے شاہکار کو منظر انداز کیے رکھا لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وقت بدلا۔ اس کا شاہکار "دی ورلڈ اینڈ اینڈ آئیڈیا" پڑھا جانے لگا۔ اور پھر اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ عمر کے آخری زمانے میں اسے شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جاتا وہ اسے حاصل کر کے منبجھال کر رکھتا۔ اب دنیا کے لوگ اس سے ملنے کے لیے آئے لگے۔ ۱۸۵۸ء میں جب اس کی ستر تیس سالگرہ منائی گئی تو دنیا بھر سے مبارک باد کے پیغام آئے۔

۴۴۳

۲۱ ستمبر ۱۸۶۱ء کو شوپنہار کا انتقال ہوا۔ وہ صبح ناشتے کی میز پر بیٹھا۔ بظاہر وہ تندرست تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد اس کی لینڈ لیڈی نے دیکھا کہ وہ ابھی تک میز پر بیٹھا ہے۔ لیکن مرچکا ہے۔ !!

دی ورلڈ اینڈ ایٹھریا

آج فلسفے کی دنیا میں شوپنہار کی اس تصنیف کو لازوال مقام حاصل ہو چکا ہے شوپنہار کی یہ عظیم تصنیف ایک اور خوبی کی وجہ سے بھی بے جدا ہم ہے۔ یہ خوبی ہے کہ یہ کتاب نہ تو کانٹ کی تصنیف کی طرح ادق اور پیچیدہ اصطلاحات سے پُر ہے۔ نہ ہی ہیگل کے فلسفے کی طرح الجھی بولی اور جیم — انداز بیان واضح اور منظم ہے۔ پوری کتاب اصل موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ اس کتاب میں بڑی توانائی ہے۔ اور بڑے صاف اور دو ٹوک الفاظ میں شوپنہار نے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا انداز تجزیہ آسان ہے۔ اس میں تجریدیت کا شائبہ تک نہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی خاص اہمیت اور توجہ کا حامل ہے۔ جس میں شوپنہار نے اس دور کی وضاحت کی ہے۔ جس میں فلسفے کی صحیح قدر نہیں ہوتی۔ وہ آخر میں لکھتا ہے :-

”زندگی مختصر ہے لیکن سچائی دیر تک زندہ رہتی ہے۔ اس لیے آئیے ہم سچ کا اظہار کریں۔“

اول ۱۷۱۷ء ارادہ۔ اس پر شوپنہار نے دنیا کی تفسیر کی ہے۔ اور فلسفے کی دنیا کو ایک نئے اور جاندار خیال اور نظریے سے متعارف کراتے ہوئے مالا مال کر دیا ہے۔ شوپنہار لکھتا ہے :-

”جسے ہم شعور کہتے ہیں۔ وہ محض ہمارے ذہنوں کی سطح ہے جس طرح زمین ہو کہ جس کو کھود کر ہم نے اس کے اندر نہ دیکھا ہو تو باہر سے وہ محض مٹی کی تہ ہی دکھائی دیتی ہے۔“

وہ ہمیں بتاتا ہے :-

UNDER THE CONSCIOUS INTELLECT IS THE CON-
-scious OR UNCONSCIOUS WILL, A STRIVING PERSISTENT
VITAL FORCE.

A SPONTANEOUS ACTIVITY, A WILL OF IMPERIOUS
DESIRE."

شوہنمار ہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی محسوس ہو سکتا ہے کہ ذہانت ارادے
دل کی چیز کی گری ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی آقا کی کوئی ملازم رہنمائی کر رہا ہو۔
وہ دل کی مثال یوں پیش کرتا ہے کہ جیسے ایک اندھا مضبوط تو انافرود ہو جس نے اپنے
گدھوں پر ایک نازک اور کمزور ترین انسان کو اٹھا رکھا ہو جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔
شوہنمار نے "دل" یا ارادے کے حوالے سے انسانی زندگی کی ایک ایسی تعبیر پیش
کی ہے کہ جو بے حد معنی خیز ہے۔

وہ لکھتا ہے:-

"ہم کسی چیز کی خواہش اور طلب اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں اس کے
حصول کے لیے اسباب کا علم ہو گیا ہے۔ بلکہ ہم چونکہ اسے حاصل کرنا چاہتے
ہیں اس لیے اس کے حصول کے لیے ایسی ہی وجوہات کا علم حاصل
کرتے ہیں۔"

شوہنمار کے خیال میں ہم فلسفوں اور دینیات کو بھی اس لیے پھیلاتے ہیں کہ اس
سے ہماری خواہشات کو دلصاف بنا سکے۔

شوہنمار انسان کو "مابعد الطبیعیاتی جانور" کا نام دیتا ہے۔ کیونکہ دوسرے جاندار
مابعد الطبیعیات کے بغیر زندہ رہتے ہیں جب کہ انسان کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے بلکہ وہ
انسانی ارادے کی تابع ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن کتنی ہی فتوحات اور شکستوں کو ذرا محوش
کر دیتا ہے۔ وہ ایک اور ثبوت پیش کرتا ہے کہ جب ہم حساب کتاب کر رہے ہوں تو ہم
اکثر ایسی غلطیاں کرتے ہیں جو ہمارے حق میں جاتی ہوں ان کے پیچھے بھی ہمارا ارادہ

کام کر رہا ہوتا ہے۔ انسانی کردار بھی ارادے میں مضمر ہوتا ہے۔ کردار کیا ہے؟ شوپنہار کے الفاظ میں یہ روایت اور انسانی رویے کے تسلسل کا نام ہے۔ شوپنہار کہتا ہے کہ وہ زبانیں۔ جو ذول و دماغ پر ترجیح دیتی ہیں وہ سچی نہیں۔ دماغ کی اعلیٰ صلاحیتیں تعریف و توصیف کی سزا دار تو ہو سکتی ہیں لیکن یہ ذیل نہیں جیت سکتی ہیں۔ دل یعنی ارادے کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے شوپنہار ہمیں بتاتا ہے کہ تمام مذاہب یہ نوید دیتے ہیں کہ جن کے ارادے اچھے ہوں ان کے لیے دوسری دنیا میں صلہ اور جزا ہے۔ یہ ارادہ۔ یہی دل ہے جب کہ شاندار فرہنگ کے لیے کوئی انعام حاصل نہیں۔

شوپنہار انسانی جسم کو بھی ارادے کی پیداوار کہتا ہے۔ خون اس ارادے کی قوت سے گردش کرتا ہے جسے ہم زندگی کا نام دیتے ہیں وہ لکھتا ہے۔

”ارادے کے عمل اور جسم کی حرکت کو عام طور پر معروضی اعتبار سے دو مختلف چیزیں کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ دونوں کے نظریے کے ساتھ علیحدہ علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ یہ دراصل ایک ہی ہیں۔ ایک وحدت جسم کی حرکت ارادے کے عمل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی حقیقت کا اطلاق جسم کی ہر حرکت پر ہوتا ہے۔ سارا جسم دراصل ایک معروضیاتی ادارہ ہے۔ سارا اعصابی نظام بھی ارادے کا تابع ہے۔“

شوپنہار کے فلسفے کے مطابق ذہانت اور عقل تھک جاتی ہے لیکن ارادہ کبھی نہیں تھکتا ذہانت کو نیند کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ارادہ عالم خواب میں بھی مصروف عمل رہتا ہے۔

ارادہ (will) انسان کا جوہر ہے۔ اسی لیے زندگی کی تمام اشکال اور زندگی کا جوہر بھی ارادہ ہے۔ ارادہ دراصل زندہ رہنے کا ارادہ ہے۔ جس کی دشمن صرف موت ہے۔ اسی لیے ہم کہتا ہے کہ ارادہ موت کو بھی شکست دے دے۔

”ارادہ علم کی طرح خود مختار اور آزاد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لکھتا ہے۔ اشیاء معنی زیادہ تبدیل ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ وہ پہلے جیسی رہتی ہیں۔“

اگر یہ دنیا "ارادہ" ہے تو پھر اس دنیا میں بہت سے آلام اور مصائب بھی تو ہوں گے انسانی خواہشوں کا عجیب تماشا ہوتا ہے۔ ایک خواہش کی تکمیل ہو تو دوسرا خواہش ادا ہو رہ جاتی ہیں۔ خواہشیں بے پایاں اور اس کی تسکین محدود پیمانے پر ہوتی ہے ارادہ مستحکم ہوا ارادہ ہمارے اندر کے خلاؤں اور خوف کو بھرتا رہے تو پھر انسان بہتر، خوش حال اور پرسکون زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ارادے کی گرفت مضبوط ہو تو خواہشیں کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ شوپنہار کے الفاظ میں جو جذبہ سیراب ہو جاتا ہے اور اکثر وہی جذبہ خوشی کی بجائے ناخوشی اور الم کا سبب بنتا ہے کیونکہ اس سیراب اور تشفی یافتہ جذبے کے مطالبے عموماً اس شخص کے بہتر مفادات سے متصادم ہوئے ہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں دو عالم کی ایک مقدار پہلے سے رکھ دی گئی ہے۔ زندگی مٹ رہے کیونکہ اس میں درد اور حقیقت کی تلخ کا مٹی شامل ہوتی ہے۔ یہاں ایک طرح سے شوپنہار نے ارسطو کی تائید کی ہے۔ کہ جس نے کما تھا دانشمند خوشی کی طلب نہیں کرتا۔ بلکہ درد عالم سے آزاد ہونے کا خواہاں ہوتا ہے۔ شوپنہار اپنی اس عظیم تصنیف میں لکھتا ہے :-

تمام سیرابی اور تسکین جسے عرف عام میں مسرت کہا جاتا ہے۔
حقیقت میں محض جو فرضی ہے ہم صحیح طور پر اپنے اندر کی خصوصیات اور
سچائیوں کا پورا شعور رکھتے ہیں نہ ہی ہمیں اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ
ہوتا ہے۔

ان آلام کا حل کیا ہے؟۔ علم؟۔ نہیں۔ شوپنہار علم کے فروغ اور اندرونی نشوونما کو
اس کا حل قرار نہیں دیتا۔ وہ تو اس کا حل ارادہ کو بتاتا ہے۔ اس کے صحیح شعور کو حل قرار دیتا
ہے۔ یہ انسان کی حساسیت ہے جو اس کو رنج و آلام کی شدت سے ہٹا رکھتی ہے جبکہ
شوپنہار کے الفاظ میں :-

چونکہ پودے اس حساسیت سے محروم ہوتے ہیں اس لیے وہ درد
بھی محسوس نہیں کرتے :-

علم میں اضافہ رنج و آلام میں اضافے کے مترادف ہے۔ حتیٰ کہ اچھی یادداشت

اور پیش بینی کی صلاحیت بھی انسانی اکام میں اضافہ کرتی ہے دروآند کہ نہیں دیتا جتنا اس کا احسا
شوہنہار کے الفاظ میں :-

” موت - موت کے احساس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی ۔ “

شوہنہار انسانی زندگی کی جو تصویر کھینچتا ہے اور اس کے حوالے سے جو نقشہ مرتب کرتا
ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک بدی اور شر سے تعبیر کرتا ہے زندگی
مالیوس کرتی ہے انسان کو قنوطی بناتی ہے اس میں یاس و اطم بھر دیتا ہے ۔ زندگی کا احسا
ہی انسان کو تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے ۔ زندگی کے بارے میں جتنا غور کرو، جتنا سوچو
زندگی مصائب کا مجموعہ نظر آتی ہے ۔ ہم ناخوش اور اداس ہیں ۔ غیر شادی شدہ ہیں تو بھی
شادی شدہ ہیں تو بھی ۔ ہم اجتماع اور محفل میں اداس ہیں اور تنہائی میں بھی ۔ کسی بھی فرد
کی زندگی کا بغور جائزہ لیجیے ۔ وہ شوہنہار کے الفاظ میں ایک المیہ ہی دکھائی دے گی ۔

زندگی ایک ایسا کاروبار ہے جو کبھی اپنے اعزازات کا خود متحمل نہیں ہوا ۔ اس
فلسفے کی رو سے موت آخری حقیقت ہے ۔ موت سے پناہ و ذہنیت ملتی ہے ۔ جس طرح درد
سے نجات صرف پاگل پن میں موجود ہے یا پھر آخری پناہ خودکشی میں ہے ۔ لیکن شوہنہار اس سے
بھی احتقان کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے زندگی بہر حال جاری و ساری رہتی ہے ۔ انسان خودکشی
کرے تو بھی اس کے ارادے پر حوت نہیں آتا ۔ وہ خودکشی کو احمقانہ فعل قرار دیتا ہے ۔
شوہنہار کے الفاظ میں انسان اس وقت تک عمارتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا جب
تک اس کا ارادہ عقل و ذہانت اور علم کو اپنا تابع نہ کر لے ۔

شوہنہار اسے جینس قرار دیتا ہے جو زیادہ علم سے تھی ہے ۔ زندگی کے اونٹ
منظاہر علم کی بجائے ارادے سے تخلیق و تشکیل پاتے ہیں ۔ انسان بنیادی طور پر ارادہ
ہے ۔ اس میں ارادہ وافر اور علم بہت کم ہوتا ہے ۔ شوہنہار کے الفاظ میں جینس کی
تعریف یہ ہے ۔

” جینس وہ قوت ہے جو اپنے مفادات کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتی

ہے ۔ وہ اپنی خواہشوں اور مقاصد کو چھوڑ سکتا ہے جو اپنی ذات کی نفی کر

سکتا ہے۔"

شوپنہار نے اپنے اس نظریے کا اطلاق آرٹ، مذہب اور موت کی حقیقت پر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوپنہار کا اس عظیم کتاب پر یہ مضمون محض ایک ایسے تعارف کی حیثیت رکھتا ہے جو ناممکن ہے شوپنہار کی یہ کتاب *WORLD AS WILL AND IDEA* ایک ایسی تصنیف ہے جسے برسوں بار بار پڑھنا اور اس پر غور کرنا چاہیے۔

پینک اینڈ تھنکنیس

بیسویں صدی میں وجوہیت کے فلسفے کو جو عالمی شہرت حاصل ہوئی اس کا سہرا اٹھاں پال سارتر کے سر بندھتا ہے۔ سارتر سے پہلے کئی ایسے فلسفی اور مفکر گزرے ہیں جنہوں نے فلسفہ وجوہیت کی بنیادیں استوار کیں۔ اور اس میں شاندار فکری اور فلسفیانہ اضافے کیے۔ لیکن یہ صرف سارتر تھا۔ جس نے اس کو عام مقبولیت بخشی اور اس طرح کہ ساری دنیا میں اس کا چرچا ہوا۔ اور بعض حوالوں سے لے لبلڈر فیشن بھی اپنا یا گیا۔

ٹراں پال سارتر بیسویں صدی کی عظیم اور مقبول ترین عالمی شخصیات میں سے ایک ہے اس کے ایک ایک لفظ کو عقیدت سے پڑھا گیا ہے۔ اس کے بارے میں ساری دنیا میں اس کی زندگی میں عالمی اخباروں میں اس کے اعمال سرگرمیوں اور دل چسپیوں کا تذکرہ شہ سرخیوں میں ہوتا رہا ہے۔

فرانس نے کئی ہنگامہ خیز شخصیتیں پیدا کی ہیں لیکن جتنی ہنگامہ خیز شخصیت ٹراں پال سارتر کی تھی اس کی مثال شاید خود فرانس بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سارتر نے ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ ایک ناول نگار، کمانی کار، ڈرامہ نگار، مفکر، فلسفی، سیاست دان، دانشور اور انقلابی کارکن کی حیثیت سے وہ ساری عمر ہنگاموں کو جنم دیتا رہا۔ بیسویں صدی میں نسل انسانی اور فکر انسانی کو بہت کم لوگوں نے اپنے افکار و نظریات اور شخصیت کی وجہ سے اتنا متاثر کیا ہوگا۔ جتنا... سارتر نے...!

سارتر ۱۲ جون ۱۹۰۵ء کو پیرس میں پیدا ہوا ابھی اس کی عمر پندرہ ماہ تھی کہ اس کے باپ کا

انتقال ہو گیا اس کی ماں کو اپنا بچہ لے کر پیرس سے اپنے والدین یعنی سارتر کے نہال جانا پڑا۔ سارٹرک میں سارتر کا چچا لسانیات کا پروفیسر تھا۔ سارتر نے اپنی سچپن کی زندگی کا احوال خود اپنی تصنیف *Woods* میں کیا ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ سارتر نے کس ماحول میں تربیت حاصل کی۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ کتابوں سے محبت کرنے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری عمر پڑھتا رہا کتاب سے اس کی محبت بہت سچی اور پائیدار ثابت ہوئی۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سارتر کئی سال تک مختلف درسگاہوں سے منسلک رہا اور ۱۹۳۲ء میں وہ برلن چلا گیا جہاں وہ فرانز برگ یونیورسٹی میں تحقیقی معلم کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سارتر ہائیڈرگراڈر مسہل کے فلسفے سے متعارف ہوا۔ جس نے اس کے فکری نظام کو بے حد متاثر کیا۔ برلن سے واپسی کے چند برسوں کے بعد وہ پیرس کی ایک درس گاہ میں فلسفے کا استاد مقرر ہوا۔ اسی زمانے میں اس نے بعض فلسفیانہ مضمون لکھے جن کی اشاعت سے سارتر کا خاصا شہرہ ہوا لیکن جب ۱۹۳۸ء میں اس کا ناول *نایا شائع ہوا تو اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیل گئی۔ اس ناول کا مرکزی کردار انٹونی روقیونین۔ آج مغربی کلچر کا ایک جانا پہچانا نام ہے اور اسے وہی شہرت حاصل ہے جو ٹیکسٹ پیپر کے ہیملٹ، ڈکنز کے اولیور ٹوٹ اور جیمز جوس کے بلوم اور مولی کو۔*

نایا ایک عظیم اور سچا فلسفیانہ ناول ہے۔ یہ صیغہ واحد متکلم میں بیان ہوا ہے اور مرکزی کردار کی ڈائریوں کی صورت میں۔ اس ناول کے مرکزی کردار اور سارتر میں کسی رشتہ بہتیں ملتی ہیں،

یہ وہ ناول ہے جو اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ سارتر کا نظام فکر کیا ہے وجودیت کی چھاپ اس ناول پر بہت گہری ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعد میں سارتر نے جس فلسفے کو مربوط انداز میں پیش کیا اس کا بھرپور عکس اس کے اس پہلے ناول میں ملتا ہے۔

اس ناول کی اشاعت نے سارتر کو عالمی ادب میں اہم مقام بخشا ہے اسی دوران میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ *INTIMA* بھی شائع ہوا اور پھر دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ دوسری جنگ عظیم میں سارتر فوج میں گیا۔ وہ جنگی قیدی بنا پھر اسے رہائی ملی اور جنگ

کے زمانے میں وہ مزاحمتی جنگ میں شریک رہا اور اپنے وطن کی آزادی کے لیے بہت کام کیا۔ اس دور میں اس نے FLIES جیسا کھیل لکھا۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ فرانس کے لیے ذلت و رسوائی کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں سارتر نے بہت کچھ سوچا لکھا اور بہت سے نتائج تک پہنچا۔ جس کے اثرات بعد میں اس کی تمام تصانیف اور زندگی پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں اس دور میں اس نے آزادی کے حقیقی معنی دریافت کیے۔ ادیب اور لکھنے والے کی ذمہ داری کا شعور حاصل کیا۔

اس حوالے سے اس نے جو کہانیاں اور ناول لکھے انہوں نے سارتر کو صوفی اول کا عالمی لکھنے والا بنا دیا۔ اس کے بعد وہ زندگی کی عملی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ "لٹریچر" اور ناولوں کی ٹریولوجی "فریڈم روڈ" کے خالق تھے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گیا اور اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ بھی اس کا تعلق نظریاتی اور فکری اختلافات کی بنا پر زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۵۱ء میں اس نے خود ایک بائیں بازو کی انتہا پسند تحریک کو جنم دینے کی کوشش کی مگر اس میں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی، بہر حال کمیونسٹ پارٹی اور مارکسزم کے ساتھ اس کی دل چسپی ہمیشہ قائم رہی مارکس کی مداحی میں کمی نہ آئی۔ جدید عہد میں جب NEW LEFT کی بنیادیں فکری اور سیاسی لحاظ سے استوار ہوئیں۔ اس میں سارتر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ماریٹس گرینسٹن کی کتاب THE NEW LEFT کا مطالعہ اس سلسلے میں اس تحریک اور نظریات کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔

سارتر ایک بہن الاقرامی شخصیت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ فلسفہ وجودیت کے فزٹا کی وجہ سے اس کو خاص مقام حاصل ہوا۔ وہ حق و انصاف کا داعی تھا۔ اور اس کے لیے اس نے اپنے ہم وطنوں کو ظالم اور غلط قرار دیا جس پر اس کی بہت مخالفت ہوئی اسے سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر صدر ڈیگال نے اسے یوں عزائم پیش کیا کہ وہ اسے کیسے سزا دے سکتا ہے سارتر تو فرانس ہے۔

سارتر نظریاتی وابستگی پر بہت اصرار کرتا ہے اگرچہ اس کے معنی اس کے نزدیک بہت

دسیع ہی۔ وہ بتاتا ہے کہ کھینے والوں کو اپنے زمانے کے معاملات و مسائل میں دل چسپی یعنی چاہیے،
نظم دستم کے حشرات جہد و جہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ دیت نام کی جنگ کے خلاصہ
اس نے جو نثر یک چلانی وہ بھی اس کے انہی نظریات کا حاصل تھا۔ دیت نام میں جنگی جرائم کے
بین الاقوامی رسل ٹریبونل کا سرگرم رکن رہا۔

طالب علمی کے زمانے میں سارتر کی ملاقات سمون دے لوار سے ہوئی تھی جو خود بہت اہم
فرائیسی مفکر، ناول نگار ہے۔ شادی کے بغیر وہ دونوں ساری عمر کھٹے رہے۔ ان کی یہ رفاقت
اور محبت بھی سارتر کی زندگی کا اہم واقعہ ہے دونوں ایک جہد جہد بھی لگاتے رہے۔
سارتر کو ادب کا نوبل انعام بھی دیا گیا۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ جینیہ سے
محروم ہو چکا تھا اور جب ۱۹۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا تو وہ دینائے حاضر کی چند بڑی شخصیتوں
میں ایک تھا۔

سارتر نے عجب انداز میں زندگی بسر کی، ہوٹلوں، کیفوں میں اس کا وقت گزارا ہاں اس
نے اپنے عہد کے سیاسی معاملات اور انسانی مسائل کو سمجھا اور ان کے لیے جدوجہد کی۔ اس کی
زندگی بے حد مصروف تھی وہ کھینے پڑھنے میں بہت وقت صرف کرتا تھا۔ اپنی زندگی میں اس
نے اپنے نظام فکر میں کئی بار ترمیم کی۔ لیکن بنیادی نظریے وجودیت سے منکر نہ ہوا۔ اس نے مارکسزم
اور وجودیت کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی اس کی یہ کوشش بحث و گفتگو کا اب ہم موضوع بنی
ہوئی ہے۔

سارتر کا سارا کام دینا کی سب بڑی زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہلکے ہاں سارتر کا
شہرہ تو بہت ہوا ہے۔ کچھ کھینے والوں پر اس کے اثرات بھی ملتے ہیں لیکن سارتر کا کام اردو میں بہت
کم منتقل ہوا ہے۔

اس کے چاروں ناولوں میں سے کسی ناول کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ اس کی کسی فلسفیانہ کتاب
کو اردو میں منتقل نہیں کیا گیا حتیٰ کہ اس کی اہم ادبی تصنیف ادب کیا ہے؛ کو بھی کسی ادیب نے اردو
میں ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی چند کہانیوں کا ترجمہ ضرور ہوا ہے جن میں "وال" اور
INTIMACY کا ترجمہ شامل ہے۔ INTIMACY کا ترجمہ بہت ناقص ہے۔ ڈراموں میں ایک

معروضات (ترجمہ مخور جالندھری) ہے اور ایک پنجابی ترجمہ شفقت تنویر مرزا نے NOEXIT کا کیا ہے۔

تاہم ہمارے ہاں بہت سے لکھنے والوں پر اس کے اثرات واضح ہیں۔ اور سارتر کو پاکستان میں بہت شہرت حاصل رہی ہے۔

فلسفہ وجودیت اور سارتر کے حوالے سے مضامین خاصی تعداد میں لکھے گئے ہیں لیکن وجودیت پر کوئی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی البتہ قاضی جاوید کی کتاب "وجودیت" تعارفی نوعیت کی بہتر کوشش ہے۔

وجودیت کیا ہے اور سارتر نے اس میں کیا اضافے کیے ہیں اور اس میں اس کا کیا مقام بنتا ہے اس حوالے کے لیے میں عام قارئین کے لیے کتابیں پڑھنے کی سفارش کروں گا۔ ایک کتاب کا نام "وجودیت بطور ایک فلسفہ" ہے اور اس کے مصنف فرنانڈو مولینا ہیں اسے پرنٹس ہال پبلشر نے شائع کیا ہے دوسری کتاب کا نام "سقراط سے سارتر تک" ہے اس کے مصنف لیونڈیوین ہیں

سارتر نے فلسفہ وجودیت کے لیے جن فلسفیوں سے بطور خاص استفادہ کیا ان میں دیکارٹ، ہمسرل، ہائیڈیگر، کیرکیگارڈ اور نبطے شامل ہیں

بینگ اینڈ نٹھنگنیس

BEING AND NOTHINGNESS

وجود اور لا شیٹ۔ "بینگ اینڈ نٹھنگنیس" کو سارتر نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں لکھا اور مکمل کیا۔ اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۴۳ء ہے اپنی اس عمدہ کتاب میں سارتر نے مظہریاتی مطالعے کے حوالے سے وجود کی حقیقت کو سمجھنے کے کوشش کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وجود جو ہر پر مقدم ہے۔ ہائیڈیگر نے انسان کو ہستی کا غلام قرار دیا تھا۔ لیکن سارتر اس سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ ہستی کو تمام وجودات کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ وہ شعور کا مظہر قرار دیتا ہے۔ وجود کی دو اقسام کا تعین کرتا ہے ایک جو SELF ہے اور شعور ہے اور دوسرا جو اس کے

شعور سے باہر شے ہے۔ جو اس کے باوجود سوچنے سمجھنے کا شعور دیتا ہے۔ سارتر شعور اور خارجی اشیا کے تعلق پر بہت اصرار کرتا ہے۔ اپنے وجود کا شعور خارجی اشیا کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اشیا سے علیحدگی کا طریقہ اپنا کر جو شعور ہوگا اسے وہ ناقابل فہم قرار دیتا ہے

وہ انسان کو اپنے فلسفے میں۔ یعنی وجود میں بہت اہمیت دیتا ہے۔

شعور ہی فیصلہ کن ہے اور وہی ناصحلہ پیدا کرتا ہے۔ اپنا وجود اور اپنے لیے وجود ان دونوں کے درمیان حاصل ہے۔ اسے سارتر لاشیئٹ NOTHINGNESS کا نام دیتا ہے۔

سارتر کے نزدیک انسان کا وجود حیران کن اور انوکھا ہے کیونکہ وہ انسان کو طے شدہ فطرت کا مالک تسلیم نہیں کرتا۔ سارتر انسان کو لاشیئٹ کے اعتبار سے موجود سمجھ کر اپنی تقدیر کا خالق قرار دیتا ہے۔ یوں وہ اپنی طویل فلسفیانہ تخلیق اور تجربے کے بعد ہمیں اس نتیجہ پر لے جاتا ہے کہ وجود جو ہر پر مقدم ہے۔

سارتر دوسری وجودیت کا قائل تھا لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ خدا اگر موجود نہیں تو ایسی ہستی ضرور اپنا وجود رکھتی ہے جس کا وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔

یوں اس نظریے اور فلسفے کے حوالے سے سارتر انسان کو آزادی بخشتا ہے اور اس کی خود مختاری کا جواز بھی فراہم کرتا ہے وجودیت کے فلسفے کے حوالے سے اس عظیم کتاب میں سارتر ہمیں اپنی تحقیق اور فلسفیانہ تنگ دود میں بہت دور تک لے جاتا ہے۔ وہ اشیا کا شعور اور شعور کا وجود کے فرق کو بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں بتاتا ہے کہ وجود کا شعور دنیا میں لاشیئٹ اور نفی کو پیدا کرتا ہے۔ اور یوں اسے نفی کی بے پناہ قوت جمعی حاصل ہوتی ہے اور یہ اپنے وجود کے لیے مکمل طور پر آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی حوالے سے سارتر نے کہا تھا۔

" ایک آدمی ہر وقت آزاد ہوتا ہے۔ "

.... خدا یا پھر نہیں ... "

سارتر کا "کالٹینس بیگ" اپنی دنیا کی پوری ذمے داری کو قبول کرتا ہے اور آپ وہ آزادی کے گمراہ معنی بخشتا ہے۔ کیونکہ آزاد وجود ہی یہ ذمہ داری قبول کرے گا کہ وہ جس حالت

میں زندہ ہے اس کا وہ ذمہ دار ہے اور وہی اس دنیا کو معنویت بخشتا ہے اور پھر انتخاب اور شعور کے حوالے سے جو دہشت جنم لیتی ہے اس کا مطالعہ سارتر کے فلسفہ وجودیت کے حوالے سے بہت اہم اور فکرائیگیز ہے۔

کیونکہ سارتر کے نظریات کے مطابق یہ آزادی ہی کا شعور ہے جو دہشت کا سبب بنتا ہے۔ دہشت اس لاشعیت سے پیدا ہوتی ہے جو فرد کے جوہر اور اس کے انتخاب کے درمیان رکاوٹ بنتی ہے۔

سارتر کہتا ہے کہ دہشت ہی ہے جس میں آزادی کا مجھ لو پر احساس ہوتا ہے سارتر کے ہاں خوف اور دہشت کے معنوں میں بڑا نمایاں فرق ہے۔

انسان۔ سارتر کے نظریے کے مطابق آزاد ہے۔ لیکن انسان کی یہی آزادی ہے جو انتخاب کی ذمہ داری اور اس کے ساتھ منسلک کرب و اذیت کو اپنے ساتھ لاتا ہے فلسفہ وجودیت اور سارتر کے ہاں اذیت اور کرب کا جو تصور بنتا ہے اس کے حوالے سے بھی وجودیت کو بطور فیشن اپنایا گیا ہے اور اس کرب و اذیت کے تصور کے حوالے سے بھی اس پر بڑی تنقید کی گئی ہے۔

سارتر یہیں بتاتا ہے کہ آزادی میں جو کرب ذمہ داری اور اذیت ہے۔ اس سے انسان فرار حاصل کرتا ہے۔ انسان گویا اپنی آزادی کا بوجھ اٹھانے سے گریز حاصل کرتا ہے۔ اور اسی گریز کی وجہ سے وہ اپنے ارد گرد وحیلوں بہانوں مصدریات کا جال بنتا رہتا ہے تاکہ کسی طرح اس پر انتخاب اور ذمہ داری کی جو "اذیت" مسلط کی گئی ہے اس سے جان بچا سکے اور اپنی "جمہوری" پر سارا بوجھ ڈال کر خود کو پرسکون بنا سکے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں سارتر نے اپنے نظریات میں خاصی ترمیم کی لیکن وجودیت کے فلسفے کے بنیادی نظریات اور ڈھلچنے کو تبدیل نہیں ہونے دیا۔ بعض امور میں اس کی اہم پسند کا میں کی واقع ہوئی۔ وہ فرد کی وجودیاتی آزادی اسکے بعد اسکی ذمہ داری اس کے کرب اور اذیت اور اس سے فرار کے بنیادی نظریات پر قائم رہا۔ سارتر نے وجودیت کے فلسفے کو عام زندگی میں رائج کیا اور ادب و فنون پر اسکے گہرے عالمی اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسکی یہ تصنیف بنیاد حیثیت رکھتی ہے جسکے مطالعے سے ہم سارتر کی وجودیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

استھتیک

کردچے نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے والدین اور بہن اس کی آنکھوں کے سامنے مر گئے۔ وہ خود گھنٹوں سے بلے کے نیچے دفن رہا اور جب اسے بلے سے نکالا گیا تو گویا اس نے دوسری زندگی پائی مسمتی۔ اس واقعہ کا اثر اس کی زندگی پر بہت گہرا رہا۔ اس کے باوجود وہ فنا اور موت انسانی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری اور الم و حزن کا درس نہیں دیتا بلکہ جمالیات کا فلسفہ لے کر دنیا کے سامنے آیا اور اس نے حسن اور خوب صورتی کو زندگی کا جوہر قرار دیا۔

کردچے کی زندگی کے کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جس کی اس کے فلسفے اور جمالیاتی نظریات کے ساتھ کوئی نسبت دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ سوچنا پڑتا ہے کہ جس شخص نے ایسی ہنگامہ خیز زندگی بسر کی وہ ایسے نظریات کا مالک کس طرح ہو سکتا ہے جس کو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

بینڈ ٹیو کردچے اٹلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا کنبہ کیتھولک اور قدامت پسند خیالات و عقائد کا مالک تھا۔ بچپن سے ہی اسے کیتھولک دینیات کی تربیت اور تعلیم دی گئی۔ اور اس میں اتنی استہا پسندی سے کام لیا گیا کہ کردچے بالآخر طرد بن گیا۔ ایسی صورتوں میں جب توازن قائم نہ رہے تو ایسا ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے۔

کردچے کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اسے پھر سے ایمان اور اعتقاد کی طرف رُخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اور اس کا خاندان ایک چھوٹے سے قصبے میں مقیم تھا کہ جب اس قصبے میں تباہ کن زلزلہ آیا اس کے والدین اور اس کی اکلوتی بہن اس زلزلے کی جھینٹ چڑھ گئے وہ خود گھنٹوں تک گرمی پڑی عمارتوں کے بلے کے نیچے دفن رہا۔

اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ کسی برسوں تک اس کی صحت بحال نہ ہو سکی لیکن اس کی روح زندہ رہی اور ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہی۔ اس نے علم حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اپنے آپ کو علم کے حصول کے لیے وقف کر دیا۔ مالی اعتبار سے وہ خود کفیل تھا۔ اس لیے وہ زندگی کے آخری دم تک ایک سچا طالب علم رہا۔ حالات اسے سیاست کی دنیا میں کھینچ لائے۔ حالانکہ وہ احتجاج کرتا رہا لیکن اسے وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ سینیٹر بن گیا اور اٹلی کی روایت یہ ہے کہ جو شخص ایک بار منتخب ہو جائے وہ تاحیات سینیٹر رہتا ہے۔ اس دور کی اطالوی حکومت دراصل ایک فلسفی کو وزارت کارکن بنا کر سیاسی وزارت کو وقار بخشنا چاہتی تھی۔ تاہم کرپے نے سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اپنے دور وزارت اور سینیٹر ہونے کے باوجود اپنا جبریدہ LA CRITICA مرتب کرتا رہا۔

اوریور ۱۹۱۴ء کا برس آیا اور پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو یہ کرپے ہی تھا جس نے شدید ترین احتجاج کیا اور اپنی ہی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس نے ایک معاشی مسئلہ کے حوالے سے چھڑنے والی جنگ کو انسانی ذہن کی ترقی اور نشوونما کے خلاف ایک سازش اور حماقت قرار دیا۔ حتیٰ کہ جب اس کا اپنا ملک اٹلی اپنے حلیف ممالک کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو کرپے نے شدید مخالفت کی۔ برطانوی منطقی اور فلسفی برٹنڈرسل نے بھی ایسا ہی رد عمل ظاہر کیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں عوام اور حکومت کی نظروں میں معتوب ٹھہرا تھا۔ ایسی صورت حال کا کرپے کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جنگی جنون میں مبتلا حکومت اور عوام کی نظروں میں معتوب و کتراتر اور غدار ٹھہرا۔ لیکن جنگ کے بعد اٹلی کے عوام نے کرپے کو معاف کر دیا۔ اس کے رتبے اور عورت و وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ آنے والے دور میں اسے اٹلی کی نئی نسل نے اپنا رہنما، اپنا فلسفی اور سپا دوست قرار دیا۔ اس کی فکر اور اس کے نظریات کو فتح حاصل ہوئی۔ وہ غالب آیا۔ گیب نوٹی نے اس کے بارے میں صحیح کہا تھا۔

"THE SYSTEM OF BENEDETTOCROCE REMAINS THE HIGHEST CONQUEST IN CONTEMPORARY THOUGHT"

اور آج ساری دنیا اس کے نظریات و افکار سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

ایسٹیک

کردے کی عمد آفریں اور لازوال کتاب ایسٹیک (جہلیات) سے پہلے اس کی کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ اس کی پہلی کتاب "ہسٹریکل میٹرلیم اینڈ دی انٹیکس آف کارل مارکس" تھی۔ کر دے مارکس اور اس کی شہرہ آفاق کتاب "داس کیپٹال" کا زبردست مداح تھا۔ اس نے مارکس کے نظریات سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اپنی سرگزشت میں مارکس اور اس کے نظریات کے اثرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تاہم کر دے کو سیاست سے جو دلچسپی مارکس کے حوالے سے پیدا ہوئی تھی۔ آنے والے دور میں اس کی شدت کم ہوتی چلی گئی۔ بہر حال وہ معاشیات اور مارکس کی تعلیمات و نظریات کو ہمیشہ بہت اہم تصور کرتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگرچہ مارکس کے نظریات نامکمل ہیں لیکن اس نامکمل نظریے نے دنیا کو وہ مواد فراہم کیا ہے جسے ہمیشہ پہلے نظر انداز کیا گیا تھا۔ اپنی کتاب میں وہ معاشیات کو ہی "کلی" سمجھنے کے نظریے کو مسترد کر دیتا ہے۔ وہ مادیت کو بطور فلسفہ بھی تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی سائنس۔

کر دے نے جو اپنا فلسفیانہ نظام پیش کیا اسے "روح کا فلسفہ" کا نام دیتا ہے۔ وہ ہیں تصور خالص (PURE CONCEPT) کا نظریہ دیتا ہے۔ جس سے اس کی مراد عالمی اور آفاقی تصور ہے۔ مقدار، معیار، ارتقا، سب تصورات کا اطلاق وہ حقیقت پر کرتا ہے۔ حقیقت ان کے لہجہ سمجھی نہیں جاسکتی۔

۱۹۰۲ء میں اس کی عمد آفریں اور لازوال کتاب "دی ایسٹیک" شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے دنیا کو ایک نئے نظریے اور فلسفے سے متعارف اور روشناس کرایا۔ اس کتاب میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ خوب صورتی کیا ہے؟

کر دے آرٹ کے مابعد الطبیعیات اور سائنس۔ دونوں پر ترجیح دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ سائنس کی افادیت اپنی جگہ لیکن فنون ہیں حسن اور جمال عطا کرتے ہیں سائنس ہمیں فرد سے ڈور لے جاتی ہے ایک ایسی دنیا میں جو ریاضیاتی گورکھ و صنایع کر رہ جاتی ہے اور آخر میں اس کی کوئی عملی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ جب کہ آرٹ اور فنون ہمیں اصلی فرد کے پاس لے جاتے ہیں اور

ہیں انوکھی حقیقت سے روشناس کراتے ہیں۔

کردچے اپنی اس کتاب میں علم کی دو اقسام بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "علم کی دو اقسام اور اشکال ہیں۔ یا تو یہ وجدانی علم ہے یا پھر منطقی علم۔ وہ علم جو انسانی قوت متخیلہ سے حاصل ہوتا ہے یا پھر وہ علم جو دانش کی دین ہے۔ ایک علم جو فرد کا ہے۔ دوسرا وہ علم ہے جو آفاقی ہے۔ اصل علم ایجاز ہے۔"

کردچے کا نظریہ ہے کہ علم کا منبع ایجاز کی تشکیل ہے آرٹ پر عجیب و غریب انداز سے قوت متخیلہ کی ایجاز سازی کو دانش اور عقل پر فوقیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"انسان اس لمحے تک ایک فن کار ہے جب تک وہ قوت متخیلہ سے کام لیتا ہے۔"

کردچے یہ تسلیم کرتا ہے کہ بڑا فن کار مواد کی اہمیت سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ اور اس کی اہمیت کو بھی سمجھتا ہے وہ دلیل کے طور پر مائیکل اینجل کو پیش کرتا ہے۔ کوئی بھی مصور اپنے ہاتھوں سے تصویر نہیں بناتا بلکہ اپنے ذہن سے۔ کردچے کا نظریہ ہے کہ جمالیاتی تخلیق اور عمل کا جو ہر فنکار کی بے حرکت کاوش متخیلہ میں مستور ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے اسے جو اظہار کرنا ہے وہ اسے کس انداز میں پیش کرے گا۔ وہ اپنے ذہن میں اسے پہلے تخلیق کرتا ہے۔ یہ تصور اس کے ذہن میں وجدان کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ جس کا تعلق کسی صوفیانہ بصیرت سے نہیں ہوتا لیکن اس کے عناصر مکمل نظر تکمیل شدہ تصور موزوں اور متوازن تخیل اور تصور ہیں۔

کردچے آئیڈیسٹ بھی کہا گیا ہے وہ آئیڈیا کو بہت اہمیت دیتا ہے اور اپنی عمد آفری کتاب "ایسٹیک" میں لکھتا ہے۔

"معجزہ فن خارج میں نمود نہیں پاتا۔ بلکہ آئیڈیا کے فن میں پلتا ہے۔"

وہ کہتا ہے کہ ہم جب داخلی دنیا پر لوری طرح غالب آجاتے ہیں جب کوئی تصویر ذہن میں لوری طرح رچ بس جاتی ہے اپنی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اسی لمحے اس کا خارجی اظہار بھی نمود و ظہور میں آجاتا ہے ہم جو کچھ اونچی آواز میں گاتے ہیں وہ پہلے اپنے اندر باطن میں گانے چکے ہوتے ہیں۔ اپنی اس شہرہ آفاق اور عمد آفری تصنیف میں کردچے نے بہت سے سوالات کا جواب دیا ہے اور بہت سے سوال اٹھائے ہیں

آفر خوب صورتی کیلئے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر زمانے کے لوگوں نے فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر جواب دوسرے جواب سے مختلف ہے۔ ہر محبت کرنے والا اپنی محبوبہ کو خوب صورت اور حسین قرار دیتا ہے۔ کر دچے نے اپنی اس کتاب میں ایسے سوالوں کا جواب اپنے فلسفیانہ نظریات و نظام کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ خوب صورتی کو کسی ایج کی ذہنی تشکیل کا نام دیتا ہے۔ یہ تشکیل کسی ایجنز پر مشتمل بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایج ہمارے باطن تصور کو اپنی گرفت میں لیتی ہے اور خوب صورتی کا تعلق اندرونی ایج سے ہوتا ہے اس کی پر اور مجسم صورت سے نہیں۔ جس جمالیات کو سمجھی کر دچے باطنی اور داخلی غور و فکر کا نتیجہ قرار دیتا ہے ہر تخلیق فن کار کے باطن کا اظہار ہے اور ہم اگر کسی چیز کو سراہتے ہیں تو جس سطح تک ہم اسے سراہتے ہیں اس میں جمالیاتی عنصر کو محسوس کرتے ہیں وہ ہماری اس اندرونی قوت کی دین ہے جو ہم نے اپنے والدین سے حاصل کی ہے اور اسی سے حسن جمالیات جنم لیتی ہے ہمارے اپنے اندر کا جمالیاتی اظہار حسین کا سبب بنتا ہے۔ کر دچے لکھتا ہے۔

"IT IS ALWAYS OUR OWN INTENTION WE EXPRESS

WHEN WE ARE ENJOYING A BEAUTIFUL WORK OF ART"

فن کار جمالیات کا خالق ہے اور دیکھنے سننے اور پڑھنے والا اس میں جمالیات کو اپنی حسن جمالیات سے حاصل کرتا ہے۔ جمالیاتی اسرار کو کر دچے متاثر کرنے والی ایج کا نام دیتا ہے۔ خوب صورتی متوازن تاثر میں پائی جاتی ہے۔ اگر اس میں توازن نہیں تو پھر یہ کس چیز کا اظہار کر سکتی ہے اور پھر وہ دو ٹوک انداز میں لکھتا ہے۔

BEAUTY IS EXPRESSION

کر دچے کی یہ تصنیف "ایستھیک" یقیناً عام طالب علم اور قاری کے لیے سہل نہیں ہے۔ اس میں بہت سے سوالات ایسے ہیں جنہیں سمجھنا عام قاری کے بس میں نہیں۔ کیونکہ یہ سمجھنا آسان نہیں ہے کہ جو نئی کوئی شخص ایجنز تراشنے لگتا ہے وہ کس طرح فنکار بن جاتا ہے اور پھر یہ کہ کیا واقعی خوبصورتی اور آرٹ کا جوہر خارجی دنیا سے یکسر کٹا ہوا ہے اور پھر یہ کہ کر دچے کے حوالے سے بہت سے فن پاروں کے بارے میں یہ شہرہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ان کو ہم کس اعتبار

سے خوب صورت قرار دیں گے۔

کردچے کی اس عمدہ آفریں تصنیف نے فنون لطیفہ اور فلسفے کی دنیا میں ان گنت مباحث کو جنم دیا ہے اس نکرانگیز تصنیف نے اپنی اشاعت کے بعد سے اب تک پوری دنیا کو کسی نہ کسی انداز سے متاثر کیا ہے۔ اس کتاب میں جن انکار و نظریات کو پیش کیا گیا ہے ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اور اس اعتبار سے اس کتاب کو فلسفہ جمالیات کے حوالے سے بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس کا یہ مقام اور اعزاز آنے والے دور میں بھی قائم رہے گا۔ کردچے کے حوالے سے ہمارے ہاں ادب و فن میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہماری تنقید نے اپنے خیالات و انکار کا بھی اظہار کیا ہے۔ ہماری تنقید میں کردچے کے حوالے بھی ملتے ہیں تاہم اس کی اس نکرانگیز اور عمدہ آفریں کتاب کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا۔ محمد علی صدیقی کردچے کی سرگزشت کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں اور اپنی جگہ اردو ادب و فن میں ایک بہت بڑا اہم اضافہ ہے۔

پرنسپلز آف سوشیالوجی

ایک ایسا شخص ذہن میں لائیے جس نے فلسفے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور اس نے کبھی کسی کتاب کو سنجیدگی سے پوری طرح نہ پڑھا تھا۔ اور یا کتاب کو ادھورا چھوڑ دیا تھا یا اسے سرسری سا دیکھا تھا۔ ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتابوں کو دنیا ایک عرصے سے پڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کے کام پر بے اندازہ لکھا گیا ہے۔ ہر ریٹ سپنسر ایسا ہی فلسفی تھا۔

اس کے ایک سیکرٹری کو لیسر کا بیان ہے کہ سپنسر نے کبھی کوئی کتاب پوری نہ پڑھی تھی۔ مائٹھی تجربات کا بھی سپنسر کو شوق تھا۔ لیکن اس میں بھی اس نے باقاعدہ تعلیم یا تربیت حاصل نہ کی تھی۔ سپنسر نے خود لکھا ہے کہ وہ ہومر کی کتاب "ایلیڈ" کو پورا پڑھ ہی نہ سکا اور کانٹا فلسفہ سرسری پڑھا تو کانٹا کا ناقدر بن گیا۔

برطانوی فلسفی ہر ریٹ سپنسر ۲ اپریل ۱۸۲۰ء کو پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک سکول ماسٹر تھا اور خاص عقائد رکھتا تھا۔ سپنسر نے ۷ برس کی عمر تک سکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر ریلوے انجینئر سرورڈ اور ریلوے کے پولوں اور پٹرولوں کا ڈیزائننگ بن گیا۔ اس دوران میں اس نے اپنے پیشے سے تعلق رکھنے والے رسالوں میں بھی کئی مضامین لکھے۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے مضامین کا ایک سلسلہ قلم بند کیا اور پھر ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک وہ "اکانومسٹ" کا نائب مدیر رہا۔ اس دور میں اس نے عمرانی اور اخلاقی نظریات کو ایک کتاب SOCIAL STATISTICS میں پیش کیا اور اس دوران میں اس نے بہت سی کتابوں پر تبصرے بھی کیے جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ سپنسر کی دیگر اہم تصانیف میں "دی ڈیولپمنٹ آف ہیمپوٹھیس (۱۸۵۲ء) میسز اینڈ

فیڈشنز (۱۸۵۴ء) جینیس آف سائنس (۱۸۵۴ء) پراگس لاز اینڈ کاز (۱۸۵۴ء) شامل ہیں۔
ڈارون کی تھلکہ خیز "اصل الانواع" کی اشاعت سے کئی برس پہلے ہی ارتقاء کے اصول کا
اطلاق پسنر نے مختلف شعبوں پر کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ بہت دلچسپ حقیقت ہے کہ تیس برس کی عمر تک پسنر کو فلسفے سے کوئی دل چسپی نہ تھی
اور اس کا سیکرٹری کوئیرکھتا ہے کہ پسنر نے کبھی کوئی سائنس کی کتاب بھی پوری طرح نہ پڑھی تھی
پسنر کو یہ خاص اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات اور آگہی کو اپنے ذاتی مشاہدات سے اخذ
کرتا تھا اس کا ذہن عجیب طرح کا تھا۔ وہ معمولی معمولی چیزوں کو ذہن میں جمع کرتا رہتا، اپنے احباب
کو اس حد کر دیتا رہتا کہ وہ زچ ہو جاتے۔

پسنر کو ایجادات سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے بہت سی ایجادات کیں لیکن ان میں
سے کسی کو بھی کمرشل کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں پسنر نے اعلان کیا کہ وہ سسٹم آف سینٹیکل فلاسفی
کے عنوان سے ایک بڑے کام کا آغاز کرنے والا ہے۔ اس کا موضوع تمام علوم کے ابتدائی اصولوں کا
اعطاء اور زندگی میں ارتقاء کا سراخ لگانا تھا اور یہ بھی کہ ارتقاء سماج اور اخلاقیات پر کس طرح اثر انداز
ہوتا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو ایک ایسا شخص کرنے والا تھا جس کی صحت خراب تھی اور عمر چالیس
برس ہو چکی تھی۔ جس کی صحت اس کو قطعاً اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ ایک گھنٹے سے زیادہ دماغی کام کرے
اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ پسنر نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے
کے لیے یہ تجویز سوچی کہ وہ پیشگی خریداری جمع کرے جو اسے چندہ دے سکیں۔ اس نے ایسے لوگوں کی ایک فہرست
تیار کی یہ تصور اس نے اپنے دوستوں کے سامنے بھی رکھا۔ اس نے اپنے منصوبے کو ایک پراپکٹس
کی صورت میں شائع کیا اور یوں اسے یورپ سے ۴۰۰ اور امریکہ سے ۲۰۰ چندہ دینے والے مل گئے۔
جس سے اسے پندرہ سو ڈالر سالانہ آمدنی کی توقع بندھ گئی۔

یوں پسنر نے اپنی تصنیف "فریب پرنسپل" پر کام شروع کیا۔ لیکن اس کی اشاعت کا رد عمل یہ
ہوا کہ اس کے بہت سے چندہ دینے والوں نے آئندہ کے لیے چندہ دینے والوں کی فہرست سے اپنا
نام کوٹا دیا۔ کیونکہ پسنر نے اپنی اس کتاب میں مذہب اور سائنس میں جو یکتائی اور ہم آہنگی پیدا کرنے

کا نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو پسند نہ آیا۔ پینسر کی اس کتاب پر پہنچا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے منہ لکھا جائے گا۔ اور اس کا یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ بعض لوگوں جن میں جان سٹورٹ مل بھی شامل ہے اس کو پیش کش کی کہ وہ اس کی آنے والی کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن پینسر نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ تاہم اس سجان کے بعد اس کے امریکی پرستاروں نے اس کو ایسے مالی تحفظات فراہم کر دیے کہ جس سے وہ اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا اس کی تصنیف پر پرنسپلز آف بیالوجی، ۱۸۶۴-۶۷ اور پرنسپلز آف سائیکولوجی، ۷۲-۷۳ اور پرنسپلز آف سوشیالوجی کے ویباچے میں لکھا کہ وہ اس کام کو مزید آگے بڑھائے گا۔ وہ لسانیات، جمالیات اور اخلاقیات کو بھی موضوع بنانا چاہتا تھا لیکن یہ کام اس کی ذہنی صحت کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔

۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو پینسر کا انتقال ہوا۔ اس کی حروفِ نوشتہ اس کی موت کے بعد شائع ہوئی اور اس کے کام نے اس کے عصروں اور اس کے بعد کی نسلوں کو بے حد متاثر کیا اور ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

پرنسپلز آف سوشیالوجی

پینسر کے فرسٹ پرنسپلز کے سلسلے میں اس کی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی کو سب سے زیادہ اہم اور وسیع سمجھا گیا۔ اپنے نظریات کے حوالے سے پینسر نے لکھا ہے کہ،
ہم اکثر یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ نہ صرف برائی میں اچھائی اور نیکو فاعلیتیں شامل ہوتی ہیں بلکہ نیکو فاعلیتیں بھی صداقت کا ایک عنصر پایا جاتا ہے۔

ارتقار کو پینسر نے زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھنے اور پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا اطلاق بھی کیا ہے۔ اس کی یہ مستقیم نشان تصنیف ایک عظیم ڈرامہ ہے اور وہ اس میں ہمیں انسانی اور کائنات کی زندگی کے زوال اور ارتقار کی داستان سنا رہے۔ انسانی زندگی پر اس کیسے کہ جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اچھے سے بہت قریب ہیں۔

وہ بیالوجی کو زندگی کے ارتقار کا علم کہتا ہے۔ سائیکولوجی کو ذہن کا ارتقار اور سوشیالوجی کو معاشرے اور سماج کے ارتقار کا نام دیتا ہے۔

سوشیالوجی پراس کی یہ عظیم کتاب دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ پسنسرس ہیں اس کتاب میں بتاتا ہے کہ سماجی بریت و تنظیم اور فرد کی بریت و تنظیم میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں جو اشتراک ہے وہ ہر نوع کو منظم کرتا ہے اور اجتماع کے تمام حصے ایک جیسے ہیں اور تمام حصے اور اجزاء ایک ساتھ ایک ہی طرح سے، ایک دوسرے کی مدد کے بغیر نشوونما پاتے ہیں لیکن انتہائی سنبھلے درجے کی چیزیں اور اجزاء اپنی کمزوری اور نقابست کی وجہ سے اپنے آپ کو حالات کے ساتھ پوری طرح مطابقت کی راہ میں مانع ہوتی ہیں۔ اور یوں وہ تباہ کن اعمال کا نشانہ بنتی ہیں۔ اس بے تنظیم صورت اجتماع میں وہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو اس کا دوسرا نچر بناتی اور منظم کرتی ہے۔

پسنسرس کہتا ہے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ان چیزوں کی اصلیت بہت حد تک کھو جاتی ہے اور ان میں جو مشابہت ہوتی ہے وہ بھی کم پڑ جاتی ہے۔ غیر مشابہت پیدا کرنے والا عمل پہلے آہستہ ہوتا ہے۔ پھر تیز ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں اس کی شناخت آسان ہوتی ہے لیکن بعد میں صورت ہی بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اب بھی ان کی "مشابہت باطنی" برقرار رہتی ہے لیکن معاشرہ تر تریب پاتا ہے اور مختلف سطحوں کی اعلیٰ اور کمتر آوازوں کے ساتھ اپنا اظہار کرتا ہے۔ اور یوں ہر معاشرے کے ابتدائی دور اور بعد کے دور میں ایک حد تک تیز پیدا ہوتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ (PRIMITIVE) قبائل اپنے اجزاء اور ترکیبی عناصر کے تضاد و عناصر کا اظہار نہیں کرتے۔ ابتدا میں یوں ہوتا ہے کہ ہر شخص ایک ہی طرح کے اعمال ادا کرتا ہے۔ ان کے مشاغل یکساں ہوتے ہیں وہ زیادہ تر ایک دوسرے پر تکیہ نہیں کرتے۔ شاد و نا دہر ہی وہ دوسرے کے تعاون کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی وسطہ شدہ سردار یا سربراہ بھی نہیں ہوتا البتہ زمانہ جنگ میں لوگ ان کی اطاعت و متابعت کرتے ہیں۔ جو بہترین رہنمائی کی صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں اس کے بعد کے ادوار میں حالات کے تحت اجزاء و ترکیب عناصر میں جو یک جہتی اور مماثلت ہوتی ہے وہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ابتدا میں یہ عمل محدود ہوتا ہے۔ اس کی کئی تہیں اور سطحیں ظہور میں آتی ہیں یوں مختلف اشکال اور اعمال کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں معاشرے اور سماج کی مختلف اکائیاں جنم لیتی ہیں اور یہ اپنی مقامی ضروریات اور حالات اور ذاتی استعداد سے بھی ان میں نمایاں تبدیلیوں اور متنوع اعمال کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یوں اس کے بعد تدریج تبدیلی اور عملی کا نتیجہ مستقل سماجی سرکچر یعنی ڈھانچے کو جنم دیتا ہے۔

سپنسر اس سلسلے میں اپنے جو نظریات پیش کرتا ہے اس کا خلاصہ اس کے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

A SOCIAL ORGANISM IS LIKE AN INDIVIDUAL ORGANISM IN THESE ESSENTIAL TRAITS, THAT IT GROWS, THAT WHILE GROWING IT BECOMES MORE COMPLEX; THAT WHILE BECOMING MORE COMPLEX ITS PARTS ACQUIRE INCREASING MUTUAL DEPENDENCE; THAT ITS LIFE IS IMMENSE IN LENGTH COMPARED WITH THE LIVES OF ITS COMPONENT UNITS, THAT IN BOTH CASES THERE IS INCREASING INTEGRATION ACCOMPANIED BY INCREASING HETEROGENEITY.

(PRINCIPLES OF SOCIOLOGY P.P. 286 NEW YORK EDITION.)

اس طرح سپنسر کے نظریات کے مطابق سماج اور معاشرے کی ترقی اور نشوونما آزادانہ طور پر ارتقاء کے فارمولے پر جاری رہتی ہے اور اس کا حجم بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس کی سیاسی وحدت خاص طور پر نمایاں ہوتی اور پھیلتی پھولتی ہے اور میں خاندان سے مراحل طے کرتی ہوئی ریاست کے مرحلے اور تنظیم تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح دیہات سے شہر جوڑ لیتے ہیں۔ پیشوں اور ہنروں میں پھیلاؤ و عظمت پر انحصار کرتا ہے۔ بڑی تبدیلیوں کا محرک بنتا ہے۔ یوں شہر جب اقتصادی طور پر کفیل ہوتا ہے تو اس کا اثر ملک پر پڑتا ہے اور ملک خود کفیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح قوم بنتی ہے۔

اپنے اس نظریے کا اطلاق سپنسر زندگی کے ہر شعبے پر کرتا ہے۔ سائنس، آرٹ، مذہب اور حکومت سب اس کے تابع ہیں۔ مذہبی سلسلے میں ارتقاء کے مراحل سپنسر کے نظریے کے مطابق اس طرح طے ہوتے ہیں کہ پہلے مختلف اقوام اور ممالک کے ہزاروں اور ان گنت دیوبی دیوتا تھے جن کی انسان پوجا کرتا تھا اور ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے انسان ایک مرکزی قوت، ایک خدا اور ایک قادر مطلق کے تصور تک پہنچا۔

اپنے نظریات و افکار کے حوالے سے سپنسر بے حد دیانتدار تھا۔ اس نے اپنی خود نوشت میں

I AM A BAD OBSERVER OF HUMANITY IN THE CONCRETE,
BEING TOO MUCH GIVEN TO WANDERING INTO THE ABSTRACT.

اس ABSTRACTION کا اطلاق اس کے نظریات نے دنیا کے افکار پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اس کی اس دوہزار صفحات پر مشتمل کتاب پر بہت تنقید بھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی اثر پذیری سے کوئی انکار نہیں کر سکا۔

پرنسپلز آف سوشیالوجی عظیم تصنیف ہے۔ ہمارے ہاں پینسر کا حوالہ تو متعدد انداز سے آیا ہے۔ لیکن اس کے کسی کام کا ترجمہ نہیں ہوا۔ لیکن جدید علوم اور انگریزی زبان کے حوالے سے پینسر ہم پر بھی اثر انداز ہوا ہے اور بطور خاص اس کی یہ کتاب دنیا کی ان کتابوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی فکر پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اور زرتشت نے کہا

”کیا میری بات سمجھ لی گئی ہے۔؟“

یہ جملہ نظریے کی آخری کتاب **Ecco Homo** کا آخری جملہ ہے۔ ۱۸۸۸ء میں مکمل دماغی پاگل پن کے حملے سے چند ہفتے پہلے نظریے نے بڑے قنوطی انداز میں اپنے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا آغاز کیا جس میں اس نے اپنی کہانی بیان کی۔ اپنی کتابوں اور تصانیف پر روشنی ڈالی۔ اس کی یہ آخری کتاب **Ecco Homo** ہے جو جرمن زبان کی خوبصورت ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ نظریے کو اپنے ہوشوں سماں کے آخری لمحے تک یہی احساس رہا کہ اسے پوری طرح سے سمجھا نہیں گیا ہے۔ کیا میری بات سمجھ لی گئی ہے؟

حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی زندگی میں اور پھر اس کی موت کے بعد بھی آج تک اسے بڑی طرح نہیں سمجھا گیا۔ جدید فلسفیوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا فلسفی ہو جسے نظریے کی طرح غلط سمجھا گیا ہو۔ اس کو بیشتر صورتوں میں غلط انداز میں پیش کیا گیا۔ حتیٰ کہ نازی دانشوروں نے تو اسے بہت ہی غلط اور بھونڈے انداز میں پیش کیا۔ جس سے یہ تاثر ملا کہ فاشیزم اور نازی ازم جیسے غیر انسانی اور جھیاہک نظاموں کا سرچشمہ۔ نظریے کے انکار و نظریات ہیں اس کے فوق البشر کے نظریے کی جس طرح مٹی پلیدی کی گئی اس کی مثال پوری انسانی فکر میں نہیں ملتی۔

نظریے کو پڑھنا سمجھنا اور پھر ہضم کرنا مشکل کاموں میں ایک ہے۔ کیونکہ خود نظریے کے الفاظ میں ”درو کے روحانیت بننے تک“ کے مراحل بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔

بہر حال اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے فکر و فلسفے پر نظریے کے

اثرات بہت گہرے ہیں۔ جارج برنارڈشا، تھامس جان، ٹراں پال، سارتر، آکیر کا میو اور اقبال پر اس کے اثرات بہت واضح اور قوی ہیں۔

اقبالیات کو تو پوری طرح سمجھنے کے لیے نطشے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اقبال کے مرد مومن کا تصور نطشے کے فوق البشر Superman سے مستعار ہے علامہ اقبال نے مرد مومن کو اپنے مخصوص نظریات اور مذہب کے حوالے سے اپنا رنگ و روپ دیا اور اس کے خدو خال اباگر کیے۔ لیکن اس کے پس منظر میں نطشے کا وہی 'فوق البشر' کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اور نطشے کے افکار کا موازنہ ایک علیحدہ باب اور اہم اور دلچسپ مطالعہ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

نطشے کی تصانیف میں اس کی سب سے اہم تصنیف اور زرتشت نے کہا، 'تسلیم کی گئی ہے انگریزی میں اس کے متعدد تراجم Thus spoke Zarathustra کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اردو اس اعتبار سے میرے نزدیک بہت خوش قسمت ہے کہ برسوں پہلے برصغیر کی تقسیم سے پہلے اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے "اور زرتشت نے کہا" کے عنوان سے براہ راست جوہنی زبان سے کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا یہ ترجمہ ان دنوں کیاب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں نطشے کی اس تصنیف کا اس سے بہتر ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو نطشے کو اپنی ہر کتاب بہت عزیز تھی لیکن خود سے بھی اس کا بھرپور احساس تھا کہ اس کی سب سے اہم تصنیف "اور زرتشت نے کہا" ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نطشے کی ساری فلسفیانہ فکر اسی کتاب میں یکجا ہوئی ہے۔

۱۰ اور زرتشت نے کہا۔ محض فلسفہ کی ہی ایک بے مثل کتاب۔ نہیں ہے بلکہ اپنے شاندار بے مثل تخلیقی اور ادبی اسلوب کی حیثیت سے بھی اس کا شمار دنیا کی معدودے چند کتابوں میں ہوتا ہے فلسفے کو اتنے موثر، تخلیقی ادبی اور مثالی انداز میں ایسے جاندار اسلوب میں نطشے کے علاوہ کم ہی فلسفیوں نے پیش کیا ہے۔ عام طور پر فلسفے کی کتابیں بے حد خشک اور بے کیفیت ہوتی ہیں۔ لیکن اور زرتشت نے کہا "اپنے اسلوب، ڈرامائی انداز، شعری حسن اور اعلیٰ ترین تخلیقی اسلوب کی بنا پر فلسفے کی کتابوں میں یگانہ اور منفرد کتاب ہے۔ اسے پڑھنا بذات خود ایک بہت بڑا ادبی اور فکری

سطح کا بے مثل تجربہ ہے۔ !

زرتشت کے حوالے سے اس کتاب میں نطشے نے اپنے نظام فکر کو پیش کیا ہے۔ اپنے افکار اور فلسفے کو پیش کیا ہے، اپنے افکار اور فلسفے کو پیش کرنے کے لیے نطشے نے زرتشت کو ترجمان کوپلہ بنایا یہ سوال بنیادی بھی ہے اور بہت اہم بھی۔ نطشے نے اس سلسلے میں جو دو وضاحت بھی کی ہے۔ زرتشت کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ قدیم ترین ایرانی مذہب کے بانی اور پیغمبر تھے۔ اس مذہب کی کتاب "زندہ رستا" ہے۔ اس مذہب کا بنیادی تصور وہ کش مکش ہے جو "آہورا مزدا" یعنی خیر اور روشنی کا دیوتا اور اہرمن یعنی شر اور تاریکی کے دیوتا کے درمیان جاری رہتی ہے۔ نطشے نے زرتشت کو اپنا ترجمان کیوں بنایا۔ اس کا جواب نطشے کے الفاظ میں ہی پڑھیے۔

- مجھ سے یہ پوچھا نہیں گیا حالانکہ یہ سوال کیا ماننا چاہیے تھا۔ کہ زرتشت کا یہ نام میرے نزدیک کیا مطلب و مفہم رکھتا ہے۔ زرتشت۔ پہلا مفکر اور ان تھا جس نے خیر اور شر کی کش مکش کو دیکھا۔ اور یہ وہی کش مکش ہے جو انسانی زندگی میں اعمال کے پس منظر میں پسے کی طرح گردش کرتی ہے۔ اس نے اعتدالیات کو مابعد الطبیعیات کی مملکت تک پہنچا دیا۔ میرے لیے جو چیز بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ زرتشت دوسرے تمام مفکرین کے مقابلے میں زیادہ راست باز ہے۔ وہ اس میدان میں اکیلا ہے۔ اس کی تعلیمات سچائی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔"

Ecco Homo نطشے:

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زرتشت کا زمانہ۔ ساتویں صدی قبل مسیح

کا زمانہ ہے۔ !!

~*~

فریڈرچ ویلیلم نطشے ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو لیبزگ کے قریب پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک پادری تھا۔ مارے گھرانے کا ماحول مذہبی تھا۔ نطشے پر عیسائی توارثی مذہبیت خالص عرصے تک سوار رہی اس نے پروفٹا سکول اور پروفٹون اور لیبزگ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ فلاسوفی میں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ اور اسی زمانہ طالب علمی میں اس نے پہلی بار شوپنہار کو پڑھا۔ اور پھر ساری عمر وہ شوپنہار کا مدعا رہا۔ نطشے فلاسوفی میں اپنا نام پیدا کر چکا تھا کہ چوبیس برس کا ہی تھا کہ جب اسے باسل یونیورسٹی میں

کلاسیکل فلاوجی کے شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ طالب علمی کے زمانے میں اسے سفلس کامرین لاسٹی ہوا۔
نطشے نے ساری عمر شادی نہ کی اور نہ ہی کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اسکے کسی عورت سے تعلقات رہے ہوں
۱۸۶۵ء میں اس کی علالت کا جو دور شروع ہوا وہ اس کی موت تک جاری رہا۔

نطشے جلد ہی مذہب سے بے گانہ ہو گیا۔ عیسائیت کے خشت لانا اس کا رد عمل بہت شدید تھا
شاید ہی کوئی فلسفی اور مفکر عیسائیت کا اتنا مخالف رہا سو نطشے کی کتاب "ایٹیڈ کرائسٹ" اس کا ثبوت
ہے۔ اسی زمانے میں اس کی ڈگریز سے دوستی ہوئی جو موسیقار کی حیثیت سے نمایاں ہو رہا تھا۔ نطشے
نے ویگنر کے روپ میں جرمنی کا نیا بیرو دیکھا۔ لیکن اد میں ان دونوں کے درمیان بگڑ گئی اور نطشے
کو ویگنر کے خلاف شدید اعتراضات پیدا ہوئے جو اس کی ایک کتاب کا موضوع بھی بنتے ہیں۔

۱۸۶۹ء میں اسے باسل یونیورسٹی میں کلاسیکل فلاوجی کا استاد مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۸۶۹ء
میں اسے امتحان دیے۔ لیبریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دے دی گئی۔ ۱۸۷۱ء تک اس کی
صحت بگڑنے لگی تھی۔ ۱۸۷۲ء میں اس کی کتاب "دی برنڈ آف ٹریجڈی" شائع ہوئی۔ وہ بیماری
کی وجہ سے تعلیمی فرائض انجام نہ دے سکتا تھا۔ اور اس کو مختلف اوقات میں رخصت لینا پڑتی۔
اس کی بہن الزبتھ نے اس کی تیمارداری کی ذمہ داری سنبھالی لی تھی۔ اس نے اٹلی اور سوئٹزر لینڈ
کی طویل سیاحت بھی کی۔ اس کی کتاب Human all too Human ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی۔
اس کتاب کے حوالے سے ویگنر نے لکھا تھا کہ یہ کتاب گواہی دیتی ہے کہ اس کا مصنف ذہنی اور ذہانی
بیماری میں مبتلا ہے۔

۱۸۷۹ء میں نطشے کی درخواست پر اسے یونیورسٹی نے تمام فرائض سے بیکدوش کر دیا۔ ۱۸۷۹
جون کو اسے پنشن دے کر ریٹائر کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کی صحت اب اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ اپنے تعلیمی فرائض
انجام دے سکتا۔ نطشے نے اپنی باقی ماندہ عمر اسی پنشن پر بسر کی۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی کتاب DAY
BREAK - اور ۱۸۸۲ء میں GAY SCIENCE شائع ہوئی۔

اور زرتشت نے کہا۔ کا پہلا حصہ نطشے نے جنوری فروری ۱۸۸۳ء میں لکھا۔ اسی سال
ویگنر کا انتقال ہوا۔ بیماری سے نطشے کو کچھ سنبھالا ملا تھا۔ اپنی بہن الزبتھ سے اس کی کچھ عرصہ پہلے
صحن چکی تھی۔ اس برس پھر الزبتھ سے صلح ہو گئی۔ اور پھر الزبتھ نے ہمیشہ نطشے کے آغری سانس

تک اس کی نگہداشت اور تیارواری کی۔ اور زرتشت نے کہا کہ یہ دونوں حصے ۱۸۸۳ء میں ہی شائع ہوئے۔ تیسرا حصہ اس نے ۱۸۸۴ء میں لکھا۔ اور نئی کتاب *Will to Power* پر کام شروع کیا، لیکن یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ ۱۸۸۵ء میں اس نے "اور زرتشت نے کہا" کا چوتھا اور آخری حصہ مکمل کر کے اسے محدود تعداد میں سخی طور پر شائع کرا دیا۔ ۱۸۸۶ء میں اس کی کتاب *Beyond good and Evil* شائع ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں "ڈیگریز کیس" ۱۸۸۸ء

Twilight of Gods. میں اس نے کسی کتاب میں شروع کیس جو اذھوری رہی۔ لیکن

اور *Anti christ* لکھی اور شائع کیں۔ *Ecce Homo* اس کی آخری کتاب تھی ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی۔ ۱۸۸۹ء میں اس پر پابلن کا شدید دور پڑا وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ نطشے کے مقدر میں تھا کہ وہ ایک بار پھر بچے بن جائے۔ اب وہ ذہنی اور دماغی اعتبار سے ایک بچے جیسا تھا۔ اس دوران میں اس کی تصانیف کے *collected* ایڈیشن شائع ہونے لگے۔ اس کی بہن الزبتھ نے اس کے تمام کاغذات اور تصانیف کو اپنے انتظام و انصرام میں لے لیا تھا۔ وہی اس کی وارث تھری۔ ۲۰ اپریل ۱۸۹۷ء کو نطشے کی والدہ کا انتقال ہوا لیکن نطشے کو کچھ خبر نہ ہوئی وہ ہوش و حواس سے بے گانہ بچہ تھا۔ ۱۸۹۹ء میں نطشے کے *collected works* کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اور ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو نطشے کا انتقال ہونا ہے۔

~*~

نطشے کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے لیے اس کے کام کا جائزہ لینا بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ نہ میں فلسفی ہوں نہ دانشور۔ لیکن نطشے کے طالب علم کی حیثیت سے چند باتوں کا انہما میرے لیے مزوری ہے۔ نطشے کی کتابوں میں سے "اور زرتشت نے کہا" کو میں نے کئی بار پڑھا ہے۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ اسے اتفاق کیے کہ نطشے کی بیشتر کتابوں کو اردو ہونگ ڈیل نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ آہ۔ جے ہونگ ڈیل وہ مترجم ہے جس نے نطشے کے فکر اور اس کی روح کو سمجھا ہے۔ اس کے حوالے سے میں نے نطشے کی ان تصانیف کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ *Ecce Homo* نطشے کی وہ تصنیف ہے جو اس کی اپنی خود نوشت ہے۔ اس میں اس نے اپنی کتابوں کے بارے میں بھی اپنی رائے دی ہے یہ گویا *self Advertisme*

Antichrist اور Twilight of God کی ایک اڑکھی مثال ہے

کے علاوہ اس کی دوسری کتابوں کو بھی کمی بار پڑھا ہے۔ نطشے کو اگر پوری طرح سمجھا اور فہم نہیں کیا گیا تو اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ مثلاً عیسائیت کے بارے میں اس کی شدید مخالفت جو نفرت کی حدوں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے بھی اس کے بارے میں تعصب پیدا کیا ہے۔ نطشے کی یہ کتاب Antichrist مذاہب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ضرور پڑھنی چاہیے۔ عیسائیت پر اس کے بعض اعتراضات ایسے ہیں جن کا آج تک جواب نہیں دیا جاسکا۔

”اور زرتشت نے کہا“ اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ فکر و فلسفہ کے اعتبار سے بھی اور اسلوب و انظمام کے حوالے سے بھی Ecco Homo میں خود نطشے نے اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”اس جیسی تحریر پہلے کبھی نہیں لکھی گئی نہ مسوس کی گئی نہ ایسا کرب ہی سہا گیا۔“ یہ تو محبت کرنے والے عاشق کا نغمہ ہے جسے پوری دردمندی سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

”اور زرتشت نے کہا“ چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں زرتشت اپنی تنہائیوں

کی دنیا چھوڑ کر نیچے اُترتا ہے اور خدا کی موت کا اعلان کرتا ہے اس کا یہ جملہ God is dead اس عہد کا سب سے اہم اور مقنا زعفریہ جملہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جملے کی حقیقت کو کم ہی سمجھا گیا ہے اسے محض ایک سنسنی خیز اعلان کی طرح سمجھا اور پڑھا گیا ہے۔ حالانکہ اسے ”اور زرتشت نے کہا“ کے پورے بیاق و سباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نطشے کا جو مفہوم اس جملے سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کو اب انسانی حالات اور مہر و نصیبت میں ہی حل کرنا اور سمجھنا ہوگا اور بلند کوفوق البشر Superman بننا ہوگا۔ انسانی تقدیر کے ساتھ ساتھ کائنات کی تقدیر کا مالک اب فوق البشر ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو اقبال کے ہاں اس طرح سے ڈھل جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتن کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے تا تیری رضا کیلے

اور زرتشت نے کہا، میں نطشے خدا کی موت کے اعلان کے بعد اپنی تعلیمات پیش کرتا ہوں۔ جو نطشے کا فلسفہ ہے۔ زندگی کے ہر موضوع پر وہ اظہار خیال کرتا ہے وہ کتا ہے۔

میں ان لوگوں کو یہ کھانا چاہتا ہوں کہ ان کے وجود کے کیا معنی ہیں اور یہ فرق البشر ہے۔
 نطشے ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں اپنے سب سے اہم سائل کا خود تجربہ کرنا چاہیے۔ اور یہ سائل کیا
 ہیں۔ انسانی جسم یعنی وجود اور اس کی روح۔ وہ انسانی خیالات کو تجربات کا درجہ نہیں دیتا
 کیونکہ انسان نے جو دنیا اپنے لیے تعمیر کی ہے۔ جس دنیا میں وہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا ہے
 وہ دنیا ہی ایسی ہے جو غلطیوں اور انسانی خامیوں سے الٹی پڑی ہے۔ انسانوں کے لیے نطشے
 کا پیغام بڑا واضح ہے۔ وہ لکھتا ہے،
 "فوق البشر روح کائنات ہے۔"

تمام دنیویا مرچکے ہیں اور اب ہم چاہتے ہیں کہ فرق البشر زندہ رہے۔ نطشے خدا اور اولیاء
 کی موت کے بعد ان کے وارث اور جانشین، فرق البشر کی تبلیغ کرتا ہے۔ پہلے حصے میں وہ بائیس
 موضوعات پر گفتگو کرتا ہے۔ ان میں روح کی تربیت، آزادی، تخلیق، خود پر قابو پانا، مابعد الطبیعیاتی
 دنیا، جبر مانہ جبلت، مسرت، تقدیر، ریاست، سہوایت اور اس کے مختلف روپ اور سچی دوستی
 اپنے ہمسائے سے ایسی ہی محبت کرو جیسے اپنے آپ سے کرتے ہو پورا عمر امن اور تنقید انسان کے
 لیے تنہائی کی ضرورت اور اس کے نقصانات، عورت اور اس کی نظرت، انسان کی نظرت، اچھی
 اور بُری شادیاں، اچھی اور بُری اموات، ان تمام تعلیمات کے پس منظر میں اصل موضوع برقرار
 رہتا ہے۔ نطشے کا فلسفہ۔ جسے اس کے ہمراہی ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

Man is something must be overcome.

دوسرے حصے میں بھی فرق البشر کی تبلیغ ہے اور اسے خدا کا جانشین بتایا گیا ہے۔ منظم
 مذہب اور رہبانیت سچ اور جھوٹ، رحم کے خلاف نظریے۔ سچی اور جھوٹی حقیقتیں اور سچی
 اور جھوٹی فلسفہ، اس دوسرے حصے میں نطشے کی نثری نظریں بھی شامل ہیں نثری نظموں کی مخالفت
 کرنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ

اور زرتشت نے کہا کہ تیسرے حصے میں زرتشت ہمیں اکیلا ہی خود سے باتیں کرتا
 ملتا ہے پہلے حصوں کے موضوعات پر اس حصے میں بھی اظہار خیال ہوا ہے۔ اس حصے میں اس
 کی شخصیت اور تعلیمات، ابدیت سے بھگانا رہ جاتی ہیں۔

چوتھا اور آخری حصہ۔ وہ ہے۔ جو نطشے نے ۱۸۸۴ میں پہلے تین حصوں کو مکمل کرنے کے بعد کتاب کو مکمل سمجھنے کے باوجود پھر لکھا تھا۔ ۱۸۸۴ میں اس نے سوچا کہ ابھی "اور زرتشت نے کہا" میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش باقی ہے۔ اس کے آخری حصے کو لکھنے کے بعد نطشے نے اسے محدود اور سنجی ایڈیشن کی صورت میں ۱۸۹۲ میں شائع کرایا تھا۔ یہ حصہ اسلوب کے اعتبار سے پہلے تین حصوں سے خاصا مختلف ہے۔ لیکن اس میں اس کی تعلیمات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ اس حصے میں تمثیلی انداز میں اس نے جس شخص کو سب سے بد صورت شکل میں دکھایا ہے۔ وہ شخص ان لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو محدود اور آزاد خیال کہتے ہیں۔ نطشے کو محدود اور آزاد خیال مفکروں سے شدید نفرت تھی۔ جس کا اظہار اس نے اپنے انداز میں کیا ہے۔

"اور زرتشت نے کہا" دنیا کی چند بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ فلسفے کی وہ کتاب ہے جس نے پوری دنیا کے فکر کو متاثر کیا تھا۔ نطشے کو اپنی اس کتاب پر بڑا فخر تھا۔ یقینی امر ہے کہ کسی مضمون کے ذریعے اس کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ کسی کتاب سے پورا انصاف تو اسے پڑھ کر ہی کیا جاسکتا ہے اور میرے جیسے طالب علم کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ کو ان کتاب کے بڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ جنہوں نے انسانی فکر کو تبدیل کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

نطشے نے اپنی کتاب Anti christ کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔

"یہ کتاب چند لوگوں کے لیے ہے اور ان میں سے بھی شاید ابھی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ کل یا برسوں... یا مستقبل کا زمانہ میرا ہے۔ بعض لوگ مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔" نطشے کے الفاظ نہ صرف اس کی پوری تصانیف پر بلکہ "اور زرتشت نے کہا" پر بھی صادق آتے ہیں۔

یہ کتاب "اور زرتشت نے کہا" یقیناً ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ یہ خاص لوگوں کے لیے ہے اور یہ خاص لوگ۔ نطشے کی موت کے بعد پیدا ہو چکے ہیں اور آج کل پوری دنیا میں نطشے کا نام گونجتا ہے اور پوری دنیا میں یہ کتاب پڑھی جاتی ہے۔

کنسیپٹ آف ڈریڈ

کیرکیگارڈی سب سے اہم تصنیف ہے بلکہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس نے بیسویں صدی کے جدید افکار اور فلسفے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں بعض ناقدوں اور عالموں کا کہنا ہے کہ کیرکیگارڈی اس تصنیف نے بیسویں صدی کی فکر کو جس سطح پر متاثر کیا ہے اور اس کے جو دور رس اور اہم اثرات عہد حاضر کی فکر پر نظر آتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اسے ان کتابوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ جو بنیادی تبدیلی لانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

”کنسیپٹ آف ڈریڈ“ اس اعتبار سے بھی اہم کتاب ہے کہ اس میں سورین کیرکیگارڈی بنیادی فکر نظریات اور فلسفہ کیجا ہو گئے ہیں۔

کیرکیگارڈی ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کی تربیت بڑے کڑے قسم کے مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس نے عشق بھی کیا اور اس عشق نے کیرکیگارڈی کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے وہ جس خاتون سے عشق کرتا تھا اس سے منگنی بھی ہو گئی اور شادی کا مرحلہ طے ہونے والا تھا کہ منگنی ٹوٹ گئی۔ اس خاتون نے کیرکیگارڈی کو ٹھکرا دیا۔ اس کا رد عمل کیرکیگارڈی پر بہت شدید انداز میں ہوا۔ یہ واقعہ اس کی پوری زندگی پر چھا جاتا ہے اور وہ محبت میں ناکامی کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو ساری عمر کے لیے لکھنے پڑھنے اور مطالعے کے لیے وقف کر دے گا

اس نے ایسا ہی کیا اور ساری زندگی کھینے پڑھنے میں بسر کر دی اس نے اپنی زندگی میں جو کتابیں لکھیں وہ فرضی ناموں سے شائع کر آ رہا۔ کیونکہ کیرگیارڈ کو معلوم تھا کہ اس کی کتابوں کی بہت مخالفت کی جائے گی اور یہی ہوا۔ اس نے جو افکار و نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے وہ تھکے خیز اور سنگامہ پر درختے۔ اس کی کتابوں پر بہت لے وے ہوئی۔ ان کی بے حد مخالفت کی گئی۔ لیکن اسے کیا کیسے کہ اس کے نظریات افکار کو ہی آج فلسفہ وجودیت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کیرگیارڈ ہی تھا۔ جس کے افکار و نظریات سے بعد میں آنے والے فلسفیوں ہبرل اور ہیدگر نے فیض اٹھایا اور فلسفہ وجودیت کو فروغ دیا۔ سارتر نے بھی کیرگیارڈ کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ سارتر کیرگیارڈ کا پر جوش مداح بھی تھا۔ اور ناقد بھی۔

نظمت کی طرح کیرگیارڈ بھی عیسائیت کا بڑا ناقد تھا۔ بلکہ اس سلسلے میں اسے اولیت حاصل ہے کہ کیرگیارڈ کو عیسائیت پر جو اعتراضات تھے ان کی وجہ سے بھی اس کی بہت مخالفت ہوئی۔ اس نے جو کتاب عیسائیت کی مخالفت میں لکھی تھی وہ اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ اس کا پہلا انگریزی ترجمہ ۱۹۴۷ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔ کیرگیارڈ کا انتقال ۱۱ نومبر ۱۸۵۰ء کو ہوا۔ چالیس یا پچاس برس کی عمر میں ہی اس نے جو کچھ لکھا وہ آج تک بحث اور غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کا پڑھا کھا طبقہ کیرگیارڈ سے نا آشنا ہو۔

”دی کونفیسپٹ آف ڈریڈ“

کیرگیارڈ کی یہ کتاب ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کی یہ کتاب اس کے فلسفے کی بنیادی فکر اور روح کو پیش کرتی ہے۔

کیرگیارڈ مغرب کے فلسفیوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کے ہاں صداقت کا تصور بھی دوسرے فلسفیوں سے بہت مختلف ہے۔ کیرگیارڈ کے ہاں صداقت مکمل ہے۔ اس کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ غیر متبدل اور دائمی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے باوجود یہ صداقت خاص فرد کے اندر پائی جاتی ہے۔ اور یہ اس کے خصوصی اعمال سے جنم لیتی ہے۔ کیرگیارڈ دوسرے فلسفیوں سے جس اعتبار سے خاص طور پر ممتاز اور منفرد دکھائی دیتا ہے وہ اس کی عقلیت کے مقابلے میں غیر عقلی عوامل پر اصرار ہے وہ انسانی زندگی میں غیر عقلی عوامل اور نگاہ کو بہت اہمیت دیتا

ہے اس کے علاوہ مذہب کو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں احساں جمال، اخلاقیات اور مذہبی مسائل کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

کیرکیگارڈ کو اس کی مذہبیت کی وجہ سے جدید مغربی فلسفے اور دینیات کا بہت بڑا عالم بھی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی اس کتاب میں کیرکیگارڈ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے وہ اسحاقؑ سمجھتے ہیں کیونکہ عہد نامہ قدیم میں بھی اسے اسمحاقؑ ہی بتایا گیا ہے۔ جبکہ اسلام میں حضرت اسماعیلؑ کا ذکر ہے، اہم قارئین کی سہولت کے لیے یہاں حضرت اسمحاقؑ کی بجائے حضرت اسماعیلؑ کا ہی نام دیں گے اس کے قصے کو اپنی کتاب اور فلسفے کا مرکز بنایا ہے۔ مغربی فلسفے اور جدید فکر کو سمجھنے کے لیے اس قصے کو جو علامتی رنگ دے کر اس کی تفسیر کیرکیگارڈ نے اس کتاب میں پیش کی ہے وہ بہت اہم ہے۔ اور اس کے حوالے سے ہم جدید یورپی فلسفے اور فکر کو بہت بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے اور پھر کیرکیگارڈ کے نظریات کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کیرکیگارڈ صداقت کو مستقل بالذات قرار دیتا ہے۔ حالانکہ مغربی فلسفے میں صداقت کو مستقل بالذات تسلیم نہیں کیا جاتا۔ مغرب کی قدیم روایات اور فکر سے کیرکیگارڈ کا یہ انحراف بڑی اہمیت رکھتا ہے اور کیرکیگارڈ کے بعد آنے والے فلسفیوں نے اس سے جو اشارات قبول کیے ہیں اس سے کیرکیگارڈ کی اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کیرکیگارڈ کی یہ کتاب خاصی پیچیدہ ہے اس کا اسلوب فلسفیانہ تجزیے کا ہے اس لیے خاصا خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن بعض حصے بڑے جذباتی انداز میں بھی لکھے گئے ہیں۔

کیرکیگارڈ کو اس امر سے بڑی دل چسپی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ خدا کے حکم پر اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیے لے کر ہمارے تھے تو وہ کیا سوچ رہے تھے۔ کیرکیگارڈ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا موضوع بنایا ہے اس کتاب پر بعض ناقدوں نے اعتراض کیا ہے کہ کیرکیگارڈ کا موضوع ایک برگزیدہ رسول ہیں۔ لیکن وہ انہیں ایک عام آدمی کی حیثیت میں پیش کرتا ہے اور ان کی بشریت پر زور دیتا ہے۔ اور عام آدمی اور ایک پیغمبر کی نفسیات میں جو فرق ہوتا ہے اسے کیرکیگارڈ نے پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا اس اعتراض کی شدت ہمارے خیال میں

کیرکیگارڈ کے اس فلسفے کے سامنے کچھ کم پر جانے تھے کہ کیرکیگارڈ حضرت ابراہیم کو اس انداز میں انسانوں کے سامنے پیش کرنے کا خواہاں ہے کہ اگر عام انسان بھی کوشش کریں تو وہ حضرت ابراہیم کی تعلیمات اور عمل سے فیضیاب ہو کر ان کی طرح قربانی کی راہ پر بخوشی چلنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

کیرکیگارڈ اپنی اس کتاب میں انسان کا جو تصور پیش کرتے ہیں اس کی ہدایت ترکیبی و دعویٰ پر مشتمل ہے۔ یعنی ایک جسم، دوسرا اس کا ذہن یعنی نفس، حضرت ابراہیم کے قصے کے حوالے سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر غور و فکر اس کتاب کا موضوع ہے ان سوالوں کو بھی کیرکیگارڈ نے ہی تلاش کیا ہے اور پھر ان پر غور و فکر کے بعد وہ ان کے نتائج بھی سامنے لاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ حضرت ابراہیم کو حکم دیتے ہیں کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک باپ کے لیے بڑا تکلیف دہ اور کرناک ہوتا ہے۔ ایسی قربانی اخلاقیات اور انسانی جذبات کی نفی کرتی ہے۔ یہاں پر کیرکیگارڈ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا کوئی ایسا مقام بھی ہے جہاں اخلاقی اصول معطل ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی مطلق فرض بھی ہوتا ہے۔ اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو یہ حکم دیا تو انہوں نے اس کو سزا دیکھا کسی کو نہیں بنایا حتیٰ اگر اس بیٹے کو بھی پیشگی اطلاع نہیں دی جسے وہ قربان کرنے کے لیے جانے والے تھے۔ آخر اس خاموشی کا راز کیا تھا؟

کیرکیگارڈ نے قصہ ابراہیم کو فلسفے اور نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے کیرکیگارڈ لکھتا ہے کہ دراصل یہ حضرت ابراہیم کے ایمان کا امتحان تھا اور ایمان کی تعریف۔ کیرکیگارڈ یوں کرتا ہے کہ یہ ایک شدید جذبہ ہے گریزاں کیفیت نہیں۔ اور اس کا اگر تعلق داغلیت سے ہے کیرکیگارڈ کے نزدیک حضرت ابراہیم عام اخلاقیات کے نقطہ نظر سے بہت ماورا ہو چکے تھے۔ یہاں کیرکیگارڈ اخلاقیات اور اناقت کو مترادف اور تقریباً ہم معنی ہی قرار دیتا ہے۔ جس پر بعد میں آنے والے بعض فلسفیوں نے اعتراضات ہی کیے ہیں تاہم کیرکیگارڈ تو تسلیم کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم اگر اپنے بیٹے کی قربانی کے لیے تیار ہوئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خدا کی خوشنودی چاہتے تھے۔

کیئرگیارڈرہیں اپنی اس نکمرا فردز کتاب دمی ٹویسٹ آف ڈریڈ میں بتاتا ہے کہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں عمومیت اور اخلاقیات کے نظریے محفل ہو جاتے ہیں۔ اور عظیم انسان اخلاقیات سے بہت آگے نکل کر بلند ہو جاتا ہے۔ بیٹے کو ہلاک کرنے کا عمل وارادہ اخلاقیات کے اعتبار سے جرم ہے لیکن جب خدا فرض مطلق کو عائد کر دے تو پھر یہ جرم نہیں رہتا۔ اس کے حکم کی تعمیل کرنا مقصد بن جاتا ہے۔

کیئرگیارڈ کی اس کتاب کے حوالے سے ہم کیئرگیارڈ کے فلسفے کے اس پہلو سے بطور خاص متاثر ہوتے ہیں کہ وہ اخلاقیات کو ایک اہم مسئلہ سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تسلیم و رضا پر بھی بہت زور دیتے ہیں کہ انسان کو خدا کی مرضی کے خلاف احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ ہر مصیبت اور آفت کو رضائے خداوندی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ تاہم انسان کرب محسوس کرتا ہے۔ قصہ ابراہیمؑ کے حوالے سے کیئرگیارڈ بھی ہیں اس کتاب میں بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بہت بڑے کرب کو برداشت کرنا پڑا۔ ایک طرف وہ ایسا کام کرنے والے تھے جو اخلاقیات اور جذبات کے برعکس تھا اور اپنے اس عمل کی کوئی توجیہ بھی لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ تنہا محسوس کر رہے تھے مگر یہی کرب ان کے لیے لازمی اور ناگزیر تھا اور اس کے ذریعے وہ وجود میں آئے۔

کیئرگیارڈ نے کرب کا جو فلسفہ اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کو بعد میں فلسفہ وجودیت کے ملنے والوں نے تسلیم و قبول کیا اور اپنی فکر کا حصہ بنایا۔

کیئرگیارڈ انسان اور خدا کے ذاتی رشتے کی تفسیر بھی اس کتاب میں کرتا ہے اس رشتے کو وہ خدا کی محبت اور ایمان کا نام دیتا ہے اور یہ ایسے انسان کو حاصل ہوتی ہے جو خدا کے عائد کردہ فرض مطلق کو قبول کرے۔ کیئرگیارڈ نے اس سلسلے میں ایک بہت نکلائیز جملہ بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

”جہاں انسان سوچنا بند کرتا ہے وہاں سے ایمان شروع ہو جاتا ہے۔“

اور ان خدا کے قدوس سے ذاتی اور مطلق رشتے تمام رک کے اخلاقیات اور عمومیت کی حدود سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ اس تفسیر کے حوالے سے کیئرگیارڈ حضرت ابراہیمؑ کی معنویت آشکار کرتا

ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تسلیم درمنا کا مظاہرہ کیا۔ خدا سے ان کا ذاتی رشتہ قائم نہ ہوا اور وہ خدا کے دوست بن گئے۔ یوں وہ لامحدود سے رشتے قائم نہ کر کے عالم محدود کو پالیتے ہیں اگر وہ عالم محدود سے یہ رشتہ رضنا و تسلیم کے مظاہرے سے قائم نہ کرتے تو پھر ان کا بیٹا واقعی قربان ہو جاتا۔ لیکن چونکہ وہ فرض کی ادائیگی میں تمام تر اخلاقیات اور جذبات کو نظر انداز اور قربان کر دیتے ہیں اس لیے اللہ نے ان کو اپنا دوست بنایا اور ان کے بیٹے کو بھی زندہ رہنے دیا اور اس کی جگہ مینڈھے کو قربان کر دیا گیا۔

کیرک گیگارد کی یہ کتاب ”دی کونسیپٹ آف ڈریڈ“ اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے کی قربانی کے لیے خدا کے حکم پر رضامند ہو جاتا۔ دنیا کے تینوں بڑے مذاہب میں یکساں اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی نبوت اور بزرگی پر مسلمان عیسائی اور یہودی یکساں ایمان لاتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس بڑے واقعے کے حوالے سے اس کتاب میں کیرک گیگارد نے جو نظریات پیش کیے ہیں وہ اگرچہ ہم مسلمانوں کے لیے بہت حد تک ناقابل قبول ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کی خیال افزوی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ افسوس یہ ہے کہ اس عظیم واقعہ جس واقعہ کو اسلام کی روح قرار دیتے ہوئے اقبال نے ”ابتدا ہے جس کی خلیل“ کہا تھا اس کی معنویت پر ہمارے ہاں کسی نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔

”دی کونسیپٹ آف ڈریڈ“ دنیا کی عظیم فکر انگیز کتابوں میں سے ایک ہے جس نے جدید فلسفے اور مغربی دینیات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

کرسٹیو ایوولوشن

جدید دور کے فلسفیوں میں برگس کو جو مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ اس کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے افکار پر برگس کے اثرات بہت گہرے اور پختہ ہیں۔ بیسویں صدی میں صنعتی ترقی اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے سائنس اور بطور خاص فزکس کو جو مقام حاصل ہوا، اس کی وجہ سے مادہ پرستانہ فکرو عقائد میں مستحکم پختگی پیدا ہوئی۔ برگس نے اس مادیت کے خفت کلا سب سے بھرپور آواز اٹھائی اور اپنے فکری نظام سے یہ ثابت کیا کہ انسان کی زندگی محض مادی نہیں، بلکہ اس کا سب سے اہم پہلو انسان کا ذاتی، داخلی اور وجدانی تجربہ ہے۔ اس اندرونی اور ذاتی وجدانی تجربے کو ہی برگس نے علم کا سرشمہ قرار دیا۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ *LIFE IS A DEVELOPMENT, CREATIVE EVOLUTION EVER ENFOLDING NEW ELEMENTS,*

برگس کے شعور منجھانے سے پہلے ہی کہ یورپ میں مادی علوم اور سائنسوں نے اتنی ترقی حاصل کر لی تھی کہ وہ جا بجا عقول کی حیثیت سے سامنے آگئی تھیں اور انہوں نے بطور خاص فلسفہ کو دبا کر رکھ دیا تھا اور مادی اور سائنسی ترقی ہی فلسفہ کے لیے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ اس مانٹا پسندی اور غیر فلسفیانہ صورت حال کا جواب برگس نے دیا تھا۔

ہسٹری برگس اسپرس میں ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک ذہین اور پر جوش طالب علم تھا۔ اس نے ابتدا میں جدید سائنسی علوم میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے ریاضی اور فزکس میں تعلیمی سطح پر اختصا ص حاصل کیا۔ لیکن انہی علوم نے ما بعد الطبیعیاتی سوالوں کے دروازے کھول دیے۔ اور اس نے ان سوالوں سے منہ نہیں پھیرا نہ ہی مادی علوم اور سائنس سے مرعوب ہوا۔ وہ بہت

جلد اس حقیقت کو پا گیا تھا کہ سائنس اور مادی علوم کے پیچھے مابعد الطبیعیاتی مسائل چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے فلسفہ پر طعنہ شروع کیا اور پھر فلسفے کا استاد مقرر ہو گیا۔ اس کی پہلی اہم کتاب ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔ آٹھ برسوں کی خاموشی کے بعد اس کی دوسری اہم اور مشکل ترین کتاب *MATTER AND MEMORY* شائع ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں وہ کالج ڈومی فرانس میں فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوا۔ اپنے اس فرض کو ہنری برگساں نے اپنی موت تک ادا کیا۔ اسے ۱۹۲۲ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ ہنری برگساں کا انتقال ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو ہوا۔

اس کی سب سے اہم تصنیف *CREATIVE EVOLUTION* کا سن اشاعت ۱۹۰۷ء ہے۔ علامہ اقبال کے تارمین جانتے ہیں کہ علامہ اقبال کو برگساں کے نظریات و فلسفے سے گہری دلچسپی تھی اور علامہ اقبال نے ہنری برگساں سے پیرس میں ملاقات بھی کی تھی۔

برگساں کے ذہن اور فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے لیے یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ سپنسرمیے مادہ پرست فلسفی کا مداح تھا۔ لیکن جوں جوں وہ سپنسرمیے کا گہرا مطالعہ کرنا چلا گیا۔ برگساں کے ذہن میں سپنسرمیے کے فلسفے اور مادہ پرستی کے بارے میں سوال و شکوک پیدا ہوتے چلے گئے۔ اور مادی میکانکیت کے غمگین سب سے بھرپور آواز برگساں نے ہی اٹھائی۔ برگساں نے مادہ اور زندگی جسم اور ذہن اور قوت انتخاب کے بارے میں بہت کھل کر لکھا، جو مادہ پرست فلسفیوں بالخصوص سپنسرمیے کے انکار کی شدید نفی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ صدیوں کی جدوجہد اور تجربوں کے باوجود کچھ تک یہ نہیں بتا سکے کہ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے اس لیے ان کے تمام سائنسی علوم اور مادہ پرستانہ افکار بے معنی ہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی کسی بنیادی الجھن کو نہیں سلجھاتے۔ اس نے یہ اہم سوال اٹھایا کہ اگر ذہن بھی مادہ ہے اور ذہنی عمل ایک میکانکی نتیجہ ہے تو پھر ضمیر کی کیا حیثیت ہے؟ وجدان کسے کہتے ہیں؟

کریٹیو ایوولیوشن

برگساں کی یہ اہم اور انسانی فکر پر گہرے اور دور رس نتائج مرتب کرنے والی کتاب ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت نے فکر و خیال کے نئے دروازے کھول دیے اور اس کی اشاعت سے اب تک یہ کتاب ان لوگوں کے لیے فکر و خیال کا نیا مواد فراہم کرتی ہے اور اس کتاب کی اہمیت

وقتی یا ہرگامی نہیں بلکہ ابی ہے۔

اس مضمون میں برگساں کے فلسفے اور کرسٹیو ایو دیویشن کا بھرپور مطالعہ پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن برگساں کی اس اہم ترین ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب کے اہم نکات پیش کرنے کی سعی ضرور کی جا رہی ہے۔

یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی بہت خوب صورت اور نوثر ہے وہ لوگ جنہوں نے اس کو اصل فرانسیسی زبان میں پڑھا ہے اور وہ اس کے خوب صورت تخلیقی اسلوب میں رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں تو اس میں کچھ مبالغہ نہیں۔ کیونکہ اس کے انگریزی ترجمے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس کا ترجمہ اور پڑھنا بھرپور تخلیقی اسلوب لیے ہوئے ہے وہ اصل زبان میں کیا ہوگی۔ اس تخلیقی اور شاندار اسلوب کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ برگساں محض اور نازا ایک خشک فلسفی نہ تھا۔ وہ عالمی ادب کا بھی پر جوش طالب علم تھا اور تخلیقی ادب کے ساتھ برگساں کی وابستگی بہت گہری تھی۔ اپنے فلسفے میں برگساں وقت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وقت بھی اتنی ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ مکان (SPACE) اور یہ وقت ہی ہے جو دراصل زندگی کے جوہر کو اپنے اندر سموتے ہوئے ہے۔ بلکہ اس حد تک کہ تمام حقائق بھی وقت ہی کے اندر موجود ہوتے ہیں جو بات سمجھنے کی ہے وہ ہے کہ وقت نشوونما ترقی پذیری ہے اور DURATION وہ اپنی اس اہم ترین کتاب میں لکھتا ہے۔

”زمانہ (DURATION) ماضی کا مسلسل نشوونما ہے جو مستقبل میں تبدیل ہوتا ہے۔“ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ماضی۔ حال میں موجود رہتا ہے اور یہاں وہ بڑے محرک کی صورت میں موجود رہتا ہے۔ DURATION کو بہتر صورت میں ”زمانہ آشنا“ کی اصطلاح میں سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ اس اصطلاح کے حوالے سے برگساں کا مفہوم بہت حد تک ادا ہو جاتا ہے۔ برگساں لکھتا ہے۔ ”ماضی بجالا دبر قرار رکھتا ہے اور اس کا کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا۔“ وہ لکھتا ہے۔

“NO DOUBT WE THINK ONLY, A SMALL PART OF

OUR PAST, BUT ITS OUR ENTIRE PAS THAT WE DESIRE,
WILL AND ACT.”

اس پر وہ مزید اضااف کرتا ہے کہ وقت چونکہ اجتماعی ACCUMULATION ہوتا ہے اس لیے مستقبل کبھی ماضی جیسا نہیں رہتا۔

وہ وقت کے سلسلے میں اقلیدس اور مادی سائنسی نظریات کو ایک دایمہ اور دوسروں کو قرار دیتا ہے۔ کیونکہ برگساں کے نزدیک انسان ایک باشعور وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے لیے تبدیلی لازمی ہے اور یہ تبدیلی انسان کو پختگی بخشتی ہے اور اس کے بعد وہ اپنی ذات کی لامحدود سطح پر تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔

اپنی اس فکر اور کتاب میں وہ انسان کا یہ تصور پیش کرتا ہے۔

MAN IS NO PASSIOLY ADAPTIVE MACHINE, HE IS A
FOCUS OF REDIRECTED FORCE A CENTRE OF CREAT-
-IVE EVOLUTION, !

حیوانات اور انسان میں جس طرح سے برگساں نے فرق بتایا ہے۔ وہ اس کتاب کا ایک اہم پہلو ہے۔ وہ حیوانات کو ایک قیدی قرار دیتا ہے۔ جو اپنی انواع کی عادات اور حقائق کی زنجیروں میں بندھے ہوتے ہیں، اگر کبھی ان کے لیے آزادی کا دروازہ کھلتا بھی ہے تو جوںی کھلتا ہے، بند بھی ہو جاتا ہے۔ جبکہ انسان کی صورت حال مختلف ہے۔ برگساں لکھتا ہے

"WITH MAN, CONCIDUSNESS BREAKS THE CHAIN IN
MAN AND MAN ALONE, IT SETS IT SELF FREE,"

برگساں سائنس اور میکانزم کے اس دعوے کو جھٹکتا ہے کہ اس نے انسان کی حقیقت کو پایا ہے اور یہ برتر علوم ہیں۔ برگساں کا دعوہ ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، جہاں بھی انسان کا سوال اٹھتا ہے۔ سائنس اور میکانکٹ کچھ نہیں بتاتے بلکہ خود اپنی حدود کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ آشکار ہوتا ہے کہ محدود علم کتنے محدود ہیں۔ اس سلسلے میں فلم اور اس کی متحرک تصویروں کی مثال بھی دی جاتی ہے۔ جو بظاہر تو متحرک ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ساکت ہوتی ہیں۔ ان کے حوالے سے حرکت کے دورانیے کو (یعنی زمانہ شمار) کو کسی طرح بھی پیش نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وقت کے تسلسل کو سمجھ سکے یا سمجھا سکے یا اپنی گرفت میں لے سکے۔

برگساں کے خیال میں دراصل یہ ہماری اپنی بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم مادی اور طبعیاتی افکار کا اطلاق اپنے خیال اور اپنی دنیا پر کرتے ہیں۔ جب ہم یہ طرز فکر اختیار کرتے ہیں تو ہم مادہ پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سائنسی علوم سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اور میکانزم کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں۔ جب یہ صورت حال ہو تو پھر سب سے اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس طرح زندگی کے بہاؤ اور جوہر کو سمجھ سکتے ہیں۔ برگساں کے پاس اس کا جواب ہے اور وہ جواب ہے کہ اپنی ذات کی حقیقتوں میں مہمان کا جلنے۔ اپنی ذات پہچانا اور سمجھا جائے اور انسان کا تخلیقی ارتقاء اس طرح ہوتا ہے۔ اسی پر ہی برگساں نے اپنی اس کتاب کی بنیاد رکھی ہے۔ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

یورپی فلسفے میں ”وجدان“ کی اہمیت اور اس کی تعریف و تفسیر پر برگساں نے سب سے پہلے زور دیا اور اس کو اولیت حاصل ہے کہ انسانی زندگی کی فلسفیانہ تقسیم کے لیے اس نے ”وجدان“ کو دسویں سطح پر فلسفے میں رائج کرنے کی بیخ و بن کو شش کی۔

برگساں الفاظ کو انعام و تفسیر کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر الفاظ محض علامتیں اور نفسیاتی تشکل ہی دھار لیں تو پھر انعام و تفسیر ممکن نہیں رہتی۔ کیونکہ تمام الفاظ علامتی نہیں ہوتے۔ برگساں اپنے فلسفیانہ نظام فکر میں نفسیات کو بہت اہمیت دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ مجھے اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ نفسیات حیران کن انکشافات کا اظہار کرے گی۔

اپنی عمد آفرین تصنیف میں برگساں نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور ڈارونزم کو ناکارہ اور بیکار ثابت کر دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں برگساں کا یہ جملہ بے حد اہم ہے وہ لکھتا ہے:-

“THERE IS A DESIGN IN THINGS, BUT IN THEM, NOT OUT SIDE.”

اس جملے کی روشنی میں ہی اگر ڈارون کے نظریات کا محاکمہ کیا جائے تو بات کھل جاتی ہے کہ ڈارون کے افکار و تجربات حقیقت کی طرف نہیں بلکہ محدود مقدار کی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں اور ان کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔

انسانی تخلیقی زندگی اور اس کا ارتقاء برگساں کے نزدیک ایک تجربے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس تجربے کو وہ خدا سمجھتا ہے، وہ خدا اور زندگی کو ایک سمجھتا ہے۔

BUT GOD IS FINITE, NOT OMNIPOTENT LIMITED BY

MATTER.

برگساں کے نزدیک خدا لامحدود ہے۔ لامنتہم ہے۔ وہی تخلیق ہے اور مخلوق اور اسے ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں، اس محسوساتی تجربے سے گزرتے ہیں جب ہمارا عمل آزادانہ ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم شعوری طور پر اپنے اعمال اور اپنی زندگیوں کا انتخاب کرتے ہیں اور اس میں انسانی وجدان کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ برگساں سچائی کی تلاش کے لیے دعوت دیتا ہے کہ اسے ہم اپنی ذات اور باطن میں تلاش کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ کرسٹیو ایوولیوشن کی اشاعت سے پہلے دنیا پر جس مادی اور سائنسی فلسفے کا غلبہ تھا۔ اسی کے مطابق انسان ایک مشین بنا دیا گیا۔ بے حسی، احساسات سے محروم، وجدان سے سے عاری۔ لیکن جب فلسفے کے افق پر برگساں کا ظہور ہوا اور بطور خاص اس کی یہ کتاب "دی کرسٹیو ایوولیوشن" شائع ہوئی تو اس نے انسان کو مادے کی قید اور برتری سے آزاد کر دیا۔ اس نے انسان کو برتر حقیقت دی اور آج کا انسان اس فلسفے کے حوالے سے تخلیقی مراحل سے گزر کر اپنی ارفع ترین تخلیق کا ذریعہ انجام دے سکتا ہے۔

برگساں تخلیق کو کوئی "اسرار" قرار نہیں دیتا۔ وقت کے تصور کی نئی تفسیر کر کے، ڈارون اور پیٹنر کے فلسفوں کو رو کر کے برگساں نے انسان اور انسانی زندگی کا ایک شاندار اور قابل فہم اور قابل عمل نظریہ دیا اور اس نکتہ و فلسفہ کا منظر اس کی کتاب "دی کرسٹیو ایوولیوشن" ہے۔

وجہ

ہیگل کے بارے میں شوپنہار کی جو رائے تھی۔ اس کا ذکر کانٹ کی عظیم تصنیف 'متفقہ بر عقل محض' کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ تاہم فلسفے کی دنیا میں ہیگل ایک اہم اور عظیم نام ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یوں تو اس کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا اجمالی ذکر آگے آگے گا لیکن اس کی کتاب LOGIC ایک ایسی کتاب ہے جس نے فلسفے کے جہان کو نظریہ صدیقین یا جدیدیات فراہم کیا اور اس نظریے کے حوالے سے دنیائے فکر و عمل میں نسبی راہیں کھلیں اور آج دنیا کے فلسفی غالب علم اور دانشور کہتے ہیں کہ یہ ہیگل کا ہی نظریہ صدیقین تھا۔ جسے کارل مارکس نے سر کے بل کھڑا دیکھ کر اسے سیدھا کر دیا اور دنیا ایک بڑے فکری اور عملی انقلاب سے روشناس ہوئی۔

کارل مارکس کے طالب علموں کے علم میں شاید یہ بات ہے یا نہیں کہ کارل مارکس نے ہیگل کا بغور اور بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ ایک زمانے میں وہ اس کے اتنا زیر اثر رہا کہ اس نے ہیگل پر ایک نظم بھی لکھی۔

جارج ولیم فریڈرک ہیگل سٹوٹ گٹ جرمنی میں ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ محکمہ مالیات میں ایک چھوٹے درجے کا افسر تھا۔ لڑکپن اور جوانی میں ہیگل نے بڑی محنت اور کثرت سے مطالعہ کیا۔ اپنے عہد کی تمام اہم کتابوں کو اس نے بغور پڑھ ڈالا۔ ہیگل کا نظریہ تھا کہ سچا کلچر اس صورت میں معرض وجود میں آسکتا ہے کہ یہ بچے کو جب وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے تو کم از کم پانچ برسوں کے لیے پڑھایا جائے اور ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو بنیادی اہمیت کی حامل ہوں۔

ہیگل نے یونانی ادب سے گہرا اثر لیا۔ حتیٰ کہ اپنی عمر کے اس حصے میں جب اسے کسی بھی

چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہیگل یونانی ادب کے اثرات کا اظہار کرتا اور اس میں دلچسپی لیتا رہا۔ شاید یونانی ادب کے مطالعہ کا ہی اثر تھا کہ ہیگل نے ایک زمانے میں حضرت مسیح کی سوانح لکھنے کی کوشش کی جس میں اس کا ارادہ حضرت مسیح کو یوسف اور مریم کا بیٹا ثابت کرنا تھا اور ان کی پیدائش کے ساتھ جو ربانی معجزہ وابستہ ہے اسے نظر انداز کر دینا تھا۔

یہ انقلاب ذرائع کا دور تھا۔ دنیا میں نئے نئے خیالات برپا ہو رہے تھے۔ ہیگل کا دور جرمنی کے ادب و فلسفہ اور موسیقی کا اہم ترین دور سمجھا جاتا ہے۔ ہیگل کے احباب اور ہم عصروں میں ایسے ایسے فلسفی اور دانشور شامل تھے جنہوں نے بعد میں عالمگیر شہرت حاصل کی۔

۱۷۹۳ء میں ہیگل نے ٹوبینگن یونیورسٹی سے گریجویشن کا امتحان پاس کیا۔ اسے سند کے ساتھ ایک خاص سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا گیا۔ جس کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ اس سرٹیفکیٹ میں ہیگل کے چال چلن اور کردار کی تعریف کی گئی تھی اور لکھا گیا تھا کہ وہ علم الانسان اور دینیات میں خاص اہلیت رکھتا ہے لیکن فلسفہ کے علم میں صلاحیتوں سے کور ہے۔ بعد میں اس شخص نے ایک مدت تک فلسفے کی اقدیم پر بلا شرکت بغیرے حکومت کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ناوار تھا۔ اسے اپنی روٹی ٹمکنے کے لیے یونیورسٹیوں کا سہارا لینا پڑا۔ ۱۷۹۹ء تک اس کے معاشی حالات خاصے دگرگوں رہے رہے۔ ۱۷۹۹ء

میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو اسے تر کے میں اچھی خاصی رقم ملی۔ جس سے ہیگل اپنے آپ کو امیر سمجھنے لگا اور اس نے یونیورسٹی چھوڑ دیں۔ اس نے اپنے دوست (نامور دانشور اور مفکر) شینگ کو خط لکھا اور مشورہ طلب کیا کہ اس کے لیے کون سا شہر موزوں ہے۔ جہاں وہ رہائش اختیار کر کے اپنے مستقبل کے لیے کچھ کر سکے۔ شینگ نے JENNA کا نام تجویز کیا۔ جہاں ایک اہم یونیورسٹی تھی۔ جینا یونیورسٹی میں شہر تاریخ کا استاد تھا۔ شینگ رومالویت کی تبلیغ میں مصروف تھا اور فتنے کے ساتھ مل کر ایک نئے فلسفیانہ نظریے کو مقبول بنانے میں کوشاں تھے۔ ۱۸۰۱ء میں ہیگل یہاں پہنچا اور سکونت اختیار کی اور ۱۸۰۳ء میں سے یونیورسٹی میں بحیثیت استاد ملازمت مل گئی۔ ۱۸۰۸ء تک وہ یہیں

تھا۔ جب نپولین نے پر ڈیٹا پر فتح حاصل کی۔ یہ چھوٹا سا علمی ادبی شہر۔ سجران اور انٹسار کا شکار ہوا۔ نپولین کے سپاہیوں نے ہیگل کے مکان کی تلاشی لی۔ ہیگل بھاگ نکلا جاتے وقت وہ اپنی کتاب THE PHENOMENOLOGY OF SPIRIT کا مسودہ ساتھ لے جانا نہ بھولا۔ جس

پردہ کافی عرصے سے کام کر رہا تھا۔ کچھ عرصے تک اس کے حالات ملتے جلتے غراب رہے کہ گوٹے ٹٹے ایک شخص کے ذریعے اسے کچھ مالی امداد بھجوائی۔ کچھ عرصے تک وہ ایک رسالے کو بھی مرتب کر رہا۔ اسی زمانے میں ۱۸۱۲ء میں اس نے اپنی تصنیف *THE LOGIC* لکھنی شروع کی جو اگست ۱۸۱۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے جرمنی کو جھنجھوڑ دیا۔ اسی کتاب کے حوالے سے ہیگل کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد بھی مقرر کر دیا گیا۔ ہائیڈل برگ کے قیام کے زمانے میں اس نے اپنی کتاب "انسائیکلو پیڈیا آف وی فلاسوفیکل سائنسز" تحریر کی جو ۱۸۱۶ء میں شائع ہوئی اس کتاب کی اشاعت نے اسے بے حد نامور و پہچایا۔ اور ہیگل کو برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد بنا دیا گیا۔ برلن یونیورسٹی میں اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ فلسفہ پڑھا تا رہا۔ اور فلسفے کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا رہا۔ اس وقت ہیگل کی جرمنی میں وہی حیثیت تھی جو گوٹے کو ادب و شاعری اور بیٹھرون کو موسیقی کی دنیا میں حاصل تھی۔ ہیگل کا یوم پیدائش گوٹے کے جنم دن کے ایک دن بعد آتا تھا۔ جرمنی کے عوام ان دونوں دنوں کو سرکاری تعطیلات کے طور پر مناتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک فرانسیسی نے ہیگل سے پوچھا کہ وہ اپنے فلسفے کو ایک جملے میں بیان کرے۔ ہیگل نے اپنے فلسفے کو ایک جملے میں بیان کرنے میں ناکام رہا۔ ہیگل نے اپنے فلسفے کو دس کتابوں میں پیش کیا ہے جن میں *THE LOGIC* اس کی اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ستر بے حد اچھا ہوا ہے۔ ہیگل کو خود احساس تھا کہ وہ اپنی بات پوری طرح سے سمجھنے میں اکثر ناکام رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا صرف ایک آدمی ہے جو مجھے سمجھتا ہے اور بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ وہ بھی مجھے نہیں سمجھتا۔ اس جملے میں اس کا اشارہ دراصل اپنی ہی طرف تھا۔ ہیگل کی بیشتر تصانیف دراصل اس کے لیکچروں پر مشتمل ہیں۔ بعض اس کے شاگردوں نے کلاس نوٹس سے مرتب کیے ہیں۔ ان میں دو کتابیں ایسی ہیں جو خود ہیگل نے لکھی تھیں۔ ایک *THE LOGIC* اور دوسری روح کے مظاہر اور یہ کتابیں بھی سید اچھی ہوئی اور ان میں شارحین کی شرح کے بغیر ان کو پوری طرح سمجھنا خاصا دشوار کام ہے

"کتاب منطق"

اپنی اس کتاب *THE LOGIC* میں ہیگل نے عقل و دانش کے نظام کے بارے میں نہیں

لکھا بلکہ اس کا موضوع وہ تصورات ہیں جو عقل و منطق سے تعلق رکھتے ہیں یہاں ہیگل نے وہی الفاظ اور مدارج استعمال کیے ہیں جنہیں اس سے پہلے کانٹ استعمال کر چکا تھا۔ یعنی وجود جو ہر مقدار حقیقت۔ ہیگل ہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہیں ایسی تمام اصلاحات کو اپنے غور و فکر پر جاوی نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے درمیان جو ایک باہمی رشتہ ہے اس پر پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ گروپوں اور اجتماعات میں حزا وہ الفاظ کی صورت میں ہوں یا کسی دوسری نوعیت کے ایک باہمی رشتہ دیکھتا ہے اس پر پوری توجہ کی ضرورت ہے جس میں یہ سب بندھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتے یا باہمی ہم آہنگی دراصل مشابہت اور تضادات پر مشتمل ہے۔ کوئی بھی خیال جس میں اس رشتے یا تضادات کو مد نظر نہیں رکھا جاتا وہ دراصل ایک خالی نظریہ اور خیال ہے۔ اس نے اس سلسلے میں ایک جملہ لکھا ہے۔

"TRUE BEING AND NOTHING ARE THE SAME."

وہ تمام تعلقات جو اس سلسلے میں سامنے آتے ہیں ان میں اہم ترین تعلق اور رشتہ تضادات کہے دنیا کی ہر نوع کی حالت اور کیفیت میں ایک تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک خاص ضد جو بعد میں ہر چیز کی اختیار کر کے جدیدیاتی تخریک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ نظریہ ہے جو نظریہ جدلیات یا تضادات کہلاتا ہے۔ اور اس کو جس صورت میں ہیگل نے پیش کیا ہے اس کے باسے میں مارکس نے فکر کے علم کا دعویٰ ہے کہ یہ سر کے بل کھڑا تھا جسے مارکس نے پاؤں کے بل سیدھا کھڑا کر دیا۔ یہ جدیدیاتی رد ہر چیز میں دوڑتی ہے اور جاری و ساری دکھائی دیتی ہے۔

ہیگل کا یہ نظریہ نیا نہیں ہے بلکہ یہ ایک پرانا نظریہ ہے جسے ہیگل نے اپنے استدلال اور اپنے انداز میں پیش کیا۔ ارسطو کے ہاں بھی یہ نظریہ و ضد کی صورت میں ملتا ہے۔ ہیگل نے یہ ثابت کیا کہ ارتقا کے عمل میں ضد کے ساتھ تضاد پیدا ہوتا ہے اور اس طرح ارتقا کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ نفی اور مثبت کا تضاد ہم بہتر کیفیت اور حالت کو جنم دے کر ارتقا کے عمل کو جاری و ساری رکھتے ہیں اور یوں وہ نظریہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے جو آج زبانِ زود عام ہے۔ یعنی

"THESIS ANTI THESIS = SYNTHESIS."

یہ وہ فارمولہ ہے جو ہیگل کے نزدیک ساری انسانی ترقی اور حقیقت کے اندر کار فرما ہے۔ یہ راز ہے جس کو ہیگل نے پہلی بار واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ لکھتا ہے۔

FOR NOT ONLY DO THOUGHT DEVELOP AND EVOLVE
ACCORDING TO THIS.

"DIALECTICAL MOVEMENT" BUT THINGS DO QUALITY,
EVERY CONDICTION, OF AFFAIRS CONTAINS A CONTRADICTION
WHICH EVOLUTION MUST RESOLVE BY A RECONCILING UNITY.

منطق میں ریگل نے یہ بتایا ہے کہ ایشیا اور عوامل کے اندر جو تضاد پایا جاتا ہے جو تصادم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس میں معنویت کو تلاش کرنا چاہیے۔ منطق میں وہ لکھتا ہے کہ اختلافیات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسان کے کردار اور عمل میں ہم آہنگی اور وحدت پیدا کرے۔ مذہب کا فریضہ یہ ہے کہ اس حقیقت منطق کو سمجھا سکے جس میں تمام تر تضادات ایک ہو جاتے ہیں۔ فلسفے کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس میں ہم آہنگی کو تلاش کرے جو تضادات میں پائی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"GOD IS THE SYSTEM OF RELATION SHIPS IN WHICH ALL
THINGS MOVE AND HAVE THERE BEING AND THEIR SIGNIFICANCE,"

اس کا اطلاق زندگی کے ہر عمل اور ہر شعبے پر ہوتا ہے۔ اپنے اس نظریے کی بدولت ریگل نے جو کچھ بتانے اور کہنے کی کوشش کی اس کا سب سے زیادہ استفادہ لائل مارکس نے کیا اور دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ بعض لوگ تو یہاں تک دعوے کرتے ہیں کہ ریگل کی کتاب THE LOGIC نے ہی اشتراکیت کے لیے راہ ہموار کی اور اس نظریہ جدیدیات نے ہی مارکس کو وہ بنیاد فراہم کی جس پر اس نے اپنے افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی۔ منطق کے حوالے سے اس کے یہ جملے بے حد اہم ہیں۔ ریگل لکھتا ہے،
"عقل ہی کائنات کا مرکز و محور ہے کائنات کا ڈھانچہ مکمل طور پر عقلیت پر استوار ہے۔"
ریگل نفی اور بدی کو بھی مثبت اور خیر کا پر تو فرار دیتا ہے اور نفی اور بدی ہی نیکی اور خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ جدوجہد کو وہ نشوونما اور ترقی کا اصول قرار دیتا ہے۔ کردار دنیا کے بحران اور دباؤ کے تحت تعمیر ہوتا ہے۔ اور انسان اپنا اصل قد و قامت اور عظمت اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنی تمام نرزدے واریوں سے آگاہ ہو اور ان سے سکھو ش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔
وہ درودالم اور مصائب کو بھی زندگی کی علامت قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے :

”زندگی خوشیوں کے لیے نہیں بنائی گئی۔ بلکہ ترقی کی منازل اور حصول علم کے لیے تخلیق

کی گئی ہے۔“

تاریخ کے بارے میں جو نظریہ ہیگل پیش کرتا ہے اسے اس کے اس جملے سے پوری طرح سمجھا

جاسکتا ہے۔ ہیگل لکھتا ہے،

”THE HISTORY OF THE WORLD IS NOT THE THREAT OF HAPPINESS PERIODS OF HAPPINESS ARE BLANK PAGES IN IT, FOR THEY ARE PERIODS OF HARMONY. HISTORY IS A DIALECTICAL MOVEMENT.“

ہیگل لکھتا ہے کہ تاریخ سازی کا عمل صرف ان زمانوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب مخالفت کے تضادات ترقی میں نشوونما پاتے اور حل ہوتے ہیں۔ وہ تاریخ ساز اور عظیم انسانوں کو حالات کا خالق قرار نہیں دیتا۔ بلکہ انہیں محض آیائیں (MIDWIFE) کا رتبہ بخشتا ہے۔ یہ روح عصر ہوتی ہے جو تاریخ کو تخلیق کرتی ہے اور اسے ہیگل (ZEITGEIST) کا نام دیتا ہے۔

ہیگل کے اس نظریے نے انسانی سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا یہ نظریہ دنیا کا مقبول ترین نظریہ ہے اور اس نظریے کے عالم وجود میں آنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے اسی نظریے کے تحت آنے والے ہر دور کی صورت گری ہوئی ہے۔ وہ سیاسی اعمال اور سیاست کا منتہا آزادی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے،

”تاریخ آزادی کی نشوونما کا نام ہے۔“

ایسے انقلابی نظریات کو پیش کرنے والا ہیگل اپنی آخری عمر میں بہت ہی قدامت پسند بن گیا

تھا۔ اس پر بہت سے اعتراض کئے گئے۔ وہ آنا و خیال (برلن) کو خواب دیکھنے والا کہتا تھا۔ اس نے حکومت کے ساتھ گہرا تعلق قائم کر لیا اور حکومت کی پالیسیوں کا موئید بنا۔ اس کے حریف اور مخالف اسے ”سرکاری فلسفی“ کہتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہیگل نے اپنے فلسفے کی بنیاد تضادات پر رکھی لیکن وہ اپنے تضادات کا شعور کبھی حاصل نہ کر سکا۔ آخری عمر میں وہ مجبوراً الحواس ہو گیا تھا ایک بار جب وہ لیکچر دینے آیا تو اس نے صرف ایک جوتا پہن رکھا تھا دوسرا پاؤں ننگا تھا جب برلن میں پہننے کی دبا پھیلی تو ہیگل وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن موت اسکے انتظار میں تھی۔ ۱۸۸۱ء میں ایک دن کی علالت کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ !!

رائٹس آف مین

دنیا میں بہت کم ایسے بڑے کھنڈے والے فلسفی، انقلابی اور دانشور ہوئے ہیں جن کی زندگیوں میں مشکلات مصائب، ناہمواریوں اور طوفانوں سے خالی ہوں۔ تھامس پین کا شمار ان محدود سے چند لوگوں میں ہوتا ہے جن کی زندگیوں کے واقعات انتہائی ڈرامائی، تہلکہ خیز اور سنسنی سے بھرے ہوئے ہیں تھامس پین ایک ایسا شخص تھا جو طوفانوں میں پلا بڑھا اور اس نے خود کئی طوفانوں کو جنم دیا۔

کبھی کبھی عالمی ادب و فکر کے طالب علم کو یہ سوال بھی ضرور کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ تھامس پین نہ ہوتا تو کیا امریکہ برطانوی اقتدار سے اتنی جلدی آزادی حاصل کر لیتا۔

تھامس پین کیا تھا؟ اس کی زندگی کیسے کیسے طوفانوں کو جنم دیتی رہی اور وہ خود کیسے کیسے طوفانوں سے گزرا۔ اس سے دلچسپی ہو تو پھر ہارڈن اسٹوڈیو جیسے ناول نگار کا ناول "سٹیٹن پین" پڑھیے۔ اسے تھامس پین وہ مصنف، صحافی، انقلابی اور دانشور ہے جسے بیک وقت برطانوی امریکی - باشندہ اور شہری کہا جاتا ہے اور یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انقلاب فرانس کے زمانے میں اسے سٹیٹن کا لقب ملا۔ اور وہ فرانس کے انقلاب کی کمیٹی کا رکن بھی رہا۔

تھامس پین آزادی، انسانی حقوق کا وہ عظیم علمبردار اور مفکر ہے جس کے انکار نے پوری دنیا کو متاثر کیا اور امریکہ کو برطانوی اقتدار سے آزاد ہونے میں مدد دی۔ اس کا اہم ترین کام اس کا کتابچہ "Rights of Man" ہے جو برک جیسے رحمت پسند برطانوی مفکر کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

تھامس پین ٹیٹن فورڈ (THE T F O R D) (نارنوک انگلستان) میں ۲۹ جنوری ۱۷۳۷ء کو

پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک کوپیکر تھا۔ یعنی ایک انسان دوست، آزاد خیال مذہبی آدمی... میں کو بہت کم تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ کسی مختلف النوع کام کر کے وہ بالآخر ۱۹۱۱ء میں محکمہ ایکسٹرنز میں ملازم ہو گیا لیکن تین برس بعد اسے اس الزام پر ملازمت سے جواب دے دیا گیا کہ وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں غفلت سے کام لیتا ہے۔ بعد میں اس کی ملازمت بحال کر دی گئی اور ۱۹۱۸ء تک اسی ملازمت سے متعلق رہا۔ اس زمانے میں وہ اپنے طور پر مطالعے اور تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہا۔ اور پھر میٹرو ڈسٹ چرچ سے وابستہ ہو کر مبلغ بن گیا۔ ۱۹۵۹ء میں اس نے شادی کی۔ اگلے سال ہی اس کی بیوی چل بسی۔ ۱۹۶۱ء میں اس نے دوسری شادی کی۔ اس کی بیوی کی تباہی کو دکان بھتی ۱۹۶۴ء میں ان میں علیحدگی ہو گئی۔ مختصراً یہیں تقریباً ساری عمر مالی مسائل کا شکار رہا۔

۱۹۶۴ء میں چین نے امریکہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچتے ہی اسے نومبر ۱۹۶۴ء میں 'فسیو ایوا گزٹ' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سمجھتا تھا۔ ایک فعال انسان تھا۔ اس لیے وہ اس تحریک میں شامل ہوا جو امریکہ کی آزادی کے حق میں تھی۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا مشہور زمانہ پمفلٹ 'Common sense' شائع ہوا۔ اس پمفلٹ میں اس نے برطانیہ کی عملداری کے خلاف، امریکہ کی آزادی کے حق میں آواز اٹھائی تھی۔ وہ اپنے دور اور ماحول کی عوامی انگلیوں کو سمجھتا تھا۔ اس پمفلٹ میں اس نے لکھا تھا۔ حکومت وہ ناگزیر بُرائی ہے جسے قبول کرنا پڑتا ہے لیکن نواباں نظام کے لیے دنیا میں کوئی رگتجائش نہیں۔ جب امریکہ میں برطانیہ کے خلاف شدید رد عمل اور جدوجہد کا آغاز ہوا تو چین نے اس میں عملی حصہ لیا۔ اس نے سولہ پمفلٹ لکھے جو CRISIS کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ وہ پمفلٹ ہیں جنہوں نے آزادی کے خواہاں عوام میں روح چھونکی۔ مورخوں اور محققوں نے لکھا ہے کہ یہی وہ پمفلٹ اور تحریریں تھیں جنہوں نے واشنگٹن کو اتنا متاثر کیا کہ وہ امریکہ کی آزادی کے لیے برطانیہ سے لڑنے میں جو پچھلا ہٹ محسوس کرتا تھا وہ دور ہو گئی۔ چین کا یہ کارنامہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے امریکہ کے عوام اور جارج واشنگٹن جو آزادی کی دہلیز تک پہنچ کر ٹھٹھکے کھڑے تھے۔ ان کو آگے بڑھنے کی تحریک مختصراً چین کی تحریروں نے دی۔ ۱۹۹۱ء میں 'سٹائٹس آف مین' کی اشاعت ہوئی۔ جس کا اقتساب جارج واشنگٹن

کے نام تھا۔ اور جارج ڈائنگٹن نے برطانیہ کی غلامی اور لڑکھاپاتی برتری کا جو اتارنے کا فیصلہ کر لیا۔ امریکہ میں پین کو سرخ ہندوؤں کے مسائل کے بارے میں قائم کردہ کمیشن کا سیکرٹری مقرر کیا گیا اس کے بعد غیر ملکی امور کی کانگریسی کمیٹی کا سیکرٹری بھی چنا گیا۔ لیکن اس کے نظریات و افکار کی وجہ سے ۱۷۷۹ء میں اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ مستعفی ہو جائے۔ تاہم اس کی خدمات کو پیش نظر رکھا گیا پین نے فرانس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ جان لارنٹس تھا۔ ان کا مشن یہ تھا کہ فرانس میں جا کر چندہ جمع کیا جائے جو آزادی کی تحریک کے کام آسکے۔ امریکہ میں اس کی خدمات کے پیش نظر اسے کچھ جائداد دی گئی۔ خطیر رقم کانگریس نے اسے دی۔ یوں پہلی بار پین مالی پریشانیوں سے سہات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

فرانس میں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ اسے فرانس کا "شہری" چن لیا گیا۔ اسے فرانسیسی نہیں آتی تھی، لکھ سکتا تھا نہ لہل سکتا تھا۔ تاہم اسے انقلابی کنونشن کارکن بنا دیا گیا۔ یہاں بھی کچھ معاملوں میں اس کے اختلافات کی وجہ سے انقلابیوں نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ یقیناً اس کا سر گلوٹین سے کاٹ دیا جاتا لیکن ۱۷۹۳ء میں وہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس زمانے میں پین نے اپنی اس کتاب کا پہلا حصہ مکمل کیا جو انسانی فکری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب "Age of Reason" ہے۔

تھامس پین ایک ایسا کوکیر تھا جو مذہب کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات رکھتا تھا وہ الہامی مذاہب کا قائل نہ تھا۔ وہ تمام مذاہب کو کوہ دراز نامکمل پاتا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں مذاہب نے سیاسی امور کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مذاہب کی یہ غامبی اس کو بری طرح کھٹکتی تھی۔ وہ خالص فطری اخلاقیات پر مذہب کی بنیادی رکھنے کا حامی تھا۔ اور ہر طرح کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا دشمن تھا۔ اس کی کتابیں بائبل پر زبردست تنقید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ بائبل پر بڑے جارحانہ انداز میں اعتراضات کرتا ہے۔ فرانس میں جب وہ قید تھا تو اس نے ایچ آف ریزن کا دوسرا حصہ مکمل کیا اسے رالہسپیر کے حکم سے قید کیا گیا تھا۔ دس ماہ کے بعد جب رالہسپیر کو زوال آیا تو پین کو رہا کر دیا گیا اور اسے پھر سے انقلابی کنونشن کارکن بنا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء تک وہ یہ فرائنس ادا کرتا رہا۔

وہ حق گزار سچا انسان تھا۔ ۱۷۹۵ء میں اس نے ایک خط میں ڈائٹکن کی پالیسیوں پر شدید تنقید کی جب وہ واپس امریکہ پہنچا تو اس کی انقلابی فکر و حق گوئی کی وجہ سے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی کتاب 'Age of Reason' کو رجعت پسند طبقوں نے بری طرح رگیدا اور اعتراضات کا نشہ بنایا تھا۔ پین ایک بار پھر نادار اور تلاش تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی صحت جواب دے گئی تھی۔ اس کی زندگی کے آخری دن تنہائی اور کسمپرسی میں بسر ہوئے۔ ۸ جون ۱۸۰۹ء کو نیویارک میں اس کا انتقال ہوا۔ اسے نیورڈچیل میں دفنایا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں اس کی یادگار تعمیر ہوئی۔ ۱۸۱۹ء میں اس کی لاش کو انگلینڈ پہنچا دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ امریکہ اور برطانیہ کا مشترکہ شہری سمجھا جاتا ہے۔

رائٹس آف پین

برک برطانیہ کا شعلہ بیاں مقرر خطیب اور مفکر سمجھا جاتا ہے وہ ایک زمانہ میں پین کا دوست تھا۔ برک انقلاب فرانس کا مخالف تھا اور اس موضوع پر اس نے ایک کتاب 'Reflections on the Revolution in France' لکھی۔ پین پر اس کتاب کا بے حد اثر ہوا۔ برک کی رجعت پسندی اور انقلاب دشمنی نے اسے مجبور کیا اور ۱۷۹۱ء میں اس نے 'Rights of Man' کے نام سے اپنا مشہورہ آفاق کتابچہ لکھا۔ جس کی اس زمانے میں اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ وہ یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گیا۔ برطانوی حکومت اس کی اشاعت پر ناراض ہوئی۔ اسے برطانوی دستور پر ایک حملہ سمجھتے ہوئے پین کو باعنی قرار دے دیا گیا۔ پین نے فرانس پہنچ کر اپنی حبان بچائی۔

برک قدامت پسند اور روایتی نظریات کا حامی تھا۔ اس کے برعکس پین انقلابی اور انقلاب فرانس کا حامی تھا۔

پین ہر قوم اور ملک کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ جس چیز کا بھی انتخاب کرنا چاہے اس کا اسے حق حاصل ہے۔ وہ پُرانے اور مردہ لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین، صحیفوں کو زندہ انسانوں پر تنہ پنے اور لاگو کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ہر ملک اور ہر نسل کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے

میں نظام اور قانون چاہے بنائے۔ وہ انقلاب کا داعی اور حامی ہے۔

تھامس پین - رائٹس کن مین " میں لکھتا ہے۔

" ہر انسانی نسل اپنے سے پہلے کی نسلوں کی طرح جملہ حقوق رکھتی ہیں۔ اس طرح ہر فرد

جب پیدا ہوتا ہے تو اسے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو اس کے ہم عصروں کے لیے ہیں۔ انسان کے فطری اور حقیقی اصول وہ ہیں جنہیں انسانوں نے شہری حقوق کا نام دے کر استوار کیا۔

برک سیاسی عمل کو بہت سچیدہ سمجھتا ہے۔ لیکن پین جو جزو افزوی اور عقلیت کے علمبرداروں

میں سے ہے۔ وہ سیاسی عمل کو بہت سادہ سمجھتا ہے۔ وہ عقل کی بنیاد پر اسے استوار کرتے ہیں۔ عقل کو کسوں نے قرار دے کر عالمی سچائیوں سے ہمکنار کر کے ایسے واضح اصولوں کی تشکیل کا حامی ہے جو انسان کی فلاح اور انسانی حقوق کی ضمانت بنتے ہیں۔

یوں پین یا دشا بہت، حکمرانی اور انسان دشمنی کی نفی کرتا ہے۔ غربت و ناداری کے سرخسٹروں

کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہوں کی طالع آزمائیوں اور حرص و ہوا کو ختم کر دو تو نتیجہ امن کی صورت میں نکلے گا۔"

پین نمائندہ عوامی حکومت کو اشرافیہ اور رولے میں ملنے والی شہنشاہیت کا نعم البدل

قرار دیتا ہے۔ لندن میں فیئین سوسائٹی بنی۔ وہ پین کے انہی نظریات و افکار پر مبنی تھی۔ پین لکھتا ہے۔

حکومت کی اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے۔

جہاں ہر انسان کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہوں۔

تھامس پین کا انداز اسلوب، اپنے نظریات کے انعام میں جس شدت کا وہ اظہار

کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک اہم اقتباس اسی کے الفاظ میں پیش کیا جا "رائٹس کن مین" کا یہ ٹکڑا۔ اس کے انکار کی روح ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ اس کا اسلوب

مجھے ملے خطہ کیجیے۔

There never and there never can exist a parliament or any description of Men, or any Generation of Man, in any country possessed the right or the power of binding and controlling posterity to the

end of time or of commanding for ever how the world shall be governed, or whn shall govern it, and therefore all such clauses acts or declarations by which the makers of them attempt to do what they have neither the right nor the power to do nor the power to excute, are themselves Null and Void. Every age and generation must be asfree to act for itself in all cases as the ages and generations which preceded it."

ہیں ایسے قوانین کو قبول سے بھی ماوراء قوانین کا نام دیتا ہے جنہیں مقدس سمجھ کر ان کو ان پر عمل کرانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اسے زیادہ مضحکہ خیز قرار دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ حالات کے تقاضوں کے تحت انسانوں کو اپنے لیے ہر راستہ اختیار کرنے کا حق ہے۔ میں کے ایسے خیالات کے تحت بعض نقادوں نے اس پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس کے افکار و نظریات میں انارکی کا فلسفہ مضمر ہے اور اس کے افکار و نظریات پر عمل کرنے سے انارکی ہی پھیلے گی۔ کسی حکومت اور طرز حکومت کو استحکام حاصل نہ ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی تنقید اور اعتراض ہے جو چین کے خیالات و افکار کے ساتھ شدید قسم کی زیادتی ہے۔ چین تو جس چیز پر زور دیتا ہے وہ ہے زندہ انسان کے حقوق وہ یہ نہیں چاہتا کہ زندہ اور اپنے عہد میں سانس لیتے ہوئے انسانوں پر وہ قوانین تھوپے جائیں جو ان لوگوں نے اپنے عہد کے لیے وضع کیے تھے۔ جواب مر چکے ہیں اور موجودہ حالات سے کیسرا علم ہیں۔ اس لیے میں انسانوں کو یہ حق دیتا ہے بلکہ اس کا فطری حق قرار دیتا ہے کہ انسان اپنے حالات کے تحت جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے وہ کر سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

" وہ لوگ جو دوسرے جہاں میں پہنچ چکے اور جو لوگ ابھی زندہ ہیں ان دونوں

کے درمیان جھگڑا کونسی چیز بیشتر کر ہو سکتی ہے۔ دوسری دنیا اور موجود دنیا کے انسانوں

کی قوت متخیز جدا گانہ ہوتی ہے ان میں ایک وہ جس کا وجود ہی نہیں اور دوسرا اپنا

وجود رکھتا ہے۔ "

تھامس ہین رائٹس آف مین میں برک پر یہ الزام لگاتا ہے کہ برک نے ایک خاص قسم کے سیاسی آدم کو تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمیشہ کے لیے پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اب

برک کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اس کا یہ آدم کوئی قوت یا آزادی بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ تقاسمین کا آدمی آزادی کے حق سے مسلح ہے وہ ہر دور میں اپنے لیے اپنے حق کا آزادانہ استعمال کر سکتا ہے۔ تقاسمین میں ہمیں بتانا ہے کہ انسان کے خالق نے انسان کو حقوق بھی دیے اور یہ حقوق صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ ہر نسل کے لیے ہوتے ہیں۔ رائٹس آف مین میں تقاسمین لکھتا ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ اٹھالیسجے روایت کو ایسے لکھی اور ان لکھی تحریروں کو دیکھیے ایک چیز سب میں مشترک ہے وہ Rights of Man. جس کا مفہوم مین کے نزدیک یہ ہے کہ تمام انسان ایک خاص اور مساوی سطح رکھتے ہیں اور تمام انسان مساوی حقوق کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب کو یکساں فطری حقوق حاصل ہیں۔ تقاسمین کے اس انقلاب انگریزی کتابچے رائٹس آف مین کا ٹیٹیکو، خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ مین لکھتا ہے۔

انسان کسی سوسائٹی میں اس لیے شامل نہیں ہوتا کہ اس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں چند حقوق کا طلب گار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ معاشرے اور سوسائٹی کو اس لیے تشکیل دیتا ہے کہ اس کے حقوق کو بہتر تحفظ حاصل ہو سکے۔ اس کے فطری حقوق اس کے تمام شہری حقوق کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ مین کے نزدیک فطری حقوق کا مفہوم اسی کے الفاظ میں یہ ہے۔

Natural rights are those which appealed to man in right of his existence of this kind are all the intellectual rights or rights of mind, and also those rights of actions as an individual for his own comfort and happiness which are not injurious to the natural rights of others."

اب ضروری ہو جاتا ہے کہ مین شہری حقوق کی جو تعریف پیش کرتا ہے اسے بھی دیکھا جائے۔ تقاسمین رائٹس آف مین میں اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ شہری حقوق وہ ہیں۔

A member of society every civil right has for its foundation some natural right pre-existing in the individual but to the enjoyment of which his individual power is not in all cases competent of this kind we all those which relate to security and protection.

مقاسم میں کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر شہری، انسان کے فطری حق سے نشوونما پاتا ہے اور پیدا ہوتے ہی یا پھر دوسرے الفاظ میں قدرتی حق ہی یہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مقاسم میں حکومت کے باسے میں بھی منفرد رائے اور نظریہ رکھتا ہے۔ وہ حکومت کے ادارے کو اتنا مستحکم نہیں سمجھتا جتنا کہ انسانوں کے حقوق اور ان کی آراء کو حکومت کو تشکیل کرتی ہیں۔ انسانوں کے معاشرے میں انسانی اذہان اور ضرورتوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔

معاشرہ مل جل کر جو دستور بناتا ہے وہ گویا سب انسانوں کی ضرورت کو لوہا کرتا ہے حکومت تو محض نام کی شے ہے بلکہ مین کے الفاظ میں حکومت میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا بیشتر حصہ تو بس نام کا ہوتا ہے۔ حکومت کے ساتھ انسانی حکومت بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے لیکن انسانی معاشرے کے ساتھ انسانوں کی وابستگی بھی کم نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسانوں اور معاشرے کی بہتری کے لیے جو چیزیں حکومت سامنے لاتی ہے اور جو دستور بنایا جاتا ہے وہ اس میں معاشرے میں عام اجازت کا حامل ہونا چاہیے۔ کسی خاص انداز کی مستحکم حکومت گویا معاشرے کے لیے ایک چیلنج ہوتی ہے اگر انسانوں کے فطری حقوق اور ان کے متبادل شہری حقوق کا خیال نہ رکھا جائے تو پھر حکومت لعنت بن جاتی ہے۔

ایسی نام کی حکومتیں انسانی تہذیب و تمدن کے لیے کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتی ہیں۔ خواہ ان کے لیے بہترین انسانی دانش کو ہی کیوں نہ بردے کار لایا جائے۔ کیونکہ اصل دانش تو حقوق کا تحفظ ہے۔ اور فطری حقوق کا شہری حقوق کا صحیح معنوں میں تبدیل کیا جانا ہے اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر حکومت کا کیا فائدہ؟

داس کیسٹیل

بعض شخصیات اور بعض کتابوں پر لکھا گیا کوئی ایک مضمون بھی کتاب اور صاحب کتاب کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ ایسی ہی صورت حال کارل مارکس اور داس کیسٹیل پر لکھتے ہوئے مجھے بھی درپیش ہے۔ مجھے ابتدا میں ہی تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ مضمون مارکس داس کیسٹیل اور اس کے افکار کے بارے میں مجھ سے چند اشاروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

جسے ہم جدید دنیا کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے تین معمار ہیں جنہوں نے اس دنیا کی صورت گری کی ہے۔ وہ ہیں کارل مارکس، فرائد اور آئین سٹین، کارل مارکس ان میں سب سے اہم ہے۔ کیونکہ اس کے انقلابی افکار اور فلسفے نے اس دنیا کو تبدیل کیا ہے۔ انقلابوں کا سرچشمہ کارل مارکس کے افکار و نظریات قرار دیے گئے ہیں وہ شخص جس کے بارے میں علامہ اقبال نے "قلبش اور مومن و ماغش کا فرست" کہا ہے۔ اس نے پوری دنیا کو اپنے افکار اور فلسفے سے دو دھروں میں تقسیم کر دیا۔ سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام اور فلسفے کا تصادم پوری دنیا کے انسانوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

کارل مارکس کے بارے میں جتنا کچھ حق اور مخالفت میں لکھا گیا ہے اس کا اندازہ اور شمار ممکن نہیں۔ اس کی کتابوں کو دنیا کی ہر زبان میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ دانشورس کہ پاکستان میں بلکہ اردو میں داس کیسٹیل کی صرف پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے اور یہ بڑا کام بھی سید محمد نعقی نے انجام دیا داس کیسٹیل کی باقی جلدوں کے علاوہ کارل مارکس کا تقریباً سارا بڑا کام اردو میں منتقل نہیں ہو سکا۔ مجھے کارل مارکس اور اس کے افکار و نظریات کے حوالے سے بظاہر ایک غیر متعلق بات

کسے کی اعزازت دیجیے کہ باقی دنیا کا حال مجھے معلوم نہیں۔ نہ ہی میں اس کا دو میدار ہوں۔ لیکن بڑی ذمے داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کارل مارکس کے بارے میں جتنی مخالفت اور حمایت انتہا پسند حلقوں کی طرف سے ایک مدت سے جاری و ساری ہے۔ اس کی بنیاد محض تعصب اور لاعلمی پر قائم ہے۔ مارکس کے نظام فکر کو پڑھے بغیر ہمارے ہاں اس کے حق میں یا مخالفت کرنے کا "فیض" بڑے زوروں پر رہا ہے۔ ادراک بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ مخالفوں کی بات چھوڑیے کارل مارکس کے ایسے کتنے ہی ماننے والوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جنہوں نے سرے سے مارکس کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔

کارل مارکس کا جملہ کام بلاشبہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے جو کچھ لیکچر اور کس-شائع ہوئے ہیں وہ بیسیوں جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ادراک بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا سارا کام ابھی تک شائع نہیں ہو پایا۔ مارکس کی بیشتر تصانیف ایسی ہیں جو سنجیدہ مطالعے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ لیکن ڈاس کیپٹل اس کی ہی نہیں پوری دنیا میں لکھی جانے والی چند ایسی کتابوں میں سرفہرست ہے جنہوں نے پوری انسانی دنیا کو متاثر کیا ہے۔ ڈاس کیپٹل کو پڑھنا یقیناً بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس کے لیے مزدوری ہے کہ اس کے مطالعے سے پہلے مارکس کی چند اہم تصانیف کا مطالعہ کر لیا جائے۔ ویسے آج کی دنیا میں کارل مارکس کی کیا معنویت ہے اور مستقبل میں وہ کی اہمیت اختیار کرے گا۔ اس سلسلے میں میں دو کتابوں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک کتاب تو اعلیٰ مارکسٹ بنیٹن لوگیووان کی ہے جو جنگ عظیم کے بعد انگریزی میں شائع ہو چکی ہے جس کا نام ہے۔ کارل مارکس اور مذاہب عالم۔ دوسری اہم کتاب ایرچ فرڈم کی ہے جس کا نام ہے BEYOND THE HORIZON OF MIND۔ اس انگریزی کتاب میں فرڈم نے کارل مارکس اور فریڈ کے افکار و نظریات کی مشترکہ اقدار کو تلاش اور دریافت کیا ہے۔ اور مارکس کو فریڈ پر ترجیح دی ہے۔

کارل مارکس کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ نہیں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص اب پوری عمر اس کو پڑھنے میں صرف کر دے تو بھی سب کچھ نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن ڈاس کیپٹل وہ کتاب ہے جسے اگر پڑھ لیا جائے تو کارل مارکس کے انکا نظریات کا پورا احاطہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بہت کم کتابوں نے

انہوں کو آندماج اور مخالف بنایا ہے۔ جتنا کہ وہ اس کیپٹل نے!

کارل مارکس کی زندگی ایک بڑے رزمیہ سے کم نہیں۔ اس نے ایسے ایسے حالات کا سامنا کیا جن کے تصور سے ہی کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے کنبے کو جھوک اور افلاس کا سامنا کرتے اور معمولی معمولی بنیادی ضرورتوں کے لیے ترسے اور مرتے دیکھا۔ لیکن اس نے اپنے مقصد کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔ جو مشن وہ لے کر چلا تھا۔ اس کے لیے وہ زندگی کی آخری گھڑی تک غربت بیماری، بڑھاپے اور مخالفت کے باوجود کام کرتا رہا۔ مارکس کی زندگی ہی بذات خود ایک ایسا موضوع ہے کہ جسے کسی ایک مضمون میں سمیٹنا نہیں جاسکتا۔ بہر حال مختصر آس کی زندگی کی چند جھلکیاں پیش ہیں۔

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو مغربی جرمنی کے شہر ٹراٹہ میں پیدا ہوا۔ اس کے والد نے مارکس کی پیدائش سے پہلے اپنے نسلی اور آبائی مذہب یہودیت کو چھوڑ کر عیسائیت کو قبول کر لیا تھا۔ اس کا والد ایک خوش حال وکیل تھا۔ مارکس نے ابتدائی تعلیم ہی یونانی شاعروں اور سیکسپید کا مطالعہ کر لیا۔ اس نے بون اور پیربرگن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے مضامین میں فلسفہ، قانون اور تاریخ شامل تھے۔ اس دور میں مارکس نے کچھ روحانی نغمے بھی لکھے۔ لارنس سٹرن کے انداز میں ایک ناول کے کچھ ابواب لکھے۔ اور نامکمل المیہ بھی۔ ۱۸۳۶ء میں اس کی منگنی جینی سے ہوئی۔ جس نے شادی کے بعد حق رفاقت ادا کرنے میں ایک شاندار مثال قائم کی۔ اس زمانے میں مارکس پریسکل کے اثرات نے غلبہ کیا۔ بعض ناقدوں کے خیال میں ساری عمر مارکس ان سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ ۱۰ مئی ۱۸۳۸ء کو مارکس کے والد کا انتقال ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے ڈیپو کریٹس اور ایسپی کیورس کے فلسفے پروفیسر ایڈیٹر کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں ایک اخبار کے عملے میں شامل ہوا۔ اور اس کا چیف ایڈیٹر بنا۔ یہ آزاد خیالی تھا۔ ۱۸۴۳ء میں فلسفہ کی سختیوں کی وجہ سے مارکس نے اخبار چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اس برس ۱۲ جون کو اس نے جینی سے شادی کی۔ اسی برس وہ پیرس چلا گیا جہاں ایک اخبار مرتب کرتا رہا۔ ۱۸۴۴ء ہی وہ سن ہے جب مارکس اور فریڈرک اینگلس کی دائمی رفاقت کا آغاز ہوا۔ یہ دوستی مثال تھی۔ اور اس کی استواری نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس کو پیرس سے نکال

دیگیا۔ وہ برسلا چلا گیا۔ اور پھر ہمیں اس کی ان مالی مشکلات اور دشواریوں کا آغاز ہوا۔ جنہوں نے ساری عمر مارکس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ۱۸۴۶ء میں اس کی اہم تصنیف جبرمن آئیڈیالوجی اور ۱۸۴۷ء میں پادوٹی آف فلاسفی شائع ہوئی ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب پر دو سال کی کتاب فلسفی آف پادوٹی کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ مارکس اب کمیونسٹ لیگ کے ساتھ اشتراک کر چکا تھا اور اس کے لندن میں ہونے والے دوسرے اجلاس میں شریک بھی ہوا۔

۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ معینی فیسٹوشن منع ہوا۔ جسے مارکس اور اینگلز نے مل کر تیار کیا تھا۔ انسانی تاریخ میں جو تحریریں لکھی گئی ہیں ان میں چند ہی ایسی ہوں گی جن کے اثرات اتنے دور رس اہم نتیجہ خیز اور انقلاب آفرین ہوتے جتنے موجودہ دنیا پر کمیونسٹ مینسٹی فیسٹو کے ہیں۔

اسی زمانے میں فرانس میں انقلاب آیا۔ جبرمنی ہنگری اور آسٹریا میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ یہ دور مارکس کی زندگی کا بہت اہم اور مصروف دور ہے۔ ۱۸۴۹ء میں مارکس پر مقدمہ چلتا ہے۔ کومن جیوری نے اسے رہا تو کر دیا لیکن اب وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا کوئی ملک نہ تھا ایک جلاوطن، بے وطن۔ وہ اس دوران میں پیر ایک اخبار کی ادارت کر رہا تھا۔ جس کا آخری پرچہ ۱۸ مئی ۱۸۴۹ء کو شائع ہوا۔ مارکس پیرس پہنچا اور وہاں سے ۲۴ اگست ۱۸۴۹ء کو لندن جہاں اس کی جلاوطن زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں اس کی کتاب فرانس میں طبقاتی کشمکش شائع ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ لیگ ختم ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں اسے بجالایا گیا جس کا انجام بھی بہتر ثابت نہ ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں مارکس نے امریکی اخبار نیویارک ٹریبیون کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے سے لے کر ۱۸۶۲ء تک مارکس نے سینکڑوں مضامین لکھے۔ وہ کفالت کے لیے امریکی اخبار کے علاوہ مختلف اخباروں کے لیے لکھتا رہا۔ لیکن غربت و کمبت کا بھیر یا اس کی دلہیز پر بٹھارہا۔ اس دور میں اینگلز جنہیں دوستی ادا کرتا تو مارکس کے کہنے کے لیے سلسلہ سیاحت جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ۱۸۶۵ء میں اس نے ڈیجیٹر پرائس پرائٹ کے نام سے کتاب شائع کی۔ پہلے انٹرنیشنل کی بنیادیں رکھیں اور اس کے انعقاد کے لیے تیاریاں کیں۔

مارکس نے بڑی مصروف زندگی گزاری۔ کام حالات اور ذاتی ضرورتوں کا دباؤ اس پر ہمیشہ رہا لیکن اس نے اپنے منصب کو ادا کیا۔ لاسال کے ساتھ اس کے نظریاتی اختلافات اور اس کا رد

اپنی جگہ مارکس کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس نے ۱۸۷۵ء میں سوشلس ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی کی بھی بنیاد رکھی
۱۸۷۸ء میں جرمنی میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔

۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو جینیوا کا انتقال ہوا۔ یہ مارکس کے لیے بہت زبردست صدمہ تھا۔ جینیوا شمال
خاندان کی فزوحی۔ وہ چاہتی تو اپنے خاندان کی اعانت کو منسوخ کر کے ناقابل برداشت افلاس سے نجات
حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک بادشاہت قدم بیوی کی حیثیت سے اپنے خاندان کے ساتھ مصیبتیں
برداشت کرتی رہی۔ اور اس کے عظیم کام میں اس کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ان پر ایسے ایسے کربناک
اور اذیت ناک لمحے بھی آئے۔ جب ان کا بچہ مراد لوگھر میں کفن و دفن کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔
مارکس عرصے سے بیمار چلا آ رہا تھا۔ اس کی صحت جواب دے چکی تھی۔ لیکن اس نے آخری عمر میں
بھی اپنا کام جاری رکھا۔ بالآخر ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو کارل مارکس کی زندگی کا سفر ختم ہوا۔

ڈاکس کیپٹیل

اس زمانے میں نہ صرف عالمی حالات بہت پریشان کن تھے بلکہ خود مارکس کے اپنے نجی حالات
بھی شدید دشواریوں کا سامنا کر رہے تھے۔ جب مارکس نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے کام کیپٹیل
کا بیڑہ اٹھایا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے اپنے دوست پائل کیو گلگمان کو ایک خط میں اطلاع دی کہ وہ اپنے
بڑے کام نام "کیپٹیل" رکھ رہا ہے۔ جس کا ذیلی عنوان "لے کنسٹری بیوشن لوڈی کریٹک آف
اکانومی" ہوگا۔

امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں مارکس کا بڑا اور لیریماس "نیویارک ٹریبون"
سے ملنے والا معاوضہ تھا۔ جو خانہ جنگی کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا۔ اس کا خاندان ضرورتوں اور امتیاج
کی تکالیف سے گزر رہا تھا۔ لیسن نے لکھا ہے

"اگر مارکس کو اینگلز کی طرف سے ملنے والی مستقل اور مخلصانہ امداد جاری نہ رہتی تو نہ صرف
یہ کہ مارکس کیپٹیل کو مکمل نہ کر سکتا بلکہ وہ اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں کھلا جاتا۔"
(لیسن کلیات جلد ۲۱ ص ۴۷ مطبوعہ ماسکو)

فرسٹ انٹرنیشنل کی تیاریوں اور امتحانات کے سلسلے میں بھی مارکس کو بہت کام کرنا پڑا تھا اب وہ راتوں کو دریا تک کیپٹیل پر کام کرتا۔ کام اور حالات کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ اکثر اس کی طبیعت ناساز ہو جاتی۔ کیپٹیل کی تین جلدوں کا پہلا ڈرافٹ ۱۸۶۵ء کے اواخر میں مکمل ہوا۔ لیکن پہلی جلد کو اشاعت کے لیے دینے کے لیے مارکس نے اس پر نظر ثانی کی۔ اس پر اس نے بہت محنت کی۔ کئی تبدیلیاں کیں۔ حتیٰ کہ جب اینگلز نے پروف پڑھنے کے بعد بعض مشورے دیے تو پھر اس میں ترمیم اور تبدیلیاں کی گئیں۔ اور پھر بالآخر ۱۹ اگست ۱۸۶۷ء کو کیپٹیل کی پہلی جلد اشاعت کے لیے پبلشر کو دے دی گئی۔ کارل مارکس نے اینگلز کو دکھا تھا۔

یہ جلد ختم ہوئی۔ اس کے لیے صرف آپ ہی اکیسے شکریدے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ آپ کا پبلشر اشاعت اور ایڈیٹری کے لیے شامل حال نہ ہوتا تو میں ان تین جلدوں کو کبھی مکمل نہ کر سکتا۔
(مارکس اور اینگلز کے منتخب خطوط ص ۱۹۱)

”اس کیپٹیل کی پہلی جلد ستمبر ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔“

مارکس کی دیگر مصروفیات نے اسے بہت مصروف رکھا۔ فرسٹ انٹرنیشنل فرانس اور پرویشیا کی جنگ اور پیرس کمیون کے حوالے سے مارکس بہت مصروف رہا۔ ۱۸۶۰ء میں کمیونیاں باک وہ کیپٹیل کے دوسرے حصوں پر توجہ دینے کے قابل ہو سکا۔ اس دوران میں اسے کیپٹیل کی پہلی جلد کے دوسرے جرمین ایڈیشن پر بھی بہت محنت کرنی پڑی۔ فرانسیسی ترجمہ کی تدوین نے بھی اس کا خاصہ وقت لیا۔ دوسری جلد کو حتمی صورت دینے میں اسے بہت محنت کرنی پڑی اور کام آں کی اپنی توقع سے کمیوں زیادہ پھیل گیا۔ اس سلسلے میں اینگلز نے کیپٹیل کی دوسری جلد کے دیباچے میں ایک اہم حقیقت کی بھی نشاندہی کی ہے۔

”مارکس پر جو تنقید اس سے پہلے ہوئی تھی اسی نے مارکس کے اندر خود احتسابی کا عمل تیز کر دیا تھا۔ اس نے اس لیے اس پر بہت محنت کی۔ اس کے پھیلتے ہوئے افق کو سمیٹنے کے لیے بہت کام کیا۔ بہت پڑھا۔“

کارل مارکس ابھی کیپٹیل کی باقی جلدوں کی تدوین نہ کر سکا تھا کہ اس کی زندگی کا سلسلہ ختم ہو گیا اس نے کیپٹیل کے جو مسودے اپنے پیچھے چھوڑے تھے وہ مزدوری تدوین کے محتاج تھے۔ یہ

ولیفٹ ایگلز نے ادایا۔ اور اس سے بہتر یہ کام کوئی دوسرا کر بھی نہ سکتا تھا۔ ایگلز کی محنت اور توجہ کے بعد کیپٹیل کی دوسری جلد مارکس کی وفات کے بعد ۱۸۸۵ء میں اور تیسری جلد ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔ لیکن نے کیپٹیل کی دوسری اور تیسری جلد کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن نے لکھا تھا۔

”کیپٹیل کی دوسری اور تیسری جلد دو آدمیوں کا کام ہے یعنی مارکس اور ایگلز کا۔“

مارکس نے جو کام اپنے پیچھے چھوڑا تھا اس کی بنا پر ایک چوتھی جلد بھی تدوین و ترتیب کی محتاج تھی۔ سیاسی اقتصادیات کی بنیادی تھیوری سرٹیس ویلیو ٹر قدر فاضلہ کا خالق مارکس ہے اور یہ اس کا اہم ترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ایگلز نے اپنے دوست مارکس کی موت کے بعد مارکس کی اس تھیوری کو کیپٹیل کی چوتھی جلد کی صورت میں ترتیب دینے اور شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن ایگلز بھی اس پر عمل نہ کر سکا کیونکہ اس کی موت نے یہ کام پورا نہ ہونے دیا۔ ایگلز کی موت کے بعد مارکس کا یہ کام علیحدہ کتاب اور مختلف نام کے ساتھ کارل کاؤٹسکی نے ترتیب دے کر شائع کر دیا۔ اس کا نام تھیوری آف سرٹیس ویلیو ہے۔

”داس کیپٹیل“ دنیا کے عظیم انقلابی سائنسدان اور ماہر معاشیات کا سب سے عظیم کارنامہ ہے یہ وہ کتاب ہے جس نے پوری دنیا کو تبدیل کیا ہے جو دنیا میں انقلاب کا باعث بنی۔ اس کی مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا۔ وہ اپنی جگہ گننا ہی اہم اور معتبر کہیں نہ ہو لیکن موجودہ دنیا پر جتنے اثرات مارکس کی تعلیمات نے ظہور پاتے اور داس کیپٹیل کے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مارکس نے جو کام کیا وہ بہت مشکل اور بہت نادر تھا۔ مارکس نے اپنے ایک دوست لاشا ترے کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ سائنس کی طرف جانے والا راستہ آسان نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ جو ٹھکنے سے خوفزدہ نہیں ہوتے وہی اس کے دُصلوانی راستوں پر چلنے کی ہمت رکھتے ہیں اور انہی کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس راستے کی بلندیوں پر جا پہنچیں۔

داس کیپٹیل نے سیاسی اقتصادیات میں انقلاب پیدا کیا۔ اس کا سارا کام سائنٹیفک بنیادوں پر رکھا ہے۔ مارکس نے سرمایہ دار معاشروں کے معاشی قانون حرکت کو دریافت کیا۔ یہ سرمایہ دار معاشرہ کس طرح جم لیتا، کس طرح ارتقائی مراحل طے کرتا اور پھر زوال سے بھٹکا رہتا ہے اس

کا مطالعہ اس نے سائنسی بنیادوں پر کیا۔ اور اس کے عارضی تاریخی کردار کو ثابت کیا کہ کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام اور معاشرہ میں جو تضاد پایا جاتا ہے اسے بطور خاص سمجھا اور تلاش کیا۔ مارکس نے یہ ثابت کیا کہ سرمایہ داری نظام کے تمام لوہڑوا اور پیٹی لوہڑوا مصلحوں اور ریفارمروں کی کاوشوں اور پردہ پوشیوں کے باوجود یہ تضادات نمایاں ہوتے چلے جائیں گے اور اصلاح کا کوئی عمل ان تضادات کو ختم نہ کر سکے گا۔

مارکس نے سرمایہ داری کی میکائزم کو واضح کر دیا۔ اس کے استحصال، اس کی صحیح صورت کو دکھایا ہے۔ سسرپس ویلیو کو اس نے واضح کیا۔ سیر مزدور کی قدر محنت جو اس کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں اس کی سیر پاور کے درمیان جو فرق ہے اس کا نام سسرپس ویلیو ہے۔ مارکس نے سسرپس ویلیو کا نظریہ دریافت اور پیش کر کے سرمایہ داروں کے استحصال کو بے نقاب کر دیا۔ لینن نے کھٹا کھٹا۔

ناضل قدر کا تصور کارل مارکس کے اقتصادی نظریے کا بنیادی پتھر ہے۔
مارکس کے نظریات کو سمجھنے کے لیے ان بطور کو پڑھیے وہ لکھتا ہے۔

The Monopoly of Capital becomes fetter upon the mode of Product which has sprung and flourished Along with and under it centralisat of the Production and Socialisation of labour at last reach a point wh They become is compatible with their captilast integument. T integument is burst as under the knell of capitalist private proper bou The Expropriators are Expropriated.

Money, Production and Commodity.

رکیڈیشن جلد اول ص ۶۳)

داس کیڈیشن کی پہلی جلد پر اس آف پروڈیونگ کے موضوع پر ہے۔ دوسری جلد میں مرلے کی تقسیم کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان دونوں پر اس سرنے کے اتحاد کے تحت پروڈکشن کے فیصلہ کن کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مارکس سرمائے کو حرکت میں دیکھتا ہے اور اس کی سرکولیشن بھی مرلے

کی مختلف شکلوں میں ہوتی ہے۔ یعنی MONEY, PRODUCTION AND COMMODITY کی پرودکشن کا سائینٹیفک تجزیہ بھی کیپیٹل کی دوسری جلد ناموضوع ہے۔ سرمایہ دار معاشرے میں ناقابل اصلاح تضادات کا تجزیہ بھی دوسری جلد میں پیش ہوا ہے۔ کارل مارکس یہ ثابت کرتا ہوا ملتا ہے کہ پرودکشن کی انارکی، بحران، بیروزگاری، سرمایہ داری کا ناگزیر جزو ہیں۔

تیسری جلد میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا کلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ مارکس ثابت کرتا ہے کہ ایک کارخانے اور صنعتی منافع، ایک تاجر کا تجارتی منافع، سود و حوز، اور بینک کا حاصل کردہ سودی منافع اور جاگیردار کی آمدنی، یہ سب سروس ویلیو سے جنم لیتے ہیں۔ وہ منافع کی تقسیم اور اس کی بدلی ہوئی صورتوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سرمائے کی مختلف اشکال کا کھوج لگانا اور ثابت کرتا ہے۔ مارکس کے سارے معاشی نظریات مکمل طور پر واس کیپیٹل میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن نے اس کے نظریہ معاشیات کو انسانی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔ مارکس کا نظریہ اس کے فلسفہ سیاسی اقتصادیات اور سائینٹیفک کیونزم پر مشتمل ہے۔ اس نے اپنی تحقیقات میں مادی جدلیات سے بھرپور استفادہ کیا۔ واس کیپیٹل سائینٹیفک کیونزم کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ محنت و سرمایہ کے مسائل کو کارل مارکس نے اپنے انداز میں حل کیا ہے۔ اس کا نظام فکر آج کے زمانے میں جواہریت اختیار کر چکا ہے۔ اسی کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

• واس کیپیٹل سائینٹیفک تجزیہ اور نظام فکر پیش کرتا ہے۔ جس سے لاکھوں کو اختلاف ہو لیکن اس کو مکمل طور پر نہ جھٹلایا جاسکے نہ جھٹلایا جاسکے گا۔ آپ مارکس کے افکار اور نظریات کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن مارکس نے جس طرح سرمایہ داری اور سرمایہ داری نظام کا پل کھولا ہے۔ وہ اتنی بڑی حقیقت اور سچائی ہے کہ جس نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔

• واس کیپیٹل پر یہ مضمون تشنہ نامکمل اور صور اور بے حد سرسری ہے ضروری ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ سنجیدگی اور غور کیا جائے۔ کیونکہ اس کتاب نے دنیا کے نقشے ہی کو نہیں بلکہ انسانی نظام کو بھی ہلایا ہے۔

سائیکو انالسز

فرائیڈ کے ساتھ اختلافات کا سلسلہ تو اس کی اپنی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا اور پچھلی چند دہائیوں سے تو اس کے افکار و نظریات کی بڑے شدید انداز میں چھیڑ چھاڑ کی جا رہی ہے لیکن ان تمام اختلافات اعتراضات اور تنقید کے باوجود فرائیڈ کے سر پر ایک ایسا تاج ہے جسے کوئی اتار نہیں سکتا۔ فرائیڈ نے انسانی لا شعور کو دریافت کیا اور وہ تحلیل نفسی کا بانی ہے۔ فرائیڈ نے بیسویں صدی کے فکر و عمل کو جتنا متاثر کیا۔ اس کے اثرات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ فرائیڈ کے نظریات، اس کی اصطلاحیں ساری دنیا میں زبانِ زدِ عام ہیں اور اس کے نظریات نے پوری انسانیت کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ وہ عام معنوں میں انقلابی نہیں تھا لیکن موجودہ دور کی ذہنی، جنسی، نفسیاتی اور فکری دنیا میں جتنا بڑا انقلاب فرائیڈ نے پیدا کیا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔

فرائیڈ کی تصنیفات میں سے میں نے اس کی کتاب "انسٹروڈیکٹری لیکچر ڈاؤن سائیکو انالسز" کا انتخاب بوجہ کیا ہے۔ یوں تو فرائیڈ کی بیشتر تصنیفات ایسی ہی جو بہت فکر انگیز ہیں لیکن جو کتاب اس کے نظریات کی وضاحت کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی کتاب ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ فرائیڈ کی جن کتابوں کو سب سے زیادہ پڑھا گیا ان میں بھی یہی کتاب سرفہرست ہے۔ اس کا پہلا جرمین ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں دی آنا میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں ہی اس کا انگریزی ترجمہ ڈبلیو جے۔ ایچ سپرٹ نے کیا۔ جوملن اور نیویارک سے بیک وقت شائع ہوا۔

فرائیڈ نے یہ لیکچر دی آنا میں ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء میں دیے تھے۔

گمنڈ فرائیڈ کے حوالے سے اس کی کسی ایک کتاب کو بنیاد بنا کر اس کے افکار و نظریات کا جائزہ

یہ ناممکن ہے۔ اس مضمون کی حیثیت دراصل فرائیڈ کی زندگی اور حبلہ نظریات اور عالمگیر اثرات کے حوالے سے چند اشارے پیش کرنا مقصود ہے۔ فرائیڈ وہ سائنسدان اور مفکر ہے جس کے نظریات و افکار پر اتنا کچھ اب تک لکھا جا چکا ہے کہ ایک آدمی کے لیے یہ سب کچھ پڑھنا بھی ممکن نہیں۔ تاہم میں نے فرائیڈ کے حوالے سے چند کتابوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جن کے مطالعے سے فرائیڈ کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

سگنڈ فرائیڈ ۶ مئی ۱۸۵۶ء کو فریبرگ میں پیدا ہوا۔ جو مورایا کا ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ اور ان دنوں آسٹریا ہنگری کا علاقہ تھا۔ وہ متوسط طبقے کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اپنے والد کی دوسری بیوی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کا والد ادون کا تاجر تھا۔ فرائیڈ کی پیدائش سے پہلے ہی وہ مالی مشکلات کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک بڑے کنبے کی کفالت بہت دشوار ہو گئی تھی۔ فرائیڈ کی عمر تین برس کی تھی کہ جب اس کے والد نے وی آنا منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں وی آنا میں فرائیڈ نے اپنی زندگی کے گگ بھاگ۔ اسی برس بسریہ کیے۔

بڑے کنبے کی ضروریات، مالی دشواریوں کے باوجود فرائیڈ کے والد نے اس کی تعلیم پر لوری توجہ دی۔ زمانہ طالب علمی میں خود فرائیڈ بھی بہت ذہین اور محنتی طالب علم ثابت ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں فرائیڈ نے سکول کی تعلیم لوری کر لی۔ وہ جماعت میں اول آتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا۔ لومبارڈی کے زمانے میں ہی اس نے بڑے عوام اپنے دل میں پیدا کر لیے تھے۔ یونیورسٹی میں اس نے بڑے انماک سے تعلیم حاصل کی۔ فزیکل سائنس میں اس کی دل چسپی بہت نمایاں رہی۔ اعصابی نظام پر اس نے اسی زمانے میں خاص کام کیا۔ پھر جنرل ہسپتال وی آنا میں ڈاکٹر کی حیثیت سے فرائزن انجام دینے لگا۔

مارتھا۔ اس کی ہونے والی بیوی سے فرائیڈ کا عشق۔ بھی اس کی زندگی کا اہم واقعہ ہے حالات کی دشواریوں کی بنا پر ان کی شادی تاخیر سے ہوئی۔ لیکن ان کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ فرائیڈ کی مارتھا سے شادی ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے وہ پیرس جاکر اعصابی امراض کے ماہر سٹارکوتھ کے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ جس سے فرائیڈ نے بہت فیض اٹھایا۔ اس نے وی آنا میں اپنا مطب قائم کیا اور وہاں خاص طور پر اعصابی امراض کا علاج کرنے میں شہرت حاصل کی۔ اسی زمانے میں اس نے کوپن

کے ذریعے علاج کے امکانات پر ایک مقالہ لکھا۔ فرائیڈ کی تحقیقات کا دائرہ وسیع ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر جوزف بریوئر نے ہسپتال کے مرض میں مبتلا کئی برس پہلے ایک لڑکی کا انوکھے انداز میں علاج کیا تھا جس سے فرائیڈ بے حد متاثر تھا۔ فرائیڈ نے اس سلسلے میں بھی پیش قدمی کی اور اپنی تحقیقات کو مزید بڑھانے اور پھیلانے لگا۔ اس طریقہ علاج میں مریض کو ہنسنا، ناڑکیا جانا تھا۔ بعد میں فرائیڈ نے اس طریقہ کار میں انقلابی تبدیلی پیدا کر کے اسے آزاد ملازمر خیال "کارنگ دے دیا۔ اسی زمانے میں فرائیڈ کی دوستی برلن کے نامور معالج فلیسن کے ساتھ ہوئی۔ ان دونوں کی جو طویل خط و کتابت ہوئی وہ شائع ہو چکی ہے اور اس سے فرائیڈ کے نظریات اور تحقیقات کے آغاز و ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے مقالہ "پروجیکٹ فار اے سائنٹیفک سائیکولوجی" لکھا جو اس کے طریقہ تحصیل نفسی کے لیے پہلی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس زمانے میں فرائیڈ نے دمی انامیس شاگردوں کا ایک حلقہ جمع کر لیا تھا۔ دس برس بعد ۱۹۰۶ء میں فرائیڈ کے نظریات کو زیورچ میں سربراہ گیا۔ ڈاکٹر Blueler جو زیورچ کے دماغی امراض کا اسپتال تھا اس نے فرائیڈ کے نظریات کی تائید کی۔ ڈوہگ وہاں اسی ڈاکٹر کا نائب تھا۔ اس کے بعد سالز برگ میں ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں تحصیل نفسی کے ماہرین کی بین الاقوامی کانگریس کا انعقاد ہوا۔ فرائیڈ اور ڈوہگ کو امریکہ نے لیکچر دینے کی دعوت دی۔ دونوں امریکہ گئے جہاں ان کا پُرچوش استقبال ہوا۔

فرائیڈ اپنے کام میں جتا رہا حالانکہ اس کے شاعری اس کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ایڈلر نے اس کا ساتھ چھوڑا اور ۱۹۱۳ء میں ڈوہگ نے نفسیات کے نئے دستاویز اور افکار و نظریات جہاں دنیا بھر میں تیزی سے پھیل رہے تھے وہاں اس کی مخالفت کا بازار بھی گرم ہوتا چلا گیا۔ فرائیڈ کی زندگی میں کسی المناک واقعات رونما ہوئے۔ اس کی بیٹی اور لڑا سے کا انتقال ہوا۔ خود فرائیڈ ایسے مرض میں مبتلا ہوا جس سے اسے مرتے دم تک کبھی چھٹکارا نہ مل سکا۔ لیکن فرائیڈ نے اپنا کام جاری رکھا۔ اوہرنازی برسر اقتدار آگئے۔ اور فرائیڈ کے افکار و نظریات اور یہودی ہونے کی وجہ سے اس کی بے انتہا مخالفت شروع ہو گئی۔ اس کی تصنیفات کو سر بازار جلایا گیا لیکن فرائیڈ کا شمار دنیا کے عظیم انفلوئنس میں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جب اس

ہجرتی برس کی تھی اسے رائے سوسائٹی کارکن بنا کر اسے اعزاز بخشا گیا۔ جون ۱۹۳۸ء میں فرائیڈ کو جرمنی سے بان بچا کر اپنے کنبے کے ساتھ نکلا پڑا۔ اس نے لندن کا رخ کیا جہاں ۲۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اس کا انتقال ہوا۔

”انٹرنیشنل آف ڈریزیز“ (۱۹۰۰ء) فرائیڈ کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس سے پہلے فرائیڈ اپنی تحقیقات کے اہم نتائج ہمک پہنچ چکا تھا۔ اور ۱۸۹۰ء میں اس نے ”تحلیل نفسی“ (سائیکو انالیسیس) کی اصطلاح سے دنیا کو متعارف کر دیا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں وہ اودیسس کمپلیکس اور infantile sexuality کے نظریات کو پیش کر چکا تھا۔ انٹرنیشنل آف ڈریزیز میں اس نے پہلی بار لپوری صراحت اور وضاحت سے لاشعور اور سخت الشعور اور ذہن کے طریقہ کار کو پیش کیا۔ اس کے یہ نظریات بہت دھماکہ خیز ثابت ہوئے جن کے اثرات سے بیسویں صدی کی نسلی صورت گری ہوئی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے سائیکوجی آف ایوری ڈے لائف“ شائع کی۔ اس کتاب کے عنوان سے ہی اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اس کا نظریہ جنس شائع ہوا جس میں اس نے جنس کی جہت کا سراغ شیر حزاری کی عمر سے بچپن کی عمر تک پیش کیا۔ ۱۹۱۰ء میں رنگیت کے نظریے کو پیش کیا ۱۹۱۳ء میں ٹوٹم اینڈ ٹیبو کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۱۵ء - ۱۹۱۷ء میں اس نے انٹروڈکٹری پیکرز دیے جو بعد میں شائع ہوئے ۱۹۲۱ء میں گروپ سائیکوجی کی اشاعت۔ جس سے سائنسی انداز میں ”E.S.“ کے تخلیقی مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے ۱۹۲۳ء میں ایگوائنڈی D کی اشاعت ۱۹۲۷ء میں ڈی فیوچر آف این ایوژن - مذہب اور اس کے سماجی اعمال پر فرائیڈ کی پہلی کتاب ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں فرائیڈ نے اس موضوع پر بہت کام کیا۔ ”سولائزیشن اینڈ الٹس ڈسکونڈینس“ (۱۹۳۰ء) جس میں جب تک تخریب پر روشنی ڈالی گئی۔ فرائیڈ کی آخری کتاب جو اس کی زندگی میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔

moses and Monotheism. ہے ان کے علاوہ فرائیڈ کے خطوط دیگر تمام ناقام کام بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں فرائیڈ کے مطالعے کے لیے جو کتاب اب تک بہتر مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے وہ شہزاد احمد کی ”موت، تہذیب مذہب“ ہے اس کے علاوہ جن عسکری کام مضمون ”فرائیڈ اور جدید ادب“ (ستارہ یادادبان) دنیا کے تین بڑے نفسیات دان (ڈاکٹر سلیم اختر) بطور خاص قابل ذکر ہے۔ فرائیڈ کے حوالے سے کچھ کام ابتداء میں شیر محمد اختر مرحوم نے بھی کیا تھا۔ مضامین کے حوالے سے دیکھا جائے تو فرائیڈ پر اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

فرائیڈ کے WORKS مکمل صورت میں انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔ سٹریچی نے ایک ٹیم کی مدد سے یہ فقید المثل کام کیا ہے۔ راشا عتی ادارے پبلیکن نے فرائیڈ لائبریری کے عنوان سے فرائیڈ کی اہم تصانیف چھاپی ہیں۔

فرائیڈ پر بیشتر ایسے الزامات لگائے گئے ہیں جن کا فرائیڈ کے نظریات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور بہت سے ایسے الزامات ہیں جو علمی اور سائنسی اعتبار سے بے معنی اور بے کار ہیں۔ بہت سے اختلافات جو علمی اور سائنسی سطح پر رکھے گئے ہیں یقیناً ان میں معنویت اور وزن موجود ہے۔ ایڈلر ڈونگ اور رائخ کے اعتراضات اور ان کے اپنے افکار کا مطالعہ بھی فرائیڈ شناسی کے لیے ناگزیر ہے۔

فرائیڈ کے بارے میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ اس نے جنس کو انسانی زندگی کا محور و مرکز بنا دیا یقینی امر ہے کہ فرائیڈ نے جنس کو بے حداہمیت دی ہے لیکن اس میں مبالغہ کا عنصر شامل نہیں ہے اور فرائیڈ کے نظریات و افکار محض جنس تک ہی محدود نہیں ہیں۔ فرائیڈ کی اہم کتابوں کے ذکر کے ساتھ مختصر آئن کے مباحث و تحقیقات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

نیوا نرڈو ڈکسٹری پیکچرز جس کو ہم نے دنیا کی سب سے عظیم کتابوں میں شامل کیا ہے۔ یہ وہ پیکچرز ہیں جو کچھ تو اس نے ۱۹۱۵ء - ۱۹۱۶ء میں دی آنا میں دیے تھے اور بیشتر وہ پیکچرز ہیں جو صرف کتابی صورت میں ہی شائع ہوئے۔ ان پیکچرز میں فرائیڈ نے اس کے مختصر ویباچے میں جو دکھا ہے کہ یہ نئے پیکچرز ابتدائی پیکچرز کا نعم البدل نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کی جگہ لے سکتے ہیں اور ابتدائی اور نیا دی موضوعات کو نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

ان پیکچروں میں حزاب کے نظریے حزاب اور اصنام و توہم پرستی، نسوانیت، تفکر و پریشانی اور ذہنی امور کو موضوع بنایا گیا ہے اور اصل مرکز تحلیل نفسی اور اس کے مبادیات اور تقاضے۔ فرائیڈ نے لاشعور کی دریافت کے بارے میں کہا ہے کہ دنیا کے بعض بڑے اور علاق شاعروں اور ادیبوں کے ہاں اس کا سراغ ملتا ہے لیکن وہ سائنسی سطح پر اس کی صراحت نہ کر سکے۔ فرائیڈ نے تحلیل نفسی کے حوالے سے لاشعور کی دریافت کے بعد اپنی تحقیقات کو جاری رکھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے تمام عوامل اور محسوسات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک

انسانی زندگی چار ایشیا کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہے۔ لاشعور، انار، فوق الانا اور اصول حقیقت۔

جنس بہر حال حیاتیاتی ضرورت ہے۔ صدیوں سے اسی کے ذکر کو گناہ اور ممنوع قرار دیا گیا اس سے انسان کی نفسی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہوئی۔ اس بڑی حقیقت کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ سماج مذہب اور نام نہاد اخلاقیات نے اس کو کھینچنے اور مسکنے میں کولی سکسز اٹھا رکھی۔ فرائیڈ جب اپنی تحقیقات کو انجام تک پہنچاتا ہے تو وہ پوری جرأت سے حقیقت منفی عوامل پر جو صدیوں پر محیط کرتا ہے تنقید کرنا اس وجہ سے بھی اسے مطعون کیا گیا کہ وہ راج اور قدیم خیالات و افکار کی قلعی کھول رہا تھا۔ فرائیڈ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی حقیر اور معمولی سی چیز بھی بے معنی نہیں ہوتی۔

انسان اپنی پوری سی کوشش بھی کر لے تو بھی اس سے کوئی رحمت اور بے معنی بات یا حرکت سر نہ نہیں ہو سکتی۔ انسانی زندگی کا ہر لمحہ اس کو بنانا یا بگاڑتا ہے۔ اور بعض لوگوں کے بڑے کارنامے بھی ان کی شخصیت کو نمایاں نہیں کر سکتے۔ جبکہ ان کی معمولی سی بات اور حرکات اس کی شخصیت کی کلید بن جاتی ہے۔ انسان کا ہر فعل اور عمل ہر نکل اس کی نفسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک کسی شخص کے افکار کا گہرا تعلق اس کی بدحواسیوں اور خوابوں سے بھی ہوتا ہے۔

فرائیڈ نے انسانی شخصیت کو سمجھنے کے لیے جو طریقہ اختیار کرتا ہے اسے آزاد کلام کہتا ہے۔ فرائیڈ تحلیل نفسی کے لیے اپنے معمولی یا شخصیت سے مطابقت رکھتا ہے کہ وہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو بیان کرتا چلا جائے۔ یوں ایسے شخص کی پرانی دہی ہوئی خواہشات اور واہموں کی یادیں شعوری سطح پر نمایاں ہو جائیں گی۔ فرائیڈ کا نظریہ یہ ہے کہ ذہنی امراض یا عصبی انتشار کی وجوہات وہ اثرات ہیں جو اس نے بچپن میں قبول کیے تھے۔ فرائیڈ کے نظریات کے مطابق شخص تحلیل نفسی کے درمیان سچ بولنا چاہتا ہے لیکن داخلی مزاحمت اسے روکتی ہے۔

یہ منفی مزاحمت فرائیڈ کے نزدیک از بنیاد راجی عوامل کی پیداوار ہے جو بچپن میں اس پر اثر انداز ہوئے تھے۔ یوں مرصع لاشعور میں چھپی پیچیدگیوں کو شعوری سطح پر لا کر قلعے صحت مند ہو جاتا ہے۔

تحلیل نفسی کے حوالے سے فرائیڈ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس بات پر زور دیا تھا کہ محض دہی ہوئی خواہشات کا احساس دلانا ہی ضروری نہیں بلکہ ان کی تعلیم و تربیت بھی ناگزیر ہے۔

فرائیڈ لا شعور کو جبلی آرزوؤں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ ان میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وہ فی الفور تسکین چاہتا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جس سے الم پیدا ہوتا ہے۔ اور تسکین کے لیے وہ تحلیل سے مدد لیتا ہے لیکن دماغ کی مثال خارجی دنیا کی حقیقت سے تطابق پیدا نہیں کر پاتی۔ اس سے نفسی سچیدگیوں جنم لیتی ہیں انسانی آرزوؤں میں سے بہت سی آرزوئیں ایسی ہیں جنہیں سماج پسند نہیں کرتا اسے مذکور قرار دیتا ہے اس لیے ایسی آرزوؤں کو دباننا پڑتا ہے لیکن وہ مٹی یا مرنی نہیں ہیں بلکہ لا شعور میں چھپ جاتی ہیں اور اسی سے انسانی شخصیت بگڑتی ہے اور اس سے ذہنی اور نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں۔ اس کے لیے تحلیل نفسی ہی وہ طریقہ کار ہے جس سے انسان کو صحت مند بنایا جاسکتا ہے۔

تحلیل نفسی - سائنس ہے اور فرائیڈ کو بھی یہ پسند نہ تھا کہ اسے فلسفی سمجھا جائے وہ اپنے آپ کو سائنسدان کہتا تھا تحلیل نفسی کے حوالے سے نفسیات کو سائنس کا درجہ دیکر فرائیڈ نے انسانی کائنات کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ادب، علم، تہذیب، سماج پر فرائیڈ کے اثرات بہت گہرے ہیں بیسویں صدی اس کے فکر و نظریے سے تشکیل پاتی ہے۔ فرائیڈ سے تمام اختلافات ایک طرف لیکن لا شعور کی دریافت ایک طرف اور تحلیل نفسی اور نفسیات کو سائنس بنانا۔ اس کا وہ کام ہے جو انسانی معاشروں اور علوم پر ہمیشہ اثر انداز ہوتا رہے گا۔

میموریز۔ ڈریزری فلیکشنز

ژونگ کے حوالے سے اس کی بعض دیگر کتابوں کو نظر انداز کر کے میرا اس کتاب کو دنیا کی سوعظیم کتابوں میں انتخاب کرنا، ژونگ کے بہت سے مداحین، قارئین اور ناقدین کے لیے تعجب اور اختلاف کا باعث ہو سکتا ہے۔

مثلاً ایک اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اہم ترین تصانیف "آر کی ٹائپس اینڈ دی کولیکٹو ان کونٹنس" یا "سمبلز آف ٹرانسفارمیشن" وغیرہ جیسی کسی کتاب کو دنیا کی سوعظیم کتابوں میں شمار کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال اگر میں نے ژونگ کی کتاب "یادیں" سزا ب اور عکس کو دنیا کی سوعظیم کتابوں میں سے ایک سمجھا ہے اور اسے اپنی فہرست میں شامل کیا ہے تو اس کی کچھ وجوہات بھی ہیں۔

ژونگ کے COLLECTED ورکس کی برطانیہ اور امریکہ میں اشاعت ہو چکی ہے ژونگ کا کام میں ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (میں روٹج ایڈیشن کا حوالہ دے رہا ہوں) ایک ایک جلد میں اس کی کسی کسی چھوٹی بڑی کتابیں اور مقالے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف نامیوں نے اس کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ اور انفرادی حیثیت میں بھی شائع کیا ہے۔ جن کی تعداد کسی درجنوں تک پہنچی ہے مگر اس کی یہ کتاب میموریز، ڈریزری، رسی فلیکشنز جو ژونگ کی خود نوشت ہے خاص انداز میں مکمل اور مرتب کی گئی، اس کتاب کو اس کی کلیات میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی حیثیت اپنی پہلی اشاعت سے اب تک بالکل آزاد اور انفرادی سمجھی گئی ہے۔

ژونگ کی اس کتاب کو اگر میں نے دنیا کی سوعظیم کتابوں میں سے ایک کی حیثیت دے کر اپنے اس سلسلہ مضامین میں شامل کیا ہے تو اس سے ژونگ کی اہم کتابوں کو نظر انداز کرنا یا ان کی وقعت

سے انکا مقصد نہیں ہے اگر میموریز، رمی فلیکشنز، کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے تو اس کی کچھ محقول وجوہات ہیں۔

یہی سمجھتا ہوں کہ یہ وہ قاری جو ڈونگ کی شخصیت اس کی فکر کے ارتقا، اس کے نظریات کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ اس کتاب میں یقیناً ڈونگ کے مہتمم باشان کام کے بارے میں تفصیلات موجود نہیں ہیں لیکن جس ایجاز اور اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ مہتمم کے اعتبار سے اتنا وسیع اور نتیجہ خیز ہے کہ ہم خود ڈونگ اور نفسیات میں اس کی عطا اور اختراع کے بارے میں تمام بنیادی معلومات سے متعارف ہو جاتے ہیں اس کتاب کا مطالعہ تزیین دینا ہے کہ ڈونگ کے نظریات کو تفصیل سے پڑھا جائے اور اس کے نظام فکر کا زیادہ دلچسپی اور انہماک سے مطالعہ کیا جائے۔

جی۔ بی۔ پریٹلے نے اس کتاب کے حوالے سے لکھا تھا۔ "اس کا کام وسعت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ وہ انسانی روح کے بطون کا سب سے بڑا فریزیشن تھا۔ اس نے جو نتائج اخذ کیے، اس نے اسے ایک پُر جوش درویش کا مقام بخشا۔"

فرائیڈ کے بعد جس نفسیات دان کو اپنی زندگی میں ہی بقائے دوام حاصل ہوئی وہ ڈونگ ہے ایڈلر وغیرہ بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن فرائیڈ کے متقدموں، اس کے شاگردوں اور پھر اس سے انحراف کر کے نفسیات کے علم کو نئی گہرائیوں، نئی معنویت سے بہکا کر دینے والے میں فرائیڈ کے بعد ڈونگ ہی سرفہرست دکھائی دیتا ہے۔ ڈونگ نے جو نظریات دیے ان کے پھیلاؤ کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ عالمگیر سطح پر اس کے ماننے والے موجود ہیں ڈونگ کا ایک اپنا دہانہ نفسیات ہے فلپ ٹائن بی نے تو ڈونگ کو کیریکلر ڈاؤنڈیٹس کے ہم پل قرار دیا ہے۔

میموریز، ڈریجز، رمی فلیکشنز، اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اس کتاب کے حوالے سے ہم دنیا کے اس عظیم ترین نفسیات دان ڈونگ کے باطن میں جھانک سکتے ہیں یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ڈونگ خود کیا تھا اور اس کا کام کس درجے کا ہے یہ کتاب بلاشبہ ایک حیران کن، منفرد و تادیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ڈونگ کے تمام نظریات سے ہم متعارف ہو سکتے ہیں اور خود ڈونگ کو بھی بہت قریب سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

ژڈوگ نے خاصی طویل عمر پائی اور اپنی زندگی کے اہتمام کے فریب تک وہ اپنے مداحوں
 شاگردوں، نامشروں اور قارئین کے پُر زور اصرار کے باوجود اپنی خود نوشت قلم بند کرنے سے انکار
 کرتا رہا۔ ژڈوگ کا خیال تھا کہ کوئی شخص اپنے بارے میں پورا صحیح بیان کرنے کی صلاحیت اور جرأت
 نہیں رکھتا بہر حال، ۱۹۵۷ء میں وہ یادداشتیں قلم بند کرانے کے لیے تیار ہو گیا اس کام کے لیے۔
 اس نے اپنی ایک دوست اور نائب اینیلا جیف کا چناؤ کیا وہ بولتا جاتا اور دوسرے ضروری مستند
 مواد کے ذریعے اینیلا جیف سے مرتب کرتی جاتی۔ ژڈوگ خود اس کام کی نگرانی کرتا تھا۔ جلد
 ہی وہ اس کام میں اتنی دلچسپی لینے لگا کہ اس نے خود ہی اپنی زندگی کے واقعات کو قلم بند کرنا
 شروع کر دیا۔ ژڈوگ نے خود بتایا کہ اس کے دوسرے اہم کاموں کی طرح ایک خواب اس کا
 محرک بنا اور اس نے خود ہی اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ژڈوگ کا انتقال ہوا اور
 اس وقت تک یہ مسودہ مکمل ہو چکا تھا اور اس کا بڑا حصہ خود ژڈوگ کے اپنے ہاتھ لکھا ہوا تھا
 یہی مسودہ جس کو پہلے اینیلا جیف نے ریکارڈ کیا اسے اینیلا جیف نے ہی مرتب کیا اور پہلی بار ۱۹۶۲ء
 میں اسے شائع کر دیا تب سے اب تک اس کتاب کے کسی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ژڈوگ کی شخصیت اس کے نظریات اور اس کی نفسیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے اس
 کتاب میں خاصا مواد بھی موجود ہے۔ ژڈوگ نے اس کتاب میں بعض ایسے امور اور موضوعات پر
 بھی اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے جو اس سے پہلے اس نے اپنی کسی کتاب میں شامل نہ کیے تھے۔
 اس کتاب میں وہ انسانی اور خدا کے تعلقات، عیسائیت، تکلیف اور حیات بعد الممات کے
 بارے میں اپنے خاص نظریات کا اظہار کرتے ہوئے ملتا ہے۔

یہ کتاب اس انداز کی خود نوشت تو نہیں ہے جو عام طور پر پرائیج ہے اس کی سبب اور اسلوب
 جدا گانہ ہیں۔ جرمن زبان، جس میں یہ لکھی گئی ہے اس میں اس کا کیا ذائقہ ہے اس کے بارے میں
 تو کچھ عرصے کرنے سے قاصر ہوں مگر وہ لوگ جنہوں نے جرمن زبان میں پچھڑا اور کلڈ رائٹسٹن کا
 انگریزی ترجمہ پڑھا ہے وہ اتفاق کریں گے کہ اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف ایک خاص
 مقام کی حامل ہے۔

اس کتاب پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ژڈوگ کے بارے

میں اُردو میں ہونے والے ایک اہم کام کا ذکر کروں۔ ٹرونگ کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اُردو میں ایک ہی کتاب ہے اور وہ کتاب خاصے خاصے تقاضے پورے بھی کرتی ہے اس کا نام تحلیلی نفسیات ہے اور اسے ڈاکٹر محمد اجمل نے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں نفسیات ٹرونگ کے باب میں یہ کتاب بہت اہم ہے۔ اور اُردو کے قارئین اس کتاب کے حوالے سے ٹرونگ کے نفسیاتی نظریات سے پوری طرح واقف اور متعارف ہو سکتے ہیں۔

”میموریز، ڈریگز، رمی فلیکشنز، بارہ البواب پر مشتمل ہے۔ ایک باب خاتمہ کلام سے متعلق اس میں ضمیر بھی شامل ہے جس میں ٹرونگ کے نام فرائیڈ کے کچھ خطوط اہم ٹرونگ کے نام ٹرونگ کا ایک خط جو شمالی افریقہ سے لکھا گیا اور رچرڈ ولہیم کے بارے میں ایک نوٹ بھی شامل ہے۔ پہلا باب ”ابتدائی برس“ کے نام سے ہے اس میں ٹرونگ بتاتا ہے کہ اس کی یادوں کا سلسلہ دو تین برس کی عمر سے جاملتا ہے۔ اس کے بعد اگلے باب میں ”سکول گزرنے والے برس“ کا ذکر کرتا ہے۔ تیسرا باب طالب علمی کا دور ہے۔

چوتھے باب میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح وہ تحلیلی نفسیات کی طرف راغب ہوا اور اس ضمن میں اس کی ابتدائی سرگرمیاں کیا ہیں۔

پانچویں باب فرائیڈ کے بارے میں فرائیڈ کے ساتھ تعلقات اور عقیدت مندی کا آغا ناس کے نظریات کے بارے میں ٹرونگ کی رائے، امریکہ کے سفر کا احوال اور پھر فرائیڈ کے ساتھ نظریاتی اختلاف کا آغاز اور تعلقات کا خاتمہ موضوع بنے ہیں یہ باب اپنے اعجاز و اختصار کے باوجود ان تمام تعلقات اور نظریاتی اختلافات پر روشنی ڈالتا ہے جو فرائیڈ اور ٹرونگ کے درمیان تھے اس باب میں ٹرونگ نے فرائیڈ کا جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور اس کی شخصیت کو پرکھا ہے اس کا مطالعہ فرائیڈین اور ٹرونگ کے دلہانہ نفسیات سمجھنے میں بہت مدد دے سکتا ہے فرائیڈ جو ٹرونگ کو اپنا بیٹا اور اپنا جانشین قرار دینا تھا اس کے بارے میں ٹرونگ کی رائے بہت اہم ہے۔ اس باب میں اس حوالہ کا بھی تفصیل سے ذکر ہے جو سفر امریکہ کے دوران ٹرونگ نے دیکھا تھا اور فرائیڈ نے اس کی جو نفسیاتی تعبیر بتائی تھی وہ ٹرونگ اور فرائیڈ کے درمیان نظریاتی اختلافات کا سنگ بنیاد بنا۔

پھٹا باب لا شعور سے تصادم، بد ہے اس باب میں ٹرڈنگ نے اپنے تجربات اور نتائج کا ذکر کیا ہے۔ جن کی درجہ سے اس کا مشہور نظریہ لا شعور وجود میں آیا۔ ساتویں باب کا عنوان WORKS ہے جس میں ٹرڈنگ نے اپنے کام کا جائزہ لیا ہے۔ آٹھواں باب - نماز ہے جو ٹرڈنگ کی زندگی اور شخصیت کے ایک اہم حصے کو سمجھنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔ نواں باب ان ملکوں اور علاقوں کے سفر، ان کے مشاہدات اور تجربات پر مشتمل ہے جنہوں نے ٹرڈنگ کے نفسیاتی نتائج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس باب میں شمالی افریقہ، امریکہ یا پہلو انڈینز، ہندوستان اور راہینا اور روم کے سفر کا ذکر ہے۔ اس باب کا مطالعہ ٹرڈنگ کے ذہن، مشترقی علوم اور اجتماعی نفسیات سے اس کی دلچسپی اور اس کے اخذ کردہ نتائج کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ دوران سفر اس نے جو خواب دیکھے ان کا نفسیاتی تجربہ بہت ہی معنی خیز ہے۔

دسواں باب VISIONS کے نام سے ہے۔ گیارہواں باب - زندگی موت کے بعد اور باہولہ باب - بعد کے خیالات پر مشتمل ہے۔

فرائیڈ اور ٹرڈنگ کے نفسیاتی اختلافات اور ان کے نتائج میں جو بعد اور فرق ہے اس کا سمجھ لو یا احساس اس کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات پر مدلل تنقید کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ فرائیڈ نے جنس کو محور و مرکز قرار دیا تھا۔ ٹرڈنگ کو اس سے شدید اختلاف ہے۔

خوابوں کے اثرات جو انسان کی نفسیات اور ذہن پر ہوتے ہیں۔ اس کے حوالے سے وہ فرائیڈ کو لوہا کرڈٹ دیتا ہے۔ کیونکہ فرائیڈ نے ہی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا تھا۔ لیکن فرائیڈ خوابوں کی تعبیر جس انداز میں کرتا ہے اس سے ٹرڈنگ کو شدید نظریاتی اختلاف رہا۔ جس کا بہت مناسبتاً انہماک اس کتاب میں ملتا ہے

مذہب کے بارے میں بشراتوں کے حوالے سے روحانیت کے موضوع پر فرائیڈ نے جو نتائج پیش کیے ان سے بھی ٹرڈنگ کو شدید نظریاتی اختلاف تھا۔ ٹرڈنگ کے ہاں سماج، معاشرے اور سماجی عوامل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا فقدان فرائیڈ کے نظریات میں ملتا ہے۔ مذہب، بشراتوں اور روحانی تجربات کے بارے میں فرائیڈ کا رویہ۔ ٹرڈنگ کے اخذ کردہ

نتیجے سے بالکل مختلف ہے۔ ٹرڈنگ سے معنائیت، بشرتوں اور مذہب کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ طمد اور مادہ پرست نہیں ہے۔ جیسا کہ فرائیڈ تھا۔ اس کتاب میں "ON LIFE AFTER DEATH" والا باب بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے ٹرڈنگ کی اپنی شخصیت ہی سامنے نہیں آتی بلکہ فرائیڈ اور اس کے اپنے مزاج میں جو فرق ہے وہ بھی نمایاں ہوا ہے فرائیڈ مطلق العنانیت اور خاص اجارہ دارانہ علمی تکبر کا مالک تھا۔ ٹرڈنگ کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ فرائیڈ اپنی علمی تحقیقات کے نتائج کو بھی اپنی من مانی اور ذاتی شکل دینے کا قائل تھا۔ اس کے برعکس ٹرڈنگ فراخ دل، منکسر المزاج اور تحقیق کے نتائج کا تابع دکھائی دیتا ہے۔

ٹرڈنگ اور فرائیڈ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ فرائیڈ اور ٹرڈنگ کے درمیان جو طویل خط و کتابت تعلقات کے آغاز اور خاتمے کے دوران تک ہوئی رہی وہ بھی شائع ہو چکی ہے۔ فرائیڈ کو جو مقام اور ادویت حاصل ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خود ٹرڈنگ نے جس انماز میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ مگر تحلیل نفسی کے علم میں ٹرڈنگ کا اضافہ بے بہا ہے۔ انہوں نے انسانی ذہن کے ساتھ انسانی روح کو بھی سمجھنے اور سمجھانے کی جو سعی کی ہے وہ انسانی علوم اور بالخصوص نفسیات میں ایسی تبدیلیوں اور انقلابات کا باعث بنا جس نے اجتماعی انسانی سوچ کو ہی نہیں بلکہ زندگیوں اور عالمی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ میموریز، ڈریمز، رسمی فلیکشنز، ایک طویل انسانی سفر کی روداد ہے اور مسافر ٹرڈنگ ہے۔ اس کتاب کے ابتدائیے کا پہلا جلد ٹرڈنگ نے یوں لکھا ہے:-

"MY LIFE IS A STORY OF THE SELF REALISATION OF UNCONSCIOUS."

اور جن جملوں پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے۔ انہی جملوں پر میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔
جب لاڈ ترسے کنتا ہے سب کچھ صفا اور شفاف ہے اور میں بھی ہوں کہ جس پر بادل چھائے ہوتے ہیں۔ تو وہ اس امر کا اظہار کرتا ہے جسے میں اب اپنی بڑھتی ہوئی آخری عمر میں محسوس کر رہا ہوں۔ لاڈ ترسے ایک ایسے آدمی کی مثال ہے جو برتر بصیرت کا حامل ہے۔ جس

نے کارآمد اور بے کار اشیاء کو دیکھا ان کا تجربہ کیا ہے اور جو اپنی زندگی کے اختتام پر یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ پھر اپنے وجود کی طرف لوٹ سکے۔ ابدی نامعلوم علم کو پاپا کے بزرگ آدمی کا فیر کر کے ٹاپ جس نے بہت کچھ دیکھا۔ ابدی حقیقت ہے۔ ذہانت کی ہر سطح پر یہ ٹاپ اپنا ظہور کرتا ہے اور اس کی مشابہت ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کوئی ربوڑھا انسان ہو یا لاڈلے سے جب عظیم فلسفی۔ اب میں بڑھاپے کی عمر میں ہوں اور اس کی اپنی حد ہوتی ہے لیکن اب بھی بہت کچھ ہے جو میرے اندر کے خلاء کو بھرتا رہتا ہے۔ پوسے، جانور، بادل، دن اور رات اور وہ ابدیت جو انسان کے اندر ہے اپنے بائے میں جتنا غیر یقینی محسوس کرتا ہوں اتنا ہی میرے اندر تمام اشیاء کے ساتھ گہری قربت داری کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مغائرت جس نے مجھے دنیا سے ایک طویل عرصے تک بیگانہ رکھا۔ وہ اب میری اپنی داخل دنیا میں منتقل ہو گئی ہے اور اس سے مجھ پر اپنی فزات کے ساتھ غیر متوقع عدم آشنائی کا کشف ہوا ہے۔“

پیکر مز پر اگر لیں

انسان کی زندگی میں بڑی بڑی ناقابل یقین تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ خدا سے کروگار کے کرشمے ہیں کہ بہت پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ دانائی اور بصیرت نہیں بخشتا جس کی ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں سے توقع رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ بے پناہ بصیرت اور دانائی ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتا ہے جو تعلیمی اعتبار سے صفر ہوتے ہیں۔

میں نہیں جانتا ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے اپنے عقیدے سے وابستہ رہتے ہوئے بھی ایسے عقیدے کے حامل لوگوں کی بصیرت سے بلا تعصب فیض یاب ہو سکتے ہیں لیکن یقینی بات ہے کہ دنیا بے تعصب لوگوں سے خالی نہیں۔ اور پھر ہم جو دائرہ اسلام میں شامل ہیں اس کے لیے تو خاص ہدایت ہے کہ ہمیں جہاں سے علم اور دانائی ملے ہم اسے حاصل کر لیں۔

جان بنین ایسا ہی شخص تھا جو تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسی ہی کتاب لکھی ہے جو ہر عقیدے کے انسان کو متاثر اور فیض یاب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب جان بنین کے لپنے ذاتی عقیدے اور روحانی واردات میں ڈوبی ہوئی ہے پلگرمز پر اگر لیں ایک ایسا شاہکار اور فن پارہ ہے جسے نقادوں نے THE PERFECT ALLEGORY کا نام دیا ہے۔

جان بنین جس نے ایک "پرفیکٹ الیگوری" کو تخلیق کیا۔ جس کی تصنیف دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک ٹھٹھرا تھا۔ وصحات کے برتنوں کو جوڑا اور ٹانگے

لگانے والوں اور اس نے کسی مکتب، کسی مدرسے میں تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ یہ چھوٹی ذات کا آدمی ایسٹوڈ انگلستان، میں ۱۶۲۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بھی ٹھٹھیرا تھا۔ اسے درتے میں یہی ہنر ملا جو اس نے اپنے باپ سے سیکھا۔ جان بنین کا باپ ایک ایسا شخص تھا جس کی کوئی معرفت نہ تھی۔ وہ آوارہ منس اور نادار تھا۔ البتہ میکالے کا خیال ہے کہ جان بنین کا باپ اس اعتبار سے اپنے طبقے کے اُن گنت لوگوں سے بہتر تھا۔ وہ خانہ بدوش نہ تھا بلکہ اس کی ایک مستقل رہائش گاہ تھی۔ ممکن ہے ایب ہی ہو۔ لیکن جس زمانے میں جان بنین پیدا ہوا۔ اس زمانے میں ٹھٹھیروں کا کوئی دگر گھاٹ نہ ہوتا تھا۔ وہ گلی کوچوں، بازاروں میں گھومتے، آوازیں لگاتے، کام کرتے اور پھر جہاں رات آتی، سو جاتے۔ ان کو آوارہ گردوں چوروں اور اٹھائی گیروں کی صف میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

ایسے ماحول میں جنم لینے اور پرودان چڑھنے والے فرد میں ہر برائی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسا ہی جان بنین کے ساتھ ہوا۔ لڑا کپن کے بعد اس کا جوانی کا زمانہ برائیوں اور گناہوں سے آلودہ ہوا۔ شاید ہی ایسی کوئی برائی ہو جس کا جان بنین نے ارتکاب نہ کیا ہو۔ تاہم بعض محققوں اور ناقدوں کا یہ خیال ہے کہ جان بنین نے بجز دانکسار اور خالص مذہبی سطح کے جو آپ سے اپنی برائیوں اور گناہوں کے گنوائے میں خاصے مبدلے سے بھی کام لیا ہے۔

جب انسان کا قلب بدلتا ہے اس کا ضمیر خدا بیدار کرتا ہے تو انسان پہلا کام یہ کرتا ہے کہ وہ اپنا احتساب کرتا ہے۔ اپنے آپ کو مجرم اور گناہ گار سمجھتے ہوئے گناہوں اور جرائم سے توبہ کرتا ہے۔ جب جان بنین پر یہ لمحہ آیا تو اس نے بھی اپنی پرانی زندگی اور اس کی تمام عادات، دلچسپیوں اور مشاغل کو ترک کر دیا۔ وہ اس کے بعد ہمیشہ اپنے آپ کو عاصی سمجھتا رہا۔ پرانے گناہوں اور برائیوں کا احساس ساری عمر اس پر آسیب کی طرح مسلط رہا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۶۴۴ء میں یا اس کے قرب و جوار میں جان بنین کو امویل کی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور وہ تقریباً دو برس تک فوجی خدمات انجام دینا رہا۔ اس کا ذہن علم و فنون کے اثرات سے پاک اور صاف تھا۔ اس نے الیگوری (تمثیل) کے پردے میں سب کچھ کھلایا ہے۔ اس کے ہاں جنگ کے حقیقی معنی یہ بتاتے ہیں۔ گناہ کے ساتھ انسان کی کش مکش

فوجوں کی پیش قدمی اس کے ہاں حقیقی انداز میں انسان کا روحانی سفر بن جاتی ہے۔ اس کے ہاں تشبیہ و تمثیل اور علامتوں کی بہتات ہے۔ وہ ہر چیز کو تمثیلی انداز سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ "پلگرمز پراگریس" اسی لیے آج بھی دنیا کی بڑی کتابوں میں شامل کی جاتی ہے کہ اس کے تمثیلی انداز میں ایک ایسی "آزادی" ہے جس میں ہر عقیدے کا شخص اس سے اپنے اپنے معنوں میں فیض یاب اور لطف اندوز ہو سکتا اور ایک بڑے ذہنی تجربے سے گزر سکتا ہے۔

"پلگرمز پراگریس" کے پڑھنے والا ہر ذہن قاری یہ محسوس کرتا ہے اس میں جو کچھ دکھایا اور بیان کیا گیا ہے وہ لامحدود ہے۔ جان بنین کسی چیز کو اس کی "حدود" میں نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ہی اس کے ہاں آپ کو مفہوم سمجھنے کے لیے لغوی معنوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی پڑھنے والا لغوی اعتبار سے "پلگرمز پراگریس" کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسے کبھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ "پلگرمز پراگریس" اس اعتبار سے بھی دنیا کی منفرد تصنیف ہے کہ یہ ایک نمکمل الیکٹوری ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے تمثیل کے پردے ہٹا کر اندر سے اس کے باطن میں دیکھنے اور محسوس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

اس تمثیلی انداز نے جان بنین کی کتاب "پلگرمز پراگریس" کو ایک بے مثل اور لازوال

داستان بنا دیا ہے۔

جان بنین فرج کے فرائض سے سبکدوش ہوا تو اس نے ۱۶۴۸ء میں شادی کر لی۔

اس نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو بقول اس کے GOLLY BOOKS کی مالک تھی۔ اور وہ اس کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں جان بنین اپنی بیوی کے ساتھ بیڈ فورڈ منتقل ہو گیا۔ اس کی ازدواجی زندگی مختصر تھی۔ یہاں ۱۸۵۵ء میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جان بنین مذہب میں بے حد دلچسپی لینے لگا تھا۔ مذہبی عقیدے کے اعتبار سے وہ غیر مقلد NON CONFORMIST تھا۔ اس کی بیوی بھی اسی عقیدے پر ایمان رکھتی تھی۔ لیکن جان بنین کے دل میں نکوک و شہمات اور فاسد خیالات پیدا ہو چکے تھے۔ وہ شدید قسم کے روحانی بحران سے دوچار ہوا۔ وہ اپنے ضمیر کے کورے سہم رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں اپنے گناہوں کو مجسم دیکھتا۔ اپنی گم شدہ روح کو

خیالوں میں دیکھتا۔ روحانی کش مکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اور اس کی صحت تباہ ہو کر رہ گئی وہ سیالوں کی دنیا میں سانس لے رہا تھا لیکن پھر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس نے مذہبی تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ وہ فاضل عالم اور پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اس کا سارا علم اس کے تجربے کی دین تھا۔ اور جو کچھ وہ بیان کرتا اس کے لیے جو الفاظ کا استعمال کرتا وہ خلیبانہ ہوتے نہ فاضلانہ۔ بلکہ سیدھے سادے اور کھردرے۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کی تعلیمات سے متاثر ہونے لگے۔ اور اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اس کی شہرت پھیلتی گئی اب سینکڑوں لوگ اس کا وعظ سننے آتے۔ اس کی کھردری زبان میں بھی ایسا دلولہ اور ایسی آگ بھتی کہ لوگ اس کا وعظ سن کر لرزنے لگتے۔

برطانیہ میں جب بادشاہت شمال ہوئی تو چارلس دوم نے آزادی اظہار پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں اس نے حکم دیا کہ ریاست کے مذہب پر یقین رکھنے والے مقرر کیے ہوئے سند یافتہ مبلغ ہی وعظ کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو سرکاری کلیسیا سے وابستہ نہ تھے، سند یافتہ نہ تھے، ان پر وعظ و تبلیغ کی پابندی لگا دی گئی۔ لیکن جان بنین بہت ہارنے والا آدمی نہ تھا۔ وہ بہت جبری اور جرات مند تھا۔ اس پابندی کے بعد اس نے پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش، دلولے اور جرات مندی کا اظہار کرتے ہوئے تبلیغ و وعظ کا سلسلہ جاری رکھا۔ نتیجہ وہی نکلا جو ایسی کشمکش میں لازمی ہوتا ہے۔ جان بنین کو بیڈ فورڈ جیل میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ بارہ برس تک قید رہا۔ جیل میں جانے سے پہلے وہ دوسری شادی کر چکا تھا۔ اس کے بچے بھی تھے اس نے جیل میں رہتے ہوئے بھی اپنے بیوی بچوں کی کفالت کی۔ وہ اچھا دست کار تھا، منگالیا سے جو ملتا وہ بیوی بچوں کی کفالت پر اٹھاتا دیتا۔ بارہ برس کی قید کے زمانے میں اس کو صرف دو کتا ہیں ہی پڑھنے کو ملیں ایک بائبل اور دوسری فاکس کی کتاب ماریٹز (شہید) ۱۶۶۰ء میں جان بنین کو قید خانے میں ڈالا گیا تھا۔ ۱۶۷۲ء میں وہ آزاد ہوا۔ لیکن اس کے بعد اسے ایک بار پھر جیل جانا پڑا۔ اگرچہ اس بار قید کی مدت مختصر تھی۔!

عالمی ادب میں اور خود ہماری اردو زبان میں بھی ایسی بہت سی شاہکار اور یادگار

کتابیں جو جیل میں لکھی گئیں۔ جان بنین کی کتاب "پلگرمز پراگریس" بھی ایسے ہی عظیم فن پاروں میں سے ایک ہے جو جیل میں لکھے گئے بعض نقادوں نے بہت حد تک درست کہا ہے کہ اگر جان بنین کو زندان کے حوالے نہ کیا جاتا تو غالباً وہ اپنا یہ شاہکار کبھی لکھ نہ سکتا جب یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تو لوگوں نے اس پر خاص توجہ نہ دی۔ اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو پھر اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا گیا۔ اس میں دشواری وہی آن پڑی تھی کہ اس کے سمجھنے کے لیے خاص ذوق اور قدرے سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی۔ سرسری انداز میں پڑھی جانے والی یہ کتاب نہیں ہے۔ "پلگرمز پراگریس" کا پہلا ایڈیشن ۱۶۴۷ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۶۷۸ء میں شائع ہوا۔ "پلگرمز پراگریس" روح کی ترقی اور سفر کا عجیب و غریب ڈرامہ ہے۔ روح مقدس شہر کی طرف محو سفر ہے۔ سفر میں بڑے بڑے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ جان بنین نے مثیلی انداز میں جو کردار تخلیق کیے وہ آج آسانی سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں جان بنین کے حوالے سے۔

ALLUSIONS, AB IDE, GREAT HEART GIA-
-NT DESPAIR, THE SLOUGH OF DESPOND.

ایسے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے شیکسپیر کی بعض تشبیہات و تراکیب۔ اسی طرح جس تجسیمی انداز میں جان بنین نے "سکوچر"، "فیلنگز"، "امپلسز" وغیرہ الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ تین صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کو تجسیمی انداز ہی میں انگریزی زبان میں استعمال کیا جا رہا ہے۔

جان بنین کا انتقال ۳۱ اگست ۱۶۸۸ء کو لندن میں ہوا۔ اس کی موت تک اس کے عظیم شاہکار کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس کی موت کے بعد یہ کتاب کتنی بار شائع ہوئی اور کتنی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، اس کا کوئی شمار اور حساب نہیں۔ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں "پلگرمز پراگریس" کا ترجمہ نہیں ہوا۔ اردو میں مجھے اس کے چند تراجم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن وہ سارے تراجم بے حد ناقص اور بے معنی تھے۔

جان بنین نے۔ پلگرمز پراگریس کے علاوہ بھی چند کتابیں لکھیں۔ لیکن ان کتابوں کو وہ شہرت اور مقام حاصل نہ ہوا جو۔ پلگرمز پراگریس کو ملا ہے۔ آج بھی انسانی روح کے اس ڈرامے کو پڑھا جائے تو اس کی معنویت آشکار ہوتی ہے۔ ہر بڑی کتاب کی طرح۔ پلگرمز پراگریس میں بھی یہ صلاحیت اور سکت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے۔

جلسن

جب میں دنیا کی سو عظیم کتابوں پر مضامین لکھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا تو میرے لیے اس منصوبے پر عمل کرنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ میں پہلے ان سو کتابوں کی فہرست تیار کروں۔ جن کو میں واقعی دنیا کی عظیم ترین کتابیں سمجھتا ہوں۔ اس مرحلے کو طے کرنے میں کمی مشکل اور دشوار مقام آئے۔ انگریزی زبان میں بھی چند کتابیں ملتی ہیں جو دنیا کی عظیم کتابوں کا احاطہ کرتی ہیں لیکن ایسے انتخابات کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنف دنیا کا جو نقشہ بناتے ہیں اس میں افریقہ، ایشیا اور تیسری دنیا کے ممالک شامل نہیں ہوتے۔ اگر تحقیق اور غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو انسانی دانست اور فکر کی حامل اہم ترین کتابیں انہی خطوں کی تحقیق اور پیداوار ہیں۔ جن کا ذکر یہ مصنف نہیں کرتے۔ بہر حال میں نے سو کتابوں کا جو انتخاب کیا وہ سراسر میرے اپنے معیار اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ میں بہت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے اس معیار کے سلسلے میں میں ایسے دلائل رکھتا ہوں کہ اختلاف کرنے والے اصحاب کو بہت حد تک قائل کر سکتا ہوں۔

میں نے اس سلسلہء مضامین کے حوالے سے ہر کتاب کو ایک بار پھر پڑھا۔ بعض مصنفوں کے حوالے سے بھی بڑی وقتیں ہمیش آئیں کہ ان کا کونسا کام شامل کروں اور کونسا رد کروں۔ اس سلسلے میں بھی میں نے ایک راہ یہ نکالی کہ مصنفوں کے حالات کے علاوہ ان کے کام کے بارے میں مجھی قدرے تفصیل سے لکھوں تاکہ پڑھنے والوں کو اس مصنف اور اس کے کام کے بارے میں کم از کم ایک بھر پور قسم کا تاثر مل سکے۔

بعض کتابیں جنہیں دنیا کی سوعظیم کتابوں میں شامل کرنے یا انکے نے پر مجھے بہت زیادہ غور و فکر سے کام لینا پڑا ان میں ایک کتاب وہ ہے جس پر اب آپ مضمون پڑھ رہے ہیں۔ یعنی مارکوئیس ڈی سیڈ کی کتاب "جسٹین"۔

مارکوئیس ڈی سیڈ کے بارے میں لوگ کتنی ہی کم معلومات کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اس کے حوالے سے نفسیات جنس میں جو ایک اصطلاح رائج ہوئی ہے وہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ "SADISM" کی اصطلاح جسے ہم اردو میں "سادیت" کہتے ہیں۔ فرائیڈ نے اس اصطلاح کو تخلیق کیا اور اس کے بارے میں لکھا تھا۔

"THE INSTINCT OF DESTRUCTION IS PLACED DIRECTLY IN THE SEXUAL FUNCTION. THIS IS TRUE SADISM."

مارکوئیس ڈی سیڈ کی یہ کتاب ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بیک وقت انسان کو بہت کچھ سوچنے پر ہی مجبور نہیں کرتی بلکہ خوفزدہ بھی کر دیتی ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جنہیں پڑھ کر قاری اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ شدید ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے خواہ وہ موافقانہ یا مخالفانہ۔ "جسٹین" پڑھنے والوں کے لیے ایک دائمی تجربہ بن جاتی ہے۔ "جسٹین" کا ایک خاص مطالعہ عالمی ادب میں یہ بھی ہے کہ اسے ممنوعہ کتابوں میں سرفہرست رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک ہی وقت میں نئے حد مقبول اور بے حد ناقبول اور سوسائٹی سمجھی گئی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب بے حد خوب صورت اور موثر ہے لیکن اس کا مواد بے حد گھناؤنا اور ناقابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے۔

ایک ایسی کتاب جو ایک عرصے تک مختلف ملکوں میں فحش سمجھی جاتی رہی۔ جس کی اشاعت کی اجازت نہ تھی جو ممنوعہ کتابوں میں سرفہرست ہو۔ ایسی کتاب کو جب میں سوعظیم کتابوں میں شمار کرتا ہوں تو یقیناً میرے پاس اس کا جواز موجود ہے۔

ایک تو یہی کہ حنفیہ طور پر سہی۔ اس کتاب کو عالمیگزینڈرشپ حاصل رہی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسے افسانوں کی کمی نہیں جنہوں نے نسل در نسل اس کتاب کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

اس کتاب کے خفیہ تراجم کئی زبانوں میں ہوئے۔

اپنی ادبی خوبیوں (قطع نظر مواد) کے باعث یہ کتاب ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتی ہے مارکوئیس ڈی سیڈ کی اس کتاب کی ایک بڑی اہم خوبی یہ ہے کہ یہ ایک سچی کتاب ہے اس کتاب میں اس نے اپنے تجربات کی پوری صداقت اور پوری صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اب اس کتاب پر مجبوری کوئی اعتراض کیا جاتا ہے اور جو سب سے بڑا اعتراض ہے۔ اس کے حوالے سے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

کہا جاتا ہے اور ایک مدت سے یہ رٹ لگائی جا رہی ہے یہ کتاب فحش ہے۔ اس کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے بڑے بڑے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود فحاشی ایک ایسی اصطلاح ہے جس پر ابہام کے پردے ابھی تک چھائے ہوئے ہیں۔ بہت سی ایسی کتابیں جنہیں ایک دور میں فحش قرار دیا گیا۔ اسی دور میں یا اس کے بعد ان کو عظیم ادب میں شمار کر لیا گیا۔

تھیکس پیر اور پھر چارلس اور پھر اس کے بعد جیمز جوائس اور ہمارے ہاں منٹو کے بعد ان کے کتنے ہی فن پاروں پر فحش کا الزام لگا۔ لیکن وہ ادب کا بہترین حصہ قرار دیے گئے۔ میں نے اس کتاب کو اس لیے عظیم کتابوں میں شامل کیا ہے کہ مارکوئیس ڈی سیڈ کی یہ کتاب دراصل مغربی تہذیب کا آئینہ ہے۔ اس کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا ہر تو پچھلے تیس چالیس برسوں میں شائع ہونے والے امریکی اور برطانوی ناولوں کا مطالعہ کیجئے۔ جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی اور امریکی تہذیب جنسی اعتبار سے کیسے کیسے تجربات میں ملوث ہے۔ اور پھر جنسی اعمال کی جیسی گھناؤنی، تفصیلی اور بے رحم روئیداد بیان ہوئی اسکے سامنے تو مارکوئیس ڈی سیڈ کا یہ ناول مجھے ایک چھوٹے بچے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جو معصوم اور عیاں کھڑا ہے۔!

آج کے امریکی اور یورپی ادب کے علاوہ آج کے یورپی اور امریکی معاشرے کو سمجھنے کے لیے جسٹین سے بہتر شاید ہی کوئی کتاب ہو۔ اگرچہ اس کا دائرہ محدود ہے۔ لیکن اگر آپ امریکی اور یورپ کے لوگوں کی جنسی اور نفسیاتی صورت حال کو سمجھنا چاہتے ہوں تو مارکوئیس ڈی سیڈ

کے ناول کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

یہ چند معروضات جنہیں میں نے اختصار سے پیش کیا ہے۔ ان کی روشنی میں میں نے مارکوئیس ڈی سید کے اس ناول کو دنیا کی سوغظیم کتابوں میں شامل کرنے کی جسارت کی ہے۔ اپنی اس جسارت پر مجھے ندامت ہے نہ علمی تفاخر کا احساس۔ کیونکہ یہ کتاب سچی ہی اتنی اہم کہ اسے عظیم کتابوں میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔

اس ناول کو سمجھنے کے لیے خود مارکوئیس ڈی سید کی زندگی کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ وہ شخص ہے جو انسانی نفس اور جنس کی ایک اصطلاح بن کر ایک مدت سے زندہ ہے۔

مارکوئیس ڈی سید کو ان فی تاریخ میں دنیا کا بدترین جنسی کجرو، فحش نگار، نیکی کا دشمن اور پاگل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ مفکر بھی تھا۔ خواہ اس کی فکر کتنا ہی بازاری اور عوامی کیوں نہ سمجھا جائے!

مارکوئیس ڈی سید اور سید ازم رسادیت کے حوالے سے کتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا شمار ممکن نہیں۔ ڈیون بلون نے اس کے بارے میں لکھا تھا:

”وہ بدی کا نظریہ ساز تھا۔ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو اپنے ناولوں میں یکجا کیا۔ انہیں انتہائی بصورت اور صداقت کے ساتھ قلم بند کر دیا۔ اس کے اپنے تجربات اور مشاہدات محض اس کے اپنے نہ تھے۔ بلکہ اس دور کے معاشرے کی بھی عکاسی کرتے تھے۔ اس لیے اس کے تجربات اور تجزیوں کی ایک فیصلہ کن کلچرل اور تاریخی اہمیت بنتی ہے۔ ڈی سید کی زندگی اور اس کا یہ ناول ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہے۔ جس میں جنسی کجروی، تشدد، ظلم و ستم کے عناصر چھائے ہوئے ہیں۔“

اس عظیم اور طاقتور ناول ’جسٹین‘، کا خالق ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا اور طبقہ امراء سے تعلق رکھتا تھا جو اس زمانے میں زوال اور انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ جب وہ لڑکا تھا تو اس کی خوب صورتی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ جنہوں نے اُسے دیکھا، ان کا کہنا ہے کہ اس کے جمال میں نسواں حسن کا عنصر غالب دکھائی دیتا تھا۔ لڑکپن ہی میں وہ

بدی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس زمانے کی حسینا میں اسے دیکھتے ہی ٹٹیاں پٹختی تھیں۔ اس کے حسن سے اثر لیے بغیر رہنا ممکن نہ تھا۔

ڈمی سیڈا اپنے زوال پذیر طبقہ امراء کا نمائندہ تھا۔ اپنے عہد کے مشرف اور امراء کی طرح اس نے بھی فوج میں کمیشن حاصل کیا اور جرمنی کے ساتھ سات سالہ جنگ میں حصہ لیا۔ جب وہ ۲۳ برس کا ہوا تو اس نے فوج سے استعفیٰ دے دیا اور پیرس میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ بدکار تھا اور اس کے باپ نے اس کی اس قابل نفرت زندگی کی راہ میں دیوار کھڑی کرنے کے لیے اس کی شادی کر دی۔ اس کی شادی ایک چھوٹے درجے کے طبقہ امراء کی ایک لڑکی ایسی مونٹریلو سے کی گئی جو فطرتاً نیک، خوبصورت اور لمبے قد کی خاتون تھی۔ سیڈا کو اپنی بیوی پسند نہ آئی۔ شادی سے پہلے وہ جنسی کج روی کی راہ پر چل نکلا تھا۔ اپنی بیوی کے برعکس اسے اپنی چھوٹی سالی سے محبت ہو گئی۔ جو سرخ بالوں والی ایک حسینہ تھی۔ سیڈا کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ یہ انتخاب اس کے والد کا تھا۔ اس کا رد عمل اس صورت میں ہوا کہ اس کی گھناؤنی جنسی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس کی ان تمام بدحرکات کے باوجود اس کی بیوی اس کی وفادار رہی۔

مارکوئیس ڈمی سیڈا ب قحبہ خانوں میں جلنے لگا۔ اپنے ہاں ایسی طوائفیں لانے لگا جو اس کی مرضی کے مطابق چلتی تھیں۔ وہ ان کے برہنہ جسموں پر کورٹوں کی بارش کر دیتا دوسروں پر تشدد کر کے، ایذا پہنچا کر ہی مارکوئیس ڈمی سیڈا کی جنسی تشفی ہوتی تھی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو اسے اسی جرم میں قید کر لیا گیا۔ معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ایک قحبہ خانے میں اس نے طوائفوں پر نڈے چابک برساتے کہ وہ لہو لہان ہو کر چینی لگیں۔ اس پہلی حراست کے بعد اس کی زندگی بکڑو حکم کا ایک مسلسل سلسلہ بن کر رہ گئی۔ یوں اسے اپنی زندگی کے بیس برس جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے۔

جیل کی ان ہی سلاخوں کے پیچھے اس نے ایک چھوٹی سی کمائی مکھی جو دراصل اس کی فینسی کی غمازی کرتی تھی۔ یہ کمائی کبھی زلیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ لیکن اس کمائی نے اس کی تحریروں کے لیے بنیاد فراہم کر دی۔ گویا یہی سخریر اس کی تصانیف کا محرک بنی۔ پہلی

حراست کے کچھ ہفتوں کے بعد اسے رہائی مل گئی۔ اس نے جرمانہ ادا کیا۔ کیونکہ وہ طبقہ امراء سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے وہ اگلے سال پارلیمنٹ کارکن بن گیا۔ لیکن اسے اپنے اس منصب جلدیہ کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس نے پھر سے سپریم میں ایک ایکٹس کیساتھ رہنا شروع کر دیا۔ جہاں مختصر سے عرصے میں سید کو عورتوں کو زبرد کو ب اور کوڑے مارنے والے کی حیثیت سے رسوائی حاصل ہوئی۔

۱۹۶۸ء میں اس نے ایک عورت روز کیئر کو اغوا کیا اور اس کے جسم پر اس وقت تک کوڑے برساتا رہا جب تک وہ خون میں نہ نہا گئی۔ وہ ننھی ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ چیخ چیخ کر اس نے پولیس کی مدد طلب کی۔ سید کو گرفتار کرنے کے بعد اس پر مقدمہ چلا گیا۔ اس مقدمے نے پولیس لیڈرپ میں سنسنی پھیلا دی۔ لیکن چونکہ سید کا خاندان بڑا اثر و رسوخ والا تھا اس لیے اسے سات ہفتوں کی قید اور معمولی جرمانہ کر کے رہا کر دیا گیا۔

سید میں اس کے باوجود کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس نے اپنی سالی کے ساتھ تعلقات قائم کیے اور انہیں دنیا سے بھی چھپانے کی کوشش نہ کی۔ اس کے ارد گرد طوائفوں اور ہم جنس پرستوں کا مجمع رہتا۔ وہ اجتماعی جنسی تقریبات کا انعقاد کرتا۔ عورتوں پر کوڑے برساتا۔ ۱۹۷۲ء میں چار طوائفوں کو اس نے اپنے کوڑوں کا نشانہ بنایا۔ انہیں اس عمل سے پہلے نشہ آور دوائی پلا دی گئی تھی۔ یہ چاروں طوائفیں بمشکل جان بچ سکیں۔ انہوں نے حکام کو اس کی اطلاع دی۔ مارکوٹیس سید اس وقت تک اپنی سالی کے ہمراہ اٹلی روانہ ہو چکا تھا اس کی عدم موجودگی میں اس کے لیے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔

کئی برسوں تک فرانس سے غائب رہا۔ ۱۹۷۹ء میں واپس آیا تو اب بھی اس کی بد اعمالیوں میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ بلکہ ان میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ مئی ۱۹۷۵ء میں پھر دو عورتیں اس کے مکان سے لکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جنہوں نے پولیس کو اس کی گھنڈنی بد اعمالیوں سے آگاہ کیا۔ سید کا خاندان بھی اب اس سے تنگ آ چکا تھا۔ اس کے اپنے ماموں نے کہا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے اس لیے سید کو گرفتار کر لینا چاہیے۔ سید پھر اٹلی بھاگ نکلا اور اٹھارہ ماہ تک وہیں رہا۔ لیکن اسے جلد ہی پھر گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں

اسے رہائی نصیب ہوئی۔

اس کی ساس اس کی جانی دشمن بن چکی تھی۔ جس کی دونوں بیٹیوں کی زندگی سیڈ نے تباہ کر دی تھی۔ اس کی درخواست پر سیڈ کو گرفتار کیا گیا۔ ۱۷۷۸ء سے ۱۷۸۴ء تک اسے دینز جیل میں رکھا گیا۔ ۱۷۸۴ء سے ۱۷۸۹ء تک وہ مشہور زمانہ باسٹیل جیل میں رہا۔ پھر اسے وہاں سے دماغی امراض کے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ اپریل ۱۷۹۰ء تک رہا۔

جب وہ اڑتیس برس کی عمر میں جیل گیا تو وہ توانا اور وجیہ انسان تھا۔ تیرہ برس کی سزا کے بعد باہر نکلا تو وہ ایک فریب اور بدنام انسان بن چکا تھا۔ ذہنی اور دماغی طور پر بھی وہ بیمار تھا۔ اب اس نے زور شور سے لکھنا شروع کیا۔ ان کتابوں اور تحریروں میں وہ لذت کی گمشدہ دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ جنسی دماغوں کا اسپر نظر آتا ہے۔ اس کے ذاتی ماحول، عواضوں اور تجربوں پر مبنی یہ کتابیں انسانی روح کی صعوبتوں کی ایک دستاویز بن جاتی ہیں۔ رہا ہونے کے بعد اس نے تصنیف و تحریر کے ذریعے زندہ رہنا چاہا۔ کیونکہ وہ قلائد ہو چکا تھا۔ اور قرض خواہوں نے اس کے خلاف مقدمے دائر کر رکھے تھے۔ چند روپے کاٹنے کے لیے اس نے ۱۸۰۰ء کے اواخر میں ایک کتابچہ نپولین کے خلاف لکھ کر شائع کرا دیا۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۰۱ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ دو برس کے بعد وہ جیل سے پاگل خانے لے جایا گیا۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے بقایا آخری گیارہ برس گزارے۔

پاگل خانے کے داروغہ نے اس کے بازو میں لکھا تھا کہ ہمارے ہاں ایک ایسا آدمی آپہنچا ہے جس نے اپنی بد اخلاقی اور بد اطواری کی بدولت شہرت حاصل کی ہے۔ اس کی موجودگی عظیم ترین شر اور بدمی کی طرح ہے۔ اس کے پاس کسی کو نہ آنے دیا جائے۔ ایسے سب سے الگ تھکاک اور تنہا رکھا جائے۔

سیڈ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بہت کچھ لکھا۔ ان گنت خطوط اپنی گرفتاری کے خلاف تحریر کیے۔ ۱۸۱۴ء میں بالآخر اس کی اس ہنگامہ خیز اور بد اطوار زندگی کا خاتمہ ہوا۔ مارکویس ڈی سیڈ نے اپنی زندگی میں درجنوں ناول لکھے۔ ۱۷۸۵ء میں اس نے "سدوم کے ایک سو بیس ایام" لکھا۔ لیکن اس کا جو ناول سب سے پہلے شائع ہوا۔ وہ "جوشین"

تھا۔ یہ ناول ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کی تاریخ کے حوالے سے فرانس پر تشدد اور دہشت کا راج تھا۔ ہر جز تیس تیس سوچکی تھی۔ صدیوں کے اخلاقی نظام اور روایات کو تہہ و بالا کر دیا گیا تھا۔ سید کو ڈر تھا کہ اگر یہ ناول پیرس میں شائع ہوا تو اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اس کے ٹائٹل پر چھپوایا کہ یہ ناول ہالینڈ میں شائع ہوا۔ حالانکہ یہ پیرس میں ہی چھپا تھا۔

سید اپنے اس ناول سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اسے بار بار بدلتا رہا۔ اور جب ۱۷۹۷ء میں یہ پھر شائع ہوا تو اس وقت یہ پہلے سے زیادہ ضخیم ہو چکا تھا۔ یہ ناول کبھی تقسیم نہ ہوا۔ زیر زمین پڑھا جاتا رہا۔ ایک ڈیڑھ صدی تک اسے خفیہ اور ممنوعہ کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ تب سے اب تک اس ناول پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس کتاب پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن یہ ناول خفیہ طور پر ہمیشہ شائع ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۵ء میں فرانس کی مختلف حکومتوں نے اس کے خلاف قدم اٹھایا۔ اس کے باوجود اس کی خفیہ اشاعت میں کوئی کمی نہ آئی اور یہ دوسرے ملکوں میں کھل کر ہوتا رہا۔ پھر اس کے تراجم بھی خفیہ طور پر شائع ہونے لگے۔

انگلستان اور امریکہ میں کسٹم ڈالے سمگل شدہ نسخوں کو نذر آتش کرتے رہے۔ امریکہ میں پہلی بار اس کا مستند ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور پھر ساری دنیا میں یہ ناول انگریزی زبان کے حوالے سے پھیل گیا۔ اس پر کیے جانے والے اعتراضات کی بازگشت اب بھی سنی جاتی ہے۔ لیکن اس ناول پر اب کسی ملک نے پابندی نہیں لگائی۔

جسٹین، یقیناً ایک کجروانہ بیمار ذہن کی پیداوار ہے اور یہ امریکی اور یورپی معاشرے کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ جو کجروانہ بیمار ہے۔ لیکن یہ ایک سچی روئیدار ہے۔ اس کی ایک خاص نوع کی اخلاقی حیثیت بھی ہے۔ مارکوئس ڈی سیڈنے اس کتاب کا اقتساب اپنی ایک خاتون دوست کے نام کیا ہے جس میں لکھتا ہے: "اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ ایک عجیب ناول ہے یہاں بڑی ہر چیز پر غالب آتی ہے اور نیکی اپنی ہی قربانیوں کا نشانہ بن گئی ہے۔ لیکن جرم اور گناہ کی انہی بدترین تصویروں نے مجھے نیکی اور اچھائی سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ نیکی اپنی بد قسمتی میں کتنی عظیم دکھائی دیتی ہے۔"

لامرزا بیلز

LES MISERABLES

بعض اوقات مجھے بڑی شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زبان جس میں ہم لکھتے ہیں جو پاکستان کی قومی زبان ہے جو ہماری تہذیب، ہمارے اتحاد اور کلچر کی امین ہے جس زبان میں بہت بڑا تخلیقی کام ہوا ہے جو یقیناً دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان کا ماں گنا تھی اور خالی ہے دنیا کی مختلف زبانوں میں جو بڑے بڑے کام ہوئے جنہوں نے پوری نوع انسانی اور عالمی ادب کو متاثر کیا وہ چند سو بڑی گنا ہیں بھی اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکیں۔ جو عالمی ادب کی آبرو ہیں جنہوں نے انسانی فکر کو جلا بخشتی ہے۔ زندگی کی معنویت سے ہمکنار کیا ہے۔

دکٹر ہیوگو کا ناول LES MISERABLES ایک ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جس پر پوری دنیا کو فخر ہے میں یہ نہیں کتا کہ اسے برصغیر کے پڑھنے والوں نے نہیں پڑھا۔ اسے یہاں انگریزی میں پڑھا گیا اور پڑھا جاتا ہے گا لیکن اگر اس کا کوئی ترجمہ اردو میں ہو جاتا تو اردو ادب اور زبان میں ایک بہت بڑا اور جاندار اضافہ ہوتا اور اردو لکھنے والے جو انگریزی یا فرانسیسی سے براہ راست آتے انہیں وہ سب ایک عظیم فن پارہ پڑھ سکتے۔

دکٹر ہیوگو کا نام ہمارے ہاں اجنبی نہیں ہے۔ سعادت حسن منٹوم جو نے اس کی ایک کتاب لاسٹ ڈیز آف گنڈیمپٹ کا اپنے ابتدائی دور میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمے میں حسن عباس نے ان کی اعانت کی تھی۔ بہت برسوں کے بعد اب یہ ترجمہ دوبارہ مرکز تہذیب اور نام سے شائع ہوا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاں بھی دکٹر ہیوگو کا ذکر ملتا ہے دکٹر ہیوگو

پر کچھ اچھے پھلے اور سٹی مضامین بھی ایک دور میں شائع ہوئے۔

لامرزا بیگز ایک ایسا شاعر ہے جو فلم والوں کو بھی بے حد مرغوب رہا۔ فرانسسی یادوہری زبانوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن ان زبانوں میں بھی اس پر فہم بنی ہوں گی لیکن انگریزی میں اس ناول کو متعدد بار فلما یا جا چکا ہے اور سینی والی فلم کی تو پاکستان میں بھی نمائش ہو چکی ہے۔ تقسیم کے بعد بھارت میں سہراب موہی نے اسے ADOPT کیا اور اس پر ایک فلم 'کنڈن' کے نام سے بنائی گئی پاکستان میں اس کے بہت سے حصوں اور ٹکڑوں کو مختلف فلموں میں جوڑا گیا۔

وکر میگو کو اس کے ایک اور ناول پر بننے والی فلم کی وجہ سے بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ ناول ہے۔ نو ترے ویم کا کب سٹرا اس ناول پر بھی بہت فہم بن چکی ہیں لیکن جینا نو بوجیٹا اور انتھونی کوئین والی فلم گھمراے میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اس حوالے سے ہمارے ہاں کا عام فلم بین بھی اس ناول کے خالق کو جانے بغیر اس کے ایک بڑے کام سے متعارف ہوا اور اسے دل کھول کر داد دی۔ اس فلم کی ہی مقبولیت نے رنگیلا کو کبڑا عاشق بنانے کی تحریک وترغیب دی اور پاکستان میں یوں اس فلم کے حوالے سے وکر میگو کو مسخ کیا گیا۔ کبڑا عاشق بلاشبہ ایک بڑی اور گھٹیا فلم تھی۔ اس فلم کے حوالے سے پاکستان کے عام فلم بینوں نے جو فیصلہ دیا وہ ہمارے دانشوروں کے لئے توجہ کا طالب ہے کہ ایک ایسی فلم مسخ ہو کر آف نو ترے ویم کو ہمارے ہاں کے عام ان پڑھ اور ہر سطح کے قاری نے بے حد پسند کیا۔ جب کہ بیشتر فلم دیکھنے والے انگریزی زبان سے نااہل تھے لیکن جب اسی موضوع پر اپنی زبان میں ایک فلم بنی جو بڑی تھی تو اسے مسترد کر دیا۔

اس پھیلے ہوئے بڑے ناول کا ایک اجمالی ترجمہ کرنے کا اعزاز مجھے بھی حاصل ہے جو کتاوی صورت میں شائع ہو چکا ہے!

لامرزا بیگز ایک ایسا اہم ناول ہے جس کے بارے میں عالمی ادب کے نقادوں نے ایک دلچسپ بحث بھی ایک زمانے میں شروع کی تھی اور کبھی کبھار اب بھی اس کی بازگشت سنی جاتی تھی۔ بعض بڑے تخلیق کاروں اور نقادوں کی رائے ہے کہ یہ ناول ٹھانسانی کے عظیم ناول دارا اینڈ پیس سے بھی بڑا ہے۔ خود ہمارے ہاں کرشن چندر نے جہاں بلازاک کو ٹھانسانی سے بڑا ناول نگار کہا، وہاں لامرزا بیگز کو دارا اینڈ پیس سے بڑا ناول قرار دیا۔

ظہیر کاتھیری جو عالمی ادیب پر گہری نگاہ رکھے ہیں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو کا یہ ناول ٹالسٹائی کے دار اینڈ پیس سے بڑا تخلیقی ناول ہے۔ یہ نکتہ بے حد دلچسپ اور خیال افزو ثابت ہو سکتی ہے کہ دو مختلف زبانوں میں دو بڑے GIANTS کے ان دو بڑے تخلیقی شہسپاروں کا کس طرح موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ جن کے موضوعات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

وکٹر ہیوگو نے ایک بھر پور زندگی بسر کی۔ وہ صرف ناول نگار ہی نہیں شاعر ادیب ڈرامہ نگار اور سیاست دان بھی تھا وہ ۲۶ فروری ۱۸۰۲ء کو بسکائی میں پیدا ہوا۔ اس کا والد نیولین کی فوج میں ایک انفر تھا۔ بعد میں وہ جنرل کے عہدے تک پہنچا اور کائنات کا خطاب و اعزاز بھی حاصل کیا۔ وکٹر ہیوگو کا بچپن مختلف ملکوں اور شہروں میں بسر ہوا۔ ایسیا، کارسیکا، نیپلز، میڈرڈ اس نے اپنے باپ کی ملازمت کی وجہ سے بچپن میں ہی دیکھے۔ بعد میں پیرس میں ایک بورڈنگ سکول میں داخل کر دیا گیا وہ پندرہ برس کا تھا کہ اکادمی فرانس کی طرف سے منعقد کئے جانے والے ایک شعری مقابلے میں شریک ہوا اور اس نے اس مقابلے میں نمایاں اعزاز حاصل کیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے شاعری کے تین مقابلوں میں اول انعام حاصل کیا۔ اسی برس اس کے بھائی نے ایک پندرہ روزہ ادبی رسالے کا اجرا کیا آنے والے تین برسوں میں جب تک یہ جریدہ شائع ہوتا رہا۔ وکٹر ہیوگو نے اس میں بے شمار تحریریں لکھیں۔ اس کی بعض نظموں میں ایسے عنان پر پائے جلتے تھے جن میں بادشاہی کو پسندیدہ قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے شاہ فرانس اس پر مہربان ہوا اور اسے پانچ سو فرانک کا وظیفہ جاری کر دیا گیا۔ ۱۸۱۹ء میں اسے شدید محنت ہوا۔ اس کی جوبو ایڈیٹی فوشر تھی وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دونوں گھرانوں کے سربراہ بالخصوص وکٹر ہیوگو کی والدہ اس رشتے کی مخالفت تھی۔ ۱۸۲۰ء میں جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اپنی جوبو سے شادی کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی برس اس کی ان نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ جو اس نے اپنی جوبو کے لئے لکھی تھیں۔ ۱۸۲۳ء میں ان کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اب وکٹر ہیوگو اپنی شاعری اور ڈراموں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے وظیفے کی رقم بڑھا کر دو ہزار فرانک کر دی گئی۔ ۱۹۳۰ء تک وہ یمن بیٹوں کا باپ بن چکا تھا اور ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہا تھا۔

۱۲ مئی ۱۸۸۵ء کو وہ انتقال کر گیا۔ پہلے اسے PANTHEON میں دفن کیا گیا۔ پھر لوہے
 قومی اعزاز کے ساتھ اسے فوج کی خراب (ARC DE TRIUMPHE) کے نیچے دفن کر دیا گیا۔
 وکٹر ہیوگو انقلابی ذہن کا مالک تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند بڑے باشعور لکھنے والوں
 میں کیا جاتا ہے اس نے پچانسی اور موت کی سزا کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی۔ اس سزا
 کو منسوخ کرانے کے لئے اس نے کتابیں لکھیں۔ کتابچے تحریر کئے، تقریریں کیں۔ اس ضمن میں
 اس کا شاہکار LAST DAY OF A CONDEMNED یعنی سزائے موت کی سزا کے
 مترجم مٹو ہیں۔ وکٹر ہیوگو نے اس دلدوز کتاب میں پچانسی کی سزا کے خلاف زبردست
 دلائل پیش کئے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو
 اس نظریے کا وہ بڑی سنگینی سے مذاق اڑاتا ہے۔ سماجی عوامل اور انسان کی زندگی پر اس کی
 نظر اتنی گہری ہے کہ وہ ان نتائج کو بڑے شمار و مدد اور استدلال سے پیش کرتا ہے جو ایک
 شخص کی پچانسی کے بعد اس کے گھرانے پر مرتب ہوتے ہیں۔ ان دشواریوں، صعوبتوں اور
 آلام کا ذکر کرتا ہے جن کا پہاڑ اس خاندان پر ٹوٹ پڑتا ہے جس کے ایک فرد کو کسی جرم میں
 پچانسی دی گئی ہو۔

آج اگر دنیا کے بیشتر ممالک میں پچانسی کی سزا منسوخ ہو چکی ہے تو یقیناً اس کی
 منسوخی میں وکٹر ہیوگو کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

وکٹر ہیوگو۔ اجتماعی معاشی اور سماجی زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور
 تقریروں کے حوالے سے کیوں سسٹم کا بہت بڑا حامی بن کر سامنے آتا ہے۔ سماج کی معاشی اور
 معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے لئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان اجتماعی زندگی بسر کرے
 اور کیوں سسٹم قائم کرے۔ اس کے ان انقلابی افکار کی وجہ سے اسے بہت سی پریشانیوں
 اور مخالمقوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے نظریات پر ڈٹا رہا۔

”نوٹرے ویم کا کبڑا“ ایک عظیم ادبی شہکار ہے۔ انسانی محبت اور رشتوں کی
 ایسی تفسیر دنیا کے ادب میں بہت کم پیش کی گئی ہے۔

نوٹرے ویم کے نیم انسان گونگے، بہرے، مسخ اور بد صورت ترین شکل والے کبڑے
 کے حوالے سے وکٹر ہیوگو ہمیں ایک ایسی انسانی صورت حال اور انسانی نفسیات سے
 متعارف کراتا ہے جو پڑھنے والے کے لئے ایک عظیم انسانی تجربے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

۱۸۲۱ء میں وکٹر ہیوگو کو فرانسیسی اکادمی کا رکن منتخب کر لیا گیا جو یقیناً بہت بڑا اعزاز تھا۔ ۱۸۲۸ء میں وہ اسمبلی کا رکن چنا گیا۔ اس کے بعد اگلے برس وہ مجلس قانون ساز کا رکن بن گیا۔ وہ نپولین کا حامی تھا لیکن جب ۱۸۵۱ء میں نپولین نے ری پبلک کو ختم کر کے اپنے آپ کو بادشاہ (EMPEROR) بنانے کا فیصلہ اور عمل کیا تو وکٹر ہیوگو اس کا مخالف بن گیا۔ ہیوگو نے حزب اختلاف کو منظم کرنے کی کوشش کی اور بغاوت بھی ہوئی لیکن ناکامی سے دوچار ہوئی۔ ہیوگو کو اپنی جان بچانے کے لئے فرانس سے بھاگ کر برسلز میں پناہ لینے پڑی۔ ۱۸۵۱ء سے لے کر نپولین کے زوال تک ہیوگو پیرس واپس نہ آیا اور جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اس جلاوطنی کے زمانے میں ہی اس نے اپنے بڑے تخلیقی شاہکار تصنیف کے جن میں لامورابیلزہ بھی شامل ہے۔

ہیوگو کی تجویز اور بیوی بھی اس کے ساتھ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جلاوطنی میں ہی اس کا انتقال ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ اپنی محبوب بیوی کی موت کا غم وہ کبھی نہ بھلا سکا۔ ۵ ستمبر ۱۹۰۷ء کو ہیوگو پیرس پہنچا۔ فروری ۱۸۷۱ء کو اسے قومی اسمبلی کا رکن چنا گیا۔ نپولین اپنے نوال سے دوچار ہو چکا تھا اور اس وقت پلوں کے تپے سے بہت سا پانی بہ چکا تھا۔ اس کے بس سے ہاتھ تھے۔ چند ہینوں کے بعد ہی اس نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اپنے نظریات کے خلاف کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ سماجی اور معاشی زندگی میں کیوں سسٹم کا زبردست حامی تھا۔ برسلز میں اس نے کیوں سسٹم پر جو تقریریں کی تھیں۔ اسی کی وجہ سے اس کی شدید مخالفت ہوئی تھی اور برسلز کی حکومت نے اسے ملک سے جرائعاً نکال دیا تھا۔

اس کی زندگی اب صدیوں سے بھری ہوئی تھی اس کا ایک بیٹا ۱۸۷۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا اور آخری بیٹا ۱۸۷۳ء میں انتقال کر گیا۔ اب وہ ایک تنہا بوڑھا تھا جسے عالمگیر شہرت حاصل تھی۔ دنیا بھر میں اس کے ملاح پھیلے ہوئے تھے لیکن وہ اکیلا اور تنہا تھا۔ اس نے دوبار قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا لیکن ناکام رہا۔ بالآخر ۱۸۷۶ء میں وہ سینٹ کارکن چن لیا گیا۔ اس کی شہرت میں پھر اضافہ ہوا جب تک وہ زندہ رہا سینٹ کارکن رہا۔ لیکن اس کی تمام تر سیاسی سرگرمیاں اور دوسری مصروفیات بھی اس کی تنہائی کا مدافعا نہیں سکیں۔ اسے پناہ اور نسکین ملی تو لکھنے سے جب تک وہ زندہ رہا لکھتا رہا۔ اس کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔

عشق، انسانیت اور ایشیا ریے جذبے ہیں جن کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ باطن سے ہے۔ انسان کا باطن حسین ہے تو وہ دنیا کا بد صورت ترین انسان ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل وہی صاحبِ جمال ہے۔ دنیا نے ادب میں بڑے بڑے بد صورت کردار پیش کئے گئے ہیں لیکن جتنا بد صورت یہ نو ترے دریم کا بڑا ہے۔ اتنا بد صورت شاید ہی کوئی دوسرا کردار ہو۔ لیکن یہی بد صورت کردار ہمیں دنیا کا حسین ترین انسان نظر آنے لگتا ہے کیونکہ اس کا دل سچی محبت، وفا شعاری اور اطاعت سے لبریز ہے۔

وکٹر ہیوگو کا سب سے بڑا تخلیقی اور لازوال کام لامزرا بیلنز ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت اس لحاظ سے بھی ایک تاریخ ساز واقعہ ہے کہ یہ بیک وقت دنیا کی دس زبانوں میں شائع ہوا، ان کی اشاعت عالمی ادب کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس ناول کے حوالے سے عالمی ادب پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے ان کی ایک اپنی تاریخ ہے۔ اس عظیم اور ضخیم ناول کے حوالے سے وکٹر ہیوگو نے انسانی زندگی اور معائنے سے تعلق رکھنے والے بعض بنیادی سوال اٹھائے اور ان کا جواب دیا ہے۔

انسان اور قانون کا رشتہ؟ قانون انسان کو مجرم بناتا ہے اور جب کوئی انسان جرم کی راہ چھوڑ کر شرافت اور انسانیت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قانون اسے شرافت کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

”لامزرا بیلنز“ میں وکٹر ہیوگو نے بنی نوع انسان کے سب سے بڑے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ جھوک اور غربت، اس کا مرکز ہی کردار والجین۔ ایک فرانسیسی نادار ہے یہ وہ انسان ہے جو دنیا کے ہر خطے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں رہتا ہے۔ وہ غریب ہے، وہ شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ محنتی ہے سادہ دل ہے۔ قانون کا احترام کرتا ہے لیکن وہ جس سماجی اور معاشی نظام میں زندہ ہے اس میں اسے اس کی تمام بڑکوششوں، ذلتوں اور ناکامیوں کے باوجود روٹی نہیں ملتی کہ وہ اپنا یا اپنے کسی عزیز کا پیٹ پال سکے اسے کام سے عار نہیں ہے وہ چھوٹے سے چھوٹا اور حقیر سے حقیر کام کرنے کے لئے بھی تیار ہے لیکن اسے کام نہیں ملتا اور وہ کب تک فاقے سہہ سکتا ہے کب تک اپنے کسی معصوم بچے کو جھوک سے جھلاتا اور کسی عزیز کو بیماری میں سکے دیکھ سکتا ہے۔

جب سماج ایسا ہوا۔ نظام اتنا کمزور ہو تو پھر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ والجین روٹی

چرا تا اور کھڑا جاتا ہے اس کے بعد اس کی عزیزہ کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں اسے روٹی پرانے کے جرم میں سخت سزا دی جاتی ہے۔ وہ جیل سے بھاگ جانے کی کوشش کر لہے ناکام رہتا ہے اس کی سزایں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے بالآخر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اب اس کا اور رپولیس کا تعاقب شروع ہو جاتا ہے۔

انسانی معاشرہ: قانون، اخلاق، ریک سوچنے کی ضرورت شمس نہیں کرتے کہ اس نے آخر روٹی کیوں چرائی تھی؟ پورا نظام یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں کہ ایک انسان کو روٹی مل سکے۔ والجین ایک دہشت کی طرح ہے۔ لوگ اس کے فرار کی خبر سن کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے کہیں جا بٹے پناہ نہیں۔ وہ ایک جاگیر دار کے کتوں کی کوٹھڑی میں سونے کی کوشش کرتا ہے اور نکال دیا جاتا ہے ایک پادری اسے اپنے ہاں رات گزارنے کی اجازت دے دیتا ہے اور وہ اسی پادری کے سونے کے شمع دان چرا کر بھاگ نکلتا ہے یہ پادری اس کی زندگی بدل دیتا ہے کیونکہ والجین جب مسروقہ اشیاء کے ساتھ پکڑا اور پادری کے سامنے لایا جاتا ہے تو پادری کہتا ہے کہ یہ شمع دان اس نے خود اسے تحفے میں دیے تھے۔

نیک بننے پر سکون زندگی گزارنے۔ دوسرے انسانوں کے کام آنے کی پرانی خواہش پھر والجین کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ان شمع دانوں کو بیچ کر ظروف سازی کا کارخانہ لگاتا ہے اپنی کھوئی ہوئی عزیزہ کی تلاش میں نکلتا ہے جس پر زمانہ اتنے ستم توڑ چکا ہے۔ کہ جس کی تفصیل ہماری زندگیوں اور ہمارے معاشرے کے لئے اجنبی نہیں اپنی نیکی، خلا ترسی اور انسان دوستی کی وجہ سے وہ انتہائی شہرت حاصل کرتا ہے۔ سماج اسے عزت کا مقام دیتا ہے وہ شہر کا میئر چن لیا جاتا ہے۔ اس کی نیکی انسان دوستی کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن قانون کو اس کی سماجی اور انسانی خدمات سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اس کی تلاش میں ہے اور ایک دن اس تک پہنچ جاتا ہے۔

انپکٹر کا کردار بھی ایک ایسا کردار ہے جو یادگار کرداروں میں سے ایک ہے یہ اندھے قانون کا مصلح فرد ہے انسانی جذبات سے عاری۔ لیکن بہر حال وہ انسان ہے۔ قانون نگدل ہے اندھا ہے لیکن انسان کا دل کبھی پتھر نہیں بن سکتا۔ اس کردار کے حوالے سے ہو گئے جس انسانی بصیرت کا اظہار کیا ہے یہ اسی کا حصہ ہے یہ انپکٹر والجین کی انسانی عظمت سے آئنا متاثر ہوتا ہے کہ اسے گرفتار کرنے کی بجائے خود کشتی کر لیتا ہے۔ قانون کی سفاکی جبر اور ثقافت

کے حوالے سے اس انسان کے کردار کو بھی سامنے رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایسے تمام قوانین کی دھجیاں بکھر کر رہ جاتی ہیں جو انسانی احساسات سے عاری ہیں جو انسان کو روٹی نہیں دے سکتے محض مجرم اور غلام بناتے ہیں۔

”لامر۔ رابیلز“، جب سے لکھا گیا تب سے اب تک زندہ ہے اور زندہ رہے گا یہ جہاں انسانی باطن اور فرد کے کئی انقلابوں کو سامنے لاتا ہے۔ سیاسی انقلاب کی بھی نشاندہی کرتا ہے انسان سے تعلق رکھنے والی تمام اقدار اور ضروریات اور بنیادی مسائل کو اس ناول میں سمویا گیا ہے یہ ناول انسانی فطرت اور سماج کے حوالے سے ایک ایسی دستاویز ہے جس کے پس منظر میں ایک عظیم اور با شعور تخلیقی ذہن موجود ہے جو ہمیں زمانوں کے ساتھ انسانوں کے چہروں اور باطن سے متعارف کرتا ہے جو انسان کے فرسودہ ڈھانچوں اور بے اثر قوانین کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔!

سکارٹ لیسٹر

فطرت نے انسان کو جو جذبے بخشے ہیں۔ ان پر پابندیاں لگانے والے معاشروں میں کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو اس پابندی کو توڑ دے۔ اور معاشرے کے قوانین سے بغاوت کر دے تو ایسے شخص کو کیا سزا ملتی ہے؟

اس کا ایک جواب ہیسیسٹر کی صورت میں ملتا ہے۔ ہیسیسٹر۔ جس نے ایک معتقد و دیندار معاشرے میں اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں ایک بچی کو جنم دیا اور اس کے معاشرے نے اسے یہ سزا دی کہ وہ ہمیشہ کے لیے۔ جب تک وہ زندہ ہے اپنے سینے پر سرخ دھاگوں سے کٹھا ہوا ایک لفظ A آویزاں کر کے پھرے۔ A۔ جو ADULTRESS یعنی زانیہ کا مخفف ہے۔ تاکہ اس معاشرے کے دیندار لوگوں کی مذہبی انا کو تسکین ملتی رہے۔ اپنے سینے پر اپنے گناہ کا اعلان سمائے، چلتی پھرتی جیتی جاگتی عورت کے حوالے سے یہ کہہ سکیں کہ گناہ کی سزا دی چکی ہے۔ یہ عورت وہ ہے جس نے زنا کیا اور یہ عورت ہمیشہ اس گناہ کے دہکتے ہوئے سرخ نشان کو اپنے سینے پر لٹکانے، نمائش کرتے ہوئے عبرت کی ایک علامت بن کر معاشرے کی پاکیزگی اور دینداری کا اعلان کرتی رہے گی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو گناہگار کو ڈھکا چھپا رہنے نہیں دیتا۔ اس معاشرے کے مذہب کا اصول تو یہ ہے کہ دوسرے کے عیوب اور برائیوں کی پردہ پوشی کی جائے لیکن ان لوگوں کی مذہبیت اس رواداری کی قائل نہیں بلکہ وہ اس گناہ کی تشہیر کو اپنے معاشرے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ عورت۔ ہیسیسٹر۔ یہ معاشرہ۔ تھینیل ہامقورن کے ناول۔ سکارٹ لیسٹر

کے کردار ہیں

پندرہ سولہ برس پہلے جب میں نے ہاتھوں کا ناول سکاٹ لیٹر پڑھا تو میں نے اس ناول اور ہاتھوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ لیکن ہاتھوں کی کوئی چیز اس سے پہلے میرے مطالعے میں نہ آئی تھی۔ جب میں نے اس ناول کو پڑھا تو میں نے اسے ختم کرنے کے بعد محسوس کیا کہ میں نے دنیا کی ایک عظیم تخلیق کا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے میرے ذہنی افق کو وسیع کیا ہے۔ میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کے بعد میں نے تلاش کر کے ہاتھوں کی ہر چیز پڑھی۔ اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھا۔ تب سے اب تک اس ناول کو میں متعدد بار پڑھ چکا ہوں۔ یہ ان ناولوں میں سے ایک ہے جن کا شمار سومرسٹ ماہم نے دنیا کے دس بڑے ناولوں میں کیا ہے جس کے تراجم دنیا کی سب سے بڑی زبان میں ہو چکے ہیں جس پر کئی بار فلمیں اور ٹی وی ڈرامے بن چکے ہیں اور جس نے دنیا کے بہت سے لکھنے والوں کو متاثر کیا ہے۔

اُردو میں سیدہ نسیم سہانی نے اس کا بہت موثر اور خوب صورت ترجمہ "لال نشان" کے نام سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ اب نایاب ہے۔

تختینیل ہاتھوں ۴ جولائی ۱۸۰۴ کو سلیم (میساچوسٹس) میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک تجارتی جہاز کا کپتان تھا۔ ہاتھوں چار برس کا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوا۔ مرنے والے نے اپنے پیچھے کوئی ترکہ نہ چھوڑا تھا۔ گھر کے حالات جلد ہی حزاب ہونے لگے۔ ہاتھوں نے کم عمری میں ہی غربت اور ناداری کا ذائقہ چکھ لیا۔ جب وہ اٹھارہ برس کا ہوا تو اس کا والدہ سلیم سے ایک دوسرے شہر منتقل ہو گئی اور ہاتھوں کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ جانا پڑا۔ ہاتھوں کی زندگی کچھ ایسے انداز سے اور ماحول میں گزری کہ وہ عزت نشین اور تنہائی پسند ہو گیا۔ اس نے بروکلین کالج میں تعلیم حاصل کی لیکن کالج کے زمانے میں ہی اس کی تنہائی پسندی کی عادت برقرار رہی۔ گریجویٹیشن کے بعد وہ واپس سلیم آ گیا اور اس نے اپنی زندگی تصنیف و تحریر کے لیے وقف کر دی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تنہا اور اکیلا ہو گیا۔

ہاٹھورن کے حوالے سے سلیم (SALEM) کا ذکر ہوا۔ جس کے حوالے سے چند وضاحتی باتیں ضروری ہیں۔ سلیم میں ایک زمانے میں بعض عورتوں، لڑکیوں اور مردوں پر اس جرم میں مقدمہ چلایا گیا تھا کہ وہ بدروحیں اور WITCHES ہیں۔ جس کا شہرہ پورے ملک میں ہوا تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس پر امریکہ کے عظیم ڈرامہ نگار آرٹھر ملر نے عظیم کھیل CRUCIBLE لکھا۔ جس کا ترجمہ کتابی صورت میں "آنٹائٹ کی گھڑی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ تراظر ہونے لگا تھا۔

اس ماحول اور سلیم کے ماضی کے اثرات ہاٹھورن کے ماضی کے اثرات ہاٹھورن کے ذہن پر بڑے گہرے تھے۔ اس کے خاندان کا ایک فرد (اغلباً) دادا اس مقدمے میں ایک جج ہی تھا۔

ہاٹھورن نے بارہ برس تک ایک تارک الدنیا جیسی زندگی گزاری۔ وہ اس زمانے میں مختصر کہانیاں لکھتا رہا۔ یہ ایک ایسی صنف تھی جسے امریکہ میں کوئی نہ جانتا تھا اور پڑھنے والے اس سے نا آشنا تھے۔ یوں ہاٹھورن امریکہ میں شارٹ سٹوری کے بانوں میں سے ایک ہے۔ بارہ برسوں میں اس نے جو ناول لکھا وہ FANHAWES کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایک رو مانس تھا۔ ایک کمزور تخلیق۔ جسے بعد میں خود ہاٹھورن نے بھی مسترد کر دیا۔

۱۸۲۷ء میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ TWICETOLD TALES شائع ہوئی جو امریکی ادب میں کہانیوں کی اولین اور اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس اولیت کی وجہ سے اس کی ایک تاریخی حیثیت بھی بنتی ہے۔

۱۸۳۱ء میں ہاٹھورن کی شادی ہوئی۔ یہ اس کی زندگی کی بہت بڑی خوشی تھی کیونکہ وہ جس خاتون سے بیاہ گیا وہ ایک فعال اور دانشور خاتون تھی۔ صوفیہ پی باڈی SOPHIA PEA BODY نے اسے عزت نشینی سے نکالا۔ اس کی تنہائیوں کو ختم کیا۔ اسے اویوں اور دانشوروں کے حلقوں اور مجلسوں میں لے گئی۔ یوں ہاٹھورن کے تعلقات اس دور کے بڑے امریکی لکھنے والوں پارسن، الیکوٹ اور مارگریٹ فولر سے ہوئے۔ شادی کے بعد ہاٹھورن

نے نقل مکانی کی اور میسنے (کوئٹہ) میں رہائش پذیر ہوئے۔

اب وہ پُرسکون اور مسرور خوشیوں بھری زندگی بسر کر رہا تھا۔ جو اس کی شریک حیات کی دین تھی۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ *MOSES FROM AMOLD MANSE* شائع ہوا۔ تین برسوں میں کہانیوں کا ایک مجموعہ اتنا بااثر نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے گھر کے اخراجات چل سکتے۔ اس کے بعض دوستوں نے اسے مشورہ دیا اور وہ ان کے مشورے پر سلیم کے کسٹم ہاؤس میں ملازم ہو گیا۔ ملازمت کے دوران بھی وہ کہانیاں لکھتا رہا۔ اس نے کسٹم ہاؤس میں پانچ برس ملازمت کی۔ جب انتظامیہ میں تبدیلی آئی تو اس کی ملازمت چھین گئی۔ اس کی عقل مند بیوی نے ایسے دلوں کے لیے کچھ رقم بچا رکھی تھی۔ اس لیے ہاتھوں مالی پریشانی کا شکار نہ ہوا۔ اور ملازمت چھین جانے کے بعد اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا شہکار "سکارٹ لیٹر" تخلیق کیا۔ جو اب عالمی ادب کا بھی شہکار سمجھا جاتا ہے۔

سکارٹ لیٹر ۱۸۵۰ء میں شائع اور اپنی اشاعت کے ساتھ ہی مقبول ہو گیا۔

ہاتھوں سلیم میں خوش نہ تھا۔ ملازمت کی وجہ سے وہ وہاں مقیم تھا۔ اس لیے وہ اس ناول کی اشاعت اور بے پناہ کامیابی کے بعد سلیم سے نکل کھڑا ہوا۔ اور اپنے گھرانے کے ساتھ کچھ عرصہ لینوکس میں مقیم رہا۔ جہاں اس نے اپنا دوسرا شاہکار *THE HOUSE OF THE SEVEN GABLES* تحریر کیا۔ اس کے بعد وہ ویسٹ نیوٹن میں آباد ہوا۔ جہاں اس نے ایک کتاب لکھی جو یوٹو پین ذہن رکھنے والوں پر ایک گہری طنز تھی۔ ۱۸۵۳ء میں اسے لیورمیول میں قونصل مقرر کر دیا گیا۔ یوں اس نے سات برس پرانی دنیا یعنی انگلستان اور اٹلی میں برس کیے۔ یہیں اس نے اپنی کتاب *MARBLE FAUN* لکھی جس کا پس منظر اور ماحول اطالوی ہے۔ ۱۸۶۰ء میں وہ واپس کوئٹہ لوٹا اور یہیں اپنی زندگی کے آخری چار برس گزارے۔ اپنی علالت اور خانہ جنگی کی وجہ سے یہ برس بہت رنج و ملال میں گزارے۔ اس کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیٹی اور بیوہ نے اس کی کچھ اور کتابیں بھی شائع کیں۔

ادب میں کبھی کبھی ایسی رد بھی مل سکتی ہے کہ کسی منفرد لکھنے والے کو بھی کسی دوسرے کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے۔ ہاتھورن کے بارے میں بھی ایک زمانے میں ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا۔ اس میں اور ایڈ گرائین پو میں گہری مشابہت تلاش کی گئی۔ حالانکہ ہاتھورن کی کہانی کا کوئی انداز ایڈ گرائین پو کی کہانی سے نہیں ملتا۔ انیسویں صدی کے آغاز تک امریکہ میں جو تنقید لکھی گئی اس میں یہی انداز فکر دکھائی دیتا ہے۔ ایڈ گرائین پو اپنی کہانیوں میں ڈراما پیدا کرنے کے لیے جو دہشت ناک تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس سے ہاتھورن کی کہانیاں یکجہ خالی ہیں۔ پھر اسلوب کے اعتبار سے بھی دیکھیں۔ جو موثر اور ہنرمندانہ اسلوب ہاتھورن کی کہانیوں کا ہے۔ پو اس سے بہت دور دکھائی دیتا ہے پو کا اسلوب تحریر خاصاً متعلقہ تھا۔

”سکارلٹ لیٹر“ اور ”ہاؤس آف آف سیون گیلز“ کے حوالے سے ہاتھورن نہ صرف امریکی ادب میں بلکہ عالمی ادب میں بھی سب سے آگے، منفرد اور کیتا دکھائی دیتا ہے وہ بڑا تخلیقی فنکار تھا۔ اپنے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے وہ فن کی دنیا میں بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جس انداز سے وہ لپٹے ناول اور کہانیوں میں ماحول تخلیق کرتا ہے۔ اس کو سامنے رکھیں تو ہارڈی جیسا مصنف۔ جسے لپٹے خاص وصف پر بڑا فخر ہے یہیں ہاتھورن ان سے بہت دور کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ جوزف کانزڈ کو بھی ماحول کی تعمیر اور تاثیر پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ لیکن اس کے ناول بھی اس خاص حوالے سے ہاتھورن کے دونوں فن پاروں سکارلٹ لیٹر اور وی ہاؤس آف وی سیون گیلز سے بہت پیچھے دکھائی دیتا ہے۔

ہنری جیمز نے سکارلٹ لیٹر اور ہاؤس آف سیون گیلز کو امریکی ادب کے ایسے شاہکار قرار دیا ہے جن کی مثال پورا امریکی ادب پیش نہیں کر سکتا۔

”سکارلٹ لیٹر“ ایک متعصب و متقدرد مذہبی معاشرے کی کہانی ہے۔ جس میں جھگڑتے ہیسیٹر، پرل اور ایک پادری جیسے انسان لستے ہیں۔

چلنگوڑا ایک بد ہیئت، اودھیز عمر طیب ہے۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکلا رہتا ہے
 ہیسیٹر اس کی بیوی ہے۔ جوان خوب صورت شائستہ، پادری اس علاقے کا وہ فرد
 ہے، جسے لوگ کرامتوں والا پادری کہتے ہیں۔ اسے خداوند یسوع کا مظہر سمجھتے ہیں اس
 کے روحانی کرشموں، اس کی عبادات، اس کے زرد اور حسین چہرے پر سارا علاقہ مرثا ہے
 چلنگوڑا تھا اپنی بیوی ہیسیٹر کو چھوڑ کر طویل عرصے کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی
 عدم موجودگی میں پادری اور ہیسیٹر جو اپنے اپنے جذبات کو دبا رہے بیٹھے ہیں، ایک دن جذبات
 کی غلبانی میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ فطرت کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں فطرت جو
 بڑی جابر ہے، اپنا آپ منواتی ہے۔ انسانوں کے صبر و ضبط کے بند تکیے کی طرح ہمالے
 جاتی ہے۔ فطرت جو انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین سے زیادہ قوی اور جابر ہوتی ہے۔
 اس طاپ، اس فطری تقاضے کے پورا کرنے کے بعد ہیسیٹر ماں بنتی ہے۔ اس کے
 ہاں جو بچی پیدا ہوتی ہے اس کا نام پرل رکھتی ہے۔ اس کا باپ کرامتوں والا پادری ہے
 اس گناہ کی پاداش میں ہیسیٹر کا دیندار معاشرہ اسے پر سزا دیتا ہے کہ وہ اپنے سینے پر
 ہمیشہ سرخ رنگوں سے کڑھا ہوا A کا نشان آویزاں رکھے تاکہ لوگوں کی نظروں میں ہمیشہ
 ایک حقیر ذانیہ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اپنے گناہ کی تشہیر کرنے پر وہ مجبور ہے۔ کیونکہ
 وہ جس معاشرے میں رہتی ہے وہ بڑا طاقتور ہے۔

وہ کسی کو یہ نہیں بتاتی کہ اس بچی کا باپ کون ہے۔ وہ بہت اچھی کڑھائی کرتی
 ہے۔ ایک معننی شائستہ عورت ہے۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر لاہ پتہ ہو چکا ہے۔ اپنا
 پیٹ پالنے کے لیے وہ کام کرتی ہے۔ اب وہ ایک بچی کی ماں ہے۔ پورا معاشرہ اس
 کے گناہ کی سزا تو دے سکتا ہے لیکن اس کی کفالت کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اس کے
 جذبات اور فطری تقاضوں سے کسی کو کوئی بدلہ چسپی نہیں۔ اسے لالچ دیا جاتا ہے، اسے
 ڈرایا دھمکایا جاتا ہے لیکن وہ پرل کے باپ کا نام نہیں بتاتی۔

اس کے سینے پر A کا سرخ دھبہ ہوا انگارہ ہمیشہ کے لیے اس کی ذلت کی نشانی بنا
 کر رکھ دیا گیا ہے۔ اسے مرتے دم تک اسی طرح اس انگارے کی جلن کے ساتھ زندہ

رہنا ہے۔ !

اوپر کرامتوں والا پادری روح کی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اصل میں گناہ کا گناہ تو وہ ہے۔ یہ سزا تو اسے ملنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ بزدل ہے۔ وہ اپنے گناہ کا اعتراف نہیں کر سکتا۔

اور پھر وہ غیبت بولتا ہے۔ چلنگور تھا واپس آ جاتا ہے۔ وہ بہت گھٹیا بہت جھوٹا انسان ہے۔ جو کام کوئی نہ کر سکا وہ نفرت اور انتقام کی وجہ سے خود کرنا چاہتا ہے۔ تلاش اس شخص کی جو پرل کا باپ ہے۔ جس نے اس کی بیوی کے ساتھ گناہ کیا۔ وہ سراپا انتقام ہے۔ وہ بدی کی علامت ہے۔ وہ طیب ہے۔ لیکن جسم کے فطری تقاضوں کو نہیں سمجھتا پھر وہ پادری تک جا پہنچتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہ پادری جو رات کے آخری پہر اپنے جسم پر کوڑوں کی بارش کرتا ہے یہی وہ شخص ہے جو پرل کا باپ ہے۔

چلنگور تھا، ہیلسٹر، پادری اور پرل مادرہ پورا معاشرہ اس فن کارانہ انداز سے سکا رٹ لیٹر میں پیش ہوئے ہیں کہ ایک باپ پڑھنے والا قاری ساری عمر اس ناول کے طلسم سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جس فضا، ماحول اور جس گہری انسانی بصیرت کے ساتھ انسانی جذبات کو با محقورن نے اس ناول میں تخلیق کیا ہے۔ وہ انٹ ٹاثر کا حامل ہے۔

پادری روح کی اذیت میں مبتلا ہے، وہ اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔ راتوں کو اپنے آپ کو مارتا ہے۔ چھیٹتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ نفس کشی اور عبادت میں مصروف ہے۔ وہ پہنچا ہوا ہے۔ وہ SAINT ہے۔ حالانکہ وہ انسان ہے جو بھونک گیا ہے۔

جسے فطرت نے درغلا یا تھا۔ اور اب جیتے جی جہنم سے بھی بڑے عذاب میں مبتلا ہے۔ اور پھر چلنگور تھا اس کا تماشا ٹی ہے۔ اسے دیکھتا ہے۔ اس کی اذیت سے خوش

ہوتا ہے ...

اور پھر ایک دن پادری ہمت کرتا ہے۔ پورا شہر جمع ہے۔ جہاں وہ مرنے سے پہلے اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ جب وہ اپنا چوڑا تار تار ہے تو لوگ دیکھتے ہیں کہ اس کے دل کے عین اوپر A کا لفظ دھک رہا ہے۔ پادری مرتے مرتے چلنگور تھا کی

طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے -

”خدا تمہیں معاف کرے تم نے بھی بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے!

پادری جس حقیقت کو پالیتا ہے وہ اتنی بڑی اور سناک ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے درجنوں صفحوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس ایک جملے میں ہاتھوڑن نے اس کا اظہار کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنی بیٹی کی طرف مرنی اور کبھی ہونی لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے -

“MY LITTLE PEARL, DEAR LITTLE PEARL,
WILT-THOU KISS ME NOW

PEARL KISSED HIS LIPS ”

پادری کے کردار کے ارد گرد ہاتھوڑن نے ایک ایسا ہالہ بنا اور تیار کیا ہے کہ اس کے اس اعتراف کے باوجود شہر کے لوگ اُن سے گندگار نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اسے بھی پادری کی بڑی کرامتوں میں سے ایک کرامت سمجھتے ہیں کہ اس نے ہیپیسٹر کے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس نے اپنے سینے پر دیکھا ہوا 'A' کوڑوں کی جھڑیوں سے بنا کر دراصل ہیپیسٹر کے لیے نجاتِ اخروی حاصل کی تھی۔

سکارٹ لیٹر میں پادری اور ہیپیسٹر کی بچی کا نام ہاتھوڑن نے PEARL رکھا ہے۔ صاف، شفاف، بے داغ، موتی، عصمت اور عفت کی علامت۔ اب اس پر غور کرنا قارئین کا مسئلہ ہے۔

ڈیڈ سولز

اس سوال کا جواب میں عالمی ادب اور گوگول کے قاری کی حیثیت سے بڑی آسانی سے دے سکتا ہوں کہ گوگول کے ناول "ڈیڈ سولز" کو دنیا کے دس عظیم ترین ناولوں میں کیوں اور کیسے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ناول کے حوالے سے بعض سوال میرے ذہن میں ہمیشہ پیدا ہوئے ہیں جن کا جواب دینا میرے لیے بہت مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔

ایک بڑا سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ ناول مکمل ہو جاتا تو پھر اس کی ادبی اور تخلیقی اہمیت کیا ہوتی کیا اسے دنیا کے دس بڑے ناولوں اور عظیم کتابوں میں شامل کیا جاتا ہے؟

کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب تو دیا جاسکتا ہے کہ مفروضوں پر کسی حقیقت کی بنیاد نہیں رکھنی چاہیے۔ فلہذا بیڑے آغزی ناول کو بھی تو دنیا کا عظیم ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ نامکمل ہے۔ کافکا کے ناول "ٹرائل" اور "کاسل" کے بارے میں بھی مسئلہ اٹھتا ہے کہ وہ نامکمل ہونے کے باوجود دنیا کے ادب کا شہکار ہیں۔ یہ ناول جس حالت میں بھی ہیں میں اسی صورت کو قبول کرتے ہوئے ان کو سمجھنا، پڑھنا اور پھر ان کا ادبی مقام قائم کرنا ضروری ہوگا۔ جب کہ دنیا ادب کے ناقدوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "ڈیڈ سولز" گوگول کا ہی عظیم شاہکار نہیں۔ روسی زبان کا ہی بے مثل فن پارہ نہیں، بلکہ عالمی ادب میں کہتا ہے۔

لیکن وہ سوال جس کا جواب کسی صورت بھی کم از کم میرے لیے دینا ممکن نہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ کوئی تخلیق کار کسی حد تک اپنی روح، احساسات اور لہجے وجود سمیت اپنی تخلیق کے ساتھ ملوث ہو سکتا ہے۔ اس کی تخلیق کس حد تک اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

یہ بہت اہم سوال ہے اور دنیا میں چند ہی ایسے تخلیقی فن پسے لکھے گئے ہیں جن کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کا سامنا کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ کچھ گفتگو گوگل کے بارے میں ہو جائے۔ اس کے فن کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔ اور پھر اس کے اس شہکار مردہ روہیں "DEAD SOULS پر گفتگو کی جائے۔

شکولائی واسیل وچ گوگل ۱۸۰۹ کو یوکریین میں پیدا ہوا۔ بچپن میں ہی اس نے یوکریین کے فوک ادب اور کرداروں سے گہری واقفیت پیدا کر لی تھی۔ یوکریین میں ہی اس نے تعلیم حاصل کی اور پھر وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ اس نے پریژبرگ کا رخ کیا۔ تب اس کا ارادہ سیٹج ادا کار بننے کا تھا۔ لیکن اس وہ ناکام رہا اور نتیجے میں اسے کلر کی کرنی پڑی۔ کچھ عرصہ وہ ایک سکول میں پڑھاتا بھی رہا وہ اپنی ملازمتوں سے غیر مطمئن تھا۔ اس زمانے میں اس نے ایک نظم لکھی جو اس کے نام کے بغیر شائع ہوئی تو اس کی بہت بندہ گئی۔ گوگل کی شہرت کا آغاز کہانیوں سے ہوتا ہے۔ جب اس کی کہانیوں کا مجموعہ "ڈنکا کے قریب ایک فارم ہاؤس میں بیٹی شامیں" شائع ہوا تو بطور ادیب اور افسانہ نگار اس کی لازوال شہرت کا آغاز ہوا اور انہی کہانیوں کی وجہ سے وہ روس کے عظیم شاعر اور جدید روسی ادب کے بانی پوشکن کی قربت میں پہنچا۔ وہ پوشکن کا مداح بن گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت پوشکن کی رفاقت میں بسر ہوتا۔ اس زمانے میں اس نے اپنے ایک دوست کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

"میں نہیں جانتا کہ میں چند دنوں کے بعد کہاں ہوں گا۔ لیکن اگر مجھے پوشکن کی

معرفت اس کے پتے پر خط لکھا جائے تو یہ خط مجھے ضرور مل جائے گا۔"

گوگل کو اس کی کہانیوں کی اشاعت کی وجہ سے پریژبرگ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر لگا دیا گیا۔ لیکن اس سے اس نے کم ہی فائدہ اٹھایا۔ اور اس کی میکچوشپ کا زمانہ بہت مختصر ہے اس کے شاگردوں میں ترکگینت بھی شامل تھا جو ساری عمر گوگل کا مداح اور اسے پوجتا رہا۔

گوگل جہاں بحیثیت انسان بہت عجیب و غریب شخص تھا۔ وہاں وہ بعض لازوال تخلیقات کی وجہ سے بھی ساری دنیا کے لیے اب تک دل چسپی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس نے یوکریین کے علاقے اور اس کے لوگوں، ثقافت اور رسم و رواج کو زندہ جاوید کر دیا۔ عالمی ادب کا کونسا

ایسا غالب سم ہے جس نے گوگول کے شاہکار "تارس بلبا" کو نہ پڑھا ہو۔ تارس بلبا اس کا وہ طویل افسانہ یا ناولٹ ہے۔ جس نے اپنی اشاعت کے دور سے لے کر اب تک ساری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ آزاد می کے لیے لڑنے والوں، شجاع کرداروں کے حوالے سے تارس بلبا ایک لافانی کردار ہے۔

دنیا کے شاہکار افسانوں کی جب بھی فہرست بنے گی اس میں "اور کوٹ" کا نام شامل ہوگا۔ دوستو تفسکی نے اور کوٹ کے حوالے سے لکھا تھا۔

"روسی ادب نے گوگول کے اور کوٹ سے جنم لیا ہے۔"

اس عظیم افسانے کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ عالمی افسانے کا انتخاب اس افسانے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اردو میں اس شہکار افسانے کا ترجمہ تارخا ہرنے کیا ہے جو "امروز" میں شائع ہوا تھا۔

تارس بلبا اور کوٹ کے خالق گوگول نے ہی "ڈائری آف اے میڈیسن DIARY OF A MAD MAN" جیسا شاہکار بھی لکھا ہے جو اس کے سب افسانوں سے مختلف ہے۔ اور اس افسانے کا شمار بھی دنیا کے شاہکار افسانوں میں ہوتا ہے۔

گوگول اداکار نہ بن سکا۔ لیکن ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اس نے انسپکٹر جنرل جیسا شاہکار لکھا۔ جو عالمی ڈرامے میں کیتا اور لازوال مقام کا حامل ہے۔ انسپکٹر جنرل کے ساتھ بہت سے واقعات وابستہ ہیں۔ جب یہ کھیل لکھا گیا تو سنسر کے لیے گیا تو زار شاہی نے اسے سٹیج کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر یہ کھیل خود زار نکولس اول نے پڑھا اور بعض ترامیم کے اسٹیج کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ گوگول نے اس سلسلے میں اپنی والدہ کے نام لکھا تھا۔

"اگر خود شہنشاہ معظم اسے سٹیج کرنے کی اجازت نہ دیتے تو نہ یہ کھیل سٹیج ہو

سکتا نہ ہی اس کی اشاعت ممکن ہوتی۔"

جب یہ کھیل ۱۹ اپریل ۱۸۳۶ء کو پہلی بار پیرینز برگ میں سٹیج ہوا تو خود زار نکولس اول کھیل دیکھنے والوں میں شامل تھا۔ اور کھیل کے اختتام پر اگرچہ گوگول وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن زار نکولس اول سٹیج پر خود آیا۔ اداکاروں سے بات چیت کی۔

انکسپر جرنل ایک عالمی اسپل اور صداقت رکھنے والی طنزیہ کامیڈی ہے۔ سرکاری نظام انسر شاہی پر اس سے زیادہ بلیغ اور تکلفیہ طنز عالمی ادب میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ ہمارے پاکستان میں ایوب خاں کے دور میں آغا بابا نے اس کھیل کو بڑا صاحب - کاروپ دیا اور ایوب دور میں بڑا صاحب کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی اور ابھی ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ مشرقی یورپ کے ایک اشتراکی ملک میں ایک تھیٹر ماہرین کو اس لیے نوکری سے جواب دے دیا گیا کہ اس نے گوگول کا یہی کھیل - انکسپر جرنل - سیٹج کرنے کی جسارت کی تھی۔

تارس لیا، یوکرین کے بارے میں زندہ کمانیوں اور کوٹ، ڈارمی آف اے میڈین اور انکسپر جرنل جیسے لازوال شاہکاروں کے خالق - گوگول کی آخری تخلیق - ڈیڈ سولز - تھی۔ گوگول کا فن ایسا ہے کہ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ اردو میں اس کی کسی کمانیوں اور ڈراموں کا ترجمہ ہوا۔ لیکن اس کی شخصیت اور فن کے بارے میں سلیقے سے کسی نے کام نہ کیا۔

گوگول عجیب و غریب آدمی تھا۔ وہ ساری عمر کنواری رہا۔ وہ خود لکھتا ہے اس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی۔ نہ ہی اس سے کبھی کسی نے محبت کی۔ کبھی جنسی جذبات کو محسوس نہ کیا اور کبھی کسی جسم کی قربت سے آشنا نہ ہوا۔ اسے اپنی ان محرومیوں پر فخر تھا۔ اپنی آخری عمر میں وہ البتہ چند خواتین کا ذکر ضرور کرتا ہے جن سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کبھی حنظل اٹھایا تھا اور شاید ایک بار اس نے شادی کا ارادہ بھی کیا تھا۔ لیکن یہ قطعہ بھی بس ارادے تک ہی محدود رہا۔

وہ ذہنی اور عملی طور پر بے چین اور آوارہ گرد تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا خاص حصہ روس سے باہر بسر کیا۔ گوگول کے حواس پر ناک چھایا ہوا تھا۔ ناکوں کے بارے میں وہ بڑا ذہنی تھا۔ اس کا یہ عجیب و غریب OBSESSION اس کی ایک کمانی میں ظاہر ہوا۔ جسے میں موجودہ دور کی جدید ترین کمانی سے تعبیر کرتا ہوں۔ حالانکہ یہ کمانی آج سے تین برس پہلے لکھی گئی تھی۔ فرائیڈین نقطہ نظر سے ناکوں کے بارے میں اس کی دلچسپی اور دہرم کی تعبیر کی جا سکتی ہے اور اس سلسلہ میں اس کا ساری عمر جنس سے گریز بھی بہت سی گتھیں کو کھولتا ہوا ملتا ہے۔

اس عظیم شخصی، ادبی اور تخلیقی پس منظر میں گوگول کے عظیم شاہکار - ڈیڈ سولز - کا جائزہ

یعنے کی ضرورت ہے۔

”ویڈیو سولنز“

گوگول نے ”ویڈیو سولنز“ کے پہلے حصے کی تکمیل پر آٹھ برس کا عرصہ (۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۲ء تک) صرف کیا اور اس کے بعد اس ناول کے دوسرے بد قسمت حصے کی تکمیل پر دس برس لگائے یعنی ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۲ء تک۔ اس کے بعد وہ اس کے تیسرے حصے پر کام کرنے لگا۔ اس کے بارے میں گوگول کا دعویٰ تھا کہ یہ اہم مقامی تیسرا حصہ اس کو لازوال شہرت سے ہمکنار کرے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے حصے کی تکمیل کے بعد دوسرے حصے تک اس پر جو بیٹی اس نے ہی اس کی فانی زندگی اور اس ناول پر ایسے اثرات مرتب کیے کہ تیسرا حصہ شروع ہی نہ ہو سکا۔

گوگول نے اعتراف کیا ہے کہ ”ویڈیو سولنز“ کا موضوع لپشکن کی دین ہے۔ یہ لپشکن ہی نے اسے بتایا تھا گوگول نے اپنے اعتراف میں لکھا ہے کہ لپشکن اس موضوع پر بڑی نظم رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گوگول کو اس اعزاز پر جو فخر حاصل ہے وہ بے جا نہیں کہ لپشکن نے اسے یہ موضوع دیا اور لپشکن کو گوگول اتنا عزیز تھا کہ اس کے علاوہ یہ موضوع وہ کسی کو بھی نہ دیتا۔

جون ۱۸۳۶ء میں روس سے جانے سے پہلے گوگول ۱۸۳۴ء کے ادھر میں یہ ناول شروع کر چکا تھا۔ اس نے اس کے ابتدائی ”ابواب لپشکن کو بھی سنائے تھے۔ جس کے ردِ عمل کو گوگول نے اس جملے میں اپنے ”اعترافات“ میں محفوظ کر لیا ہے:

”وہ بے حد شرم و دکھانی دینے لگا اور بالآخر بولا: ”آہ ہمارا روس کتنا غمزدہ

اور ادا کس ہے۔“

۱۸۳۶ء میں جب گوگول سوئٹزرلینڈ میں تھا تو وہ یہ ناول لکھ رہا تھا۔ جب وہ پیرس گیا تو وہاں بھی اس کی تکمیل کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۳۷ء کے موسمِ خزاں اور ۱۸۳۸ء میں گوگول روم میں ناول کے پہلے حصے پر نصف سے زیادہ کام کر چکا تھا۔ اس ناول کی تحریر کے دوران میں ایک واقعہ ایب بھی پیش آیا۔ جس کا ذکر بے حد ضروری ہے اور یہ واقعہ خود گوگول نے ہی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

”میرے ساتھ عجیب ماجرا ہوا۔ میں جولائی کے مہینے میں ایک دن البانہ اور گنزالونامی چھوٹے ٹقبوں کے درمیان جا رہا تھا کہ مجھے اچانک ایک خستہ حال سرائے میں رکن پڑا۔ جو ایک چھوٹی ٹسی پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھی۔ لوگ وہاں مختلف زبانوں میں مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔ بلیئرڈ کی میزے مسلسل گیندوں کی کھٹا کھٹ آواز آرہی تھی۔ ان دنوں میں اپنے ناول ”ڈیڈ سولز“ کا پہلا حصہ لکھ رہا تھا۔ اس لیے اس کا مسودہ کبھی اپنے آپ سے دور نہ کیا تھا میں نہیں جانتا کہ اچانک کیا ہوا لیکن جونہی میں اس پر ہجوم اور پڑ پڑ سرائے کے اندر داخل ہوا۔ میرے پورے وجود کو اس خواہش نے غلبے میں لے لیا کہ میں ابھی لکھنا شروع کر دوں۔ میں نے ایک چھوٹی ٹیبلز لانے کا حکم دیا۔ اور سرائے کے ایک گوشے میں رکھوا کر بیٹھ گیا۔ مسودہ نکالا اور تمام تر شور کے باوجود میں لکھنے لگا۔ میں دنیا دماغیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ اس پاس کا احساس ہی میرے وجود نے قبول کرنا بند کر دیا تھا۔ میں نے اس ماحول میں پورا ایک باب لکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب کے لکھنے میں مجھے جو تحریک حاصل ہوئی وہ بے مثل اور عجیب تھی۔ اس تحریک نے ہی مجھ سے ایسا باب لکھوایا جو بے حد شاندار، خوب صورت اور سب سے بہتر ہے۔“

اپنی تحریر میں گوگل نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس خاص تحریک کے تحت اس نے کون سا باب اس پر ہجوم سرائے میں لکھا تھا۔ تاہم اس کے بارے میں مختلف قیاسات پائے جاتے ہیں۔ گوگل کے سوانح نگار اور نقاد پافل اینسکوف نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہی زیادہ معتبر اور مستند قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۱ء میں گوگل اپنے ناول پر نظر ثانی کر رہا تھا تو اس نے ایک باب کا بطور خاص ذکر کیا۔ جب وہ اس شاندار خوبصورت اور بے مثل باب کو دوبارہ مجھ سے لکھوا چکا تو خود میں اس باب سے اتنا متاثر ہو رہا تھا کہ میں نے کہا نکالانی گوگل میرا خیال ہے کہ یہ باب واقعی ایک حقیقی جینس کی تخلیق ہے۔“

گوگل نے مسودے کو بڑی مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن دیکھو

ابواب بھی بڑے نہیں، پھر لولا، چلو ہم تھوڑی دیر کے لیے سیر کرنے چلیں۔ چلتے وقت اس خیال سے کہ بارش نہ ہونے لگے۔ اس نے اپنا چھاتہ بھی ساتھ لے لیا۔ وہ بہت مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے اس باب پر نازاں۔ اس کا چہرہ تیار رہا تھا۔ جو نہی ہم ایک سنسان اور اور خالی گلی میں داخل ہوئے۔ گوگول گانے اور رقص کرنے لگا۔ وہ یوکرینی رقص کے ساتھ یوکرینی نغمہ گارہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے جوش سے چھاتے کو بھی لہرا رہا تھا وہ آنا مدہوش اور پُر جوش تھا کہ چھاتہ اس کے ہاتھ سے یوں چھوٹا کہ اس کی ہتھی اس کے ہاتھ میں رہ گئی اور باقی چھاتہ دور جاگرا۔ اس نے رقص کرتے ہوئے چھاتے کو اٹھایا۔ اس طرح گوگول نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

گوگول کو اپنے ناول "دیڈ سولز" کے بارے میں ہمیشہ سے یہ یقین تھا کہ ناول بہت سنسنی مھیلے گا۔

اس ناول کا ہیرو ایک مکار عیار شخص ہے۔ شیطان کا ایک بہروپ اس کا نام شیشکون ہے وہ ایک عجیب چال چلتا ہے۔ روس میں زرعی غلام رکھنے کا رواج تھا۔ زرعی معیشت کا تمام تر دار و مدار ان زرعی غلاموں (SERFS) پر تھا۔ بڑے بڑے جاگیر دار ان زرعی غلاموں کی ملکیت پر فخر کرتے تھے۔ ان کا اندراج باقاعدہ رجسٹروں میں درج ہوتا اور پھر مردم شماری میں بھی ان کو شامل کیا جاتا۔ شیشکون مردہ زرعی غلاموں کی روجوں کو خریدنے نکلتا ہے۔ یہ دنیا کا عجیب و غریب کاروبار ہے جو وہ کر رہا تھا۔ وہ ان غلاموں کو خریدتا جو مر چکے تھے۔ گو یا وہ مردہ روجیں خریدتا رہا تھا۔ اس سے وہ کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ مردہ غلاموں کو کوستے داموں خرید کر اپنی ملکیت ظاہر کر کے ان کو آگے دھوکہ دہی سے بیچنے کا حراہاں تھا۔ اپنے اس کاروبار میں وہ پورے روس کے دیہات کا دورہ کرنے نکلا۔ ایک طرف تو شیشکون ہے اس کا کردار اس کا کاروبار اور دوسری طرف پھیلے ہوئے روسی دیہات اور اس میں بسنے والے گون ناگوں انسانی کردار۔

گوگول اس ناول کا آغاز کرتے ہی اس ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اسے اپنے ناول کا صحیح مقصد پہلے سے معلوم ہونا چاہیے۔ وہ بار بار اس ناول کے بارے میں ذہنی طور پر الجھتا

تھا۔ ایسے سوالوں سے جو اس کی تخلیقی زندگی میں پہلے شاید کبھی پیدا نہ ہوئے تھے جب تک تو وہ اس ناول کی تحریک اور کیفیت میں اس طرح شراور تھا کہ وہ لکھتا چلا گیا وہ اس وقت ایک خاص تخلیقی SPELL کے زیر اثر تھا۔ لیکن بعد میں جب تخلیقی تحریک رک گئی تو وہ بید پریشان ہوا اور یہیں سے اس کے ان ذہنی امراض کا آغاز ہوا۔ جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئے وہ ان ذہنی امراض سے نجات حاصل کرنے کے لیے پھر روس سے باہر چلا گیا۔ تاکہ سیرد سیاحت ہی کسی طرح اس کے غم کا علاوہ بن سکے۔ ۱۸۴۶ء میں جب اسے روس چھوڑے تین سفتے ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا:-

”میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ کوئی معمولی انسان نہیں کر سکتا۔ میں اپنی روح میں شیر جیسی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔“

ایک دوسرے خط میں اس نے لکھا:-

”اگر میں اس ناول کو مکمل کر لیا تو یہ کتنا عقیدہ الٹا کارنامہ ہوگا۔ پورا روس اس میں ظاہر ہوگا۔ یہ میرا سب سے عمدہ تخلیقی کارنامہ ہوگا۔ جو مجھے ہمیشہ کے لئے زندہ کر دے گا۔“

اس ناول کو اگر ایک دلدل سے تعبیر کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ گوگول اس میں دھنسا چلا جا رہا تھا۔ پہلے تو وہ پورے روس کو اس میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس سے بھی اس کی تشغی نہ ہو رہی تھی۔ اس ناول کے موضوع کے حوالے سے وہ سمجھنے لگا کہ تقد نے اسے ایک ایسا موقع فراہم کیا ہے کہ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ناول کو روس کی نجات کا ایک وسیلہ بنا سکتا ہے۔

مارچ ۱۸۴۱ء میں اس نے اپنے ایک دوست کے نام روم سے ایک خط میں لکھا:-

”یہ خدا کا مفد کس ارادہ ہے۔ ایسے موضوع انسان کے ذہن میں خود

نہیں آسکتے۔ انسان خود ایسے موضوع سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”ڈیڈ سولز“ کے پہلے حصے میں ایسے اشعار اور کائنات ملتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کچھ لکھنے والا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جس اسرار کو وہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ وہ اس

ناول کے موضوع کی انتہائی نگہرائیوں میں اسے برآمد کر کے تخلیقی سطح پر دنیا کے سامنے پیش کر رہے۔ وہ اپنے ہی اس ناول، اپنی ہی اس تخلیق میں اس طرح الجھتا چلا گیا کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس ناول کے حوالے سے وہ دراصل اپنے وجود کے معنی کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ ذہنی اور دماغی طور پر علیل رہنے لگا تھا۔ اس کی بیماری طوالت پکڑتی جا رہی تھی۔ وہ ایسے ذہنی کرب سے دوچار ہوا جس نے اس کے حواس اور اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ بہر حال اسے ڈیڈ سولز کا پہلا مکمل حصہ شائع کرنا پڑا۔ کیونکہ صحت کے علاوہ اس کے مالی حالات بھی دگرگول ہو چکے تھے۔ اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ناول کا پہلا حصہ شائع ہو اور کچھ پیسے ہاتھ لگ سکیں۔ جنوری ۱۸۴۲ء میں وہ ماسکو واپس آیا اور آتے ہی ناول سنسر کے لیے بھیجا دیا۔ سنسر نے اس کے ناول کو اشاعت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ان کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ رومن کو مُردہ قرار دے کر وہ مذہبی عقائد کی نفی کر رہا ہے۔ گوگول نے اسے سنسر کرنے کے لیے پیٹرن برگ بھیجا دیا۔ یہیں سنسر کے حکام نے ناول کے اس جملے پر شدید اعتراض کیا۔ جس میں کپتان کو پلٹیکین کی تباہی کا ذمے دار سرکاری حکام کو قرار دیا گیا۔ سنسر کے حکام کے مجبور کرنے پر اسے یہ حصہ بدلنا پڑا۔ اس میں اس کردار کو اپنی تباہی کا خود ذمے دار دکھایا اور بعد میں جو ناول شائع ہوا اس میں اصل مسودے کو ہی شامل کیا گیا۔ جو ناول آج ملتا ہے وہ بھی اور جنل حصے پر مشتمل ہے۔

۷ جون ۱۸۴۲ء کو ڈیڈ سولز کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اسے خاصی شہرت ملی۔ لیکن یہ گوگول کی توقع سے بہت کم تھی۔ تاہم اسے یقین تھا کہ اس ناول کے بعد میں لکھے جانے والے حصے پورے روس کو ہلا کر رکھ دیں گے۔

دوسرے حصے میں گوگول روس کی روح کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کے معنی کو بھی حل کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے حصے میں وہ اس ناول کے حوالے سے روس کو نجات کا راستہ دکھانے کا خواہاں تھا۔ لیکن اب وہ ذہنی علالت کے اس درجے میں تھا کہ اس سے کچھ لکھنا نہ جا رہا تھا۔ جون ۱۸۴۵ء میں اس نے ڈیڈ سولز کے اس پورے دوسرے حصے کو خود مندر آتش کر دیا۔ جتنا کہ اس نے اسے اب تک لکھا تھا۔

اب وہ اپنی ذات کے الجھاؤ میں پھنس چکا تھا۔ اُسے خود روحانی رہنمائی کی ضرورت ہوئی۔ ایک مذہبی جنونی پادری میٹھوا اس کی رہنمائی کے لیے آیا جس نے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ اس کی تمام بیماریوں کی جڑ اس کی تصانیف ہیں اور اسے چاہیے کہ اس نے ڈیڈ سولز کا جو حصہ لکھا ہے اسے جلا دے۔ اس کے بعد وہ ترک دنیا کے خانقاہ میں چلا جائے۔ اس میں اس کی نجات ہے۔ گوگول نے پادری میٹھو کی خواہش پوری کرتے ہوئے ڈیڈ سولز کے دوسرے اور تیسرے حصے کو جتنا اس نے لکھا تھا نذر آتش کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۴ فروری ۱۸۵۲ء کی رات کو پیش آیا اور اس کا اسے اتنا صدمہ ہوا۔ اپنی عظیم تخلیق کو اپنے ہاتھ سے جلا دینے کے غم نے اسے ہمیشہ کے لیے بستر سے لگا دیا۔ اس نے فلتے کرتے شروع کر دیے۔ غذا کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا اور اسی فاقہ کشی کے عالم میں اپنے مسودے کو نذر آتش کرنے کے نو دن بعد ۱۸۵۲ء کو گوگول کا انتقال ہو گیا۔

ڈیڈ سولز، جو اس وقت دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس میں پہلا حصہ مکمل ہے دوسرے حصے کے وہی صفحات اس میں ملتے ہیں جو اس مسودے کا پہلا ڈرافٹ تھا۔ اور وہ بھی نامکمل ہے۔

وہ اپنے اس ناول کے ذریعے اس راز کو ظاہر نہ کر سکا۔ جس میں پوری سنی نوع انسان کی نجات مضمر تھی۔ اس کی اپنی تخلیق اس کے لیے موت ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس کی روح اور وجود اس تخلیق میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ گوگول کی وفات کے آٹھ برس بعد روس میں زرعی غلاموں کے ادارے کو معطل کر دیا گیا۔ لیکن اپنی نامکمل صورت میں بھی ڈیڈ سولز، زندہ ہے۔ کیونکہ اس میں انسانی کرداروں کی جو گہری بنائی گئی ہے وہ افسانہ ہے۔ ہر رنگ لازوال، کیونکہ اس ناول کے کردار تمام بہنی نوع انسان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انگل ٹامنز کیسین

دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے اعلیٰ سرپرست امریکہ میں "کالے" یعنی حبشی کس طرح زندہ ہیں۔ ان کے حقوق کس طرح پامال کیے جاتے ہیں۔ آج وہ پہلے درجے کے شہری کیوں تسلیم نہیں کیے جاتے؟ ان کی تحریکوں، رویوں، موسیقی و ادب اور سیاست تھیٹریٹر کے بارے میں آج کا بالغ نظر قاری بہت کچھ جانتا ہے۔ کیونکہ موسیقی، باکنگ، اداکاری، ناول، افسانہ اور ریاست میں انیسویں، بیسویں صدی میں ایسے سرگرم آدرہ حبشی فنکار اور لکھنے والے پیدا ہوئے جن کی شہرت اور کام سے پوری دنیا واقف ہے۔

کبھی کبھی میں آج کے اور ماضی قریب کے بعض بڑے حبشی ناول نگاروں کے کام کو پڑھتے ہوئے سوچتا ہوں کہ ان کا کام اپنی نسل اور نسل کی ذاتی اور اجتماعی صعوبتوں کی صحیح آئینہ داری کرنے کے باوجود۔ اس اثر پذیری کا حامل کیوں نہیں۔ جو ہیریٹ پچر سٹوڈ کے ایک ناول میں اس انداز میں ملنے آئی کہ لپورا امریکہ گونج اٹھا اور ...

لیکن اس اور سے پہلے کچھ اور باتیں

حبشی شعرا نے جو کچھ لکھا۔ اس میں اپنی طویل غلامی، صعوبتوں اور سیاسی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ کھینچا۔ وہ بے حد موثر ہے۔ اور بعض شاعر اور ان کی شاعری کو بلاشبہ بڑی شاعری بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جس کا ذکر مجھے اصل میں کسی اور مضمون میں کرنا چاہیے۔ اس وقت فلکس کے حوالے سے بات کرنے کی ضرورت ہے اور یہ موضوع بھی اپنی جگہ اہم اور پھیلا ہوا ہے اور اس پر بھی اجمالاً ہی بات ہو سکتی ہے۔

انگریزی کے حوالے سے، آج کے بالغ نظریہ وسیع المطالعہ پاکستانی قاری سے امریکی روپیے کے بارے میں بات کی جائے اور اس ضمن میں سوال جھبشی لکھنے والوں کا ہو تو۔ پاکستانی قاری جو امریکی ادب کا طالب علم ہے۔ وہ چند بڑے نام اور چند بڑے کام فرما گنوا دے گا۔ کیونکہ یہ ناول تخلیقی سحر بریں ہیں جو ایک نسل کی غلامی اور ان کی حالت کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔

رچرڈ رائٹ کو ہی لکھیے جس کے ناولوں میں NATIVSON کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اور امریکی نقادوں نے بھی اس ناول کے بارے میں کہا ہے کہ یہ پہلا جدید ناول ہے جو دنیا میں کسی جھبشی نے لکھا ہے۔ فیڈ مسن تو اس ناول کا خاص طور پر بے حد مداح ہے اور اس نے اس ناول کے حوالے سے کئی مضامین لکھے ہیں۔۔

اس کے بعد ایلی سن (ALLI SON) کا ناول ہے (THE INVISIBLE MAN) جس عنوان کے حوالے سے دھیان فرماؤ ایچ۔ جی۔ ویلز کے ناول کی طرف جاتا ہے۔ جس کا موضوع ہی بڑا چوکا دینے والا ہے اور اس پر متعدد ایسی فلمیں بنی ہیں کہ جنہیں ہر دور میں ان گنت انسانوں نے بڑے ذوق و شوق سے دیکھا ہے۔ لیکن ALLI SON کا ناول۔ دی انویزیبل مین " دراصل حسن اسلوب، موضوع، فنی رچاؤ کے اعتبار سے رچرڈ رائٹ جیسے بڑے لکھنے والے تخلیقیت سے بھی اہم اور بڑا ناول ہے۔ اس ناول میں بیحد گہرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا ادبی اور فنی رتبہ بہت اونچا تسلیم کیا گیا ہے۔ پوری انسانیت کا ایک حصہ۔ جھبشی۔ امریکہ میں بستا ہے۔ موجود ہے لیکن پھر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسے معدوم اور غائب رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ دیکھا نہیں جاتا۔ ہر چند کہیں کہ ہے مگر نہیں ہے... کی ایسی طبع معنی خیز تشریح جھبشیوں کے حوالے سے شاید ہی دنیا کے کسی فن پارے میں کی گئی ہو۔ رالف ایلی سن کے اس ناول کے ماحول کی تعداد نہیں بتا سکتا۔ خاص طور پر فرانس کے بڑے والوں نے اسے بے حد سراہا ہے۔

رچرڈ رائٹ اور رالف ایلی سن کے بعد ایک اور بڑا نام سامنے آتا ہے جیمز بالڈو

(JAMES BALDWIN) جیمز بالڈون کے ناولوں، کہانیوں اور حبشیوں جیسے متعلقہ مسائل پر فکرائندوز تحریروں نے ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔ بھلا FIRE NEXT SIDE پڑھنے کے بعد کون شخص ہے جو امریکہ میں رہنے والے حبشیوں کی زندگی کے بارے میں دل پر ایک بھر پور نقش ثبت کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ ماکم اکیس کی زندگی پر اس نے جو تخلیقی کام کیا ہے اس کی معنویت کا دائرہ وسیع ہے بالڈون کے ساتھ ساتھ PINTER جیسا ڈرامہ نگار بھی امریکی سٹیج پر اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ پورے امریکہ اور پوری دنیا کو چونکا رہا ہے۔ یہ چند آج اور کل کے بڑے تخلیقی نام اور ان کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے سینکڑوں اہم، بغیر اہم اور کم اہم لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ... لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح آج کے زمانے میں ہارڈ ڈانسٹ نے امریکی حبشیوں کی زندگی کی سچی تصویر کشی اپنے ناولوں بالخصوص FREEDOM ROAD میں کی۔ کیا اسی طرح پہلے ادوار میں کوئی سفید نام امریکی ایسا لکھنے والا نہ تھا۔ جس نے امریکہ میں سفید فاموں کی بالادستی، جبر ظلم اور سرمایہ دارانہ استحصال کے شکار حبشیوں کو موضوع بنایا ہو۔

اسی سوال کا جواب ہیرٹ جیجر سٹو ہے۔

جس کا ناول انکل ٹامز کیمین "ٹیکنیک، زبان، فنی رچاؤ کے اعتبار سے یقیناً اتنا بڑا ناول نہیں جتنا بڑا رالف ایلیسن کا یا بوئی یا جیمز بالڈون کا کام ہے لیکن UNCLE TOMES CABIN آج کے تخلیقی اسلوب معیار اور ٹیکنیک کے پیمانے پر کیسا ہی خام اور کمزور کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔ یہ وہ ناول ہے جس میں بڑی سچائی بلکہ سفاکی سے امریکی حبشیوں کی زبوں حالی اور عدم غلامی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور مصنفہ حبشیوں کی حالت گزار پر آئسو نہیں مہانتی بلکہ ان کی ہمدردی کے جذبے میں بھی مشابہت دکھائی دیتی ہے اور پھر یہ ناول ایسے دور میں لکھا گیا جب حبشیوں کی حق اور مفاد میں لکھنا۔ امریکی معاشرے میں ایک گناہ اور بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔

"انکل ٹامز کیمین" وہ ناول ہے جس نے واقعی دنیا میں انقلاب برپا کیا یہ ان محدود چند ناولوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی معاشرے پر گہرا اثر ڈالا۔ ابراہام لنکن کو

یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے دور صدارت میں امریکہ میں غلامی کی تفسیح کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ جن محرکات اور اسباب کے حوالے سے ابراہام لنکن نے آنا بڑا انقلابی قدم اٹھایا ان میں واضح حد تک "انکل ٹامز کیبن" کے اثرات بھی شامل تھے۔
انکل ٹامز کیبن کا شمار ان نادلوں میں ہوتا ہے جو بہت پڑھے گئے۔ بہت سی زبانوں میں منتقل ہوئے اور جن کے گہرے اثرات انسانی سماج پر مرتب ہوئے۔

ہیریٹ الزبتھ چیچر سٹوڈ ایک پادری لیمن چیچر کی بیٹی تھی جو ۱۲ جون ۱۸۱۱ء کو لیچ فیلڈ میں پیدا ہوئی۔ وہ چار برس کی تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ۱۸۱۵ء میں ہو گیا اس کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اور اس کی بڑی ہمیشہ کی تھرائن نے اپنے ذمے لی جس نے بعد میں ہارٹفورڈ میں ایک سکول قائم کیا۔ جس میں داخل ہونے والی پہلی طالبہ علم ہیریٹ چیچر سٹوڈ تھی اور اسی سکول میں اس کے بعد ہیریٹ سٹوڈ نے خود بھی معلم کے فرائض سرانجام دیے۔ اس کے والد نے ایک زمانے میں اپنا گرجا اور فرائض چھوڑ کر سنسٹیٹ میں لیمن مٹیا لورجی سینارمی میں سربراہ کے فرائض سنبھال لیے۔ ہیریٹ کی بڑی بہن کی تھرائن اپنے والد کے ہمراہ چلی گئی۔ کیونکہ وہ مزید مطالعے اور تجربے کے بعد ہارٹفورڈ میں عورتوں کا ایک کالج قائم کرنے کی بڑی خواہاں تھی۔ ہیریٹ نے اس عظیم کام میں اپنی بہن کا ہاتھ بٹایا۔ بڑی لگن کا مظاہرہ کیا۔

اسی زمانے میں ہیریٹ نے کہانیاں خاکے اور مضامین لکھنے شروع کیے جو مقامی اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔

۱۸۳۶ء میں اس نے سینارمی کے ایک لیکچرار کالون اسٹوڈ سے شادی کی۔ پادری کالون ایلس سٹوڈ ایک زندہ اور سچی روح کا مالک تھا۔ وہ امریکہ میں جہشوں کی غلامی کے خاتمے کا زبردست حامی تھا اور اسے امریکہ کے ماتھے پر ایک بدناما دھبہ سمجھتا تھا۔

شادی کے بعد ہیریٹ نے تحریر و تقریر کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۴۳ء میں اس کی ایک تصنیف

AMONGS DESCENDANTS OF THE PILGRIM "

شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مطالعہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ امریکی زندگی کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

ہیریٹ پیچرسٹو نے اپنی زندگی کے اٹھارہ برس سنائی میں گزار دیے تھے اس زمانے میں اس کا رابطہ کچھ مفروضہ عدیشی غلاموں سے پیدا ہوا۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بدولت اس نے دیکھا کہ جنوبی امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ کتنا غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کس طرح سفید نام خدا بنے بیٹھے ہیں۔ ان تجربات و مشاہدات نے ہیریٹ پیچرسٹو کو حبشیوں کی غلامی کا کٹروٹھن اور آزادی کا حامی بنا دیا۔

یہ نیک دل عورت جو خالص مذہبی ماحول میں پیدا ہوئی پروردان چڑھی جس کا باپ پوری تھا جس کا شوہر پوری تھا۔ اس نے اپنی مذہبیت کو انکل ٹامز کیسین میں ہی ایک نسبی معنویت کے ساتھ چھپا لیا بسایا ہی نہیں ہے بلکہ وہ فخریہ کے ثبوت پہلوؤں کو سامنے رکھتی ہے ورنہ امریکہ ہی کے پادری اور مذہبی رہنما تھے جنہوں نے حبشیوں کو شیطان کی اولاد قرار دیا تھا۔ غلامی کو جائز ثابت کیا تھا۔ مذہبی علماء اور پادریوں نے ہی حبشیوں کی غلامی کے ادارے کو اپنے فتوؤں سے استحکام بخشنے میں ایک نمایاں ترین کردار ادا کیا تھا۔ ایسے ماحول میں ہیریٹ پیچرسٹو کا انحراف بڑی انقلابی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔

۱۸۵۰ء میں ہیریٹ کے خاوند کو بوڈون کالج برنسویک میں پروفیسر کا عہدہ دیا گیا۔ اور یہیں برنسویک ہی ہیریٹ پیچرسٹو نے اپنا عظیم تخلیقی ناول انکل ٹامز کیسین یعنی LIFE AMONG THE LOWLY لکھنا شروع کیا۔ اس ضمنی عنوان سے ہی اس کے موضوع کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ ضمنی عنوان ایک دوسری حقیقت کی بھی غمازی کرتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے ہم رنگ سفید فاموں کو مذہبی پیغام بھی پہنچانا چاہتی ہیں کہ وہ صرف سماجی، عمرانی اور انسانی سطح پر ہی حبشیوں کی غلامی کے خلاف نہ تھکتی بلکہ مذہبی تعلیمات و اعتقاد کے اعتبار سے بھی وہ غلامی کو غلط اور گناہ سمجھتی تھی۔

اس زمانے میں ایک اخبار نیشنل ایرا (NATIONAL ERA) شائع ہوا تھا

جو غلامی کے خلاف تھا۔ یہ اعزاز اسی روز نامے کو حاصل ہوا کہ اسی میں انکل ٹامز کیبن قسطاً شائع ہونا شروع ہوا۔ نیشنل ایریا اسٹنگٹن سے شائع ہوتا تھا۔

مارچ ۱۸۵۲ء میں یہ ناول پہلی بار کتابی صورت میں منصفہ شہود پر آیا۔ اپنی اشاعت کے ساتھ انکل ٹامز کیبن کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور مخالفوں نے بھی پڑھا۔ بعد میں اس ناول کے ترجمے دنیا کی بائیس زبانوں میں ہر خطے میں اس ناول کو مختلف ادوار میں قارئین نے پڑھا۔ اردو میں میں نے ایک مجید احمد غلط سا ترجمہ کتابی صورت میں دیکھا تھا وہ ترجمہ اتنا غیر موثر تھا کہ مجھے مترجم کا نام بھی یاد نہیں رہا۔

دنیا میں بہت کم کتابوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایسے وقت شائع ہوئی ہوں کہ جس زمانے میں واقعی انہیں شائع ہونا چاہیے تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اہم تخلیقی کام یا تو وقت سے پہلے شائع ہوئے یا پھر بعد میں۔ انکل ٹامز کیبن ایک ایسے زمانے میں شائع ہوا جو اس کی اشاعت کے لیے موزوں اور بر محل تھا۔ امریکہ میں غلامی کے حق اور مخالفت میں ایک ہنگامہ باہم ملک خانہ جنگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

اس ناول پر معتبر ناقدوں اور معتصب قارئین نے بڑے شدید حملے کیے۔ انہیں بند کرنے کے منافعانہ زندگی بسر کرنے والے بہت سے لوگوں نے اس ناول پر یہ اعتراض کیا کہ جس طرح کی زندگی حبشی کردار ناول میں بھر کرتے دکھائے گئے ہیں۔ وہ غلط جھوٹ اور مبالغہ آمیزی سے مملو ہے۔ حبشی تو بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی حالت پر مطمئن ہیں۔ اور غلامی میں ہی اپنی نیجات سمجھتے ہیں اور چونکہ وہ رنگت اور ذہن کے اعتبار سے غلامی کی زندگی کے علاوہ کسی قسم کی زندگی بسر کرنے کی اہلیت اور صلاحیت سرے سے رکھتے ہی نہیں۔ اس لیے یہ ناول گمراہ کن، جھوٹ کا پلندہ اور بکواس ہے۔

ابراہام لنکن نے اس ناول کو پڑھا اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ غلامی کے خلاف اس کے جذبات میں مزید قوت اور شدت پیدا ہوئی اور وہ غلامی کے خاتمے کے فیصلے پر ڈٹ گیا۔

انکل ٹامز کیبن کے خلاف جو کچھ سکانڈانہ اندازہ میں لکھا گیا اور اس کی صداقت پر

جو کچھ اچھا لایا اور حلقے کے گئے اس کے جواب میں ہیریٹ بیچر نے ایک کتاب KEY TO UNCLE TOM'S CABIN لکھی۔ اس کتاب کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ اس کتاب میں ہیریٹ بیچر سلوڈنے واقعاتی اور مستند شہادتوں اور دستاویزات سے ثابت کیا کہ امریکہ میں حبشی غلاموں کی حالت کتنی ناگفتہ بہ ہے اور غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔

فیض صاحب نے لکھا ہے کہ بڑے لکھنے والے پر مجاہدہ بھی فرض ہوتا ہے۔ ہیریٹ بیچر سلوڈ نے حبشیوں کی غلامی کے خلاف آواز ہی نہیں اٹھائی۔ ایک بڑی تخلیق کوہی جنم نہیں دیا۔

لوگوں کے اعتراضات کو ہی برداشت نہ کیا بلکہ عملی سطح پر بھی وہ غلامی کے خلاف میدان میں نکل کھڑی ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں اس نے یورپ کا سفر کیا جس کا صرف ایک مقصد تھا لاپنی ہم جنس سفید نام انگریز عورتوں پر اذیت کر کے کہ غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔ وہ حبشیوں کے لیے لوگوں اور بالخصوص عورتوں کے دلوں میں جذبہ ہمدردی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں شائع

ہونے والی اس کی تصنیف DRED-TALE OF THE DISMAL SWAMP اپنی جگہ بصرت افزہ مطالعہ ہے اس فن پارے میں ہیریٹ بیچر سلوڈ نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ معاشرہ اور سماج کس طرح تباہ اور مسخ ہو کر رہ جاتا ہے جو غلامی کو برداشت کرتا ہے۔

ہیریٹ بیچر سلوڈ کا بھائی ڈارڈ بیچر بھی لکھنے والا اور صحافی تھا۔ اپنی بہن کی بیشتر تصانیف اسی نے شائع کی تھیں۔ وہ خود بھی غلامی کا شدید مخالف اور دشمن تھا۔ ہنری ڈارڈ بیچر کو سپین یونین کا ایڈیٹر بھی رہا۔ اس دور میں بھی امریکہ کا مشہور جریدہ "اسٹارنگ" شائع ہونا شروع ہوا۔ ہیریٹ بیچر سلوڈ اس کی مستقل لکھنے والی تھی۔

"انکل ٹامز کیبن" کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ ہیریٹ بیچر سلوڈ کی کسی دوسری کتاب کو تو حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم اس کی کہی کتابیں شائع ہوئیں جن کو دل چسپی سے پڑھا گیا۔ ہیریٹ بیچر سلوڈ بہت اچھی داستان گو بھی تھی۔ جب وہ ادب حلقوں اور دیگر تقریبات میں اپنی تحریروں کو سنایا کرتی تو ایک سماں بانڈھ دیتی تھی۔

۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۲ء تک ہیریٹ بیچر سلوڈ اپنے شوہر کے ساتھ اینڈرو میسا پولس میں رہی جہاں ایک سینما میں اس کا خاندان پروڈیوسر تھا۔ اس کے بعد یہ گھرانہ ہارٹفورڈ منتقل

ہو گیا۔ امریکہ میں جو خانہ جنگی ہوئی اس میں ہیریٹ بیچر سٹوڈ کے بیٹے نے بھی ابراہام لنکن کی فوجوں کا ساتھ دیا اور جنگ میں حصہ لیا۔ وہ کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا اور خانہ جنگی میں شدید زخمی ہوا۔ خانہ جنگی کے ختم ہونے کے بعد وہ لوگ فلوریڈا چلے آئے۔ جہاں کی آب و ہوا زخمی بیٹے کے لیے مفید تھی۔ ۱۸۶۸ء میں HEARTH AND HOME نامی ایک جریدہ کے آغاز کیا۔ جس کا مدیر ڈونالڈ ایم چیل تھا۔ ہیریٹ بیچر سٹوڈ کے شوہر نے بطور مصداق مدد اس پرچے میں شرکت کی۔ ۱۸۸۶ء میں ہیریٹ بیچر سٹوڈ کے شوہر کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد ہیریٹ عورت نشین ہو گئی۔ اور ہارڈ ڈو جالبسی۔ تقریبات اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا ترک کر دیا اور یہیں یکم جنوری ۱۸۹۶ء کو وہ انتقال کر گئی۔ اور اسے اسکے خاوند کے پہلو میں اینڈر وڈ میں دفنایا گیا۔

”انگل ٹامز کین، ایک ایسا ناول ہے جو نہ صرف غلامی کے خلاف شدید ترین تضحیتی احتجاج بلکہ انسانوں کی منظمی کی ایک۔ ایسی سچی دستاویز ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس ناول کا مرکزی کردار ٹام ایک نیک دل، اطاعت گزار، مذہبی جمعی ہے۔ سارا ناول اگرچہ اس کے گرد گھومتا ہے۔ اس کا لکڑی کا چھوٹا سا کین بظاہر ایک چھوٹی سی دنیا کی طرح کا ہے لیکن یہ اس پورے امریکی سماج کا احاطہ کرتا ہے جہاں جمعی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا جینا اجیرن ہو چکا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ان کی روحوں تک کو غلام بنانے کی جاہلانہ کوشش کی گئی ہے اور اس میں بڑا اور حاکم سفید فام معاشرہ کامیاب رہا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتے۔ اپنے گھر آباد نہیں کر سکتے۔ ان کے کنبے کو جب سفید فام آقا چاہے تتر بتر کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جگہ گوشوں کو اپنا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ پیدا نشی غلام ہیں۔ ان کی بہنوں اور بیویوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں۔ کیونکہ سفید فام آقا جب چاہے اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔

اتنی مجبوری اور بے کسی کے باوجود وہ احتجاج کرتے ہیں۔ زندہ رہنے کا سچی حاصل کرنے کے لیے وہ غلام آقاؤں کی گرفت سے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرار کے منصوبے

تے ہیں اور آزادی کیلئے غلامی سے فرار کی راہ میں مارے جاتے ہیں۔
 ”انکل ٹامز کیسین“ حبشیوں کی زندگی کے سارے دکھوں اور غلامی کی بدترین لعنت کا
 بھری پورا اور موثر ترین مرقع ہے۔

آج جب اس ناول کے حوالے سے میں سوچتا ہوں تو ہیریٹ بیچر سٹوڈ کی جرات مندی پر
 حیرت ہوئی ہے کہ وہ خود مذہبی خاتون تھی اور ایک ایسے مذہب سے وابستہ تھی جس کی
 تعلیم یہ ہے کہ تمہارے ایک رخصت پر کوئی تھپڑ مارے تو اس کے آگے دوسرا رخصت کر دو۔
 اگر تمہیں کوئی میل بیگار پورے جاتے تو تم اس کے سامنے دو میل جاؤ۔ ایسے مذہبی عقائد پر ایمان
 رکھنے والی ہیریٹ بیچر سٹوڈ نے غلامی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور اس ناول کے ذریعے اس
 مذہب کے ماننے والوں کو یہ سمجھایا کہ غلامی لعنت ہے۔ غلامی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ یہ
 انسانیت کی توہین ہے۔

”انکل ٹامز کیسین“ اپنی اس جرات مندانہ نگار شہزادہ کی وجہ سے آج بھی بڑا ناول
 ہے۔ اور ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی تاریخ اور تقدیر کو بدلنے میں
 نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

دورنگ ہائٹس

۱۹۸۲ء کے اداسل میں مجھے ایک خاتون کا سفر نامہ پڑھنے کا موقع ملا۔ خاتون سفر نامہ نگار نے ایک پروگرام کے مطابق اس علاقے کی سیوریساحت کا منصوبہ بنایا تھا۔ جہاں ایلی بروٹے پیدا ہوئی اور جہاں اس کے ناول، دورنگ ہائٹس کے کردار کبھی زندہ تھے۔ گویا اس خاتون نے اس علاقے کو اپنی سیاحت کے لیے منتخب کیا تھا جو دورنگ ہائٹس، کالینڈ سکیپ ہے ۱۹۸۲ء میں یہ خاتون سفر نامہ سخریرکرا کے چھپوا چکی تھیں۔ اس خاتون نے اس سفر نامے میں سب سے زیادہ جن باتوں پر حیرت کا اظہار کیا۔ وہ یہ تھیں۔

انگلستان کا یہ حصہ اب بھی انگلستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں پسماندہ ہے اب بھی یہاں کے لوگ پرانے انداز کی روایتی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہاں عزت بھی نہیں ہے۔

اس خاتون سفر نامہ نگار نے اس حقیقت کی نشاندہی بھی کی ہے۔ آج بھی اس علاقے کا موسم اتنا ہی غیر یقینی اور تند و تیز ہے جتنا کہ ایلی بروٹے کے ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ لوگ اکھڑ اور بد مزاج ہیں۔ زیادہ گھٹنا ٹھاپند نہیں کرتے۔ گویا وہ علاقے جو ایلی بروٹے کے ناول "دورنگ ہائٹس، کالینڈ سکیپ ہے۔ وہ حقیقی ہے۔ اسی حالت میں موجود ہے۔ جس طرح اس کا ذکر ایلی بروٹے نے کیا تھا۔

ایلی بروٹے کے ناول "دورنگ ہائٹس" کا آغاز اس جیلے سے ہوتا ہے۔

۱۸۰۱ء... یہ بنگلہ جس کا نام گرینچ ہے۔ میں نے اسے حال ہی میں کرائے پر حاصل کیا

ہے۔ شہروں کے ہنگاموں اور شہر شرابوں سے دور رہنے والوں کے لیے انگلستان بھر میں اس سے زیادہ خوب صورت اور پرسکون جگہ شاید ہی کہیں ہو۔۔۔۔؟

۱۸۱۱ء سے اب تک وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہے۔ دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ لیکن وورنگ ہائیٹس کالینڈر سکوپ نہیں بدلا۔ فطرت وہاں اسی طرح دکھائی دیتی ہے جس طرح اس ناول میں ظہور پذیر ہوئی۔ اور وورنگ ہائیٹس آج بھی ایک سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

ورنگ ہائیٹس - عشق باغیز کی داستان ہے۔ پاگل کر دینے والا عشق۔ جو انسانوں میں محبت اقدار کو دبا کر منفی اقدار کو نمایاں کرتا ہے۔ جو ایسا وحشی جذبہ بن کر سامنے آتا ہے کہ انسانوں کو ان کی سطح سے گرا کر وحشیوں اور جانوروں کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے۔ وورنگ ہائیٹس کا مطالعہ ایک ناقابل فراموش تجربہ ہے۔ اس میں ایسے ایسے جذبات معمور ہیں جن کو صرف حواس ہی محسوس کرتے ہیں۔ اور اس تجربے کو بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک گہرا دل میں بس جانے والا حیران کن حد تک الٹا دکھانا دل ہے۔ اس کے کرداروں کے بارے میں پڑھنے والوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی تعبیر کیا کریں۔ یہ قوی لیکن متضاد جذبوں کا پیکر ہیں۔ اور ان میں ایسے نفرت کرنے والے عناصر بھی گندھے ہوئے ہیں جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کردار انسان ہیں جو کچھ نہیں دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے بارے میں تاثر دیتے ہیں۔ وہ دراصل ان کے کرب کی پیداوار ہیں۔ یہ ایسے کرب سے گزرے ہیں جس کا احوال دنیا کے بڑے ادب کے فن پاروں میں کم ہی ملتا ہے۔

ورنگ ہائیٹس، ایک ایسا ناول ہے جس کا سکہ ایک صدی سے زائد عرصے سے رائج ہے۔ اور وقت کے گزرنے اور زمانے کی تبدیلیوں نے اس سکے کو دھنڈلایا ہے نہ اسے بے وقعت بنایا ہے۔ بلکہ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے اس سکے کی قیمت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ورنگ ہائیٹس، ایک ایسا ناول ہے جس کی عالمگیر کشش کو ہر قاری نے محسوس

کیا ہے۔ اس پر مبنی کئی بار ٹی وی ڈرامے لکھے اور پیش کیے جا چکے ہیں۔ ریڈیو کے لیے اسے بار بار دنیا بھر میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر مبنی کئی بار فلمیں بن چکی ہیں۔ جن میں وہ فلم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس میں سر لارنس اولیور نے ہیتھ کلیف کا کردار ادا کیا تھا۔ ٹیکسٹر کے بعض لازوال کرداروں کی طرح ہیتھ کلیف بھی ایک ایسا کردار ہے جسے دنیا کے بڑے فنکار اپنے لیے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے اسے ادا کرنے کی خواہش دل میں رکھتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے اردو میں میں نے اس ناول کے دو تراجم پڑھے ہیں۔ ایک ترجمہ سید قاسم محمود کا ہے جو خاصے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ اچھا نہیں ہے۔ اصل میں ان کرداروں کی زبان ایسی ہے کہ اسے کسی زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ پھر اس ناول میں ایک جاندار کردار جو زف کا ہے جو اس گھرانے کا لازم ہی نہیں بلکہ بہت سے امور میں دخل بھی ہے۔ جو زف جس انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کے لہجے میں جو کاٹ استہزا اپنی برتری اور دوسروں کے لیے حقارت گھلی ملی ہے۔ وہ لہجہ اردو میں منتقل کرنا تو ایک طرف دوسری زبانوں میں ہی منتقل کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔

”دورنگ ہائیٹس“ کا دوسرا ترجمہ سیف الدین حسام ایم اے نے کیا ہے۔ ترجمے کو رذاں دو ان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بے ربطی کا شکار ہے۔ کہانی کا تعلق ۱۸۰۱ء میں ہے۔ یہ ترجمہ کامل ہے کہ اس نے ترجمے میں اپنی طرف سے ”جیٹ طیاروں“ کا بھی ذکر کر دیا ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ اس زمانے میں جیٹ طیارے تھے ہی نہیں تو ان کے حوالے سے کوئی مثال کیسے دی جا سکتی ہے۔!

دورنگ ہائیٹس کی مصنفہ ایلن بروئٹے۔ بروئٹے کس سرورز میں سے ایک ہے اور جہاں ایک بہن کا ذکر ہر وہاں باقی بہنوں کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

ایلن بروئٹے اپنی دوسری نامور بہن شارلٹ بروئٹے کی طرح تھارنٹن پارک سائٹ میں پیدا ہوئی۔ ایلن کی تاریخ پیدائش ۲۰ اگست ۱۸۱۸ء ہے۔ وہ صرف تیس برس زندہ رہی اور اپنی مختصر سی عمر میں اسنے بڑے مصائب کا سامنا کیا۔ وہ پادری باپ کی بیٹیاں تھیں اور ان کی ماں

ایک کورنٹھ خاتون تھی۔ ان سب بیٹیوں کی زندگی عزت کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد کی داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت یہ خاندان ہارنٹھ منتقل ہو چکا تھا۔ سات برس کی عمر میں شارٹ سکول میں داخل کرانی لگئی۔ اسی سکول کو شارٹ برونس نے اپنے ناول "جین آرٹر" میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ شارٹ کی طرح ایملی اور این بھی شدید بیماری میں مبتلا رہیں۔ وہ اعصابی تکلیف میں مبتلا رہتی تھیں۔ ان بہنوں کو سپرٹ پلانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ایملی نے ایک عرصے تک گورنس کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ لیکن یہ کام پسند نہ آیا۔ کچھ عرصے کے لیے یہ نہیں برسوز بھی رہیں۔

قدرت نے ان بہنوں کو تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں تینوں بہنوں نے شاعری کی ایک کتاب شائع کی یہ ان تینوں بہنوں شارٹ۔ ایملی اور این۔ برونسے کسٹرز کی نظموں کا مجموعہ تھا۔ اس نظموں کے مجموعے نے ادبی دنیا میں کوئی پہل چل پیدا نہیں کی۔ اس مجموعے کی ناکامی نے ان بہنوں کو مشترک طرف مائل کیا اور وہ ناول لکھنے لگیں۔ شارٹ کا پہلا ناول "پروفیسر تھا۔ این کا پہلا ناول "ایگس گری" تھا۔ ان دونوں ناولوں کی خاص پذیرائی نہیں ہوئی۔ ایملی برونسے کو زندگی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کوئی دوسرا ناول لکھ سکے۔ اس کا پہلا اور آخری ناول "ورنگ ہائیس" ہے اور اس ناول نے ہی اسے زندہ جاوید کر دیا۔ ان تینوں بہنوں کے جھانی یار لاپل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو سدا کا بیمار تھا۔ لیکن بڑی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ تینوں بہنوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو چمکانے میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔

برونسے کسٹرز میں دو بہنوں نے اپنے اپنے ناولوں کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی ہے۔ شارٹ کا ناول "جین آرٹر" اور ایملی برونسے کا ناول "ورنگ ہائیس" عالمی ادب کے اہم اور مقبول ترین شہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

۱۹ دسمبر ۱۸۴۸ء کو ایملی کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں بہت دکھ سے ایسا لگتا ہے کہ اس نے جو کربناک زندگی بسر کی اس کا سارا کرب اپنے اس اکلوتے واحد شاہکار

ناول "دورنگ ہائیس" میں بھروبا۔

"دورنگ ہائیس" میں ناول کا قصہ پہلے تو گریچ کو کرانے پر حاصل کرنے والے مسٹر لاک وڈ کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ مسٹر لاک وڈ کے حوالے سے ہیں اس ناول کے اہم کرداروں سے ملایا جاتا ہے۔ ماضی کی داستان ایک ملازمہ نیل سناتی ہے اور اس کے اہتمام کو پھر مسٹر کلارک وڈ کے ذریعے سامنے لایا جاتا ہے۔

عشق بلاخیز کی اس داستان میں ہیٹھ کلیف ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا باپ کون ہے ایسی کی ماں کون ہے۔ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا علیہ بھی اس علاقے کے لوگوں سے مختلف ہے۔ اسے تو سڑک سے اٹھا کر لایا جاتا ہے۔ اور ایک خاندان کا فرد بنا دیا جاتا ہے۔ وہ منصف المزاج ہے اور بعد میں لالچی بھی بن جاتا ہے۔ جس جس نے اسے دکھ پہنچایا ہے اس سے اہتمام لینا اور اس کو تباہ و برباد کر دینا اس کی جائداد پر قبضہ کر لینا۔ اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنا اس کا کردار بن چکا ہے لیکن وہ خود بہت دکھی ہے وہ محبت میں ایک ایسا چرکا کھا چکا ہے۔ جس نے اس کی روح کو زخمی کر دیا ہے۔ اس زخم کا کوئی ادا نہیں۔ کوئی علاج نہیں یہ زخم سدا رسا رہے گا اور جب تک وہ ہمارے حافطوں میں محفوظ ہے۔ جب تک ہم اس ناول کو پڑھتے رہیں گے۔ ہیٹھ کلیف مرنے کے بعد بھی دکھی ہی محسوس ہوگا۔

عشق بلاخیز کی یہ داستان۔ کبھی کی داستان ہے جو ٹوٹ کر اس وحشی سے محبت کرتی ہے فرنا اس کا مقدر ہے۔ لیکن بہت دکھ سہہ کر۔ بہت رنج و بیچہ کر۔ وہ ہیٹھ کلیف سے شادی نہیں کر سکتی۔ شادی اس کی ایک نرم خور بیٹھ کلیف سے بالکل مختلف شخص کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ ہیٹھ کلیف کو اپنے ذہن سے اپنی روح سے نہیں نکال سکتی۔ اس کے عشق کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کی تمام برائیوں، اس کی تمام تر خامیوں سے آگاہ ہے۔ ان کا اسے پورا شعور ہے لیکن وہ اس پر ہی مرتی ہے۔ بلے شاہ نے کہا تھا۔

رانجھا رانجھا آہندی نی میں آپے رانجھا ہئی

بالکل اسی طرح کا تجربہ کبھی تو عشق میں ہوا ہے۔ وہ محبت اور جذب کے اس مقام پر پہنچی

ہولی ہے جہاں وہ کستی ہے۔

- میں ہیتھ کلیف ہوں۔

وہ ایڈگر سے شادی کرنے کا تہیہ کر چکی ہے اور ایڈگر سے شادی کر بھی لیتی ہے۔
لیکن اس شادی کو وہ اپنے محبوب سے جدائی نہیں سمجھتی۔ جب ملازم نیلی اسے کہتی ہے
کہ اس کے اس فیصلے سے ہیتھ کلیف تمہارا رہ جائے گا تو کیسے کہتی ہے۔

”کون جدا کر سکتا ہے ہمیں جب ہم میرے دل کی دھڑکنیں زندہ ہیں جیٹیک سائس
آ رہی ہم جہاں نہیں ہر سکتے۔ ہیتھ کلیف کی ہستی تو میرے انگ میں سمائی ہوئی ہے۔
ہیتھ کلیف سے میری محبت ان چٹانوں کی طرح ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن جن
پر یہ دھرتی کھڑی ہے جن کے بغیر اس کائنات کا وجود ہی نہیں ہے۔ نیلی۔ میں خود ہیتھ کلیف
ہوں۔ اس لیے کہ میری انگوں میں وہ چمک رہا ہے۔ میرے دل میں وہ دھڑک رہا ہے
میرے خون کی گردش کا باعث وہ ہے۔“

ہیتھ کلیف۔ اس گھر کا پروردہ ہے۔ کیسے کا باپ اسے شہر کی ایک گلی سے اٹھا کر لایا
مقا۔ اس کے حسب نسب کا کسی کو علم نہیں۔ کیسے کا بھائی اس سے خار کھاتا ہے
لیکن کیسے اس پر مر مٹی ہے۔ ہیتھ کلیف ہر ظلم سہتا ہے۔ اس کا مرنی مر چکا ہے۔ اور اس
کے وارث کیسے کے بھائی نے اس کا درجہ گھٹا کر ملازم بنا دیا ہے۔ وہ گندہ رہتا ہے لیکن
اس گندے وحشی کے عشق میں کیسے ڈوب چکی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ کیسے منذب
ایڈگر سے رہ و رسم بڑھا رہی ہے تو وہ ایک دن وہاں سے نکل جاتا ہے۔ کیسے اس کی
جدائی میں مرتے مرتے سچی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہیتھ کلیف کہاں گیا ہے۔ جب وہ
واپس آتا ہے تو وہ دولت مند ہے۔ منتقم مزاج بن چکا ہے۔ وہ کیسے کے بھائی کو جوئے میں
لوٹا ہے اور دو رنگ بیٹیس اور ساری جاہلاد پر قابض ہوتا اور اس خاندان کے افراد کو اپنا
غلام بنانا چلا جاتا ہے۔ اس کا ذہن اب شیطان کے ذہن کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ انتقام
لیتا ہے۔ بہت خوفناک انتقام۔ وہ کیسے کی نند کو درغلاتا ہے۔ اسے لے مہاگتا ہے اس
سے شادی کر لیتا ہے۔ اس پر ظلم و ستم توڑتا ہے اور پھر ایک ایسے بیٹے کا باپ بنتا ہے جو

لاغر دکڑور ہے جس کے بارے میں ہر لمحے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرنے والا ہے۔ کیسیتی ایک بچی کو جنم دے کر مر چکی ہے۔ ساری جائیداد پر قبضہ کرنے اور انتقام لوہرا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ کیسیتی کی بیٹی سے اس کے بیٹے کی شادی ہو جو لاغر دکڑور ہے۔ وہ اپنے مہرے آگے بڑھاتا ہے اور کامران ہو جاتا ہے۔ اب اس کا انتقام لوہرا ہو چکا ہے اس کا بیٹا کیسیتی کی بیٹی سے شادی کرنے کے بعد اپنے باپ۔ بہتہ کلیف کے نام ساری جائیداد منتقل کر کے مر چکا ہے۔

انتقام کی آگ بجھانے کے باوجود بہتہ کلیف ایسے کرب میں مبتلا ہے جس نے اسے اکھڑ بنا دیا ہے جو اسے راتوں کو گھر سے باہر رکھتا ہے جو اسے ایک پل چین نہیں لینے دیتا کیسیتی کی شکل اس کو ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کی محبوبہ مرگ بھی اس کے لیے زندہ ہے اس کے سامنے آتی ہے۔ اس سے باتیں کرتی ہے۔ وہ عشق بلاخیز میں بہتا چلا جا رہا ہے اس عشق کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ بہتہ کلیف اپنی محبوبہ کی قبر کھدواتا ہے۔ وہ نیلی۔ ملازمہ سے کہتا ہے:

میں نے گورکن لڑکے کو راضی کر لیا کہ وہ کیسیتی کے کفن سے مٹی اکھاڑ دے۔ اس نے مٹی پرے کی تو میں نے کفن کھول لیا۔ کیا بتاؤں نیلی.... اٹھارہ سال بعد بھی وہ بالکل ایسے لیٹھی تھی جیسے ابھی ابھی دفن کی گئی ہو۔ گورکن لڑکے نے مجھے جلدی سے کفن بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں نے ڈھکن بند کر دیا۔ لیکن تابوت کے ایک پہلو کے تختوں کے پیچ کھول کر تختہ الگ کر دیا۔ میں نے گورکن لڑکے کو خاصی رقم دی ہے اس کو رضامند کر لیا ہے کہ جب میں مروں تو مجھے کیسیتی کی قبر کے اس پہلو میں دفنایا جائے جدھر سے اس کے تابوت کا درمیانی تختہ میں نکال چکا ہوں۔ میرے تابوت کا تختہ بھی نکال دیا جائے گا۔ میں کیسیتی کے قرب میں دفن ہوں گا۔

اٹھارہ برس کے بعد بہتہ کلیف کو چین آیا ہے۔ اس کے عشق کی انتہا کا تصور یہ ہے کہ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس نے اپنا رخسار کیسیتی کے رخسار پر رکھا ہوا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہے....!

یہ ہتھیہ کلیف روحوں پر سی یقین نہیں رکھتا۔ بلکہ اس مجھے عشق نے اسے یہ اعتماد بھی بخشا ہے کہ جب تک وہ اپنی محبوبہ کے پہلو میں دفن نہ ہوگا اس کی محبوبہ کیسے ہی کی لاش بالکل صحیح حالت میں برقرار رہے گی۔ اسے مٹی اس وقت تک نہ لگے گی جب تک وہ خود اس کے پہلو میں دفن نہیں ہو جاتا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سوتے ہوئے خاک بن جائیں گے۔

جس بروز کیسے ہی کو دنیا یا گیا۔ وہ رات طوفانی رات تھی۔ اس رات وہ قبرستان میں چلا گیا تھا اور اس نے قبر کھود کر اپنی مردہ محبوبہ سے بغل گیر ہونے کی خواہش کی تھی۔ طوفانی رات میں اسے اپنی محبوبہ کا ہیرو لہ قبر سے باہر دکھائی دیا تھا۔ یہ سب عشق کے کرشمے ہیں۔ عشق جو بلا خیر ہے جو ایسے کرب سے آشنا بھی ہو جاتا ہے کہ روحانیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

دورنگ ہائیس، دنیائے ادب کا عظیم تخلیقی کارنامہ ہے یہ اس لیے بھی بڑا فن پارہ ہے کہ اس کی خالق نے بھی کرب نامک زندگی بسر کی تھی اور وہ سارا کرب اس ناول میں منتقل ہو جاتا ہے۔

اس عشق میں وہ معنی قوتیں شامل ہو جاتی ہیں جنہوں نے ہتھیہ کلیف کو حسی بنا دیا ہے لیکن اسے اپنی بے انصافی کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قابض ہو کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا بیٹا مر چکا ہے۔ بیوی مر چکی ہے۔ محبوبہ مر چکی ہے۔ وہ نیم دیوانہ ہو چکا ہے اس کی محبوبہ اسے جاگتی آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔ صرف موت ہی اس کو تسلی اور سکون بخش سکتی ہے۔

دورنگ ہائیس، مقامی لوگوں کی زبان میں اس جگہ کو کہتے تھے۔ جہاں اندھیان جلتی ہوں۔ ہوائیں جھنپتی ہوں۔ طوفان آتے ہوں۔ دورنگ ہائیس، ناول بھی عشق کے طوفان اور عشق کی اندھی کا قصہ ہے۔ !!

فادر اینڈ سنز

انقلاب روس سے پہلے کے لکھنے والوں میں ترگنیف کا شمار انسانی، گوگول اور دوستوئیفسکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور لینن نے ترگنیف کو اپنی تحریروں میں کئی بار سراہا اور لینن نے روسی زبان کے حوالے سے ترگنیف کو اس طرح بھی خراج تحسین پیش کیا تھا کہ ترگنیف کی زبان، عمدہ عظیم اور شاندار ہے۔

یہ ایک بڑی حقیقت ہے جس کا اعتراف لینن نے کیا تھا۔ روح انسانی اور مناظر فطرت کی تصویر کشی کے کمال کے ساتھ ساتھ ترگنیف کے یہاں اسلوب کی سادگی اور صفائی، طلاقت اور فصاحت، بیان اور زبان کی صحت اور موسیقیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے ترگنیف کی تخلیقات روسی ادبی زبان کے ارتقا میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ بیان روس کے ایک ماہر لسانیات پیٹرون کا ہے۔ حواد پر درج کیا گیا ہے۔

یوں تو ترگنیف کی ہر تخلیق معرکے کی ہے جن کا ذکر اجمالاً آئے گا۔ لیکن اس کے ناول 'باپ اور بیٹے'، 'فادر اینڈ سنز' کو عالمی ادب کا شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنی اشاعت سے آج تک اس ناول کے تراجم دنیا بھر کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور اس ناول کے حوالے سے روس اور مغرب میں ایک بڑی تحریک نے بھی جنم لیا ہے جسے Nihilism کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی ہر چیز کی نفی کرنا۔ انحراف میں اقرار تلاش کرنا اور نفی میں اثبات... اس طرز فکر اور تحریک کے ڈانڈے اگرچہ تشکیک سے چاٹتے ہیں لیکن دونوں میں ایک خاص سطح کا نازک فرق بھی ہے۔

بعض نقادوں نے بعض دیگر خصوصیات کی وجہ سے ترگنیف کے ایک دوسرے بڑے ناول NEST OF THE GENTRY کو فادرز اینڈ سنز سے بڑی تخلیق قرار دیا ہے (خود روس میں ایک عرصے تک "فادرز اینڈ سنز" پر کڑی تنقید ہوتی رہی، لیکن NEST OF THE GENTRY ایک بڑی تخلیق اور بڑا ناول ہونے کے باوجود "فادرز اینڈ سنز" سے بلند اور عظیم نہیں، جو ہمہ گیر معنویت "فادرز اینڈ سنز" میں ہے۔ وہ دنیائے ادب کے بہت کم شاہکاروں کا مقدر سہی ہے۔

ہماری اردو زبان میں "فادرز اینڈ سنز" کا ترجمہ "نئی پود" کے نام سے انتھار حسین شائع کرا چکے ہیں۔ اس ترجمے کی دہری خوبی یہ ہے کہ معنویت اور روح تو اس میں اصل ناول کی ہی لیکن ترجمہ انتھار حسین نے اپنی مخصوص زبان میں مخصوص انداز سے کیا ہے۔ یوں یہ ترجمہ پڑھ کر ترگنیف کے ناول سے بھی خاصا اچھا تعارف ہو جاتا ہے۔ اور انتھار حسین کی خاص زبان کا ذائقہ بھی!

ترگنیف - ۹ نومبر ۱۸۱۸ء کو اورال میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین کا تعلق کھانتے پیتے زمیندار اشرافیہ طبقے سے تھا۔ اس خاندان کی اچھی خاصی جاگیر داری تھی۔ اور اس دور کے زرعی غلاموں (BERFS) کے بغیر تصور بھی نہیں جاسکتا۔ ترگنیف کے آباؤ اجداد بھی زرعی غلاموں کے مالک تھے۔ ترگنیف کی والدہ ایک سچی جاگیر داری تھی۔ ان زرعی غلاموں کے ساتھ جو سلوک اس جاگیر داری نظام میں روا رکھا جاتا تھا۔ یہ غلام بھی اسی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ترگنیف کی والدہ پیردرخانہ وغلاموں کو چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر کوڑے مارا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنے تمام غلاموں کو صرف اس وجہ سے کوڑے مارے کہ پھولوں کی کبیری سے ایک خاص پودے کا پھول موجود نہ تھا۔

ترگنیف جس نے اپنا بچپن فطرت کی آغوش میں گزارا۔ ببل کے نغمے پر فریفتہ رہا۔ جس کا ذکر اکثر اس کی تحریروں میں ملتا ہے۔ بچپن میں ہی SERF DOM کے نظام سے متعزز ہو گیا۔ اپنی والدہ کے ساتھ اس کے جو اختلاف ہوئے۔ اس کی وجہ اس کی والدہ کا یہی سبب رہا۔ سلوک تھا۔ جو وہ اپنے زرعی غلاموں پر روا رکھتی تھی۔ لیکن اس دور کی اشرافیہ کے نمائندہ رہے

طور پر اس کی والدہ کو روسی اور فرانسیسی ادب سے عشق تھا۔ ترگنیف کی والدہ نے ہی اس کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ جب ترگنیف کی پہلی تخلیق ایک نظم کی صورت میں شائع ہوئی تو اس کی والدہ نے اس نظم کو بے حد سراہا۔ اس نے ترگنیف کو جو خط لکھا وہ اس کے ادب سے گہرے تعلق کا عکاس ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

- مجھے بلاشبہ تمہارے اندر ذہانت دکھائی دئی ہے۔ یہ نظم شاندار ہے۔ ہاں میں پوری سنجیدگی سے یہ لکھ رہی ہوں... مجھے ابھی کچھ سڑا بریز کھانے کے لیے دئی گئی ہیں۔ ہم دیہاتی لوگ ہر اصلی اور خالص چیز کے قدر دان ہوتے ہیں۔ تمہاری اس نظم سے سڑا بری کی نمک آتی ہے۔"

بچپن میں ترگنیف کو ایسا ماحول ملا جو متضاد اور متصادم تھا۔ ایک طرف خوش حالی، فطرت کے مناظر، بیل کی آواز دوسری طرف زرعی غلاموں کی حالت زار اور مالکوں کا جبر و ستم۔ ترگنیف نو برس کا تھا کہ جب اس کا خاندان ماسکو منتقل ہو گیا۔ یہاں ترگنیف نے پہلے تو ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لیا پھر ایک سال بعد وہ پیٹری برگ یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا جہاں انیس برس کی عمر میں ۱۸۸۷ء میں اس نے گریجویشن کی۔

جس ماحول اور طبقے سے وہ تعلق رکھتا تھا اس کے کسی بھی فرد کے لیے یہ تعلیم کافی سمجھی جاتی تھی لیکن ترگنیف کے دل میں علم کی گہری طلب تھی اس نے برلن کا رخ کیا اور وہاں برلن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس کے موضوعات تاریخ اور قدیم زبانوں کے علوم تھے۔ اس نے سیگل کا یہاں بطور خاص مطالعہ کیا۔ اس کو یونیورسٹی میں بعض ایسے طالب علموں کی رفاقت بھی حاصل ہوئی جو بعد میں اہم ادبا اور افراتواہت ہوئے۔ ان میں کاشن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے ایک انارکسٹ انقلابی کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

ترگنیف کی زندگی کا بیشتر حصہ روس سے باہر گزارا۔ اس نے یہ جلا وطنی خود اختیار کی تھی۔ یہ فیصلہ اس نے بہت غور و فکر کے بعد کیا تھا۔ اور اس کے سمجھے۔ زرعی غلاموں کے ساتھ روار کھے جانے والے سکوں کے خلاف نفرت کا قومی جذبہ تھا۔ ترگنیف لکھتا ہے،

میں اس نفرت کے ساتھ رہتے ہوئے، اس فضا میں سانس نہیں لے

سکتا تھا۔ جہاں نفرت بھی اسی ہوا سے ملتی تھی۔ میرے لیے یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ میں اپنے دشمن سے جتنی دور ہو سکے چلا جاؤں تاکہ میں اس کے خلاف زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر سکوں۔ میں نے قسم کھالی تھی اور اس قسم کو نبھانے کے لیے میں وطن چھوڑ کر مغرب میں چلا آیا۔"

اس خود چلا وطنی کی وجہ سے اس نے اپنی جابر اور خود مختار والدہ کی مخالفت مول لی اور ماں بیٹے کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی جاگیر کے زرعی غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اب وہ ایک خود مختار اور عوامی خیال انسان تھا۔ اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو تخلیقی زندگی کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے ڈرامے لکھے، نظموں لکھیں اور مغنیہ پاولین سے عشق کیا جو ساری عمر چلتا رہا۔ ۱۸۵۷ء میں جب گوگول کی موت واقع ہوئی تو وہ ان دنوں روس میں تھا۔ اس نے گوگول کی موت پر ایک تعزیتی مضمون لکھا جس سے زار شاہی شدید ناراض ہوئی اور اسے اس کی جاگیر سے جلا وطن کر دیا گیا۔ ترگنیف نے پھر مغرب کی راہ لی اور پیرس چلا گیا۔ اب تک اس کی شہرت نہ صرف روس بلکہ دنیا میں پھیل چکی تھی۔ اس کے ہم عصر ٹالسٹائی، دوستوئیسکی اس کی شہرت کے علاوہ اس کے وطن سے دور رہنے کی بنا پر اس کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہ رکھتے تھے لیکن وہ اس کی تخلیقی عظمتوں کے دل سے قائل تھے۔

۱۸۶۰ء تک روسی ادب میں بڑی نمایاں تبدیلیاں آئی تھیں۔ یہ وہ دور ہے جب ترگنیف اپنی نظموں، چھوٹے ناولوں اور کہانیوں کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس زمانے میں روسی ادب میں سماجی صورت حال، انسانی ماحول، لوگوں کے اندرونی رویوں کے بارے میں لکھا جانے لگا تھا۔ روایتی کردار آہستہ آہستہ نکلش سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اور ان کی جگہ کلرک، ہنرمند، چھوٹے تاجر، ملازم، زرعی ملازم، آوارہ گرد، موسیقار، سازندے اور اداکار لینے لگے تھے۔ نکلش کی دنیا کا منظر بدل رہا تھا۔ اعلیٰ اشرافیہ طبقے کے ڈرامنگ ردیوں اور دیوان خانوں کی جگہ سڑکوں، بازاروں اور فٹ پاتھوں اور ان پر آہو شراب خانوں نے لے لی تھی۔ لکھنے والوں کے ایک خاص مکتب نے اپنے ظہور کو یقین بنا دیا تھا۔ جسے روس کے

عظیم نقاد ہیلینکی نے "نیچرل سکول" کا نام دیا تھا۔ یہاں نیچرل سے مراد حقیقت پسندی تھی۔

اس زمانے میں جب ترگنیف کی کہانیوں کا مجموعہ "اے ہنٹرز سیکچر" A HUNTER'S

SKETCHES شائع ہوئی تو اسے روسی ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا گیا۔ اس مجموعے

کی پہلی کہانی "کھورادر کالیچ" ہیلینکی جیسے نقاد کی زیر اداوت شائع ہونے والے رسالے ہم

عصر میں ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اور بعد میں دوسری کہانیاں جو ۱۸۵۲ء میں "اے ہنٹرز سیکچر"

کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ شیجرین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

ایک نیا ادب معرض وجود میں آیا ہے۔ عوام کے لیے ان کی مشکلوں کا منظر۔

اس کتاب میں ایک شکاری ایک رائفل اور ایک شکاری کتے کے ساتھ وسطی روس

کے دیہات میں آوارہ گردی کرتا رہا ہے وہ دیہاتیوں کی زندگی کو دیکھتا ہے۔ وہ زرعی غلاموں

کی حالت زار کا نقشہ کھینچتا ہے۔ روس کا وہی علاقہ ان کہانیوں میں زندہ ہو گیا ہے۔ ان کہانیوں

میں ترگنیف بتاتا ہے کہ روس کے عظیم زاروں سے بھی بدتر روس کا عام کسان ہے۔ روس

کی ساری طاقت اس کے کسانوں کے حوالے سے ہے۔

ان کہانیوں کے حوالے سے اور پھر بعد میں ترگنیف کی دوسری تخلیقات میں پہلی بار روسی

عورت کو بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ ترگنیف کا یہ روسی ادب میں ایک بڑا کنٹری بیوشن یہ بھی

ہے کہ اس نے روسی عورت کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی سب سے اس نظر انداز کی جانے والی

عورت کی روحانیت سے لبریز محبت کرنے والی روح کو پہلی بار الفاظ کے ذریعے سچائی اور گہرائی

کے ساتھ پیش کیا۔ ترگنیف کی یہ ہیروئن یہ نسوانی کردار کمزور اور چھوٹے مردوں کو ناپسند کرتی

ہے۔ وہ روحانی اعتبار سے جبری اور مضبوط مردوں کو پسند کرتی ہیں اور اسی میں ان کا مخصوص

اخلاقی روپ اور ذاتی قوت مضمر ہے۔ وہ محبت کر سکتی ہیں اور ایثار بھی۔

ترگنیف سے پہلے روسی کسانوں کو جذبات اور محبت کے احسانات سے عاری سمجھا جاتا

تھا۔ اس لیے ہیلینکی نے ترگنیف کی کہانیوں کے مجموعے کے حوالے سے لکھا تھا۔

ان کہانیوں کے حوالے سے ترگنیف نے ایک ایسے پہلو کو دکھایا ہے جو

پہلے روسی ادب میں مفقود تھا۔"

لے ہنر پوچھنے کے لئے کئی نسلیں کو متاثر کیا ہے۔ اور آج بھی اس کے الفاظ زخمہ اور تباہندہ ہیں جب کہ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ترگنیت کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے اس کے حوالے سے فرانس کے بڑے اور ہم عصر اور مصنفوں سے اس کا تعارف ہوا جو بعد میں گہری اور ذاتی دوستی میں منتقل ہوا۔ اس کے ہم عصروں میں میری اور فلادیمیر اس کے مداح اور دوست تھے اور ایک صدی بعد ہینگوے اپنی کتاب AMOUEA LEFEAST - میں لکھ رہا تھا، "میں لے ہنر زینگیچ کے ساتھ روس میں گھوم پھر رہا ہوں۔" ترگنیت کی شہرت فرانس، برطانیہ اور امریکہ میں پہنچ گئی۔ اس کے کھیل روس میں خاصے مقبول ہوئے لیکن اب وہ ایک بڑے سوال سے دوچار تھا۔ اس نے خود ایک جگہ لکھا ہے "بہت ہو چکا... بہت ہو چکا۔" سوال یہ ہے کہ عظیم تخلیق کا اہل ہیں۔

اس نے سوال کو عرض جان بنا کر اس کے بعد بڑے کام کرنے کی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ ناول لکھتا چلا گیا ۱۸۵۶ء RUDIN کا سن اشاعت ہے۔ ۱۸۵۹ء میں A NEST OF THE GENTRY - ۱۹۶۰ء میں ON THE EVE (اس کا ترجمہ، منتر شام، کے نام سے اردو زبان میں کمال احمد رضوی کر چکے ہیں) اور پھر ۱۸۶۶ء میں SMOKE اور ۱۸۷۷ء میں VIRGIN SOIL -

ان بڑے کاموں اور ناولوں کے دوران ۱۸۶۲ء میں اس کا ناول باپ اور بیٹے FATHER AND SONS شائع ہوتا ہے جو اس کا بے مثل شاہکار ہے اور عالمی ادب میں بہت اہم مقام رکھتی ہے۔

- فاؤر اینڈ سنز "کایسرو بازروف عالمی ادب کے بڑے کرداروں میں سے ایک ہے اس نے خود کہا تھا کہ وہ ایک ایسا قومی اور توانا کردار تخلیق کرنا چاہتا ہے جو مشکلات اور نفعی کرنے والا ہو۔"

یہ کردار جس پر اس نے برسوں غور و فکر کیا تھا، فاؤر اینڈ سنز، میں بازروف کے نام سے ظہور پذیر ہوا۔ اس ناول پر بہت لے وے ہوئی۔ وہ روسی نقاد جو ترگنیت کے قہقہے پڑھتے نہ تھکتے تھے۔ انہوں نے اس ناول اور اس کے مرکزی کردار بازروف کو ایک کردار

کی بجائے ایک کبریٰ کچھ قرار دیا۔ نازک مزاج ترکینف کے لیے یہ تنقید ناقابل برداشت تھی۔
ترکینف کہا کرتا تھا کہ "فاورز اینڈ سنز" میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس کو پورے طور
پر صرف دو سنوٹو تفسیر کی سمجھ سکا تھا۔ جس نے اس ناول پر شاید دنیا کی مختصر ترین رائے دی تھی
اور وہ رائے یہ تھی ...

بے چین اور رنجیدہ غصیلابازروف (ایک بہت بڑے دل کی علامت) !
آخر بازروف کی اتنی مخالفت کیوں ہوئی؟ طالب علموں اور نقادوں کے لیے ایک خاص
فکر رکھنے کی وجہ سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو نئی نسل اور نئی پود کے رجحانات میلانا
اور رویوں کے ساتھ بہدروانہ اور صحیح معنوں میں حقیقت پسندانہ رویہ رکھتے ہیں ان کے لیے
"فاورز اینڈ سنز" اور اس کامرکزی کردار بازروف کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا اور یہی اس ناول
کی وہ خوبی اور صفت ہے جس نے اس کو ہر عہد کا ناول بنا دیا ہے۔ ہر دور کی نئی نسل اس
ناول کو اپنا ناول کہہ سکتی ہے۔

نئی نسل پر ہر دور میں ایک ایسا وقت آیا ہے جب وہ پرانی نسل اس کے انکار اور
اعمال سے بدظن ہو کر ان کے ہر عمل اور فکر کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بازروف بھی ایک
ایسا کردار ہے۔ وہ ایک بے چین روح ہے اسی کے مقدر میں جوانی میں موت لکھی ہے۔
لیکن وہ کسی چیز میں اشبات نہیں کرتا۔ جان لیوا بیماری کے وٹوز میں بھی وہ اپنی عادت
کو نہیں چھوڑتا۔ جب وہ ایک شدید دورے سے سنبھلتا ہے تو اس کا باپ اطمینان کا سانس
لیتے ہوئے کہتا ہے :

"شدید بھجان آیا تھا ... اور وہ آکر ٹل گیا ..."

بازروف اس وقت بھی چوکتا نہیں۔ وہ کہتا ہے :

"بے ہودہ، بے کار" بازروف بولا "ایک لفظ میں کیا رکھا ہے تم ایک کو ضرب لگاتے

ہو۔ کہتے ہو بھجان ... اور تم مطمئن ہو جاتے ہو ... کتنی حیرت کی بات ہے کہ لوگ اب
بھی لفظ پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی آدمی کو زد و کوب کیے بغیر کہو کہ وہ احمق
ہے تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ اور کسی بھی شخص کو انعام دیے بغیر کہو کہ وہ آدمی کہ دو تو

وہ مسحور ہو جائے گا

اپنی موت کے حوالے سے وہ بڑی بے نیازی سے ایک عالمگیر صداقت کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"DEATH IS AN OLD STORY, YET ALWAYS NEW TO SOMEBODY"

عالمی ادب کا یہ عظیم کردار ہر چیز پر شک کرتا ہے۔ وہ بیزار نسل کا نمائندہ ہے۔ سیاسی نعرے اس کی تسکین نہیں کر پاتے۔ وہ لبرل لوگوں کی اصلاحات سے مایوس ہے۔ کیونکہ لبرلزم کے کھوکھلے پن کو وہ سمجھ چکا ہے۔ دہقانوں کے کمیون بنانے پر وہ یقین ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دہقانوں کے کمیون بنانے کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کسانوں کو سوشلزم کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جائے۔ وہ تو ہر چیز کی نفی کرنے پر آمادہ ہے۔ حتیٰ اگر اپنے آپ کی بھی....

"فادرز اینڈ سنز" کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ترگنیف کے ایک بیان کو سامنے رکھ لیا جائے تو بہت آسانی ہو سکتی ہے۔ ترگنیف نے ایک بار لکھا تھا۔

"TO ACHIEVE A REPRODUCTION OF THE TRUTH, THE REALITY OF LIFE ACCURATELY AND POWERFULLY IS THE GREATEST HAPPINESS FOR A WRITER EVEN IF THIS TRUTH DOES NOT COINCIDE WITH HIS OWN SYMPATHIES."

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑی ادبی صداقت کا اظہار بہت کم ہوا ہے اور اسی صداقت کے حوالے سے کہنے والے کا کردار اور منصب بھی واضح ہو جاتا ہے۔

۲۷ اگست ۱۸۸۸ء کو ترگنیف کا پیرس سے کچھ فاصلے پر واقع یوتروال میں انتقال ہوا اس کی نعش سینٹ پیٹریسبرگ لائی گئی اور وائلکونا کے قبرستان میں دفنادی گئی۔
ارنلٹ ریٹان۔ فرانسیسی عالم نے تعزیتی تقریر کرتے ہوئے کہا:
"وہ پوری انسانیت سے تعلق رکھتا تھا۔"

ہیرا فاف اور ٹائمز

میں شامل لر منتون کا یہ ناول THE HERO OF OUR TIMES میں پیش کیا گیا ہے اور لر منتون نے اسے ۱۸۳۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ اور ۱۸۳۹ء میں اسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس ناول کی اشاعت روس میں خاصی تھمکہ خیز ثابت ہوئی۔ لر منتون کے اس فن پاسے پر بہت اعتراض کیے۔ بعض اعتراضات بہت بودے اور بے معنی تھے۔ اور بعض خلوص سے کیے گئے تھے۔ اس ناول کے حوالے سے لر منتون کو بہت شہرت اور رسوائی حاصل ہوئی۔ اس ناول کو عام قاری پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ نقاد حضرات کے اپنے پیانے ہوتے ہیں اور اکثر وہ تخلیق کا جائزہ اس تخلیق کے حوالے سے نہیں لیتے۔ بلکہ اپنی میلک سے اسے پڑھتے اور اپنے پیانوں سے اس کا حساب کرتے ہیں۔ لر منتون کا یہ ناول بھی اسی بدمذاق کاشکار ہوا ہے میرے نزدیک اس ناول کی اس زمانے میں جو عام سطح پر قدردانی نہ ہو سکی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ناول اپنے دور اور زمانے سے ذرا آگے کی چیز تھا۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قدر قیمت کا اندازہ ہونے لگا۔ اور اب ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ ناول زندہ ہے اپنی معنویت کا اظہار کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے کسی اہم راز اور اسرار ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ہمیں بہت کچھ سمجھاتے ہوئے اٹھاتا بھی ہے۔ کیونکہ یہ ایک بڑا فن پارہ ہے۔ اور بڑے فن پاسے کی ایک بڑی جلیب یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہمارے اندر کی دنیا کو متحرک کرنا اور بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔

لر منتون کے اس ناول کے تراجم دنیا کی بڑی زبان میں ہو چکے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے

میں نے اس ناول کا اردو میں ایک ترجمہ پڑھا تھا۔ جس کا ترجمہ پرنسپل غلام سرور نے کیا تھا۔ یہ بہت اچھا ترجمہ تھا اور آج کل دستیاب نہیں ہے۔ ماسکو کے روسی بلجیسی زبانوں کے اشاعت گھر نے بھی اس کا ترجمہ اردو میں شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ خدیجہ عظیم نے کیا تھا۔

• دمی بیروآف اور ٹائمز کا شمار دنیا کی بڑی تخلیقات میں کیوں کیا جاتا ہے۔؟ اس میں ایسی کونسی انفرادیت ہے جس نے اسے ڈیڑھ سو برس سے زندہ رکھا ہے۔ اور ڈیڑھ صدی میں اسے ان گنت لوگوں نے مختلف زبانوں میں پڑھا ہے۔ تو اس کا سیدھا سادا جواب میسے پاس یہ ہے کہ جہاں اس ناول کا اسلوب بے حد جاندار ہے وہاں اس کا مرکزی کردار پچورین عالمی ادب کا ایک ایسا کردار ہے جو ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو بہت کچھ سونچنے پر مجبور کرتا ہے گا۔ پچورین ایک ایسا کردار ہے جسے ابدیت کی روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔ ہر دور میں یہ کردار زندہ رہے گا۔ ہر دور کے لوگ اسے اپنے عہد کا ہیرو سمجھیں گے۔ کیونکہ اس میں بعض ایسی انسانی خوبیاں اور ایسی صداقتیں جمع کر دی گئی ہیں جو ہر انسان کے لیے معنی بھی رکھیں گی اور کشش بھی۔

اصل میں یہ پچورین ہی ہے جسے اس دور میں سمجھا نہ جاسکا۔ اور جو اتنا عمیق گہرا اور تہ در تہہ کردار ہے کہ ہر دور اس کی پرت اتارے گا۔ لیکن اس کو پوری طرح دیکھ نہ پائے گا۔ اس دور میں بیشتر قاری اور آج کا عام قاری بھی ایک رخصت کرداروں کے ہی علاج ہوتے تھے۔ اس لیے ایک بگڑے ہوئے، جذبات سے عاری انسان کو جب اپنا آئیڈیل بنا کر پیش کیا گیا تو لوگوں کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا۔ خود لڑتوں کو اپنے اس کردار کے بارے میں وضاحت کرنی پڑی۔ وہ لکھتا ہے:

• "بیروآف اور ٹائمز" کا ہیرو ایک تصویر ہی ہے۔ کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ ہر پوری نسل کی تمام حراہوں کی بھرپور تصویر ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان اتنا بُرا نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ جب آپ تمام رومانی اور اٹناک ناولوں کے بد معاشوں پر یقین لائے ہیں تو آپ کو پچورین کی شخصیت پر کیوں یقین نہیں آتا... کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کو اس میں اس سے زیادہ صداقت ملتی ہے۔ جتنی آپ

توقع کرتے تھے؟

واقعی حقیقت یہی ہے کہ پچھو پچھو میں ایک ایسا کردار ہے اور اسی لیے وہ ہر عہد کا ہیرو بنتا ہے کہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ صداقت کا اظہار کرتا ہے۔ اور یہ صداقت اتنی گہری قومی اور کڑی ہے کہ ہم سے ہضم نہیں ہوتی۔

لرغبتوں نے اپنے اس ناول اور اس کردار کے حوالے سے اپنے نظریہ فن کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس ناول اور اس کردار کو سمجھنے کے لیے لرغبتوں کے فن سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔ وہ لکھتا ہے،

”آپ سوال کریں گے کہ اخلاقیات کو اس سے کچھ حاصل ہو گیا نہیں؟ معاف کیجیے گا۔ میٹھی میٹھی باتیں بہت ہو چکی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ وہی حقیقتوں کی تیزابی صداقتوں کے اظہار کی۔ لیکن آپ کہیں یہ مفروضہ قائم نہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے مصنف کو کبھی یہ خوش فہمی رہی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی عزابیوں سے سجات دلائے۔ خدا اس کو اس الزام سے محفوظ رکھے۔ بات ساری اتنی ہے کہ مصنف کا جی چاہا کہ موجودہ زمانے کے آدمی کا خاکہ کھینچنے ایسے روپ میں جس میں اسے خود مصنف دیکھتا ہے اور کم از کم اتنا تو ہو کہ بیماری کی تشخیص ہو جائے۔ مگر اس کا علاج کیونکر اور کیسے ہوگا۔ یہ خدا جانے۔“

انقلاب روس کے بعد روسی ادب کے نئے عہد و حال نمایاں ہونے لگے۔ پُرانے اسلوب بھی بدلے اور موضوع بھی لیکن ہزار ہا تبدیلیوں اور نظریاتی انقلابات کے باوجود چند مصنف ایسے جاندار اتنے قومی ثابت ہوئے کہ ان کا انقلاب روس بھی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ان معدودے

چند مصنفوں میں سے ایک لرغبتوں اور اس کا شاہکار ناول ”دی ہیروائف آؤر ٹائمز“ ہے۔ ”دی ہیروائف آؤر ٹائمز“ کی بعض ایسی خوبیاں ہیں جو نہ تو گنہگار کے ہاں ملتی ہیں نہ دوسروں کی اور ٹالسٹائی کے۔ یہ گہرا نفسیاتی ناول ہے۔ اور انسان کو سمجھنے کی ایک بڑی معنی خیز

تخلیقی کوشش بھی۔ ”آئیڈیاز IDEAS“ بڑے فنی رچاؤ اور انسانی احساسات میں گنہ سے ہوئے طے ہیں۔ بیسویں صدی میں لکھے جانے والے NOVEL OF IDEAS سے یہ بہت مختلف ناول ہے۔ یہاں ہمیں آئڈوس بکھلے اور اس قبیل کے دوسرے ناول نگاروں

کے ناولوں کی طرح کردار لمبی لمبی بحثیں کرتے نہیں ملتے۔ رومنٹوں کے ہاں آئیڈیاز: انسان کے باطن سے جنم لیتے ہیں۔ خارجی علم سے نہیں۔ آئیڈیاز کا منشا دانشوری کا اظہار نہیں بلکہ ازلی انسانی صورت کو سمجھنے کی ایک خلاقانہ سعی ہے۔

یہ ناول مختلف داستانوں میں بنا ہوا ہے۔ ان داستانوں میں ہمیں جہاں قدیم روس جیتا جاگتا اور سانس لیتا ہوا ملتا ہے۔ وہاں انسان بھی۔ جو کسی بھی ملک سے زیادہ قدیم ہے۔ ناول کی ایک خاص تکنیک ہے۔ پہلا حصہ بیلا ہے۔ اس ناول کے راوی کو ایک سفر کے دوران میں ایک پرانا فوجی افسر ملتا ہے جس کا نام میکسم میکسی میچ ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو راوی کو اس ناول کے ہیرو پچویرین سے متعارف کراتا ہے۔ اور اس کی اور اپنی زندگی کے ایک دور کا واقعہ سناتا ہے۔ جو بیلا کے عنوان سے ہے۔ یہ حصہ اپنی جگہ ایک مشکل کہانی ہے۔ بوڑھا تجربہ کار فوجی افسر راوی کو پچویرین سے جس انداز سے متعارف کراتا ہے وہ بڑا دلچسپ اور گہرا ہے۔ ہمیں آغاز میں ہی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ ہم ایک انوکھے انسان سے ملنے والے ہیں۔ تعارف کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

پچویرین یقین مآلوں کو بڑا کھتا۔ اگرچہ وہ کچھ خطبہ سنا تھا۔ بعض اوقات تو وہ کسی کسی دن سردی اور بارش میں شکار کھیلتا رہتا۔ ہر شخص سردی سے ہتھیڑ رہا ہوتا۔ تنگ کے فطرحال ہو جاتا۔ لیکن پچویرین پر کچھ اثر نہ ہوتا اور بعض اوقات اس کے کمرے میں ہوا کا جھونکا بھی آجاتا تو بول اٹھتا کہ اسے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ بعض اوقات گھنٹوں بات نہ کرتا اور بعض اوقات گھنٹوں قصے کہانیاں سنا کر سب کو اتنا ہنساتا کہ سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ پورے ناول میں ہمیں اس کے بچپن اس کے والدین اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا۔ چند اشائے ایسے ملتے ہیں کہ وہ بڑے اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس دور میں ناول کے ہیرو کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ پیش کرنے کا عام رواج تھا۔ لیکن رومنٹوں نے اس سے انحراف کیا ہے۔ وہ اصل میں ہمیں اس طرح خود اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

بیلا میں وہ ایک ضدی، جنونی اور جی دار انسان کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ وہ

اس لڑکی کو خطروں میں اپنی جان ڈال کر حاصل کر لیتا ہے۔ جس سے اسے محبت نہیں لیکن اس کے حصول کے لیے اس نے سردھڑک باندھی لگا دی ہے۔ وہ لڑکی اس کی قید میں اس سے بے اعتنائی کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے بات تک نہیں کرتی۔ لیکن وہ ڈرامہ رچانا جانتا ہے عورتوں کا دل موہ لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ جب وہ لڑکی سیلا اس سے محبت کرنے لگتی ہے اس پر اپنا سب کچھ سمجھا دے دیتی ہے تو وہ اس سے لگا جاتا ہے وہ کسی چیز کو سنجیدگی سے قبول کرنے کا عادی نہیں۔ اس پر جذبات کے دورے کبھی کبھی پڑتے ہیں۔ کیونکہ وہ آدمی ہے لیکن وہ جلد ہی ان پر قابو پا لیتا ہے اس کا نظریہ ہے۔

”اگر ان اچھی طرح غور کرے اور سوچے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ زندگی اس قابل تو نہیں ہے کہ آدمی اس کی فکر میں گھلنا رہے۔“

وہ دولت سے خوب عیش کر چکا ہے۔ زندگی کی مختلف دلچسپیوں میں اس نے بہت انہماک کا اظہار کیا۔ اونچی سوسائٹی کی دو شیرازوں سے دل لگایا۔ مطالعے میں اپنے آپ کو غرق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایک ایسا آدمی ہے جسے قرار نصیب نہیں۔ ایک بے چینی ہے جو اسے لیے لیے پھرتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے۔

”سب سے زیادہ مسرور تو وہ لوگ تھے جو جاہل مطلق تھے۔ باقی رہی شہرت تو وہ قسمت کا کھیل ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تو ریا کاری کی ضرورت نہ ہے اور بس۔!“

وہ خود کہتا ہے۔

”میرے دماغ میں ہر لمحہ ہل چل مچی رہتی ہے۔ میرے دل میں انٹسٹ پیاس ہے۔ کوئی سچیز مجھے اطمینان اور تسکین نہیں بخش سکتی۔“

یہ ہے پچوہریں۔ آج کے دور کا انسان۔ بے چین۔ سستی کی تلاش میں سرگرداں جسے کہیں قرار نہیں۔ ایک معتمہ۔ اور یہ وہ محروم ہے جو آج سے ڈیڑھ صدی پہلے لڑکتوں نے تخلیق کیا تھا۔

بیلا جے حاصل کرنے کے لیے اس نے سر دھڑکی بازی لگا دی تھی۔ وہ مرچکی ہے۔
لیکن پچورین کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہیں آتا۔ جب بوڑھا فوجی میکسم اسے زمانے کی
رسم کے مطابق تسلی دیتا ہے تو پچورین ہنسنے لگتا ہے۔
پچورین عجیب ضدی انسان ہے۔ وہ دوسروں کو دکھ دیتا ہے۔ خود دکھ سے سنتا ہے
لیکن کسی سے اظہار نہیں کرتا۔ وہ انسانی زندگی اور اس کے مقصد کے بارے میں بنیادی
سوالوں میں سدا الجھارتا ہے۔

پچورین ایک ایب آدمی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا ہے :-
"وہ جب ہنستا تو اس کی آنکھیں نہ ہنستی تھیں۔ یہ انوکھی خصوصیت
یا بدینتی کو ظاہر کرتی ہے۔ یا ابری اداسی کو۔"

نادل کے دوسرے حصے میں نادل کے راوی اور بوڑھے فوجی کی اچانک ملاقات آئی
پچورین سے ہو جاتی ہے۔ بوڑھا فوجی پرانے ناطے کی وجہ سے جذباتی ہورہا ہے لیکن پچورین
اس سے بہت سرد مہری سے ملتا ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ وقت رکنا بھی پسند نہیں کرتا۔
پچورین بتاتا ہے کہ وہ ایران کی سیاحت کے لیے جا رہا ہے۔ پتہ نہیں وہ زندہ واپس
بھی آئے گا یا نہیں۔ نادل کا یہی دوسرا حصہ ہے۔ جہاں ہم پچورین کو دیکھتے ہیں پہلے حصے
میں اس کی زندگی اور اس کے کردار کے بارے میں ایک داستان بوڑھا فوجی سناتا ہے
دوسرے حصے میں وہ تھوڑی سی دیر کے لیے زندہ حالت میں نادل کے چند صفحات میں
اپنے وجود کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

بوڑھے فوجی میکسم کو پچورین کی اس سرد مہری کا اتنا دکھ ہوتا ہے کہ اس کا دوستی جیسے
رشتے سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ وہ پچورین کی ڈاڑھیاں برسوں سے اس امید سے اٹھائے
اٹھائے پھرتا رہا ہے کہ پچورین سے ملاقات ہو تو وہ یہ ڈاڑھیاں اس کے خواتے کر دے گا۔
لیکن اس کے رویے کی وجہ سے وہ اب ان ڈاڑھیوں کو بھی ایک بوجھ سمجھنے لگا ہے۔ پچورین
کی یہ ڈاڑھیاں اس نادل کا راوی حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد اگلے حصے میں یہ راوی
رہیں بتاتا ہے :-

حال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ ایران سے واپسی میں پچورین کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کیونکہ اب مجھے یہ اوراق پریشان شانے کرانے کا پورا پورا سہ حاصل ہو چکا ہے۔ ناول کا تین چوتھائی حصہ پچورین کی یادداشتوں کی شکل میں ہے۔ یوں ابتدا میں ناول کی جو تکلیک معنی وہ تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی رمنٹوف کا ناول خاص خوبی کا مظہر ہے۔ ان ڈائریوں میں اس کی زندگی کے واقعات ہیں۔ چونکہ دینے والے خاص طور پر اس لیے کہ یہ واقعات پچورین کی نفسیات اس کے مزاج، اس کی شخصیت اور اس کی روح کو سامنے لاتے ہیں۔ راوی تیسرے حصے کی ابتدا میں اس حوالے سے لکھتا ہے۔

”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ پچورین نے اپنی کمزوریوں اور برائیوں کا پردہ پوسے خلوص سے چاک کیا ہے۔ انسانی روح کی کمائی جہاں تک گھٹیا سے گھٹیا روح کی کمائی بھی اتنی ہی دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہے جتنی کہ کسی قوم کی تاریخ“ یہاں راوی جو دراصل ناول نگار ہے وہ پڑھنے والوں کے تجسس کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔

آپ میں سے کچھ لوگ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ پچورین کے کردار کے بارے میں میری رائے کیا ہے؟ میرا جواب آپ کو اس کتاب میں مل جائے گا۔“

واقعی۔ جواب کتاب میں ہی موجود ہے!! یادداشتوں کے حصے کی بھی کمائی یا بیلا باب تامان ہے جو ایک ساحلی شہر کا نام ہے۔ جہاں پچورین کو کچھ عرصہ ٹھہرنا پڑا ہے یہاں وہ اپنی تمام تر ذہانت، جرأت مندی اور چالاکی کے بل بوتے پر ایک لڑکی کے ہاتھوں آئوبن کر اپنی بہت سی قیمتی چیزیں کھو بیٹھتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اس میں آئیڈیاز کی کمی ہے اور پچورین کا اپنا کردار بھی زیادہ تفصیل سے سامنے نہیں آتا۔

یادداشتوں کے پہلے حصے کے بعد ناول کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے اور اس کا پہلا باب۔ شہزادی ماری ہے یہ انسانی ضد اور بہادری کی کمائی ہے جس میں پچورین کے کردار کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ یہاں وہ کٹھور، سنگدل اور غیر جذباتی انسان بھی دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر جب اس کی محبوبہ دیر اپنے بوڑھے خاندان کے ساتھ جانے پر مجبور ہے اور روانہ ہو چکی ہے تو وہ بہت جذباتی ہو کر اس کا تعاقب کرتا ہے لیکن اس

تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہاں اس پر شدید جذباتی دورہ پڑتا ہے۔ جو اپنے اور پر مکمل ضبط اور قابو رکھتا ہے۔ اس نے اپنے آنسوؤں اور سسکیوں کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ اگر اس کا گھوڑا راستے میں گر کر زخم جاتا تو شاید وہ دیر اپنی محبوبہ کو راستے میں جا لیتا لیکن وہ دور رہ گیا اس نے محسوس کیا کہ اس کا کلیجہ پھینکا جا رہا ہے اور اسے شدید احساس ہوا۔

”اچھا تو میں رو بھی سکتا ہوں۔“

لیکن وقت گزرنے کے فوراً بعد وہ سنبھل گیا۔ جذبات کا دورہ ختم ہوا تو اسے بڑی کے ساتھ جھوک محسوس ہونے لگی اور اس نے دل میں کہا اچھا ہوا کہ گھوڑا راستے میں گر کر مر گیا اگر میں دیرا کی سواری کو راستے میں ہی جا لیتا تو کیا ہوتا۔ اس محبت کا انجام کیا ہو سکتا ہے وہ شادی شدہ اور میں شادی سے نفرت کرنے والا آزاد پسند، چلو اچھا ہوا۔

اور وہ پھر جذبات سے عاری ہو گیا۔

وہ شہزادی ماری پر خند میں عاشق ہوا۔ اسے یہ تاثر دینے لگا کہ وہ تو کسی کی پردہ نہیں کرتا۔ اس کا ایک اپنا جاننے والا جو شہزادی ماری کے عشق میں گرفتار تھا۔ اور دوسرے لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کے لیے سازش تیار کی گئی وہ ڈونٹی لڑا اور اپنے حریف کو مار دیا۔ لیکن وہ شہزادی سچ سچ اس سے محبت کرنے لگی۔ لیکن وہ تو اس کو دکھ دینا چاہتا تھا اور سچ بولتا۔ اس نے اسے کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کر سکتا اور پھر بڑی بات کہ وہ اس سے محبت بھی نہیں کرتا۔ وہ اس صدمے سے شدید علیل ہو گئی۔ وہ اس سے شدید علالت کے دنوں کا بلتا ہے۔ اور تب بھی اسے بڑی مسفاکی سے کہنا ہے کہ وہ اس کی حسان بچانے کے لیے بھی اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے دل میں اپنے لیے نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے اور جب وہ واقعی اس سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے تو وہ حوش ہو جاتا ہے۔

ایسا ہے یہ آدمی۔ ہمارے زمانے کا ہیرو؛ پیچورین!

وہ ایسا آدمی ہے جو ایک بات بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیتا۔ ”وہ ایک ایسا انسان ہے جو اپنے جہنم میں خوف جلتا ہے۔ یہ جہنم بھی خود اس نے بنایا ہے۔ یہ جہنم ہے ماضی کی یادیں اور تفصیلات۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے:

میرمی فطرت کتنی حیران کن ہے۔ یہ کس قدر صحت کی بات ہے کہ میں کچھ بھی نہیں بھول سکتا کبھی کچھ نہیں بھولتا۔

وہ بہت سی عورتوں سے وقتی عشق کر چکا ہے۔ جب وہ عشق کرتا ہے تو دنیا و ما فیہا سے لاتعلق ہو جاتا ہے وہ اس عشق میں بُری طرح ڈوب جاتا ہے لیکن دل ہی دل میں وہ اس عشق سے بیزار بھی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جب عشق کے ابتلا سے نکل آتا ہے تو پھر اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ اپنے آپ کو کوستا ہے۔ عورت ذات کے بارے میں اس کی رائے بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔ وہ عورتوں کے بارے میں سمجھتا ہے کہ ان کی اپنی سرے سے کوئی رائے ہوتی ہی نہیں ہے۔

وہ اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھتا ہے۔

”محبت کے جذبات اب میرے عقل و ہوش پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتے۔ حالات نے میری انا کو کھیل ڈالا لیکن ایک دوسری صورت میں یہ نمایاں ہو گئی۔ یہ حوصلہ و ہوش آہڑے کیا؟ طاقت کی فوج، مجھے اپنے ارد گرد کی ہر چیز کو فوج کرنے اور اپنے سامنے جھکانے سے خوشی ہوتی ہے اور پھر یہ جذبات کیا ہیں؟ یہ خیالات کے ارتقاء کی پہلی منزل ہی تو ہیں اگر کوئی سمجھے کہ جذبات ساری عمر برقرار رہیں گے تو اس سے بڑا احسن کوئی نہیں۔“

وہ اپنی زندگی کے مقصد اور وجود کے بارے میں بہت غور و فکر کرتا ہے جو سوال اس حوالے سے پچورین کے دل میں پیدا ہوتے نہیں وہ ان سوالوں کا جواب بھی ڈھونڈتا ہے وہ انسانی خواہشوں کی بے کرانی کے طلسم سے بھی آگاہ ہے۔ اور ان کی ناپائیداری کا بھی راز جانتا ہے۔

وہ دشمنوں سے عشق کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ ”مگر عیسائیت کے نقطہ نظر سے نہیں ہیں انہیں دیکھ کر بہت محظوظ ہوتا ہوں۔ میں ان کی سازشوں کو ڈھادیے میں ہی اپنی زندگی کا مقصد پاتا ہوں اگر دشمن نہ ہوں اور ان سے عشق کر کے بدلہ نہ چکایا جائے تو پھر زندگی کا کیا حاصل؟

وہ دوسروں کو دکھ پہنچا کر مسرت حاصل کرتا ہے اور پھر سوچتا بھی ہے۔ کڑھتا

بھی ہے۔ دکھ بھی محسوس کرتا ہے کہ میں اس طرح کی خوشی کیوں محسوس کرتا ہوں۔ اسے مستقبل پر کوئی یقین نہیں۔ موت سے وہ نہیں ڈرتا۔ لیکن کبھی کبھی اپنی تنہائیوں سے خوفزدہ ہو جاتا ہے اس پر عجیب سا احساس سوار رہتا ہے۔

”ممكن ہے میں كل مر جاؤں۔ دنیا میں كوني رايك وجود بھی ایسا نہیں ہوگا جو پوری طرح مجھے سمجھ سکے۔“

وہ ڈوبل لڑنے جاتا ہے تو دعوت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی ضرورت ہی وہ محسوس نہیں کرتا۔ وہ کسی کو دوست نہیں سمجھتا۔

چچورین کس بات پر یقین رکھتا ہے۔ آرزوہ زندگی اور انسان کے بارے میں کونسا تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ رفعتوں نے لکھا ہے۔ اس کا جواب کتاب میں موجود ہے اور واقعی اس کا جواب کتاب میں موجود ہے۔ یہ اس کتاب کا آخری باب ہے۔

”تقدیر کا غلام“ آدمی تقدیر کا غلام ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔

”ہم مسلمانوں کے عقیدے پر بات کر رہے تھے کہ آدمی کی تقدیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس تقدیر کو مسلمانوں کے عقیدے کو مانتا ہے۔ چچورین کی ذات کا سارا حسن اور سارا انصاف اسی عقیدے کا اثر ہے وہ جانتا ہے کہ جب تک تقدیر میں موت نہیں لکھی موت نہیں آئے گی۔ اور اس کا ثبوت بھی وہ فراہم کرتا ہے۔ دو لچ کا کردار اسی مسئلے اسی۔

عقیدے کا بین ثبوت بن کر ناول میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مزاج میں جو بے چینی اور اضطراب ہے۔ اس کے اندر کی جو آدمیت ہے وہ اسے اس پر بھی ٹکھنے نہیں دیتی۔

چچورین آدمی کو تقدیر کا غلام مانتا ہے۔ اس کے لیے ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ لیکن آدمی بڑی عجیب چیز ہے۔ اسے سمجھنا بہت دشوار ہے۔ وہ کہتا ہے، اب کون ہے جو اس پر یقین نہ کرے گا کہ آدمی تقدیر کا غلام ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آدمی کے بارے میں یہ بات یقین سے نہیں کسی جاسکتی کہ وہ کس بات پر یقین رکھتا ہے۔

تو پھر کس طرح زندہ رہنا چاہیے۔ چچورین کے حوالے سے یہ سوال اٹھتا ہے اور چچورین بھی بتاتا ہے۔

”میں ہر چیز پر شبہ کرنے کو بہتر خیال کرتا ہوں۔ کوئی اپنی ایسی طبیعت بنا لے تو مجھ پر آدمی
نا معلوم حالات کا بھی بہتر انداز میں بہادری سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ بہر حال نبوت سے
بدتر حادثہ پیش آنے سے تو رہا۔ اور موت سے کسے فرار حاصل ہے؟“
انیسویں صدی میں انگریزوں نے چکوریوں کے حوالے سے جو کردار اپنے عہد کا نمائندہ بنا کر
پیش کیا۔ وہ تخلیقی اور انسانی سطح پر ایک آفاقی کردار بن کر دنیائے ادب پر چھا چکا ہے
اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

ریڈ اینڈ دی بلیک

ژولیاں سورینی عالمی ادب کے چند اہم لازوال اور فکرائیگز کرداروں میں سے ایک ہے یہ کردار ستاں وال نے اپنے ناول "سرخ و سیاہ" میں پیش کیا ہے۔ جب یہ ناول ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا تو اس وقت ستاں وال کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک بھرپور زندگی بسر کر چکا تھا اور زندگی کے ان گنت تجربات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان گنت تجربات سے گزر چکا تھا۔ لیکن جیسا کہ دارا اس نے ژولیاں سوریل کی صورت میں پیش کیا ویسا وہ نہ تو خود تھا اور نہ ہی کوئی اس کا لئے والا۔

فرانسیسی زبان میں شائع ہونے والے اس ناول "سرخ و سیاہ"

"LE ROUGE ET LE NOIR"

کا مقصد یہ ٹھہرا کہ یہ عالمی ادب کا عظیم شاہکار قرار پایا۔ دنیا بھر کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ باہم نے اسے دنیا کے دس بڑے ناولوں میں ایک قرار دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اس ناول کی عظمت اور خوش قسمتی ہے کہ اسے اردو زبان میں مرحوم محمد حسن عسکری جیسا مترجم ملا جنہوں نے اس کا ترجمہ "سرخ و سیاہ" کے نام سے شائع کیا اور اردو ادب میں ایک پیش بہا اضافہ کیا۔ جب یہ ناول پہلی بار شائع ہوا تو اس کے بارے میں پڑھنے والوں اور ناقدوں کا تاثر ملا جلا تھا۔ اس میں ژولیاں سوریل کا کردار بہت بڑی مشکل بن گیا تھا لیکن وہ بہت اچھا لگتا ہے بہت پیارا اور محبت کے قابل اور کہیں وہ اتنا بڑا لگتا ہے کہ اس سے نفرت ہونے لگتی ہے اس قسم کے تاثرات تھے جو لوگوں اور نقادوں نے اس ناول کے حوالے سے بیان کیے۔ پھر اس

ناول میں "ساں وال" نے ایک اور تجربہ بھی کیا تھا جو مردہ ناولوں سے بہت مختلف تھا۔ اس ناول میں ایک کے بجائے دو ہیروئین ہیں جو دونوں ہیروئینوں کی سوریل پر مبنی ہیں اور وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ اگرچہ اس محبت کا انداز عام ناولوں کی محبت سے بہت مختلف ہے۔ "ساں وال" کے ناول "سرخ دیباہ" کی اشاعت سے پہلے عام طور پر یورپی ناولوں میں ایک ہی ہیروئن پیش کی جاتی ہے۔ اور اسی پر توجہ دی جاتی تھی۔

ساں وال کو اپنے اس ناول اور اپنے بعد میں شائع ہونے والے ناول کے حوالے سے کچھ مایوسی ہوئی کہ ان کتابوں کو جو اہمیت حاصل ہوئی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس خیال کے پیش نظر "ساں وال" نے یہ لکھا کہ ان کے ناولوں کو ایک سو برس کے بعد پوری طرح سمجھا جاسکے گا "ساں وال" کی یہ پیش گوئی "حرف بجز پوری ہوئی" اب جبکہ اس ناول کی اشاعت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے "ساں وال" کو عالمی ادب میں اس کے ناول کے حوالے سے وہی مقام مل چکا ہے جس کا وہ حقدار تھا۔

ساں وال کا اصلی نام ہنری بل تھا جو آج پڑھنے والے بہت کم جانتے ہیں۔ اسے عالمگیر شہرت اس کے قلمی نام "ساں وال" سے ہوئی۔ "ساں وال" فرانس میں کرنیول میں ۲۳ جنوری ۱۷۸۳ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اور ریاضی میں خاص نام پیدا کیا بعد میں وہ پیرس چلا گیا جہاں ایک پولی ٹیکنیک سکول میں پڑھنے لگا۔ "ساں وال" کا تعلق خاصے خوشحال خاندان سے تھا۔ پولی ٹیکنیک کی اس نے تعلیم اور صوری چھوڑ دی۔ کیونکہ اس کے ایک عزیز نے اس کے لیے ملکہ جنگ میں معقول ملازمت کا بندوبست کر دیا تھا بعد میں اسے حکومت نے اٹلی اور میلان کے سفارت خانوں میں بھیج دیا اسے اٹلی بہت پسند آیا اور بعد میں اس نے اپنا طرز زیست اور انداز بود و باش اطالوی انداز میں دلچال لیا۔ ۱۸۰۰ء میں وہ فرج میں بھرتی ہوا اور اسے لیفٹیننٹ بنا دیا گیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔ بعد میں اس نے مارینز میں کچھ کاروبار کرنے کی کوشش کی ۱۸۰۶ء میں وہ پارلیمنٹ کا رکن بنا اس کے بعد ۱۸۱۰ء تک وہ ایک پرچے کو مرتب کرتا رہا۔ نپولین نے جب روس پر حملہ کیا تو اس نے بھی اس فوجی مہم میں حصہ لیا جب نپولین کو زوال ہوا تو "ساں وال" اٹلی چلا گیا۔ جہاں وہ ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۱ء تک مقیم رہا میلان بھی کچھ عرصہ گزارا جہاں باران اور مادام ڈی شیٹل سے

اس کے تعلقات پیدا ہوئے۔

سناں وال نے ایک دوسرے قلمی نام سے ۱۸۱۴ء میں پیرس سے ایک کتاب شائع کی جو موسیقی کے بارے میں تھی اس کے بعد اپنے نئے قلمی نام سناں وال کے ساتھ اس نے اٹلی اور نیپلز کے سفر نامے اور تاریخ شائع کرائی، وہ اطالوی طرز زلیست اور کچر کا زبردست ملاح بن گیا ۱۸۲۱ء میں جب وہ پیرس لوٹا تو اذنی حلقوں میں آنے جانے لگا۔ اور اس دور کے بعض اہم فرانسیسی ادیبوں سے گہرے روابط قائم ہوئے ۱۸۲۲ء تک اس نے کئی دوسری کتابیں لکھیں جو روم کے بارے میں تھیں۔ ۱۸۳۰ء میں اس کا شاہکار ناول "سرخ دسیاہ" شائع ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں اسے ایک ملک کا سفیر بنا دیا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں اس کا دوسرا شاہکار ناول "LACHARTREU SEPARMA" شائع ہوا۔ جسے بعض ناقدین اس کا سب سے اہم اور بڑا تخلیقی کارنامہ ہی قرار دیتے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت سناں وال کے لیے باعث مسرت ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ وہ ناول ہے جس کی باراک جیے عظیم فرانسیسی ناول نگار نے بے حد تعریف کی۔ اور اس پر ایک شاندار تبصرہ لکھا۔ اس ناول کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام کردار اطالوی ہیں اور یہ اطالوی طرز زلیست کی عکاسی کرتا ہے۔

۲۲ مارچ ۱۸۴۲ء کو سناں وال کا انتقال ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کی ہمیشہ نہ اس کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا جو مکتوب نگاری میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ سناں وال نے ایک بار لکھا تھا کہ اس نے ناول دراصل خوش قسمت لوگوں کے لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ قاری یقیناً خوش قسمت ہے جس نے اس کے عظیم شاہکار "سرخ دسیاہ" کا مطالعہ کیا ہے۔

"سرخ دسیاہ" ایک ایسا حقیقت پسندانہ شاہکار ہے جس میں انسانی نفسیات کی گہرائی میں اتر کر مصنف نے انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں اور عوامل کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ نام دراصل علامتی ہے۔ "سرخ" رنگ اور اختیار کی علامت بنتا ہے۔ اور دوسرا رنگ سیاہ مذہب اور اختیار کی علامت۔ اس دور میں (اور اب بھی) یہ سمجھا جاتا رہا کہ انسان کو اقتدار یا تو مذہب کے حوالے سے مل سکتا ہے یا پھر فوج کے

ذریعے سٹیٹن کریں نے اپنے مشہور زمانہ ناول "دی ریڈیج آف دی کرج" میں سرخ رنگ کو "دلاوری کا سرخ نشان" کہا تھا۔ ستاں دال بھی اسے انہی معنوں میں لیتا ہے اور سیاہ رنگ پادریوں کے لباس کے حوالے سے اقتدار کی علامت بتاتا ہے۔

"سرخ و سیاہ" کا ہیرو ڈوئیاں سوریل ایک قصباتی بڑھئی کا بیٹا ہے وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے بے حد مختلف ہے۔ وہ پرکشش اور نازک ہے وہ ایک طالع آزمایا اور عم چوبطیعت کا مالک ہے۔ وہ سرخ اور سیاہ، فرج اور مذہب کے درمیان سے ایک ایسی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے سود مند ہو ڈوئیاں نے نپولین کو نہیں دیکھا لیکن وہ نپولین کو پوچھتا ہے۔ وہ اس کا آئیڈیل اور ہیرو ہے ایک ایسے زمانے میں جب نپولین کا مداح ہونا سماجی اعتبار سے نقصان دہ ہے وہ نپولین کی محبت میں گرفتار ہے لڑکپن میں اسے ایک ایسے شخص سے دوستی کرنے کا اتفاق ہے جو نپولین کی فرج میں ڈاکٹر تھا۔ اس شہنشاہ یافتہ ڈاکٹر سے وہ نپولین کے بارے میں بہت معلومات حاصل کر چکا ہے

جب یہ ناول شروع ہوتا ہے تو نپولین پر زوال آچکا ہے۔ فرانس میں امن و امان کا دور دورہ ہے۔ نپولین جلا وطنی کی زندگی گزار رہا ہے ملک میں کلیسا کے زیر اثر ایک رجعت پسند حکومت قائم ہو چکی ہے اس لیے ژولباں مجبور ہے کہ وہ نپولین کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کو چھپا کر کلیسا کی زندگی کو پاتا ہونے۔ مستقبل کی ترقی کے لیے سیرٹھی بنائے وہ حیرت انگیز حافظے کا مالک ہے اس نے انجیل مقدس کو عبرانی زبان میں پورا یاد کر رکھا ہے وہ WONDER BOY کی سچی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اس کی عملی زندگی کا آغاز عجیب انداز میں جنوبی فرانس کے اس قصبے سے ہوتا ہے۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا اس قصبے کے تاجر اور میر کے ہاں اسے بچپن کا اتالیق رکھا جاتا ہے۔ یہاں اس کے پہلے عشق کا آغاز ہوتا ہے جو وہ میر کی بیوی سے کرتا ہے جو خود اس کے عشق میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ اس عشق کی تفصیل جس انداز سے ستاں دال نے پیش کی ہے۔ اس کی تعریف ممکن نہیں۔ ژولباں اس طبقے سے نفرت کرتا ہے۔ جس سے اس کی شادی شدہ مجبورہ کا تعلق ہے۔ ژولباں ایک ریاکار ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس محبت میں ریاکاری کا عنصر

کتا ہے اور وہ کس حد تک خالص محبت کرتا ہے۔ جب اس کے عشق کو قصبے میں رسوائی حاصل ہوئی ہے تو وہ اس وقت تک اپنی اس محبوبہ سے فیض یاب ہو چکا ہوتا ہے جو ثروباں کے ساتھ بے حد گہری بے حد اعلیٰ ہوئی محبت کرتی ہے۔ یہ ایک نیکو کار عورت کا کردار ہے جو ماں ہے لیکن اس نوجوان سے محبت کرنے لگی ہے اس کے دل میں گناہ کا احساس جس انداز میں جس نفسیاتی اور تخلیقی صداقت کے ساتھ بیان ہوا ہے یہ اس ناول کا سب سے خوب صورت اور موثر پہلو ہے۔

ثروباں ایک کلیسیائی درسگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہت کم ایسے یورپی ناول ہوں گے جن میں کلیسیائی زندگی کا نقشہ اس کی پوری صداقت کے ساتھ اس طرح بیان ہوا ہو جس طرح "سرخ و سیاہ" میں ہوا ہے لیکن ثروباں یہاں بھی پوری تعلیم حاصل کر کے پادری نہیں بن پاتا کہ اسے پیرس جانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ایک مقدر نواب کا سیکرٹری بن جاتا ہے یہاں بھی وہ پادریوں جیسے سیاہ لباس کو پہنتا ہے اس لباس کو ترک نہیں کرتا۔

یہاں اس کی زندگی کا دوسرا عشق شروع ہوتا ہے اس کا آقا نواب دلا مول ہے۔ جس کی بیٹی سے وہ عشق کرتا ہے وہ اس سے شادی پر تڑپ جاتی ہے۔ نواب دلا مول اسے اپنا داماد بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اس کے لیے فوج میں اعلیٰ ملازمت کا بھی بندوبست کر دیتا ہے۔ ناول کے اس حصے میں "سرخ و سیاہ" ظہور پذیر ہو جاتا ہے اس کی سابقہ محبوبہ میسر کی بیوی ایک خط میں نواب دلا مول کو اپنے اور ثروباں کے تعلقات سے آگاہ کرتی ہے۔ جلد باز اور نا عاقبت انڈیش ریاکار ثروباں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیتا ہے وہ اپنی سابقہ محبوبہ پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے جو بچ جاتی ہے۔ ثروباں پر مقدمہ چلتا ہے اور اسے موت کی سزا دی جاتی ہے۔ یہاں جیل میں موت کی سزا پانے سے پہلے اس کو اپنی اصلی محبت اور اپنی منافقت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

انسانی منافقت اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کش مکش کے حوالے سے دنیائے ادب میں "سرخ و سیاہ" سے بڑا ناول شاید ہی لکھا گیا ہو۔ اب اس کی دونوں محبوباؤں کی جان بچانے کے لیے سردھڑکی بازی لگا دیتی ہیں لیکن ثروباں موت کو ترجیح دیتا ہے وہ۔

منافقت اور ریاکاری سے عاجز آچکا ہے۔ اس نے زندگی کا کشف حاصل کر لیا ہے۔
 ٹرولیاں سوریل ایک رومانی ہیرو سے مشابہت رکھنے کے باوجود مختلف ہیرو ہے۔
 وہ کلیسا کے سیاہ رنگ کے چمچے کے نیچے اپنی ہوس چھپائے ہوئے ہے۔ وہ ایک ٹرا سٹرا
 کردار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ خواتین اس میں بطور خاص دل چسپی لیتی ہیں۔

۱۹ویں صدی میں فلا میٹر بالزاک اور زولا جیسے عظیم فرانسیسی ناول نگار پیدا ہوئے ان
 میں ساں وال بھی پروتار انداز میں کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس کا شاہکار
 "سرخ و سیاہ" ہے جو عالمی ادب کا ایک عظیم کارنامہ ہے وہ ٹرولیاں سوریل کے خالق کی
 حیثیت سے لازوال ہوا۔ ٹرولیاں جو ایک پورے معاشرے سے نبرد آزما اور برسریکار ہے۔
 کہیں کہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ٹرولیاں صرف اپنے کردار کے بل بوتے پر پورے معاشرے
 کو شکست دینے اور چھا جانے پر تیار ہوا ہے۔ کیونکہ اسے نہ دولت کی ہوس ہے نہ مذہبی
 معاشرے میں اونچے مرتبے کی پرواہ۔

ساں وال نے ایک مذہبی معاشرے کی منافقت کو جس انداز میں پیش کیا ہے یہ اس
 ناول کا خاص پہلو ہے۔ ساں وال نے اس ناول میں ناول نگاری کے بارے میں اپنے
 نظریے کا بھی اظہار کیا ہے۔ یوں وہ ایک حقیقت نگار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔
 وہ لکھتا ہے۔

"ناول تو ایک آئینہ ہے جسے لے کر سڑک پر نکلا جاتا ہے اگر راستے میں گڑھے اور
 جوہر دکھائی دیتے ہیں تو اس میں اس آئینہ کا تو کچھ قصور نہیں۔"
 "سرخ و سیاہ" یورپی ادب کا اسی نہیں عالمی ادب کا بھی عظیم شاہکار ہے۔

ریڈیو نیس آف تھنگز پاسٹ

۱۹۲۲ء میں جب مارسل پر دست کا انتقال ہوا تو وہ اپنی زندگی کا ہی نہیں بلکہ عالمی ادب کا ایک عظیم ترین فن پارہ مکمل کر چکا تھا۔ اپنا عظیم الشان تخلیقی کارنامہ جو آج ساری دنیا میں ریڈیو نیس آف تھنگز پاسٹ کے نام سے مشہور ہے۔

مارسل پر دست نے ایک دلچسپ اور عجیب و غریب زندگی بسر کی اور اس سے بھی عجیب تر اور حیرت انگیز تخلیقی کارنامہ اس نے اپنے اس ناول کے حوالے سے تخلیق کر کے تخلیقی ادب میں ہمیشہ کے لیے اپنے لیے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جو صرف اور صرف اسی سے ہی مخصوص ہے۔

فرانسیسی زبان میں لکھا جانے والا یہ ناول۔ فرانس کے ہر اس ناول نگار اور نثر نگار کی تخلیق سے مختلف اور منفرد ہے۔ جن کا شمار لوہری دنیا میں ہے۔ ڈومبا یوگو، زولا، آندرے ژید، سارتر، فلائیبر، ژاں ژینی، کوکٹو اور پھر روبن رولان کے ضخیم شہکار ژاں کرستوفی سمکے فرانسیسی ادب میں ناول کی عظیم الشان اور منفرد تخلیقی تاریخ ہے۔ یہ سب بڑے نام اور ان کے بڑے کام عالمی ادب کے عظیم کارناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح روسی، انگریزی اور دوسری بڑی مقتدر زبانوں کے ناول نگاروں کا بھی ایک اپنا مقام ہے۔ لیکن مارسل پر دست کا ناول "ریڈیو نیس آف دی تھنگز پاسٹ" سب سے علیحدہ دکھائی دیتا ہے۔

بیسویں صدی تک جن ناول نگاروں نے اس صنف ادب میں نمایاں تخلیقات کا اضافہ کیا اور ناول کی صنف کو زندگی کا سب سے اہم ترجمان بنا دیا۔ ان میں بڑے بڑے نام آتے ہیں

جن کے بہت سے فن پاروں کا ذکر اس سلسلہ مضامین میں تفصیل اور اجمال سے آچکا ہے لیکن مجھے یہاں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مارسل پر دست کا ناول سب سے مختلف و منفرد ہے۔

ہر شخص جس کا لکھنے پڑھنے سے سنجیدگی رہا ہر وہ اپنی زندگی میں جتنا کچھ پڑھتا ہے۔ اس میں سے چند تصانیف اور کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کو وہ اپنے مطالعے کا حاصل قرار دیتا ہے۔ مارسل پر دست کے اس ناول "ری میمر بنس آن تھنگز پاسٹ" کا ایک کردار سوان (SWANN) ہے۔ جس کی زبان سے مارسل پر دست نے یہ جملہ لکھوایا ہے۔

"زندگی بھر میں ہم تین یا چار ہی ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جو حقیقی اور اصلی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔"

مارسل پر دست کا یہ ناول۔ انہی تین چار کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ کتابوں کا دائرہ کچھ محدود کر لیں تو پھر یوں کہا جاسکتا ہے کہ عالمی ادب میں تین چار ہی ایسے بڑے ناول ہیں جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے ایک مارسل پر دست کا ناول ہے۔

میں تو اس ناول کے حوالے سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے اور اس میں تحقیقی صلاحیت موجود ہے، اسے اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن مارسل پر دست کے اس ناول کو پڑھنا بھی تو ایک مشکل کام ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ سکاٹ مونکرفٹ نے کیا ہے اور جس کے ترجمے کے بارے میں خود مارسل پر دست نے یہ جملہ کہہ کر مترجم کو داد دی تھی کہ۔ ترجمہ اصل ناول سے بڑھ گیا ہے۔ یہ ترجمہ چار ہزار صفحات میں کسی جلدوں پر مشتمل ہے۔ آج کے اس صرٹ دور میں اتنا ضخیم ناول پڑھنا یقیناً کلمے وار۔ والا مسئلہ ہے لیکن ادب کے ہر سنجیدہ قاری سے کم از کم یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ وہ ادب اور ہر کی کتابوں کو نظر انداز کر کے ٹالسٹائی کا "وار اینڈ پیس" اور مارسل پر دست کا "ری میمر بنس آن تھنگز پاسٹ" تو پڑھ ہی لے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل "الم غلم" اور بے کار کتابوں کے مطالعے سے کہیں بہتر ہے کہ دو ناول ہی پڑھ کر انسان اس عظیم تجربے کو محسوس کرنے جس کا احوال بیان کرنا مشکل ہے۔

میں مارسل پر دست کے اس ناول سے سینکڑوں ایسے ٹکڑے نقل کر سکتا ہوں اور ان کے حوالے سے تمام بڑے بڑے ناول نگاروں کے ساتھ اس کا موازنہ کر سکتا ہوں لیکن اس سے بھی

اس عظیم تخلیق کے ساتھ بھلور پرنسٹن نہ ہو سکے گا۔

اس ناول میں ہی ایک ٹکڑا ہے جہاں آئنٹ لیونی۔ نئے مارسل کو چائے پلائی ہے اس کا بیان مارسل پر دست نے کوئی ۲۴ سطروں میں قلم بند کیا ہے اس واقعے کو ہیٹگو سے اپنی اختصار پسندی سے بیس الفاظ میں قلم بند کر سکتا تھا اور دنیا کا ایک اور بڑا ناول نگار بالزاک سولفظوں میں اسے اپنے انداز میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ لیکن اس واقعہ کو جس انداز میں مارسل پر دست نے لکھا ہے وہ صرف اسی سے مخصوص ہے اور دنیا کا کوئی مصنف اسے اس انداز میں بیان کر ہی نہیں سکتا تھا۔

یہاں پھر یہ وضاحت ضروری ہے کہ میرے جیسے طالب علم جو براہ راست فرانسیسی زبان نہیں جانتے۔ وہ انگریزی کے وسیلے ہی سے اسے پڑھ سکتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے اچھا ترجمہ سکاٹ مونکولین کا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا ترجمہ نہیں نے دیکھا ہے نہ میرے علم میں ہے اور پھر مونکولین کے ترجمے کے بعد کسی دوسرے ترجمے کو پڑھنے کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

مارسل پر دست کے ہاں لفظ جو شکل اختیار کرتے ہیں وہ کسی دوسرے بڑے لکھنے والوں کے ہاں دکھائی نہیں دیتی، یہاں لفظ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے لازمی، توام اور باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ ان میں زندہ چیزوں جیسا خستہ پن پایا جاتا ہے۔ اور پھر جب ہم اس نثر کے حوالے سے پوری کتاب پڑھ جاتے ہیں تو ہمیں یہ بھلور پرنسٹن ہوتا ہے جو ایک کشف کی سی حالت رکھتا ہے کہ اس ناول میں زندگی اور فطرت۔ یک جان ہو چکے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس ناول کے حوالے سے میں یہ بات سمجھا سکتا ہوں کہ نہیں۔ کہ مارسل پر دست نے یہ ناول ایک خاص اعصابی نظام کو بروئے کار لا کر تحریر کیا تھا۔ تخلیق اور اظہار کی دنیا میں یہ اسلوب اعصابی نظام، اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب اس ناول کا کوئی از خود توجہ سے مطالعہ کرے۔ جیسا کہ اس ناول کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ بیٹی ہونی گھڑیوں، لمحوں اور اشیا کی یادیں ہیں۔ بیٹے ہونے وقت کی بازیافت۔ یہی اس ناول کی تقسیم ہے۔!

وقت۔ اس ناول کا سب سے اہم عنصر ہے اور وقت کو جس طرح "میںٹامورفوسسٹر"

نے بدل دیا ہے۔ اس کی بازیافت۔ اس کا معاملہ ہے۔

METAMORPHOSIS کی یہ حس۔ مارسل پر دست کے اعصابی نظام کے ساتھ وابستہ اور مربوط ہے اور یہ دونوں حسیں جو اس کتاب میں منظم و مربوط ہو گئی ہیں۔ مارسل پر دست کی حس اس ترین تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے جنم لے کر بدلتے ہوئے تناظر کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں اور یوں ایک لپسا انسانی معاشرہ اپنے ماضی اور بدلے ہوئے تناظر کو ہمارے ساتھ زندہ ہو کر سانس لینے لگتا ہے۔ مارٹینوبلی، سوان اور ڈیٹ، مادام درون ایسے کردار ہیں جو مارسل پر دست نے تراشے اور اپنے عظیم فنی اور تخلیقی تجربے اور اپنے ناول کی تعظیم کے لیے ان کو استعمال کیا۔ اس ناول میں خارجی حقائق اپنی جھلک دکھاتے ہیں لیکن کسی ایک خارجی جملے کی تفسیر۔ دوسرے جملے سے نہیں ملتی۔ ایک جیسے لمحوں کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے اس طرز اسلوب میں تاثیرت کا پہلو نمایاں قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ تاثیرت متحرک ہے۔ معمولی سے معمولی جزئیات میں بھی یہ متحرک ناشی انداز پایا جاتا ہے۔

اس ناول کا گہرا تعلق مارسل پر دست کی اپنی زندگی سے بھی ہے۔ مارسل پر دست اور اس کی ماں میں جو محبت تھی اور اس حوالے سے جو سچیدہ اور گہرا رشتہ جم لیتا ہے۔ اس کے باسے میں مارسل پر دست کے نقادوں اور نفسیات دانوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ جب ۱۹۰۵ء میں مارسل پر دست کی والدہ کا انتقال ہوا تو مارسل پر دست تنہا اور اکیلا رہ گیا۔ اس تنہائی کی عظیم دین اور عطا۔ یہ ناول ہے۔

بعض ناقدوں نے اسے جدید ناول کے سہلے انیسویں صدی کے اسلوب کے ناولوں میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ اس میں کردار نگاری، وسیع وسیع سکیل اور مثالی انداز فکر پایا جاتا ہے اور پھر اس کے ناول کے خالق کے تخلیقی اعتماد کی جو بھر پور جھلک، اپنی ذات اور اس ناول کے حوالے سے اس ناول میں ملتی ہے۔ یہ بیسویں صدی کے جدید ناولوں میں دکھائی نہیں دیتی اور پھر وہ کونسا ناول ہے جس کے باسے میں پستے و ثوق سے کہا جاسکتا ہے۔ اس میں مصنف اور خدا کی ذات ایک ہو گئے ہیں۔ خالق کی حیثیت سے۔

مزید برائے آف تھنکنگ ہاسٹ "کا بر سجدہ قاری اس ناول کے اس پہلو سے واقف ہو گا کہ

اس ناول میں جو تصورات پیش ہوئے ہیں وہ SUBSTANCE سے اخذ نہیں کیے گئے بلکہ یہ تصورات بذات خود SUBSTANCE ہیں۔ اس ناول کا پلاٹ ایجوکیشن اور رزمیات کے رشتے کے حوالے سے ترتیب نہیں پاتا بلکہ اس میں ایک حقیقی اور براہ راست ڈرامائی انداز بھی شامل ہے۔ اس ناول کا ایک ایک لفظ دوسرے لفظ سے جڑا ہوا ہے۔ اس نثر میں وہ خوبی ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں نقش بناتی چلی جاتی ہے۔ ہر کسی کو مار کر کسی واقعے کو بھول نہیں پاتے۔ اس ناول کا ایک کردار ڈی فریش دبل۔ تین ہزار صفحات گزرنے کے بعد پھر ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن وہ طویل غیر حاضری کے باوجود اس ناول کی عظیم عمارت میں جڑا ہی ہوئی، ایک مضبوط اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جسے نکال دیا جائے تو عمارت میں سوراخ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں ایک خاص تعمیراتی شکل بھی موجود ہے۔ جو شاید ہی کسی اتنے بڑے ضخیم ناول میں اس انداز سے ملتی ہو۔

دانٹے نے بہت کچھ لکھا لیکن وہ زندہ اپنے ایک ہی کام ڈیوان کا میڈیٹی کے حوالے سے رہا۔ اسی طرح مارسل پر دست اپنے اسی اکلوتے عظیم اور ضخیم ناول کی بدولت زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اور اس کے اس اکلوتے تخلیقی فن باپے کی بدولت اس کی زندگی اس فن اور اس کے ناول کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ایک پوری لائبریری انہی کتابوں سے بھر سکتی ہے اور کٹا سکتا ہے کہ اس ناول کے حوالے سے اس کے فن اور اس کی ذات پر ہمیشہ لکھا جاتا رہے گا۔ مارسل پر دست ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں دنیا بھر میں اس کی سو سالہ برسی کی تقریبات ہوئیں اور اس کے ناول کے حوالے سے اس کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

سات جلدوں پر مشتمل یہ ناول ری ایڈیشن میرے مطالعے میں رہا ہے جس کا ترجمہ سکاٹ نوکر لین نے کیا ہے اس کے بارے میں اردو زبان کے حوالے سے کما جا سکتا ہے کہ مارسل پر دست اور محمد حسن عسکری کے ہاں ملتا ہے۔ ایک دو جگہ انتھار حسین نے بھی مارسل پر دست کا حوالہ دیا ہے۔ ان دو ایک حوالوں کے علاوہ ہمارے ہاں اس کا ذکر کم ہی ہوا ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جبکہ ہمارے ہاں مارسل پر دست سے کہیں کمتر تغیر ملکی کہنے والوں کا بہت بہت چلا آرہا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ اس ناول کی ضخامت بھی ہے لیکن میں اسے کوئی وجہ نہیں سمجھتا۔

ایڈمنڈ سون نے اس ناول کے حوالے سے لکھا تھا۔ یہ ناول بھی بائبل کی طرح ہے۔ یہ ایک ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جس میں انسان کو تشفی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں جسم اور رُوح کی کا بیان منفرد ہے۔ ناقابل تقلید مارسل پروست نے اسی ناول میں ایک جگہ لکھا ہے۔
”جسم رُوح کو ایک قلعے میں قید کر لیتا ہے۔“

ماضی کی یادوں کی بازیافت اسی رُوح کی کش مکش اور جدوجہد ہے۔ تنہا رُوح جو آزاد کی خواہاں ہے۔ جسم کے قلعے سے نکلنے کی جدوجہد۔ یہ ناول ایک عظیم تخلیقی تجربہ ہے۔ اپنے اس عظیم تخلیقی فن پائے اور تجربے کی قدردانی میں سے مارسل پروست بھی آشنا تھا اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں اس کی عظمت پر مستحکم نہیں ہوا۔

مارسل پروست نے ”ریمیڈیٹس آف تھنگز پاسٹ“ کے حوالے سے اپنے ہی الفاظ میں ”ابدیت کی ایک حس“ کو اپنا تذکرہ بنا کر چھوڑا، اس اُمید اور یقین کے ساتھ کہ میرے لب آنے والے اس خزانے سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔“

دی ٹرائل

بیسویں صدی کے فکشن میں علامتی طرز کا ایک بہت بڑا اور بعض کے نزدیک سب سے بڑا ناول نگار اور کہانی کار کافکا ہے۔ وہ کافکا جس نے اپنی موت کے بعد عالمگیر شہرت حاصل کی اور جس کے ناول اور کہانیوں کا بیشتر حصہ اس کی موت کے بعد شائع ہوا۔ وہ فرانز کافکا جس نے اپنی جان لیوا بیماری کے آخری دنوں میں ہدایت تحریری طور پر دی تھی کہ اس کے تمام مسودے جلا دیے جائیں۔

جب وہ مرا تو اس کے کاغذات میں سے اس کے عزیز دوست میکس برود کو ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کے ڈیک میں ملا۔ یہ تحریر سیاہی سے لکھی ہوئی تھی اور یہ میکس برود کے نام ایک خط تھا۔ اس خط کا متن تھا۔

ڈائریکٹ میکس۔ میری آخری درخواست، ہر وہ چیز جو میں اپنے پیچھے اپنے باک کیس کپ بورڈ، گھر اور دفتر کے ڈیسکوں اور جہاں کہیں بھی تمہاری نظر میں میری کوئی چیز پڑے، اُتریلو کی صورت میں، مسودوں کی شکل میں اور خطوط (میرے اپنے اور دوسروں کے) خاکے اور ایسی ہی چیزیں، بغیر پڑھے سب کے سب جلا دیے جائیں۔ حتیٰ کہ وہ تمام خاکے اور مسودے بھی جو تمہارے اور دوسرے دوستوں کے پاس ہیں، میرا نام لے کر دوسروں سے درخواست کرنا اور ایسے خطوط جو وہ تمہیں دینا نہ چاہیں اپنے ہاتھوں سے وہ خود جلا دیں۔

اگر میکس برود نے اپنے دوست کی آخری خواہش پر عمل کرنا تو آج دنیا میں کافکا کی وہی چند تحریریں ہوتیں جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔ اور اس کے ناول اور کہانیوں سے کوئی واقف نہ

ہوتا اور کانفکا یقیناً وہ شہرت اور مقام عالمی ادب میں حاصل نہ کر پاتا جو اسے آج حاصل ہے
 کانفکا کے تین ناول ہیں۔ "ٹرائل" "دومی کاسل" اور "امریکا" یہ تینوں ناول ناممکن صورت
 میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے ان ناولوں میں "ٹرائل" اور "کاسل" کو جدید عالمی ادب کا شہکار
 تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن زیادہ اہمیت دی "ٹرائل" کو حاصل ہے۔ "دومی ٹرائل" کو کانفکا نے ۱۹۱۶
 ۱۹۱۷ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ "کاسل" اور "امریکا" کو ۱۹۱۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن زیادہ
 اور اس کی بہت سی کہانیاں اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔ وہ اپنی زندگی میں انہیں چھپوانے
 کا خواہش مند نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے عزیز ترین دوست میکس برودے سے زبانی بھی
 کہا تھا کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے تمام مسودوں کو نذر آتش کر دے۔ میکس برودے نے
 اس سلسلے میں لکھا ہے کانفکا نے کہا تھا۔

"میری آخری خواہش بہت سادہ ہے، میری ہر چیز جلا دینا، میکس برودے لکھتا ہے۔
 مجھے آج بھی اپنے اس جواب کے الفاظ یاد ہیں جو میں نے اسے دیا تھا۔ اگر تم سنجیدگی سے مجھے
 اس کام کا اہل سمجھتے ہو تو مجھے ابھی بتانے دو کہ میں تمہاری خواہش پوری نہ کر سکوں گا۔"
 یقیناً عالمی ادب پر میکس برودے کا بڑا احسان ہے کہ اس نے کانفکا کی درخواست پر عمل نہ کیا
 فرانتز کانفکا۔ ایک جرمن یہودی بولہ بین کنبے کا فرزند تھا۔ جو پراگ (چیکو سلواکیہ) میں ۱۸۸۳ء
 میں پیدا ہوا۔ اس نے جون ۱۹۰۶ء میں قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس کے
 بعد وہ ۱۹۰۶ء سے ایک نیم سرکاری ملازمت پر فائز رہا۔ جس کے صلے میں اسے معقول
 تنخواہ ملتی تھی اور اوقات کار مختصر تھے۔ اس ملازمت کی وجہ سے اسے پہلی جنگ عظیم میں
 فوج میں جانے سے چھٹی مل گئی۔ اس نے پہلی کہانی ۱۹۱۳ء میں شائع کرائی۔ اپنی زندگی میں
 اس نے بہت کچھ لکھا لیکن چند کہانیاں ہی شائع کرائیں۔ جن کی بدولت اسے ادبی حلقوں میں
 خاصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس کا سارا بڑا کام ناول، کہانیاں اس کی موت کے بعد اس کی
 خواہش کو نظر انداز کر کے شائع کی گئیں۔ کانفکا کو تپ و ق کا مرن لاجت تھا اور یہی مرض اس
 کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اس کی موت ۳ جون ۱۹۲۴ء کو واقع ہوئی۔ جب وہ مرا تو اس
 کی عمر ۴ برس تھی۔

ایک کہانی کار کی حیثیت سے اس نے "میٹا مفا رسس" اور "دیہاتی ڈاکٹر" جیسی شہرہ آفاق کہانیاں لکھی ہیں۔ ناول نگار کی حیثیت سے اس کو جو مقام جدید عالمی ادب میں حاصل ہے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اس کا عظیم فن پارہ "ٹرائل" اس کی موت کے بعد پہلی بار ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا اور تب سے اب تک اس ناول کو دنیا کی متعدد زبانوں میں منتقل کر کے شائع کیا گیا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ "ٹرائل" کے اب تک ان گنت ایڈیشن امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں شائع ہو چکے ہیں۔ کافکا کی ایک ایک تحریر اور سطر شائع ہو چکی ہے اس کے خطوط، اس کی ڈائریاں تک چھپ چکی ہیں، -

کافکا کے فن اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ نقادوں کے علاوہ ماہرین نفسیات کو بھی اس میں خاص دلچسپی رہی ہے۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں کے علاوہ اس کی شخصیت اور ذات کے بھی نفسیاتی تجزیے کئے گئے ہیں۔ بعض ناقدوں نے اس کے ہاں جو بالعدا الطبیعیاتی عنصر پایا جاتا ہے اس پر بھی خاص کام لیا ہے۔

اردو میں اس کی کہانیاں مترجم ہو چکی ہیں لیکن اس کا کوئی ناول منتقل نہیں ہوا۔ تاہم اس کے اشارات اردو ادب پنجابی کے بعض مصنفوں پر بہت واضح ہیں جن میں پنجابی کے ناول نگار فخر زمان خاص طور پر نمایاں ہیں۔ کافکا کے اشارات عالمی ادب پر بے حد نمایاں اور واضح ہیں۔

کافکا کے ایک نقاد نے اس کے کام کے حوالے سے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک خاص امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کافکا کے حواس اور لاشعور پر ہمیشہ اس کا باپ چھایا رہا۔ وہ ہمیشہ کوشاں رہا کہ کسی طرح وہ باپ کی نظروں میں چمکے۔ اس کے اس نفسیاتی الحجاب کو کئی نقادوں نے موضوع بنایا ہے۔

کافکا کا ناول "دی ٹرائل" بیسویں صدی کے علامتی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی جوزف کے ہے جو اس کے دوسرے ناولوں کا بھی مرکزی کردار ہے۔ اور وہ خود کافکا ہے۔ اصل میں کافکا انسان کی تنہائی اور تقدیر کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنا چاہتا تھا اور چونکہ وہ خود مطمئن نہ تھا کہ وہ اپنی روح کی تنہائی کو سمجھ سکا ہے۔

اس لیے وہ اپنی تخلیقات کی اشاعت کے حق میں نہ تھا اس کی یہ بے اطمینانی اس لیے بھی تھی کہ وہ اپنے الجھاؤ اور الجھنوں کے حوالے سے پڑھنے والوں کے لیے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا اپنا ذاتی خیال تھا۔ حالانکہ اپنی تمام تر علامتی گہرائی کے باوجود اس کے ناممکن نادلوں سے بھی پورا ابلانح حاصل ہوتا ہے۔

”دی ٹرائل“ کا ہیرو جو زن کے (۱۶) ایک بنک میں چیف کلرک ہے جسے اس کی تیریہ ساگرہ کے دن عین صبح کے وقت گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اسے یہ نہیں بتایا جاتا کہ اسے کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ پھر یہ گرفتاری بھی بہت عجیب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام پر جا سکتا ہے۔ روزمرہ کے معمولات پر عمل کر سکتا ہے لیکن وہ ہے ایک زیر حراست شخص۔ اب اس کردار کو اپنی بقیا یا زندگی ایک ایسے الزام کے دفاع میں بسر کرنی ہے۔ جس سے اسے آگاہ نہیں کیا گیا۔

اپنے اس موضوع کی بدولت یہ ناول ایک مستح (MYTH) کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ بیسویں صدی میں بہت کم ناولوں کو اس حد تک بحث کا موضوع بنایا گیا ہے جتنا کہ ”دی ٹرائل“ کو۔ ”دی ٹرائل“ میں جہاں ڈرامائی عنصر بہت نمایاں ہے۔ وہاں اس کے فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلو بھی بہت اہم ہیں جنہوں نے اس ناول کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ ”ٹرائل“ میں معنویت اور علامتوں کا ایک جہاں سمویا ہوا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے والا ہر قاری اپنی ذہنی سطح اور استعداد کے حوالے سے اس کے معنی اخذ کر سکتا ہے۔ یہ انسان کی تنہائی کا بھی منظر ہے اور ان دیکھی قوتوں کی اس ”کارروائی“ کو بھی سامنے لاتا ہے۔ جو انسان کے لیے ایک بہت بڑے اسرار کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ زندگی کے عذاب کی بھی کمائی ہے اور یہ بھی کہ آج کا انسان زندگی کی بھل پوڑ معنویت سے محروم ہو چکا ہے اور وہ زندگی کے ذرائع سے محروم ہو چکا ہے۔

”ٹرائل“ کا اس حوالے سے بھی مطالعہ کیا گیا ہے کہ یہ انسانی تقدیر کے جبر کے پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ ”دی ٹرائل“ کا مطالعہ بذات خود ایک بڑے تجربے سے روشناس ہونے کے مترادف ہے۔ ”کاسل“ اور ”ٹرائل“ دونوں ناولوں میں مابعد الطبیعیاتی عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔ اگر اس ناول کی علامتوں کو وسیع تر معنی دیے جائیں تو یہ ناول انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے۔

بن جاتا ہے جو زندگی کی طرح پُر معنی بھی ہے۔ اور پُر اسرار بھی... بعض نقادوں نے اس میں لایعنیت (ABSURDITY) کے عنصر کو بھی تلاش کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شہکار عظیم ترین علامتی ناول ہے۔ (ABURD) ناولوں اور تخلیقات کی دلیل میں نہیں آتا۔

”دی ٹرائل“ نامکمل ناول ہے، زندگی کے اسرار کی طرح زندگی کی طرح... قابل فہم اور ناقابل فہم (WILLA) اور ایڈون سپور نے اس کا جرمن زبان سے جو ترجمہ انگریزی میں کیا ہے وہ سب سے بہترین ہے۔ کیونکہ اس میں نامکمل باب بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

”دی ٹرائل“ عالمی ادب کا ایک منفرد شہکار ہے۔ اس ناول نے پورے عالمی ادب میں اپنے لیے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اور یہ ناول علامتی اظہار کا ایک ایسا ناول ہے جس میں زندگی کی تفسیر ایسے متنوع اور منفرد انداز میں کی گئی ہے اور انسانی تنہائی اور تقدیر کو ایک ایسے تخلیقی انداز میں سمویا گیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

”دی ٹرائل“ اپنی مثال آپ ہے۔

مادام بوداری

عالمی ادب میں، مادام بوداری، کا جو مقام ہے اس کا ذکر تو تفصیل سے ہو گا ہی لیکن پاکستان کے حوالے سے اس عظیم ناول کا ذکر جیلے غیر سنجیدہ سہی۔ لیکن ایک خاص وجہ سے ناگزیر ہو چکا ہے۔ مادام بوداری، کے فرانسیسی سے انگریزی میں جو تراجم ہوتے ہیں۔ ان میں ایلیں رسل کا ترجمہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ انہیں کتنے لوگوں نے پڑھا اور پھر اردو میں محمد حسن عسکری نے مادام بوداری کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اردو دان قارئین میں سے کتنوں نے پڑھا۔ اس کا مجھے صحیح علم نہیں لیکن اس ناول کے حوالے سے نہ سہی، ایک فلم کے حوالے سے مادام بوداری کو پاکستان میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ چند برس پیشتر (۱۹۷۴ء - ۱۹۷۵ء) کی بات ہے جب فلوریہ کے ناول پر مبنی ایک فلم کی نمائش پاکستان میں ہوئی۔ اس میں ایسے مناظر تھے جنہوں نے ہمارے فلم بینوں کو گرما کر رکھ دیا اور یوں میڈم باوری، میڈم بوداری کا اتنا شہرہ ہوا کہ شاید وہ بائیں بعد میں ہمارے ہاں کے قبول عام سٹیج ڈرامے لکھنے والوں نے بھی، میڈم باوری، کو خوب شہرت بخشی اور ہر ایسی انگریزی مسلم جسے حوام میں مقبول کرنا چاہتا، اس کا نام میڈم باوری یا میڈم بوداری سے زیادہ بے باک جیسی سطر میں لکھ کر فلم بینوں کی آتش شوق کو بجھانے کی گراہ کن اور مذموم کوشش کی گئی۔ آج میڈم بوداری یا باوری ایک ایسا نام ہے جو خاص تہذیب کے حوالے سے ہمارے ملک کے ان گنت لوگوں کی زبان پر ہے۔

جن دنوں یہ فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ میں نے انہی دنوں اس فلم کے حوالے سے ایک مضمون شائع کرایا تھا کہ یہ فلم نہ صرف فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک بڑی زیادتی ہے بلکہ یہ سچا ہے فلوریہ کے ساتھ بھی ایسا سنگین مذاق کیا گیا ہے کہ اگر فلوریہ زندہ ہوتا تو سرسپٹ لینا کیونکہ فلوریہ

کے اس شاہکار پر مبنی فلم اس ناول سے بہت مختلف تھی اور اس میں ان کی روح موجود نہ تھی۔ بہر حال ایک غیر ملکی فلم ساز نے فلویریہ کے ساتھ جو مذاق کیا اس کی وجہ سے ہمارے ملک میں اس ناول یا ناول کی ہیروئن کا خوب چرچا ہوا۔ وہ فحاشی کی غلامت بن گئی۔ آج بوداری یا مادام بوداری (یہ نام پاکستانیوں نے وضع کیا) کے مصنف کا نام ان لوگوں سے پوچھا جائے جو اس کردار کے نام سے واقف ہیں تو وہ بھی فلویریہ کا نام نہ بتا سکیں گے۔

مادام بوداری، محض فلویریہ کا ہی نہیں بلکہ پورے عالمی ادب کا بے مثل اور عظیم کارنامہ ہے۔ فلویریہ نے ادب کی تخلیق میں لفظ کو جو اہمیت دی اس کی مثال عالمی ادب میں خال خال ہی ملتی ہے۔ اور پھر جس طرح کی زندگی خود فلویریہ نے بسر کی وہ بھی اپنی مثال آپ تھی۔

گستاخ فلویریہ ۱۲ دسمبر ۱۸۲۱ کو ژنواں فرانس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سرجن تھا۔ ۱۸۴۰ء تک فلویریہ نے ژنواں ہی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پیرس چلا گیا۔ پیرس میں اس نے جاکر لکھنے پڑھنے کا آغاز کیا۔ اسے قانون کی تعلیم میں کوئی رولپسی نہ رہی ادبی حلقوں میں اس کا آنا جانا شروع ہوا۔ ڈکٹر ہیوگو، کولیت جیسی عظیم ادبی شخصیتوں سے اس کا تعارف ہوا اور ادبی شخصیتوں سے تعلقات اور دوستی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ پیرس میں فلویریہ کا قیام چند برس تک رہا۔ اس کی والدہ اکیلی رہ گئی تو وہ ژنواں واپس چلا گیا۔ جہاں اس نے ساری زندگی گزار دی۔ اگرچہ وہ وقتاً فوقتاً پیرس کا چکر لگایا کرتا تھا۔

فلویریہ نے ۱۸۴۷ء اور پھر ۱۸۴۹ء میں کچھ بیرونی ممالک کی بھی سیاحت کی۔ اس سیاحت کے دوران میں ہی اس نے مادام بوداری، پر کام شروع کیا۔ اس سے پہلے فلویریہ دو کتابیں: *SENTI* اور *TAMPTATION OF STI. ANTIONE MENTLE EDUCATION* لکھ چکا تھا۔

لیکن دونوں کتابیں مسودوں کی صورت میں پڑھی تھیں اور مادام بوداری کے لکھنے کا عمل چار برس ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء میں مکمل ہوا۔ اکتوبر ۱۸۵۶ء میں یہ ایک جریدے میں قسط وار شائع ہونے لگی اپنی اولین قسط دار اشاعت کے ساتھ ہی مادام بوداری کے بارے میں ایک ایسی بحث کا آغاز ہوا جو آج تک جاری ہے اور بحث کا مرکز دھند ہے۔ ناول لکھنے کا آرٹ !

فرانسیسی حکومت نے اس ناول پر فحاشی کا الزام لگایا۔ فلویریہ اور اس کے پبلشر کو عدالت

کاسا من کرنا پڑا لیکن عدالت نے اس ناول کو غاشی سے مبرا قرار دے دیا۔ اس کے بعد یہ ناول کتابی صورت میں پہلی بار ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔ فلوری نے اس ناول کا اقتساب اس دیکل ماری آس توآں شریوں سینار کے نام کیا جس نے اس کتاب کا مقدمہ لڑا تھا۔ مادام بوداری کے بعد فلوری ایک عرصے تک اس طوفان کے تھکنے کا انتظار کرتا تھا اس کی اشاعت کی وجہ سے پتا ہوا تھا اس نے اپنے پہلے دو ناولوں کے مسودوں کو ایک طرف رکھ کر ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا جس کا نام "سلاہو" ہے۔ یہ ناول فلوری کی تصانیف میں موضوع کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کرائے کے پاسبیوں کی اس بغاوت پر ہے جو کاتھیبے کے خلاف کی گئی ۱۸۶۲ء میں یہ ناول شائع ہوا اور وہیں اس کا ترجمہ مرحوم عنایت اللہ دہلوی کر چکے ہیں اس زمانے کے نقادوں نے اس ناول کی خوب مذمت کی لیکن بعد کی نسلیوں نے اس ناول کی ادبی اہمیت کو فرغاندلی سے تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد فلوری نے پہلے مسوے کو نئے سرے سے لکھا۔ SEN۔ TIMENTLE EDUCATION اس کا نام ہے جو سات برسوں میں لکھا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کی اشاعت ہوئی لیکن نقادوں نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ حالانکہ یہ ناول دینائے ادب کے اہم ترین ناولوں میں سے ایک ہے اور اب اس کی معنویت حسن اور فخری کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔

فرانس اور جرمنی کے درمیان جو جنگ فلوری کی زندگی میں اس ناول کی اشاعت کے بعد ہوئی۔ اس پر فلوری کو بڑی پریشانی ہوئی۔ فلوری کا دعوے تھا کہ اگر جرمنی اور فرانس کے تاجدار اس کے اس ناول سینٹی منٹل ایجوکیشن کو پڑھ لیتے تو یہ جنگ کبھی نہ چھڑتی۔ فلوری کی صحت اب گرنے لگی تھی۔ اس کے بعض دوست اس سے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے حراہ کش ہو گئے کچھ مر کھپ گئے اس کی والدہ کا انتقال ۱۸۷۲ء میں ہوا عمر کے آخری برسوں میں وہ ترکینیت زدلا ڈاڈاے کا گورنر جیسے عظیم کھنے والوں کا رفیق اور دوست تھا۔

کٹرنے موپساں پرچو ناول لکھا ہے اس میں فلوری کی زندگی کے آخری ایام اور موت کا نقشہ بڑے مہر اور تفصیلی انداز سے کیا ہے کیونکہ موپساں فلوری کو استاد کا درجہ دیتا تھا اور اس کے فلوری شہر سے بہت گہرے تعلقات تھے وہ ایک تنہا شخص تھا جو کبھی کبھار پیرس چلا جاتا۔ دوستوں سے ملتا تو تنہائی کچھ اور بڑھ جاتی۔

۱۸۷۴ء میں فلوری کا ناول "پٹشین آن سینٹ انٹونی" شائع ہوا جس پر اس نے برسوں محنت کی

تھی فلوریڈا ایک ایسا مکھنہ والا تھا جس کی حزد ہی اپنے کام سے تسلی بہت مشکل سے ہوتی تھی وہ اپنے ناولوں کو بار بار لکھتا تھا۔

ان عظیم ادبی کارناموں کے باوجود اس کے دور میں اسے وہ مقام نصیب نہ ہوا جس کا وہ حقدار تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جب اس کی تین کہانیوں کا مجموعہ THREE TALES کے نام سے شائع ہوا تو بالآخر اسے محترمہ انسانی کے عظیم معیاروں اور خالصتوں میں تسلیم کر لیا گیا۔

اس کا آخری تخلیقی کارنامہ جس پر اس نے کسی برس محنت کی نامسکل رہا یہ اس کا ناول BOUVARD AND PECUCHEت ہے۔ جس ذاتی طور پر اسے مادام بوداری اور سینٹی میٹل ایگریکولچر سے بڑا ناول سمجھتا ہوں اگرچہ فلوریڈا کو موت نے محنت زدہ کی کہ وہ اسے مکمل کر سکے لیکن انسانی علم کی بے پناہ طاقت پر جو طنز اس نے اس ناول میں کیا ہے جو بصیرت اس ناول کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے اس کی بنا پر یہ نہ صرف غیر تکمیلی صورت ہی میں فلوریڈا کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہے بلکہ عالمی ادب کا بھی عمومی انسانی حماقت کے موضوع پر یہ ناول دنیا نے ادب کا ایک انوکھا اور منفرد شاہکار ہے اپنی غیر مکمل حالت میں یہ ناول اتنا بڑا کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے اگر یہ مکمل ہو پاتا تو شاید آج دنیا کی سو عظیم کتابوں میں مادام بوداری کی جگہ اس کا ذکر کیا جاتا یہ نامسکل ناول فلوریڈا کی موت کے بعد شائع ہوا ہے۔ کہ پل شہر کا پڑن اور ترجمہ کردہ درشن سب سے عمدہ اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

۸ مئی ۱۸۸۰ء کو آج سے ایک سو چار برس پہلے فلوریڈا کا انتقال ہوا اسے روان میں اس کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں روان میوزیم میں اس کے بت کی نقاب کشائی کی گئی۔

فلوریڈا فلکشن کی دنیا میں ایک نیا انداز لے کر وارد ہوا وہ مکمل حقیقت کو ایسے مکمل اور موزوں ترین الفاظ میں پیش کرنے کا قائل تھا کہ جس سے اس کے صحیح معنوں کا ابلاغ ہو سکے اس کا اسلوب ایکل بے مثل ہے۔ اس نے اس اسلوب کو اپنانے کے لیے برسوں محنت کی تھی وہ ایک ایک لفظ کے باطن میں صحائف لکھتا تھا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے ناول پر جتنے اثرات فلوریڈا کے ہیں اور کسی مکھنہ دانے کے نہیں اگر فلوریڈا نہ ہوتا تو ممکن ہے ہم مولپاں کی کہانیاں حضور پڑھ لیتے لیکن اس اسلوب میں مولپاں کی کہانیاں کبھی پڑھنے کو نہ ملتیں جو فلوریڈا نے اسے سکھایا تھا۔

مادام بوداری کی اشاعت سے فرانسیسی REALISTIC ناول کا آغاز ہوتا ہے اگر فلوریڈا ہمیشہ

اس سے انکار کرتا رہا کہ اس کا کسی بھی ادبی تحریک سے کوئی تعلق ہے وہ تخلیق کے عمل کے سلسلے میں سب سے منقطع ہو جانے کا قائل تھا۔ اس نے جو اسلوب ایجاد کیا وہ اس کی برسوں کی انتھک محنت شاذ کا نتیجہ ہے اس کی نثر کے حسن کی تعریف ناممکن ہے انڈیا پازنڈ نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب کوئی شخص حقیقی معنی میں اچھی شاعری اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ فلوریڈا کی نثر سے واقف نہ ہو یا اس کو کتنا چاہیے کہ اس نے مادام بوداری نہ پڑھی ہو۔“

مادام بوداری کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں ہمارے ادب میں محمد حسن عسکری فلوریڈا کے پرچوش مداح تھے اردو ادب میں فلوریڈا کو متعارف کرانے کا سہرا عسکری صاحب کے سر بندھتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عسکری صاحب نے مادام بوداری کا اردو ترجمہ کر کے جہاں ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا وہاں اردو ادب کا دامن بھی ہلکا کر دیا۔ کیونکہ اردو کے کسی ادیب یا مترجم کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ مادام بوداری کا اردو ترجمہ کر سکتا تھا۔

مادام بوداری۔ ایسا۔ اس کا مرکزی کردار ایک قصبائی ڈاکٹر شادل کی بیوی جو بوریٹ کے ہاتھوں مری جا رہی ہے اپنی بلوغت اور جوانی کے دنوں میں اس نے تاریخی رومانس پڑھے ہیں جنہوں نے اس پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس کے دل میں انگلوں کا ایک طوفان باہرے خواہشوں کی دنیا آباد ہے لیکن دنیا کی حقیقت کچھ اور ہے جب یہ خواب اور اطمینان حقیقت سے ٹکراتے ہیں تو چکنا چور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس ناول میں بورٹا سوسائٹی کی فلوریڈا نے شدید مذمت کی ہے جو اس کا ہمیشہ سے پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

ایسا۔ مادام بوداری عالمی ادب کا زندہ اور یادگار کردار ہے۔ یہ محض ایک عورت کی بدکاریوں کی داستان نہیں بلکہ یہ انسان کے باطن سے بھی پردہ اٹھاتی ہے سوسائٹی کے مسکروہ چہرے کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔ رومانی محبت کے خوابوں کی تکمیل کے لیے بھٹکنے والوں کا ایسا انجام کم ہی دنیائے ادب میں ملتا ہے جیسا کہ فلوریڈا نے مادام بوداری میں دکھایا ہے۔

ہر دور میں جو ایک منافقت پائی جاتی ہے یہ ناول اس فہرہ کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اس ناول کے کردار اداغے کو تو ایک نظر دیکھیے اداغے کے حوالے سے ہی اس ناول کا اتمام ہوتا ہے یہ وہ شخص ہے جسے ایک تمنے بھی نواز لیا ہے۔ کیونکہ حکام اس کا احترام کرتے اور اے عامر اس کی محافظ ہے۔ بس اتنے مختصر سے جملے میں ہی ایک پوری سوسائٹی کی حالت کا نقشہ کھینچ جاتا ہے کہ اس سوسائٹی میں۔

میں منافقت کسی حد تک سرایت کر چکی ہے۔
ایما۔ مادام بوداری زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرتی ہے۔ یہ زہر جو اس نے خود کھایا اس کی
معنویت پر غور کرنا اس ناول کو پوری طرح سمجھنا ہے اور ایما۔ مادام بوداری کے انجام نے ہی اس ناول
کو اس معنویت سے ہمکنار کیا ہے جس کی دہرے یہ ناولی دنیا کے عظیم شاعر کاروں میں شامل کیا جاتا ہے کیونکہ
مادام بوداری کی الٹا ک موت ایک سوسائٹی اور معاشرے کو زندہ کرتی ہے۔

مال

گورکی محض ایک لکھنے والا ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک ادب میں ایک خاص نکلر کا بھی نمائندہ ہے۔ ادب میں ایک اصطلاح - اشتراکی حقیقت نگاری - بھی ہے۔ گورکی اس کا بانی ہی نہیں بلکہ سرخیل بھی تھا۔ اور اس نے ادب میں اشتراکی حقیقت نگاری کو فروغ دیا اور اپنے دور اور آنے والے دور کے ادیبوں اور لکھنے والوں کو ہر گز گریسٹ پر متاثر کیا۔

ہمارے ہاں اردو زبان میں جن روسی ادیبوں اور لکھنے والوں کو بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی - ان میں گورکی سرفہرست ہے۔ گورکی کا بیشتر کام اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے بہت پہلے منٹو نے اس کی کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کے بعد گورکی کے شاہکار "میرا بچپن" اور اس سلسلے کی دوسری کتابوں کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اردو میں منتقل کیا۔ آج بہت سے لکھنے اور پڑھنے والوں کو یہ بھول بھی چکا ہو گا کہ مرحوم محمد حسن عسکری نے بھی گورکی کو ترجمہ کیا تھا۔ میں ادیب کیوں بنا " کا ترجمہ عسکری صاحب نے ہی شائع کروایا تھا۔

ہمارے اردو کے لکھنے والوں اور مترجموں کے علاوہ گورکی کی بیشتر تصانیف کا ترجمہ روسی ادب کے بدیشی زبانوں کے سرکاری نامہ تراشیوں کے ذریعے ہی ہو گیا ہے۔ گورکی ہمارے ہاں اور دنیا بھر میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔

گورکی نے اپنا بچپن اور جوانی جس نکبت افلاس و در بدری اور آوارگی میں بسر کیے اس کا سارا احوال اس کی کتابوں میں پوری سچائی اور صداقت سے کے ساتھ ملتا ہے۔ اس زندگی نے اسے تجربات سے مالا مال کر دیا۔ ایسی آفکارہ گردی اور افلاس کی زندگی بسر کرنے کے حوالے سے وہ

روس کے عوام کی حقیقی رولت سے آگاہ ہوا۔ گورکی کا شمار ان چند بڑے روسی ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے روس کا چہ چہ دیکھا تھا جس نے روس کی سرزمین کو پوری طرح دیکھا تھا وہ ایسے ایسے علاقوں میں بھی اپنی خانہ بدوشی کے زمانے میں گیا جہاں کوئی روسی ادیب نہ جاسکا تھا۔

اسی گورکی کا شاہکار ”ماں“ ہے... !

گورکی نے جب لکھنا شروع کیا تو شعر بھی لکھے اور رومانی اسلوب کی کہانیاں بھی۔ اس نے اپنی تخلیقی زندگی کے پہلے دور میں روس کے حوالے سے نیم تاریخی اور لوک کہانیوں کو بھی اسی تخلیقات کے مواد میں شامل کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ زندگی کی حقیقتوں کے قریب ہو کر لکھنے لگا اور پھر اس نے اس حقیقت نگاری کو رائج کیا جسے اشتراکی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔

گورکی کے اپنے دور کے سبھی اہم روسی لکھنے والوں سے تعلقات تھے۔ ان میں سے بعض سے وہ بے حد متاثر ہوا لیکن بعض کو اس نے بے حد سراہا لیکن اپنی تخلیقی زندگی کے پختہ دور میں اس نے اشتراکی حقیقت نگاری کے جس اسلوب کو اپنایا وہ اس کا اپنا ہے اس پر کسی کی پرچھائیں دکھانی نہیں دیتی۔

گورکی کے بچپن، جوانی اور میری تعلیم گاہیں اور شاہراہ حیات، پر کے مہزانات سے شائع ہونے والی خود نوشت کتابوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا میں بہت زیادہ پڑھی جانے اور متاثر کرنے والی کتابوں میں سے ہیں۔ اردو زبان میں ایسے ادیبوں کا سراغ لگانا مشکل نہیں جنہوں نے گورکی کی ان کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کے ہاں گورکی کا خاص رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے یہ لکھنے والے اگر گورکی نہ ہوتا تو شاید اس انداز میں نہ لکھتے اور نہ ہی اتنے اہم سمجھے جاتے۔ !

گورکی نے ہر صنف میں لکھا، مضامین، کہانیاں، ناول، شاعری، ڈرامے اور سیاسی تحریریں اس کے ڈراموں میں LOWER DEPTHS کو عالمی شہرت حاصل ہے یہ ڈرامہ جب سے لکھا گیا ہے تب سے اب تک ان گنت بار دنیا کی مختلف النوع زبانوں میں ترجمہ ہو کر کھیل جا چکا ہے۔ ہمارے ہاں کتنے ہی ڈرامہ نگاروں نے اس ڈرامے سے استفادہ کر کے ڈرامے لکھے ہیں۔

سید احتشام حسین نے گورکی کے حوالے سے جو لکھا ہے وہ گورکی کی شخصیت کی صحیح تصویر ہے۔ سید احتشام حسین مرحوم نے لکھا تھا:-

”گورکی انقلاب روس کا وہ نقیب، سپاہی، داعی اور مفکر تھا جسے انسانی زندگی کی بقا قدری کے احساس درد نے شاعر، ادیب اور مبلغ انسانیت بنا دیا۔ اس نے جو کچھ لکھا اس میں خلوص اور دردمندی کے دوش بدوش انسان کی عظمت کا بغیر منزل اول یقین موجود ہے اس کا ہر لفظ انسانی عظمت کے عقیدے کی تفسیر ہے۔“

گورکی نے جس دور کے روس میں آنکھ کھولی وہ دور زار شاہی دور تھا جس میں عوام غریب مزدور اور کسان، اپنی تکبت اور بربادی کے آغزی کناٹے تک پہنچ چکے تھے۔ زار شاہی استبداد اور آمریت کی بھیا تک شکل اختیار کر چکی تھی لیکن یہ وہی دور ہے جب انقلاب روس کا بیج بویا جا چکا تھا۔ اور اب اس کی فصل کافی بجانے والی تھی۔ گورکی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف اس دور کو بدلتے دیکھا بلکہ اس دور کو بدلنے میں اس کی تمام تر خلاقانہ صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب سے پہلے اور پھر انقلاب کے بعد۔ گورکی کی عظیم خدمات کو سراہا گیا اور لیمنن نے اسے عزاجِ ستحسین پیش کیا۔ اور انقلاب روس کے بعد اس کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ گورکی کو جو قدر و منزلت انقلاب کے زمانے اور بعد میں حاصل ہوئی وہ بے مثل ہے وہ روس کا عظیم سپوت اور قومی ہیرو بن چکا ہے۔

گورکی کا ناول ”ماں“ انقلاب سے چھٹے کے روس کے اس دور کی عکاسی کرتا ہے جب انقلاب آزادی، مساوات اور انسانی حقوق کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی۔ اس دور کو گورکی نے ”ماں“ میں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس دور میں نچلے طبقے کے افراد کن حالات سے گذر رہے تھے۔ ان کی زندگیاں کتنی پر صعوبت، اذیت ناک اور ناقابل برداشت ہو چکی تھیں اور اسی دور میں وہ انقلاب، انصاف اور مساوات کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

”ماں“ کا ایک ایک لفظ اس دور کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک بوڑھی ہے۔ پانغل۔ انقلابی کی ماں۔ ایک سیدھی سادی عورت جس کی زندگی عزت اور نظم و

تشد و کے شب دروز میں سے گذرتے ہوئے بسر ہو گئی ہے جو انقلاب کے فلسفے سے نا آشنا ہے۔ جو ایک ماں ہے.... ماں.... لیکن زندگی نے ایسے تجربات سے ہمکنار کیا ہے جو محض فلسفہ طرازی کرنے والوں کے تجربات کا حصہ نہیں بن سکتے۔ وہ ایک عورت ہے جس نے غربت دیکھی ہے۔ سدا دکھ سے ہیں۔ سماج کے ہاتھوں، خاندان کے ہاتھوں، غربت کی دہرے سے لیکن وہ زندگی سے محبت کرتی ہے اسے اپنا بیٹا پیارا ہے اگر وہ اپنے بیٹے پائل کی انقلابی جدوجہد میں شریک ہو گئی ہے۔ تو جہاں اس کا سبب اس کی ممتا ہے وہاں اس کا وہ سچا شعور بھی ہے۔ جو اسے اس کی اپنی زندگی کے تجربات سے حاصل ہوا ہے،

اس ناول کا ہیرو پائل ایک نیا ہیرو ہے۔ نیا انسان ہے جو پہلی بار کسی ناول میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ وہ پُر عزم ہے۔ اپنے عقیدے اور جدوجہد کے لیے مرنے والا، وہ اپنی امیگوں اور محبتوں کو بھی اپنے عقیدے اور جدوجہد کی کامیابی کے لیے نظر انداز کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ نئے سماج، نئے انقلاب کا ہیرو ہے۔ ایک ایسا نائنڈہ۔ جو آنے والی نسوں کی راہنمائی کرتا ہوا ملتا ہے۔ پائل کا انقلابی عزم اور اس کا انقلابی عقیدہ اسے جاہ و جلال بخشے ہیں۔ وہ محنت کش طبقے کی عظمتوں کا امین ہے جو دنیا بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہے،

اتنے عظیم اور مرحوب کر دینے والے کردار کے سامنے اس کی ماں۔ گور کی کے ناول ماں کا مرکزی کردار۔ ایک بوڑھی عورت ہے۔ زمانے کے دکھوں کی ماری ہوئی۔ جس نے زندگی کی شکل دکھوں اور بے انصافیوں کی صورت میں ہی دیکھی ہے۔ اس کے باوجود وہ ماں ہے اس کی ساری طاقت اس کی ممتا میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ کمزور ہے۔ نرم خو ہے۔ بہت سی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیتیں نہیں رکھتی۔ لیکن وہ انقلاب کی جدوجہد میں جس انداز سے شامل ہوتی ہے اور پھر جس استقلال اور عزم کا اظہار کرتی ہے۔ اسے دیکھتے اور پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پائل سے بھی زیادہ قوی ہے اور جب وہ مر رہی ہے زار شاہی کے سپاہی اسے مار رہے ہیں اور وہ اٹھتا اور پھٹٹ بانٹ رہی ہے اور لوگوں کو لپکار رہی ہے اور ناول

اپنے انتقام کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی عظمت اس کے استقلال اس کے انقلابی عزم اس کی بے پناہ محبت، بیکراں ممتا کا نقشہ ہمارے دلوں پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے۔

اس کردار، بوڑھی کمزور عورت اس ماں کے حوالے سے گور کی ایک ایسا کردار پیش کرتا ہے جو سراپا ممتا ہے، جو محبت ہے، جو مرنے سے تو صرف روس کیلئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے۔ کہ ساری دنیا محبت انصاف اور خوش حالی کی آماجگاہ بن جائے۔

”ماں“ میں گور کی نے اس دور کے روس کی ایسی مکمل اور سچی تصویریں پیش کی ہیں کہ ہمیں روس کا وہ پورا عہد اس ناول میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ گھروں میں مزدوروں کی جو حالت ہے اور نیکوٹیوں میں ان کا جو حشر سہو رہا تھا اس کی سچی تصویریں ہمیں ”ماں“ میں ملتی ہیں۔ گور کی کی اشتراکی حقیقت نگاری محض فوٹو گرافی نہیں ہے بلکہ اس دور کے انسانوں کے تمام احساسات اور عمل اور رد عمل کو ہم ان صفحات میں دیکھ سکتے ہیں۔

ماں کی ایک اور ادبی حیثیت بھی ہے

ادب میں مقصدیت پر یقین رکھنے والے اس سلسلے میں ایک بات پر متفق ہیں کہ گور کی ادب میں مقصدیت کا سب سے بڑا حامی اور مفکر تھا اور ادب میں مقصدیت کی سب سے باکمال تخلیق ماں ہے۔ گور کی کا ناول ”ماں“ جہاں ادب میں مقصدیت کی سب سے اہم نمائندہ تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے یہ روس کے ایک خاص عہد کی سب سے سچی اور مکمل تصویر بن گیا ہے۔ ایک عہد کی سب سے سچی انسانی دستاویز!!

فرام آر تھ ٹوڈی مون

ورن کی یہ کتاب ’زمین سے چاند تک‘ ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ ایک صدی پہلے شائع ہونے والی اس کتاب کو ایک حیران کن کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک صدی پہلے انسان چاند پر پہنچنے کا تصور خرابوں کے علاوہ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ٹرول ورن نے ۱۸۷۵ء میں جو تخیلاتی ناول لکھا جسے ’سائنس فکشن‘ کا نام دیتے ہیں وہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے ایک صدی بعد ایک حقیقت ثابت ہوا۔

ٹرول ورن کا شمار دنیا کے بڑے لکھنے والوں میں ہوتا ہے آج جبکہ دنیا بھر میں سائنس فکشن جدید مقبول ہے اور بلاشبہ ان گنت کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ٹرول ورن سائنس فکشن کے میدان میں یکتا و منفرد دکھائی دیتا ہے اور اس کا اگر کوئی رحریف نظر آتا ہے تو وہ ہے۔ ایچ جی ویلز۔ لیکن جتنا مقبول آج بھی ٹرول ورن ہے اتنا نہ ایچ جی ویلز ہے نہ کوئی آج کا سائنس فکشن لکھنے والا مصنف۔

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری بھی ہے اور قارئین کی دلچسپی کے لیے بھی کہ ۱۹۷۶ء میں یونیسکو نے ایک رپورٹ کتاب شماریت کے عنوان سے شائع کی ہے۔ اس جائزے اور تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ٹرول ورن دنیا کے ان مقبول عالم مصنفوں میں سے ایک ہے۔ جن کی کتابوں کے تراجم دوسری زبانوں میں سب سے زیادہ ہوئے ہیں۔ پہلے فبریر لینن ہے جس کی تصانیف کے ۱۹۷۶ء تک ۲۴۸ زبانوں میں تراجم ہوئے۔ دوسرے فبریر براگا تھا کہ سٹی جس کے ناولوں کے ۱۹۷۶ء تک ۱۵۹ زبانوں میں تراجم ہوئے۔ تیسرا فبریر ٹرول ورن کا ہے۔ جس کی تصانیف کے تراجم ۱۹۷۶ء تک ۱۵۹ زبانوں میں ہوئے اور ان میں سب سے زیادہ جس کتاب کے تراجم ہوئے وہ کتاب ’فرام دی آر تھ ٹوڈی مون‘ ہے۔

ٹرول ورن کی قوت متخیلہ بے مثل تھی۔ اس میں پیش گوئی کی جو صلاحیت تھی۔ اس نے اسے دنیائے

ادب میں ایک خاص مقام عطا کیا ہے۔ دنیا میں جب پہلی بار انسان چاند پر گیا تو خلا میں انہیں بے وزنی کا تجربہ ہوا۔ ورنہ سائنسدان نہیں سمجھتے لیکن اس نے ۱۸۷۵ء میں اس خلائی بے وزنی کا ذکر اپنے ناول میں کر دیا تھا جس کا تجربہ جدید خلا نوردوں کو ہوا۔

ثوڈل ورن ۸ فروری ۱۸۲۸ء کو ٹانٹس کی بندرگاہ برٹین (فرانس) میں پیدا ہوا۔ ورن نے گیارہ برس کی عمر میں پہلی بار ۱۸۳۹ء میں بحری سفر اختیار کیا۔ ہوا یہ کہ وہ گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے اپنی عم زاد سے بڑی محبت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ اس بنت عم زاد کو ولین کے لیے وہ مونگے کا ہار لائے گا تو وہ بھی اس سے محبت کرنے لگے گی۔ لیکن ورن کا فرار بہت عارضی ثابت ہوا محض ایک دن پر مشتمل۔ اس کے والد نے اسے ڈھونڈ نکالا اور گھر لے آیا۔ ورن نے قانون کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۴۸ء میں وہ حصول تعلیم کے لیے پیرس چلا گیا اور ۱۸۴۹ء میں اس نے قانون کی ڈگری حاصل کر لی۔ ادب کے ساتھ اس کا ابتدائی لگاؤ شوقیہ تھا اور اس نے ڈرامے لکھنے شروع کیے اور اس کا ایک ڈرامہ سٹیج بھی ہوا جسے ناٹائیوں نے بے حد پسند کیا۔ اور ورن نے پھر سے قانون میں دلچسپی لینے کا ارادہ کر لیا۔ اس زمانے میں لے سائنس سے دل چسپی پیدا ہوئی، پہلے اس نے جغرافیہ کا مطالعہ کیا پھر اپنے ایک عزیز کی اعانت سے ریاضی پڑھی اور اس بات سے سجدہ مقرر ہوا کہ طبیعیات میں ایک معمولی سی غلطی تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اس کے ناول "زمین سے چاند تک" کا ریاضی دان جے بی میٹس انتہائی سورت حساب لگاتا ہے جس کی تصدیق آنے والی صدی میں ہوئی۔

"زمین سے چاند تک" ناول میں خلا باز چاند سے ایک گاڑی میں واپسی کا سفر کرتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت ایک صدی بعد امریکی خلا باز اپالو ۸ سبجرائٹل میں ورن کے ناول میں بیان کیے ہوئے مقام سے صرف ۲۱۲ میل کے فاصلے پر اترتا ہے۔ یہاں تخیل اور حقیقت ایک صدی بعد ایک ہو جاتے ہیں اپالو ۸ کے کمانڈر فرینک لیورمن نے ورن کے پڑپوتے کے نام خلائی سفر سے واپسی کے بعد ایک خط لکھا جس میں ثوڈل ورن کے تخیل کی بے حد داد دی اور لکھا:

"ورن خلائی عہد کے اولین نقیبوں میں سے تھا۔ ہمارا خلائی جہاز باربیکن رناول کے کردار کی طرح فلوریڈا سے خلا میں روانہ ہوا۔ اس جہاز کا وزن اور بلندی بھی وہی تھی جو ورن نے صدی پہلے اپنے ناول

میں اپنے تخیل جہاز کا بتایا تھا۔ کیا ورن اس پراسرار سچائی اور پیش گوئی کے امکان پر زندہ ہونے کی صورت میں حیران ہوتا۔ شاید نہیں کیونکہ ورن ہی تھا جس نے ایک بار کہا تھا۔ امریکیوں کے لیے جانڈیکس اس سے زیادہ دور نہیں۔"

ورن کا تخیل اتنا حقیقی اور سائنسی تھا کہ اس کی کتابوں سے کسی ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ورن کی اس کتاب "زمین سے چاند تک" میں لیزر شعاعوں کا تصور بھی ملتا ہے۔ جو اگرچہ قدیمے مبہم ہے۔ ورن نے سائنسی کمائیاں لکھنے کا پختہ ارادہ کر کے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس کی ابتدائی کتابوں کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم وہ ناکام بھی نہیں رہا۔ ۱۸۵۷ء میں ورن نے ایک نو عمر بیوہ سے شادی کر لی۔ وہ پڑ سکون زندگی گزارتا رہا۔ چند ایک مواقع اسے سیر و سیاحت کے بھی ملے جن کے تجربات پر اس نے اپنی بعض کتابوں کی بنیادیں استوار کیں۔ دراصل وہ ایک کرسی نشین سیاح تھا۔ جس کی قوت تخیل بے حد تیز اور بے پناہ وسیع تھی۔ اس تخیل میں آنے والی سائنسی زندگی کی سچائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

قطب شمالی کی مہم کے بارے میں ورن نے جو ناول اپنے تخیل کی مدد سے لکھا تھا۔ آنے والے دور میں جب حقیقی طور پر قطب شمالی کی تلاش کی گئی تو حیرت انگیز مماثلتیں سامنے آئیں۔ قطب شمالی کی مہم والے ناول میں ورن کا ہیرو کپتان ہارپر اس فارورڈ نامی جہاز پر سفر کرتا ہے۔ جہاز فارورڈ شمالی عرض بلد ۳۵° تک سفر کرنے کے بعد برف میں دھنس جاتا ہے۔ اس کے بعد شمال میں برف کبھی نہیں گھسکتی اور وہاں گرمی بھی نہیں پڑتی اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوئی مہم جو کبھی نہیں گیا یہ سب کچھ ورن اپنے تخیل کی مدد سے لکھ رہا تھا۔ لیکن جب اس کتاب کی اشاعت کے چالیس برس بعد امریکی مہم جو پیٹری قطب شمالی کی مہم پر روانہ ہوا تو ان سب تخیلاتی جزئیات کی حقیقی طور پر تصدیق ہو گئی۔

ورن نے اپنی کتابوں میں بعض ایسے کردار تخلیق کیے جنہیں لازوال شہرت حاصل ہوئی ہے اس نے اپنے ناول "۲۰ ہزار لیگ سمندر کی گہرائی" TWENTY THOUSAND LEAG. UES

UNDER THE SEA میں کپتان نیمو کا کردار تخلیق کیا جو دنیا کے چند بڑے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے کرداروں میں سے ایک ہے۔ اس کردار میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ مستقیم مزاج ہے لیکن ورن نے اسے علم اور بہادری کی علامت بنا دیا ہے۔

ورن کی بے پناہ عظمت کا بغیر معمولی اظہار سائنسی عقلیت پسندی کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اسے انسان اور انسانیت پر بھی بہت گہرا اعتماد اور یقین تھا وہ سائنس کی افادیت کا مبلغ ہے۔ سائنس کے ذریعے جارحیت اور انسانی تباہی کا شدید مخالف ہے۔ ورن نے اپنی کتابوں میں مستقبل کی بہت سی ایجادات کی پیش بینی برسوں پہلے کر دی اور وہ سمجھتا تھا کہ سائنس انسان کی ترقی کے لیے ہے۔ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں خوشحالی کا باعث بنے گی۔ انسانوں کے لیے سہولتیں فراہم کرے گی۔

ورن کے مشہور ناولوں میں اس کے یہ ناول بہت اہم ہیں۔ "بیس ہزار لیگ" سمندر کے نیچے "جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔ دنیا کے گرد اسی وائز میں سفر (ارادہ و دی و دلدادہ) ایسی ڈیزائن جو ۱۸۷۰ء میں ہی شائع ہوا۔ "پراسرار جزیرہ" جس کا سن اشاعت ۱۸۷۵ء ہے اور پھر اس کا سب سے اہم ناول "فرام دی ارتھ ٹو دی مون" جو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا ہے۔

"زمین سے چاند تک" ناول میں اپنے تخیل کے بل بوتے پر ورن نے جو کچھ لکھا وہ آنے والے دور میں سائنسی اعتبار سے بہت حد تک درست ثابت ہوا جس کی چند مثالیں میں پیش کر چکا ہوں چند مزید باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ورن کے ناول کی قمری ہوائی۔ فلوریڈا میں اس مقام سے چھوڑی گئی تھی جو موجودہ کیپ کینیڈیٹی سے زیادہ دور نہیں، جہاں سے دنیا کے پہلے خلا باز خلا کی تسمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس کے علاوہ ورن کے ناول کا انسان بردار راکٹ سمندر میں ٹھیک اسی طرح واپس آکر گرتا ہے جیسے ایک سو برس بعد پالوہ کی واپسی حقیقی طور پر ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر ورن نے دو مرتبے پیشین گوئی، سائنس فکشن لکھنے والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صحیح اور درست پیشین گوئیاں کیں۔ اور اس کی غلطیاں نہ صرف کم بلکہ کم تر ہی ہیں۔

ژول ورن کی کتابوں کو کتنی زبانوں میں کتنی بار شائع کیا گیا۔ اس کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ ان ناولوں میں "معم جونی"، خواب جیسے خیالی منصوبے، صحیح مشاہدات ایسے عناصر ہیں جنہوں نے ان کتابوں کو ہر عمر کے انسانوں کے لیے دل چسپی کا مرکز بنا دیا۔ اس کی کئی کتابوں کو بچوں کے لیے بھی بار بار لکھا اور پیش کیا گیا ویسے جو ان اور بوڑھے۔ نثر کے عالمی قاری اس کا دور میں مداح رہا ہے۔

اس کے ان گنت پرستاروں میں ایک ٹالسٹائی بھی تھا جو ورن کی کہانیاں نہ صرف خود شوق سے پڑھتا تھا بلکہ اپنے بچوں اور پوتوں کو بھی سنا کرتا تھا۔ ٹالسٹائی کے پاس "دنیا کے گرد ۸۰ دن میں"

ایک ایسا نسخہ تھا جو مصور نہیں تھا۔ ٹائٹل کی گوریہ ناول اتنا پسند تھا کہ وہ اس کے حاشیوں اس کے مناظر کی خود ڈرائنگ کرتا رہتا تھا۔

ٹول درن کے ان ناولوں اور کہانیوں کو متعدد بار امریکہ اور یورپ میں فلمایا جا چکا ہے جس سے اس کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ ہر دور میں اس کی کہانیوں اور ناولوں کو ٹی وی کے لیے فلمایا گیا دنیا بھر کے بچے اور بڑے ان کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

اُردو میں ایک زمانے میں اس کی کچھ کہانیاں نصاب میں شامل رہیں۔ برصغیر میں اس کی کئی کتابوں کو متعدد لوگوں نے اُردو میں منتقل کیا۔ مختلف انداز سے اس کی کہانیوں اور ناولوں کو اخذ کیا گیا۔ "دینا کے گرو اتسی دن میں" میں کتابی صورت میں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے۔ درن کو اس کی کہانیوں اور فلموں کے حوالے سے ہمارے ہاں جانا پہچانا جاتا ہے۔ لیکن اس کی کتاب کا کوئی ڈھنگ سے ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ جو متعدد ترجمے شائع ہوئے وہ ترجمے کے اعتبار سے بھی زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اور طباعت و پیش کش کے اعتبار سے بھی ناقص تھے۔ تاہم وہ اُردو دان طبقے کے لیے اجنبی نہیں ہے۔

ٹول درن جو خلائی عہد کا نقیب تھا جو زبردست قوتِ متخیلہ کا مالک تھا۔ جس نے آنے والے دور کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ جس نے "زمین سے چاند تک" لکھ کر ثابت کیا کہ اس کے کرداروں کی طرح ہی آنے والے دور کے غلافور و سفر کریں گے۔ اور ایسے ہی حالات اور واقعات اور مقامات سے گزریں گے۔ جیسے اس نے اپنے ناول میں بیان کر دیے ہیں۔

یہ ٹول درن ۲۴ مارچ ۱۹۰۵ء کو اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوا تھا۔

بروز کرمازون

• بروز کرمازون - دوستو ٹھیسکی کا۔ آخری ناول ہے۔ اس کے بے مثل ناولوں میں یہ ناول اس کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ناول اس کی موت سے کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا۔ لیکن اپنی اس موت سے پہلے بھی دوستو ٹھیسکی الگ بار موت کا مزہ کچھ چکا تھا۔ اور تجربہ آنا لڑکھا اور اور دُور رس نتائج کا حامل تھا کہ اس کے اثرات دوستو ٹھیسکی کے شہکار ناولوں پر واضح طور سے دکھائی دیتے ہیں، —

دوستو ٹھیسکی — جس کا پورا نام فیو دور مائینلو وچ دوستو ٹھیسکی تھا۔ اس نے ایک ایسی کربناک زندگی بسر کی جس نے اسے اس تجربے اور بصیرت سے مالا مال کر دیا جو اس کے ناولوں کا خاص عنصر قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج جب ہم دوستو ٹھیسکی کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر بعض ایسے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جو چونکا دینے والے ہیں۔

۷۔ دوستو ٹھیسکی پر کسی کھنسنے والے کے اثرات نہیں ملتے۔ ابتدائی ناولوں میں اگر وہ کسی حد تک ٹانڈاک جارج سیلڈ وغیرہ سے متاثر نظر آتا ہے۔ تو سمجھی اس کا اپنا انداز آنا منفرد ہے کہ جو دوسروں کے اثرات پر حاوی ہے بعد میں اس نے جو شہکار کھئے۔ ان پر صرف دوستو ٹھیسکی کی اپنی منفرد چھاپ لگی ہوئی ہے اور دوستو ٹھیسکی کے فن کے بارے میں بڑے بڑے نقادوں نے لکھا ہے کہ وہ ناقابلِ تقلید ہے۔ جس نے اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی وہ مارا گیا، ناکام رہا۔

۸۔ آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود یہ بات تمام تخلیقی سپائزوں اور فنی تقاضوں کو سامنے رکھ کر بلا حجب کسی جاسکتی ہے۔ کہ دوستو ٹھیسکی آج کا کھنسنے والا ہے۔ جدید ترین مصنف!

ۛ۔ انقلاب روس کے بعد کچھ عرصے تک یوں لگا کہ دوستو تفسیقی کا زوال شروع ہو گیا ہے، خاص طور پر روس میں، لیکن یہ ہنگامی وقت گزرنے کے بعد جدید روس میں بھی اس کو از سر نو دریافت کیا گیا ہے۔ اور اس کی تصانیف کو پورے اہتمام سے روسی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔

ۛ۔ دوستو تفسیقی کو پڑھنا ایک عظیم تجربہ ہے۔ بقول محمد حسن عسکری مرحوم، جو لوگ اپنے آپ اور اپنے ماٹن کے جذبہ کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ وہ دوستو تفسیقی کو کبھی ڈھنگ سے پڑھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔

دوستو تفسیقی ۱۱ نومبر ۱۸۲۱ء میں ماسکو میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک ڈاکٹر تھے۔ لیکن گھر بوجالات خوشحال نہ تھے۔ بچپن ہی میں دوستو تفسیقی کو غربت کا منہ دیکھنا پڑا۔ میٹر برگ کے فوجی سکول کے انجینئرنگ کے شعبے میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی۔ پھر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ چند برسوں کے بعد دوستو تفسیقی نے فوج سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا سارا وقت تصنیف و تالیف کے لیے وقف کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پہلا ناول بے چارے لوگ 'CROCCORCL' کے نام سے شائع ہوا۔ دوستو تفسیقی اس زمانے میں ایک خاص سیاسی گروپ کی سرگرمیوں میں فعال حصہ لیتا تھا۔ اس سیاسی جماعت کے ارکان کو حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اس میں دوستو تفسیقی بھی شامل تھا۔ یہ ۲۳ اپریل ۱۸۴۹ء کا واقعہ ہے۔ دوستو تفسیقی کو سزائے موت سنائی گئی۔ جس پر عمل کرنے کے لیے اسے لے جایا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے گلے میں پھندا ڈالا جاتا۔ اس کی سزائے موت کی تبدیلی کا حکم آگیا۔ یہ تجربہ تھا۔ جس نے دوستو تفسیقی کے اعصاب اور روح پر ساری عمر اپنا تاثر قائم رکھا۔ بہر حال وہ عالمی ادب کو اپنے عظیم ناولوں سے مالا مال کرنے کے لیے سرج گیا۔ اور اسے سائبریا بھیج دیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں قید و بند کی صعوبتوں سے نجات کے بعد دوستو تفسیقی پھر اپنی تخلیقی دنیا میں واپس آگیا۔ اسے اسی زمانے میں مرگی کا مرض لاحق ہوا تھا۔ دوستو تفسیقی کے فن میں اب وہ باطنی و نفسیاتی گہرائی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے جس کی مثال پوری دنیا کا ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے ناول 'چچا کے خواب' سے اس کے دوسرے ادبی دور کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ طویل مختصر کہانی یا ناول ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی۔

دوستو تفسیقی اب کائنات اور اس کے مظہر انسان کی روح کو اور روح کی افیتوں اور نفسیاتی

کس مکس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں اس کی تخلیق - دی ہاؤس آف ڈیڈ - شائع ہوئی ہے ۱۸۶۲ء میں ڈکٹوں کے مائے لوگ - ان ناولوں میں وہ کھل کر بورژوازی طبقے سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے لیکن وہ DOG MATIST نہیں تھا بلکہ ایک سچا فنکار اور سوسی عوام اور کچلے ہوئے مظلوم انسانوں کے ساتھ اس کی بہدروی بہت نمایاں اور واضح ہے۔ وہ روس اور فرانس میں وسیع پیمانے پر پڑھا جانے لگا تھا۔ اس کے باوجود ان کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اسے بہت لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے قمر پر قرضے کا انبار تھا۔ بعض اوقات ایسے بھی ہوا کہ اسے خاص وقت کی شرط پوری کرنے سے پہلے دن رات کسی ناول پر کام کرنا پڑا۔ قرض وصول کرنے والوں سے جان بچانے کے لیے وہ ۱۸۶۷ء میں جرمنی چلا گیا۔ یہاں اس نے بیڈن نامی شہر میں قیام کیا۔ اور دولت مند بننے کے لیے اس نے دن رات جوا کھیلا۔ اس زمانے کے تجربات کو اس نے اپنے ناول "جوا ری" میں پیش کیا۔ جس کا اردو ترجمہ سید قاسم محمود کر چکے ہیں۔

"جوا ری" جس نے بھی پڑھا ہوگا۔ وہ منظر کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جس میں جوا ری نونوں سے بھری بوری لیے چل رہا ہے اور بھوکا ہے۔ بازار بند میں۔ وہ کئی دنوں سے بھوکا ہے۔ لیکن اب دولت ہونے کے باوجود بھی وہ بھوکا ہے۔ اور پھر وہ رات کو بے ہوش ہونے سے پہلے روپے کمرے میں عجیب کیفیت میں بچھیر دیتا ہے۔ چار برسوں میں دوستو ٹفسکی نے ان کے یہ جان کے تحت اتنا کچھ لکھا کہ وہ روس واپس آنے کے قابل ہو سکا۔ اب وہ قرضے اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ تھوڑی بہت آسودگی بھی حاصل ہو گئی۔ جب دوستو ٹفسکی ۸ جنوری ۱۸۸۱ء میں فوت ہوا تو اس وقت وہ باری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔

مصانیف اور "بردرز کیمازوف"

دوستو ٹفسکی کے فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا پہلا ناول "بے چارے لوگ" - شائع ہوا تو اس عہد کے عظیم روسی نقاد بیلسکی نے اسے "عظیم ادیب" کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ روسی نقادوں نے ملتے جلتے تعانوں اور حالات کے تحت، بالخصوص انقلاب روس کے بعد کے کچھ برسوں میں اس سلسلے میں کچھ نظر ثانی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے یہ خطاب چھینا سجا چکا۔ بلکہ ہر دور میں دوستو ٹفسکی

کی معنویت میں اضافہ ہوتا رہا اور بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے تمام ادوار میں بھی اس کی عظمت میں اضافہ ہی ہوگا

دوستو نفسیسی نے تخلیق کی دنیا میں اپنے لیے منفرد راہ نکالی۔ اس نے انسان کے باطن اور روح میں گہری نفسیاتی بصیرت کے ساتھ جھانکا ہے۔ وہ ہمیں انسانی نفسیات اور روحانی کش مکش کی سب سے سچی تصویر دکھاتا ہے۔ انسان میں جو نفسیاتی ہیجان پایا جاتا ہے۔ جذبات کی نفسیات کے بیان کو دوستو نفسیسی کا کوئی ہمسر اور مثیل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات اور اپنے باطن کی حقیقتوں سے خوف کھانے والے لوگ اس کی پوری طرح پرٹھ اور سمجھ نہیں سکتے۔

دوستو نفسیسی کے خاص اور شہکار ناولوں میں ایک تو "کرائم اینڈ پنڈیشنٹ" ہے جس کو دنیا کی ہرزبان میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ اس پر فلمیں بنی ہیں۔ ڈرامائی تشکیلیں کی گئی ہے۔ ایسے ہی ایک ڈرامائی ڈرشن کارڈو ترجمہ کمال احمد رضوی کر چکے ہیں۔ یہ ناول ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ جواری ۱۸۶۷ء میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور پھر ۶۹-۱۸۶۸ء میں "ایڈیٹ" ممتاز مفتی۔ "ایڈیٹ" دوستو نفسیسی کا شاہکار قرار دیتے ہیں اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ دوستو نفسیسی سے متاثر ہوئے۔ افسوس کہ اردو میں ابھی تک اس کا ترجمہ نہیں ہو سکا۔ *POSESSED* کا سن اشاعت ۱۸۷۱ء ہے، اور آخری ناول "برورز کرمازون" جسے دنیا کے ہر نقاد نے عظیم ترین اور دنیا کے بڑے ناولوں میں شمار کیا ہے۔

یہ بھی مقام افسوس ہے کہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں ہو سکا۔ اس میں کچھ نیک نہیں کہ دوستو نفسیسی کو اردو میں منتقل کرنا بطور خاص مشکل کام ہے لیکن کسی کو ہمت تو کرنی چاہیے تھی۔ !! بے۔ سی پوینیز (POWEYS) نے دوستو نفسیسی پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں اس نے دوستو نفسیسی کے ناولوں اور خاص طور پر "برورز کرمازون" کا ذکر کرتے ہوئے ایک بہت چتے کی بات کہی ہے۔ پوینیز نے لکھا ہے کہ دوستو نفسیسی ہمیں "برورز کرمازون" میں بتاتا ہے کہ *WAYS OF MAN* کیا ہیں اور *WAYS OF GOD* کیا ہے۔

سی بی سنو نے *REALISTS* کے عنوان سے دنیا کے آٹھ عظیم ترین ناول نگاروں پر ایک کتاب مرتب کی تھی۔ جس میں اس نے دوستو نفسیسی اور ٹالسٹائی کو سرفہرست رکھا ہے۔ اپنی اس

کتاب میں سسی پسنو نے اپنی اس الجھن کا بھی اظہار کیا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا ناول نگار کون ہے؟ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ دوستو تفسی کی سب سے بڑا ناول نگار ہے یا ٹالسٹائی۔ یا تو یہ دونوں دنیا کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں یا پھر ان دونوں میں سے کوئی ایک۔ سسی پسنو کا تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔ اور وہ لکھتا ہے جو ان میں اسے 'برورڈ کرمازون' دنیا کا سب سے بڑا ناول لگا۔ جب وہ زیادہ پختہ عموماً ہوا تو ٹالسٹائی کا "جنگ اور امن" پھر وہ آخر میں لکھتا ہے جو اسی کے الفاظ میں پڑھیے۔

I AM NO SURE OF NOW ADAYS, I BELIEVE THAT THE
PROFOUND INSIGHTS OF THE "BROTHERS KARMAZOV" WILL
REMAIN WITH ME AS LONG AS I HAVE LIFE LEFT,"

یہ بہت دلچسپ واقعہ ہے کہ ٹالسٹائی کو دوستو تفسی کی سرے سے ناپسند تھا۔ اس کا ذکر میکسم گورکی نے اپنے اس مضمون میں بطور خاص کیا ہے جو اس نے ٹالسٹائی کی موت پر لکھا تھا۔ خود میکسم گورکی کی نظر میں دوستو تفسی کی کیا قدر و قیمت تھی۔ اس کو گورکی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔
"دوستو تفسی کے کمال فن کو سب تسلیم کرتے ہیں تصویر کشی میں اس کے فن کے سامنے کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ غالباً ٹیک سپر ہے۔"

دوستو تفسی کے بارے میں ٹالسٹائی کی ناپسندیدگی کے حوالے سے تخمینے مان نے جو لکھا ہے وہ بے حد اہم ہے تخمینے مان نے لکھا ہے کہ مرثو کو دینی نے صحیح تجزیہ کیا تھا کہ ٹالسٹائی ایک ایسا صاحب نظر ہے جو FLESH کو دیکھتا ہے۔ جبکہ دوستو تفسی ایک ایسا صاحب نظر ہے جو روح کو دیکھتا ہے ٹالسٹائی دوستو تفسی کی گہری نفسی بصیرت کو بیماری سمجھنے کی وجہ سے کبھی دوستو تفسی کو پوری طرح ہضم نہ کر سکا حالانکہ اسی دوستو تفسی نے ٹالسٹائی کے ناول "اینا کرینین" کا ایک دلچسپ اور شاندار تجزیہ تحریر کیا تھا جو ٹالسٹائی کو کم ہی پسند آیا تھا۔ ٹالسٹائی کو دوستو تفسی کی بصیرت اور عظمت کا احساس اس وقت ہوا جب دوستو تفسی کا انتقال ہوا۔ اس سے پہلے ٹالسٹائی کہتا تھا کہ دوستو تفسی ہمیں جس دنیا میں لے جاتا ہے وہ مریض اور بیمار ہے اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ خود دوستو تفسی بیمار اور مریض ہے لیکن پھر تخمینے مان کے ہی الفاظ ہیں۔۔۔۔

ڈیوڈ کا پرفیسر

۷ فروری ۱۸۱۲ء کو پیدا ہونے والے چارلس ڈکٹنز کا نام آج ساری دنیا میں ایک گھڑیوں نام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ناول سارے عالم میں پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے ناولوں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہوئے ہیں۔ اس کے ناولوں پر ڈرامے لکھے گئے اور انہیں سٹیج کیا گیا اس کے ناولوں پر مبنی فلمیں بنتی رہتی ہیں۔ لی ڈیوڈ کے لیے اس کے ڈراموں کو ٹیلی ویژن کی شکل دی گئی۔ وہ دنیا کے چند بڑے اور مقبول ترین لکھنے والوں میں سے ایک ہے۔ ابرٹ مورس نے اسے شیکسپیر اور ڈائٹھے کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ "DICKENS IS EVERYTHING FOR EVERY BODY" ONE HE HAS SOME THING FOR EVERY BODY ڈکٹنز کے ہاں یہ جو خوبی پائی جاتی ہے کہ اس کے ناولوں میں اس کے قاری کو اپنے مطلب اور دلچسپی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کے حوالے سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا تخلیقی ناول کونسا ہے۔ پسند اپنی اپنی کے معیار کی تو بات ہی تو ادب میں نہیں چلتی۔ یہاں تو ان تمام عناصر کو دیکھنا پڑتا ہے جن کی بدولت کولی بڑی تخلیق قرار پاتی ہے۔ اور پھر اس میں ایسے جراثیم کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے جو اسے ابد تک زندہ رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ڈکٹنز کے ناولوں میں "پک وک پلیز" تو دنیا کی پر لطف اور مزاحیہ کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ناول کا کوئی پلاٹ نہیں۔ کوئی مرکزی تصور نہیں۔ گریٹ ایکسپیکٹیشنز "اولیور ٹرسٹ" "ٹیل آف دی ٹو سیٹرز، وغیرہ ایسے ناول ہیں جن کی مقبولیت یکساں ہے اور جو ڈکٹنز

کو زندہ رکھنے میں کبھی ناکام نہ رہیں گی۔ لیکن اصل میں جو ناول واقعی ڈکنز کا فن پارہ اور عظیم کا نامہ ہے وہ "ڈیوڈ کوپر فیلڈ" ہے۔ یہ وہ ناول ہے جو اپنی شہرت کے بعد سے اب تک کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس میں اتنی سکت اور جان ہے کہ یہ عظیم ناولوں کی صف میں ہمیشہ کھڑا رہے گا۔ اور اس سے کسی طرح اس کا یہ منفرد اور ممتاز مقام نہ چھینا جا سکے گا۔ کوئی اس کی جگہ ہی حاصل کر سکے گا۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ، ڈکنز کے دوسرے دلچسپ اور بڑے ناولوں کے مقابلے میں یہ ناول اس لیے خاص اہمیت کا ناول ہے کہ یہ ناول دراصل ڈکنز کی اپنی زندگی کا قصہ ہے یہ ایک خود سوانحی۔ یعنی آٹو بائیو گرافی کا ناول ہے۔

چارلس ڈکنز ۱۸۱۲ء کو پورٹ سی انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نبوی پے آفس میں ایک نچلے درجے کا کلرک تھا۔ لیکن وہ ایک خوش باش آدمی تھا۔ اپنی اور اپنے گھرانے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے اکثر ادھار لینا پڑتا تھا۔ چارلس ڈکنز کا بچپن تنگ دستی میں بسر ہوا وہ بارہ برس کا تھا جب اس کی زندگی میں وہ واقعہ رونما ہوا جس نے اس کی زندگی اور شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس کے والد کو قرض کی ادائیگی نہ کرنے کے جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ڈکنز سے سکول چھٹ گیا اور اسے ملازمت کرنی پڑی۔ اس کا کنبہ لندن منتقل ہو گیا۔ جہاں ڈکنز کی زندگی کی طویل جدوجہد کا آغاز ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈکنز کو کبھی پوری طرح تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن وہ بلا کا پڑھا کرتا تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ اپنے والد کی اس ذلت پر اسے اتنا دکھ ہوا کہ وہ اس موضوع پر ساری عمر گفتگو کرنے سے کتراتا رہا۔

پندرہ برس کی عمر میں وہ ایک قانون کی فرم میں آفس بوائے کی حیثیت سے ملازم ہو گیا یہاں اس کے مشاہدے کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوا اس نے وہاں زیادہ عرصہ ملازمت نہ کی کہ یہ کام اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس نے شارٹ سٹوری لکھی اور ایک اخبار مارننگ کرائیکل میں رپورٹر مہرتی ہو گیا۔ ۲۰ برس کی عمر میں وہ برطانیہ کا سب سے بڑا پارلیامانی رپورٹر بن چکا تھا۔ لندن کو دیکھنے کا اسے بہتر موقع ملا تھا۔ اس نے ۱۸۳۲ء میں چھوٹے

چھوٹے خاکے اور کہانیاں لکھنی شروع کیں یہ کہانیاں مغربی میگزین " اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔

جب اس کی پہلی کہانی پریس میں چھپ رہی تھی تو وہ رات بھر پریس کے باہر بیٹھا رہا۔ اپنی پہلی کہانی کو چھپا ہوا دیکھ کر وہ رونے لگا تھا۔ جب ڈکنز کو احساس ہوا کہ اس میں لکھنے کی بھرپور صلاحیت ہے تو اس نے لکھنے پر زیادہ وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔

۱۸۳۶ء میں قسمت نے اسے ایک عجیب موقع فراہم کیا۔ اس وقت ڈکنز کی عمر ۲۴ برس تھی۔ جب ایک پبلشر نے اسے کارٹونوں کے میگزین کے ساتھ سرخیاں لکھنے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا۔ ابھی یہ سیریل شروع ہوا ہی تھا کہ کارٹونسٹ رابرٹ سیمور نے خودکشی کر لی۔ اب ڈکنز نے خود مزاحیہ سلسلہ لکھنا شروع کیا۔ اپریل ۱۸۳۶ء میں "پک وک پیپرز" کی قسط شائع ہونے لگی۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس شمارے میں ڈکنز کے "پک وک پیپرز" کی قسط شائع ہوتی تھی۔ وہ شمارہ چالیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہو جاتا تھا۔ نومبر ۱۸۳۷ء میں اس کی آخری قسط چھپی۔ بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ "پک وک پیپرز" کی کامیابی نے ڈکنز کو نئی راہ سمجھائی۔ اس نے رپورٹرز کی ملازمت چھوڑ دی۔ اور اپنے آپ کو لکھنے کے لیے وقف کر دیا۔ اسی زمانے میں جب "پک وک پیپرز" کتابی صورت میں شائع ہونے والی تھی۔ ڈکنز نے کیٹھرائٹ ہوگا رتھ سے شادی کر لی۔ جس سے اس کے کسی بچے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ شادی کامیاب نہ رہی۔ ڈکنز کی بیوی کو اس کے تخلیقی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی زندگی کے آخری برس اس طرح گزرے کہ ڈکنز اور اس کی بیوی علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے تھے۔ اور ڈکنز کے گھر کا انتظام و انصرام اس کی سالی نے سنبھال رکھا تھا۔

بہر حال ڈکنز نے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس نے دن رات لکھنا شروع کیا۔ اولیور ٹورسٹ "پک وک پیپرز" کے بعد شائع ہونا شروع

ہوا۔ اس کے بعد "نکولس نکل بائی" اور پھر اس کے ناول "تادم مرگ" شائع ہوتے رہے۔
۱۸۳۹ء میں "نکولس نکل بائی" شائع ہوا تو اس کا پہلا ایڈیشن سچاس ہزار کی تعداد میں فروخت
ہوا۔ ڈکنز کی شہرت انگریزی زبان جاننے والی دنیا میں تیزی سے پھیل گئی۔ ۱۸۵۰ء
میں اس نے اپنا جریدہ "HOUSE HOLD WORDS" جاری کیا۔

ڈکنز بہت بڑا اداکار تھا۔ اس نے اپنی مقبولیت سے مجبوراً پر فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے
ناولوں کے جذباتی ٹکڑے سینکڑوں سامعین کے سامنے باقاعدہ اداکاری کرتے ہوئے
پڑھا کرتا۔ ہر کردار کے لیے مختلف لہجہ بدلتا۔ خود رونا اور دوسروں کو رلاتا۔ اس نے ایک
پرالم زندگی بسر کی تھی۔ لڑکپن اور جوانی جدوجہد میں گزاری۔ شادی اس نے آئی۔ جب
کامیابی نے قدم چومے تو بھی وہ عالمی مقبولیت کے باوجود ایک دکھی انسان تھا۔ ۵۸ برس
کی عمر میں وہ ۱۸۷۰ء میں فوت ہو گیا۔

ڈکنز کا فن

ڈکنز کو اپنے زمانے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ
اس زمانے میں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کا ترجمان بن گیا تھا۔ وہ اپنے عہد کا نفاذ بھی
تھا اور رہنما بھی۔ وہ سماجی برائیوں کے حسرات آداز اٹھاتا تھا۔ کم سن بچوں پر ظلم و ستم
کم سن بچوں کی ملازمت، قرضے کی ادائیگی نہ کرنے پر سزائے قید، پاگل خانوں اور ذہنی امراض
میں مبتلا لوگوں کی حالتِ زار، عزت، قانونِ فوجداری کے نقائص اور سب سے بڑھ کر
اس دور میں بچوں کی حالتِ زار۔ یہ ایسے موضوعات تھے جو اس زمانے کے مسائل سے تعلق
رکھتے تھے۔ اور آج بھی عالمی تاثیر کے حامل ہیں۔ ڈکنز کے ناولوں کی جڑیں اٹھا رہیں
صدی کے انگلستان کے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چونکہ تیسری دنیا کے مسائل آج
بیسویں صدی میں بھی وہی ہیں۔ اس لیے اس کے ناولوں کی اپیل میں کوئی خاص کمی
نہیں ہوئی۔

اس کے باوجود ڈکنز بہت بڑا "ENTERTAINER" بھی تھا۔ والٹر ایلن نے

تو اسے فلکشن کی دنیا کا سب سے بڑا انٹرٹینر قرار دیا ہے۔ اس کی کوئی کتاب پڑھ لیجیے اس میں مزاح کا ایک ایسا قومی اور جاندار عنصر شامل ہوگا جو اپنے قارئین کو بے انتہا معظوظ کرتا ہے ڈاکٹر ایک بڑے مصلح کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے نادلوں کے ذریعے سماجی اور معاشرتی اصلاح کا علمبردار تھا اور اس میں یقیناً اسے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے نادلوں کی دنیا جہاں پر یوں کی کہانیوں کی دنیا ہے۔ وہاں دلہشت ناک حوالوں کی بھی دنیا ہے اس کے بیشتر نادلوں میں کہانی۔ بچے بیان کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی نگاہ سے ہمیں یہ دنیا دکھاتا ہے۔ اس طرح اس دنیا کی بد صورتیاں بچوں کی معصومیت سے ملوث ہو کر کہیں زیادہ خوفناک لیکن موثر صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ڈاکٹر کے نادلوں کے کردار ایسے ہیں کہ وہ ناول کے واقعات پر جامی ہو جاتے ہیں۔ ہم اس کے نادلوں کا پلاٹ سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے کرداروں کو اپنے حلقے سے باہر نہیں نکال سکتے۔

ڈاکٹر کے بیشتر ناول کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے اخبارات اور جرائد میں قسط وار شائع ہوئے تھے۔!

ڈیوڈ کوپر فیلڈ

ڈاکٹر کا یہ ناول اگرچہ پوری طرح خود سوانحی ناول تو نہیں ہے لیکن یہ ناول ڈاکٹر کی جذباتی زندگی کے ارتقا کی تاریخ ضرور بنتا ہے۔ یہ ناول بیس ماہانہ قسطوں میں مئی ۱۸۴۹ء سے نومبر ۱۸۵۰ء تک شائع ہوا۔ جب یہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو ڈاکٹر نے اس کے دیباچے میں لکھا:-

”اپنی تمام کتابوں میں سنے میری یہ کتاب بہترین ہے۔ جس طرح والدین سب بچوں سے محبت کرنے کے باوجود ایک بچے سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنی تخلیقی اولاد میں سے جو اولاد مجھے سب سے عزیز ہے۔ اس کا نام ہے۔ ڈیوڈ کوپر فیلڈ۔“

یہ ناول جو ڈاکٹر کو سب سے زیادہ پسند تھا اور جو واقعی اس کا شہرہ کار ہے۔ اسے اس

کے پڑھنے والوں نے ابتدائی زمانے میں اس کے دوسرے ناولوں سے کم پسند کیا۔ عام طور پر وہ شمارہ جس میں ٹوکنز کا ناول قسط وار شائع ہوتا تھا۔ وہ بیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوتا تھا۔ لیکن ڈیوڈ کوپر فیلڈ شائع ہونا شروع ہوا تو اس کی اشاعت پچیس ہزار رہ گئی۔

اس کی وجہ کیا تھی؟ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ ناول میلو ڈرامائی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ادب کی تاریخ میں REALISM کی اصطلاح ۱۸۵۵ء سے پہلے استعمال میں نہ آئی تھی۔ مشہور نقاد جی۔ ایم لیوس نے اسے پہلی بار ۱۸۵۵ء میں استعمال کیا اور جی۔ ایچ لیوس کے خیال میں ٹوکنز کے ناول اس اصطلاح پر پورے نہیں اترتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ناول کی عظمت آشکار ہونے لگی۔ اور بیسویں صدی میں اس ناول کو خاص مقام حاصل ہوا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا میں ٹوکنز کا جو ناول سب سے زیادہ پڑھا اور سراہا جاتا ہے۔ وہ ناول ڈیوڈ کوپر فیلڈ ہے۔ بیسویں صدی کے اہم ترین نقاد چرچرڈ آکڈنگٹن نے اس عظیم حقیقت پسندانہ ناول قرار دیا ہے۔ ارنسٹ اے بیکر نے "ہسٹری آف وی انگلش" ناول میں ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے بارے میں لکھا ہے۔

اس ناول میں ایک سچے حقیقت پسندانہ نگار کی حیثیت سے ٹوکنز

کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے کردار اتنے ہمتی پائیدار ہیں۔ جتنی کہ وہ زمین جس پر وہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

۶۴۔ ابواب پر مشتمل ڈیوڈ کوپر فیلڈ کا خلاصہ بیان کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ تاہم اس کی کچھ جھلکیاں دکھائی جا سکتی ہیں۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ اپنے والد کی وفات کے چھ ماہ بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے موقع پر اس کی خالہ میسی موجود ہے۔ جو گمراہ خیالات اور مضبوط قوت ارادہ کی مالک خاتون ہے۔ اسے اس بات سے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ اس کی خواہش کے برعکس لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ڈیوڈ کی ابتدائی زندگی اپنی والدہ کلارا کے ساتھ گزرتی ہے جو نرم خو لیکن کمزور اور اعلیٰ عزت

ہے۔ پیگورٹی۔ آیا بھی ہے اور اولیٰ ملازم بھی۔ جب ڈیوڈ کو پرفیلڈ کی والدہ مسٹر ڈوسٹون کے ساتھ شادی کر لیتی ہے تو ڈیوڈ کو پیگورٹی کے ساتھ تفریح کے لیے اس کے عزیزوں کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ پیگورٹی کا بھائی چھیرا ہے۔ وہ اپنے درقیم عزیزوں ہام اور ایملی کی کفالت کرتا ہے۔ یہاں ڈیوڈ سادہ دل غریب لوگوں سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔

جب وہ گھر واپس آتا ہے تو اسے یہ تلخ تجربہ ہوتا ہے کہ اس کا سوتیلہ باپ اور اس کی بہن بہت ظالم ہیں۔ ڈیوڈ پر ظلم کرتے ہیں۔ مسٹر ڈوسٹون ایک بار ڈیوڈ کو بری طرح پیٹتا ہے۔ ڈیوڈ اس کے ہاتھ پر کاٹ لیتا ہے۔ سزا کے طور پر اسے لنڈن کے قریب ایک سکول میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ سکول کماحت عزاب ہے۔ اور اسٹاڈ مسٹر کریکل دوسروں کو اذیت دے کر مسرت حاصل کرنے والا شخص ہے۔ یہاں بدترین ماحول میں ڈیوڈ کو پرفیلڈ کو سٹی فورٹھ اور ٹریڈز کی دوستی نصیب ہوتی ہے۔

جب اس کی ماں مر جاتی ہے تو ڈیوڈ کا سوتیلہ باپ اسے سکول سے اٹھا کر لنڈن کی ایک فیکٹری میں ملازم کرا دیتا ہے۔ یہاں دس برس کا ڈیوڈ ظلم و ستم اور بھوک کا نشانہ بنتا ہے۔ اگر اسے کوئی تسلی دیتا ہے تو وہ خوشی ہاتھیں مسر و کا ڈبر ہے جس کے ہاں ڈیوڈ ڈرتا ہے لیکن جب مگڈو بر کو بھی لنڈن چھوڑنا پڑ جاتا ہے تو وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ فیکٹری سے بھاگ نکلتا ہے۔ پیدل ڈوور پہنچتا ہے۔ جہاں اس کی دامد رشتے دار بیسی رہتی ہے۔ یہاں بھی اسے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے مسٹر ویگفیلڈ کے ہاں پناہ ملتی ہے۔ جو خاکہ بیسی کا وکیل ہے۔ جس کی بن ماں کی سچی ایگننر ہے وہ محبت کرنے لگتا ہے۔

اب وہ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ سترہ برس کی عمر ہو چکی ہے۔ جب ڈیوڈ کو اپنے لیے کوئی پیشہ اختیار کرنا ہے۔ وہ وکیل بننے کا خواہاں ہے۔ تھامس روزگار میں اس کا اپنے پرانے دوستوں سے سامنا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی بے ایمانیوں اور منافقتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ ایگننر سے اسے جو محبت تھی وہ اس کی گہرائی سے پوری طرح آشنا نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے مالک سپن لو کی بیٹی ڈورا سے محبت کرنے لگتا ہے۔ سپن لو کو یہ شادی پسند نہیں۔ وہ شدید مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد ڈیوڈ ڈورا سے شادی کر لیتا ہے۔ قانونی فرم جس میں وہ کام کر رہا ہے

اس پر ایک بظہانت اور بے ایمان آدمی قابض ہو جاتا ہے۔

ڈیوڈ کو پرفیلڈ یہ ملازمت چھوڑ کر لندن چلا جاتا ہے اور وہاں شارٹ ہینڈ سیکھ کر ایک اخبار کارپورٹر بن جاتا ہے۔ ۲۱ برس کی عمر میں وہ ڈورا سے شادی کرتا ہے۔ اور اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ دوسرے شغل کا بھی آغاز کرتا ہے۔ وہ کمائیاں لکھنے لگتا ہے۔ ڈورا ایک بڑی خانہ دار عورت ہے۔ وہ گھر کے کام کاج سے ہی جی نہیں چراتی۔ بلکہ اسے اپنے شوہر کی تخلیقی سرگرمیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی گھریلو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ جس کا ڈراپ سین ڈورا کی موت سے ہوتا ہے۔

زندگی میں ڈیوڈ کو کئی المناک واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے عزیز واقارب مر جاتے ہیں۔ وہ ان المناک واقعات کو بھلانے کے لیے سیر و تفریح پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ مقبول ترین مصنف بن چکا ہوتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کو دراصل سچی محبت ایگنرز سے تھی۔ وہ ساری عمر دراصل ایگنرز سے ہی محبت کرتا رہا تھا۔ جب وہ تین برس کے بعد لندن پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایگنرز شادی کرنے والی ہے۔ ڈیوڈ کو پرفیلڈ اس سے ملتا ہے۔ اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ ایگنرز اسے بتاتی ہے کہ وہ تو خود اس سے محبت کرتی ہے۔ یوں ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

ڈیوڈ کو پرفیلڈ میں پوری کمائی ڈیوڈ کو پرفیلڈ خود سناٹا ہے۔ یہ کمائی وہ اس وقت سارا ہے۔ جب وہ ایک بالغ اور پختہ عمر کا قیام مصنف بن چکا ہے۔ وہ ایگنرز سے شادی کر کے کئی بچوں کا باپ بن چکا ہے۔

ایڈگر جانسن نے اس ناول کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ وہ بے حد رقیع اور صحیح ہے ایڈگر جانسن لکھتا ہے کہ لکشن میں ڈیوڈ کو پرفیلڈ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ بچپن کی جتنی سچی اور حقیقی تصویر اس ناول میں پیش کی گئی ہے کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ ڈکٹرز کے بہت بعد میں آنے والے جیمز جوائس نے اسے پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ

ایزا سے یگانگ ہیں

یہ بچپن کی محرومیوں اور تلخیوں کی عکاسی لگے ہے۔ لیکن بچپن کی مسرتوں، عقیدتوں اور شفقتوں کا ذکر یہک نہیں ملتا۔ مارک ٹوین کے دونوں ناولوں "ٹھام سواٹر" اور "ہیکل بری فن" کی عظمتوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے یہ دونوں شاہکار بھی ڈیوڈ کوپر فیلڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

دی نیٹو سن

آج عالمی ادب میں امریکہ میں لکھے جانے والے نیگرو ادب، کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ امریکہ کے حبشی ڈرامہ نگاروں، شاعروں، کہانی کاروں اور ناول نگاروں نے عالمی ادب میں اپنے لیے بلند مقام اور رتبہ حاصل کیا ہے۔ امریکہ میں حبشی لکھنے والوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ غلامی کے ابتدائی دور میں حبشی لکھنے والوں کی تخلیقات سامنے آتی رہیں لیکن بیسویں صدی میں امریکی حبشی ادب کو جو نمائندگی عالمی ادب میں ملی اور حبشیوں کی زندگی اور نفسیات کو تخلیقی پیراہن عطا ہوا تو اس کا سرخیلی رچر ڈرائٹ ہے۔ آج کے حبشی ادب پر سب سے زیادہ اثر رچر ڈرائٹ کا ہے۔ یہ رچر ڈرائٹ ہی تھا جس نے امریکی حبشیوں کی مغائرت، غم و غصہ، تشدد، فرسٹریشن کو پہلی بار تخلیقی سطح پر نکاشن کے ذریعے بیان کیا۔ اس کے بعد آنے والوں نے اس سے یا تو رہنمائی حاصل کی یا پھر اس سے اثر لے کر اس سے کچھ انحراف کیا۔ بہر حال رچر ڈرائٹ ہی پہلا نیگرو لکھنے والا تھا جس نے امریکی نیگرو ادب کے خدو خال نمایاں کیے۔

رچر ڈرائٹ نے جو کچھ لکھا اور اس کے حوالے سے امریکی نیگرو ادب کی جس طاقتور روایت نے جنم لیا اُسے خود رچر ڈرائٹ کی زندگی کے مطالعے کے بغیر پوری معنویت کے ساتھ سمجھا نہیں جاسکتا۔

رچر ڈرائٹ ۱۹۰۸ء میں مسیسی میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن عام نیگرو بچوں کی طرح "بئجر" تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور فن کا جو سفر طے کیا۔ اس میں شکاگو، نیویارک اور پیرس

اہم مندرلیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ رچرڈ رائٹ نے اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت اور اپنے فن کے ذریعے اپنے اردگرد کے متعصب سفید فام ماحول کو شکست دینے کے لیے بڑی طویل جدوجہد کی۔

رچرڈ رائٹ کو اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار اور اپنی شخصی مشکلات پر قابو پانے کے لیے جو کچھ کرنا پڑا۔ اس کے لیے اس کے عہد جوانی کا مطالعہ بہت دلچسپ اور فکرائیگز ہے۔ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہونے والے رچرڈ رائٹ کو ابتدائی عمر میں مسی سے محض جانا پڑا۔ اس کے والدین نے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا تھا۔ غربت اور حالات کی وجہ سے رائٹ اور اس کے بھائی کو یتیم خانے میں پناہ لینا پڑی۔ کیونکہ اس کی والدہ کو فالج ہو گیا تھا۔ اس دور میں رائٹ تنہائی کا شکار ہوا۔ انسانوں پر اس کا اعتماد اٹھ گیا غربت اور اپنے خاندان کے حالات کا اثر ساری عمر ان پر رہا۔ وہ ایک بے چین روح بن گیا۔ وہ ہر کام میں بے چینی اور بے صبری کا مظاہر کرنے لگا۔ جس کے اثرات ہیں اس کی تصانیف پر بھی بہت گہرے دکھائی دیتے ہیں۔

بعد میں رائٹ کی ماں نے رچرڈ اور اس کے بھائی کو یتیم خانے سے اٹھا کر رشتے داروں کے ہاں بھیجا۔ تاکہ وہاں وہ قدرے سکون سے زندگی گزار سکیں۔ کئی گھرانوں میں بدسلوکی کا مزہ چکھتے ہوئے رائٹ کو اپنی نانی اور خالہ کے ہاں پناہ ملی۔ جو مذہبی خواتین تھیں اور انہوں نے اپنے مخصوص مذہبی عقائد کو رچرڈ رائٹ پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ لڑ جوانی میں ہی رچرڈ رائٹ نے بغاوت اور انحراف کا مظاہرہ کیا اور ساری عمر وہ مردہ عقائد اور رجعت پسندانہ نظریات کا باغی رہا۔

جوانی میں ہی رچرڈ رائٹ کو شدت سے یہ شعور حاصل ہو گیا کہ ادریجی۔ کا اصلی حکمران وہ ہے جس کے ہاتھ میں معیشت کی باگ ڈور ہے۔ سفید فام مالک اور تاجر اس نے ایسے کئی سفید فاموں کے ہاں مختلف طرز متیں اختیار کیں۔ لیکن وہ اپنے حبشی اور کالے رنگ کا ہونے کی وجہ سے ان کی برتری کو کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے کئی بار اپنے سفید فام مالکوں کے سامنے اپنے رنج اور غصے کا اظہار کیا۔

بلیک بوائے کے نام سے رچرڈ رائٹ نے جو اپنی خود نوشت لکھی ہے اس میں اس نے زندگی کے ابتدائی سترہ برسوں کے حالات بڑی تفصیل اور سچائی سے قلم بند کیے ہیں۔ اس میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے سفید نام جنوب کے امریکیوں کی اطاعت قبول کرنے سے بغاوت کر دی تھی۔ غصے اور تشدد کا رجحان اس کے اندر رکھتا تھا۔ اس نے اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ساری عمر اس کا رویہ خصیلا اور جارحانہ رہا۔ اسی زمانے میں اسے مطالعے کا چرکا پڑا۔ لیکن وہ ناول خرید نہیں سکتا تھا۔ لائبریری سے کتابیں لینے کے لیے وہ ایک سفید نام امریکی مصنف ایچ۔ ایل مینگیسن کا سفارشی خط لے کر گیا۔ ایچ۔ ایل مینگیسن امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ ردار کھے جانے والے مظالم اور بڑے سلوک کا بہت بڑا ناقد تھا۔ اور رائٹ اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس زمانے میں رائٹ نے مینگیسن کے بعد دوسرے اہم سماجی شعور رکھنے والے سفید نام ناول نگاروں کا مطالعہ کیا۔ جن میں تھیوڈور ڈریئر اور سینکلر لوئس بطور خاص قابل ذکر ہیں اور اسی زمانے میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے جنوبی امریکہ کو چھوڑ کر شمالی امریکہ میں چلے جانا چاہیے۔ جہاں حبشیوں کے خلاف تعصب نسبتاً کم تھا۔ رائٹ باوقار زندگی بسر کرنے کا خواہاں تھا۔

۱۹۲۷ء میں رائٹ شکاگو پہنچا لیکن اسے دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہاں بھی حبشیوں کے ساتھ جائز اور انسانی سلوک روا نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کا امریکی جمہوریت پر اعتقاد متزلزل ہو گیا اور اس نے کمیونسٹ پارٹی میں شکرکت کی۔ اپنے ابتدائی دور کے مضامین میں وہ یہیں یہ تلقین کرتا ہوا ملتا ہے کہ تمام حبشی لکھنے والوں کو مارکسی نقطہ نظر کو اپنانا چاہیے۔ اسی زمانے میں اسے آزاد خیال جوائنڈ کے لیے مضامین، نظمیں اور کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ جنہوں نے جدید امریکی نیگرو ادب کی بنیادیں استوار کیں لیکن رچرڈ رائٹ سیاست اور سیاسی نظریات و عقائد پر فن کو قربان کرنے کا قائل نہ تھا۔ ادب اور پروپیگنڈے کے فرق کو بھی سمجھتا تھا۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت چھوڑ دی۔ اس کا تفصیلی احوال رائٹ نے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جو مشہور زمانہ کتاب GODS THAT

FAILED میں شامل ہے۔ اس زمانے میں جب رائٹ فیڈرل نیگرو تھیریٹک اور سیکرٹری اور فیڈرل رائٹرز پراجیکٹ کارکن تھا تو اس نے ہمیشہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے تھوپے جانے والے مشوروں کی مخالفت کی۔ تاہم اپنی عمر کے آخری دور تک اسے مارکسزم کے بنیادی اصولوں سے بہرہ ور رہی۔

رچرڈ رائٹ کی پہلی کتاب اس کی کہانیوں کا مجموعہ "انگل ٹائمز چیلڈرن" ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ کہانیاں جہاں حبشیوں کی زندگی اور ان کے مصائب کی سچی عکاس ہیں۔ وہاں بعض روایات سے انحراف بھی کرتی ہیں۔ بریٹ پیچر سٹوڈ کاناڈا، انگل ٹائمز کمین، کامران کچھ اور تھا۔ حبشیوں سے دلی بہرہ داری رکھنے والی پیچر سٹوڈ کا یہ ناول بہت اہم اور تاریخی ساز ثابت ہوا تھا۔ اس سلسلہ مصنفین کی سو کتابوں میں اس ناول پر مضمون شائع ہو چکا ہے، لیکن اس ناول کا بنیادی مقصد حبشیوں کے لیے رحم اور بہرہ داری کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ اس میں کردار بھی خاصے تھڑوے دکھائے گئے تھے۔ رائٹ نے اس رویے سے شدید انحراف کیا۔ وہ حبشیوں کے لیے رحم نہیں بلکہ ان کے حقوق کا طلب گار تھا۔

رائٹ ایک ایماندار لکھنے والا تھا۔ اس نے اپنی کہانیوں پر فخر کا اظہار نہیں کیا بلکہ وہ تو یہ کہتا تھا کہ یہ کہانیاں حبشیوں کی حقیقی زندگی کی بھرپور جھلک ہی پیش نہیں کر سکی ہیں اس نے کہا۔ اب میں ایسا ناول لکھوں گا جو اتنا سخت اور گہرا ہوگا کہ سفید نام قارئین کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

اس نے اپنے اس ارادے کو ۱۹۴۰ء میں شائع ہونے والے ناول "نیٹوسن" میں پورا کیا۔ "نیٹوسن" صرف رچرڈ رائٹ کا ہی بڑا تخلیقی فن پارہ نہیں ہے بلکہ اس سے ہی جدید اور معاصر نیگرو لیٹریچر کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس ناول میں رچرڈ رائٹ نے پہلی بار شہر میں بسنے والے امریکی حبشیوں کی معاشی اور سماجی کٹری اور مسائل کو تخلیق کا جامہ پہنایا۔ یہ ایک احتجاجی ناول ہے۔ جب تک امریکہ میں حبشیوں کو برابر کی سطح پر نہیں لایا جاتا۔ جب تک ان کی معاشی اور عمرانی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ تب

ہمک یہ ناول ہر دور کی نمائندگی کرتا رہے گا۔ اور جب حالات بدل گئے تو بھی اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ بلکہ ایک عظیم ادبی دستاویز کی حیثیت سے اس کا مقام اور بھی بلند ہو جائے گا۔

بعض نقادوں نے اس کے اسلوب، ان کی کردار نگاری اور فنی ساخت پر بہت سے اعتراض کیے ہیں لیکن یہ ایک ایسا ناول ہے جو نیچر لسٹک ناولوں کی ذیل میں آتا ہے۔ اس میں جو زندگی اپنی صحیح صورت میں دکھائی گئی ہے۔ وہ اس ناول کا اصل حسن اور جوہر ہے۔

”نیٹوس“ میں رچرڈ رائٹ ہمیں بتاتا ہے کہ سفید رنگ کی برتری میں مبتلا معاشرے میں ایک حبشی کو کن مظالم کا سامنا کرتے ہوئے بالآخر اپنے آپ کو اس معاشرے کے ہاتھوں مصلوب کرانا پڑتا ہے۔ اس ناول میں جو جارحیت ہے۔ شدت ہے۔ سہمی ہے۔ اگر اسے بہتر اور مختصراً قسم کے مشینی اور غیر جذباتی اسلوب میں لکھا جاتا تو اس کی توانائی اور قوت تاثیر کو بہت دھچکا لگتا اور جو رد عمل رچرڈ رائٹ اس حوالے سے اپنے پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی کمزور پڑ جاتا۔

”نیٹوس“ کی فنی اور تخلیقی قدر و قیمت کا اندازہ بھی اس کے مطالعے سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت سے پہلے کبھی وہ انکشافات نہ ہوئے تھے جو اس ناول میں حبشیوں کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی حبشیوں کی کچی اور مسلی ہوئی رحوں اور جذلوں کو اتنی شدت سے بیان نہ کیا گیا تھا۔ اس ناول کی اشاعت پر وہی رد عمل ہوا جس کی رچرڈ رائٹ کو توقع تھی۔ امریکہ کے نیگرو ادب کو ایک قافلہ سالار رہی نہیں ملا تھا۔ نئے ادب کی بنیاد ہی استوار نہیں ہوئی تھی بلکہ اس ناول کے پڑھنے والے سفید نام امریکیوں نے بھی اس کی تاثیر اور قوت کو محسوس بھی کیا اور اپنی ندامت کا اظہار بھی۔ پہلی بار پوری شدت سے اس ناول کے حوالے سے سفید نام امریکیوں کو شدت سے احساس ہوا بلکہ تھامس۔ جو اس ناول کا حبشی ہیرو ہے وہ بھی امریکہ کا ایک حصہ ہے اور اس ملک کے اصلی بیٹوں میں سے ایک ہے۔

اس ناول کی اشاعت نے صرف رچرڈ رائٹ کو بطور ناول نگار ایک مستحکم حیثیت بخشی بلکہ اس سے امریکہ میں حبشی ادب کے سوتے بھی بھوٹ پڑے۔ دوستو ٹیفسکی نے گوگل کے شہکار "اودر کوٹ" کے حوالے سے کہا تھا کہ روس کے ادب کو "اودر کوٹ" نے جنم دیا ہے۔ اسی طرح پورے وثوق سے رچرڈ رائٹ کے اس ناول "نیٹوس" کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ جدید امریکی نیکرڈ لٹریچر کا سرشمہ رائٹ کا ناول "نیٹوس" ہے۔ "نیٹوس" کے بعد ۱۹۴۵ء میں "بلیک بولے" شائع ہوئی جو رائٹ کی ابتدائی

عمر کے سترہ برسوں پر مشتمل اس کی خودنوشت ہے۔ اس کے بعد اس کی بے چین طبیعت اسے عیسائیت اور کمیونزم دونوں سے منحرف کر کے وجودیت کے فلسفے تک لے گئی۔ ۱۹۵۲ء میں اس کا ناول "دی آڈٹ سائیڈز" شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی رائٹ نے سفید فام یورپی معاشرے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کا ہیرو بھی ایک حبشی ہے۔ جو امریکہ کے متوسط طبقے کی تمام اقدار کو یکسر مسترد کرتا ہوا ملتا ہے۔

امریکہ کی نسل پرستی۔ رنگ میں امتیاز اور انتہا تک پہنچی ہوئی مادہ پرستی نے رائٹ کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ کو چھوڑ دے۔ اس نے کچھ عرصہ انگلستان میں قیام کیا۔ پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء اپنی وفات تک وہ پیرس میں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس کے ناول "لائٹ ڈریم" اور کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ اس نے عمرانی مسائل کے سچے سچے بھی کیے۔ اور کتابیں لکھیں۔ جن میں سفید فام "سنو" (۱۹۵۷ء) بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس نے افریقی قوم پرستی کی تحریکوں میں بھی گہری دلچسپی لی۔ افریقہ میں اپنی جہادوں کی تلاش کا بھی شوق رہا۔ لیکن وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی معریت نے اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل کر رکھی ہیں۔ وہ ساری عمر ایک ROOTLESS انسان رہا۔

وہ ایک تحریک بن کر گیا۔ اس نے نئے لکھنے والے حبشی مصنفوں کی رہنمائی کی۔ رالف لیلیسن جیسے عظیم ناول نگار کو اس نے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ وہ حبشی ادب کا امام تھا۔ اور مجموعی طور پر اس نے امریکی ادب میں گراں بہا اضافے کیے۔

نیٹو سن اس کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہے۔ جس نے امریکی نیگرو ادب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ اس نے اس ناول کے حوالے سے اور اپنی دوسری تصانیف کے ذریعے انتہائی تخلیقی دیانت داری کے ساتھ ان لوگوں کی زندگیوں، نفسیات، معاشی اور سماجی حالات کو پیش کیا۔ جنہیں ان کے اپنے وطن میں اپنے ملک میں ہی اجنبی اور غیر ہی سمجھا نہیں جاتا۔ بلکہ ان کے تمام انسانی حقوق کو بھی سلب کیا جا چکا ہے۔

رچرڈ رائٹ کے ناول "نیٹو سن" کے حوالے سے اسے یہ حجاز تھیں بجا طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس نے انسانی تجربات کے ان منطوقوں کو دریافت کیا جو اس سے پہلے کبھی دریافت نہ کیے گئے تھے۔ "نیٹو سن" کا مصنف رچرڈ رائٹ وہ مصنف ہے جس نے اپنے ہم رنگ لوگوں کے جذبات، رجحانات اور مصائب سے پوری دنیا کو تخلیقی سطح پر متعارف کرایا۔

رچرڈ رائٹ ایک ایسا مصنف ہے جس نے اپنے پڑھنے والوں کو ان لوگوں سے ملوایا جو گناہ تھے۔ جنہیں امریکی سماج نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر اس نے امریکہ کے نیگرو ادب میں ایک مستقل اور سچی روایت کا اضافہ کیا اور وہ روایت ہے۔ نیگرو لٹریچر میں احتجاج کی روایت اس نے جس نئی جہت کی نشاندہی اپنے ناول "نیٹو سن" میں کی اس سے بعد کے آنے والے نیگرو مصنفوں نے استفادہ کیا اور امریکی حبشیوں کے صحیح اور سچے نفسیاتی رجحانات اور رویوں کو ادب میں جگہ ملی۔

رچرڈ رائٹ نے ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے جو جدوجہد کی وہ امریکہ کے حبشیوں کی ثقافت کا ایک اہم اور نمایاں ترین جزو ہے۔ اگر حبشی۔ امریکی استعمار بنتے ہیں تو پھر یہ رچرڈ رائٹ ہی تھا جس نے سب سے پہلے اپنے ناول "نیٹو سن" میں اس استعمار کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ کافمن نے اسے امریکی ادب کی سرزمین ادب کا ایک نامور قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائسڈ

ہر شخص کے اندر ایک جیکل ہے اور ایک ہائسڈ۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک وجود میں رہتے ہوئے لگتھم لگتھا، متضاد لیکن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے۔ خیر اور شر، مجبور و مختار، ازلی اور ابدی کشمکش باطن اور ظاہر کی۔

یہ وہ موضوع ہے جسے رابرٹ لوئی سٹیونس نے اپنا با۔ اور جونا دل لکھا۔ منفرد لازوال اور یکتا ٹھہرا۔ رابرٹ لوئی سٹیونس کی دیگر تصانیف پر ایک نگاہ ڈالیں اور پھر ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائسڈ پر اٹھیں تو گہرا تعجب ہوتا ہے۔ سٹیونس کو ایڈوکیٹر، رومان اور فطرت سے محبت تھی۔ اس کی سب کتابوں پر اس کا محبوب اور پسندیدہ موضوع ہی چھایا ہوا اور غالب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ ناول خود اس کی اپنی تصانیف میں بالکل علیحدہ، جداگانہ اور ایسا لکھنا دکھائی دیتا ہے۔

ویسے بھی عالمی ادب میں یہ ایک یکتا ناول ہے۔

رابرٹ لوئی سٹیونس پر اصل میں لکھنے کا حق تو محمد خالد اختر کو جاتا ہے کہ اردو زبان میں لکھنے والوں (اور شاید پڑھنے والوں) میں بھی شاید ہی کوئی دوسرا ایسا ہو جو محمد خالد اختر کی طرح رابرٹ لوئی سٹیونس کا مداح ہو۔ عالمی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں تو ایک فرض پورا کرنے کے لیے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔!

رابرٹ لوئی سٹیونس سے محبت کرنے والوں کی دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی اور کبھی کمی محسوس نہ کی جائے گی۔ پھر وہ ہر نسل کے جوانوں اور بوڑھوں کا پسندیدہ مصنف!

سٹیونس ۱۳ نومبر ۱۸۵۰ کو پیدا ہوا۔ اس کا والد لاسٹ ہاؤسوں کا معمار اور اینجینئر تھا۔ اس کے باپ نے سٹیونس کو بھی انہی بنیادوں پر تعلیم دلوائی کہ وہ اسی کا پیشہ اختیار کر سکے۔ ۱۸۶۷ء میں سٹیونس ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ لیکن تین سالوں کے بعد اس نے ایک دم قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۸۷۵ء میں وہ قانون کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اس دوران میں وہ ایک شدید مرض میں بھی مبتلا رہا۔ یہ مرض پھیپھڑوں کا درد تھا۔ جس سے وہ ساری عمر نجات حاصل نہ کر سکا۔

سٹیونس ایک سچا لکھنے والا تھا۔ تخلیق ادب کے لیے اس نے اپنے قانونی پیشے کو جلد ہی ترک کر دیا۔ اس کی ابتدائی تصانیف میں "اندرون ملک ایک بحری سفر" (۱۸۷۸ء) اور پھر "ٹرولیز و ڈوائے ڈنکی" (۱۸۷۹ء) سفر نامے تھے۔ سٹیونس کو سیاحت سے گہری دل چسپی تھی۔ یہ دونوں سفر نامے اس کی اس سیاحت کی یادگار ہیں۔ جو اس نے پیدل اور ایک چھوٹی، عام کشتی میں فرانس میں کیے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں اس کے مضامین کا مجموعہ VIRGIN BUS PUGERIS AUE کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سٹیونس کے ذہن میں شامل ہیں جو بے حد دلچسپ اور سدا بہا ہیں۔ اس برس اس نے "نئی الف ایلی" بھی لکھی۔ جس کی کہانیاں دہشت ناک واقعات اور لڑا دینے والے قتل کی داستانوں پر مشتمل ہیں۔

سٹیونس کو اپنی جس کتاب پر سب سے پہلے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی وہ ہے "ٹریژر آئی لینڈ (TREASURE ISLAND)" یہ وہ کتاب ہے جو مقبول ترین رومان سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصے تک ہمارے ہاں بھی نصاب میں شامل رہا۔ بحری قزاقوں اور مہم جوؤں پر مشتمل اس ناول کے کردار زبان زد عام ہیں۔ اس ناول کا ہر زبان میں ترجمہ ہوا۔ فلمیں بنیں۔ اس کو ڈرامے اور ٹی وی ڈرامے کا بھی روپ دیا گیا۔ بچوں اور بڑوں میں یہ رومان یکساں مقبول ہے۔ ۱۸۸۵ء میں پرنس اولوہ شائع ہوا۔ یہ بھی اس کا ایک شاہکار رومان ہے۔ اس کی بھی کئی بار ڈرامائی تشکیل ہو چکی ہے۔ ۱۸۸۶ء میں اس کا ایک اور مقبول اور شاہکار رومان "گڈ فریڈ" کے نام سے شائع ہوا۔ بلکہ اورو

(۱۸۸۸ء اور ۱۸۸۹ء) میں پبلشرز کے دفتر میں مقبول ہوئے۔ لیکن بعد میں ان ناولوں کو بھی کئی بار فلمایا گیا۔

رابرٹ لولی سٹیونسن - افسانہ نگار، مضمون نگار، ناول نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا۔ ایک ایسا شاعر جسے انگریزی زبان اور عالمی ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۸۸۵ء میں شائع ہونے والا اس کا شعری مجموعہ اے جاملڈ گارڈن آف درس آج بھی دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۲ء میں بھی اس کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔

سٹیونسن کے ناولوں کی فہرست اچھی خاصی ہے۔ کچھ تصانیف اس نے اپنے سوتیلے بیٹے لائیڈ اور پرن کے اشتراک سے بھی لکھیں۔ کچھ رومان ناممکن رہے اس کی ایک بہت اہم اور عظیم تصنیف WEIR OF HEARNSTONE اس کی موت کے بعد ہی ناممکن صورت میں شائع ہوئی۔ ایک تصنیف سینٹ آئیونز، کو بعد میں اے بی کیولر کوچ نے مکمل کر کے شائع کیا۔

سٹیونسن ساری عمر علیل رہا لیکن وہ ناقابل شکست عزم اور تخلیقی قوتوں کا مالک تھا۔ وہ بہت عالی حوصلہ اور خوش گفتار انسان تھا۔ اس کو ہر شخص چاہتا تھا۔ اس کے دور کے ہر بڑے لکھنے والے کے دل میں سٹیونسن کے لیے پیار اور احترام تھا اس کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسا محبت کرنے والا انسان تھا۔ جس کے احباب کا دائرہ وسیع تھا۔ وہ صحت کی تلاش میں سفر کرتا رہتا۔

۱۸۷۶ء میں اس کی پہلی ملاقات فینسی اوسبورن سے پیرس میں ہوئی تھی۔ اور سٹیونسن کو اس شادی شدہ خاتون سے عشق ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں جب سٹیونسن کو جزیرے کی فینسی اوسبورن امریکہ میں علیل ہے۔ تو اپنی بجزرتی صحت، نامساعد حالات اور کم فراخ کے باوجود وہ ترک وطن کرنے والوں کے معمولی بھری جہاز پر سفر کرتا ہوا، سان فرانسسکو پہنچا۔ وہاں فینسی سے ملا۔ طویل غیر آرام دہ بحری سفر نے اس کی صحت پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ کچھ عرصہ وہ آرام کرتا رہا اور ارمی ۱۸۸۰ء کو اس نے فینسی

ادسبرن سے شادی کر لی۔ جو طلاق لے چکی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ انگلستان چلے آئے۔ دونوں میاں بیوی مسلسل حالت سفر میں رہتے۔ مقصد یہ تھا کہ ایسی جگہ کی تلاش ہو سکے جو سٹیونس کی صحت کے لیے مفید اور سازگار ہو۔ وہ سوئٹزر لینڈ، لیوریہ، اسکاٹ ہائی لینڈز اور نیویارک تک گئے۔ نیویارک میں سٹیونس نے جس مکان میں قیام مختار اب اسے یادگار کی صورت دی جا چکی ہے۔ پھر سٹیونس ایک طویل بحری سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اور بالآخر ۱۸۹۰ء میں سما میں جا پہنچا۔ اس جزیرے میں اس نے اپنا گھر تعمیر کیا۔ یہاں اس نے اپنی کے زندگی کے آخری برس تصنیف و تخلیق میں بسر کیے۔ سٹیونس نے بھر پور زندگی گزار لی۔ سیر و سیاحت، محبت و عشق بے پناہ لکھا۔ جزیرے کی سیاست میں بھر پور حصہ لیا اور معتبر اور موثر شخصیت بن گیا۔ سما جزیرے کے مقامی لوگ اسے THYSITALA کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے۔ ”داستان گو۔“

۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو سٹیونس کا سما جزیرے میں انتقال ہوا۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے ایک پہاڑ کی چوٹی پر دفن کیا گیا جو اس کے گھر کے عقب میں واقع تھا۔

ٹریٹری آئی لینڈ، کڈنیٹ، ماسٹر آف بلینڈے جیسے رومان لکھنے والا سٹیونس کئی کہانیوں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔ اس کی کہانی ”مارکھیم کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ اسے فلمایا بھی گیا ہے۔ یہ کہانی اس کی دوسری کہانیوں سے مختلف اور جداگانہ ہے۔ بالکل اس طرح ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ اس کا ناول۔ ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ کا سن اشاعت ۱۸۸۶ء ہے۔ تب سے اب تک یہ ناول انگریزی زبان میں کئی بار اور کتنی تعداد میں شائع ہو چکا ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس طرح اب تک یہ دنیا کی کتنی زبانوں میں کتنی بار ترجمہ ہوا۔ اس کا بھی کوئی حساب نہیں لگایا جاسکتا۔ کئی بار اس ناول کو فلمایا گیا۔ سیٹیج کیا گیا۔ اور ٹی ڈی ڈرامے کی صورت میں پیش کیا گیا۔

اُردو میں اس ناول کی متعدد بار تلخیص شائع ہو چکی ہے۔ پورا ناول ترجمہ کرنے کا سہرا ڈاکٹر محمد حسن کے سر بندھتا ہے۔

اس ناول کے واقعات اور کرداروں پر مبنی کسی دوسرے ناول لکھے گئے۔ فلم والوں نے اسے متعدد بار مختلف انداز میں ADOPT کیا۔

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائید کا شمار دنیا کے معنی خیز اور مقبول ترین کرداروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ نام علامتیں اور استعارے بن چکے۔ ان میں معنی کا جہان پوشیدہ ہے۔

یہ ناول جو ہولناک ناولوں کی سی فضا رکھتا ہے، انسانی تقدیر اور انسانی نفسیات کا معنی خیز آئینہ ہے۔ جس میں ہر انسان اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔ حرص و ہوس اور شر

کا غلبہ جو انسان کو مطیع کر لیتا ہے۔ اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے اصل اور خیر کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے اندر کا شر اس کو بے بس کر دیتا ہے

اس طرح غالب آجاتا ہے کہ انسان ہر کوشش کے باوجود اپنے اصل تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ ایک ایسی اندرونی اور باطنی جنگ کا آغاز ہوتا ہے جس کا نتیجہ موت ہے۔ شر کی موت

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائید۔ ایک ہیں۔ ایک وجود، ایک شخص میں پلنے والے خیر و شر۔ اس ناول کا نقادوں نے ہزار پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ نفسیات والوں نے اس کو اپنے

مخصوص انداز سے سراہا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی نفس کی ایک سچی اور تکلیف دہ تفسیر پیش کرتا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اس ناول کا مطالعہ اگر خالص طور پر وسیع تر مذہبی نقطہ نظر سے بھی کیا جائے تو اس کے مسنوں کے کچھ اور پہلو اور وسعتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے بھی اس کا

مطالعہ معانی کے جہان کے نئے دروازے کھولتا ہے۔ ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائید، دو مختلف چہروں دو مختلف جذبوں، دو مختلف انسانی اور

حیوانی رویوں، شر اور خیر کے ساتھ مل کر ایک انسان کا روپ دھارتے ہیں۔ جو انسان ہم سب میں کسی نہ کسی حد تک، کسی نہ کسی انداز میں موجود ہے کہیں جیکل غالب ہے، کہیں ہائید۔

لیکن دونوں ہمارے اندر موجود ہیں۔ اس بصیرت نے ہی اس ناول کو لازوال کر دیا ہے۔ ڈاکٹر جیکل ایک سائنس دان اور عالم ہے۔ وہ ایک ایسے تجربے میں مصروف ہے جس

کے بارے میں اس کے ہم عصر اور دوست اسے منع کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر جیکل اس سے باز نہیں آتا۔ اور پھر جب وہ تجربے سے گزرتا ہے تو اس کی گایا پلٹ جاتی ہے۔ مخلول پیتے ہی وہ مسٹر ہائیڈ جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس تجربے کے ساتھ ہی اس کے اندر کا جو شر اور شیطان ہے وہ غالب آ جاتا ہے۔ اس کی اصل شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ بد شکل اور بد ہیئت بن جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جیکل کی صورت میں وجیہ اور جاذب نظر ہے۔ جیکل کی صورت میں وہ نرم دل، عالم اور خیر کا نمائندہ ہے۔ لیکن ہائیڈ کی صورت میں وہ ہوس پرست، ظالم اور متشدد انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ ہائیڈ وہ شر ہے جو ہر انسان کے اندر چھپا ہوا ہے۔ جس کو دبائے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بعض اوقات ارادہ اور غیر ارادی طور پر اسے ایسی تحریک ملتی ہے کہ وہ چیز پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کش مکش کو جو خیر اور شر کے درمیان ہوتی ہے سٹیوٹنسن نے ایک بڑے انسانی رزمیے اور لمبے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کو لکھنے کی تحریک بھی سٹیوٹنسن کی عجیب انداز میں ہوئی۔ اس نے ایک خواب دیکھا۔ جیسی سے اس نے اس ناول کا موضوع لیا۔ جو آج دنیا کی چند بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔

رابنسن کروسو

آج سے پونے تین سو برس پہلے ۱۷۱۹ء میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام رابن سن کروسو اور جس کا مصنف ڈینیئل ڈیفینر تھا۔ اپنی اشاعت کے زمانے سے آج تک یہ کتاب پوری دنیا میں مقبول رہی ہے۔ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں اور زبانوں میں یہ کتاب کتنی بار اور کتنی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ تاہم ایک بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کچھلے پونے تین سو برس سے یہ کتاب مسلسل ساری دنیا میں پڑھی جا رہی ہے اور یہ کتاب اتنی دلچسپ اتنی جاندار اور اتنی اہم ہے کہ آنے والے ہر دور میں اس کتاب کو پڑھا جائے گا۔

”رابن سن کروسو“ بچوں اور بڑوں سب کے لیے یکساں دل چسپی کی حامل کتاب ہے اسے ہر نسل کے بچوں اور بڑوں نے ساری دنیا میں پڑھا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کتاب کو بنیاد بنا کر بہت سے لکھنے والوں نے ”رابن سن کروسو“ کے نئے معجزے اور کارنامے کتابی شکل میں شائع کرائے۔ رابن سن کروسو ایک ایسا کردار ہے جو ساری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے جب سے دنیا میں فلم سازی کا آغاز ہوا ہے۔ رابن سن کروسو پر متعدد بار فلمیں بن چکی ہیں اسے دنیا بھر کے اہم فلمی ٹیٹیشنوں نے اپنے اپنے انداز میں ماخوذ کیا اور اس پر فلمیں بنائیں۔ رابن سن کروسو کے بڑے پھلے ترجمے دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ بہت سے ملکوں میں ایک عرصے سے یہ کتاب انگریزی کے تعلیمی نصاب میں شامل رہی اور غیر زبانوں میں نصابی ضرورتوں کے تحت اسے شائع اور مقامی زبانوں میں

ترجمہ کیا گیا ہے۔

”رابن سن کرو سو“ ایک ایسا ناول ہے جسے کتاب، فلم اور ٹی وی کے حوالے سے پاکستان کے بچے، لڑکے اور بڑے نسل بانسل سے واقف ہیں۔ لیکن اس کے مصنف ڈینیئل ڈیفنو کے بارے میں قارئین کی معلومات بہت کم، ادھوری اور نامکمل ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تخلیق نے شہرت اور مقبولیت کے میدان میں خالق کو پیچھے چھوڑ دیا۔

ڈینیئل ڈیفنو ایک بڑا لکھنے والا تھا جس کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ لیکن اس کی تمام تر عالمی شہرت ”رابن سن کرو سو“ کی وجہ سے ہے۔

ڈیفنو کے سن پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ قیاس اظہار ہے کہ وہ ۱۹۶۰ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جیمز عیسیٰ کے اعتبار سے قصاب تھا۔ جب ڈیفنو بچپن میں عمر کو پہنچا تو اس نے اپنے خاندانی نام فو کے ساتھ ڈی کا اضافہ کر دیا یوں وہ ڈیفنو ڈیفنو کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ اس کا باپ جیمز تھا تو قصاب لیکن آدمی غضب کا تھا۔ دینی نظریات کے اعتبار سے وہ ایک منحرف تھا۔ اس وقت جو مذہبی عقائد سرکاری اور دینی سطح پر مستحکم تھے۔ وہ ان کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور ان سے انحراف کرنے کی جرات رکھتا تھا۔ اسی لیے اس کے باپ نے اپنے بیٹے ڈیفنو کو ایک ایسے مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا جو اس کے اپنے نظریات کے مطابق تھا۔ یہاں نوننگٹن گرین میں ڈیفنو ۱۹ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔

وہ مصنف بننے کا خواہاں تھا اور جب وہ ۲۵ برس کا ہوا تو اس نے ایک پمفلٹ شائع کیا جو پادریوں کے خلاف تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور پمفلٹ لکھا جو ترکوں کے خلاف تھا۔ اس دور میں یورپ والے ترکوں سے بے حد خائف رہتے تھے۔ ترکوں نے بہادر شجاعت اور فتوحات کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے تھے کہ یورپ کے روشن دماغ لوگ بھی مذہبی تعصب اور ترکوں کی فتوحات کی وجہ سے ان کے خلاف لکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک لمبی مدت تک ترکوں کے خلاف لکھنا یورپ کے لکھنے والوں کے لیے ایک ”مجبوری“ یا فیشن کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

ڈینیل ڈیفونے اپنے دور کی سیاسی سرگرمیوں میں مجبوراً حصہ لیا وہ کئی ایسی سازشوں میں ملوث رہا جو اس دور کے انگلستان کے حکمران کے خلاف تھیں۔ کئی بار وہ سزا اور عقوبت سے سے ہال بال بچا کئی بار اسے جان بچانے کے لیے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

” برٹش سیکرٹ سروس کی ایک اجمالی تاریخ کے نام سے رچرڈ ڈیکن نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں بڑے بڑے اہمکشافات کیے ہیں کہ کیسے کیسے عالی مرتبت لوگ برطانوی سیکرٹ سروس کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ ان میں ایک ڈینیل ڈیفونو بھی تھا جس نے اپنی جان بچانے کے لیے برطانوی سیکرٹ سروس کے لیے جاسوسی کرنا قبول کر لیا تھا۔ ڈیفونو شاعر بھی تھا۔ اپنے عہد کے حالات پر اس نے ایک طنز پر نظم ۱۹۰۱ء میں لکھی تھی جسے بڑا شہرہ حاصل ہوا تھا۔ اس نظم کو لوگوں نے خود شائع کر کے گلیوں اور بازاروں میں گا گا کر بچا۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے اپنے عقائد کے بارے میں جو مضامین شائع کیا اس کی بنیاد پر ڈینیل ڈیفونو کو گرفتار کر لیا گیا اس پر مقدمہ چلا۔ سزا اور جرمانہ ہوا اور زندان میں ڈال دیا گیا۔ وہ سمجھتا رہا کہ اس کے مضامین کو غلط سمجھی دیے گئے ہیں اور اسے جو سزا دی گئی ہے وہ اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈیفونل نے ایک جریدے کا آغاز کیا جس کا نام ”ریویو“ تھا۔

”ریویو“ کو وہ لوزبرس تک شائع کرتا رہا۔ ۱۹۰۶ء میں لارڈ گوڈولفن کے ایما پر اسے کمیشن میں شامل کر لیا گیا جو سکاٹ لینڈ اور انگلستان کے درمیان مفاہمت اور مذاکرات کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ رچرڈ ڈیکن نے لکھا ہے کہ اصل میں اسے بطور جاسوس کمیشن میں شامل کیا گیا تھا اور ڈینیل ڈیفونے اتنی قیمتی اور اہم معلومات حاصل کیں کہ حکومت نے اس کی خدمات سے حوش ہو کر اس کے لیے تاحیات پنشن مقرر کر دی۔

ان خدمات کی حکومت کے نزدیک اصل حقیقت کیا تھی۔ اس کا ثبوت ایک اور واقعہ سے ملتا ہے۔ ڈیفونو کو جیکوبین پارٹی سے شدید نفرت اور اختلافات تھے۔ اس نے اس کے خلاف ایک مضامین لکھ مارا جس کے نتیجے میں اسے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اسے جرمانہ ہوا، سزا دی گئی اور نیوگیٹ جیل میں ڈالا گیا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس مپٹل کی پاداش میں اسے گرفتار کر کے سزا نہ دی جاتی تو ڈیفنڈو ساری عمر سیاسی سرگرمیوں میں ہی ملوث رہتا اور علمی ادبی کاموں پر سنجیدگی سے توجہ نہ دیتا اس بار وہ نیوگیٹ جیل میں اپنے بارے میں بہت کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ سیاسی سرگرمیوں میں اس کے لیے سوائے قید و بند کی صعوبتوں اور رسوائیوں کے علاوہ کچھ نہیں رکھا۔ خدا نے اسے گورنر خیز فرین دیا ہے اور بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس لیے اسے علمی ادبی کاموں پر اپنی ساری توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ سیاسی سرگرمیوں اور مذہبی مناقشات کی وجہ سے اس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔

ہولائی کے بعد ڈیفنڈو نے اپنے آپ کو علمی ادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا اور اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہلجب اس کا ناول "رابن سن کرو سو" شائع ہوا۔ اسے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ فقید المثال ہے۔

"رابن سن کرو سو" کے بعد بھی اس نے کئی اہم فن پارے تخلیق کیے۔ ۱۹۲۲ء میں اس اہم ترین تصنیف "جنرل آف پلیگ" شائع ہوئی جسے کلاسیک کا درجہ حاصل ہے اس کے بعد بھی اس کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس نے اپنے آپ کو تحریر و تصنیف کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس لیے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ لکھتا رہا۔ اس نے ناول لکھے۔ سوانح عمریایں تحریر کیں۔ اقتصادیات پر کتابیں لکھیں۔

ڈیفنڈو نے ۱۹۸۴ء میں شادی کی تھی اس کی کئی اولادیں تھیں ۱۹۳۱ء میں لندن میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے بہت سے بہت سے موضوعات پر لکھا۔ اقتصادیات، مذہبیات، جادو ٹونڈ، سوانح عمریایں، ناول، جنرل اور طنزیہ شاعری... لیکن اسے جو ادبی شہرت حاصل ہوئی وہ اس کا مصداق ناول "رابن سن کرو سو" ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اگرچہ اس کتاب کو ہمارے ہاں مدتوں سے پڑھا جا رہا ہے اور عرصے تک یہ انگریزی کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے لیکن اس کا کوئی سچہ لوہا اور مستند ترجمہ آج تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوا۔ نصابی ضرورتوں کے تحت اس کے کسی مجھدے اور بڑے ترجمے نصابی نامہ شائع کر چکے ہیں۔ کسی بار اس کی تلخیص بھی مختلف

جرائد میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک ترجمہ اے حمید نے بھی کیا ہے لیکن افسوس کہ اے حمید جیسے صاحب طرز لکھنے والے نے بھی اس ناول کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔

”راہن سن کرو سو“ دینائے ادب کا معروف اور مقبول ترین ناول ہے۔ جب اے ڈیفو نے لکھا تھا تو اس سے پہلے بھی اس کہانی اڈر کردار کا سراغ موجود تھا۔ کیونکہ یہ ایک زندہ اور حقیقی کردار پر مبنی ناول ہے اسی لئے جب ڈینیئل ڈیفو نے اسے اپنے تخلیقی اسلوب میں لکھا تو کسی ناشروں نے اسے اس لیے شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ کہانی تو پہلے سے شائع ہو چکی ہے۔

دینائے ادب میں یہ واقعہ کیٹا یا اٹو لکھا نہیں ہے۔ وارث شاہ کی پیر سے پہلے دامودر کی ہیر پنجابی شاعری میں موجود تھی۔ اسی طرح یونانی اساطیر اور دیو مال کے حوالے سے انگریزی ادب میں کئی شاہکار تصنیف ہوئے۔ ٹیکسپیڈ کے کسی ڈرامے ان کہانیوں اور کرداروں پر مشتمل ہیں جو پہلے سے لوگوں کو معلوم تھے۔ زرمیو جولیٹ ”ہویا“ ہیملٹ، ان کی کہانیاں اسی دور کے لوگوں کو معلوم اور یاد تھیں۔ لیکن ٹیکسپیڈ نے ان کو فن پارہ بنا دیا۔ یہی تخلیقی کارنامہ ڈینیئل ڈیفو کا تھا کہ اس نے ایک جانے پہچانے قصے کو ایسے آہستہ آہستہ میں تحریر کیا کہ وہ لافانی ہو گیا۔

ناشروں کے انکار کے بعد جب یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تو اسے ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ خود اسے شائع کرنے سے انکار کرنے والے ناشر ہاتھ ملتے رہ گئے کہ اگر وہ اسے شائع کرتے تو کتنی دولت اور شہرت حاصل کرتے۔

”راہن سن کرو سو“ کا قصہ ایک اصل کردار پر مبنی ہے۔ ایک صاحب الیگزینڈر ٹیلرک تھے جو ایک سخی بحری جہاز پر بطور استاد ملازم تھے۔ ہوا یوں کہ کسی بات پر ٹیلرک کی جہاز کے کپتان سے طعن گئی۔ کپتان بھی ایک مسر مہرا اور منقسم مزاج انسان تھا۔ اس نے ٹیلرک کو ایک دیران علاقے کے ساحل پر جہاز سے اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساحلی علاقہ امریکہ کے جزیرہ معزب میں واقع تھا اور یہ واقعہ ۱۷۰۲ء میں پیش آیا۔ ٹیلرک اب اس دیران جزیرے میں زندگی گزارنے کے لیے مجبور تھا۔ اس نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے وہ سب

کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا۔ جزیرے میں وہ اکیلا ازلتہ تھا۔ کوئی آدمی تھا نہ آدم زاد اس نے اپنی دنیا بسائی اور بنائی شروع کر دی وہ کسی برس وہاں تنہا رہنے پر مجبور ہوا کیونکہ وہ ایک دور افتادہ جزیرہ تھا جہاں سے بحری جہاز شاؤنادر ہی گزرتے تھے۔ بہر حال کئی برسوں کے بعد ایک جہاز وہاں سے گزرا اور شیلکرک کو سوار کر کے ڈالپس شہر ہی آبادی میں لے آیا۔

شیلکرک کا قصہ اس زمانے میں بہت مشہور ہوا اور اس کو اس دور کے مختلف چھوٹے اور عام لکھنے والوں نے مختلف انداز میں لکھ کر گویا ڈیسنیل ڈیفینو کے لیے ایک بڑا فن پارہ تخلیق کرنے کی راہ ہموار کر دی ۱۷۱۹ء میں رابن سن کرڈسو شائع ہوا اس کے بعد اس کی اپنی مقبولیت میں جہاں اضافہ ہوتا رہا وہاں کئی دوسرے لکھنے والوں نے بھی رابن سن کرڈسو کے کردار کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے نئے نئے کارنامے اور ایڈوینچر لکھنے اور شائع کرنے شروع کر دیے۔ اور یہ سلسلہ اب پونے تین سو برس گزر جانے کے بعد بھی جاری ہے۔ اس سے انداز لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کردار اور یہ کتاب کتنی زرخیز اور فیض رساں ہے۔

رابن سن کرڈسو ایک سیدھا سادا انسانی کارنامہ ہے۔ یہ ایک عوامی کہانی ہے جو بلاشبہ بہت عظیم الشان ہے دنیا کے ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آج کے قاری کے لیے بھی اس میں وہی دل چسپی ہے جو ۱۷۱۹ء کے قاری کے لیے تھی آج کا جدید نقاد اس میں اپنے حساب سے مین میج نکال سکتا ہے۔ بہت سے اعتراضات کر سکتا ہے لیکن اس تنقید اور اعتراضات کے باوجود اس کی ادبی حیثیت اور ذول چسپی سے انکار نہیں کر سکتا۔ نہ ہی اسے کسی طور جھٹکا سکتا ہے۔ اس ناول میں ایوٹرن (۱۷۷۷-۱۷۵۷ء) اور حقیقت کا ایک ایسا امتزاج ہے جو بہت کم کتابوں میں ملتا ہے۔ ڈیسنیل ڈیفینو نے جزئیات کو بنیاد بنا کر ناول میں ڈرامائی تاثر پیدا کیا ہے۔

موبی ڈک

ماہم نے میلول کے ناول 'موبی ڈک' کا دنیا کے دس بڑے ناولوں میں شمار کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ قارئین جنہوں نے اس ناول کا مطالعہ نہیں کیا وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس ناول کا شمار دنیا کے دس ناولوں میں ایک بڑا ناول لگا کر رہا ہے۔ اس کا دنیا سے ادب اور بالخصوص ناول کی صنف میں کیا درجہ ہوگا۔ ناول کی صنف جب سے معرض وجود میں آئی ہے۔ تب سے اب تک دنیا کی چھوٹی بڑی مختلف زبانوں میں کتنے ناول لکھے گئے ہیں اس کا شمار کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔ نہ ہی کسی انسان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دنیا بھر میں لکھے جانے والے تمام ناولوں کو پڑھا ہوگا۔ لیکن یہ بات خاصہ تیس دن کے ساتھ کسی جاسکتی ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے ناول لکھے گئے ہیں وہ اکثر و بیشتر مختلف ادوار میں ساری دنیا میں اپنی اصل یاد دہانی زبان میں ضرور پڑھے گئے ہیں۔

'موبی ڈک' کا قصہ بھی عجیب ہے۔ اس کا سن اشاعت ۱۸۵۱ء ہے۔ جب یہ ناول شائع ہوا تو اس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ میلول امریکہ کے ان لکھنے والوں میں ہے جنہوں نے خالص امریکی تخلیقی ادب کے خدوخال تراشے اور اس کی صورت گری میں نمایاں ترین حصہ لیا۔ والٹ ورسٹین ہائٹورن، ایڈگر ایلین پو، ہتھو لو جیسے عظیم لکھنے والوں نے امریکی ادب کی صورت گری کی اور اس کی بنیادیں رکھیں۔ مخصوص حلقوں میں موبی ڈک کا کچھ ذکر ہوا اور اس حوالے سے محققاتی شہرت میلول کو بھی ملی۔ لیکن میلول کے اپنے زمانے میں اس کی جس کتاب کو قدرے دل چسپی سے پڑھا گیا وہ اس کا ناول 'بلی ڈ بلی ڈ' BILLY BUD

ہے۔ لیکن تھوڑی سی مدت تک اس کے کام کا چرچا ہوا پھر خود میول گنماہی کی گود میں سو گیا۔ امریکی ادب کے بعض ناقدوں نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۶ء سے بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک بالکل گنماہ تھا۔ اس کی کوئی کتاب نہ چھپتی تھی۔ لوگ اور نقاد اسے بالکل فراموش کر چکے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہرمن میول کو از سر نو دریافت کیا گیا۔ اس بار دراصل میول اور موبی ڈک کو حیات نو ملی۔ جسے اس کی لافانی زندگی اور شہرت کا آغاز کہا جاسکتا ہے تب سے اب تک 'موبی ڈک' اور میول زندہ جاوید ہو گئے ہیں دنیا کی مختلف زبانوں میں موبی ڈک اور بلی ڈک کے تراجم ہوئے ان پر فلمیں بنیں۔ فلم کا اچھا ذوق رکھنے والوں نے پاکستان میں بھی امریکی فلم 'موبی ڈک' دیکھی ہوگی جس میں گریگری ہینک نے کپتان آہرب کا کردار ادا کیا تھا۔

پشکن نے ایک نظم میں لکھا تھا کہ ایک دن کوئی نیک دل راہب آئے گا جو اس کی نظموں کے گرد آلود صفحوں سے گرد جھاڑے گا۔ اور اس کی آنکھوں کے آنسو اس کی نظموں کے الفاظ کو ہمیشہ کے لیے منور اور روشن کر دیں گے۔ کچھ ایسا ہی میول اور اس کے عظیم ناول 'موبی ڈک' کے ساتھ ہوا کہ مدتوں اس کا کوئی ذکر نہ کرتا تھا۔ لیکن اب یہ دنیا کے ادب کا جانا پہچانا نام ہے۔ ساری دنیا میول اور موبی ڈک کے نام سے آشنا ہے اور موبی ڈک اور اس کے مصنف کے بارے میں دنیا کی ہر زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور رہتی دنیا تک لوگ میول کے عظیم فن پارے موبی ڈک کو پڑھتے رہیں گے۔

ہرمن میول یکم اگست ۱۸۱۹ء کو نیویارک میں پیدا ہوا۔ ہرمن میول کی دادی کے بارے میں ایک روایت پائی جاتی ہے کہ وہ آئیور ڈینڈل ہومز کی نظموں کی ہیروئن تھی۔ میول کا باپ چھانصا تاجر اور کاروباری آدمی تھا۔ جس کا میول کے لڑکپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ میول نے چھپے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ وہ ایک جہاز میں کپتن ہوائے کی بعیت سے ملازم ہو گیا۔ میول کو سمندر اور سمندری زندگی سے عشق تھا۔ یوں اس کی طویل سمندری زندگی کا آغاز ہوا اور پہلی بار انگلستان گیا۔ وہ چوبیس برس کی عمر کا تھا کہ جب اس نے

ایک ایسے جہاز میں ملازمت اختیار کرنی جو پہلے مچھلی کے شکار کے لیے نکلا تھا۔ اس جہاز پر وہ ڈیڑھ برس تک رہا اور فرار ہو گیا کیونکہ جہاز کا کپتان بہت ظالم تھا۔ جہاز سے فرار ہو کر میڈل ایک جزیرے میں جانکا جہاں آدم خور قبائلی رہتے تھے۔ انہوں نے میڈل کو چار ماہ تک اپنے ساتھ رکھا اور اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ آسٹریلیا کا ایک وسیلہ مچھلی پکڑنے والا جہاز اس علاقے میں آنکلا تو میڈل کو وہاں سے رہائی نصیب ہوئی۔ میڈل اس بحری جہاز میں کام کرتا رہا اور دو برس کے طویل بحری سفر کے بعد پھر نیویارک زندہ سلامت واپس پہنچ گیا۔ یہ میڈل کی آخری بحری ملازمت تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ ۱۸۶۰ء میں سمندر کے راستے ایک جہاز پر دنیا کی سیر کے لیے نکلا لیکن تب اس کی حیثیت ایک مسافر کی تھی۔ میڈل نے بحری زندگی کا طویل مشاہدہ کیا تھا بلکہ وہ خود اس کو بسر کر چکا تھا۔ اس نے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ وہ ملاحوں اور جہاز کے ایک ایک فرد اور ان کی نفسیات سے واقف تھا۔ سمندر سے اس کی گہری دوستی رہی تھی۔ اپنی ملازمتوں کے دوران میں وہ یادداشتیں مرتب کرتا رہا تھا۔ جنہوں نے اس کے تخلیقی کام کی تکمیل میں بہت مدد دی۔ میڈل نے اس آخری بحری ملازمت کے بعد نیویارک کسٹم ہاؤس میں ملازمت اختیار کر لی اور اپنے آپ کو سخریہ تصنیف کے لیے وقف کر دیا۔

میڈل کی پہلی کتاب کا نام خاصا طویل ہے جو اس زمانے کا عام رواج تھا۔ آج کل اسے اس مختصر نام TYPEE سے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب اس کی اپنی سرگزشت ہے۔ اس کتاب میں اس نے ان چار ماہ کا احوال بیان کیا ہے جو اس نے آدم خور قبائلیوں کی قید میں گزارے تھے یہ کتاب ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی اور اسے خاصا پسند کیا گیا۔ اگلے برس اس کی دوسری کتاب "ٹریٹیو آف اینڈ ونچران دی ساؤتھ سی" NARRITOE OF ADUE اس کی دوسری کتاب "NATURE IN THE SOUTH SEA" شائع ہوئی۔ اس برس اس نے میساچوسٹس کے ایک بچے کی بیٹی سے شادی کی۔

بہرین میڈل اپنے زمانے کے اعتبار سے اسلوب موضوع میں ایک انقلابی بھی تھا اور ایک راست فکر رکھنے والا مصنف بھی۔ ۱۸۵۰ء میں اس کی جو کتاب شائع ہوئی وہ خاص اہمیت

کی حامل ہے اس کا نام ڈائٹ جیکٹ ہے۔ اس کتاب میں اس نے بطور خاص یہ احتجاج کیا کہ
 ملاؤں کو کسی غلطی یا جرم کی سزا میں کوڑے مارنا شدید قابل نفرت حرکت اور ظلم ہے اس کے اس
 احتجاج کا خاطر خواہ اثر ہوا اور حکومت کی طرف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ پھر یہ سے کسی فرد کو اب کوڑے
 نہ مارے جائیں۔ کوڑے مارنے کی سزا منسوخ کر دی گئی۔ موبلی ڈک کا سن اشاعت ۱۸۵۱ء ہے
 اس کے بعد بھی میول نے کسی کتاب میں لکھیں لیکن ان کو خاص شہرت حاصل نہ ہوئی۔
 نہ ہی ان کی کوئی خاص ادبی اہمیت ہی تھی۔ بلی ڈک۔ بہر حال اس کا ایک اور شاہکار سمجھا
 جاتا ہے۔ میول شاعر بھی تھا۔ اس کی نظموں کا ایک مجموعہ بھی اس کی زندگی میں شائع ہوا۔
 اپنی زندگی کے آخری برس اس نے علالت میں بسر کیے۔ اس کا انتقال ۲۸ ستمبر ۱۸۹۱ء
 کو نیویارک میں ہوا۔

موبلی ڈک، میول کا ہی شاہکار نہیں بلکہ دنیائے ادب کا عظیم فن پارہ ہے۔ ۱۸۵۱ء
 میں اس کی اشاعت پر اس زمانے کے بڑے بڑے لکھنے والوں نے اسے سراہا حقیقت
 یہ ہے کہ جن لوگوں نے سمندر اور سمندر سے متعلق افراد کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں بہت کم
 لکھنے والے ایسے ہیں جو سمندر کو اتنا جانتے اور سمجھتے ہوں جتنا کہ میول سمندر کو جانتا تھا سمندر
 اسی کے ہاں ایک علامت اور ایک حقیقت دونوں حقیقتوں سے سامنے آتا ہے۔
 جان سیفیلڈ نے موبلی ڈک کے بارے میں کہا تھا۔

۔ موبلی ڈک " ایک ایسا ناول ہے جو سمندر کے تمام راز اور اسرار بے نقاب کر

دیتا ہے۔ "

نیمینٹنل ہاتھوں اس ناول سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اس نے میول کو ایک شاندار
 اور تعریفی خط لکھا۔ رابرٹ لوئی سٹیونسن اس ناول کا مداح تھا اور اس نے بھی خراج تحسین
 پیش کیا۔ بری نے اعتراف کیا کہ اس کا کردار کپتان ہک۔ میول کی دین ہے۔

اس عظیم فن پارے کو جسے دلوں کے لیے نظر انداز یا فراموش کر دیا گیا بیسویں
 صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں اس کو RE - DISCOVER کیا گیا۔ آر۔ ایم۔ ویور، جان
 فری ہن اور لوئی ٹھنڈو نے اس کی سوانح عمریاں اسی دور میں لکھیں۔ اس کے شاہکار موبلی ڈک

پر فلم بنی، چھپرتی بڑا کوٹھایا گیا اور ۱۹۶۴ء میں اس کی تمام تحریروں کو میٹاکر کے مکمل صورت میں شائع کیا گیا۔

موبی ڈک، کٹنا بڑا تخلیقی کام ہے اس کا اندازہ اس کی اس صلاحیت سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نظر انداز کیے جانے کے باوجود زندہ ہو کر سامنے آیا اور اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔ میں ذاتی طور پر میول کو اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اردو میں اسے مرحوم محمد حسن عسکری نے ترجمہ کیا ... !!

موبی ڈک کس لیے عظیم تخلیق ہے؟

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہر مین میول کو اس موضوع پر پوری دسترس حاصل ہے جس پر وہ ایک ناول لکھ رہا ہے۔ سمندر، بحری جہاز، اس کی دنیا اور پھر انسان کی نفسیات، پوری جڑیات کے ساتھ اس ناول میں ملتی ہیں۔ مجھے اس کا ایک ایڈیشن بھی دیکھنے کا اتفاق ہے جس میں اصل ناول کے آغاز سے پہلے بیسیوں صفحات پر وہ حوالے درج کیے گئے تھے۔ جو موبی ڈک یعنی وہیل مچھلی کے بارے میں قدیم ترین عہد سے لے کر میول کے اپنے عہد پر محیط تھے۔ جہاں کہیں وہیل مچھلی کا ذکر ہوا۔ اس کا حوالہ اس میں موجود تھا۔

موبی ڈک کی دوسری اہم صفت۔ وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا ناول ہے جو سمندر کے تمام اسمز اور راز ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ جہاں یہ ناول مختلف النوع انسانوں کے مزاج، ظاہر اور باطن کا مرقع ہے وہاں انسان ازل سے فطرت کے خلاف، اسے تسخیر کرنے کے لیے جو جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ ناول اس کا عظیم ترین اظہار ہے۔ یہ انسانی انتقام کی بھی داستان ہے جو دراصل فطرت کے قومی اور ظالم مظاہر کو مسخر کرنے کا ایک استعارہ بنتا ہے۔

یہ سنیکوے کا بڑا مداح ہوں لیکن اس کا ناول "اولڈ مین اینڈ دی سی" OLD MAN AND THE SEA اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود موبی ڈک کے مقابلے میں ایک چھوٹا ناول ہے۔ محمد حسن عسکری نے تو اس کا ذکر یہ کہہ کر ختم کر دیا تھا کہ اس میں سے "بوسے بوسے کوئی آئینہ"

لیکن مجھے اس ناول کے حوالے سے جو کچھ پڑھنے کا موقع ملا اس کے اندر بطور خاص "موبلی ڈوک" کے حوالے سے میک کو پڑھا اور سمندر کو موبلی ڈوک کے مقابلے میں بہت چھوٹا فن پارہ سمجھتا ہوں۔ یہ ڈوک اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ جس زمانے میں یہ ناول شائع ہوا اور اسے مقبولیت حاصل ہوئی اس کے کچھ عرصے بعد لائف میں ایک بال تصویر فیچر شائع ہوا اس میں بتایا گیا تھا کہ ہینگوے کے اس ناول کا بوڑھا - زندہ ہے اور ہینگوے نے اس کی کہانی اس سے سن کر لکھ ڈالی تھی - خیر یہ تو ایک اور بات ہوئی - اس کی وجہ سے ہینگوے کے اس ناول میں جو سمندر پیش کیا گیا ہے اور تمام وسعت اور بیان کی جزئیات کے باوجود موبلی ڈوک کے سمندر کے سامنے ایک ندی دکھائی دیتا ہے -

موبلی ڈوک میں ایک طرف وسیع و عریض لامحدود، بیکراں سمندر ہے دوسری طرف اس سمندر میں آزاد پھرنے والی وہیل مچھلی - موبلی ڈوک ہے اور ان کے مقابلے میں کپتان آلب ہے - ایک آدمی ... !

یہ آدمی کپتان آلب - بے پایاں عزم و ہمت کا مالک ہے - انتقام نے اسے جنونی بنا دیا ہے - سمندر کے ایک سفر میں ایک وہیل مچھلی نے مقابلے میں اس کی ٹانگ چبا ڈالی اب وہ اپنی مصنوعی ٹانگ کے ساتھ زندہ اور کھڑا ہے اس ٹانگ میں بھی وہیل مچھلی کے بعض اجزائے مل ہیں وہ اس وہیل مچھلی موبلی ڈوک سے انتقام لینا چاہتا ہے - اسے ہلاک کرنے کے لیے زندہ ہے - یہی اس کا مقصد حیات ہے - یہ کپتان آلب ایک عظیم ہیرو ہے - اس کی تراش غراش، اس کا بے پایاں عزم، اس کا جنون اس کی شخصیت اور پھر سمندر اور موبلی ڈوک کے ساتھ اس کی جنگ اور اس جنگ میں اس کی ہلاکت - اسے عظیم یونانی الیے کا ہر دو بنا دیتے ہیں -

وہ ایسا دیوتا ہے جو آدمی ہے - !!

اس ناول کا راوی اسماعیل ہے - وہ بے کار ہے - وہ ہمیں اس دور کے امریکہ کی سیر کراتا ہے - وہی اور عوامی زندگی کے مناظر پیش کرتا ہے - وہ ہمیں ملاحوں کے حالات، عادات اور نفسیات سے آگاہ کرتا ہے - وہ ہمیں پوری تفصیل سے بتاتا ہے کہ جہاز جس پر وہ ملازم

ہوا کیسے روانہ ہوا اور جب ناول ختم ہوتا ہے تو اس جہاز میں سوار ہر شخص مر چکا ہے۔ سوائے اس کے۔ جو یہ رزمیہ سنانے کے لیے زندہ بچ گیا ہے۔
میلویل کے اس عظیم اور لافانی ناول کے بعض ٹکڑوں کو پیش کر رہا ہوں۔ ترجمہ محمد حسن عسکری مرحوم کا ہے کہ میرے خیال میں اردو میں اس ناول کا ترجمہ ان سے بہتر نہ کوئی کر سکتا تھا اور نہ ہی کر پائے گا۔

”موبلی ٹوک“ سے کچھ اقتباسات

۱۔ ہاں یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ پانی اور غور و فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔
۲۔ ذرا یہ تو بتائیے کہ غلام کون نہیں ہوتا۔ بڑھے کپتان مجھ پر کتنا ہی حکم چلا نہیں اور میری کتنی ہی ٹھکانی کر لیں لیکن مجھے یہ سوچ کر تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ سب ٹھیک ہی تو ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہ آدمی پر ہی گذرتی ہے۔ جسمانی طریقے سے مابعد الطبیعیاتی طریقے سے سہی ساری کائنات میں جدھر دیکھو وہی ٹھکانی رچل رہی ہے۔
۳۔ جہاں تک امیر آدمی کا تعلق ہے تو سمجھاؤ کہ برفانی محل میں شنشناہوں کی طرح رہتا ہے۔ شراب خوری کے خلاف اس نے ایک انجن بنا رکھی ہے جس کا وہ صدمہ ہے چنانچہ وہ پتلیوں کے شیر گرم آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں پیتا۔
۴۔ تھمکہ بڑے غضب کی چیز ہے اور لہجہ سے نادر و کمیاب۔ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہو جو بھی پر دوسرے کھل کھلا کے ہنس بڑس تو یقین مانئے وہ بڑی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔

۵۔ عقیدہ گیدڑ کی طرح قبروں پر پلٹتا ہے اور بڑے سے بڑے شکوک و شبہات سے بھی نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔

۶۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں جس چیز کو میرا سایہ کہا جاتا ہے۔ وہی میرا اصلی وجود ہے میرا خیال ہے کہ ہم لوگ روحانی حقیقتوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح مچھلیاں پانی کے اندر سورج کو دیکھتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ پانی کی مولیٰ ٹسی چادر ہوا کی طرح ہلکی ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ میرا جسم میرے اعلیٰ تر وجود کی لپٹ ہے۔

- ۛ۔ دنیا ایک جہاز ہے جو سمندر میں چل رہا ہے اور جس کا سفر کبھی پورا نہیں ہوتا۔
- ۛ۔ شاید سچا فلسفی وہی ہے جسے معلوم نہ ہو کہ میں فلسفیانہ قسم کی زندگی بسر کرتا ہوں جب میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلسفی کہتا ہے تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ اس بڑھیا کی طرح جس کا معدہ کمزور تھا۔ اس شخص کی بھی ہاضمے کی مشین ٹوٹ گئی ہوگی۔
- ۛ۔ آنکھیں بند کیے بغیر آدمی کو اپنی حالت کا احساس نہیں ہٹھیک طرح نہیں ہوتا ہلکے اندر جو حصہ مٹی کا ہے اسے تو روشنی مغرب ہے لیکن ہمارے اصل جوہر کے لیے تاریکی وہی چیز ہے جو مچھلی کے لیے پانی۔
- ۛ۔ جب تک آدمی مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی اور قتل یا ذلیل نہ کرے مجھے کسی کے مذہب پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

ۛ۔ انسان ایک تصور کی حیثیت سے ایک بلند اور تابناک چیز ہے۔

ۛ۔ انسان کا اصلی وقار آپ کو اس بازو میں نظر آئے گا جو مچھلاڑا چلاتا ہے یا ہتھوڑا اٹھاتا ہے وہ جمہوری وقار جس کا منبع خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔ جمہوریت کا مرکز اور محیط وہی قادر مطلق ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور یہی چیز ہماری مسادات کی ضمانت ہے اور اسے علویت بخشی ہے لہذا اگر میں حقیر جہاز یوں، متردوں اور جلاوطنوں میں تاریک اور پرالامہ لیکن نہایت بلند صفات دکھاؤں۔ ان کی زندگی میں المیہ کا سا جلال اور حسن پیدا کروں۔ اگر ان میں سے کوئی انتہائی معزومہ بلکہ انتہائی ذلیل شخص بعض اوقات روحانی بلند یوں پر چا پھنچے اگر میں کسی خلاصی کے بازو کو آسمانی نوز میں نکلا دوں۔ اگر میں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اندوہناک تاریکی میں ایک قوس و قزح روشن کر دوں تو اسے مسادات کی روح جس نے میرے سارے ہم جنسوں کو انسانیت کی ایک ہی خلعت بخشی ہے۔ تمام نقادوں کے مقابلے میں میری گواہ رہیو۔ اسے جمہوریت پسند تو میرا گواہ رہیو۔

ۛ۔ دنیا میں جتنے آلات ہیں ان میں انسان سب سے جلدی عذاب ہوتا ہے۔

ۛ۔ اس عجیب و غریب ملعونے یعنی زندگی میں لڑکھے موافقے ایسے بھی آتے ہیں کہ جب آدمی کو یہ ساری کائنات ایک بہت بڑا مذاق معلوم ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ اس کی ظرافت پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی اور اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس مذاق کا نشانہ خود میں ہوں۔

ۛ۔ ہم جن پُراسرار چیزوں کے خواب دیکھتے ہیں باوجود قربت کبھی نہ کبھی یہ اتفاق کے دل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کے گرد تعاقب کرتے ہوئے ہم یا تو کسی دیران، کسی مہجول بھلیوں میں جا پہنچتے ہیں یا راستے میں ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

ۛ۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ بڑی باقاعدگی سے بے قاعدگی برسی جائے۔

ۛ۔ جو لوگ دنیا سے کہتے ہیں کہ ہماری گتھی سلجھا دو۔ ان کے لیے تکلیف تو بہت ہے اور نائدہ کم۔ یہ خود اپنی گتھی تو سلجھا نہیں سکتی۔

ۛ۔ اکثر سننے میں آیا ہے کہ موضوع چاہے کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو لیکن جب یہ پھیلنا شروع ہوتا ہے تو بعض میں اس کے ساتھ ساتھ بلندی اور وسعت آتی چلی جاتی ہے اگر موضوع بڑا ہر توڑ ہر چیز کو بڑا کر کے رکھ دے۔ ہم بھی پھیل کر اتنے ہی بڑے ہو جاتے ہیں جتنا ہمارا موضوع عظیم کتاب لکھنے کے لیے موضوع بھی عظیم ہی چننا چاہیے جو چڑھڑی کے متعلق کوئی عظیم اور ویرپا کتاب کہیں لکھی جا سکتی چاہے بہت سے لوگوں نے اس کی کوشش کی ہو۔

ۛ۔ دنیا کی بڑی سے بڑی خوشیوں کے اندر ایک طرح کا بے معنی چھوٹا پن موجود رہتا ہے۔ لیکن تمام گہرے غموں کی تہ میں ایک پُراسرار معنویت ملتی ہے۔ بلکہ بعض آدمیوں میں تو فرشتوں کی سی شان ہوتی ہے۔ چنانچہ دکھوں کی نشانیاں دیکھ کر صرف یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انسانی مصائب کے شجرہ نسب کا مطالعہ کرتے کرتے ہم آخر کار دیوتاؤں کے شجرہ نسب پر جا پہنچتے ہیں۔ لہذا ہنسنے کھلکھلاتے سورج اور نغمہ ریز چاند کے سامنے کھڑے ہو کر بھی یہ بات ماننی پڑے گی کہ دیوتا تک خوش نہیں رہتے۔ انسان کی پیدائش کے وقت سے جو دکھ اور غمناک داغ موجود ہے۔ وہ داغ لگانے والوں کے غم کی نشانی ہے۔

ۛ۔ انسان کے اندر جو واقعی حیرت انگیز اور ہیبت ناک عناصر ہیں وہ آج تک الفاظ یا کتابوں میں بیان نہیں ہوئے۔ موت جب قریب آتی ہے تو سب لوگ برابر ہو جاتے ہیں۔ اور سب کے اوپر وہی ایک راز منکشف ہوتا ہے جس کا حال کوئی مردوں کی دنیا کا مصنف ہی بتائے تو بتائے۔ !

ۛ۔ مہذب آدمی بیمار پڑے تو اُسے اچھے ہونے میں چھ مہینے لگتے ہیں۔ جنگلی بیمار ہو تو ایک دن میں مٹھیک ہو جاتا ہے۔

ۛ۔ میں تجھے پوچھتا ہوں اور تجھ سے لڑتا بھی ہوں۔

ۛ۔ جتنی چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں وہ سب بے جسم ہوتی ہیں۔

ۛ۔ میری سب سے زیادہ عظمت میرے سب سے بڑے غم کے اندر پنہاں ہے۔

گلیور ڈیولوز

دنیا میں آج کوئی ایسا تعلیم یافتہ لڑکا یا مرد ہوگا جو کسی نہ کسی "گلیورز" اور "لی پیٹن" سے واقف نہ ہو۔ آج یہ نام دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور ان کو علامتوں اور استعاروں کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اگرچہ ٹوکر جاسن نے سولفت پر یہ بھینٹی کسی تھی کہ سولفت استعارے سے خوف کھاتا ہے۔

گلیور ڈیولوز ایک ایسی طنزیہ اور مزاحیہ کتاب ہے جو ہر ملک میں کھلی ڈھالی صدیوں سے پڑھی جا رہی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اسے فلم اور ٹی وی کے لیے بار بار فلمایا گیا ہے۔ اسے کارٹونوں اور اسٹیشنوں کی صورت میں ساری دنیا میں بار بار شائع کیا گیا ہے اور وہ ہر ملک جہاں کسی کتاب کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی، گلیور ڈیولوز کو دلچسپی سے پڑھا اور اپنا یا گیا۔ سیاست کی دنیا میں صدیوں سے اس کے کرداروں کے حوالے سے سیاسی اصطلاحات وضع ہوئیں جو آج بھی ساری دنیا میں رائج ہیں۔ ان کو سن کر اگر سولفت کی اس بے مثل کتاب کی طرف دھیان نہ بھی جائے تو ان اصطلاحوں کا پورا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے اور سننے پڑھنے والا حوظ اٹھاتا ہے۔

وہ شخص جس نے یہ عظیم ترین کتاب تخلیق کی وہ خود بھی ایک انوکھا شخص تھا، بہت تک چڑھا، بہت منہ بھٹ اور دوسروں کی اہانت کر کے دلی خوشی محسوس کرنے والا۔ فریڈرک لین نے سولفت کا جو فلسفاتی تجزیہ کیا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ کیونکہ کوئین نے سولفت کی بے مثل طنز کا سر شہ اس کی اپنی ذات کو قرار دیا ہے اور ان مردوں اور تشہ کامیوں کو اس کا سبب

قرار دیا ہے جن سے سولفٹ ساری عمر دوچار رہا۔

سولفٹ کا المیہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف انسان کو حقیر سمجھتا تھا بلکہ اس کی تذلیل کر کے بھی خوش ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور عظمتوں کے باوجود انگریزی ادب کا سب سے بدتر اور ناپسندیدہ لکھنے والا سمجھا گیا لیکن یہ ردِ عمل اس کے ذاتی رجحانات اور رویوں کی پیداوار تھا جہاں تک "گلیورز ٹریولرز" کا تعلق ہے اس کتاب کو صدیوں سے انسان نے چاہا اور دل میں بسایا ہے۔

وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جو اپنی فیاضی نزم دلی اور خوش خلقی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا لیکن جو ناکھن سولفٹ پر اپنے خاندان کی پرچھائیں تک نہ پڑی تھی۔ سولفٹ ۳۰ نومبر ۱۶۶۷ء کو ڈوبن رائٹ لینڈ، میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین آئرش نہیں بلکہ انگریز تھے۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کا باپ مرچکا تھا۔ بچپن سے ہی اس نے لغواری اور غربت کا بھینٹا ہوا چہرہ دیکھا پھر اس کے رشتہ داروں نے بھی اس خاندان کے ساتھ جو سلوک کیا اس نے بچپن میں سولفٹ کی زندگی میں تلخی اور کڑواہٹ بھر دی۔ پینے وہ کاسکنی سکول میں پڑھا پھر ڈبلن کے ٹینیسی کالج میں حصولِ علم کے لیے داخل ہوا۔ وہ کم آمیز طالب علم تھا وہ خود بہت سست اور لاتعلقی واقع ہوا تھا اس کی والدہ نے کوشش کی اور یوں سولفٹ کو سرولیم ٹیل کے ہاں سیکرٹری قسم کی ایک ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کے دوران وہ پادری بننے کے لیے دیہی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۲۷ برس کی عمر میں وہ پادری بن گیا لیکن یہ کام اس نے دو برس تک کیا اور اسے چھوڑ کر پھر سرولیم کے ہاں ملازمت کرنے چلا آیا۔ ۱۶۹۸ء تک اس نے یہیں وقت گزارا جب سرولیم ٹیل کا انتقال ہوا تو پھر ملازمت خود بخود ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے آئر لینڈ کے مختلف گرجوں میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۷۱۳ء سے اپنی موت تک وہ لارڈ بریکلی کی سفارش سے ڈبلن میں سینٹ پٹرک گرجے میں ڈین کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس گرجے کے ساتھ اس کی وابستگی کی وجہ سے اس گرجے کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ سولفٹ کی کسی نظیہ اور نثری تحریریں شائع ہو چکی تھیں۔ ان میں اس کی ایک تحریر "دی ٹیل آف اے ٹب" ایسی تھی۔ جس نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی اور لوگ اسے ایک

طنز نگار کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ آج بھی بعض نقاد اس کی اس تخلیق کو اس کا شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔

سولفٹ کو اپنی زندگی میں سیاست سے بڑھی دل چسپی رہی۔ اس دل چسپی کا بہن ثبوت اس کے شاہکار گلیوزز ٹریولرز سے بھی ملتا ہے۔ اس نے ٹورمی پارٹی سے ناٹ جوڑا اور مخالف نوک پارٹی کے خلاف طنز و مزاح کے تیر برسوں کے شروع کر دیے اس کی یہ سیاسی اور ہنگامی طنز یہ تحریریں اس دور میں تو بہت مقبول ہوئیں لیکن آج ان کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی کے طالب علم بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ جب ملکہ این کا انتقال ہوا اور ٹورمی پارٹی کا زور ٹوٹا تو پھر سولفٹ کی سیاسی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ لیکن اب اس نے آرٹس کا ز میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اور انگریز ہونے کے باوجود آئرلینڈ کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو گیا۔ اس نے اپنے تیز و ترس قلم سے پھر طنز یہ سیاسی تحریریں لکھنی شروع کر دیں۔

"WOODPS COPPER COINA C-G" کی ترکیب اسی زمانے میں سولفٹ نے ایک مضمون میں وضع کی تھی۔ جسے آج عالمگیر شہرت حاصل ہے اپنی ان سرگرمیوں اور تحریروں کی وجہ سے وہ ایک ہیرو کی حیثیت سے خاصا مقبول رہا۔

سولفٹ نے ساری عمر شادی نہیں کی لیکن اس کے دو معاشقوں کا سراغ ملتا ہے۔ سیٹلا اور ویٹا۔ دونوں خواتین باری باری اس کی زندگی میں آئیں۔ اس نے ان سے محبت کی لیکن وہ دراصل سٹی لوز انسان سے محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ دونوں خواتین اس کے سلوک سے نالاں ہوئیں اور اس کی زندگی سے نکل گئیں۔ وہ ان کے ساتھ بھی بڑی حقارت اور تذلیل سے پیش آتا تھا۔

سولفٹ ایک نفسیاتی مریض تھا اور بعد میں خود اپنے لیے ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ بن گیا وہ دنیا سے شدید نفرت کرتا تھا۔ انسان اور دنیا کا ذکر حقارت اور تلخی کے بغیر اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ وہ دماغی طور پر بیمار تھا۔ یہی مرض پاگل پن کا سبب بنا۔ اس کی زندگی میں ایک ہی خوشی آئی اور وہ تھی گلیوزز ٹریولرز کی اشاعت اور اس کی مقبولیت، جو ناخن سولفٹ

دنیا کے بے مثل طنز نگار اور عالم ادب کے ایک بے مثل شاہکار کے خالق کا انتقال مرض دیوانگی میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ڈبلن میں ہوا۔ جہاں وہ کئی برسوں سے دیوانگی کے علاج کی وجہ سے ڈاکٹروں کی نگرانی میں تھا۔

گلیورز ٹریولرز

دنیا میں جو مزاح اور طنز نگار ہوئے ہیں ان کے بارے میں جب لکھا جاتا ہے تو مزاح اور طنز دونوں صفات کو یکجا کر دیا جاتا ہے ایسے لکھنے والے ہوتے ہیں جنہیں خالص طنز نگار کہا جاسکتا ہو۔ سولفٹ کا شمار ایسے ہی معدودے چند لکھنے والوں میں ہوتا ہے اگرچہ والیٹر کو اس کی تخلیقات ناپسند تھیں تاہم سولفٹ کا شمار عالمی ادب کے چند بڑے بڑے طنز نگاروں میں ہوتا ہے اور انگریزی زبان میں تو اس کا کوئی ثنائی مشکل سے ہی ملتا ہے۔ اس کا اسلوب بے حد مزیدار اور سادہ تھا اس کا قلم تیزی سے مچھکتا اور تھمتے نہیں لگاتا تھا۔ بلکہ اس کا قلم زہر لگاتا تھا۔ طنز کا زہر۔ وہ طنز پیدا کرنے کے لیے پھکڑپن سے کام نہ لیتا۔ نہ ہی اس کی تلخی سستے جذببات کی پیداوار تھی۔

عالمی ادب کا یہ شاہکار "گلیورز ٹریولرز" جس کی بدولت سولفٹ کو لازوال شہرت ملی ہے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت کے لیے سولفٹ خود لندن گیا۔

"گلیورز ٹریولرز" دنیا کے ادب کا عجیب اور منفرد شاہکار ہے۔ اس عظیم طنز شاہکار کو ہر عمر کے انسانوں نے پڑھا اور اس سے لطف اندوز ہوئے۔ ایک سادہ دلچسپ اور دل میں اتر جانے والی کہانی لی وجہ سے اسے چھوٹے بچوں نے بھی پڑھا مچھر سکول کے طالب علموں نے بھی اور عالم و فاضل حضرات نے بھی اسے پسند کیا اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والوں کی کسوٹی پر بھی یہ شاہکار معیار می اور عظیم ثابت ہوا۔ گلیورز ٹریولرز نہ صرف بچوں، لڑکوں بلکہ بڑوں کا بھی پسندیدہ شاہکار ہے۔ عالمی ادب میں چند ہی ایسے کردار تخلیق ہوئے ہیں جنہیں لازوال زندگی ملی ہے۔ ایسے کرداروں میں سولفٹ کا کردار گلیورز بہت نمایاں ہے۔

گیارڈ سمٹھنے "گلیورز ٹریولز" کی کومنٹری لکھی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ دراصل اس طنزیر شاہکار کے حوالے سے سولفٹ نے اپنے عمدگی سیاسی صورت حال پر طنز کی ہے اس میں بادشاہ جارج اول اس کے دربار اور نیوٹن پر جو طنز کی گئی ہے وہ بہت کاری اور موثر ہے لیکن "گلیورز ٹریولز" کا اس پہلو سے مطالعہ مخصوص افراد کے لیے ہے۔ اس کی عالمی اور آفاقی اپیل کی وجوہات سے کتاب کی وہ صفات ہیں جو ہر انسان کے لیے کشش رکھتی ہیں وہ انش و عقل اور جہالت میں جو تضاد ہے وہ اس کتاب میں بہت نمایاں ہے۔ جانوروں اور انسانوں کی دنیا کا تضاد اور پھر انسان کے اندر جو خامیاں کمزور اور بدیاں ہیں ان کو اس کتاب میں انتہائی نقطہ تک پیش کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے "سیر ڈائریسکٹ" نے "گلیورز ٹریولز" کے بارے میں رٹے دی تھی "SEVERE UNJUST AND DEGRADING" لیکن اسے کیا کیجیے کے لیے یہ منفرد اسلوب کا شاہکار ہے۔ اس میں رمز و کنیے کا استعمال آنا حسین اور موثر ہے کہ بہت کم عالمی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس میں قوت متخیلہ اتنی خوب صورت، بھرپور اور وسیع ہے کہ پڑھنے والا اس دنیا میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

"گلیورز ٹریولز" سولفٹ کا ہی نہیں عالمی ادب کا شاہکار ہے۔

کونٹ آف مانی کرسٹو

ایڈمنڈ ڈیٹلز - غلام قادر فصیح اور موتیوں کا جہیزہ۔

ان تین ناموں سے ایک لڑھی بنتی ہے۔ ایک نام یاد آئے تو اس کے ساتھ دوسرے دو نام بھی فی الفور یاد آجاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ زمانہ جواب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ انسان زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور ماضی کے نشان زیادہ تر مٹاتا چلا جاتا ہے یا وہ امتداد زمانہ سے خود مٹتے چلے جاتے ہیں لیکن بعض یادیں، بعض کیفیات، بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان کا حافظہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔

ایڈمنڈ ڈیٹلز، موتیوں کا جہیزہ اور غلام قادر فصیح میری روح میں رچے بسے ہیں۔

عمر عزیز کی پانچویں دہائی میں داخل ہونے کے ساتھ جب میں اپنی عمر کی دوسری دہائی کے ابتدائی برسوں کو یاد کرتا ہوں تو مجھے یہ تینوں نام یاد آجاتے ہیں۔

ایڈمنڈ ڈیٹلز - ایگزیکٹو ڈوما کے مشہور عالم ناول 'کونٹ آف مانی کرسٹو' کا ہیرو ہے۔

جب میں اپنی عمر کی دوسری دہائی کے ابتدائی برسوں میں تھا تو میں نے ایک ناول پڑھا۔ موتیوں کا جہیزہ، یہ ایک صغیر ترجمہ تھا۔ بلاشبہ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل۔ اس کے مترجم غلام قادر فصیح کا نام میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہی ڈوما کے اس شہکار کے مترجم تھے۔ اس کی سو صفحات پر مشتمل ناول کو میں نے اپنے لڑکپن میں پڑھا اور یہ میرے دل پر نقش ہو گیا۔

مجھے یاد ہے کہ موتیوں کا جہیزہ پڑھنے کے بہت برس بعد جیسا پہلی بار مجھے ایگزیکٹو ڈوما

کایر ناول انگریزی میں دکھائی دیا تو میں کسی نئی سید سے اور بھوکے کی طرح اس پڑھنے پر اڑا۔ یہ ضخیم ناول میں نے دو دنوں میں پڑھ ڈالا اور غلام قادر نصیح نے اس کا چوترا جہ کیا تھا۔ اب مجھے اس کا ذائقہ میں محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت میرے پاس وہ تراجم نہیں۔ اگر اب میں اسے پڑھوں تو یقیناً اس کے ترجمے کے معیار پر کچھ بات کر سکتا ہوں انگریزی میں اسے میں نے کئی بار پڑھا اور کئی تراجموں کے ترجمے نظر سے گزرے ہیں۔

”کوئٹ آف مائٹی کرسٹو“ کا شمار دنیا کے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس میں انسانی فطرت اور زندگی کی تفسیر ایسے انداز میں بیان کی گئی ہے کہ جس نے اسے ایک بار پڑھا وہ اس کے کرداروں کے سحر اور تاثر سے کبھی دامن نہیں چھڑا سکتا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ ہو۔ پاکستان میں اس ناول پر مبنی دو مختلف فلمیں دیکھ چکا ہوں اسے بی بی سی ٹی وی نے تمثیل کی صورت میں پیش کیا۔

اپنی اشاعت کے سال سے اب تک یہ ناول دنیا میں پڑھا جاتا رہا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔ ایک زمانے میں اس کا ایک حصہ ڈرامے کی صورت میں ہمارے انگریزی نصاب میں بھی شامل رہا۔

ایگزینیٹر ڈوما کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا ایک دوسرا ناول ”تھری مسکیٹرز“ (THREE MUSKETEERS) بھی ان ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ جنہیں ہر دور میں پڑھا گیا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں ”کوئٹ آف مائٹی کرسٹو“ اور ”تھری مسکیٹرز“ میں ڈوما کا اسلوب عکس ہے۔ انسانی فطرت کے ساتھ اس کی شناسائی اتنی گہری ہے کہ بہت سے ناقابل یقین عناصر کو اس نے حقیقت کا روپ بخش دیا ہے۔

ایگزینیٹر ڈوما ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد فرینچ رمی پبلک میں ایک جرنیل تھا۔ ڈوما کا دادا ایک مارکوئیس اور دادی ایک عدالت تھی۔ ڈوما کے گھنے بال اور موٹے ہونٹ اس کے آباؤ اجداد کی خمازی کرتے ہیں۔ اس کی فطرت میں جو اتھا پسندی اور اشتعال تھا اس سے بھی اس کی رنگوں میں دوڑنے والے خون کا سراغ ملتا تھا۔

۲۴ جولائی ۱۸۰۷ء کو ویلز کوئٹرز میں پیدا ہوئے۔ ایگزیکٹو ڈوما کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا وہ باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔ ۲۰ برس کی عمر میں اس نے پیرس کا رخ اس حالت میں کیا کہ اس کا کل اثاثہ بیس فرانک تھے۔ پیرس میں اسے طالع آزمائی میں کامیابی حاصل ہوئی اور اسے ملازمت مل گئی۔

۱۸۲۶ء میں وہ ناول نگار کی حیثیت سے سامنے آیا اس کی پہلی تصنیف کا نام نادلا (NOUVELEE) تھا۔ ۱۸۲۹ء میں اس نے ہنری سوئم کے نام سے ایک تاریخی کھیل لکھا۔ اس کھیل نے اس کی شہرت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ اس اعتبار سے اس کھیل کی حیران کن اور سنسنی خیز کامیابی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اس دور میں جو ڈرامے کھیلے جاتے تھے وہ رومانی ہوتے تھے۔ رومانیت کا گہرا اثر اس دور کے فرانسیسی سٹیج پر تھا۔ اپنی اس بے مثل کامیابی کے زمانے میں جمی ڈوما ڈیوک آئرلینڈ کا ہی ملازم تھا جس نے اس کی کامیابی سے خوش ہو کر اس کی معمولی ملازمت کو ترقی دے کر اپنا لائبریرین مقرر کر دیا۔

ڈوما بڑا سیانا آدمی تھا۔ اس نے اپنی اس مقبولیت سے لہرا پورا فائدہ اٹھایا۔ عمائدین ہارسوخ اور اکابر میں سے تعلقات قائم کیے۔ اور اس سے مالی فوائد حاصل کیے۔

۱۸۴۶ء میں ڈوما نے ڈیوک ڈمی مونٹپیسیر کے ساتھ سپین اور افریقہ کا سفر کیا۔ اس سیاحت کے زمانے میں اس نے خوب خرچ کیا۔ واپس آیا تو مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اسے عیش و عشرت اور مٹھا مٹھا باٹھنہ زندگی بسر کرنے کی عادت ہو چکی تھی۔ اسلئے اپنے معیارِ ذلت کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے پیرس میں اپنا تھیٹر قائم کیا۔

وہ طالع آزمائے تھا۔ اس نے سیاسی شعبے میں بھی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن ناکام رہا۔ فرانس کے لوگ اسے بطور سیاسی رہنما تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ البتہ بطور مصنف اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے اخراجات اس کی آمدنی کے ساتھ مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے مالی پریشانیوں میں پھنس کر وہ بلجیم چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گیری بالڈی کا مداح بن چکا تھا جو اس وقت

یہ سسلی فینچ کر چکا تھا۔ گیری بالڈی کی امداد کے لیے اس نے فرانسیسی عوام سے عطیات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

وہ کابل اور بست الوجود ہو چکا تھا۔ دنیائے ادب میں وہ پہلا بڑا لکھنے والا ہے جس نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ اور اس کے زمانے سے وہ اصطلاح رائج ہوئی جسے GHOST WRITER کہتے ہیں۔ ڈومانا دار حاجت مند اور غریب مصنفوں کی خدمات حاصل کر کے ان کو اپنے ناولوں اور تخلیقات کا خاکہ تفصیل سے بتا دیتا۔ اس کے بعد یہ لوگ لکھنے کا کام کرتے لیکن ان مسودوں پر نظر ثانی وہ خود کرتا اور ان میں سبس اور ڈرامہ بھی خود ہی پیدا کرتا۔ اگرچہ اس نے ضرورت مند لکھنے والوں کا استحصال کیا لیکن اس سے ڈومانا کی مخصوص صلاحیتوں پر کوئی حرج نہیں آتا۔ وہ اپنے ہر ناول کا خالق خود تھا اور اسے خود ہی آخری اور حتمی شکل دیتا تھا۔

کسانی بیان کرنے میں اسے جو صلاحیت حاصل تھی وہ بہت کم لکھنے والوں کو دیتے ہوئی ہے۔

ڈومانا جس طرح اپنے ناولوں میں کسی خاص آئیڈیل کو سامنے رکھتا ہوا نہیں ملتا اسی طرح ہی نے اپنی زندگی بھی گزاری۔ اس پر بہت الزامات عائد ہوئے لیکن اس نے اپنی زندگی کا چلن نہ بدلا۔ اپنے دور کی حسناؤں سے اس کے تعلقات کی داستانیں رسوائیاں بھی بنتی ہیں اور تیزیل آمیز قصے بھی۔ لیکن ڈومانا کو اس سے کچھ عرصن نہ رہی۔ وہ اپنے انداز میں زندگی بسر کرتا رہا۔

ڈومانا کے قارئین کو اس کا احساس ہو گا کہ وہ اپنے ناولوں میں خوب صورت مکالموں کے کتنا کام لیتا تھا۔ اس کے ہاں مناظر کی تفصیل پر زور نہیں ملتا، بلکہ وہ یہ کام بھی مکالموں سے نکالتا ہے۔

اس کا پہلا تاریخی ناول "ازابیل ڈی بیواڑ" تھا۔ اسی ناول نے اسے سحر کی بنیاد بنائی کہ وہ فرانس کی پوری تاریخ کو ناولوں میں قلم بند کر لے اس کا یہ منصوبہ "کرانیکل آف فرانس" کی صورت میں سامنے آیا۔ جسے لمبھن نقاد اس کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ اس

کایہ عظیم و ضخیم کام سولہ نادلوں پر مشتمل ہے۔

وہ ساری عمر مقروض رہا لیکن اپنی زندگی کی طرز نہ بدل سکا۔ اس کے خلاف مقدمے دائر کئے گئے لیکن وہ اپنی طرز حیات میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکا۔ اس نے اپنے لیے ایک نخل نما حویلی تعمیر کرائی جہاں وہ زندگی کے دھندوں اور مشاغل سے آزاد ہو کر اپنی عمر کے آخری برس بسر کرنے کا حزمہاں تھا لیکن اس کا یہ خواب پورا نہ ہوا۔ آخری عمر میں وہ ایک بیمار اور نادار بوڑھا تھا۔ اس کا بیٹا جو خود ایک ممتاز مصنف اور مشہور ڈرامے CAMILLE کا خالق تھا۔ وہ اپنے نامور لیکن نادار باپ کو زندگی کے آخری ایام میں ۱۹۷۵ء لے گیا جہاں ۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو الیگزینڈر ڈوما کا انتقال ہوا۔

ڈوما اگر غیر معتدل زندگی نہ گزارتا تو اس کا انجام مختلف ہوتا۔ اسی طرح وہ اگر غیر معتدل لکھنے والا نہ ہوتا تو اس پر لگائے گئے الزامات سے اس کا دامن پاک ہوتا۔ اس کے باوجود وہ دنیا کے بڑے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے مصنفوں میں سے ایک ہے۔ اس کے دو نادلوں کونٹ آف مانتھی کرسٹو اور مٹھی مسکیئرز میں ایسی تاثیر ہے کہ آنے والے ہر دور کا قاری بھی ان میں دلچسپی لے گا۔

کونٹ آف مانتھی کرسٹو

ایک بڑا اور ضخیم ناول ہے۔

اس کا ہیرو ایک خوب صورت لوزجان ہے جو طاح ہے اس کا نام ایڈمنڈ ڈینیئر ہے اس کا باپ بوڑھا اور بیمار ہے۔ اس کی ایک محبوبہ ہے جسے وہ جی جان سے چاہتا ہے۔ ایک بحری سفر کے دوران میں اس جہاز کا کپتان مر جاتا ہے جس پر ایڈمنڈ ڈینیئر بڑے عمدے پر فائز ہے۔ مرتے ہوئے کپتان کی خواہش پوری کرتے ہوئے وہ اس کا ایک شفیق پیغام ایک شخص کو پہنچاتا ہے جس کی خبر اس کے حاسدوں کو ہو جاتی ہے۔

فرانس کی تاریخ کا یہ دور ہے جب نپولین اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اس کے حلیفوں اور ساتھیوں کو ملک دشمن سمجھا جاتا ہے۔ ایڈمنڈ ڈینیئر واپس ساحل پر آتا

ہے تو ہزاروں کمپنی کا مالک جو اسے بہت چاہتا ہے اسے جہاز کا پاکستان بنا دیتا ہے ایڈمنڈ ڈیفنڈر کو اپنے بوڑھے باپ سے بے حد محبت ہے۔ وہ ایک نیک شعار فرزند ہے وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے حاسد اس کے خلاف ایک سازش کا حال بنتے ہیں اور پولیس کا حامی اور باغی ہونے کا الزام لگا کر عین اس روز گرفتار کر دیتے ہیں جس روز اس کی شادی ہونے والی تھی۔

ایڈمنڈ ڈیفنڈر کو زندان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ مجسٹریٹ جو اسے سزا دیتا ہے۔ وہ اسی انقلابی اور حکومت کو مطلوب باغی کا باپ ہے۔ جس کے پاس ایڈمنڈ ڈیفنڈر اپنے کپتان کا پیغام لے کر گیا تھا۔ یہ شخص چاہتا ہے کہ اس کا راز فاش نہ ہو۔ حکومت کو معلوم نہ ہو کہ اس کا باپ حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہے وہ سارا ملکہ ایڈمنڈ ڈیفنڈر پر ڈال دیتا ہے جو زندان میں پڑا سر رہا ہے۔

میان ایڈمنڈ ڈیفنڈر کی ملاقات ایک بوڑھے عالم سے ہوتی ہے جو جیل سے فرار ہونے کے لیے برسوں سے سرنگ کھود رہا ہے لیکن یہ سرنگ ایڈمنڈ ڈیفنڈر کی کوششوں میں ٹکرتی ہے۔ یہ عالم ایڈمنڈ ڈیفنڈر کی کیا پلٹ دینا ہے۔ وہ اسے علم سے بہرہ ور کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ ان کا دنیا میں یہ مقام ہے اور انسانی جذبات میں انتقام کا جذبہ قوی ترین جذبہ ہے۔

جب اس بوڑھے کی موت واقع ہوتی ہے تو وہ ایڈمنڈ ڈیفنڈر کو مانسی کر سٹو کے عظیم خزانے کا راز بتا چکا ہے۔ ایڈمنڈ ڈیفنڈر بوڑھے کی لاش کو کھڑکی میں رکھ کر خود اس کی جگہ "مردہ" بن جاتا ہے۔ جیل کے حکام اس کو لاش سمجھ کر جزیرے سے باہر سمندر میں میں پھینک دیتے ہیں۔ اب وہ آزاد ہے۔ وہ مانسی کر سٹو کے جزیرے میں پہنچتا ہے اور وہاں وہ خزانہ تلاش کر کے اس جزیرے کو خرید کر کونٹ آف مانسی کر سٹو بن جاتا ہے۔

اس کی دولت اس کے اثر و رسوخ اس کی ذہانت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ حیران کن شخص ہے۔ بوڑھے عالم نے اسے علم اور دولت کا بے بہا خزانہ بخشا تھا اب وہ اس منافق اعلیٰ سوسائٹی سے انتقام لیتا ہے جو مہذب، کھلاتی ہے لیکن اسے کوڑھ

ہو چکا ہے اور اپنے کوڑھ کو اس نے ریشمی اور قیمتی لباس میں چھپا رکھا ہے۔
 وہ ان لوگوں کا سرپرست ہے جو مظلوم ہیں۔ ان کے لیے اس کی دولت حاضر ہے
 جنہوں نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک کیا تھا۔ جب وہ برس برس جیل میں سڑ رہا
 تھا تو اس کا باپ کسمپرسی کے عالم میں مر گیا۔ اس کی محبوبہ نے شادی کر لی مہمی۔ اس کے
 حاسد اور دشمن اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہو چکے تھے لیکن وہ ان سب سے ٹکر لینے کا حوصلہ
 اور وسائل رکھتا ہے۔ اس کی دولت، اس کی پراسرار شخصیت، اس کی بے پناہ ذہانت
 مجسمہ انتقام بن جاتی ہے۔

وہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ وہ سازش کے جال بنتا ہے اور اپنے دشمن کو ایسے
 انجام سے روشناس کرتا ہے جس کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا جاہ و جلال
 اس کا کردار اور اس کا اندازِ زیلت دوسروں کے لیے معرکوب کن ہے۔ اس کے چہرے میں
 ایک ایسی کشش ہے جو بیک وقت گھناؤنی اور ہولناک بھی ہے اور خوب صورت بھی
 وہ سرایا رحم ہے اور سرایا انتقام و عذاب بھی۔

اس کے کردار کے عمل اور رویے کے حوالے سے ڈوما ہمیں ایک ایسے معاشرے
 اور اس کے افراد سے ملاتا ہے جو منافق ہے۔ ریاکار ہے۔ جو ظاہر سے بڑا خوشنما اور
 خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا باطن بے حد غلیظ اور مکروہ ہے انسانی نفسیات
 کو ڈومانی بے شمار کرداروں کے حوالے سے پیش کیا ہے جہاں معاشرے کے راندہ درگاہ
 اور دھتکارے ہوئے انسان انسانیت کے جوہر سے منصف دکھائی دیتے ہیں اور جو
 لوگ معاشرے کے سربراہ اور عمائدین ہیں وہ گھٹیا اور انسانیت سے عاری
 کونٹ آف مانٹی کرسٹو۔ ایک عظیم نادل اور عظیم کردار ہے۔ وہ روایات کا امین
 ہے۔ مشرق و مغرب کی روایات کو اس نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

وہ اپنی سابقہ محبوبہ جو اسے پہچان نہیں سکی اس کے ہاں دعوت میں جاتا ہے جو دعوت صرف
 اسی کے اعزاز میں دی گئی ہے کیونکہ کونٹ آف مانٹی کرسٹو نے اس کے بیٹے کی جان
 بچائی ہے۔

لیکن اس دعوت کا مہمان خصوصی۔ کونٹ آف مانٹی کرسٹو۔ اس دعوت میں کوئی چیز نہیں چکھتا۔

یہ روایت مشرق کی ہے کہ دشمن کے گھر کا اناج چکھنا بھی گناہ ہے۔

ایڈمنڈ ڈیٹینر۔ کونٹ آف مانٹی کرسٹو۔ مشرق کے لوگوں پر اعتماد کرتا ہے اس کا سب سے قریبی معتمد اور راز دار اس کا ایک مشرقی ملازم ہے۔ جو کونٹ آف مانٹی کرسٹو جس نے ایک ترک شہزادی کو بیسی بٹنایا ہے۔ مشرق کا ایک لادوال کردار بن گیا ہے۔

مہیشہ زندہ رہنے والا، ہمیشہ پڑھا جانے والا، ہمیشہ پسند کیا جانے والا۔

ایگزیکٹرز ڈوم مانے اس ناول کے حوالے سے ہیں ایسے معاشروں کی سچی تصویر

دکھائی ہے جہاں معاشرتی ناہمواریاں ہیں۔ جہاں سیاسی استحصال ہوتا ہے۔ جہاں صرف دولت کی پوجا ہوتی ہے۔

ہیروئن کا میسٹری

چھوٹے بڑے لکھنے والوں کے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک دعویٰ ملتا ہے۔ شاعرانہ اور حقیقی دونوں کا کوئی حساب لگانے بیٹھے تو پاگل ہو جائے لیکن بالزاک نے جتنا بڑا دعویٰ کیا۔ اس کی مثال دنیائے ادب میں نہیں ملتی اور پھر اپنے دعویٰ کے لیے جو ثبوت پیش کیا اس جیسا ثبوت بھی دنیائے ادب کم ہی پیش کر سکتی ہے۔

بالزاک کا دعویٰ اتنا کہ وہ سماج کا جنرل سیکرٹری ہے۔

وہ لکھنے کے فن کو مقدس سمجھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ لکھنے بیٹھتا تو پادریوں کی کالی جبا پہن لیتا تھا۔ اس نے ایک عجیب زندگی گزاری۔ قرض کے تلے پتا رہا۔ جیتا رہا اور لکھتا رہا۔

کارل مارکس اور اینگلس اور لینن جیسے اس کے ایک طرف مداح تھے تو دوسری طرف اس نے باریشیر، آندرے مورو اور اپنے بعد آنے والے دنیا کے ہر بڑے لکھنے والے سے حراجِ تحسین حاصل کیا۔ اب بھی دنیا میں ایسے ناقدوں کی کمی نہیں جو اسے دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کرتے ہیں۔

اس کے ناولوں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ اس کے فن پر ان گنت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فرانس کے بڑے لکھنے والوں میں سے بالزاک کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اردو زبان میں اس کے دو بڑے شکار مستقل ہو چکے ہیں۔ بڈھا گوریو اور یومین گرانڈے "کارتہ جمہ" "سرد ویران اندھیرا گھر"

دونوں کی مترجم سیدہ نسیم ہدائی ہیں۔ اس کی بے مثل کہانیوں Droll stories کی ایک اپنی ہی لذت اور ذائقہ ہے اور کچھ کہانیاں بھی اردو میں مستقل ہو چکی ہیں۔ کرشن چندر اس کے مداح تھے۔ اور اسے ٹاسٹائی سے بڑا ناول نگار مانتے تھے۔ دوسری طرف محمد حسن عسکری اس کی تعریف میں مدلوں

رطب اللسان رہے۔

بلازاک دینا تے ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ ناول نگاروں میں بہت کم ایسے ناول نگار ہوئے ہیں جنہوں نے تعداد میں اتنے زیادہ اور اتنے بڑے ناول لکھے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں اس کی وفات کو پوری ایک صدی ہو چکی تھی۔ ایک صدی سے زائد عرصے میں دنیا میں ناول کے فن نے بڑی ترقی کی۔ اس میں بڑے بڑے اہم تجربے ہوئے۔ ٹیکنیک میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کے باوجود بلازاک کا نام اسی طرح جگمگا رہا ہے۔ ایک صدی نے اس کے کام کی معنویت اور اہمیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ اسے دھندلایا نہیں ہے۔ وہ اتنا طاقتور، زندہ، رسنے والا مصنف ہے کہ اسے زمانہ بھلا نہیں سکتا۔

بلازاک کی اپنی زندگی ایک عظیم انسانی رزمیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہیرو ہے جو ہار ماننا جانتا ہی نہیں۔ مصائب اور آلام اس کو گھیرے میں لیے رکھتے ہیں۔ اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن وہ کسی پریشانی سے ہراساں نہیں ہوتا۔ وہ تخلیق کے منصب سے آنکھیں نہیں چرانا دنیا کی بڑی سے بڑی ناکامی اور پریشانی اس کے تخلیقی صوتوں کو خشک کرنے میں ناکام رہی۔ وہ اپنے کام میں تخلیق کرنے میں بہترین مصروف رہا۔ فرانس میں ایک گاؤں تورس ہے جہاں وہ ۲۰ مئی ۱۷۹۹ء کو پیدا ہوا وہ اپنے چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ یعنی پہلو بھئی کا بیٹا۔ اس کے والدین درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ باپ قصبے میں ایک درمیانے درجے کے سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ بلازاک جب لاپرواہی کے مدرسے پیرس میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا تو یکدم عوم حالات نے پلٹا کھلایا۔ اس کے والد کی ملازمت ختم گئی۔ گھر کے حالات بھی اس سے بڑی طرح متاثر ہوئے۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو گیا۔ مستقبل کے اس عظیم مصنف اور ناول نگار کو اپنے گھر کی عموالات کے تحت ایک نوٹری آفس میں بطور کلرک ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ لیکن بلازاک کو دفتری معمولات اور ذرا لٹریچر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آئندے کے مورخانے لکھا ہے کہ بلازاک کی بہن نے Intuition of Renown. کا مالک سمجھتی تھی۔ اس لیے بلازاک نے جلد ہی یہ ملازمت ترک کر دی اور ایک لکھے والے کی حیثیت سے اپنا مقام بنانے کے لیے نثر پر تصنیف کو اپنا پتلا تھا۔ دورات رات بھر جاگتا اور کھاتا رہتا۔

۱۸۲۶ء میں حالات کو بہتر بنانے کے لیے اس نے ایک طالب بار پیٹلے کے ساتھ شراکت کر لی اور خود

ہی اپنی کتابوں کا نام مشربین کیا۔ لیکن اس کی یہ کاوش بھی ناکام رہی۔ اس کام میں اسے شدید خسارہ رہا اور قرضہ کم ہونے کی بجائے اس پر قرضے کا مزید انبار رکھنا پڑا۔

اس کے باوجود اس نے یورپیوں اور مصائب سے اپنے فن کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ وہ پہلے چلیے انہماک سے ہی تخلیق کرتا رہا۔ اور پہلی جلدی محنت اور لگن سے لکھتا رہا۔ بالآخر ۱۸۲۹ء میں اس کا ناول Lachouans شائع ہوا۔ جس سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ ناول ایک تاریخی ناول ہے۔ اس ناول کی اشاعت اور مقبولیت سے بالزاک نے اپنے اصل نام سے لکھنا شروع کیا اور اپنے پہلے سارے کام کو خود ہی مسترد کر دیا۔ اس ناول کی اشاعت سے پہلے اگر وہ غیر معمولی محنت اور لگن سے لکھتا تھا تو اس کی اشاعت کے بعد اس نے پہلے سے زیادہ وقت نظری، تخلیقی، سچائی اور انہماک سے لکھنا شروع کیا۔

اتنی بھر پور مصروفیت اور محنت کے باوجود اس نے کسی نہ کسی طرح محبت کرنے کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیا۔ اس محبت نے بھی اس کے مصائب میں اضافہ ہی کیا۔ کیونکہ اس کی محبوبہ ایک شادی شدہ پولش خاتون داماد ایلینا مینیکا تھی۔

جیسی حیران کن، رزمیاتی زندگی بالزاک نے گزاری۔ ویسی اس کی محبت معنی ایلوینا سے اس کی محبت اس کے لیے ایک روگ ثابت ہوئی۔ اس کے عشق میں اس نے کسی دوسری عورت کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ مصروفیت، تخلیق کی لگن نے اسے پہلے کبھی اتنی فرصت ہی نہ تھی لیکن جب عشق ہوا تو ایسی خاتون سے جو شادی شدہ، صاحب جاؤ اور سوسائٹی میں بڑا نام رکھتی تھی۔ ۱۸۲۲ء میں بالزاک کی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی محبوبہ ایلینا کا فتورہ قرضہ لے لئی سے فوت ہو گیا۔ اب وہ اس سے شادی کر سکتا تھا۔ لیکن بالزاک چاہنے کے باوجود بھی اپنی محبوبہ سے جلد ہی شادی نہ کر سکا۔

جس سے شادی کرنے کی آرزو میں اس کی عمر بیت گئی تھی۔ بالزاک کو کئی بیماریوں اور مصیبتوں نے آن گھیرا۔ جس سے شادی اتنا میں پڑنی چلی گئی۔ اور اپنی موت سے صرف چند ماہ پہلے بالزاک اس قابل درسا کہ وہ اپنی محبوبہ سے شادی کر سکے۔ جب اس کی عمر ۵۰ برس چوٹکی تھی۔

ابتداء میں اس نے ایک فرضی نام سینٹ این۔ ایم۔ ڈی ویلگرے سے جاسوسی ناول بھی لکھے۔ لیکن اس میں وہ ناکام رہا۔ تو تخلیقی ادب کی طرف آ گیا جو اس کا اصل میدان تھا۔ لیکن یہاں بھی آغاز بہت بائیس ن ہوا۔ بالزاک نے ناکامیوں سے گھبرا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے انتھک محنت اور لگن سے لکھنے کا عمل

جاری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی ادب کی تاریخ میں شاید ہی کوئی سمٹ اور لگن کے معاملے میں بالزاک کا مثیل ہو۔ ناکامیوں نے اسے آلام و مصائب میں گرفتار کر دیا۔ عزت کے بیڑے نے گھر کی دہلیز پر ڈیرے ڈال دیے اور قرضے بڑھتے چلے گئے۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری وہ تھک کر نہ ڈٹا تھا بلکہ جھکا جاتا۔ اپنے فنی کے ساتھ وہ اتنا مخلص تھا کہ ایک مناسب موزوں اور برعمل لفظ کے انتخاب کے لیے گھنٹوں سر کھپاتا رہتا تھا۔

ایلوینا سے اس کی محبت اور پھر اس سے ملاقات کے لیے دور دراز کے مقام تک آنے جلنے کی وجہ سے ایک لمبے عرصے تک بالزاک کی تخلیقی پیداوار میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کی تخلیق توانائی کے سوتے کبھی خشک نہ ہونے پائے۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے بالزاک پوری دل جمعی سے اپنا کام نہ کر سکا۔

بالزاک نے دوسری انگنت تحریروں کے علاوہ ستر ناول لکھے۔ دسی بیومن کا میڈی ۵۵ ناولوں پر مشتمل ہے تمام ناول اپنی اپنی جگہ مشکل ہیں، لیکن ایک خاص رشتے میں منسک ہیں۔ اس کے ناولوں میں "دیہات کی زندگی کے مناظر" شہر کی زندگی کے مناظر" "بڈھسا گوریو" "یوحین گلاڈے" ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں جو چار ناول لکھے۔ ان کا شمار عالمی شہکاروں میں ہوتا ہے اور ان چاروں کی شہرت سے اس کا عظیم الشان کارنامہ "بیومن کا میڈی" مرتب ہو کر تکمیل پاتا ہے۔

وہ چار ناول ہیں: "کرن میڈی"، "کرن پون"، "عصری زندگی کے مناظر" اور "دوباری زندگی کے مناظر" بالزاک کا منصوبہ دنیا کے عظیم ترین ادبی مقصودوں میں سے ایک ہے۔ اس کی تقلید بعد میں زولانے کی اور گزوردی نے بھی کر اپنی اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود ایک رشتے اور ایک خیال میں منسک ناول لکھے اور ان کو یکجا کیا گیا۔ بالزاک کے سامنے انسانی فطرت تھی۔ وہ یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ انسانی سماج کا سیکرٹری جنرل ہے۔ وہ انسانوں کی نفسیات کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ وہ انسانی کائنات کو ایک طریقے کی صورت میں دیکھتا اور پیش کرتا ہے۔ اب یہ تو بالزاک کے پڑھنے والے ہی جانتے ہیں کہ اس نے یہ انسانی طریقے کس ایلے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور انسانی تقاضا کتنا بڑا المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔

جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اور اس کی تائید بعض نامور لکھنے والوں نے بھی کی ہے وہ یہ ہے کہ جتنے کردار تعداد میں بالزاک نے تخلیق کیے ہیں۔ اتنے کردار کسی دوسرے لکھنے والے نے تخلیق نہیں کیے

مجھے اس وقت نام یاد نہیں آ رہا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فرانس کے ایک محقق اور نقاد نے کئی جلدوں پر ایک کتاب مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ جس میں اس نے صرف بالزاک کے ناولوں کے تمام کرداروں کا شمار کیا ہے اور ان کے بارے میں وضاحتی اور تشریحی نوٹ لکھے ہیں۔

بعض نقادوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انسانی نفسیات سے جتنی واقفیت ٹیکسٹ پیئر کو تھی دوسرے کسی لکھنے والے کو حاصل نہ ہو سکی۔ ٹیکسٹ پیئر کے بعد جس شخص کا نام لیا جاسکتا ہے وہ بالزاک ہے۔ اس رائے پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اختلاف کر سکتا ہوں نہ اتفاق۔ کیونکہ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو ٹیکسٹ پیئر بالزاک اور پورا انسانی نفسیات پر عادی ہو اور میرا ایسا کوئی دعوے انہیں ٹیکسٹ پیئر کی ہر تحریر پر پڑھنے اور بالزاک کے چار ایس ناولوں کا قاری ہونے کے باوجود میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

بعض نقادوں نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ بالزاک کے ہاں کردار نگاری ایسے عروج پر پہنچی ہوتی ہے کہ جس کی مثال دنیائے ادب میں نہیں کر سکتی۔ کردار نگاری کے ضمن میں اس کا کوئی ثانی نہیں لیکن اس کے بیشتر ناول اس چیز سے محروم ہیں۔ جسے توازن کا نام دیا جاتا ہے یہ ایک ایسی رائے ہے جس پر میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔ لاکامیڈی ہیوسن کے بعض ناولوں میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے۔ یہ ناول حسن توازن سے محروم ہیں لیکن لاکامیڈی ہیوسن کے بیشتر ناول ایسے ہیں جن پر حسن توازن کے فقدان کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اصل میں بالزاک کو اپنی زندگی میں اتنا کچھ لکھنا پڑا کہ تمام تر انہماک، لگن اور محنت کے باوجود وہ بعض ناولوں میں بعض خامیوں کو کبھی دور نہ کر سکا۔

ایک بات بہر حال ہے کہ ٹیکسٹ پیئر کے ساتھی ڈراموں کے مجموعی کرداروں کی تعداد۔ بالزاک کے ناولوں کے کرداروں کی تعداد سے بہت کم ہے۔!

جیسے جیسے چہرے اور جیسے لوگ بالزاک کے ناولوں کی کائنات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے اور اتنے چہرے کسی بڑے لکھنے والے کے نگار خانہ تخلیق میں دکھائی نہیں دیتے۔!

بالزاک جس کا انتقال ۱۸ اگست ۱۸۵۰ کو پیرس میں ہوا۔ اس کے بارے میں میں نے لکھا تھا۔

The greatest store house of documents that we have of human nature.

لاکامیڈی ہیوسن کے دیباچے میں بالزاک نے ایک اور دعوے کیا تھا کہ وہ زندگی کو پیش کر رہا ہے۔

اس کا دعوے صادق تھا جس انداز میں اس نے اس دعوے کو ثابت کیا کہ اس کی مثال ملتی مشکل ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جس طرح علم الحیوانات کے ماہرین حیوانوں کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ میں انسانوں کی اسی طرح درجہ بندی کروں گا۔ انسانوں کی انواع کو سامنے لاؤں گا۔ اور ان کی انفرادیت کو ان کے پورے کردار کے ساتھ پیش کروں گا۔ یوں بالزاک نے کامیڈی ہیومن میں پوری انسانی زندگی کی ایک مدور شکل میں تصویر کھینچنے کی سعی کی جس میں وہ بے حد کامیاب ہوا۔ اس نے "کامیڈی ہیومن" کے ناولوں کے حوالے سے ہزاروں کردار تخلیق کیے۔ اپنے ناممکن کام کی تکمیل کے لیے ساری عمر جتار ہا۔ ادبی مورخ اور نقاد، متفقہ طور پر اس کے بارے میں رائے دیتے ہیں۔ اس نے جس منصوبے کی تکمیل کا دعوے کیا اور بیڑہ اٹھایا وہ اس میں کامیاب رہا۔

- کامیڈی ہیومن میں شامل ناول۔ محض ناول نہیں ہیں بلکہ یہ زندگی کا پینر راما ہے۔ اس نے جس طرح سے سوچا تھا اسی طرح مکمل کیا۔

اور دنیائے ادب میں یہ بہت بڑا بے مثل کارنامہ ہے۔۔۔

اب میرے جیسے ادب کے طالب علم اور بالزاک کے پرچس مباح کے لیے یہ بے حد مشکل ہے کہ وہ کامیڈی ہیومن میں سے کسی ایک ناول کو چھانٹ کر یہ کہہ سکے کہ یہ اس کا شاہکار ہے۔ بالزاک کے شاہکار تعداد میں بہت زیادہ ہیں یہ تمام ناول ایک کثافت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں انسانی نفسیات کے بابے ایسے انکشافات ملتے ہیں جو اس سے پہلے اور اس کے بعد کی تحقیقات میں شاید نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ میرے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اس کے چھ ناولوں کے بارے میں اشارہ کرتا چلوں۔ کیونکہ ان ناولوں میں انسانی کرداروں، ان کی نفسیات اور ان کی جرگائیں آباد ہے اسے کسی ایک مضمون میں پیش کرنا ناممکن ہے۔

تو پہلے کس ناول کا ذکر کروں؟

کزن میٹی کا جسے ساری عمر دوڑنے کی خدمت سے فرصت نہ ملی۔ وہ اپنے عزیزوں کے لیے کولمبو کے بیل کی طرح تھی۔ دن رات کام کرتی رہتی۔ اور کوئی اس کا غمگسار نہ بنا۔ کسی نے اس کے دل میں جھانک کر نہ دیکھا۔ اس کی انگلیوں اور حسرتوں کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا یا پھر COUSIN PONS کا جو دنیا میں تنہا تھا جسے پناہ ملی تو اپنے جیسے ایک بوڑھے موسیقار کی دوستی میں۔ دوستی کا انسانی زندگی

میں جو مقام ہے اس پر یہ ناول آمد سے موردِ اِنگاہ میں سب سے بڑا اور موثر ناول اپنے رشتہ داروں اپنے عزیزوں کی کج خلقی سے نالاں اور رنجور پونز کے پاس نزاوات کا ذخیرہ ہے لیکن اس کا دل دوستی سے خالی ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی دوست نہیں۔ اس کے امیر اور دولت مند رشتے دار اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے ہیں۔ اسے کھانا بھی کھلاتے ہیں تو اس میں بھی تعقیر اور اہانت کا عنصر شامل ہوتا ہے پھر اسے ایک اپنے جیسے عمر خوردہ بوڑھا ملتا ہے۔ یہ اس کا دوست ہے۔ ان دونوں کی زبان مختلف ہے۔ دوسرا موٹیا بوڑھا جرم ہے۔ لیکن ان کے دل دوستی کے رشتے میں بندھے ایک دوسرے سے ہکلام ہوتے ہیں۔ بوڑھے poins کو زندگی دوستی کا دامن پھیلا کر پناہ دیتی ہے لیکن اسکی موت۔ یہ سب کچھ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تو پھر مجھے The great illusions. کا ذکر کرنا چاہیے۔ شہری اور دیہاتی زندگی کا منفرد مشاہدہ اور مطالعہ انسانوں کے وہ رویے جو کشف کی طرح پڑھنے والے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ شہرت کس طرح رسوائی بنتی ہے۔۔۔ یا پھر میں Ass. skin کا ذکر کروں جس کا امیر و زندگی کی خوشیوں کے لیے اپنی روح بیچ دیتا ہے اور اس کی زندگی کا دار و مدار گدھے کی کھال کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ہے اور جب اس نے معدوم ہونا ہے تو اسے مرجانا ہے۔ یہ نوجوان گوتے کے ناولرٹ سے بہت مختلف ہے۔ اس کا اپنا کردار ہے۔ اپنی نفسیات ہے اور پھر جس طرح وہ اپنے ہونک انعام سے دور چار ہوتا ہے وہ دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا ہے۔

کا میڈی سیوسن کے ناول Man and Harlot. کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے یہ شہر کی دنیا ہے۔ تھریٹر اور اخباروں کی دنیا۔ جہاں تخلیقی لکھنے والا اخباروں کی سنسنی خیزی کی ٹھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جہاں ناول نگار اور شاعر۔ ایک نئی مخلوق میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اس صنعتی اور سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے۔ وہ صحافی بن جاتا ہے۔ Eugene grandet. کے ذکر کے بجز کار میڈی سیوسن کے ناولوں کی اہمیت کس طرح اُجاگر کی جا سکتی ہے۔

اس ناول میں بالزاک نے ایک کبوترس کا ایسا بے مثل کردار کیا ہے کہ جو انسانی فطرت کے ان دُشکے چھپے گوشوں کو سامنے لاتا ہے جو پڑھنے والے کو ہتھرا دیتے ہیں۔ یہ نادر محبت کا نوحہ ہے اس لڑکی کا نوحہ ہے جو اس کبوترس کی میٹی ہے اور اپنے دلوا لید اور خود کشی کرنے والے چپا کے بیٹے کے عشق میں گرفتار ہے۔ کس کس انداز میں وہ ایثار کر کے اپنے محبوب کے لیے چھوٹی چھوٹی معمولی معمولی آسائشیں فراہم کرتی

ہے اور پرنسوس اپنی کجخوشی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ وہ کاغذ بچانے کے لیے اس اخبار پر اپنے نفع و نقصان کے اعداد و شمار لکھتا ہے جس میں اس کے بھائی کی موت کی خبر چھپی ہے۔ مرتے ہوئے آخری لمحوں میں ہادری کے سینے پر لٹکتی ہوئی سونے کی صلیب دکھیر کر اس کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ ایسے شاہد اور اتنی حسین کردار نگاری کا نمونہ ہے جو صرف بالزاک کے ہی بس کی بات تھی۔

اور پھر اس ناول کا ایک کردار ملازمہ نانوں کون بھلا سکتا ہے... اپنے آقا کے ساتھ اس کی جانوروں جیسی وفاداری محبت کی کونسی قسم ہے۔ کونسی اداس ہے؟

اور پھر کامیڈی ہیومن کے ناول بڈھا گریو، کا گوریو ٹیکسپیئر کے گنگ لیٹر سے شانے سے شانے ملائے ہوئے کھڑا ہے۔ چھوٹا مزہ بڑی بات۔ لیکن اسے کسے بغیر چارہ نہیں کہ اپنی تمام تر عظمتوں اور فخر کی کے باوجود۔ باپ اور بیٹیوں کی محبت کے موضوع پر جتنا بڑا ناول بڈھا گریو ہے اتنا بڑا ڈرامہ گنگ لیٹر نہیں ہے۔

یہ بڈھا گریو جو اپنی بیٹیوں پر جان چھڑکتا ہے ایسا انسان ہے جو اپنی بیٹیوں کی خوشی اور شادمانی کے لیے ہر قربانی دے سکتا ہے آپ بھوکوں مر سکتا ہے لیکن ان کے لیے سب کچھ بھینچتا چلا جا رہا ہے۔ وہ اس حد تک اپنی بیٹیوں پر فریفتہ ہے ان کی خوشیوں کا طلب گاہ ہے کہ وہ ان کے عاشقوں تک کو دعائیں دیتا اور ان کی خوشنودی کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن وہ دھتکارہ ہوا انسان ہے اس کی بے انتہا محبت کی کسی کو قدر نہیں وہ ایسی ہی بے چارگی کی موت مرتا ہے جیسی موت ایسے مرنے والے بے مہر معاصرے میں ایسے دنا شعار اور محبت کرنے والے لوگوں کا انجام اس سے مختلف کیا ہو سکتا ہے لیکن اس کے انجام سے اس ناول کا جوان ہیرو پیرس میں نت نئے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لیے آنے والا پوٹین۔ نیا دلولہ حاصل کرتا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ بے مہر شکر من طرح فتح کیے جا سکتے ہیں۔ انہیں فتح کرنے کے لیے مہر اور محبت کی نہیں بلکہ سفاکی کی ضرورت ہے بڈھا گریو، میں وہ مخلوط جو بنیں اپنے بھائی پوٹین کے نام کھاتی ہیں۔ وہ بھائی اور بہنوئی کی محبت کے رشتے کی خوب صورت اور موثر ترین تفسیر بن جاتے ہیں۔

کامیڈی ہیومن کے بارے میں کیا کچھ لکھوں؟ کس کس ناول کا کس کس طرح ذکر کروں؟ ان پر لکھنے کے لیے بڑا ذہن اور بڑا قلم اور ایک عمر چاہیے اور یہ سب کچھ مجھے میسر نہیں!!

دارلینڈ پیس

کوئینس گارنٹ کا انگریزی ترجمہ اور ایک دورِ اناؤہ گاؤں موضع ڈنڈیاں ... انسان زندگی کے بعض ایسے تجربات اور واقعات ہوتے ہیں جن کا ذائقہ انسان اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک محسوس کرتا ہے۔ عالمی ادب میں فکشن کا سب سے بڑا شاہکار ٹالسٹائی کے ناول دارلینڈ پیس کو مانا جاتا ہے اس کی شہرت سن سن کر کتنا اشتیاق تھا کہ اسے پڑھا جائے۔ اور پھر پہلی بار اس کا پورا اور مکمل ترجمہ ہاتھ آیا۔ جو کوئینس جیے استاد اور عظیم مترجم کا کیا ہوا تھا۔ اسے اتفاق کیسے کہ ٹالسٹائی کا شاہکار عالمی ادب کا عظیم فن پارہ "دارلینڈ پیس" مجھے ایک گاؤں میں پہلی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ پرسکون خاموش اور گھٹا ہوا گاؤں، موسم بہار کا ... اور ٹالسٹائی کا "دارلینڈ پیس" میں سمجھتا ہوں کہ میں اس ماحول اور اس عظیم تخلیق کے حوالے سے جس تجربے سے روشناس ہوا وہ خدا کی بڑی دین تھی۔

اور خدا ٹالسٹائی پر بھی یقیناً بے حد مہربان تھا کہ اسے ایسی صلاحیتوں سے نوازا کہ جن کی بدولت وہ عالمی ادب کا سب سے بڑا اور منفرد شاہکار "دارلینڈ پیس" لکھ سکا۔

"دارلینڈ پیس" میں ایسا سحر ایسا جادو اور ایسے معانی ہیں کہ آپ اسے کسی ماحول میں پڑھیں۔ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دنیا کا یہ عظیم شاہکار۔ ٹالسٹائی کا ہی نہیں، پورے عالمی ادب کا عظیم فن پارہ ہے۔ ٹالسٹائی نے جب اسے لکھنا شروع کیا تو شاید اسے خود علم نہ تھا کہ وہ کتنے عظیم شاہکار کو تخلیق کر رہا ہے۔ لیکن سب سے ایک بات کا پتہ ضرور چلتا ہے اور اس کی زاوی ان ٹالسٹائی ہے۔ جس نے لکھا ہے کہ "دارلینڈ پیس" کے مسودے کو کم از کم سچاس بار REVISE کیا گیا۔ ٹالسٹائی ایک بار مسودہ کی نظر ثانی کرتا پھر اسے دوبارہ پڑھتا پھر تبدیلیاں اور اضافے ہوتے اور یہ سلسلہ مسلسل چلتا

۱۔ بالآخر دنیائے ادب کا یہ شاہکار پہلی بار ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہو کر اختتام کو پہنچا۔ تب سے اب تک دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کا سب سے خوب صورت اور اچھا ترجمہ کونٹیننس کارنٹ کا ہے۔ دار اینڈ پیس کو مختص صورت میں سبھی کئی زبانوں میں ترجمہ اور شائع کیا گیا۔ کیونکہ اصل ناول بہت ضخیم ہے۔ اس ناول پر امریکہ اور روس میں فلمیں بن چکی ہیں۔ لی ڈی کے لیے اسے کیا گیا اور اس کی ڈرامائی تشکیل کی گئی کہتے ہیں اردو میں محمود جالندھری نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو مکمل بھی ہوا لیکن آج تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس بڑے کام کا آغاز خرد اور علم نے بھی کیا۔ اردو کے ایک جریدے میں دار اینڈ پیس کا ترجمہ ہر ماہ شائع ہوتا رہا۔ بیس ایک سطروں کے بعد میں خود یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا اور اصل اور پورے ناول کے ایک پوختائی حصے کا ہی ترجمہ ہوا جو شائع ہو گیا۔ اس کے بعد علم روزگار نے فرصت نہ دی کہ ٹالسٹائی کے اس شاہکار ناول کو مکمل کر سکوں۔ ٹالسٹائی کی بعض کہانیاں البتہ اردو میں شائع ہوئی ہیں اس کے ناول ایسا کر سینما کا ایک مکمل ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

کاونٹ یونکو لائیوچ ٹالسٹائی بہت معزز اور دولت مند گھرانے کا فرد تھا۔ وہ جس محل میں پیدا ہوا اس کے کمروں کی تعداد چالیس تھی۔ اس کی جاگیر لیسیا پولیا ناکا شہرہ آج ساری دنیا میں ہے۔ یہیں ۲۸ اگست ۱۸۲۸ء کو ٹالسٹائی نے جنم لیا۔ وہ اجمی شیرخوار تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو برس کا تھا کہ باپ بھی چل بسا۔ اس کی پرورش اس کے رشتہ داروں اور عزیزوں نے کی۔ ۱۸۴۲ء میں وہ کازان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ٹالسٹائی کی عمر کا یہ وہ دور تھا جب اس نے وہی چلن اختیار کیا جو اس کے طبقے سے مخصوص تھا۔ اس نے جی بھر کے دل کے ارمان نکالے۔ زندگی کی سرستیں میں ڈوب گیا لیکن اس لہو و لب میں پڑنے کے باوجود ٹالسٹائی نے ایسے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا جن میں وہ اپنی ذات کا اظہار کر سکتا تھا۔ ٹالسٹائی نے فوج میں کمیشن لیا اور اسی زمانے میں اس نے اپنی پہلی تخلیق کو جنم دیا۔ جو "کاسک" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کی پہلی کتاب "سپین" تھی جو خود نوشت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد "لوگین" "بھیر جوانی" "شائع ہوئیں۔ سیرتا پوں کی کہانیاں اس کے بعد شائع ہوئیں۔ ٹالسٹائی نے جنگ میں بھی حصہ لیا اور اس کے یہ تجربات بڑے فنکارانہ انداز میں اس کے شاہکار "دار اینڈ پیس" میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ٹالسٹائی نے دوبارہ غریب کی سیاحتیں بھی کیں کچھ عرصہ پٹربرگ میں رہا اور پھر اس نے اپنی جاگیر کو ہی مستقل قیام گاہ بنایا۔ وہ دہقانوں کی حالت زار سے بے حد متاثر ہوا۔ اس دور میں ٹالسٹائی نے ان منصوبوں پر عمل کرنے کا آغاز کیا جو کسانوں کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لیے تھے۔ اور اس کام کے لیے وہ ساری عمر کوشاں رہا۔ اس نے ایک مدرسہ گاؤں میں قائم کیا۔ جہاں وہ خود بھی پڑھایا کرتا تھا۔

اب ہم ٹالسٹائی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ وہ ایک معتبر و مقدس اور عظیم انسان تسلیم کیا گیا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں ٹالسٹائی نے شادی کی۔ اور یوں ٹالسٹائی کی زندگی کا ایک دور ختم ہوا۔ اس شادی نے اس کی زندگی کو آنے والے برسوں میں اجیرن کر دیا۔ میاں بیوی کے مزاج میں بہت نمایاں فرق تھا۔ دونوں میں عموماً جھگڑا اور ناچاقی رہی۔ اس کی بیوی کو ٹالسٹائی کی عوام اور دہقان دوستی اور اس کے فلاحی منصوبوں سے چڑھتی تھی۔

ٹالسٹائی نے کسانوں کی حالت زار پر جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنی سچائی، واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے عالمی ادب کا ایک ممتاز کارنامہ ہے۔ اس دور میں اس نے جو مختصر کہانیاں لکھیں انہوں نے ٹالسٹائی کو دنیا کے عظیم مصنفوں میں لاکھڑا کیا، ساری دنیا میں اس کے مطالعہ کی تعداد میں اضافہ ہونا چلا گیا۔

اور پھر اس کے دو عظیم فن پارے منظر عام پر آئے۔ "دار اینڈ پیس" اور "اینا کرینیا" دار اینڈ پیس کا سن اشاعت ۱۸۶۵ء - ۱۸۶۹ء ہے اور "اینا کرینیا" کا سن اشاعت ۱۸۶۷ء - ۱۸۷۰ء ہے ان دونوں ناولوں کی بدولت اسے دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کیا گیا۔ یہاں اس امر کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آخری عمر میں جب ٹالسٹائی ایک بڑے مورالسٹ کی حیثیت سے نمایاں ہوا تو اس نے اپنے شہکار ناول "اینا کرینیا" کو خود ہی ۱۸۷۸ء میں چھپوا کر دیا۔

"دار اینڈ پیس" عالمی ادب کا بہت اہم فن پارہ ہے۔ اس ناول میں روس زندہ اور جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ نپولین کے حملے کے حوالے سے جنگ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور اس ناول میں تین سو سے زائد ایسے کردار ہیں جو دائمی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا کیمنوس اتنا وسیع اور بھرپور ہے۔ اور اس کو ایسے فنکارانہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ جس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا فن پارہ

پیش نہیں کرتا۔

ٹالسٹائی اپنی زندگی میں ایک بڑے بحران سے بھی گزرا۔ ۱۸۸۱ء کا سن اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنے افکار و نظریات اور اعمال میں یکسانیت پیدا کرنے میں انتہائی خلوص کا اظہار کیا تھا۔ وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے باوجود باطنی اور ذہنی بحران اسے کئی بار خودکشی کرنے پر آمادہ کرتا رہا۔ بالآخر اسے تسکین خاص قسم کی مذہبیت اور اخلاقیات میں ملی۔ جس کا پرچار اس نے خود ہی شروع کر دیا۔ اس نے کہا خدا کی بادشاہت آپ کے اپنے دل میں بسنی ہے۔ محبت خدا ہے اور زندگی کا مفہوم محبت پر یقین ہے۔ اپنی زندگی کے اس دور میں اس نے جو کتابیں لکھیں وہ اس کے عقائد میں رچی بسی ہیں۔ جس میں "اعتزافات" "میری زندگی" "میرا عقیدہ" کیا ہے۔ اپنے انہی عقائد اور نظریات کو اس نے ادب میں بھی پیش کیا۔ کئی کتابوں کے علاوہ اس کے آخری دور کا ناول "ریزکشن" اس کے عقائد و نظریات کا منظر ہے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ٹالسٹائی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر عام کسانوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے۔ اس پر اس نے عمل کرنے کی کوشش بھی کی، ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا لیکن راستے میں ریل کے سفر کے دوران وہ شدید بیمار ہو گیا۔ اور ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو اس کا ایک ریلوے سٹیشن پر انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش اس کی جاگیر میں لائی گئی۔ وہیں اس کو دفنایا گیا۔ اور اس کی جاگیر کو اس کی یاد میں میوزیم بنا دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں نے اس کی جاگیر اور میوزیم کو بہت نقصان پہنچایا لیکن جنگ عظیم کے بعد اس کی تعمیر نو ہوئی اور آج دنیا بھر کے لوگ اس کی قبر اور میوزیم کو دیکھنے جاتے ہیں۔

ٹالسٹائی عظیم مصنف ہی نہیں ایک عظیم انسان بھی تھا۔ اس نے زندگی کو جس انداز میں برتنا اور گزارا۔ اس کی مثال بھی قدرے کم ہی ملتی ہے۔ داراپنڈیس کے خالق کی حیثیت سے وہ لازوال ہو چکا ہے۔

روس میں جب انقلاب آیا تو دوسرے کئی مصنفوں کی طرح ٹالسٹائی کو بھی نئی انقلابی حکومت کے کارندوں اور انقلابیوں نے وجہت پسند قرار دیا اور اس وقت خود لینن ٹالسٹائی کے دفاع کے لیے نکلا۔ لینن نے ایک مضمون "ٹالسٹائی انقلاب روس کا ایک آئینہ تھا" کے عنوان سے لکھا۔ اور

ٹالسٹائی کے مخالفوں کو دمان شکن جواب دیا۔ لیمن کا یہ اقدام عالمی ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیمن نے لکھا تھا:

” وہ عمدہ جب بوردوا انقلاب روس میں رونما ہو رہا تھا۔ ٹالسٹائی کو یہ عظمت حاصل ہوئی کہ وہ لاکھوں اور ان گنت کلاؤں کے جذبات و خیالات کا ترجمان بنا۔ ٹالسٹائی پر کسی کا اثر نہیں لیکن اس کے خیالات و تصورات بحیثیت مجموعی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ٹالسٹائی کے ہاں جو تضاد ملتا ہے وہ اس معاشرے کا تضاد ہے۔ ٹالسٹائی ایک آئینہ ہے جس میں پورا معاشرہ اپنا عکس دکھاتا ہے اور انہی تضادات نے انقلاب میں ایک اہم تاریخی کردار ادا کیا ہے۔“

آج ٹالسٹائی پر پورے روس کو فخر ہے ۱۹۰۴ء میں ٹالسٹائی کا ڈیڑھ سو سالہ یوم پیدائش پورے روس میں انتہائی رجوش و عقیدت سے منایا گیا۔ ٹالسٹائی کس قسم کا انسان تھا وہ دوسروں پر کس طرح اثر انداز ہوتا تھا اس کا اندازہ گورکی کس مضمون کو پڑھ کر ہوتا ہے جو گورکی نے ٹالسٹائی کی موت پر لکھا تھا۔ اس کے آخری جملے یوں ہیں جن میں گورکی نے ٹالسٹائی سے اپنی ملاقات کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

” میں خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ بعض وجوہات کی بنا پر میں نے اپنے آپ کو اسے (ٹالسٹائی) کو غور سے دیکھے اور کچھ خیالات کے ساتھ سوچے ہوئے پایا۔ یہ آدمی خدا کی طرح ہے۔۔۔“

~*~

اپنی زندگی میں ہی ٹالسٹائی نے ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ دار اینڈ پیس کو عالمی ادب کا فن پارہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور پھر دنیا بھر کے رہنما، ادیب، فلسفی اور دانشور اس کو عورت و احترام کی جگہ دے رہے تھے۔ اس کے ہاں ملاقاتیوں کا اتنا متناہدھا رہتا تھا۔ نہ صرف روس سے بلکہ دوسرے ممالک کے پڑھنے لکھنے والے اس سے ملنے آتے تھے۔ اس دور کے ہر بڑے آدمی کی ٹالسٹائی سے خط و کتابت تھی۔ اس ساری عظمت اور مقبولیت کی کئی وجوہات تھیں۔ لیکن ان میں دو وجوہات بہت نمایاں ہیں ایک اس کی شخصیت اور افکار اور دوسرے اس کا ناول ”دار اینڈ پیس“۔

”دار اینڈ پیس“ اور ٹالسٹائی کے اثرات کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ تقاریر موٹیلاناکا ایک مضمون بطور خاص اس حوالے سے پڑھنے کی چیز ہے۔ جس کا انگریزی میں ترجمہ ”ٹالسٹائی اینڈ وی لٹریچر آف ٹوٹینٹھ سینچری رائٹرز آؤٹ سائیڈ ریشیا“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں تقاریر موٹیلاناکا نے بیسویں صدی کے ان بڑے ادیبوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ٹالسٹائی کے اثرات قبول کیے اور جنہوں نے ”دار اینڈ پیس“ سے بہت کچھ سیکھا۔

”دار اینڈ پیس“ جو کرداروں، اپنے تناظر، موضوع اور پھیلاؤ کے اعتبار سے دنیا کا بڑا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہل قلم حضرات نے لکھا ہے لیکن اس کے حوالے سے ایک کام بے حد اہم ہے اور وہ ہے دارنارنگورنفا کا۔ اپنی کتاب میں دارنارنفا نے بتایا ہے کہ ”دار اینڈ پیس“ کے کردار کہاں سے آئے۔ اس کے پیش لفظ کے چند جملے یہاں پیش کرتا ہوں۔

”ٹالسٹائی نے اپنے ناول ”دار اینڈ پیس“ کے لیے جن کرداروں کو تخلیق کیا۔ وہ فرضی نہیں ہیں۔ کرداروں کی اکثریت حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ بہت سے کرداروں کے لیے مواد ٹالسٹائی نے اپنے آباؤ اجداد کی زندگیوں سے حاصل کیا۔ اور بہت سے کرداروں کو اس نے اپنے معاصر اور جاننے والے لوگوں کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا۔“

نقاشا کا کردار۔ جو دار اینڈ پیس کی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر دارنارنفا نے بہت تحقیق کی ہے اور جس خاتون کو ماڈل بنا کر ٹالسٹائی نے نقاشا کا لالہ زوال کردار تخلیق کیا۔ اس کے بارے میں بہت دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

~*~

”دار اینڈ پیس“ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسی تخلیق ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ زندگی سے محبی عظیم تر ہے۔ ”دار اینڈ پیس“ لفظوں کا ایک سمندر ہے ایک ایک لفظ گہرائی اور گہرائی کا حامل اور عمیق انسانی مقدر، جذبات، نفسیات کا آئینہ، اس کا ایک ایک کردار انسانی ابرار سے پردہ اٹھاتا ہے تھا من مانے لکھا تھا کہ ٹالسٹائی ایسا لکھنے والا تھا جو کشف کا حامل تھا اور پڑھنے والے پر اسرار کا انکشاف کرتا تھا۔ ”دار اینڈ پیس“ دنیائے ادب کا سب سے اہم کشف اور انکشاف ہے۔

ڈان کینوٹے

عظیم مصور ڈالی نے "ڈان کینوٹے" کو پیٹ کیا ہے۔ ایسی تصویر تخلیق کی ہے جو آنکھوں کے سامنے اپنے پورے باطن کے ساتھ اس ڈان کینوٹے کو لے آتی ہے جس کو میگیوٹیل ڈی سٹرائیز نے تخلیق کیا تھا....

ڈان کینوٹے دہلا پتلا، کم رو، پچکے ہوئے جڑوں والا آدمی۔ رنگ موزوں چمک دمک سے خرد زہرہ بکتر اور خود پہنے ہاتھ میں لمبا نیزہ لیے اپنے گھوڑے روز سینٹ پر سوار.... جو گھوڑا کا ہے کو ہے، اتنا دہلا پتلا مرل ہے کہ جیسے گھوڑے کا ڈھانچہ ہو.... صدیوں سے وہ اس حالت میں اپنے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے اس کے پیچھے اس کا نائب سانچو پائٹنر ہے۔ پھولے ہوئے پیٹ والا سانچو پائٹنر.... یہ جوڑا۔ دنیا کا عجیب الخلقیت اور مقبول ترین جوڑا ہے جو صدیوں سے انسانوں کو متاثر کرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک.... اور ہیشہ یہ جوڑا ہیں متاثر کرتا ہے گا۔

سروائیز کا ڈان کینوٹے اتنا ہی مقبول اتنا ہی اہم ہے جتنے دنیا کے کچھ دوسرے کردار۔ پولیسٹر، سندباد، علی بابا۔ گلیور.... رابن سن کر و سوار پرک وک پمیرز کے مسٹر پک وک.... سروائیز کا ڈان کینوٹے دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کی کوئی زبان نہیں جس میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ان کرداروں اور اس کتاب نے دنیا کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ ہمارے زمانے (۱۹۸۳ء) میں مشہور ناول نگار اور لولیتا کے خالق نابوکوف کے ان بیچروں کا مجموعہ شائع ہوا ہے جو اس نے ڈان کینوٹے پر دیے تھے۔ ان بیچروں میں جہاں نابوکوف نے پرانے

عہد کے مصنفوں اور تحریروں پر سرائیٹیز کے ڈان کیخڑے کے اثرات کا ذکر کیا ہے وہاں موجودہ عہد کے کھنے والوں جان ایڈائیک، ساؤل، بیلو اور خود اپنی تحریروں میں ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو ڈان کیخڑے کی عطا ہیں۔

ڈان کیخڑے اور ساخو پاننرا دونوں جانے پہچانے نام اور کردار بن چکے ہیں۔ انہیں جس انداز میں سرائیٹیز نے پیش کیا تھا وہ اس طرح زندہ ہیں کہ انہوں نے زمانے کے اثرات قبول کرنے اور بڑھا ہونے سے انکار کر دیا وہ امتداد زمانہ سے وصلدائے بھی نہیں۔ ان کے چہرے موزر ہیں۔ ایک ایک نقش واضح اور صاف ہے۔ نابوکوف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

”وہ انسانی خیالات کے جنگل اور کرک کی دنیا میں گذشتہ ساڑھے تین سو برسوں سے اپنے گھوڑے پر سوار سفر کرتا چلا آ رہا ہے۔ اب ہم اس کا مزید مذاق نہیں اڑا سکتے۔ وہ ایک لیجنڈ ہے۔ اس کا حسن اس کا جذبہ ترحم ہے۔ اس کا پرچم حزب صورتی ہے۔ وہ ہر اس چیز کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو نرم، تنہا، نالغ، بے نفسی اور شجاعت کہلاتی ہے۔ یہاں پر وڈی سپراگون بن گئی ہے۔“

سرائیٹیز کے ڈان کیخڑے کو دنیا کا پہلا جدید اور باقاعدہ ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عالمی نقادوں کی یہ متفقہ رائے نہیں ہے تاہم بہت سے نقاد اور عظیم لکھنے والوں نے ”ڈان کیخڑے“ کو دنیا کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ نابوکوف نے اپنے پیکرز میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں۔ تاہم اس کا ایک جملہ خاصا معنی خیز ہے نابوکوف ڈان کیخڑے کے بارے میں لکھتا ہے:

اس ناول ڈان کیخڑے میں کسی نقائص اور نمایاں ہو سکتی ہیں لیکن ڈان کیخڑے آدمی مستحکم اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

~*~

اس ہمیشہ زندہ رہنے والے ناول کا اردو میں تین نام تھے سرشار نے ترجمہ کیا ہے جو بہت عرصہ پہلے لوک شور نے ”خدا کی فوجدار“ کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس ترجمے کے بارے میں مرحوم محمد حسن عسکری نے جو رائے دی ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ سرشار نے اس کا ترجمہ اپنے انداز میں کیا اور اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ جس کا اپنا ذائقہ اور حسن ہے اس میں سرائیٹیز بہر حال موجود ہے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرتا تو یقیناً سرشار سے بہتر ہوتا۔ لیکن سرشار نے اسے

جو رنگ دیا ہے وہ کبھی اسے نہ دے سکتا۔

”مسروائیز اور - ڈان کیخوٹے“

اپنی وفات سے چاروں پہلے مسروائیز نے اپنے آخری بیلے کا اتساب اپنے مرئی کوندے ڈی سیوس کے نام لکھا۔ اس نے لکھا۔

”الوداع زندگی کی شیریں ساعت، الوداع میرے مسرور ساتھیو اور دوستو۔

کیونکہ میں نے غمخس کر لیا ہے کہ میں مر رہا ہوں۔ اب میرے دل میں ایک ہی خواہش ہے کہ میں آپ سب کو دوسری زندگی میں دیکھ سکوں۔۔۔“

وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میرے دکھ بڑھ رہے ہیں۔ امیدیں دم توڑ رہی ہیں۔

۲۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو ہفتے کے دن مسروائیز کا انتقال ہوا۔ ویسٹ ٹیکسپیر اور مسروائیز کا ایوم دتا

ایک ہے۔ ٹیکسپیر نے بھی باورگار کردار ڈراموں کے حراسے سے تخلیق کیے۔ لازوال ڈان کیخوٹے کا خالق بھی۔ اس اعتبار سے ٹیکسپیر کا ہم پلہ ہے کہ اس نے بھی ایسا کردار تخلیق کیا جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن ان دونوں کی زندگیاں مختلف انداز میں گذریں۔

۲۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو مسروائیز ڈیوڈ میں انتقال کرنے والا ٹیکسپیر بڑے سکون اور آسودگی کے

عالم میں اس دنیا سے اٹھا وہ خوش حال تھا۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ اس نے زندگی کا بیشتر حصہ آسودگی سے بسر کیا تھا۔

..

۲۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو میڈرڈ میں انتقال کرنے والا مسروائیز دوسروں کی فیاضی پر زندہ رہا۔

غربت کے خلاف ایک طویل جنگ لڑتے ہوئے وہ مرا تو کبھی دوسروں کی نیک دلی اور فیاضی کا محتاج تھا۔

~*~

مسروائیز ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوا۔ سلماز کا اور میڈرڈ میں تعلیم حاصل کی۔ بعض نقادوں نے

راتے دی ہے کہ وہ اپنی تخلیق ڈان کیخوٹے کے مقابلے میں بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی تخلیق اس سے عظیم تر ہے وہ ایک روایتی ہسپانوی تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے کٹر کمیونسٹ۔

ہمدردوں اور بدعتی عیسائیوں کے خلاف سپین میں جو سوائے زمانہ تعزیری محکمہ قائم ہوا وہ اس کا
کبھی محترف اور موید تھا۔

یہ حدود جو بعض نقادوں نے قائم کر دی ہیں ان کی اس عظیم اشان قوت مستحید اور تخلیقی
صلاحتوں کے سامنے کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ جنہوں نے ڈان کیخوئے کو جرم دیا اور لازوال بنا دیا۔
ڈان کیخوئے کو انسانی حماقتوں کی بائبل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سپین کے دور انحطاط پر ایک طنز
نہیں ہے بلکہ اس میں وہ آفاقیت ہے جس نے اسے ہر ملک کے ہمدرد کے انسان کو متشکک
ہے۔ روایتی عمد شجاعت پر مبنی رومانس پڑھ کر ڈان کیخوئے ہی جرم نہیں لیتا بلکہ خود سوانیٹز نے
ایسے روایتی رومان خاصی تعداد میں پڑھے اور وہ ان کی تعریف پر آمادہ ہوا۔ لیکن اس میں جو عالمی
اور آفاقی احساس اور صداقت ہے اس نے اسے لازوال بنا دیا۔ ڈان کیخوئے اور سانچو پارٹیزا
جاسے ہیں۔ ایسے میں ڈان کیخوئے ایک گیت گارہا ہے۔

”میں جنگ پر اس لیے جا رہا ہوں کہ کچھ پیسے ہاتھ لگ جائیں اگر میرے پاس پیسے ہوتے
تو میں زیادہ شعور کا ثبوت دیتا۔“

کیا یہ دولائیس۔ انسانی تاریخ میں لڑی جانے والی ہر جنگ کی حقیقت کو ظاہر نہیں
کرتی ہیں۔ کیا یہ ایک آفاقی سچائی نہیں ہے؟ کیا یہ ایک ایسی طنز نہیں ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے
کی صلاحیت رکھتی ہے اور ایسی کتنی ہی انسانی سچائیاں اور انسانی حماقتیں ہیں جنہوں نے
ڈان کیخوئے کو ہمدرد کے لیے قابل قبول امداد یا معنی بنا دیا ہے۔

سروانیٹز نے جس قدیم روایت شجاعت کو طنز کا ہدف بنا دیا ہے۔ اس کے معنی ہمہ گیر
ہیں۔ ڈان کیخوئے کے گہرے اور باطنی معانی سے پوری طرح متعارف ہونے کے لیے ضرور دیکھا
ہے کہ سروانیٹز کی زندگی کو بھی سامنے رکھا جائے خود سروانیٹز نے ایک ایسی زندگی بسر کی جو ایک
شجاع KNIGHT کی مثالی زندگی تھی۔ اگرچہ اس کے معنی کچھ مختلف بنتے ہیں۔

سروانیٹز پیشہ درسا ہی تھا۔ اگر قسمت اور حالات اس کے لیے ناسازگار نہ بن جاتے
اور غربت کو دور کرنے کے لیے اسے جدوجہد کرنی نہ پڑتی تو شاید وہ کبھی مصنف نہ بن پاتا
اس نے لکھا صرف اس لیے شروع کیا کہ کسی طرح وہ اس دھندے سے روپیہ کما کر اپنی

نزبت کو دور کر کے ڈان کیڑے میں ڈان کیڑے ایک جگہ لکھتا ہے۔

The Lance has Never Blunted the Pen, "Not the Lance."

والٹر سار کی نے اس ایک جملے کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس ایک جملے میں سپین کی پوری تاریخ سما گئی ہے کیونکہ سپین ہی ایک ایک ملک ہے جس کی تاریخ کے ابتدائی دور سے اب تک ایسے مصنف پیدا ہوئے ہیں جو شاندار سپاہی بھی تھے۔۔۔

ڈان کیڑے کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے سے پہلے بھی سردانٹیز ایک بڑی شخصیت اور بہادر سپاہی تھا۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا شاہکار اور انسانی سپاہیوں اور حاکموں سے بے عزت کتاب لکھنے سے پہلے اس نے اپنی عمر کا ایک طویل دور زندگی کے تجربات سے سبق حاصل کرنے میں بسر کیا تھا۔

چارلس ڈکنز، ٹیکس پیئر اور بنار ڈشاک کی طرح اس کے والدین بھی بے حد نادار اور عزیز تھے۔ بھوک کا بھیر بھیر ہمیشہ اس گھر کے دروازے بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا باپ روڈریگو ایک عظامی حکیم اور بہرہ بھی تھا۔ اس عزت اور ناداری نے سردانٹیز کے دل کو دوکسر انسانوں کے دکھ درد محسوس کرنے کا تجربہ عطا کیا، عزت و افلاس نے ہی سردانٹیز کو کنبے اور خاندان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ زندگی کے ناسازگار ترین لمحوں میں سردانٹیز کی ماں اور اس کی بہنوں نے جس حوصلے اور ایثار کا مظاہرہ کیا، سردانٹیز ساری عمر اس سے متاثر رہا۔ اس کی کوئی کتاب دیکھ لیجئے اس میں غریبی اور ناداری کا موضوع کسی نہ کسی صورت میں اظہار پاتا ہے۔ ڈان کیڑے میں وہ اس کا اظہار ایک ایسے انداز میں کرتا ہے جس کی مثال دنیا سے ادب میں شاید نادری ہی ملتی ہے۔ اپنے مشہور عالم کردار سانچو پانزا کا تعارف کراتے ہوئے سردانٹیز ہیں جس کرب سے آشنا کرتے ہیں اور طنز کا جو دار کرتا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ سانچو پانزا ایک ایماندار آدمی ہے اگر ایسا القاب ایک ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہو جو غریب ہو سنا شاک کی طرح سردانٹیز افلاس اور ناداری کو جرم تو قرار نہیں دیتا لیکن ڈکنز کی طرح وہ ساری عمر اس احساس ناداری میں مبتلا رہا۔ اس سے کبھی چمکا کھٹا حاصل نہ کر سکا۔

جوان ہونے پر وہ فوجی مہموں میں شریک ہوا۔ ۱۵۷۱ء میں اس نے سپانٹو کی جنگ میں حصہ لیا۔ شجاعت کے کارنامے انجام دیے اور زخمی بھی ہوا۔ ۱۵۷۵ء میں جب وہ کئی معرکوں کے بعد وطن واپس آ رہا تھا تو اس کے بھری جہاز پر حملہ ہوا وہ اور اس کے بھائی کو دشمنوں نے قیدی بنایا۔ انہیں الجزائر پہنچا دیا گیا کہ یا تو انہیں فروخت کر کے عمام بنا دیا جائے یا یہ اعمال کی رقم وصول کر کے واپس وطن بھجوا دیا جائے۔

سر ڈانیئر سپانچ برس تک دشمنوں کی قید میں رہا۔ اس نے چار دفعہ فرار ہونے کی ناکام کوشش کی۔ ۱۵۸۰ء میں سر ڈانیئر سپین واپس پہنچا۔ یہ اعمال کی رقم ادا کر کے اسے رہا کر دیا گیا تھا اپنے گھر پہنچ کر اسے شدت سے احساس ہوا کہ گھر کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ اس کی ماں اور بہنوں نے اس کی رہائی کے لیے رقم جمع کرنے کے لیے دن رات محنت کی تھی۔ کتنے ہی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ جواب قرض کی واپسی کا شدت سے تقاضا کرنے لگے۔ سر ڈانیئر کی شجاعت اور صعوبتوں کا اسے کوئی صلہ نہ ملا۔ کوئی مستقل ملازمت اسے نہ مل سکی۔ اس نے تصنیف و تحریر کے ذریعے پیسے کمانے کی کوشش کی۔ ۱۵۸۲ء میں اس کا ایک رومانس GALATEA ^{کھلیا} لکھا لیکن اس سے اسے کچھ آمدنی نہ ہو سکی۔ وہ ایک کامیاب اور مقبول ڈرامہ نگار بن کر اپنی غربت دور کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ امیدیں بھی ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ سپین کے تھیسٹر میں یہ دور لوپ ڈمی دیکھا جیسے ڈرامہ نگار کا تہہ جو جوان تھا اور بڑی کامیابی سے اس فن میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ۱۶۱۳ء میں سر ڈانیئر نے اپنی کتاب "جرنی ٹوڈ ہاز ناکس" کے مسودے کے آخر میں لکھا تھا۔

When a poet is poor half of his Genuine Fruits and Fancies
Miscarry. by reason of his Anxious cares to win the Daily Bread.

۱۵۸۲ء میں توئید کے قریب واقع ایک گاؤں کی ایک انیس سالہ لڑکی سے اس نے شادی کی۔ لیکن سر ڈانیئر کے حالات ایسے تھے کہ وہ اپنا کوئی گھر نہ بنا سکتا تھا۔ نہ ہی اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ اس زمانے میں عظیم سپانزی آرٹسٹا تیار می کے مراحل سے گزر رہا تھا سر ڈانیئر بھی اس کی تیاری کے لیے مالی وسائل کے سلسلے میں سرکاری ملازم تھا۔ لیکن کبھی مستقل

اور بدقت تنخواہ نہ ملتی تھی۔ عرصے پہلے اس کی بیوی اپنے بھائیوں کے پاس رہی اور سردانینیز سپین میں گھومتا رہا۔ اگر میڈیا کی تیاری کے لیے رقم اور اشیا جمع کرنے والے عملے کا رکن بن کر بھوک اور قافلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ۱۵۹۷ء اور ۱۶۰۲ء میں اسے دوبارہ جیل میں جانا پڑا۔

جرم - غربت !

۱۶۰۵ء میں ڈان کینژٹے کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ جلد ہی ڈان کینژٹے اور اس کے نائب ساچو پائنز اکرپورے ملک میں شہرت حاصل ہو گئی اور اس کے فوری بعد یورپ میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ ابدی اور عالمگیر شہرت کا آغاز ہوا۔

پہلے حصے کی اشاعت ۱۱ اس کی ملک گیر کامیابی کے باوجود سردانینیز کی غربت دور نہ ہو سکی۔ اس نے اس کا انتساب اپنے مرنے والے ڈانٹ آف لیموس کے نام سے کیا۔ اور اس سے اپیل کی کہ وہ اس سے قیضانہ سلوک کرے۔ کیونکہ وہ بیمار بھی ہے اور اس کے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ اپنی غربت، بیماری اور ناسازگار حالات کی وجہ وہ دو برس تک اپنے کامیاب اور مقبول ناول کے دوسرے اور آخری حصے کو مکمل نہ کر سکا۔ ڈان کینژٹے کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دوسرے مصنف آرمینیڈانے اس کا دوسرا حصہ مکمل کر کے شائع کر دیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے سردانینیز کو کتنا بڑا صدمہ پہنچا ہوگا۔ بہر حال اس صدمے کو ان نے برداشت کیا اور ڈان کینژٹے کو مکمل کر کے شائع کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

سردانینیز نے ڈان کینژٹے کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا۔

EXEMPLARY TALES (جس میں بارہ ناولٹ شامل ہیں) اس کا ایک خاصا

واقعہ کا ہے لیکن اس کی یہ کتاب اور یہ تحریر ڈان کینژٹے کی شہرت کے نیچے دب چکی ہے۔ ڈان کینژٹے "اس کا عظیم کارنامہ ہے۔ دنیائے ادب کا ایک لازوال شاہکار۔

مجھے اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھجک یا ندامت محسوس نہیں ہو رہی کہ میں اس مضمون کے اہتمام پر ڈان کینژٹے کی تلخیص پیش نہیں کر رہا۔ اصل میں میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کی تلخیص کا اہل نہیں یہ پوری کتاب ترجمہ ہونی چاہیے یا ایسے انداز میں اس کی تلخیص ہونی چاہیے جیسی ڈاکٹر سار کی نے کی ہے جو تلخیص ہونے کے باوجود ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈان کیخوٹے، پر مضمون لکھنے کی تیاری کرتے وقت میں نے اسی کے کئی حصوں پر نشان لگائے کہ میں اس کے ان ٹکڑوں کا ترجمہ پیش کر دوں گا لیکن بعد میں میرے لیے ان ٹکڑوں میں سے بھی کسی ٹکڑے کا انتخاب کرنا بے حد مشکل ہو گیا۔

ڈان کیخوٹے کا ہوا چکیوں (WIND MILLS) پر حملہ دنیا کے ادب میں ایک استعارہ اور عظیم علامت بن کر پوری دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔ اسے نثر المثل کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اسی ٹکڑے کا تھوڑا سا ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کی ترجمہ میں اہمیت ہے نہ یہاں گنجائش موجود ہے۔

”پھر انہوں نے تیس یا چالیس ہوا چکیوں کو دیکھا جو سطح زمین پر ابھری کھڑکی تھیں جو نی ڈان کیخوٹے کی نگاہ ان ہوا چکیوں پر پڑی۔ وہ اپنے نائب سے مخاطب ہو کر بولا۔

”قسمت ہماری آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیے ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ ہم نے جو چاہا تھا اس سے بھی بڑھ کر ہمیں مل رہا ہے کیامت وہاں اوپر دیکھ رہے ہو میرے دوست سا پتھر پانزا، تیس بلکہ اس سے بھی زیادہ دیوتا قاتم عظیم الجثہ دشمن۔ میں ان سے جنگ لڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور انہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے ملنے والے مال و دولت سے ہم دولت مند ہو جائیں گے۔ ہاں یہ ایک مقدس جنگ ہوگی ان جیسے مغزور دشمنوں کو صغیر ہستی سے مٹا دینا خدا کی فریضی کے عین مطالبات ہے اور اس سے وہ ہم پر مہربان ہوگا۔“

”کیسے دیوتا قاتم لوگ؟“ سا پتھر پانزا نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ سامنے کھڑے دیوتا قاتم لوگ، جنہیں تم دیکھ رہے ہو۔“ اس کے آقے نے جواب دیا۔ وہی جن

کے پاس لے لے ہتھیار میں۔ ان میں سے بعض ہتھیار تو ناقابل بیان حد تک طویل ہیں۔“

”جناب والا، امتیاز سے کام لو۔“ سا پتھر نے جواب دیا۔ وہ جنہیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ دیوتا

قاتم ان نہیں بلکہ ہوا سے چلنے والی چکیاں ہیں اور جنہیں تم ہتھیار سمجھ رہے ہو وہ ان کے پر ہیں

یہی وہ پر ہیں جو ہوا سے گھومتے ہیں تو چکی کے سپتھر کو بھی گھما دیتے ہیں۔“

”صاف ظاہر ہے۔ ڈان کیخوٹے نے جواب دیا۔ کہ تم مہم جوئی اور شجاعانہ کارناموں کا کوئی تجربہ

نہیں رکھتے۔ وہ دیوثانیت لوگ ہیں اور اگر تم ان سے خوفزدہ ہو تو ایک طرف جا کر بیٹھ جاؤ اور میرے لیے دعا کر دو کہ میں ایک ایسے معرکے میں لڑنے کے لیے جا رہا ہوں جو بہت مدد خفاک اور میرے مقابلے میں ان کی تعداد و قوت بہت زیادہ ہے۔

اپنے نائب و خادم ساچھو پانزا کی بیچ دیکھ کر سنے بغیر بڑبڑاتے ہوئے ڈان کیخوڑے نے اپنے گھوڑے روز کو ہمیں لگائی۔ ساچھو پانزا چیتراہ گیا کہ آقا آپ دیوثانیت دشمنوں پر نہیں بلکہ ہوا چکیوں پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ ڈان کیخوڑے اتنا مگن اور منہمک تھا کہ اس نے ساچھو کی ایک نہ سنی۔ وہ ہوا چکیوں کو اپنے خلوص سے طویل القامت جسم دشمن سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ اب وہ ان ہوا چکیوں کے بہت قریب پہنچ چکا تھا وہ اپنے گھوڑے پر سوار اسے دوڑاتا اور دھڑکتے ہوئے چیتراہ تھا۔

”بزدلو! جھانگنا نہیں۔ دیکھو صرف اکیلا شجاع ہی تم سے لڑنے کے لیے آ رہا ہے۔ اسی لمحے ہوا چلنے لگی اور ہوا چکیوں کے بڑے بڑے پرگردش میں آگے۔ جب ڈان کیخوڑے نے یہ حالت دیکھی تو وہ پھر چیتراہ۔“

اگرچہ تمہارے بازو اور ہتھیار تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن تمہیں اس شجاع کی قوت کا اندازہ نہیں جو تمہیں مزہ چکھانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔“

اس طرح چیتراہ ہونے اس نے اپنے چہرے کو خود کے پیچھے چھپایا۔ اپنے نیزے کو آگے بڑھا کر تار و زینت کو ہمیں لگائی اور داسے میں آگے والی پہلی ہوا چکی پر حملہ کر دیا۔ اس نے نیزہ ہوا چکی کے پڑے پر دے مارا لیکن ہوا اتنی تیز، غلام اور قوی تھی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہوانے اسے اس کے گھوڑے کو اپنے ہتھکنجے میں کس کر پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔ ڈان کیخوڑے ٹپٹخ کر رہ گیا۔

ساچھو پانزا کا گدھا جتنی تیزی سے جھاگ سکتا تھا وہ اسے جھاگتا ہوا اپنے آقا کی مدد کے لیے پہنچا اس نے دیکھا کہ اس کا بہادر اور شجاع آقا حرکت تک کرنے سے معذور ہے۔

”خدا ہماری مدد کرے۔“ ساچھو بولا۔ ”جناب کیا میں نے آپ سے عرض نہ کیا تھا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر ذرا ہوشمندی سے توجہ دیں۔ وہ تو ہوا چکیاں تھیں اور کوئی شخص اس وقت ان سے دھوکا نہیں کھا سکتا جب تک خود اس کے اپنے دماغ میں ہوا چکیاں بھری نہ ہوں۔“

”ساچھو زیادہ تیزی نہ دکھاؤ۔“ ڈان کیخوڑے نے کہا۔ ”کیونکہ جنگ میں ایشیا تیزی سے تبدیل

بھی ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ جادوگر فریڈن جس نے تیرے گھر اور میری کتابوں کو ہتھیایا تھا۔ اسی نے ان دیوتاؤں کو ہتھیایا۔ دشمنوں کو ہتھیایا۔ تاکہ میں فتح کی شان و شوکت سے بہرہ مند نہ ہو سکوں۔ ہاں وہ میرا ایسا ہی دشمن ہے لیکن تم دیکھ لینا آفریقہ میں اس کی ساری برائی اور شیطنت میری تلوار کے سامنے دھری کی دھری رہ جائے گی۔

خدا کے راہ نیارے ہیں۔ سانچو پانزوا۔ نے اپنے آقا کو زخمی حالت میں زمین سے اٹھنے میں مدد دیتے اور گھوڑے پر سوار کراتے ہوئے کہا۔

یولیسز

ناول کی صنف میں جو ایک بڑا انقلاب آیا۔ ہم جسے 'جدید ناول' کہتے ہیں اس جدید ناول کے مسماروں میں ہسزلی جیمز بالخصوص اس کا ناول 'دی ایلبیڈرز' مارسل پر دوست 'ری ٹریٹمنٹ آف ٹھنڈے پاسٹ' اور جیمز جوائس ہیں۔ یہ تینوں ناول نگار جو ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ ان کے ہاں بعض ایسی مشترک خصوصیات اور اقدار ملتی ہیں جن کی بدولت ہمارے دور کے عالمی ادب میں ناول کی جدید صورت گری ہوئی۔

جدید اور قدیم پاروائیٹی ناول میں بنیادی فرق کیا ہے۔ یہ ایک اور الجھا دینے والی بحث ہے۔ مختصر آئیں کہا جاسکتا ہے کہ روایتی اور قدیم ناول زندگی کی خارجی حقیقتوں کی عکاسی کا فریضہ انجام دیتا رہے۔ حقیقت روزمرہ کی حقیقت جیسی ہوتی تھی۔ جبکہ نیا اور جدید ناول انسان کے باطنی اور نفسی تجربے کا اظہار بنتا ہے اور ناول نگار داخلی اور ذاتی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے قاری کو اپنی ذات کے اندر کے سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ عام قاری جو اس سفر کی صعوبتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ جدید ناول سے پوری طرح محفلد ظاہر نہیں ہو سکتا۔

جیمز جوائس کا پر اظہار ایک وقت طلب تجربہ بنتا ہے۔ یقینی امر ہے کہ ہر قاری اس تجربے سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

جیمز جوائس ۲ فروری ۱۸۸۲ء ڈبلن (آئرلینڈ) میں پیدا ہوا۔ جوائس کی ماں نے چودہ بچوں کی ماں بننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس کا والد ایک ٹیکس گلڈر تھا۔ خاندان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ مختلف ادوار میں جوائس نے جیسوسٹ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ

مطالعہ کا رسیا تھا۔ ابن اس کا پسندیدہ ڈرامہ لنگار تھا۔ ۱۹۰۰ء میں ہی اس نے ابن کے ڈراموں پر ایک مضمون لکھ کر چھپوا کر اپنے ساتھی طالب علموں کو حیران کر دیا تھا۔

اس نے ڈبل اینڈیٹری کالج سے گریجوایشن کی اس کے بعد اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے ملک سے باہر بسر کیا اس نے بوہیمین انداز کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ پیرس چلا گیا تھا جہاں گزربسر کے لیے وہ آئرلینڈ کے جدیدوں میں کتابوں پر تبصرے چھپواتا رہا۔ جب اس کے والد نے اسے اطلاع دی کہ اس کی والدہ مرنے والی ہے تو جو اس ڈبل اینڈیٹری۔ اس کی والدہ کا انتقال ۱۳ اگست ۱۹۰۳ء کو ہوا۔

جون ۱۹۰۴ء کو اس کی ملاقات نور بازنیکل سے ہوئی۔ جو اس اس سے محبت کرنے لگا۔ جو اس نے اپنے کیتھولک عقیدے سے برگشتہ ہو چکا تھا اور نورا کے ساتھ بغیر شادی کیے زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ ایسا آئرلینڈ میں ممکن نہ تھا۔ اس لیے یہ جوڑا پہلے زیورچ گیا جہاں جو اس کچھ عرصہ ایک سکول میں پڑھاتا رہا۔ یہاں سے وہ پولا (لوگوسلاویہ) گیا یہاں بھی وہ انگریزی پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد وہ ٹریسٹ چلا گیا۔ یہاں ۱۹۰۵ء میں وہ ایک بیٹے اور ۱۹۰۹ء میں ایک بیٹی کا باپ بنا۔ اس دوران میں جو اس روم میں ایک بینک میں کچھ عرصے کے لیے کلرک کی بھی کرتا رہا۔ اس زمانے میں اس کی نظموں کا مختصر مجموعہ "چیمبر موزک" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی کہانیوں کا مجموعہ "ڈیلنڈز" کوئی ناشر شائع کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بعد وشتوار میں اور وقتوں کے بعد کہانیوں کا مجموعہ "ڈیلنڈز" ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔

جو اس کی عمر کا بیشتر حصہ ناداری اور تنگدستی میں بسر ہوا۔ دولت مند بننے کے لیے نئی نئی سکیں بنانا لیکن ان میں اسے عملی طور پر کامیابی نہ ہوئی۔ بوہیمین سے ہی اس کی بیانیہ کمزور تھی اور بیانیہ کے سلسلے میں بھی وہ ساری عمر پریشان ہی رہا۔ بعض نقادوں نے اس کی کمزور بیانیہ کو اس کی داخلیت پسندی کا بڑا سبب بتایا ہے۔

۱۹۱۴ء میں کہانیوں کے مجموعے "ڈیلنڈز" کے علاوہ اس کا ناول "اے پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایٹ اے یونگ مین" شائع ہوا۔ اس کی اشاعت میں ایبزرالونڈ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جو اس نے پہلی جنگ عظیم کا زمانہ جلاوطنی میں ہی گزارا اور جنگ کے معاملہ میں وہ خاموش

اور غیر جانبدار رہا۔ جنگ کے بعد جو اس کا زیادہ وقت - یولیسیز لکھنے میں گزرا۔ اس کا ایک مداح اسے کچھ مالی مدد فراہم کرتا رہا۔ جو اس جزدوقتی طور پر انگریزی بھی پڑھاتا رہا۔ بالآخر اس کی سالگرہ کے دن ۲ فروری ۱۹۲۲ کو یولیسیز شائع ہوا۔ اس برس جو اس بچوں کے ہمراہ آئرلینڈ اپنے وطن پہنچا لیکن وہ زیادہ وہاں نہ رک سکا کیونکہ آئرلینڈ میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اور ساتھ ہی جو اس کی آنکھ کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ وہ پیرس چلا گیا۔ آنکھ کی تکلیف پھر ساری عمر کا روگ بن گئی۔ لیکن وہ اپنا ناول فننگلز ویک لکھنا چلا گیا۔ اس کی آنکھ کا کسی بار آپریشن ہوا۔ اس نے ۱۹۳۱ء میں انگلستان میں شہری حقوق حاصل کرنے کی نیت سے اپنے بچوں کی ماں نور سے روایتی نکاح بھی پڑھوایا۔ یولیسیز کی شہرت اور کامیابی نے جیمز جو اس کو قدرے خوش حالی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اس ناول پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ بھی چلا تھا جو ایک علیحدہ روداد ہے۔

جو اس کی ایک بیٹی ڈینی توآنن سے محروم ہو گئی۔ زندگی کے آخری برس جو اس اپنی اس شہیت بیٹی بوریس کے علاج میں مصروف رہا۔ ڈیوریج میں اس کا علاج ہو رہا تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔

۱۳ جنوری ۱۹۴۱ کو جو اس کا انتقال ڈیوریج میں ہوا۔

~*~

یولیسیز کا مطالعہ ایک مشکل کام ہے اور اس کو پوری طرح سمجھنا اس سے بھی مشکل تر... جیمز جو اس کا آخری ناول فننگلز ویک کے بارے میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ اسے سمجھنے والوں کی تعداد گنتی کے لوگوں کی رہی ہے... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یولیسیز کو پڑھنا اور سمجھنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں....

وہ لوگ جو دنیا کے اس عظیم ناول سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ یولیسیز پڑھنے سے پہلے جو اس کی کہانیوں کا مجموعہ ڈبلنز پڑھیں۔ اس کے بعد اس کا ناول لے پورٹریٹ جو اس کی ہر تصنیف کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ QUASI AUTO BIOGRAPHICAL ہے۔ ڈبلنز اور لے پورٹریٹ پڑھنے والے کے لیے یولیسیز آشنا اور آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ خاص اسلوب جو یولیسیز میں اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ اس کا تجربہ جو اس نے اپنی کہانیوں اور

پہلے ناول "لے پورٹریٹ" میں کیا تھا۔ پھر ان کہانیوں اور پہلے ناول کے کردار ہی ہیں جو "یولیسز" میں گھسے بڑھتے چلے ہیں۔

"یولیسز" کی نثر اور اسلوب کے حوالے سے ایڈمنڈولسن نے جو مضمون "جیمز جوائس کا "یولیسز" کے عنوان سے لکھا ہے بہت اہم ہے۔ ایڈمنڈولسن نے یولیسز کو فلائیر کے ناولوں کے بعد ایک مکمل لکھا ہوا ناول قرار دیا ہے۔ فلائیر کی نیچرلزم اور جوائس کی سبکزم کے امتزاج سے جو اسلوب اور نثر اس ناول میں پڑھنے کو ملتی ہے وہ انگریزی ادب میں ایک نیا اور منفرد چیز ہے۔ اسی حوالے سے مرحوم محمد حسن عسکری نے لکھا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جوائس کے طریقہ کار اور تکنیک کو سمجھنے اور اسے ذہن میں رکھنے بغیر اس کی کتابوں سے لطف نہیں اٹھایا جاسکتا... جو لوگ کل تک جوائس کے مخالف تھے وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے جا رہے ہیں کہ اس کا شمار یورپ کی تہذیب کے پیدا کیے ہوئے بڑے سے بڑے آدمیوں میں ہے۔"

(جھلکیاں محمد حسن عسکری ص ۲۰۴)

انگریزی ادب کے بڑے بڑے نقادوں نے جوائس کے بارے میں بڑی سخت اور درشت آراء دی ہیں۔ بلٹن مری جیسے نقاد نے جوائس اور لارنس کا موازنہ کرتے ہوئے جوائس کو "بخبر اور ڈبھی۔ ایچ لارنس کو زندگی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ امی ایم فورسٹر جیسے ناول نگار اور نقاد نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ

"جوائس نے زندگی کو گندگی سے ڈھک دیا ہے۔"

ایسی سخت اور درشت اور دو لوک تنقید و تنقیص کے باوجود "یولیسز" بیسویں صدی کا اور عالم ادب کا عظیم شہکار ہے۔

یولیسز کی عظمت اس کے اسلوب، تکنیک اور جوائس کے تصور حقیقت میں مضمر ہے۔ وہ انسان کو سب سے کم اور غیر آدرشی صورت میں پیش کرتا ہے اور انسان کو مکمل سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کے ہاں کردار نگاری جو صورت اختیار کرتی ہے اس کے بارے میں ایڈمنڈولسن لکھتا ہے؛

"جوائس نے یہ فریضہ اپنے ذمے لیا تھا کہ اس کے مارجن منظر آوازوں

میں حرکت کرتے ہیں ان کا مکمل حسن اور صحت کے ساتھ بیان کرے۔ اور پھر اس
انوکھے ذخیرہ الفاظ کا صحیح استعمال اور دریافت اور ان کا آہنگ، جن کے حوالے
سے ہر کردار کے اس کے اپنے خیالات کا اظہار ہو سکے۔

(پروٹیسٹنٹ جوائس - ص ۱۵۱)

جوائس نے مشکل ترین کام کا فریضہ ادا کیا ہے۔ انسانوں کے شعور کے اندر اترنے کا۔ یہ بھی
یڈمنڈ لسن ہی کا کنا ہے کہ ہم جوں جوں یولیسز پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس ناول کی نفسیاتی سچائی
کے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ ایڈمنڈ لسن نے یولیسز کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے۔

جوائس بلاشبہ انسانی شعور کے ایک نئے دور کا عظیم شاعر ہے۔ ص ۱۵۵

اور یولیسز کے حوالے سے جوائس ادب میں ایک انسانی اور نئی حزب صورتی لیکر آیا ہے۔

۷۰

ٹربنس جیسے شاعر نے اپنے دور کے لکھنے والوں میں سے جوائس کو عظیم نثر نگار قرار دیا تھا۔
مارچ ۱۹۱۸ء میں امریکہ کے رسالے *EAST* میں یولیسز قسط وار شائع ہونا شروع ہوا۔ ایڈرا
پونڈ کے عمل دخل سے نیویارک میں بھی یہ بیک وقت قسط وار شائع ہونے لگا۔ لیکن ایک برس
بعد اس کی قسط دار اشاعت روکھنی پڑی۔ کیونکہ اس کو حزب الاخلاق قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں کہیں
جا کر امریکہ میں قانونی طور پر یہ ناول شائع ہوا۔

یولیسز کی نثر میں جو عناصر شامل ہیں ان کی مختصر آیوں نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ جدید شہرت

سمبلزم ایچ اور ابھام اور پھلا - EPIPHANY -

سٹورٹ گلبرٹ نے جیمز جوائس پر اہم ترین کام کیا ہے۔ گلبرٹ سے جوائس نے خود کہا تھا
کہ اس کا ناول "یولیسز" ہومر کی عظیم رزمیے "اوڈیسی" کے مماثل ہوگا مقام عمل کے لیے دلہن پورکا
جزیرائی صداقت کے ساتھ اور اس کی صداقت کے

ذریعہ سطح پر فنون کا بیان جیسے دینیات تاریخ وغیرہ اور پھر عدد وسطی کی مماثلت کے مطابق
اس کی تجسیم اور اس کے احصاء ڈرامائی اور نغمگی سے بھر پور اظہار جو تجربے کی بھٹی سے نکلا ہوا
ہو اور مرکزی کرداروں کے ذہنی اور جسمانی تجربات کا اظہار ہو۔

”یولیسز“ کا عمیق مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تین حصوں میں باہوا ہے۔ ایک حصہ ڈیڈلاس کی صبح پر اور دوسرا بلوم کی ڈبلن کی مسزگشت پر اور تیسرا بلوم کا گھراپنی بیوی کے پاس اور سٹیفن کی لپنے باپ کے پاس واپسی پر.....

عمیق اور گہرے مطالعے سے ہی یولیسز کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ یہ اور ڈیڈلاس کے دیوئی لائی عنصر کے بھی عین مماثل ہے۔ ایڈرا پونڈ نے اس حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ خصوصی مطالعہ کا حاصل ہے۔

پروفیسر ٹنڈل نے ”یولیسز“ کی تھیم پر جو کتاب لکھی ہے وہ اس ناول کے اعمان کی بھرپور نشاندہی کرتی ہے۔

ان خصوصیات کے علاوہ جس خرابی کی وجہ سے ”یولیسز“ نے اپنی اشاعت کے زمانے میں ادبی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ اس کے کرداروں کے ذہنی تجربوں کی پیش کش ہے۔ ذہنی تجربوں کو اس اسلوب میں بیان کیا گیا ہے جسے عرف عام میں ”شعور کی روکتے ہیں جس میں داخلی مکالمہ خاص کردار ادا کرتا ہے اس لیے جب ہم اس ناول کے کسی کردار کو پڑھتے اور محسوس کرتے ہیں تو ہم دنیا کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ دیکھ رہا ہے۔ سٹورٹ گلبرٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”یولیسز“ میں۔

Joyce does not give us the raw material of the mind but the illusions of the mind's natural flow..

کیونکہ جو اس کوئی نام نہاد نفسیات دان تو ہے نہیں کہ وہ حقیقی آدمیوں کے ذہنی اعمال کو دستاویزی صورت دے رہا ہو اور ہیں یہ بتانا چاہتا ہو کہ ”شعور“ کیا ہوتا ہے۔ جو اس تو فنکار ہے جو فن کا ایک شہکار تخلیق کر رہا ہے۔ وہ اپنی تفصیلات اور جزئیات اس انداز سے انتخاب کرتا ہے کہ جس سے ایک خاص ڈرامائی لمحوں سے گزرنے والے خاص ذہن کی پوری کیفیت اور فضا کا اظہار ہو سکے۔ اس سلسلے میں اس کے پاس اظہار کا ذریعہ زبان ہے اور زبان کو جس انداز سے جو اس نے استعمال کیا ہے اس کی مثال پورے انگریزی ادب میں نہیں ملتی۔ محمد حسن عسکری نے جیمز جو اس پر اپنے مضمون میں اس سلسلے میں چند مثالیں دی ہیں ان سے جو اس

کے اس کمال کو سمجھا جاسکتا ہے اور پھر میں یہ اعادہ کروں گا کہ اس زبان کی وسعت، حسن اور معنویت کا پورا احاطہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ "یولیسز" سے پہلے "ڈبلنرز" اور "اے پورٹریٹ" کو پڑھ لیا جائے۔ کیونکہ اس طرح "یولیسز" کا مطالعہ بہت آسان ہو جائے گا۔

اس ناول کے کردار سٹیفن، بلوم اور مولیٰ کے حوالے سے ہم انسانی ذہن کی اس کائنات سے متعارف ہوتے ہیں۔ جو یولیسز کے مطالعے سے پہلے ہماری نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ پروفیسر ٹیڈل نے اس ناول کے کردار مسٹر بلوم کے حوالے سے عورت کے باطنی شعور کو سمجھنے کے سلسلے میں جو اس کو جو فرح پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ اس کردار کی سچائی اور بڑائی کا منظر ہے۔ "یولیسز" کو پوری طرح سمجھنے کے لیے بعض حوالوں، علامتوں، اساطیر اور تخیلی فن پاروں کے بارے میں بنیادی معلومات کا جتنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اس عظیم فن پارے کی گہری اور پوری معنویت تک پہنچنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ "یولیسز" میں (بلکہ جو اس کی ہر سحریر میں) وقت کا جو تصور اور اہمیت ہے اس کے بڑھتے ہوئے ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

عالمی ادب اس منفرد اور نشاہ ساز ناول "یولیسز" پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے گا۔ اس ناول کا پڑھنا اور سمجھنا ایک عظیم تجربہ ہے۔ اس حوالے سے جمیز جوائس کے ناول "یولیسز" کے بارے میں چند کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے ان میں سے چند کتابوں اور اہم مضامین کے نام دے رہا ہوں۔

"جمیز جوائس اینڈ دی میٹنگ آف یولیسز" (فرینک بڈگن، یولیسز "آرڈر اینڈ متھوڈ")
ایس ایلیٹ، جمیز جوائس زیولیسز (سٹورٹ گلبرٹ) دی سٹرکچر آف دی ناول "ایڈون میور" لٹریچر
ایس ایلیٹ (ایڈورڈ پونڈ) ولیم سٹڈل کا مضمون "جمیز جوائس ہرزے آف انٹریٹینگ دی موڈرن ورلڈ
ایڈمنڈ ولسن کا مضمون "جمیز جوائس"۔ یولیسز۔"

اس مضمون میں میں نے دائرہ اس ناول کے کرداروں اور عقیم کے حوالے سے کوئی اشارہ نہیں دیا کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ مضامین کے قاری۔ اس مضمون کے حوالے سے اپنے اندر یہ تحریک پیدا کریں کہ وہ خود اس عظیم ناول کا مطالعہ کر سکیں۔ جو اس نے ایک بار لکھا تھا۔ میں اپنی روح کی بھٹی میں اپنی نسل کا ضمیر بنانے جا رہا ہوں۔ "یولیسز" اس کی روح کی بھٹی سے نکلا ہوا فن پارہ ہے۔ !!

نظمیں

گوگول نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

پوشکن کے نام سے ہی فوراً روسی قومی شاعر کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ پوشکن ایک غیر معمولی مظهر اور غالباً روسی روح کا مظہر ہے۔ اس میں روسی مناظر قدرت، روسی جذبات روسی زبان اور روسی کویکر کی عکاسی ایسی پاکیزگی اور شفاف حسی کے ساتھ ملتی ہے۔ جیسے وہ شیشے کی اُبھری ہوئی سطح سے معکوس ہو رہی ہے...

پوشکن عظیم روسی عوامی شاعر، دلکش سخن اور دانش مندانہ کہانیوں کا بانی پہلے حقیقت پسند ناول ایگینین الیگینین اور ہمارے ڈرامے بوریس گردولوف کا مصنف، ایسا شاعر جس کی شاعری کے حسن اور فکر و خیال کے انحصار کی طاقت کو ابھی تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ شاعر جو عظیم روسی ادب کا خالق تھا اور جانے وہ کونسا لمحہ تھا جب پوشکن نے اپنی نظم میں لکھا تھا۔

اور۔ ایک دن ایک نیک دل راہب

ادھر اٹکلے گا اور وہ امتداد زمانہ سے

پیلے پڑ جانے ملے گرد آلود کاغذوں پر سے گرد

جھاڑ دے گا۔

اور اس کے آنسوؤں سے

ایک ایک گرد آلود لفظ جگمگا اٹھے گا...

زمانے نے پوشکن کے کسی حرف کو گرد آلود نہیں ہونے دیا۔ اس نے جو لکھا وہ موجود اور روشن

ہے وہ دنیا کے چند بڑے شاعروں میں شمار ہوتا ہے اور بلاشبک وشبہ وہ روسی ادب کا خالق ہے۔
روس کے قومی ادب کا خالق جس کے بغیر روسی ادب کا تصور بھی محال ہے۔

۱۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا والد دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے تھے پوٹکن کی والدہ ابراہام ہاینال کی نواسی تھیں جو ایک خوب شوخ مزاجہ تھیں۔ پوٹکن فطری جذبات رکھنے والا حریت پسند شاعر تھا۔ غلم و استبداد کا دشمن، آزادی کا عاشق عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والا۔ روس کے ڈار نے پوٹکن کی شاعری کے بارے میں بڑی ناراضی سے کہا تھا۔
"پوٹکن نے نفرت انگیز شاعری سے روس کو بانٹ دیا ہے۔ پوٹکن کو اس جرم میں سائبریا جلا وطن کر دینا بہتر ہوگا۔"

یہ سزا تو اسے نہیں ملی لیکن اسے پریڈ برگ سے روس کے جنوبی علاقے میں جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۸۲۰ء میں پوٹکن کی پہلی تصنیف "رسلان اور لیو میلا" مسکن کی جو ایک نظم ہے۔ اس نظم کو لے کر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ زوگونسکی جیسے بزرگ شاعر نے نظم سے متاثر ہو کر اپنی تصویر پوٹکن کو بھیجی اور اس پر لکھا "تنگست خود زہ استاد کی طرف سے فتح یاب شاگرد کو" اس کے بعد اس کی کسی نظمنیں شائع ہوئیں جنہوں نے اسے شہرت سے ہمکنار کیا۔ ایک طویل نظم جو ۱۸۲۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ خاص نوعیت کی ڈرامائی نظم ہے۔ اس نظم کا ہیرو صرف اپنے لیے آزادی کا حوالا ہی ہے۔ یہ پرفرغز انفرادیت کے حسرات ایک ایسی نظم ہے جو شہر والون کی غلامانہ ذہنیت کی مذمت بھی کرتی ہے پوٹکن اور دارشاہی کے درمیان بیٹھ مٹنی رہی۔ ۱۸۲۴ء میں اسے دوران فادہ صوبے بسکوف میں بھیج دیا گیا۔ یہ بھی ایک سزا ممتھی لیکن اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی وہ روسی عوام کے دل میں اپنا گھر بنا چکا تھا۔

پوٹکن نے عوامی کہانیوں کو منظوم کیا روسی تھیٹر کو حیات نوبختی۔ بولیس گردونوف روسی ادب کا ہی نہیں عالمی ادب کا ایک شہکار المیرہ ہے۔ اس لیے میں اس نے مطلق العنانی کو مسترد کر دیا۔

۱۴ دسمبر ۱۸۲۵ء کو پریڈ برگ میں "دسمبر والون کی بغاوت" ہوئی جو ناکام رہی۔ پوٹکن

۱۸۲۶ء کے موسم خزاں میں پوٹسڈن ماسکولوٹا ۱۸۲۸ء میں اس نے رزمیہ نظم "پولتا دابکھی"۔

۱۸۳۳ء میں اس کی شہکار نظم "تاجے کا شہسوار" شائع ہوئی۔

اس سے پہلے ۱۸۳۰ء میں پوٹسڈن نے اپنی عظیم منظوم کارنامہ "ایوگینی اونگین" ختم کیا

اس منظوم ناول پر اس نے آٹھ بڑے رگائے تھے۔ (انگریزی میں اس کا سب سے اچھا ترجمہ

نابوکوف نے کیا ہے، ایوگینی اونگین اس کا سب سے اچھا ترجمہ نابوکوف نے کیا ہے، ایوگینی اونگین

اس کا وہ کارنامہ ہے جسے حجاز سٹیشن پیش کرتے ہوئے عظیم روسی نقاد اور جمہوریت پسند ولسار

بیلنسکی نے پوٹسڈن کی اس تصنیف کو "روسی زندگی کا انسائیکلو پیڈیا کہا تھا۔

روس کے لوگ کس مزاج کے ہیں۔ روس کا اپنا مزاج اور لینڈ سکیپ کیا ہے۔ روسی کس طر

سوچتے ہیں۔ ان کا تمدن کیا ہے۔ یہ منظوم ناول اس کا جواب ہے۔

اس منظوم ناول میں پیٹر بزرگ، ماسکوا اور ان روسی صوبوں کی زندگی سامنے آئی ہے ج

کا اس منظوم ناول کے سپرد اونگین نے سفر کیا تھا۔ ناول کے وسیع حقیقت پسند کینوس پر اس زمانہ

کے روس کے سماج کی سچی تصویریں سامنے آئی ہیں روس کی سر زمین اس منظوم ناول میں اپنے

لینڈ سکیپ کے ساتھ جیتی جاگتی اور سانس لیتی ہوئی سامنے آئی ہے۔

"ایوگینی اونگین" نے سفر کیا تھا۔

"ایوگینی اونگین" عالمی ادب کا شہکار ہے۔ یہ منظوم ناول دنیائے ادب میں ایک ایسا

مقام رکھتا ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۳۱ء میں پوٹسڈن کی زندگی کا اہم واقعہ شادی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کی شاد

ماسکوکو کی ایک بہت حسین نازنین نایا گولی رودا سے ہوئی۔

پوٹسڈن کو روسی ادب کا بادا آدم کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ اس کی عظیم شاعری ہی نہیں

پوٹسڈن نے روسی زبان کی نشر کو بھی ایسا حسن عطا کیا ہے جو پہلے خال خال ہی تھا۔ اس کی تحریر

میں آزاد میسج، جمہوریت پسندی خاص عناصر ہیں اس کے علاوہ اس نے نشر کو سادگی

حسن ہنشا۔ ایسائیت اور اختصار بندی نے اس کی نشر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ لیکن کی کہانیاں اور

کی سیکم۔ اس کے نشری شاہکار ہیں۔

حکم کی بیگم اس کی وہ طویل مختصر کہانی یا ناولٹ ہے جس کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔
 ڈکشن چندرنے تو اسے اپنی ایک کہانی میں پوشکن کے حوالے کے بغیر مہربتا بھی ہے۔ نثر میں شہرت
 حکم کی بیگم کو حاصل ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ شہرت پاکستان کی بیٹی (۱۸۳۶ء) کی اشاعت
 سے ہوئی۔

پوشکن کی شاعری میں جو عظیم اور ابدی مقام اس کے منظوم ناول "ایو گینٹی ڈونگیین کو حاصل
 ہے۔ نثر میں وہی مقام پاکستان کی بیٹی کا ہے۔

اس کا آخری شہکار "دو بروسکی" ہے۔ ایک ناول جو پوشکن کی وفات کے بعد ۱۸۴۱ء میں شائع
 ہوا۔ اس میں اس کی تمام تر ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ ہیں۔ روسی جاگیر داری نظام کے خلاف
 یہ ناول جہاں ایک احتجاج کا درجہ رکھتا ہے وہاں حقیقت نگاری میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔
 پوشکن کی زندگی کے آخری برس بہت کمٹھن تھے۔ زار روس سے تعلقات بے حد خراب ہو چکے
 تھے۔ درباری اس کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

پوشکن نے فرانسیسی نژاد انتیس کے ساتھ ڈوئل لڑا جس میں اسے ہلکا زخم لگا اور جانی
 میں ۱۹ جنوری ۱۸۴۷ء کو ختم ہو گیا۔ اس کی موت پر لہر منتون نے جو نظم لکھی اس کی یاد اس کے سزا
 لہر منتون کے عظیم ناول THE HERO OF OUR TIMES کا ترجمہ اردو ادب میں ہو چکا ہے۔
 تیوچوین نے پوشکن کے بارے میں ایک نظم میں کہا تھا۔

"پہلی محبت کی طرح تجھے۔"

روس اپنے دل سے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

اور ایک زمانے میں پوشکن نے کہا تھا۔

روس کی دستوں میں چوچا میرا ہی ہوگا

اور نام میرا ہر اک کی زباں پر ہوگا!

آج پوشکن کا نام صدیوں سے ہر بڑھنے سننے والے کی زبان پر ہے وہ ایک فلاح دہن کا
 کاماک تھا ایک ایسا کھنے والا، ایک ایسا انسان جس نے ایک بڑے ملک اور بڑی زبان کے
 قومی ادب کی بنیادیں رکھیں اور دنیا میں اپنے فن کی بدولت بقائے دوام کا تاج پہنا۔

..~..

پوشکن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کی عظیم تصانیف کے سنانے میں ایک متبحر بچے کی طرح کھڑا اپنے آپ کو پاتا ہوں۔

وہ کس اعتبار سے عظیم ہے؟ اس سوال کا جواب بے حد آسان ہے۔ اس کے بارے میں کچھ ذکر ہو بھی چکا۔ لیکن اس کی کونسی تصنیف عظیم ہے کونسی ایسی کتاب جو دنیا کی سو بڑی کتابوں میں شامل ہو سکتی ہے تو اس سوال کا جواب میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کی نظم "بجائے" اس کا منظوم ناول "ایوگین" "ایوگین" یا پھر اس کے نثری شاہکار "پکتان کی بیٹی" اور "حکم کی بیگم" یا پھر اس کا ڈرامہ "گردونوف" انتخاب کو کڑے سے کڑا کر لیں تو پھر شاعری میں "ایوگین" اور نثر "پکتان کی بیٹی" وہ جتنا بڑا شاعر تھا۔ اتنا ہی بڑا نثر نگار تھا۔!

"ایوگین" اور "پکتان کی بیٹی" دنیا کی شاعری، دنیا کی شاعری کا شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس منظوم ناول کی شاعری دنیا کی بہترین شاعری ہے۔ اس سے کچھ اقتباسات اور کچھ اس کی نظموں کے تراجم پیش خدمت ہیں۔!! تراجم - ڈا۔ انصاری کے ہیں۔

میں نے چاہا تمہیں، تم سے محبت کی تھی

کیا خبر آج بھی دل میں دہی چنگاری

خیراب آہنچ میں کیوں اسکی جلاؤں تم کو

جی نہیں مانتا کچھ ٹھیس لگاؤں تم کو

دل دکھے جس سے وہی بات سناؤں تم کو

تھی محبت میں گلے کی نہ صلے کی پردا

بے زبانی سے، کبھی رشکے دل ٹکڑے تھا

جس نزاکت سے لگن سے تمہیں چاہا میں نے

یوں ہی ہو جائے کوئی اور بھی۔ اللہ کرے

اب نیلے گنبد کے نیچے
پھیلے ہیں برن کے خالیچے
کیا شان دکھاتے ہیں دن میں، کیا دھوپ میں جم جم کرتے ہیں
اس اُجیلے سستے منظر میں شفاف سا جھل بکھرا ہے
پالے کی ہلکی چھینٹوں سے داددار کا سبزہ نکھرا ہے
اور پتھر جیسے برن تلے دھارے بھی نرم گزرتے ہیں
کمرے میں روپلی دھوپ لے
دن آیا اُجلا روپ لے
چولے میں بھرے ہوں انگارے
اور چٹ چٹ اُڑتی چنگاری
بستر میں پڑے ہوں سوچ میں گم
تب لطف ہے موسم کا پیاری

پونجھی ہے آزاد چمن میں
کیسی فکر کہاں کا دھندا
اُڑنا پھرنا سر آنگن میں
اس دُجمن کو کیا کرنا ہے جو
تھکے چن چن چھتر بنائے
ہے وہ رہن بسیرا اس کا
جس ٹہنی پر آنکھیں میچے
جس ٹہنی پر نیند آ جائے
جب سورج کی لال کٹوری
نکلے اور اُجالا چھٹکے

پنچھی اپنے رب کا حکم سن کر مجھ سے ہلکے ہلکے چپکے اور بھجن خود گائے۔
جب رُت بدلے آئی گرمی
اور بہاروں کی سب نرمی
دھوپ میں جھلے، پیاس سے جھڑکے
اور پھر جب دن ہوں پت جھڑکے
بادل گرھیں، بجلی کڑکے
آدمی کتنے دکھ بھرتا ہے
سردی، گرمی، آندھی، پانی
سب کے ساتھ گزر کرتا ہے
لیکن پنچھی کیوں غم کھائے
پھر سے اچھی رُت آنے تک دور سمندر پار اڑ جائے
کون رکھے اسے بندھن میں
پنچھی ہے آزاد چمن میں زینگارے
سرسوتی نہ جب تک اس کو دے صدا
کوی کہاں ہے تو ہماری بھینٹ لے کے آ
کوی کہیں
جہاں کے چھوٹے موٹے کاروبار میں دبا ہوا
وہ بے دلی سے نکلے روزگار میں دبا ہوا
پڑا رہے۔
ستار اس کا بے لونا رہے
نشتے میں نیند کے مگن کوی کی آتما ہے
جو مٹ چکے ہیں لذتوں کی راہ میں
جو گر گئے ہیں ہوش کی نگاہ میں

عجب نہیں کہ ان سے بھی ذلیل و خوار ہو کوی
مگر ذرا صدائے غیب آئے گی
شعور کو چھوئے گی اور
شاعرانہ روح کو جگائے گی
کوی اٹھے گا اپنے من کی آنکھیں کھولتا ہوا
عقاب کے مثال شہر کو تو مست ہوا
زمانے بھبر کی دل لگی،
چھپے گی بن کے اک سوئی
زبان اس پاس کی
لگے گی اس کو اجنبی
وہ جن کو پوجتا ہے جگ، بنائے اپنا دیوتا
یہ خود پسند سرکھی، جھکے نہ جھک سکا
وہ آپ اپنی ذات میں ہی معشر خیال ہے
خود اپنے زمزموں سے مالا مال ہے
یہ روز کا چلن، یہ بے حسی اسے دہال ہے
مزاج کا نہ اس سے میل ہے نہ اس سے تال ہے
وہ بے نیاز جا رہا ہے تیز گام اس طرف
جہاں کناڑے ہو چکے ہیں بے تقاؤ اس طرف
جہاں مچا ہے شور بن میں ڈھاک کے
جہاں لہر لہر ہے موج، بے لگام اس طرف

(شاعر)

بدی کے پھول

پراسرار آدمی! ذرا تیرتا تو سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے۔
اپنے باپ سے، ماں، بہن سے، یا بھائی سے؟
میرا نہ تو کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ بہن نہ بھائی؟
اپنے دوستوں سے؟
یہ تو تم نے ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس کا میں آج تک مطلب نہیں سمجھا۔
اپنے ملک سے
مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ہے کس عرصہ بلد میں۔
خوب صورتی سے،
وہ لافانی دیوی، اس سے محبت کرنے کو تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں۔
دلت سے؟
مجھے اس سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں خدا سے۔
پھر تمہیں کس سے محبت ہے انڑھے اجنبی،
مجھے بادلوں سے محبت ہے، ان بادلوں سے جو گزر جاتے ہیں وہ دیکھو،
ان حیرت انگیز بادلوں سے!



یہ شارل بو دلیسر کی ایک نظم ہے اس کا ترجمہ مہم محمد حسن عسکری نے کیا ہے۔ اس نظم کے بارے

میں عسکری صاحب نے جو تفصیل رائے دی ہے، اس کے چند جملے آپ بھی پڑھ لیجئے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:-

”اپنی جمالیاتی قدر و قیمت کے علاوہ بودیلیر کی یہ نظم انیسویں اور بیسویں صدی یا صنعتی دور کی سماجی اور اخلاقی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی طرح ادب اور آرٹ کی تاریخ میں بھی ممکن ہے کہ یہ نظم اس دور کی ہر تحریک یا ہر فنکار پر حاوی اثر ہو سکیں۔ بڑی حد تک اس میں پہلے زمانے کی روح بند ہے۔ اس عہد کے انسان کی ساری روحانی ایلیسیاں، مجبوریات، معذریات اس کی ساری حسرتیں اور آرزوئیں اس نظم میں گونجتی ہیں۔ یہ نظم اس کی شکست کی آواز ہے بلکہ زندگی کے اس نظام کی بھی۔ ان منفی عناصر کے پہلو بہ پہلو اس نظم میں انسان یا کم سے کم فنکار کی روحانی کاوشوں اور موت کے خلاف اس کی جدوجہد کا نشان بھی ملتا ہے۔“

شارل بودیلیر کے ساتھ عالمی جدید شاعری کا آغاز ہوتا ہے وہ ایک ایسا فنکار اور شاعر ہے جس کی شاعری نے دنیا بھر کے ادب پر اثرات مرتب کیے ہیں بودیلیر اور اس کی نظموں کے مجموعے بدی کے پھول کے ساتھ جدید شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کی نظموں کا یہ مجموعہ جو اپنی اصل زبان فرانسیسی میں LES FLEURS DUMAL کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہو چکا ہے۔ محمد حسن عسکری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے بھرپور انداز میں بودیلیر کو اردو میں متعارف کرایا۔ اس کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بہت کچھ لکھا اور اس کی بعض نظموں کو اردو قالب دیا۔ بعد میں لیتھق بابر نے بودیلیر کو اردو میں منتقل کیا۔ بودیلیر کی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا ترجمہ لیتھق بابر نے کیا ہے اردو میں شائع ہو چکا ہے۔

عسکری صاحب نے انسانی تاریخ میں رونما ہونے والے ۱۸۵۷ء کے برس کو دواہم واقعات کی وجہ سے یادگار اور دور رس نتائج کا حامل قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے، ۱۸۵۷ء کا برس اس لیے یادگار ہے کہ ۱۸۵۷ء میں برصغیر میں انگریزوں کے خلاف پہلی بڑی بغاوت ہوئی اور دوسرا واقعہ بودیلیر کی نظموں کے مجموعے بدی کے پھول کی اشاعت جو ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا۔

شارل سپری بودیلیر کی ولادت ۹ مارچ ۱۸۲۱ء کو پیرس میں ہوئی۔ اس وقت اس کی والدہ کی عمر اٹھائیس برس تھی اور وہ جوزف فرانکو، بودیلیر کی دوسری بیوی تھی جس کی عمر اس وقت باسٹھ برس

تھی۔ بودیلیر کا باپ ایک عالم شخص تھا اور بڑے نواب کے بچوں کا معلم بھی تھا۔ وہ مذہبی اعتقادات رکھنے والا انسان تھا۔ بودیلیر کو یہ مذہبیت درشتے میں ملی۔

بودیلیر خوش گوار اور پرسکون ماحول میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کے ابتدائی برس بہت پر مسرت تھے۔ اس کے والدین اسے بے حد چاہتے تھے۔ اس کے والد نے اسے لاطینی زبان میں تعلیم دلانی باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ بودیلیر کو ساری عمر اپنے والد کی کمی محسوس ہوئی۔ ساری عمر اس کے کمرے میں اس کے والد کا پورٹریٹ لٹکا رہا۔

۱۸۲۴ء میں بودیلیر کے باپ کا انتقال ہوا۔ اگلے برس ۱۸۲۸ء میں اس کی والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ کرنل آپیک بودیلیر کا سوتیلہ باپ بہت وجہ اور خوب صورت انسان تھا۔ شاہی خاندان کے ساتھ اس کے گھرے مراسم تھے۔ وہ اپنی مرضی کا آدمی تھا۔ اپنے اعلیٰ فرجی حکام کی کم سی پرداہ کرتا تھا۔ وہ تسلط فزید اور میڈرڈ میں سفیر بھی رہا۔ پھر سیکنڈ ایمپائر کے زمانے میں سینٹر بن گیا۔ بودیلیر کا مزاج اپنے سوتیلے باپ سے بے حد مختلف تھا اور بودیلیر کو اپنی ماں کی اس شادی کا دکھ بھی بہت ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی والدہ نے اس کے والد کیساتھ غلامی کی ہے بودیلیر کے ایک سوانح نگار کریپے نے لکھا ہے کہ یہ ایسا زخم تھا جو کبھی مندمل نہ ہو سکا۔

بودیلیر نے لیون اور پیرس کے کالجوں میں تعلیم حاصل کی لیکن وہ پیدائشی شاعر تھا اس کا مخصوص مزاج تھا اگے کے سوتیلے والد کا خیال تھا کہ وہ بودیلیر کو کسی سفارت خانے میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز دیکھے۔ لیکن بودیلیر کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو ادب کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جس زمانے میں بودیلیر نے یہ فیصلہ کیا۔ اس وقت ۱۸۳۸ء میں اس نے ایک مصرعہ تک نہ لکھا اس لیے اس کے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی گئی۔ بودیلیر کے اندر کا فڈ کارل سے اکا تا تھا کہ وہ روایتی زندگی بسر نہیں کرے گا۔ اس زمانے میں بودیلیر نے دن رات پڑھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں اس نے بارزاک جیسے عظیم ناول نگار سے تین سالہ پیدائی اور یہی وہ دور تھا جب بودیلیر کلاطینی کو ارٹز میں کیمپوں کے ہنر آنا جانا شروع ہوا۔ وہ زندگی کا ہر تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ہر ذائقہ

چکھنا چاہتا تھا۔ جس سے اس کے خاندان کا پریشان ہونا لازمی تھا لیکن بودیلیر اپنی زندگی کو ایک تجربہ گاہ بنانے پر تامل نہ کرتا تھا اور اس نے ایسا کر دکھایا۔

وہ ہندوستان کے بحری سفر پر نکل کھڑا ہوا بحری جہاز کا کپتان اس کے خاندان کا دوست تھا۔ موتیس میں وہ جہاز سے اتر گیا۔ کال عورتوں، والی نظمیں اس عمدگی بزرگت میں۔

۱۸۴۲ء میں بودیلیر پیرس واپس آیا اس کے آداب و اطوار، لباس، شکل و شبہت میں ایک ایسا وقار اور شان تھی کہ جو اسے دیکھتا اور ملتا اس کا گرد ویدہ ہوجاتا۔

بیوزیل نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

”اس کی آنکھیں کسی مشرقی سلطان کی طرح پراسرار تھیں۔ جن میں روشنی کی جوت دکھائی دیتی۔ اس کی جلد گلابی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ پر کشش خدخال کا مالک تھا۔ اس کے گھنگھریلے گھنے کالے بالوں نے اس کی وجاہت کو چار چاند لگا دیے تھے۔“

بودیلیر اب ایکس برس کا ہو چکا تھا۔ خاندانی ورثے سے لے کر خاصا کچھ ملا تھا۔ اس لیے وہ بڑے مٹھا مٹھا بٹھے سے زندگی گزارنے لگا۔ اسی زمانے میں اس نے ”بدی کے پھول“ کی نظمیں لکھنا شروع کی تھیں۔

۱۸۴۲ء میں بودیلیر کی شہسائی اس وقت عورت سے ہوئی جس کا نام جینی ڈورل یا جینی سیر تھا۔ اس خاتون کی اصل حقیقت پر اب تک ان سزا کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ پیرس کے ایک مقصود میں اداکاری کیا کرتی تھی۔ بودیلیر کے لیے اس کی رفاقت نے اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ وہ لکھا کرتا تھا یہ عورت HIS ONLY DISTRACTION HIS ONLY PLEASU.

”RE HIS ONLY FRIEND“ بن گئی تھی لیکن جسے وہ اپنا سب کچھ سمجھتا تھا وہ عورت ایک ہرجائی، ان پڑھ اور بلا نوازش تھی، لیکن بودیلیر کے لیے وہ ناگزیر بن چکی تھی بدی کے پھول کی بعض نظمیں جنہیں جینی سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان سے علم ہوجاتا ہے کہ بودیلیر کے لیے وہ کیا حیثیت رکھتی تھی۔ ”بدی کے پھول“ کی ان نظموں کے حروف سے جینی کی صفات جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس میں نظم جس کا نام WELEBALCON ہے، خاص اہمیت

حاصل ہے۔

بودیلیر کو جنسی بیماری لاحق ہوئی لیکن چھپنی کے لیے اس نے چونچیں لکھیں ان میں بے پناہ ترغیب اور شدت موجود ہونے کے باوجود جنسی عمل کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ نہ ہی ان نظموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی جنسی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا۔

بودیلیر کے ایک فوٹو گرافر ناڈر (NADAR) نے تو بودیلیر کے باسے میں میاں تک کما ہے کہ وہ مراکز کو نڈر انتہا:

بہر حال صحیح قیاس یہ ہے کہ اگر جینی ڈیورل کے لیے بودیلیر آنا جذباتی تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جینی ڈیورل اس کے جسمانی تقاضوں اور خامیوں کو پوری طرح جانتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب اس کی نظموں کا مجموعہ "بدی کے پھول" شائع ہوا تو اس پر بڑی لے دے ہوئی ایک تو یہ شاعری مرد و جاشاعری سے بے حد مختلف تھی۔ پھر ان نظموں پر بد اخلاقی کا الزام عائد کیا گیا لیکن یہی کتاب جسے بد اخلاقی کے الزام میں ملوث کیا گیا آج دنیا کی عظیم ترین شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ فرانسیسی ادب میں ہی نہیں پوری دنیا میں نظموں کی اس کتاب کی جواہریت ہے وہ ادب کے قارئین پر واضح ہو چکی ہے۔

"بدی کے پھول" کا اکتساب تھیوفیل گاتیر کے نام ہے جس کا ناول "میڈموزیل ڈی ماپن" (MADEMOISELLE DE MAUPIN) عالمی ادب کا ایک شہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۸۴۲ء کے موسم گرما میں بودیلیر کی گاتیر سے ملاقات ہوئی جو انتہائی گہرے مراسم میں تبدیل ہو گئی۔ بالزاک، بودیلیر اور گاتیر حشیش کے رسیا تھے!



"بدی کے پھول" ۲۵ جون ۱۸۵۷ء کو شائع ہو کر کہنے کے لیے آئی۔ فلوریئر جسے حال ہی میں اس کے ناول "مادام بوداری" کی ترجمان سے مقدمے میں الجھایا گیا تھا۔ پہلا شخص تھا جس نے نظموں کے مجموعے کو سراہا اور اپنی تعریفی رائے سے بودیلیر کو مطلع کیا۔ ۱۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو حکام نے یہ کتاب ضبط کر لی۔ ۲۰ اگست ۱۸۵۷ء کو بودیلیر کو ایک عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ جہاں اس پر عوامی اخلاق کو تباہ کرنے والی نظموں لکھنے کا مجرم قرار دے کر تین سو فرانک جرمانہ کیا گیا۔

دکٹر سوگوند نے اس جرمانے کے حوالے سے بوڈیلیر کو لکھا :-

”موجودہ حکومت جو سب سے بڑا اعزاز دے سکتی ہے وہ اس نے تمہیں

دے دیا ہے۔ میرے شاعر دوست میں تمہارا ہاتھ تھامتھا ہوں۔“

بعد میں جرمانے کی رقم گھٹا کر پچاس فرانک کر دی گئی اس حوالے سے بوڈیلیر اور اس کی

نظموں کے مجموعے ”بدی کے پھول“ کی خاصی شہرت ہوئی، لیکن بوڈیلیر کے وقار کو ٹھیس لگی

تھی۔ ”بدی کے پھول“ میں چھ نظموں کے بارے میں حکم صادر کیا گیا کہ جب تک ان کو مجموعے سے

نکالا نہیں جائے گا۔ تب تک یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکے گا۔ بوڈیلیر کو اس بات سے سمجھوتہ کرنا

جب اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تو اس میں یہ چھ نظمیں موجود نہ تھیں

لیکن بلجیئم میں اس کا جوائنٹیشن شائع ہوا اس میں یہ نظمیں شامل تھیں۔

اب تک بوڈیلیر کے مالی وسائل ختم ہو چکے تھے وہ دو برس برسز میں رہا۔ اب تکبت

اور افلاس کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو اس پر فالج کا حملہ ہوا جس کا اثر اس

کے دماغ پر بھی ہوا۔ چند ماہ تک وہ برسز کے ایک کلینک میں زیر علاج رہا پھر اپنی رہائش

گاہ پر آگئی۔ لیکن ۲ جولائی ۱۸۶۶ء کو اسے پیرس کے ایک نرسنگ ہوم میں پہنچا دیا گیا۔ اس کی

حالت بگڑ چکی تھی وہ لوگ جنہوں نے اسے اکیس برس کی عمر میں دیکھ کر اسے ایک شہزادہ کہا تھا

اب وہ اسے جوانی میں ایک بڑھا جڑوس سمجھ رہے تھے۔ وہ گنجا ہونچکا تھا۔ اس کا جسم سوکھنے لگا تھا۔

۲۱ اگست ۱۸۶۷ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ میڈویل نے اس کی موت پر لکھا۔

”بدی کے پھول“ کی نظموں کا خالق محض ایک شاعر نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک سچا شاعر تھا۔

اس رات سے کئے والے دور کے کسی نقاد کو اختلاف پیدا نہیں ہوا۔

رباعیات

۱۸۵۹ء سے اب تک مغرب میں جس مشرقی شاعر کو بہت زیادہ پڑھا گیا ہے اور اس کے کلام کو مصدور کیا گیا اور اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا وہ فارسی کا شاعر، عمر خیام ہے جس کی رباعیات ساری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔

۱۸۵۹ء میں رابرٹ فرڈر جیرالڈ نے ان فارسی رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں شائع کر لیا تھا۔ ۱۸۵۹ء سے پہلے بھی یورپ میں عمر خیام کو جانا پہچانا جاتا تھا البتہ بے پرکھی ہوئی اس کی ایک کتاب کو البتہ کے استادوں اور طالب علموں نے ہمیشہ سراہا تھا۔ لیکن اسے جو شہرت اپنی رباعیات کی وجہ سے حاصل ہوئی اس شہرت نے عمر خیام کی دوسری اہم صلاحیتوں اور کارناموں کو خاصا دھندلا دیا۔ اب وہ دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا پیغام دینے والا ایک شاعر سمجھا جاتا ہے اور اس میں بھی کچھبالغہ نہیں کہ مغرب والوں نے اس کی شاعری کی پوری روح کو نہیں سمجھا بلکہ اس کی ظاہری سطح سے ہی سے زیادہ متاثر ہوئے۔

عمر خیام جیسا کہ اس کے نام کے ساتھ منسلک "خیام" سے ظاہر ہے۔ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جو خیمے بنانے میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ عمر خیام کا سن پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۷۱ء میں نیشاپور (خراسان) میں پیدا ہوئے ان کی زندگی کو ایک لیجنڈاؤر مینتھ کی سی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایک روایت ہے کہ عمر خیام نے امام الموفق کی درس گاہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے ہم کاتبوں میں حسن بن صباح اور نظام الملک جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تینوں گہرے دوست تھے۔ حسن بن صباح نے بعد میں اپنا ایک گروہ "خشیش" کے نام سے ترتیب دیا۔ جس کی مکاریاں

کی داستان تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ نظام الملک نے ترقی کی اور وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچے۔
 عمر خیام محض ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے علم نجوم و فلکیات، ریاضی اور الجبرا میں بڑا
 نام پیدا کیا یہ سہرا بھی عمر خیام کے سر بندھتا ہے کہ انہوں نے ایرانی کینڈڑ اور تقویم پر اس زمانے میں
 نظر ثانی کی۔ ستاروں کے جدول تیار کیے۔ ریاضی پر کئی کتابیں ان کے قلم سے موجود ہیں۔
 بعض مصنفوں نے عمر خیام کو بڑے غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اصل میں ان کی باوقار
 سے متاثر ہو کر یہ تصور کر لیا کہ عمر خیام بھی ایسے ہی شخص ہیں جیسا انسان ان کے ہاں ان کی رباعیات میں
 موجود پاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ شعر کہنا۔ عمر خیام کا مقصد حیات نہ تھا۔ نہ ہی انہوں نے اس
 پر اپنی پوری صلاحیتوں کو ہی مرکوز کیا تھا تاہم وہ بڑے شاعر تھے۔ عالمی شعر کی صف میں ایک ممتاز
 اور دوامی مقام رکھنے والے شاعر۔

عمر خیام کی زندگی پر بہت سا کام ہوا ہے ان میں سے چند کتابوں کا ذکر میں عمر خیام کے حوالے
 سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عمر خیام پر ایک کتاب ۱۹۲۳ء میں رونق لیڈلے لکھی تھی۔ عمر خیام اینڈ
 ٹائمز یہ کتاب بے حد گراہ کن ہے۔ اس کتاب میں عمر خیام کو خاصے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
 دوسری کتاب جو ہمارے ہاں بھی خاصی پڑھی گئی ہے وہ ہیرلڈ لیم کی کتاب عمر خیام ہے۔ ہیرلڈ لیم کو یہ گڑ
 آتا تھا کہ وہ تاریخ شخصیت اور داستانی انداز کے آل میل سے دلچسپ کتاب لکھ لیتا تھا۔ ہیرلڈ لیم
 کی کتاب بھی اس کے مخصوص دلچسپ داستانی انداز میں ہے۔ اس میں ہمیں جو عمر خیام ملتا ہے۔ وہ خاصا
 حقیقی نظر آتا ہے۔ ہیرلڈ لیم نے عمر خیام کے خدو خال کو صحیح انداز میں نمایاں کرنے کے لیے بہت
 محنت کی ہے۔

اپنے محدود مطالعہ کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ عمر خیام پر جو سب سے اچھی اور مستند کتاب لکھی
 گئی ہے وہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک مؤرخ
 اور محقق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور وہ عمر خیام پیش کیا ہے کہ جو وہ اصل میں تھا۔ انہوں نے عمر خیام کی
 ذات کے ساتھ منسوب کہانیوں اور داستانوں کو اپنی تحقیق سے پرکھ کر حقیقت سے ختم کر دیا ہے۔
 اور اس کتاب میں ہمیں وہ عمر خیام دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف اپنے عہد کا، بلکہ اپنے خصوصی کمالات کی
 وجہ سے دائمی عزت و فضیلت اور مرتبے کا حامل ہے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی یہ اہم تصنیف ایک

عرصے سے کیا ہو چکی ہے۔

عمر خیام کا سن وفات ۱۱۲۳ء ہے۔

ایڈورڈ فزجرالڈ کا شمار انگریزی زبان کے درمیانے درجے کے شاعروں میں ہوتا ہے اس کی اپنی شاعری میں اتنی جان اور توانائی نہیں کہ وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتی۔ لیکن فزجرالڈ عمر خیام کے مترجم کی حیثیت سے لازوال حیثیت حاصل کر چکا ہے کہا جاتا ہے اور بہت حد تک صحیح بھی ہے کہ فزجرالڈ کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل نہ تھا لیکن وہ خود ایک ایسا شاعر اور انسان تھا جسے چھوڑوں، رنگوں حسن و جمال سے بڑا لگاؤ تھا۔ جب وہ عمر خیام کے کلام سے متعارف ہوا تو اس کی شاعری اس کے جی کو لگی۔ فزجرالڈ نے فارسی زبان کا مطالعہ ۱۸۵۳ء میں شروع کیا تھا اور ۱۸۵۶ء میں اس نے کچھ تراجم کیے جن میں جامی کے کلام کا بھی ترجمہ تھا۔ ۱۸۵۹ء میں عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ کتاب بہت عوامی صورت میں شائع ہوئی اور عرصے تک گمنامی کی حالت میں پڑھی رہی یہ ایک اتفاق تھا کہ فزجرالڈ کے عمر خیام کی رباعیات کے ترجمے پر انگریزی شاعر روز سی کی نگاہ ایک پرانی کتاب میں بھیچے والے کی دکان پر پڑ گئی۔ اس نے وہ کتاب خریدی اور پھر اس کو پڑھنے کے بعد فزجرالڈ کے ترجمے کو سراہا۔ بعد میں انگریزی شاعر سون برن نے اس کی بے حد تعریف کی۔ اس پذیرائی سے متاثر ہو کر فزجرالڈ نے ان شاعروں کے مشورے پر رباعیات عمر خیام پر نظر ثانی کی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۸ء میں شائع کر دیا۔ اس کے بعد مغربی دنیا شاعر عمر خیام کے نام سے گونجنے لگی۔ وہ لوگ جو فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں ان کے علم میں ہے اور کسی بار اس کی نشاندہی بھی کی جا چکی ہے کہ فزجرالڈ کا ترجمہ اصل کے عین مطابق نہیں۔ بلکہ فزجرالڈ نے اس میں اپنی طرف سے بھی بہت سے گل بوٹے ٹٹائے ہیں۔ بہر حال فزجرالڈ کے اس ترجمے کے حوالے سے عمر خیام کو ساری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ انگریزی کے علاوہ یورپ کی دوسری کتنی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مشرقی زبانوں میں بھی رباعیات عمر خیام کا متعدد بار ترجمہ ہوا ہے اور یوں عمر خیام اپنی رباعیات کے حوالے سے دنیا بھر کا محبوب شاعر بن چکا ہے۔ عمر خیام کی رباعیات، مصوروں کی دل چسپی کا باعث بھی رہی ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے مصوروں نے اس کی رباعیات کو مصور کیا ہے۔ مغرب و مشرق میں اس کی رباعیات کے کتنے ہی مصور ایڈیشن منگنے داموں بک چکے ہیں۔

عزیز مشرق عبدالرحمان ہفتالی نے بھی عمر خیام کو مصور کیا تھا اس کا یہ کام ابھی پوری طرح سامنے نہیں آسکا
برصغیر پاک و ہند میں اردو اور علاقائی زبانوں میں عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔
رم نے جو تراجم کیے وہ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم و امجد سلیم مرحوم نے بھی رباعیات
ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ انسوس یہ شائع نہ ہو سکا اور ان کی موت کے بعد معلوم نہیں کہ ان کے شاگرد
درخوب صورت تراجم پر کیا گذری۔ ڈاکٹر تاثیر نے بھی عمر خیام کی بعض رباعیوں کا ترجمہ کیا تھا جن میں
سے ایک بے حد خوب صورت ترجمہ نذر قارئین ہے۔

اٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں

سورج نے وہ پتھر مارا ہے

جو مے بھتی وہ سب بہہ نکلی ہے

جو حجام تھا پارہ پارہ ہے

فٹنر جیرالڈ جس کے تراجم کی وجہ سے عمر خیام کو عالمی شہرت حاصل ہوئی اسی کے تراجم کی مثال
کے لیے دو رباعیوں کا انگریزی ترجمہ حاضر ہے۔

"A BOOK OF VERSES UNDERNEATH THE BOUGH,
A JUG OF WINE, A LOAF OF BREAD AND THOU.
BESIDES ME SINGING IN THE WICDERNESS OH,
WILDERNESS WERE "PARADISE ENOW."

دوسری رباعی انگریزی ترجمے میں یوں ہے۔

A GOURD OF RED WINE AND A SHEAF OF POEMS,
A BARE SUBSTANCE,
A HALF A LOAF NO MORE,
SUPPLIES US TWO ALONE IN THE FREE DESERT,
WHAT SULTAN WOULD WE ENVY ON HIS THRONE ?

۱۹۶۷ء میں رباعیات عمر خیام کا ایک اردو ترجمہ شائع ہوا اس کے مترجم انگریزی زبان کے محدث

شاعر رابرٹ گریوز اور علی شاہ لڑائی تھے۔ رابرٹ گریوز نے اس ترجمے کے حوالے سے دعوے کیے کہ انہیں علی شاہ لڑائی کے ذریعے جو نسخہ رباعیاتِ عمر خیام کا ملا ہے وہ مستند ترین اور اصلی نسخہ ہے رابرٹ گریوز کو ایسے دعوے کرنے کی عادت رہی ہے۔ ایک زمانے میں گریوز نے دعوے کیے تھے کہ ہومر کی اور ویس کی کئی کئی نسخہ خود ہومر نہیں بلکہ اس کی بیٹی تھی۔ اس لیے ان کے اس دعوے پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ گریوز نے اپنے ترجمے فٹزر جیرالڈ پر شدید تنقید کی کہ فٹزر جیرالڈ کے ترجمے اصل سے دور گراہ کن اور غیر مستند ہیں۔ بہر حال اتنے بڑے دعووں کے بعد گریوز نے علی شاہ لڑائی کے ساتھ مل کر رباعیاتِ عمر خیام کا جو ترجمہ شائع کیا اسے پذیرائی نہ ملی۔ جبکہ فٹزر جیرالڈ کے ترجمے کے ایٹک نے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔

عمر خیام کی شاعری کے اڈے بعض نقادوں نے ایسی قدس کے فلسفے سے جا ملاتے ہیں۔ اسے نثر پرستی، لذت اندوزی اور لطف و عیش کا پیمانہ شاعر قرار دیا گیا ہے۔ عمر خیام کی رباعیات کی یہ تعبیر نہ صرف غلط ہے بلکہ عمر خیام کے ساتھ ایک بڑی زیادتی کے مترادف ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ظاہری سطح پر شراب و سن، زندگی کی مسرتوں اور حاضر لمحے کی لطف اندوزی کا بھرپور احساس عمر خیام کی رباعیات میں ملتا ہے۔ لیکن صرف انہی عناصر سے ہی عمر خیام کی رباعیات تشکیل نہیں پائیں۔ ان رباعیوں میں فنا اور موت کا گہرا احساس ملتا ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج ہے۔ منافقت سے نفرت کا بھرپور شعری اظہار ملتا ہے۔ عمر خیام انسان کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن وہ موت اور فنا کی سچی اور لرزماوینے والی تصویر بھی کھینچتا ہے۔ زندگی کی قدر و وقعت اور موت کی حقیقت بھی انہی رباعیات میں ملتی ہے پھر اس کے ہاں نثر و پرستی کا جو تصور ہے وہ عالم محبت اور بے ریا جذبات سے جنم لیتا ہے۔ اسی لیے عمر خیام کے ہاں منافقت کھینچنا موثر ترین احتجاج ہے۔ حیرت ہے کہ عمر خیام کے مفسر اور ناقدان رباعیوں میں جو مضمونانہ رمز دکھائیے اور تمثیل ہے اسے کس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مشرق کی عظیم شاعری کی روایت کے حوالے سے عمر خیام کی شاعری پر تصوف کی گہری چھاپ ہے جو فنا کا احساس دلاتی ہے۔ زندگی کی مسرتوں کا اظہار کرتی ہے اور یہیں ایک ایسی دنیا میں ایسے انداز میں زندہ رہنا سکھاتی ہے جو دونوں ناپائیدار ہیں۔

بیوزاف گم اس

اس نے ساری عمر شادی نہیں کی حالانکہ وہ جسم کا شاعر تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

I AM THE POET OF THE BODY AND I AM THE POET
OF THE SOUL. I AM THE POET OF THE WOMAN, THE
SAME AS THE MAN.

وہ آوارہ گرد تھا۔ سیلانی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور چھوٹے چھوٹے لوگوں سے محبت کرنے والا۔ وہ آزادی اور جمہوریت سے عشق کرتا تھا۔ اور مقبول جیسے شخص نے اس سے ملاقات کرنے کے بعد اس کے بارے میں کہا تھا۔

POSSIBLY THE GREATEST DEMOCRAT EVER LIVED.

والٹ دہسٹن لانگ آئینڈرنیو یارک) میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ پیدائش ۳۱ مئی ۱۸۱۹ء ہے اس کا باپ ایک عام آدمی تھا۔ ایک ماہر بننا۔ لیکن پیشہ دارانہ طور پر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ گھر کے حالات ایسے ہی تھے جیسے کم آمدنی والے گھرانے کے ہوتے ہیں۔ والٹ دہسٹن اسی لیے کسی سکول میں زیادہ عرصہ تک باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ پانچ چھ برس تک ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گیارہ برس کی عمر میں وہ ایک دفتر میں چھپڑا سی لگ گیا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ طباعت کا کام بھی سیکھتا رہا لکھنے پڑھنے کا اسے شدید لگا تھا۔ باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود وہ گھنٹوں کتب خانوں اور لائبریریوں میں پڑھتا رہتا۔

اسے صحافت کا بھی شوق تھا۔ کیونکہ وہ مخصوص نظریات رکھتا تھا جن میں انسانی مساوات،

غلامی کی مخالفت اور آزادی کی محبت سرفہرست ہیں۔ وہ اخباروں، رسالوں کے لیے لکھتے لگا اور پھر ایک ہفت روزہ "لوگ آئیڈینڈز" کو مرتب کرتا رہا۔ یہ ہفت روزہ زیادہ دن نہ چلا۔ ۱۱۸۸ میں وہ "بروکلین ایگل" کا ایڈیٹر بنا۔ اس میں اس نے امریکی معاشرے اور فنون کے بارے میں بنیاد سوال اٹھائے اور ان کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ وہ غلامی کا شدید مخالف تھا۔ جمہوریت اور آزادی کا علمبردار اس کے خیالات، اعلیٰ اور اونچے طبقے کے لوگوں کو پسند نہ تھے۔ جس کے نتیجے میں اسے "بروکلین ایگل" کی ادارت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے ایک جریدے "کریسنٹ" کی ادارت کی۔ مگر وہاں بھی ماحول کچھ بہتر نہ تھا۔

وہ ادارہ گرد اور سیلابی تھا۔ عام لوگوں میں گھل مل جانے کا اسے ضبط تھا۔ اس نے لمبی سیر کی اور ادارہ گردی کا لطف اٹھایا۔ جنوبی امریکہ اور جنوب مغربی امریکی ریاستوں کے عوام کی زندگیوں کا گہرا مشاہدہ کیا۔ وہ سیر و سیاحت اور عام ان لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہوا "کریسنٹ" ایگ گھوم آیا۔ ۱۸۵۰ء میں وہ "انس آف بروکلین" سے نکلنے والے ایک جریدے "دی فری مین" کا ایڈیٹر بن گیا۔ یہ پرچہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔ والٹ دیمٹین نے اس کے بعد مسماری اور گھر بنانے اور بیچنے کا دھندہ کر لیا۔ اگر وہ اس طرف اپنی پوری توجہ صرف کرنا تو خاصی دولت کما سکتا تھا لیکن اُسے دولت سے افس نہ تھی وہ تو عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ انہی کے دکھ درد اور مسرتوں کو محسوس کر کے اپنی زندگی کو بامعنی اور باوقار بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔

پھر اسے نظمیں لکھنے کا خیال آیا۔ ایک ایسا شخص جس کی زندگی ان حالات میں گزر رہی ہو۔ اس کا شاعر بن جانا یقیناً حیران کن بات لگتی ہے۔ کلفٹن فیڈمین نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے وہ بے ڈھب لباس پہننے والے، ملازموں، مزدوروں، دکانداروں، چھوٹے ملازموں، کوچوں والوں کے دوست، والٹ دیمٹین نے جہاں زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا وہاں اپنے احساس جمالیات کی بھی تربیت کرتا رہا تھا۔ اسی لیے اس کے لیے شاعر بننا مشکل نہ رہا۔

والٹ دیمٹین کی شاعری۔ دنیا کی بڑی شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی نظمیں اس کے شہادتِ جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ نئی نئی جہتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ گھاس کی پتلیاں۔ امریکہ کی سچی تصویر ہے۔ وہ اپنی نظموں میں امریکہ کے باشندوں اور ان کی

لقاب کشائی کرتا ہے وہ اخلاقی، معاشرتی، سیاسی مسائل پر لکھتا ہے۔ حسب الوطنی، انسان دوستی، جھوٹی پابندیوں کے خلاف جہاد کرتا ہے۔

اپنی نظموں میں اس نے مرد و شاعری سے شدید انحراف کیا۔ وہ شعر میں وزن، بحر، قافیے کی پابندی کو پُرِ غلوں اور براہِ راست شعری اظہار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ اس نے ان سب پابندیوں کو توڑا۔ خیر باد کہہ دیا۔ رسمی عروض کو سچ دیا۔ اس کی شاعری کونثری شاعری کہا جاسکتا ہے بلکہ صحیح معنوں میں وہ عظیم نثری شاعر تھا۔ اس نے گھاس کی پتیاں میں جو شعری اسلوب اختیار کیا اور جن خیالات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اس کی دگر سے شدید مخالفت ہوئی۔ اس کی کتاب کو ضبط کیا گیا اور ایسا بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار والٹ دہمٹین کو اس لیے تعزیری کارروائی کا نشانہ بنا پڑا کہ اس کے پاس اس کی اپنی ہی نظموں کا مجموعہ گھاس کی پتیاں پایا گیا تھا۔ جن کا رکھنا جرم تھا۔

۱۸۵۵ء کا برس عالمی شاعری میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس برس والٹ دہمٹین نے گھاس کی پتیاں کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ کتاب صرف ۹۵ صفحات پر مشتمل تھی۔ اور محدود تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے انسانی جسم، انسانی اعمال اور فطرت کو یک جہان کر دیا تھا۔ اس لیے ان نظموں کو غیر شاعرانہ اور مخرب اخلاق قرار دیا گیا۔ بہت کم لوگوں نے اسے سمجھا اور اسے سراہا۔ ایک مدت تک یہ نظموں کی کتاب گنہگار رہی۔ ایمرسن پہلا بڑا اور اہم شخص ہے جس نے سنجیدہ قارئین کی توجہ نظموں کی اس کتاب کی طرف مبذول کرائی۔ لوگ اسے پڑھنے لگے اور پھر اس کے نئے ایڈیشن نئی نظموں کے اصفاف کے ساتھ شائع ہونے لگے۔ ۱۸۶۰ء میں جب اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی ضخامت ۲۶۰ صفحات تک پہنچ چکی تھی۔ والٹ دہمٹین کی نظموں اب امریکہ میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی سراہی جا رہی تھیں۔

۱۸۶۲ء میں والٹ دہمٹین فوج میں مردوں کی حیثیت سے ملازم ہوا اور وہ خانہ جنگی میں زخمی ہونے والے لوگوں کی مرہم سہی کرتا رہا۔ نیلی آنکھوں اور الجھی ہوئی ڈاڑھی والے شاعر کی صحت اب خراب ہو چکی تھی۔ اُسے شہری محکمے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

”گھاس کی پتیاں“ کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں وہ نظموں بھی شامل تھیں جو اس نے

جنگ کے حوالے سے لکھی تھیں۔ یہ ایڈیشن ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں ایک اور ایڈیشن نئی نظموں کے احضار سے شائع ہوا۔ جس میں اس کی وہ مشہور نظم بھی شامل ہے جو اس نے ابراہام لنکن کے قتل پر لکھی۔ نظم کا نام ہے۔

WHEN LILCS LAST IN THE DOORYARD BLOOM.

والٹ وہٹمین نے انسانوں کا جو مشاہدہ کیا اور آزادی سے جو عشت کیا۔ اس نے اسے جمہوریت کا عظیم ترین نقیب بنا دیا۔ اس کی شاعری امن اور آزادی کی شاعری ہے۔ جس میں سچی اور گہری کیفیت پائی جاتی ہے۔ اپنی ان نظموں کی وجہ سے اسے ملازمت سے بھی نکال دیا گیا۔ بعد میں اسے انگلینڈ میں محکمہ خزانہ میں کلرک بنا دیا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ وہ کئی دن منتقل ہو کر وہیں رہنے لگا۔ اس کی زندگی کے بقیہ ۱۸ برس غربت اور بیماری میں بسر ہوئے۔ لیکن والٹ وہٹمین کی زندہ دلی برقرار رہی۔ وہ دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے لکھنے والے اس سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔

اپنی موت سے پہلے ہی والٹ وہٹمین نے اپنی قبر کے لیے ہارلے قبرستان کینڈان میں ایک مزار تعمیر کرایا تھا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۲ء کو اس کا انتقال ہوا اور اسے اسی مزار میں دفن کر دیا گیا۔

والٹ وہٹمین عوام، انسانیت، آزادی، امن اور سچائی کا شاعر ہے۔ وہ جمہوریت، اخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کا قائل نہیں۔ وہ انہیں توڑتا ہے۔ ان کے خلاف پوری شدت سے آواز اٹھاتا ہے۔ والٹ وہٹمین کی شاعری نے امریکی شاعری میں انقلاب برپا کیا۔ اسے زندگی کی اصلی حقیقی ذہنی سچائیوں اور نظریات سے متعارف کرایا۔ اس نے پابند شاعری ترک کی۔ اس نے روایتی شاعری اسلوب کو ترک کر کے اظہار کے لیے نئی راہیں تراشیں۔

اس کی نظموں میں عام انسان اپنی پوری جذباتی کیفیات اور آدرش کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ بظاہر فطرت سے محبت کرتا ہے اس کی شاعری میں وہ الفاظ اور اشیا کے نام بھی شامل ہیں جنہیں روایتی شاعر غیر شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔

”گھاس کی پتیاں کی اشاعت عالمی ادب کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ گھاس کی پتیاں نے عالمی شاعری کو متاثر کیا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں والٹ وہٹمین کی نظموں کا ترجمہ بار بار

مختلف اودار میں نہ ہوا ہو۔ وہ ایک عالمی شہری اور آفاقی حیثیت کی شاعری کا خالق ہے وہ پوری انسانیت کا شاعر ہے۔ اس کی ایک نظم ہے۔

"THIS MOMENT YEARNING AND THOUGHT FUL."

پوری نظم لیں ہے۔

THIS MOMENT YEARNING AND THOUGHT FUL SITTING ALONE,
IT SEEMS TO ME THERE ARE OTHER MEN IN OTHER LANDS
YERNING AND THOUGHT FUL,

IT SEEMS TO ME I CAN LOOK OVER AND BE HELD THEM IN
GERMANY ITALY, FRANCE, SPAN OR FAR, FAR AWAY IN CHINA
OR IN RUSSIA OR JAPAN,

TALKING OTHER DIALECTS AND IT SEEMS TO ME IF I CO-
ULD KNOW THOSE MEN I SHOULD BECOME ATTACHED TO
THEM AS I DO TO MEN IN MY OWN LANDS,

O I KNOW WE SHOULD BE
BRETHREN AND LOVERS,

I KNOW I SHOULD BE HAPPY WITH THEM,

والٹ دہسٹین اپنی نظموں میں نئے شہروں کے خواب دیکھتا ہے۔ ایسے شہر جنہیں کہہ ارض کی
فرجیں مل کر بھی تسخیر نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ جس شہر کا خواب دیکھتا ہے اس کو انسان دوستوں نے
بسیا ہے جو ہر چیز سے زیادہ انسانی محبت سے عشق کرتے ہیں۔ یہی محبت ان کی توانائی ہے اور
رہبر بھی۔ اس شہر کے لوگوں کے اعمال میں، ہر حرکت میں، حتیٰ کہ ان کی نگاہوں اور لفظوں میں
بھی یہی محبت اپنا اظہار کرتی ہے۔

والٹ دہسٹین صدائوں کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں متنوع آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ موسم
سرمایا کی آمد کی صدا سنتا ہے۔ وہ موگرگی کے دھماکوں سے محبت کرتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کی آواز۔

سے اس کی نظیں سجتی ہیں۔ کھیلانوں اور گھروں میں کی جانے والی سرگوشیاں اس کے ہاں ملتی ہیں اور ریل گاڑی کی چہکار بھی۔ اس کے ارد گرد ہمیشہ موسیقی کا طبعاً بندھا رہتا ہے۔ اس کی مشہور نظم ہے۔

THAT MUSIC ALWAYS ROUND ME,

جس میں وہ کہتا ہے۔

I HEAR NOT THE VOLUMES OF SOUND MERELY,

I AM MOVED BY THE EXQUISITE MEANINGS,

I LISTEN TO THE DIFFERENT VOICES,

O WINDING IN AND OUT, STRIVING CONTENDING

WITH FIERY VEHE MENCE,

TO EXCEL EACH OTHER IN EMOTION,

اردو میں گھاس کی پتیاں کی کچھ منتخب نظموں کا ترجمہ جناب قیوم نظر نے کیا ہے جو گھاس کی پتیاں کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ قیوم نظر اردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے ہاں نظم میں ہدایت کے بعض تجربے بھی ملتے ہیں لیکن والٹ ڈبھٹین کو ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک خاص انداز اپنایا ہے۔ جو قابل غور ہے۔

پروفیسر عبدالواحد نے اس ترجمے کے حرف آغاز میں اس مسئلے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ والٹ ڈبھٹین کے بارے میں یہ ذکر آچکا ہے کہ اس کی نظموں اور مدنی اور رومی پابندیوں سے آزاد اور انحراف کرتی ہیں۔ لیکن قیوم نظر نے اس کا ترجمہ مردوج بجزوں میں کیا ہے۔ بلکہ کتاب کے آخر میں نظموں کے پہلے مصرعوں کے ارکان بھی دیے گئے ہیں۔

پروفیسر عبدالواحد لکھتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کے نزدیک اردو میں ایسا کلام مرتب کرنا جو بیک وقت غیر مدنی بھی ہو

اور شعریت کا حامل بھی۔ محال ہے۔

تاہم پروفیسر عبدالواحد اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان تراجم میں بجزوں کی پوری سختی سے پابندی نہیں کی گئی۔ بعض جگہ ترجمہ بجز سے گر گیا ہے۔ یہاں شاعر کا اپنا ارادہ بھی دکھائی دیتا ہے اور قیوم نظر

نے بجز کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

اس کے باوجود یہ کہنا ضروری ہے کہ دالٹ و ہٹین کی نظموں کا ترجمہ بغیر عرضی اسلوب میں

ہونا ضروری ہے۔

آخر میں دالٹ و ہٹین کی ایک نظم FOR YOU O DEMOCRACY کا ترجمہ

پیش خدمت ہے۔ مترجم قیوم نظر ہیں۔

تیری خاطر جمہوریت

آا اور آرمیں بنا دوں گا یہ جو رہے گا متحد

میں بنا دوں گا کہ تجھے اک نسل ایسی شان والی جس کی ہم سر

دیدہ سوز شید نے دیکھی نہ ہو

میں بنا دوں گا زمین کو بہترین اور پرکشش

بہدوں کے پیار سے

بہدوں کے عمر بھر کے پیار سے

✽

دوست داری کے لگاؤں کا وہ پودے جن سے اٹھیں گے درخت

اتنے گھنے، امریکہ کے دریاؤں کے، اس کی بڑی جھیلوں کے

اور رنگیں میدانوں کے دامن پر جو ہیں پھیلتے ہوئے

اور شہروں کو گردوں گالیوں مہم اک دوسرے کی گردلوں

میں ان کے بازو ہوں حامل پیار سے

بہدوں کے پیار سے

بہدوں کے مہر و مصلحت پیار سے

میری جانب سے یہ تیری نذر جمہوریت، یہ تیری خدمت ہے میری ناز نہیں

تیری خاطر تیری خاطر کار ہوں میں یہ گیت۔

(ترجمہ قیوم نظر)

اے سیرن ان دی ہیل

جدید ادب میں بہت کم لوگ ایسے دکھائی دیتے ہیں جو راں بو کی طرح حیران کن غیر العقول اور پریشان کن ہوں۔ وہ بہت کم عمر جیا۔ محض ۳۷ برس اور ان ۳۷ برسوں میں اس نے ایک ایسی زندگی گزاری جو ناپاک بھی تھی۔ صعوبتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہم جو بیاہ تھی۔ اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں اس نے اتنی رسوائیاں اور بدنامیاں سمیٹیں کہ جن کو آج بھی لوگ نہیں بھلا سکتے اور پھر ایک دم اس کی زندگی میں دولت مند بننے کا ایسا جنون اور طوفان پیدا ہوا کہ اس نے شعر و ادب کو چھوڑا اور طالع آزمائی کے لیے نکل کھڑا ہوا لیکن وہ کبھی اتنا دولت مند نہ ہوسکا کہ زندگی کے کچھ برس ہی آسودگی اور بے فکری سے بسر کر سکتا۔ اس کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ جب وہ مر رہا تھا تو اسے علم نہیں تھا کہ اس کی شاعری کی بنا پر اسیے نر انس کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو ترک کر کے اس سے کلیتاً تعلق ہو چکا تھا۔

آج اس کی شاعری اور اس کی زندگی دونوں کو ایک نیچڈ ٹرمی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ سرٹیلزم والے اس کو اپنا دیوتا اور پیغمبر مانتے ہیں اور کہتے ہیں۔ سرٹیلٹ تحریک پر سب سے زیادہ اثرات راں بو کے ہیں۔

راں بو ایک حیران کن انسان تھا۔ ایک ونڈر چائلڈ.....!

پیرس سے کچھ فاصلے پر واقع ایک قصبے شارل ویل میں اس کی پیدائش ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ اس کی ماں دیتالی دہقان زاوی تھی۔ مردانہ شکل اور صفات کی مالک اور باپ فوج

میں سیٹیفینٹ تھا۔ اس کے والدین کی متاثرانہ زندگی بہت ناخوش گوار تھی اور ایک زلزلے میں وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو گیا۔ ۱۸۷۸ء میں باپ کی موت واقع ہوئی۔ راں بو پر اپنی ماں کا اثر بہت گہرا تھا۔ وہ اس کی سخت گیری کے ہاتھوں بہت تنگ تھا اور اس کے آزادی چاہتا تھا۔ راں بو کا ایک بڑا بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔

راں بو پیدائشی نابالغ تھا۔ سکول میں ابتدائی تعلیم کے زلزلے میں ہی اس نے اپنی بے پناہ تخلیقی ذہانت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں اس نے لاطینی شاعری کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اور اسی برس اس کی پہلی نظم ایک ادبی جریدے میں شائع ہوئی۔ ابتدائی عمر میں ہی اس نے فرانس کے بڑے کھٹنے والوں کی تصانیف کا مطالعہ کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں جن کتابوں کو ممنوعہ سمجھا جاتا تھا وہ ان کو بھی پڑھ چکا تھا۔ وہ بچپن سے ہی خود سرتھا۔ اپنے آپ کو کھٹن کا شکر تھا۔ وہ شدید ترین جذبات کا مالک تھا۔ اور آزادی چاہتا تھا۔ آزادی کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ سخت گیریوں کے اثر اور جس زاہ ماحول سے فرار ہو جائے۔ اور یہی راں بو نے کیا۔ وہ گھر سے ایسی حالت میں بھاگ نکلا کہ اس کے پاس ایک پالی رکھ نہ تھی۔ راستے سے واپس آنا پڑا۔ حالانکہ اس کی منزل پیرس تھی۔ جہاں پال ورلین شاعر سے اس کی خط و کتابت کا آغاز ہو چکا تھا۔ شارل دیل واپس آکر وہ پھر ٹکا نہیں۔ پھر بھاگ نکلا۔ یہ ۱۸۷۷ء کا قصہ ہے جب وہ پیرس پال ورلین کے پاس پہنچا۔

راں بو کی زندگی کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک پال ورلین کا ذکر نہ ہو۔ پال ورلین پیرس میں خود اپنی سسرال کے ہاں رہتا تھا۔ راں بو اس کے پاس اس حال میں پہنچا کہ اسے دیکھ کر کھٹن آتی تھی۔ لباس دہشتانہ اور غلیظ جسم بالوں میں جو تیس۔ پال ورلین کے سسرال والوں نے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ تو پال ورلین نے راں بو کے لیے ایک علیحدہ کمرہ کر لے کر لے لیا۔

یہاں سے بدنامیوں اور رسوائیوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ دونوں شاعروں کے درمیان جن کی عمروں میں نمایاں فرق تھا۔ ایسے تعلقات کا آغاز ہوا جنہیں ناپاک کہا جاسکتا ہے۔

پال ورلین اور راں بو اس کی تردید کرتے ملتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے عوامل، ان کے خطوط سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ یہ تردید بے معنی اور غلط تھی۔

راں بو کی زندگی کا یہ دور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ ہر دم نشے میں دھت ہر طرح کی منشیات کا استعمال، ہوٹلوں اور ادبی مجالس میں ہنگامے، پال ورلین کی بیوی تنگ آگئی وہ طلاق لینے کی تیاریاں کرنے لگی۔ لیکن یہی وہ دور ہے جب راں بو نے نثری نغمیں لکھیں جو - ILLUMI NATION کے نام سے شائع ہوئیں۔

پریس میں وہ بدنامی اور رسوائیوں کی انتہا تک پہنچ گئے۔ وہاں رہنا مشکل ہوا تو دونوں نے لندن کا رخ کیا۔ اس دوران میں راں بو بوشارل ایل بھی جانا رہا۔ لیکن پھر ورلین کے پاس پہنچ جانا۔ مئی ۱۹۳۷ء میں ایسا واقعہ ہوا جس نے ان کے تعلقات کو ختم کر دیا۔ ورلین برسوں میں تھا۔ دن رات نشے میں دھت رہتا۔ سسروال والے اس کے تعاقب میں تھے ایک دن نشے میں پال ورلین نے راں بو پرستول سے دو گولیاں چلا دیں۔ راں بو کی کلائی پر زخمی ہو گئی۔ ورلین کو دو برس کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا اور راں بو نے شارل ویل کا رخ کیا۔

شارل ویل میں اس زمانے میں راں بو نے وہ نغمیں لکھنی شروع کیں جو بعد میں UNE SAISON EN ENFER یعنی جہنم کا ایک موسم کے نام سے شائع ہوئیں۔

۱۹۴۶ء میں جہنم کا ایک موسم کی اشاعت ہوئی۔ اس دوران میں ورلین اسے بلانا تھا لیکن راں بو اس سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ راں بو نے اپنے حصے کی صرف بارہ کاپیاں وصول کیں اور پھر اپنی اس کتاب کو بھی فراموش کر دیا۔

۱۹۴۳ء تک یہ کتاب پبلشر کے تفاعل کا شکار اس کے ترخانے میں پڑھی رہی اور ۱۹۶۱ء میں صحیح معنوں میں اسے منظر عام پر لانے کا موقع ملا۔

ILLUMINATION اور جہنم کا ایک موسم کے حوالے سے اسی لیے نقاد بعض گھیلے کر جاتے ہیں کہ جہنم کا موسم اس کا آخری نغموں کا مجموعہ نہیں ILLUMINATION ہے۔ جہنم کا ایک موسم کے بعد راں بو کا تخلیقی دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ دس

برس کی عمر میں اس نے پہلی نظم لکھی۔ اور انیس برس کی عمر میں شاعری کو چھوڑ دیا۔
اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جس پر بہت سے لوگوں نے اپنی رائے
دی ہے۔ اس نے ہر چیز کو کیوں ترک کر دیا اور دورِ افریقہ میں حرار جا نکلا۔
کامیوں نے اس سلسلے میں کہا تھا۔ شاعری کی دنیا چھوڑ کر حرار جا نکلنا لایعنیت۔ ABS
URDITY۔ مہنتی۔

کیٹس کی جو انرگی کے حوالے سے ایک انگریز نقاد نے لکھا تھا کہ گودہ زندہ رہتا تو
وہ ٹیکسپیر سے بڑا شاعر ہوتا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ اگر اس بو شاعری ترک نہ کرتا تو....
اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں تو کامیاب
نہیں چلتا۔ راں بودس برس سے انیس برس کی جو تک جیسی زندگی گزارنا رہا اس کا رد عمل
تو سامنے آنا ہی تھا پھر اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی تمام تر شعری صلاحیتوں
کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے لیے جتنا ممکن تھا اس نے اتنا ہی لکھا۔ اس سے زیادہ وہ لکھ
نہ سکتا تھا۔

راں بود کی زندگی کا نیا دور صرف ایک مقصد کے تحت شروع ہوتا ہے وہ ہے دولت
کا حصول۔ جو لوگ راں بود کی شاعری کے سنجیدہ قاری ہیں۔ وہ اس مقصد کو اس کی شاعری
کے موضوعات کی نفی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اور ان کی شاعری کا رد عمل بھی۔ اب وہ ایک
طالبِ آزما مہم جو کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ سفر کی تیاری سے پہلے اس نے
عربی، ڈچ، ہسپانوی اور کچھ دوسری زبانیں سیکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پاک اور
عربی کی بعض دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

راں بود پہلے تو کرانے کے پاس ہی کی حیثیت سے الیگزینڈر گیا۔ بیمار ہوا تو واپس شارل
ویل چلا آیا۔ ۱۸۸۰ء میں وہ ہمیں قبرص میں ٹھیکیداری کرتا ہوا ملتا ہے۔ پھر وہ عدنان چلا گیا
وہاں ایک کپڑی میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۱ء میں وہ دشوار راہوں سے گزرتا ہوا ایسیا
سینیا کے شہر حرار پہنچا۔ اسلحے کا کاروبار شروع کیا۔ اس میں خسارہ ہوا۔ حرار سے واپس
عدا، آنا۔ لیکن دولت مند بننے کی آرزو نے اسے چین نہ لینے دیا۔ پھر حرار پہنچا۔ جو رقم اس

نے جان مار کر جمع کی تھی۔ اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔ صحت برباد ہو گئی۔ اس نے غلاموں کی تجارت کی۔ اس کی ایسی تصویریں بھی بنائی گئیں۔ جن میں اسے غلاموں پر کوزے برساتے ہوئے دکھایا گیا۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۱ء تک کئی بار اس کی ماں نے اسے واپس بلوایا۔ لیکن وہ تو دولت مند بن کر واپس جانے کا تہیہ کر چکا تھا اور دولت ہی اس کے نصیب میں نہ تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی عدم موجودگی میں فرائس میں اسے سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جا رہا تھا۔ پھر اس کی جان کیو سیاری کا آغاز ہوا۔ اس کا دایاں گھٹنا سخت ہوا۔ دردنا قابل برداشت ہو گیا۔ واپسی کا سفر شروع کیا۔ اسے پالکی میں سوار ہونا پڑا۔ عدن آیا۔ لیکن کوئی آرام نہ آیا تو مارسیلز کا رخ کیا۔ جہاں اس کی وہ ٹانگ کاٹ دی گئی۔ تیار داری کے لیے اس کی بہن اس کے پاس پہنچی۔ ٹانگ کٹنے کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہوا۔ ناسور سارے جسم میں پھیل رہا تھا۔ شارل ویل سے اسے دوبارہ مارسیلز لے جایا گیا۔ اس کی بہن اس کے ساتھ تھی۔ راستے ہی میں ۱۰ نومبر ۱۸۹۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

راں بو شارل ویل میں مدفون ہے۔ اس کی قبر کے کتبے پر لکھا ہے۔ اس کے لیے دعا کرو۔

جہنم کا ایک موسم جدید عالمی شاعری کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی روح کا کرب پیش کرتی ہے۔ جو شدت جذبات سے مضطرب اور بے چین ہے۔ اس کا کرب اس کی تسکین کا باعث نہیں بنتا۔

راں بو۔ ہیئت کا بڑا قابل تھا۔ وہ نظم کی ہیئت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا اس کے ایک نفاذ نے لکھا ہے کہ جب وہ ہیئت کے معاملے میں نئے ہیئتیں سلکھے ڈھاننے میں ناکام رہا تو اس کی شاعری بھی ختم ہو گئی۔

راں بو پیدا نشی نابغہ تھا۔ اور وہ بچپن سے ہی ایک خاص ورژن کا مالک تھا۔ وہ شاعر کے لیے اپنی ذات کے علم کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ شاعر کو پرودہ میتھیوس کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ جس کی ذمے داری انسانیت پر ہے۔ شاعر۔ بھی اس کی اہمیت رکھتا ہے کہ

وہ غیر مشہور و مشہور بنا دے۔

”جہنم کا ایک موسم“ تشکیک، اگر وہی اور اعتقاد کے جھگیوں میں پھینے ہوئے آج کے انسان کی روداد کو پیش کرتی ہے۔ آج کے انسان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے راں بو سے بہتر بہت کم شاعر دکھائی دیتے ہیں اور ”جہنم کا ایک موسم“ اس کا شاہکار ہے۔

راں بو کی ابتدائی زندگی ایسی ہے جس میں وہ ایک PAGANWORLD کا متلاشی ہے۔ جہاں عیش و عشرت میں مصروف انسان اور دیوتا ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی شاعری اس کے عصر اور آج کے انسان کی جذباتی کش مکش اور کرب کو بیان کرتی ہے۔ مگر اسی تشکیک اور بے یقینی کی دلدلوں میں دھنسا ہوا انسان رحمت خداوندی اور الطاف اور انصاف کا طلب گار دکھائی دیتا ہے۔

راں بو کا یہ شہکار ”جہنم کا ایک موسم“ عالمی ادب کا عظیم شہکار ہے۔ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ایک نثری نظم ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

راں بو اور ”جہنم کا ایک موسم“ پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا۔

اُردو میں اس کتاب کا ترجمہ انیس ناگی نے براہ راست فرانسیسی سے کیا ہے۔ انیس ناگی اکہ مترجم کی حیثیت سے بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سینٹ جان پیرس کے بعد راں بو کا ترجمہ ان کے مرتبے میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

”جہنم کا ایک موسم“ ایک اعتبار سے راں بو کی خود نوشت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

”جہنم کا ایک موسم“ سے کچھ سکرٹے

ایک شام حسن کو میں نے اپنے زانوؤں پر بٹھایا اور مجھے اس کا مزہ کر ڈالگا اور میں نے اس سے بدسلوکی کی۔

میں نے بہت کامرانی سے ہر انسانی امید کو اپنی روح سے نکال دیا ہے۔ تیرا بختی میرا خدا رہی ہے۔

میں نے اپنے آپ کو کچھ ٹریں لٹھیر دیا۔ میں نے اپنے آپ کو گناہ کی ہواؤں میں

خشک کیا۔ اور میں نے دیوانگی سے جی بھر کے دل لگی کی۔

ابھی تو میں بددعا کے زیر اثر ہوں اپنے وطن سے مجھے ڈر لگتا ہے۔

سچ نکلنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمیں ان راستوں پر پھر جانا ہے جو میری بدی

سے گرا بنا رہیں۔

”ہاں، تمہاری روشنی کے لیے میری آنکھیں بند ہیں۔ میں ایک وحشی ہوں۔

ایک زندگی ہوں۔ لیکن مجھے بچایا جاسکتا ہے۔ سوداٹیو، قصابو، کنجوسو، سوداگرو تم زندگی

ہو۔ مجسٹریٹ تم بھی زندگی ہو۔ جنرل تم زندگی ہو۔ شہنشاہ۔ پرانی خارش تم زندگی۔ تم نے

شیطان کی جھبھی کی غیر محمول شراب پی ہے۔ یہ لوگ سرطان اور بخار سے الہام لیتے

ہیں۔ معذور اور عمر رسیدہ اتنے محترم ہیں کہ انہیں زندہ اُبال دینا چاہیے۔ سب سے زیادہ

عیاری یہ ہے کہ اس برا عظیم کو خیر باد کہا جائے۔ جہاں دیرانگی لغفتیوں کے لیے ریغال

مہیا کرتی ہے۔ میں ہام کی حقیقی سلطنت میں داخل ہونا ہوں۔

کیا میں ابھی تک فطرت کو جانتا ہوں؟ کیا میں اپنے آپ سے آشنا ہوں؟ اب

زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مودوں کو اپنے پیٹ میں دفن کرتا ہوں چوچیں

داحول، رقص، رقص، رقص۔ میں اس لمحے کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں جب سفید نام

ساحل پر اترتے ہیں۔ میں عدم میں گرجاؤں گا۔

جھوک، پیاس اور چوچیں، رقص، رقص، رقص، رقص۔ ا

(ترجمہ - انیس ناگی)

ۛ۔ خدا ہی میری قوت ہے اور میں خدا کی ہی تعریف کرتا ہوں۔

ۛ۔ ایک غیر بہرہ و، میری معصومیت مجھے رُلا دے گی۔ زندگی ایک بہرہ و

ہے جس میں میں نے حصہ لینا ہے۔

ۛ۔ جہنم کا ماحول مناجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ۛ۔ میرا خیال ہے۔ میں جہنم میں ہوں۔ مجھے اپنے غصے کے لیے ایک جہنم چاہیے

تھا۔ اپنی نخوت کے لیے ایک جہنم۔ اور ہم آغوشی کا جہنم۔ جہنموں کی ایک سنگت۔

(ترجمہ - انیس ناگی)

پہ۔ میں قدیم باطل اور جھوٹی محبتوں کا مذاق اڑا سکتا ہوں اور ان جھوٹے جوڑوں کو نادم بھی کر سکتا ہوں۔ میں نے عورتوں کا جہنم دیکھا ہے اور مجھے یہ اجازت ہوگی کہ میں ایک جسم اور ایک روح میں صداقت قائم رکھ سکوں۔

پہ۔ ہاں عزیز میں عفو کا طلب گار ہوں کہ میں نے جھوٹ سے اپنا پیٹ بھرا ہے۔
”جہنم کا ایک موسم“ آج کے انسان کی ذہنی اور روحانی رُوداد ہے۔ رال بو کی شاعری اور اس کی شخصیت آج کے انسان کی صحیح صورت پیش کرتی ہے جو دولت کے لیے مذہب، شاعری، عقل و عزم، انسانی رشتے سب کچھ تھک کر دیتا ہے۔ !!

المحجری

بیسویں صدی کے فرد کے آشوب اور فہم ذات اور انسان کی تنہائی اور پھر اس کے حوالے سے مابعد الطبیعیاتی مسائل کے بارے میں جس سطح پر رکے نے سوال اٹھائے اور کرب کو برداشت کیا اس کی مثال پوری عالمی شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ وہ بنیادی سوال جو فلسفے سے تعلق رکھتے تھے ان کو احساسات کی سطح پر شاعری کے وسیلے سے اپنے عہد کے انسان کی عالمگیر تنہائی کے تال میل سے رکے نے ایسی شاعری کی جس نے اسے دنیا کے صف اول کے شاعروں میں لاکھڑا کیا جان پینگ (PILLING) نے تو تفصیل سے اس کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ گوتے کے بعد جرمن زبان نے رکے جتنا بڑا شاعر پیدا ہی نہیں کیا۔ اور جب رکے کی شاعری کے مختلف ادوار اس کی ذات اور اس کے تخلیقی مسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے تو جان پینگ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر جب ہم آج کی یورپی اور عالمی شاعری پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بہت کم شاعر ایسے ہیں جنہوں نے رکے کی طرح جدید شاعروں کو متاثر کیا ہے۔

اپنی موت سے تین برس پہلے اس نے دس نوحوں پر مشتمل یہ عظیم شعری کتاب "ڈیولوز ایلمینز" شائع کی۔ یہ نوحے اس کی ذات کے آشوب اور اس تخلیقی جدوجہد کا آئینہ ہیں جس میں اس کے وہ مسائل شعری صدائیتوں کے ساتھ ملتے ہیں جن کا تعلق خدا اور موت اور انسان کے باہمی رشتوں سے بنتا ہے۔

رکے پراگ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک ریٹائرڈ آفسر تین فوجی تھا۔ اور

اس کی ماں کی خواہش تھی کہ وہ میٹھی کوچہم دے۔ بیٹا پیدا ہوا تو اسے بہت مایوسی ہوئی۔ ایک عرصے تک اس کی ماں اسے لڑکی سمجھ کر لڑکیوں جیسا لباس اور برتاؤ کر کے اپنی اس مایوسی کا خلاء بھرتی رہی۔ رکتے بچپن سے ہی بے حد حساس تھا اور جب اسے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑی تو وہ بے حد تکلیف میں مبتلا رہا۔ ایک تو اس کی صحبت اچھی نہ تھی دوسرے وہ فوجی تعلیم سے نفرت کرتا تھا۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۱ء تک وہ ملٹری سکول میں رہا۔ پھر اس نے کمرشل اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک رشتہ دار بیرسٹر کے ساتھ کچھ عرصہ کام کرتا رہا۔ ۱۸۹۴ء میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ۱۸۹۵ء۔ ۱۸۹۶ء میں وہ پراگ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ لیکن اس نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ قانون کی بجائے اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دے گا۔ وہ دوبارہ روس گیا اس کی سرزمین اور اس کے منظر نامے سے وہ بہت متاثر ہوا۔ روس یاترا کے زمانے میں ہی اس نے ٹالسٹائی سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس نے روسی تاریخ، ادب اور آرٹ کا مطالعہ کیا ۱۹۰۱ء میں اس نے ایک مجسمہ ساز عورت سے شادی کر لی۔ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں وہ پیرس میں میں عظیم مجسمہ ساز روڈن کا سیکرٹری رہا۔

رکتے بے چین طبیعت کا انسان تھا۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس نے سفر میں بسر کیا۔ ۱۹۱۵ء میں اسے وی آنا میں پھر فوجی سرورس کے لیے طلب کیا گیا جہاں اس کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ اسے کلرک تعینات کیا گیا۔ اور بالآخر میونخ جانے کی اجازت مل گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری برس سوئٹزرلینڈ میں بسر کیے۔ اسے جرنل کے سرطان کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور ۱۹۲۶ء میں وہ ویلیونٹ میں انتقال کر گیا۔

اپنی شاعری کی ابتداء میں ہی رکتے بڑے بڑے سوالوں سے الجھنے لگا۔ اس نے ایک بار اپنے ایک دوست کے نام خط میں لکھا تھا،

”حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کو اپنی زندگی میں دراصل ایک ہی آویزش کا سامنا اور تجربہ کرنا پڑتا ہے جو بار بار مختلف بھیس اور چہرے بدل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔“

رکتے کی ساری عمر جس آویزش کا شکار اور نشانہ بنی رہی وہ تھی تجربے کا خام مواد اور اس کی تخلیقی ہیئت۔ اس نے ۱۹۰۳ء میں ایک خط میں لکھا تھا،

میں نہیں چاہتا کہ زندگی اور آرٹ میں بور رہے۔ انہیں کسی طرح کسی مقام پر ایک ہی مسمیٰ کا حامل دیکھنا چاہتا ہوں۔

رکے کو ہمیشہ اپنی ذات کی تنہائی کا شدید اور کربناک احساس رہا۔ رکے کو خطوط لکھنے کی لت تھی۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے ہیں ان سے اس کی ذات اس کے تخلیقی اور شعری مسائل اس کی تنہائی اور آشوب کا ایک ایسا منظر نامہ دیکھنے میں ملتا ہے جس سے ہر دور کا لکھنے والا بہت کچھ سیکھ اور حاصل کر سکتا ہے۔ بچپن میں وہ کیتھولک عقیدے کا مالک تھا جسے اس نے بعد میں کیسے مسترد کر دیا تھا۔ اس کی شاعری اور اس کی ذات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لپٹے آپ کو بے حد تنہا سمجھنے لگا تھا۔ عقیدے سے انحراف اور نت نئے سوالوں نے اس کے دل کو اپنی آماج گاہ بنا کر اس کے اندر ایک ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جسے وہ ساری عمر اپنی شاعری اور تنہائی سے نبھوا کر مسائل سے پر کرنے کی کوشش کرتا رہا اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو رکے نے اپنی ذات اور شاعری کے حوالے سے انسانی ذات اور روح کے خلا کو ہی پر کرنے کے لیے جو جدوجہد کی وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ جس کی مثال کہیں کم ہی ملتی ہے۔

وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا ہر تجربہ اس کی ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا اور جس نے اپنی ذات کو مجتمع اور منظم کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اس کی ذات کے حوالے سے ٹارٹ لا یورڈس برگ کا ایک جملہ بہت اہم ہے جس نے رکے کے حوالے سے لکھا تھا۔

He was an Artist and hated the approximate.

رکے نے اپنے عقیدے کو توجیہ دیا تھا لیکن وہ ایک روحانی انسان تھا۔ ایک روح رکھنے والے سچے انسان کی طرح وہ روح کے مسائل کو سمجھنے میں ہمیشہ کوشاں رہا اور اس کا بھی داعی تھا کہ انسانی زندگی کو لازمی طور پر بدن چاہیے۔ اور اس نے زندگی کا وہ شعور حاصل کر لیا تھا جس کی بدولت رکے نے لکھا تھا۔

”ہم فوج کے بائے میں باتیں کرتے ہیں؟ تحمل ہی سب کچھ ہے۔“

اس نے روڈن کی موت اور ایک شاعر دوست کی خودکشی پر چونٹیں لکھی ہیں وہ زندگی اور موت کے حوالے سے اس کے نادر احساسات اور شعری تجربات کا احوالہ کرتی ہیں۔

رکے کی اس شعری تصنیف "نوز" کی اشاعت سے پہلے اس کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ جو اس کے تجربات اور احساسات کے منظر تھے۔ ان شعری مجموعوں نے اس کی شاعرانہ حیثیت کو استحکام بخشا۔ ان شعری مجموعوں میں "دی بک آف ہارورز" "دی بک آف ایجنڈا بنو پوینٹر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رکے کی بہت سی نظموں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے جن میں سے ایک ترجمہ جو پروفیسر احمد علی کا کیا ہوا ہے پیش خدمت ہے۔

اور پھر، اور
عشق کے منظر کیلئے دیکھے اور پھر اور۔
قبروں کے کتبے نوز کرتے نام بہ نام
ڈر کے مارے سہمے، ساکت، غار پہاڑ
جن میں روزِ شب مدغم ہو دیں آکے آخر، اور پھر ہم تم
دونوں ٹہلیں جا کر کہنہ سالہ پیڑوں کے نیچے ڈالے ہاتھ میں ہاتھ
یٹھیں ہم تم تھپو لوں کی آنکھوں میں۔ اور پھر
نکھر اسٹراچر خ نیلی۔ اور پھر، اور۔

سید ہادی حسن مرحوم کے بڑے تخلیقی کارناموں میں ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے براہِ راست جرمن زبان سے رکے کے نوزوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ "نیادور" میں شائع ہوتے میرے علم کے مطابق سید ہادی حسن رکے پر تفصیلی کام کے علاوہ "ڈیولوائیٹیز" کا ترجمہ بھی کتابی صورت میں شائع کرنے والے تھے مگر مرنے سے قبل ہی۔

ڈیولوائیٹیز

اکتوبر ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک رکے، ڈیولوائیٹیز میں اکیلا ہی رہا۔ ڈیولوائیٹیز ایک کوسٹ پر ایک قدیم قلعہ تھا جو رکے کی دوست شہزادی میری کی ملکیت تھا۔ یہیں اس قلعے میں جنوری

اور فروری ۱۹۱۲ء میں اس نے دوزخ لکھے جنہیں اس نے ڈیوڈ ایلیگز کانام دیا۔ تیسرا نثر اس نے پیرک میں ۱۹۱۳ء میں مکمل کیا پھر نثر میونخ میں ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ بالآخر فروری ۱۹۲۲ء سوئٹزر لینڈ میں شادوی موزوٹ میں مکمل ہوا۔ یہ چھوٹا سا نثر تیسرے کے قریب واقع تھا۔ رلکے ۱۹۱۹ء میں سوئٹزر لینڈ پہنچا تھا اور یہاں اس کے ایک فیاض دوست نے اسے پناہ دی تھی۔ یہاں اس نے اپنے ان عظیم دس نثروں کو لکھی تخلیق نہیں کیا بلکہ اسی زمانے میں اس نے ہچمن، سوسکس لڈ آرنیس، بھی لکھے۔

ڈیوڈ ایلیگز کو یارلکے کی ساری عمر کے کرب، شعری متاع اور اس کے جوہر اور تنہائی کا حامل ہے۔ اس کے شعری نظام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس نادر شعری مجموعے میں اس کی فکر اپنی اتہا کو پہنچی۔ یہ لڑے اس کے روحانی کشف کا مظہر ہیں۔ اس خفا کو بڑھاتے ہیں جسے خرد اس نے پیدا کیا اور پھر ساری عمر اسے بھرنے میں صرف کر دی۔

Then was it, Ohighest that you felt in me shame to know me. Your
ath went over me so that your severe and all embracing smile
sed into me.

ان نثروں میں رلکے کے طرز خاص Fragmentry Poeatry. کی جھلک بھی ملتی ہے اور اس کے علاوہ خاص بات یہ ہے وہ قاری جو اعلیٰ ترین سطح کی نثری شاعری کا مطالعہ کرنے کے خواہاں ہیں انہیں بھی رلکے کی شاعری اور بالخصوص "لوموں" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ رلکے کو ہمیشہ یہ مسئلہ درپیش رہا اور وہ اس سلسلے میں بڑے کرب کا شکار تھا۔ نظم میں وحدت کیسے پیدا ہو۔ نظم کی ریت اور معنی میں وحدت... اس نے اپنے مسائل کو ان گنت خطوط میں بیان کیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ڈیوڈ ایلیگز میں وہ اس تخلیقی مسئلے سے بچنگی اور کمال کے ساتھ، عمدہ برآہوتا ہوا ملتا ہے۔ رلکے کہا کرتا تھا کہ شاعر... ہر بڑا شاعر۔

شید پر اسرار Assaults of his God. میں رہتا ہے۔ ان نثروں کی تخلیق کے زمانے میں وہ اکثر اس شک و شبہ میں بھی گرفتار رہا کہ وہ کس حد تک کامیاب

ہوا ہے۔ اس زمانے میں اس نے بڑی صداقت کو بھی دریافت کر لیا تھا۔ جو اس کی ذات اور تخلیق کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

رکے نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

”ایک شخص اکثر اپنی ذات کو پالیتا ہے... زبان کے خارجی تنوع اور زندگی کے باطن

کے حوالے سے...“

زبان کو اس نے Speech Seed کا نام بھی دیا ہے اور یہاں مجھے حضرت

عیدی کے حوالے سے یاد آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ بعض بیج چٹاؤں پر گرتے ہیں اور ضائع ہو جاتے ہیں۔ رکے کے ہاں ان نوحوں میں Seeds of Speech کا زیاں نہیں ملتا۔

”ڈیولونڈ ایلمینز“ میں نمایاں تنوع ہے لیکن یہ ایک وحدت کا تاثر دیتے ہیں ان کا ایک بولتا ہوا۔

اشتراک ہے جس نے ”نوحوں“ کی شاعری کی توانائی کو ہمیشہ تازہ رکھا ہے اور پھر ان نوحوں

میں جو بعد الطبیعیاتی اور آفاقی مسائل ہیں انہوں نے نوحوں کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا ہے۔

”ڈیولونڈ ایلمینز“ کی شاعری ”توانائیوں کا رقص“ ہے۔ ان نوحوں میں رکے کے ہی الفاظ۔

Exposure on the Mountains of the heart. کی کیفیت ہے کیونکہ

رکے کی ”فریگنڈری“ شاعری کو یہ سہولت حاصل ہوئی کہ وہ زیادہ اور ہلکی ہوا میں سانس

لے سکے۔ ”نوحوں“ کی شاعری اپنے پڑھنے والے کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنا محاسبہ کرے اور اس

کے ساتھ ہی اس شاعری کا اعلان کرتے ہوئے شاعر کے کرب سے ہی حظ اٹھائے۔ رکے کی

اس انداز کی کئی مثالیں نوحوں سے دی جاسکتی ہیں۔ نوحوں کا ایک ٹکڑا ہے۔

Are we perhaps here, Simply to say, House, Bridge, Fountain, Door
Vessel, Fruit Tree, Window Tower. but to say and then understand m
as the things Them selves never tought so intensity to be.

ان نوحوں کو پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ حمد نامہ عتیق کی کتاب ”ایوب“ یاد آتی ہے۔ ایوب بنی

کے نوحوں کا کوئی اثر رکے کے نوحوں پر نہیں ہے لیکن ان کا تقابلی مطالعہ ایک عظیم تجربے کی

حقیقت رکھتا ہے۔

انسان، خدا، موت، اکائیات، مابعد الطبیعات کے حوالے سے فرد کی تنہائی، ذات کا آشوب
رکے کے لوجوں کے نمایاں عناصر ہیں۔ بعض نقادوں نے ان لوجوں میں رکے کے اس تجسس
کو نمایاں عنصر قرار دیا ہے۔ جس کے حوالے سے وہ آئیڈیل انسان کا تصور پیش کرتا ہے۔ یقیناً یہ
عنصر اور تجسس لوجوں میں موجود ہے لیکن یہ نمایاں ترین نہیں ہے بلکہ انسان کا زوال.....

More then ever thing fall away, that we can live for what occupie's
their place is deep without Image.

If they were to waken, the endlessly deep a symbol in us look
they should points perhaps at — The catkins of the empty hazels, the
drifting one's or bring to wind the rain which falls in the spring on
the dark earth and we to think happiness arising would then feel
that almost surprises us when what is happy falls.

رکے نے انسانی زوال کو منشاء سے رہائی قرار دیا ہے۔ جس کا اظہار ان لوجوں میں ملتا ہے۔
ہر بڑے اور لازوال فن پارے کی طرح۔ ڈیولونایلیجیر کے بارے میں بھی کسی مضمون میں پورا انصاف
نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ رکے کی عظیم شعری تخلیق اپنے قاری نے اعلیٰ اور نازک ذوق کا بھی مطالبہ کرتی
ہے اور پھر ایسی شاعری جس کے خالق نے ساری عمر اس کرناک تخلیقی جدوجہد میں بسر کر دی ہو کہ
زندگی اور آرٹ ہم معنی ہو جائیں اپنے قاری سے اور بھی بہت کچھ چاہتی ہے اور محسوسات انسانی
میں جو کچھ بھی یہ شاعری منتقل کرتی اور اس میں مدھانے کا سبب بنتی ہے اس کو لفظوں میں
بیان کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

رکے نے یہ ممکن کر دکھایا کہ آرٹ اور زندگی ہم معنی اور یک جان ہو سکتے ہیں اور اس عظیم
شاعر کے حوالے سے ڈیولونایلیجیر کے بارے میں چند آخری باتیں۔

رکے نے شاعری کو انسانی ضمیر سے گہرا اور قریبی تعلق رکھنے والی چیز قرار دیا تھا۔
”ڈیولونایلیجیر“ میں ضمیر کے ساتھ روح اور روحانی مسائل بھی شامل کیے۔ رکے کی شاعری
کی تقلید اور نقل نہیں ہو سکتی لیکن اس کے گہرے اثرات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جبکہ رکے
کے ان لوجوں کا پولش زبان میں ترجمہ ہوا۔ تو اس کے مترجم کو رکے نے ایک خط میں لکھا
تھا۔ اس خط میں ایک جگہ اس نے لکھا تھا۔

”زمین کے لیے اس کے سوا کوئی رنعم ابدل نہیں کہ ہم میں اپنا آپ چھپا لے۔ ہم صرف اور محض ہم ہیں... کیونکہ یہ ہم ہی ہیں جو ظاہر اور چھپے ہوئے کو اپنے اندر چھپا اور پناہ دے سکتے ہیں اور جوں جوں ہم اس ظاہر اور غیر ظاہر کو اپنے اندر پناہ دیتے ہیں توں توں ہماری اپنی ظاہری اور باطنی نشوونما بھی سوتی تر رہتی ہے... ”ڈیونو ایلیجز“ اسی ظاہر و غیر ظاہر کی شاعری ہے۔

مارسل پر دست کی موت پر رگلے نے ایک خط میں مارسل پر دست کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا...

The perfect tact of his analysis, which pitches no particular th
Play fully releases, the verything it seemed to cling to and still, ۱
almost unsurpassable precision everywher admits and makes allowi
for the ultimate mysteries

رگلے نے مارسل پر دست کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک ایک حرف خود اس پر
اور ”ڈیونو ایلیجز“ پر صادق آتا ہے۔

ولسٹ لیٹ

ایلیٹ نے کئی حوالوں سے شہرت پائی۔ نقاد کی حیثیت سے ڈرامہ نگار، مدیر اور خاص انداز کی بذہنی فکر کے حوالے سے، لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے اور ان کا سارا کام اگر پڑھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ ان کے سب سے عظیم اور فکر انگیز کام۔ شاعری کے گرد گھومتے تھے۔

ولسٹ لیٹ کی اشاعت سے پہلے ہی ایلیٹ خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے بعد میں انہوں نے بیسویں صدی کے چند گنے چنے بڑے شاعروں اور نقادوں کی فہرست میں اپنا شمار کر دیا۔ ان کی شاعری نے بیسویں صدی کو متاثر کیا۔ ان کے تنقیدی افکار کی بھی سارے زمانے میں دھوم رہی ہے۔ وہ اچھے ڈرامہ نگار تھے۔ لیکن شاعر اور نقاد ایلیٹ کے سامنے ڈرامہ نگار ایلیٹ دبا ہوا ٹھکانا دیتا ہے۔ مدیر اور پبلشر کی حیثیت سے بھی ایلیٹ نے عالمی ادب میں اہم خدمات انجام دیں۔

ایلیٹ کا پورا نام سٹامس سیڈنز ایلیٹ۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کو سینٹ لونی (امریکہ) میں پیدا ہوا۔ اور ابتدائی تعلیم کے بعد ہارڈ ویو نیورسٹی سے انگریزی ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۱۱ء میں وہ پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں پڑھتے رہے۔ ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۴ء میں وہ ہارڈ ویو نیورسٹی میں فلسفہ پڑھتے رہے۔ پھر ۱۹۱۴ء میں ماربرگ یونیورسٹی جرمنی میں بھی زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ آکسفورڈ چلے آئے۔ یہیں انورڈ نے ۱۹۱۵ء میں شادی کی۔ ایک ہائی سکول میں استاد رہے۔ اسی زمانے میں ان کی ابتدائی

نظمیں شائع ہوئیں۔

۱۹۱۷ء میں ایلیٹ لائبریریز بک کی فارن برانچ میں کلرک تھے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب ساگ آف جے الفریڈ پروفورک اور دوسری نظمیں شائع ہوئیں۔ اور ایلیٹ ادبی حلقوں میں ہانپے پھیلنے جانے لگے۔ اس دوران ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء میں وہ ESQUIST کے اسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے اور پھر ان کی شعری تصانیف عالمی ادبی آفت پر چھانے لگیں۔ اس دوران میں ان کی اہم نکلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۲۷ء ایلیٹ کی زندگی کا اہم سال ہے۔ اس برس انہوں نے ایٹنگو کیٹھوٹک عقیدے کو اپنایا۔ اور انگلستان میں شہریت کے حقوق حاصل کیے۔ شعری مجموعوں کے علاوہ مضامین کا مجموعہ (۱۹۳۱) لیوڈن پرنٹری اینڈ لیوڈن کرٹسزم (۱۹۳۳) میں شائع ہوئے۔ اسی دور میں ان کا ڈرامہ مرڈران کیٹھوٹک (۱۹۳۷) سیٹج ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ایلیٹ کی بیوی کا انتقال ہوا اور ۱۹۴۸ء میں ایلیٹ کو ب کا نوبل انعام دیا گیا۔ اس کے بعد ان کے کئی ڈرامے سیٹج ہوئے اور نوٹس ٹو وار ڈوے ڈیفینیشن آف کلچر (۱۹۴۹) میں شائع ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں ایلیٹ نے دوسری شادی کی۔ اور مری جنوری ۱۹۶۵ء کو لندن میں ان کا انتقال ہوا۔!

ایلیٹ کا شمار بیسویں صدی کے چند بڑے دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے نظریات و افکار کو بعض حلقوں میں رجعت پسندانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ صداقت بھی ہے۔ ان اس کے باوجود نہ تو ایلیٹ کی عظمت سے انکار کیا جاسکتا ہے نہ ہی عالمی ادب پر ان کے اثرات کو جھٹلایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ایلیٹ نے اپنے افکار و نظریات کا برملا اظہار کیا تھا۔ ایلیٹ نے لکھا تھا۔

”میرے عمومی زاویہ نگاہ کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ میں ادب میں کلاسیکیت سے شہنشاہیت اور مذہب میں کیٹھوٹک ازم پر ایمان رکھتا ہوں۔“

ایلیٹ کی بہت سی نظمیں بیسویں صدی کی عظیم شاعری میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین اور کتابوں کی بھی کم اہمیت نہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لکھا جاتا ہے کہ مگرولیسٹ لینڈ اس کا وہ تخلیقی کارنامہ ہے جو عالمی ادب کے گمے چھپنے

فن پاروں میں سے ایک ہے۔

”ویسٹ لینڈ“ طویل نظم ہے جو ۱۹۲۲ء میں پہلی بار ”کرائیڈرین“ کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ ”کرائیڈرین“ کا پہلا شمارہ تھا اور اس کا مدیر خود ایلیٹ تھا۔ لیکن یہ عظیم فن پارہ اپنی اشاعت سے پہلے کانٹ چھانٹ، نظر ثانی اور ترمیم کے ایک طویل مرحلے سے گزرا تھا۔ اور اس کو آخری اور حتمی شکل ایڈراپونڈ نے دی تھی۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۱ء میں اس منظم کے دو ابتدائی ڈرافٹل چکے ہیں جن کو ایلیٹ کی بیوہ نے مرتب کر کے شائع کرا دیا ہے ان دو ڈرافٹ اور شائع ہونے والی نظم میں تضاد ہے۔ اور ان کا تقابلی موازنہ بے حسد دلچسپ ہے اور بہت سے ناقدوں نے اس پر کام کیا ہے۔ جن میں برٹن رافیل کا کام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔

”ویسٹ لینڈ“ کی اصلاح ترمیم اور کانٹ چھانٹ کا فریضہ ایڈراپونڈ نے انجام دیا تھا اور جب یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی تو اس کو ”ایڈراپونڈ“ وی بی ڈورک مین کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ ایلیٹ حواہاں تھا کہ اس کی جو اصلاح اور حاشیہ آرائی اپونڈ نے کی ہے اسے بھی سمجھ سہی شائع کیا جائے۔ لیکن اپونڈ نے اس کی مخالفت کی اور اپنے ایسی غلطیوں کو بکھا۔ اپنے لفظ ”اپریل“ سے آخری لفظ ”شانسی“ تک یہ نظم کسی تعطل اور انقطاع کے بغیر دو اداں ہے اور ہم اسے انگریزی زبان کی طویل ترین نظم کہہ سکتے ہیں۔“

ایڈراپونڈ نے اس نظم کی تدوین، اصلاح، ترمیم اور کانٹ چھانٹ کے حوالے سے خود بھی ایک دلچسپ نظم لکھی تھی۔ جس میں اپنے اس عمل کو ”سیزرین آپریشن“ کا نام دیا ہے ایڈراپونڈ کی تدوین، ترمیم اور کانٹ چھانٹ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بعض نقادوں نے ایڈراپونڈ پر نظم کی ”ارضی حیثیت“ کو نقصان پہنچانے کا الزام بھی لگایا ہے۔ لیکن ایلیٹ ہمیشہ اپونڈ کا مداح رہا اور بہت زمانہ گزارنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں خود ایلیٹ نے اپنی نظم کے اس آپریشن کے حوالے سے ایڈراپونڈ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ایڈراپونڈ ایک شاندار اور بے مثل نقاد تھا۔ کیونکہ وہ کبھی آپ کو

رُخ اختیار نہ کرنے دیتا تھا کہ آپ اپنی ہی نقالی کرنے لگیں۔"

ایلیٹ نے اپنی اس نظم کا نام پہلے *HE DO THE POLICE IN DIFFERENT VOICES* رکھا تھا جو چارلس ڈکنز کی ایک کتاب کے ایک کردار سے مستعار لیا گیا تھا۔ ایڈرا پونڈ ہی نے نظم کا نام بدل کر ویسٹ لینڈ رکھا۔ ویسٹ لینڈ اپنی آخری شکل میں شائع ہونے سے پہلے ایک بکھری ہوئی نظم تھی۔ یہ پونڈ ہی تھا کہ جس نے اس کی شیرازہ بندی کے اسے ایک مکمل با معنی وجود بناتا۔

۱۹۲۲ء میں یہ نظم پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت پر طرح طرح کی آرا کا اظہار ہوا۔ ایملی لاول جیسے شاعر نے اسے "A PIECE OF TRIPE" کہا۔ ملٹن میری جیسے نقاد نے اسے فضولیات اور بے کار چیزوں کا انبار قرار دیا۔ ٹائمز کے تبصرہ نگار نے اسے ایک ایسی پیروڈی قرار دیا جو ہنرمندی کے فقدان اور بد ذوقی پر مبنی ہے۔ رچرڈ ایلمان نے لکھا۔ "لائیڈ بیٹک کے مشہور بیٹک کلرک نے سچاس برس کے بعد شاعری کی کرنسی کو نئی قیمت عطا کی ہے۔" جیمز جونس کو نظم کا اختتام خواتین کے لیے لکھی جانے والی شاعری جیسا محسوس ہوا۔

خود ایلیٹ نے ۱۹۲۳ء میں فورڈ میڈکس فورڈ کے نام ایک خط بھی لکھا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ویسٹ لینڈ میں میرے خیال میں تیس بہت اچھے مصرعے ہیں۔ یہ ایلیٹ کا انکسار تھا۔"

ویسٹ لینڈ، آہسان نظم نہیں ہے۔ لیکن یہ اتنی مشکل اور خوفزدہ کر دینے والی نظم بھی نہیں ہے کہ سمجھ میں نہ آسکے۔ تاہم بڑی شاعری کے کچھ اپنے مطالبات ہوتے ہیں۔ اور ویسٹ لینڈ کے بھی کچھ مطالبات ہیں۔ جن کے بغیر اس نظم کی پوری معنویت آشکار نہیں ہوتی۔ تلمیحات، علامتیں، تاریخی کردار اس نظم میں موجود ہیں جو اپنے پڑھنے والے سے پس منظر سے شناسائی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس نظم میں خود نوشت کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اور اعتراضات بھی جو بعد میں رابرٹ لودل، سیلیویا پلاٹن، این سیکن وغیرہ کی شاعری کا طرہ امتیاز قرار پائے۔

ولیسٹ لینڈ کے جدید شاعری پر اثرات بہت نمایاں اور گہرے ہیں اور پھر اب تک شاید ہی کوئی ایسی نظم لکھی گئی ہو جس میں موجودہ عہد کی شہری زندگی کو پیش کیا گیا ہو۔ بیلین وینڈلر نے تو ویسٹ لینڈ کو ایک عظیم دستاویزی فلم "بھی قرار دیا ہے۔

ایلیٹ کی یہ نظم ویسٹ لینڈ ۳۲۴ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اور پانچ حصوں میں منقسم ہے جو بعینت اور حسامت کے اعتبار سے مختلف اور غیر مساوی ہیں۔ اس کے پہلے حصے کا نام "مردوں کی تدفین" ہے اور پہلا مصرعہ "APRIL IS THE CRUELLEST MONTH"

ہے اور آخری مصرعہ "شانسی شانتی شانتی" ہے اور ویسٹ لینڈ کے پانچ حصے پانچ مختلف انداز کی محکات کی طرح ہیں۔ نظم میں ہمیں کئی کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے جو ہمارے عہد کے شہ کلبے مقصد بیزار کن زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں ہی ایک خاتون کو دیا ہے جو راتوں کو بہت پڑھتی ہے اور روز بروز یہی جنوب کے علاقوں میں چلی جاتی ہے۔ یہ خاتون دولت مند ہے اور بے مقصد زندگی گزارتی ہے۔ اس کے حوالے سے ایلیٹ نے طبقہ امریکی بے کار دولت مندی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں زندگی کو ایلیٹ نے شکستہ امیجر کا ڈھیر قرار دیا ہے۔ اور یہاں سمندر بھی سبز اور خالی ہے۔

رابرٹ لینگ بام نے "ولیسٹ لینڈ" کے حوالے سے لکھا ہے۔
 "ولیسٹ لینڈ" ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں انسانوں کے درمیان

ابلاغ و اظہار کا رابطہ ختم ہو چکا ہے۔

"ولیسٹ لینڈ" میں متعدد مقامات پر مکالماتی اظہار ہوتا ہے لیکن یہ مکالمہ مخاطب کے بغیر جزم لیتا ہے۔ بولنے والا اپنے آپ سے اور آس پاس کی دنیا سے مکالمہ کر رہا ہے۔ انسانوں سے نہیں۔ انسانوں کے درمیان جو اصل تعلق اور رابطہ ہوتا ہے۔ وہ اس پوری نظم میں کہیں جڑتا ہوا نہیں ملتا۔ ہارگر وونے "ولیسٹ لینڈ" کے بارے میں بہتر رائے دی ہے۔ ہارگر وونے لکھتا ہے۔

اس نظم میں شہری اور صحرائی علامتوں کے حوالے سے اس بیمار انسان کی زندگی کے پہلو اُجاگر کیے گئے ہیں جو آس مہذب اور جدید جہنم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس نظم کے کسی حصے ایسے ہیں جو اب حزب المتل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔
وہ لاش جسے تم نے پچھلے برس اپنے باغ میں کاشت کیا تھا، کیا وہ پھوٹنے
لگی ہے۔ کیا وہ اس برس کھل اُٹھے گی۔

شہر اس نظم میں UNREAL بلکہ سامنے آتے ہیں اور آغاز ہی میں موت کی آواز
سنائی دیتی ہے۔ اپریل ظالم ترین مہینہ ہے...
ڈیٹھ لینڈ کا دوسرا حصہ آگے گیم آن چھین ہے۔ اس میں جدید دور کا انسان ایسی
دنیا میں رہتا ہے جو ایلٹ کے بقول

” اور یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں مردہ انسان اپنی ہڈیاں کھو
بیٹھتے ہیں۔ “

جہاں انسان ہسٹریا میں مبتلا ہے۔ کچھ نہیں جانتا کہ کیا کرے۔
ہم کیا کرتے رہیں گے ہمیشہ

دس بجے گرم پانی

اور اگر بارش ہو جائے تو چار بجے ایک بندکار۔

اور ہم شطرنج کا کھیل کھیلتے رہیں گے۔

پلکوں سے محروم آنکھوں پر بوجھ ڈالے۔

دروازے پر دستک کا انتظار کرتے ہوئے۔

اور پھر اس کیفیت کا شدید ہذیبانی اظہار جو اس طرح جنم لیتا ہے۔

” اور اب میں کیا کروں گا۔

اب میں کیا کروں گا؟ “

تیسرے حصے کا عنوان آگ کا وعظ (فار سمرن) ہے۔ جہاں

دریا کا خیمہ ٹوٹ چکا ہے۔

پتوں کی آخری انگلیاں

گیلے ساحل سے چھٹی ڈوب رہی ہیں

چوتھے حصے کا عنوان - ڈیسٹ پانی واٹر ہے۔

پانچویں اور آخری حصے کا عنوان "WHAT THE THUNDER SAID" ہے اس آخری حصے میں پہلے سارے حصوں کے بھرے ہوئے تار - گویا یکجا ہو جاتے ہیں اس حصے میں کئی مذہبی حوالے بھی ملتے ہیں۔ جن کے حوالے سے بعض نقادوں نے "ولیسٹ لینڈ" کو ایک مذہبی نغمہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

• وہ جو زندہ تھا ...

اب مر چکا ہے ...

کا اشارہ حضرت مسیحؑ کی طرف قرار دیا جاتا ہے۔ اور پھر موت میں زندگی اور زندگی میں موت کو ہی سمودیا جاتا ہے۔

"ہم جو جے جا رہے ہیں۔ اب مر رہے ہیں
تھوڑے سے تحمل کے ساتھ۔"

یہاں پانی "سجات دہندہ بن کر نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن "ولیسٹ لینڈ" میں پانی بھی نہیں ہے اور عدد کی کڑک بانٹھ ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود تنہائی ممکن نہیں رہ پائی بلکہ ... کوئی ہے جو ہمیشہ تمہارے ساتھ پہلو پہلو چلتا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ عورت ہے یا مرد۔ لیکن وہ کون ہے جو تمہارے دوسری طرف چل رہا ہے؟

اس دنیا میں ٹاور گرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں پانی نہیں رہا۔ کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ غیر حقیقی شہروں کی دنیا ہے۔ میرٹھ، اسکندریہ، دی آنا، لندن سب غیر حقیقی شہر ہیں۔ اور ولیسٹ لینڈ، شہری اور انسانی مورڈٹی (OHOR BIDITY) کا موثر اور سنگین ترین انظہار بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود آخری مصرعے میں یہیں شانتی شانتی کی صدا سنائی دیتی ہے ...

ولیسٹ لینڈ کی معنویت، ہیئت، فنی پہلو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھ جانے گا۔ اس نغمہ کے حوالے سے ایلیٹ پر ویدانت اور تصوف کے اثرات کا بھی جائزہ لے

کیا اسے رحمت پسند بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ہنسی دہیوں اور رجحانات کی اس نظم کے حوالے سے تشریح و تفسیر کی گئی ہے۔ بلاشبہ ویسٹ لینڈ ایک عظیم فن پارہ ہے۔ میں آخر میں ڈیوڈ وارڈ کی رائے نقل کروں گا جو اس نظم کا میرے خیال میں بہترین تجربہ یہ پیش کرتی ہے۔

” ایک سطح پر یہ نظم جذباتی گورکھ دھندوں کا انحصار ہے۔ اور اس میں مختلف النوع جذباتی اختلاط کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ ذاتی ہی نہیں جن کا اطلاق ہر کہ دم پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظم میں جو غیر متوازن جذبات ہیں انہوں نے اسے قوت عطا کی ہے۔ ویسٹ لینڈ میں اس نفرت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جو اپنی ذات سے ہوتی ہے اور روح کو مسخ کر دیتی ہے۔ اور ہمارے دور میں انسان جتنا حیوان اور منافق بن کر سامنے آیا ہے۔ پہلے کبھی ایسا دکھائی نہ دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے پہلے اپنی ناکامیوں اور خامیوں کا اتنا شعور بھی نہ رکھتا تھا یوں دیکھا جائے تو کم از کم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ویسٹ لینڈ کلاسیکی رتبے کی حامل ہے اس میں ایک خاص اور یقینی انداز کی شہری اور تہذیبی موربڈٹی کا انحصار ایسی قوت اور توانائی سے ہوا ہے کہ جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس موربڈٹی کا انحصار براہ راست الفاظ میں عمل کے ذریعے ہوا ہے۔ محض اشاروں سے کام نہیں چلایا گیا۔۔۔۔۔“

کینٹوز

اور دن بھی پوری طرح مکمل اور کافی نہیں ہیں۔
 اور راتیں بھی اوصوری اور ناکافی ہیں۔
 اور زندگی یوں ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہے
 جیسے کھیت میں رہنے والا چوہا۔
 چلتا ہے تو گھاس تک کو حرکت نہیں ہوتی۔

زندگی کسی دور میں ایڈراپاؤنڈ کے لیے ناکافی اور غیر مطمئن صورت حال اختیار کر گئی تھی اور اس نے
 زندگی کے گزرنے اور حرکت کے عمل کو کھیت میں رہنے والے چوہے سے تشبیہ دی تھی جو اس طرح غیر
 محسوس طریقے سے حرکت کرتا ہے کہ گھاس تک اس کی حرکت سے ہلتا تک نہیں۔

لیکن جیسی زندگی ایڈراپاؤنڈ نے بسر کی اور جیسی شاعری اس نے کی، اس کو سامنے رکھیں تو
 انتہائی متحرک، فعال انسانی شخصیت سامنے آتی ہے۔ جس نے نہ صرف شاعری کو نئی جہتوں اور معنی سے
 روشناس کر لیا بلکہ اپنے عہد کے کتنے ہی شاعر اور لکھنے والوں کی اس طرح سر پرستی اور رہنمائی کی کہ
 ان پر ایڈراپاؤنڈ کے اثرات بہت گہرے دکھائی دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے اور اس میں کچھ ایسا شک و شبہ بھی نہیں کہ ایڈراپاؤنڈ بیسویں صدی کا سب
 سے بڑا شاعر تھا۔ اس کی شاعری کا منظر نامہ بہت وسیع ہے۔ شاعری میں اس نے زبان و بیان،
 ہیئت کے معنوی اور باطنی تجربے کیے۔ اس نے پہلی بار شاعری کی دنیا میں قدیم منطقوں کو دریافت
 کیا اور لریں شاعری کی کائنات کو وسعت دی۔ اس کے کینٹوز، دنیا کی عظیم شاعری کا ایک اہم حصہ ہیں

جس میں تمام شہری تجربوں اور باطنی معنویت کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی زندگی کے اہم اعمال اور توجہ کے علاوہ دنیا بھر کی قدیم و جدید شاعری کے اعلیٰ نمونوں کو منتقل دیکھا گیا ہے۔

ایڈراپاؤنڈ نے بڑی فعال، متحرک اور تھلکہ خیز زندگی بسر کی۔ اس نے بعض ایسے فیصلے کیے اور ان پر اس جرأت مندی سے عمل کیا کہ وہ بہت سی حکومتوں اور لوگوں کی نگاہ میں مستحب ٹھہرا اور اس کی خوب رسوائی ہوئی۔

ایڈراپاؤنڈ کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے اور خود اس کی اپنی شہری اور شہری شخصیات کے مطالعے سے میرا ایک تاثر یہ قائم ہوا کہ اگر وہ مستحب ٹھہرا اور اس نے بعض امور میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا تو اس کی بھی سٹوٹس و جہالت تھیں۔

ایک تو یہ کہ وہ اقتصادیات کی بہت سوچ بوجھ رکھتا تھا اور ابتدائی عمر میں ہی امریکی معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے سے وہ اس حقیقت کو باچکا تھا کہ امریکی نظام معیشت دنیا کے انسانوں کے لیے ایک لعنت اور عذاب سے کم نہیں اس کا اظہار وہ بر ملا کرتا رہا اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اگر وہ نازیوں کا حامی بنا اور نازی حمایت میں تقریریں کرتا رہا تو اس کا یہی سبب تھا۔

اور دوسری اہم بات جو مجھے ایڈراپاؤنڈ کے ہاں ملتی ہے وہ ہے موسیقی کے ساتھ اس کا ماہرانہ اور پُر خلوص لگاؤ۔ یوں تو اس کی شاعری میں ہی موسیقی کا عنصر تانا بنایا ہے کہ اسی سے موسیقی کے بانے میں اس کے پُر جوش طرز عمل کا ثبوت مل جاتا ہے لیکن اسے یہ بھی لگ رہا کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں موسیقی پوری طرح پُپ نہیں سکتی اور امریکہ اس لیے کوئی بڑا موسیقار پیدا نہیں کر سکا۔

ایڈراپاؤنڈ جتنا اہم اور بڑا شاعر تھا اتنا ہی اہم نقاد اور مترجم ہے۔ اس نے ایک بڑے نقاد اور شاعر کی حیثیت میں بعض ایسے سوال بھی اٹھائے ہیں جن کا جواب نہیں دیا جاسکا۔ اس میں اہمیت تو سوال کی ہوتی ہے جواب کی نہیں اور ایڈراپاؤنڈ کو اس کا بھرپور شعور حاصل تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ میں بعض ایسے سوال بھی اٹھانے چاہتا ہوں جن کا جواب خود نہیں معلوم ہو۔

ایڈراپاؤنڈ کا سن ولادت ۱۸۸۵ء ہے وہ امریکہ کے ایک سرحدی گاؤں میں پیدا ہوا۔ چند برسوں کے بعد اس کا خاندان فلاڈلفیا منتقل ہو گیا۔ اس باپ نیکسال میں ملازم تھا۔ مختلف شہروں کے

تعلیمی اداروں میں اس نے تعلیم حاصل کی۔ غالب علمی کے زمانے میں ہی اسے شاعری سے دل چسپی پیدا ہوئی جس کے اثرات اس کی ساری زندگی پر ملتے ہیں۔ ہسپانوی اور فرانسیسی شاعری کا بھی اس نے بھرپور مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں پاؤنڈ لندن آیا۔ جہاں سووم رومانی شاعری کے خلاف بھرپور صدا بلند کر رہا تھا۔ پاؤنڈ نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی جسے ایمجسٹ شاعری کی تحریک کہا جاتا ہے۔ وہ ٹریٹس جیسے بڑے شاعر کا سیکرٹری بھی رہا۔ ٹریٹس نے جلیوں کے ساتھ پاؤنڈ کی محبت کا بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ ٹریٹس کے اثرات بھی پاؤنڈ پر بہت واضح رہے، لیکن وہ بہت جلد اپنا انفرادی لہجہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

پاؤنڈ بہت جلد نئی شاعری اور نئے تنقیدی افکار کے حوالے سے معتبر اور رہنما شخصیت کا مقام حاصل کر بیٹھا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا قصہ عام ہے کہ پاؤنڈ نے کیسے ایلیٹ کے لیے چندہ جمع کیا کہ وہ بیک کی ملازمت سے آزاد ہو کر شاعری پر پوری توجہ دے سکے اور پھر اس نے ویسٹ لینڈ کو ترتیب دیا اور اس کی تصحیح کا فریضہ انجام دیا۔ ہینگوے نے اپنی کتاب اے موڈ ایبل فیٹ میں پیرس میں زمانہ قیام کے دوران میں پاؤنڈ کے حوالے سے کتنے ہی واقعات کا ذکر کیا ہے کہ پاؤنڈ نے کس طرح مختلف شاعروں کے لیے امداد کا انتظام کیا۔

ایڈر پاؤنڈ کی شاعری کا اہم ترین دور (۱۹۱۰ء) رہا ہے، جب اس نے مشرقی تہذیبوں اور مشرقی زبانوں کی شاعری میں گہری دل چسپی کا آغاز کیا۔ پرودا اس کی شعری روایت، ہسپانوی اور اطالوی شاعری سے وہ پہلے ہی بہت اچھی طرح واقف رہ چکا تھا۔ اس نے فارسی شاعری کو بھی سمجھے کی کوشش کی مگر جاپانی اور چینی شاعری میں اس نے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ اور ان زبانوں کی نمائندہ شاعری کے ترجمے کیے۔ اس نے موسیقی پر بہت کام کیا۔ دو اپنی بھی لکھے جن کا کمپوز بھی خود تھا۔ آرٹسٹس شیفز کی کتاب "ایڈر پاؤنڈ اینڈ میوزک" اس سلسلے میں بہت اہم ہے کہ موسیقی کے ساتھ ایڈر پاؤنڈ کو کتنی دلچسپی تھی۔ اور وہ خود کمپوز ہونے کے علاوہ موسیقی کا بہت اہم نقاد بھی تھا۔

ایڈر پاؤنڈ نے کنفیوشس سے گہرے اثرات قبول کیے، اور اس کے تراجم کیے قدیم جاپانی لوزہ (Noh) ڈراموں کے ترجمے کیے۔ اس کے نعروں کے کسی مجموعے اس کی زندگی میں شائع ہوئے۔ کنفیوژس کا سب سے بڑا شعری تخلیقی کارنامہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اینڈراپاؤنڈ ایک متنازعہ شخصیت بلکہ نمایاں ہوا۔ معاشی نظریات کے حوالے سے امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے بائے میں اس کے رویے کا مختصر ذکر ہو چکا ہے۔ امریکی نظام معیشت سے اسے جو نفرت تھی وہ فسطائیت کے ساتھ قربت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ امریکی یہودی سرمایہ داروں کے بائے میں اس کا رویہ کھلا دھلا تھا اور وہ ان سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے روم ریڈیو سے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ امریکی نظام معیشت کا کٹر مخالف بن کر سامنے آیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں نکلا کہ جنگ عظیم دوم کے خاتمہ کے بعد اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اسے امریکہ لایا گیا۔ جہاں اس پر مقدمہ چلا، اُسے ذہنی اور دماغی مرعین قرار دے کر دماغی اسپینال ہیمنیوڈیاگیا وہ کئی برس تک ہسپتال میں رہا اور ۱۹۵۸ء میں اسے رہا کیا گیا۔ اس زمانے میں بھی اس کے خلاف بہت پروپیگنڈا ہوا۔ اور اس کی رہائی کے لیے بھی جدوجہد جاری رہی۔ رہائی ملی تو اس نے امریکہ میں قیام کرنا پسند نہ کیا اور اٹلی کا رخ کیا۔ اپنی زندگی کے آخری برس اس نے بہت خاموشی سے بسر کیے۔ اس کی خاموشی کی بھی بہت شہرت ہوئی۔

اینڈراپاؤنڈ کی نثری اور شعری تخلیقات کے مجموعوں کی خاصی معقول تعداد ہے۔ تراجم اس کے علاوہ ہیں۔ اس نے سفولکلر کو بھی ترجمہ کیا۔ پرودائس شاعروں کو بھی بے کنفیڈنٹس، چین اور جاپان کے نمائندہ شاعروں کو بھی، ہندی شعراء بھی اس کے حوالے سے انگریزی میں منتقل ہوئے۔ اس کے خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں جہاں اس کے خطوط کا مجموعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ عالمی کلچر پر بھی اس کی کتاب بہت اہم ہے۔ عالمی ادب کے مطالعے کے سلسلے میں اس کی کتاب اے بی سی آف لٹریچر رہنما کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ جاپان کے کلاسیکی نوہ ڈراموں کا ذکر ہو چکا ہے اس کے ادبی مقالات بھی کیجا کر کے شائع ہو چکے ہیں۔

اینڈراپاؤنڈ کی نظموں کے کسی مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔ مفتوحہ نظموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اینڈراپاؤنڈ کا سب سے اہم کام اس کے کینیڈوز (CANZOS) سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کینیڈوز اس کی انفرادیت، شاعری میں اس کی حدت کے مظاہر ہیں۔ کینیڈوز دراصل ایک بڑی رزمیہ نظم کی طرح ہے۔ جسے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پاؤنڈ نے ان کینیڈوز کی تکمیل میں اپنی زندگی

کا ایک طویل عرصہ صرف کیا ہے۔

کینیٹوز کی شعری ہیئت، زبان اور اصول مختلف ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید عالمی شاعری پر چراشات ایڈرا پاؤنڈ کے نظریات شاعری اور بالخصوص اس کے "کینیٹوز" ہیں۔ ان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایڈرا پاؤنڈ کے کینیٹوز نے شاعری کو نئی جہتوں، اسالیب اور مطالب و معنی سے آشنا کیا۔ یہ کینیٹوز یقیناً اعلیٰ ذوق کے لوگوں کے لیے ہیں۔ بڑی شاعری کے مطالبات بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ان کینیٹوز میں جو حوالے آتے ہیں اس کو سمجھنے بغیر اس عظیم شاعری کی پوری معنویت اور وسعت سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ "کینیٹوز" میں وہ سب فلسفی، دانشور اور شاعر در آئے ہیں جن سے ایڈرا پاؤنڈ کو خاص نسبت اور محبت تھی۔

ان کینیٹوز میں اساطیری کرداروں کے حوالے نے بھی معنویت پیدا کی ہے۔ اس لیے جب تک پڑھنے والا اساطیری کرداروں کے بارے میں بنیادی معلومات نہ رکھتا ہو۔ کینیٹوز کی بڑی شاعری سے پوری طرح کلفت اندوز نہیں ہو سکتا۔

"کینیٹوز" کا دائرہ صدیوں اور زمانوں پر محیط ہے شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس کا ذکر یا اشارہ ان کینیٹوز میں موجود نہ ہو۔ ایڈرا پاؤنڈ کے اپنے سیاسی اور معاشی نظریات تک مختلف حوالوں سے ان کینیٹوز میں ظہور کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ایڈرا پاؤنڈ کی اپنی ذات اور تجربات بھی ان کینیٹوز میں پوری طرح موجود ہیں۔ اس کی سوانح عمری مرتب کرنی ہو تو "کینیٹوز" اس سلسلے میں بھی بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ان کینیٹوز کا بنیادی موضوع انسانی تقدیر اور تدبیر ہے اور ان کے حوالے سے جو مسائل جنم لیتے ہیں اور جو سوال ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ کینیٹوز میں پوری شجرت کے ساتھ اپنا ظہور کرتے ہیں۔ کینیٹوز کا مطالعہ ایک عظیم تجربے کی حیثیت رکھتا ہے یہ ایسی شاعری ہے جسے ایک سانس یا ایک نشست میں پڑھا نہیں جاسکتا۔ یہ شاعری آہستہ آہستہ تک تک کھور کر کے پڑھنے کا مطالبہ کرتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے اسرار کھلتے ہیں اور اس کی معنویت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کینیٹوز کی شاعری بیسویں صدی کا سب سے اہم شعری کارنامہ ہے اور اس کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے.....!!

جاوید نامہ

علامہ اقبال کی ہر تصنیف شعری حسن فکر، تجزی اور فلسفے کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے اس کا اندازہ اقبال کے ہر سنجیدہ قاری کو ہے لیکن شعری ہیئت میں علامہ اقبال کی سب سے اہم تصنیف "جاوید نامہ" ہے۔ فارسی زبان میں لکھی جانے والی یہ کتاب جہاں یونانے شعر و فکر کی ایک روایت کی اہم ترین کڑی ہے وہاں اپنی جگہ اس کا ایک ایسا بلند اور انفرادی مقام ہے جو دنیا کی بہت کم کتابوں کو حاصل ہوا ہے۔

جاوید نامہ کا سن اشاعت ۱۹۳۲ء ہے۔ یہ اقبال کے دور آخر کی یادگار تصنیف ہے۔ جب ان کا فن، ان کی فکر و فکر کے کسی مدارج طے کر کے اپنی انتہائی پختگی اور بلندی کو پہنچ چکی تھی۔ جاوید نامہ کے حوالے سے میں علامہ اقبال کی زندگی کے حالات بیان نہیں کروں گا بلکہ اقبال کے عہد کے بارے میں چند اہم نکات کی نعت اندر ہی ضروری سمجھتا ہوں۔ بظاہر مسرابہ دعویٰ بہت سے لوگوں کے لیے مبالغہ آمیز ہو لیکن میں یہ دعویٰ بڑے یقین سے کر رہا ہوں کہ برصغیر پاک و ہند بلکہ پورے بڑے ایشیا، میں آج تک کوئی ایسا شاعر اور فلسفی پیدا نہیں ہوا جو اقبال جتن پڑھا لکھا ہو۔ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو بے حد اہم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جہاں اقبال پڑھیں وہاں کام ہوا ہے اور تشنگی محسوس کی جاتی رہے گی۔ علامہ اقبال کو مغرب و مشرق کے قدیم و جدید فلسفے اور فکر پر پوری دسترس حاصل تھی۔ اقبال اپنی زندگی کے آخری سانس تک علم کے جوہار ہے۔ ان کے خطوط میں سینکڑوں ایسے خطوط ہیں جن میں انہوں نے کتابوں کا ذکر کیا ہے اور کتابوں کی فرمائش، اقبال اپنی پوری زندگی میں پوری جی مسکراتے کے امین تھے۔ جتنا کچھ انہوں

نے پڑھا برصغیر پاک و ہند کے کسی شاعر نے نہیں پڑھا۔ قدیم و جدید فکر و فلسفے کے امتزاج سے اپنی شخصیت کو ایسی بلند لیں پر لے گئے کہ جہاں آج تک علامہ اقبال کی دفات کے بعد بھی کوئی نہیں پہنچ سکا۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ اقبال کو کیسا حمد ملا جس حمد میں اقبال نے آنکھ کھول لی اور وہ پھر اس دنیا سے رخصت ہوئے اس حمد میں دنیا کی فکری اور سائنسی اعتبار سے نئی صورت گری کا عمل فروغ پا چکا تھا....

قدیم فلسفیوں اور شاعروں کو چھوڑیے۔ جن سے اقبال پوری طرح آشنا تھے اور ان کے کام کے بارے میں اپنی متوازن رائے رکھتے تھے۔ ان کے اپنے حمد پر اک نگاہ ڈالیے اردو شاعری غالب تک پہنچ چکی تھی۔ انہماں فکر کے نئے سانچے واصل چکے تھے۔ رشید عبدالقادر مرحوم نے باگ و درایم غالب کے حوالے سے اقبال کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ فکرائیز نکتہ ہے۔ خود اقبال مغرب مشرق کے علوم اور فلسفے سے بہرہ ور تھے۔

اقبال نے پہلی جنگ عظیم کو دیکھا جمعیت اتروم کی مجلس کا قیام بھی دیکھا اور اس کی بے قیمتی اور بے اثری کو بھی جاننا آج کی جدید دنیا جو کچھ ہے اور جن ذہنوں نے اسے ڈھالا ہے ان کے سب فلسفے اور افکار اقبال کی حیات میں نمایاں ہو چکے تھے۔ کارل مارکس جدیدیات اور نئے نظام کا فلسفہ پیش کر چکا تھا۔ لینن روس میں انقلاب لا چکا تھا۔ اس کی بازگشت اور رد عمل اقبال کی نظموں میں ملتی ہے، فرائیڈ۔ نفیحات و جنس کے نظریات پیش کر چکا تھا۔ در خیالات میں فرائیڈ اور نغریہ جنس کے حوالے سے علامہ اقبال نے جو مزاج تحسین پیش کیا وہ ریکارڈ پر ہے۔

آئین سائنس کا نظریہ اضافیت لاری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ نطشے ۱۹۰۰ء میں دنیا کو اپنے فلسفے کی متاع دے کر رخصت ہو چکا تھا۔ برگساں سے اقبال خود ملاقات کرتے ہیں۔ ادھر گراں خواب چینی بھی سمجھنے لگے تھے اور افریقہ اور ایشیا کی اقوام غلامی کے خلاف احتجاج کرنے لگی تھیں۔ برصغیر میں آزادی کی جدوجہد عروج پر تھی اور خود اقبال مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا تصور ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں پیش کر چکے تھے۔ نازی ازم اور فاشیزم

نے یورپ میں اپنے قدم جمالیے تھے اور اقبال نے موسیقی سے ملاقات کی تھی۔ اضطرابِ آئینہ بزم اور یقین کے اس عہد میں اقبال انسانی فکر کے تمام اہم کارناموں سے آشنا ہو چکے تھے۔ اور اقوامِ مشرق کو نوید آزادی دے رہے تھے اور دوسری جنگِ عظیم چھڑنے کے امکانات بھی اقبال پر واضح تھے۔

اقبال کی فکری بصیرت کو کوئی دوسرا شاعر اور فلسفی نہیں پہنچ سکا، اس سچنگی عمر اور فکر کے دور میں جاوید نامہ، منصفہ شہود پر آتا ہے۔ جاوید نامہ عالمی ادب کا عظیم شعری اور فکری فن پارہ ہے۔ دنیا کی سب بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اردو میں کئی تراجم ہوئے ہیں جن میں رفیق خاور کا ترجمہ بہتر ہے، کئی مقامی زبانوں تک میں 'جاوید نامہ' کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

جاوید نامہ میں انسانی فکر اس بلندی تک پہنچ جاتی ہے کہ جہاں بیزاں بر شکار آمد لے بہت مردانہ کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اقبال کے ہاں 'جاوید نامہ' کے حوالے سے آدمی اور بشر کو جو مقام دیا گیا ہے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے کہ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے

کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

'جاوید نامہ' کا منبع، سرچشمہ اور بنیاد۔ معراجِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے معراجِ

نبوی سے جو روایت بنتی ہے اس میں جاوید نامہ کا عظیم الشان مقام ہے۔

انسانی تاریخ میں یہ حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی معراج تھا کہ جس نے نہ صرف مسلمان شاعروں اور فلسفیوں کو اس موضوع کو اپنانے کی تحریک عطا کی۔ بلکہ غیر مسلموں نے بھی واقعہ معراجِ نبوی سے فیض اٹھایا۔ اس سلسلے میں ایک حوالہ شیخ بائزید بسطامی کا ہے جنہوں نے تیرہویں صدی ہجری میں اپنے مریدوں کو اپنے روحانی سفر کی روداد بیان کی۔ اس عربی روداد کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔

حسین بن منصور علاج کی مشہور عالم کتاب "الطواسین" میں "طاسین محمدی" میں بھی

روایات معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر ملتا ہے۔ ابوعلی سینا نے بھی اپنے دور رسالوں رسالۃ الطب اور رسالۃ الروح میں روح کے سفر عالم بالا کا ذکر کیا۔ ابوہریرہ شہید ائمہ سی نے رسالۃ التوابع والذوالجہ میں شعراء و ادبا کی روحوں کے سفر کا حال تخلیقی سطح پر کیا ہے۔

لیکن اس روایت میں جو اہم تصنیف ہے وہ ابو العلاء المعری کی تصنیف 'رسالۃ العنقران' ہے۔ (اقبال نے ابو العلاء المعری پر جو نظم لکھی ہے وہ قابل توجہ ہے) شیخ عسکری "منطق الطیر" کا حصہ ہفت وار بھی اسی موضوع کو لیے ہوئے ہے۔

اس کے بعد شیخ اکبر بن عربی کی "فتوحات مکیہ" اہم ترین تصنیف ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے حوالے سے ذرا آگے چل کر بات ہوئی ہے۔ اس سے پہلے "اردو پیران نامہ" کا ذکر ضروری ہے یہ تصنیف ایک زرتشتی عالم کی تصنیف ہے جو زبان پہلوی میں رقم ہوئی۔

اس کی شان نزول بہت دلچسپ ہے کہا جاتا ہے کہ یہ زرتشتی عالم سرور میں سٹھا کسی نشتے کی بدولت سیر افلاک کی اور جب وہ عالم ہوش میں آیا تو اس نے عالم سرور میں جو کچھ دیکھا سٹھا اسے بیان کر دیا... لیکن اس خواب میں اس نے جو کچھ دیکھا اس میں معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات بہت نمایاں ہیں۔ بعض محققین ایک عرصے تک اس غلط فہمی اور مغالطے کا شکار رہے کہ یہ کتاب معراج نبوی سے پہلے کی تصنیف ہے لیکن اب یہ مغالطہ دور ہو چکا ہے۔

اس روایت میں جس کتاب نے عالمگیر شہرت حاصل کی وہ دانستے کی ڈیوان سن کامیڈی " ہے

ڈیوان سن کامیڈی کے حوالے سے اقبال کے جاوید نامہ کے بارے میں جو ناسخ اخذ کیے اور واقعہ معراج نبوی صلعم اور اس کے بعد ابن عربی کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

جاوید نامہ، نگر انسانی کی معراج ہے۔ مولانا اسلم جبراجپوری نے لکھا تھا کہ فردوسی کا شاہنامہ مولانا رومی کی مثنوی، سعدی کی گلستان اور دیوان حافظ کے بعد جاوید نامہ، فارسی شاعری میں بڑی اور اہم کتاب ہے۔ میں اسے روایت معراج نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے سیر افلاک کے موضوع پر لکھی جانے والی تصانیف میں سب سے اہم کتاب قرار دیتا ہوں۔

خطاب بڑ جاوید (سننے بڑنشاؤرز) کے علاوہ جاوید نامہ دو ہزار کے لگ بھگ اشعار پر مشتمل ہے۔ زندہ رود جو اقبال خود میں۔ دو مولانا رومی کی رہنمائی میں سفرِ فلک کرتے ہیں۔ دانسنے کا مقصد سفرِ ارواح و فلک۔ اپنی محبوبہ کا دیدار تھا جو دیدارِ خداوندی پر ختم ہوا۔ دانسنے نے درجہ بل کو اپنا رہنا بنایا تھا۔ لیکن اقبال۔ پیر رومی کو رہنما بناتے ہیں اور ان کا مقصد عالمِ ارواح کی سیر ہے۔ درمیانی وسیلہ۔ جیسے باہر تپے دانسنے کے ہاں ہے۔ یہاں نہیں بنایا گیا۔

جاوید نامہ کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے اور اختتامِ خطاب بڑ جاوید (سننے بڑنشاؤرز) پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمہید آسمانی، روزِ ازل زمین کی آسمان پر طعنہ زنی ہے۔ پھر نغمہ ملائکہ ہے۔ اس کے بعد زمینی تمہید ہے جس میں پیر رومی کی روح ظاہر ہوتی ہے۔ زردان۔ زمان و مکان کی روح مسافر کو عالمِ بالا کی سیر کراتی ہے۔ اس کے بعد زمزمہ انجم ہے۔

فلکِ قرمی بندوشی و شواسترا جہانِ درست سے ملاقات ہوتی ہے۔ جلوہ سردوش کے بعد وادی سیر حمیدہ کی سیر ہوتی ہے جسے ملائکہ وادی طواسین کا نام دیتے ہیں۔ اس کے بعد طاسین گوتم ہے جہاں رقاہدہ تائب ہوتی ہے طاسین زرتشت میں ابرمن کی بددلت زرتشت کی آزمائش بیان ہوتی ہے۔ طاسین مسیح میں ٹالسٹائی کا خواب ہے۔ اور طاسین محمدؐ اور خانہ کعبہ میں روح البوجہل کا لوجہ۔

فلکِ عطار و میں زندہ رود۔ جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح کی زیارت کرتا ہے۔ فلکِ عطار و میں دینِ وطن، اشتراکیت اور ملوکیت، مشرق و مغرب، عالمِ قرآنی محکمات، اختلافِ آدم، حکومتِ الہی، زمینِ خدا کی ملکیت ہے حکمت خیر کثیر ہے پر اظہارِ خیال کے علاوہ روسی قوم کے نام جمال الدین افغانی کا پیغام ہے اور زندہ رود کی غزل۔

فلکِ زہرہ میں خدایانِ قدیم کی انجمنِ نغمہ بعل دریا نے زہرہ میں غوطہ زن فرعون اور کچن کی روجوں سے ملاقات کے علاوہ درویش سوڈانی کا اظہار ہوتا ہے۔

فلکِ مریخ میں اہل مریخ، پھر مریخی انجم شناس کی رصد گاہ سے آمد، شہرِ مریخ کی سیر اور دوشیزہ مریخ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ جس نے رسالت کا دعوے کیا تھا
فلکِ مشتری میں، علاج، غالب اور قرق العین ظاہرہ کی مضطرب روجوں سے ملاقات

اور مکالمہ ہے جو گردشِ پیہم میں دلدادہ ہیں اور جنت میں قیام ان کے لیے پسندیدہ نہیں ہے، فلکِ مشرقی میں زندہ زواہن ارواح سے اپنے مسائل بیان کرتا ہے اور یہیں خواجه اہل فراق (ابلیس) کی آمد ہوتی ہے جو مکالمہ کرتا ہے ابلیس کے بارے میں اقبال کا جو تصور ہے وہ یہاں بہت نمایاں ہوتا ہے فلکِ زحل میں وہ ذلیل روحیں بستی ہیں جنہوں نے ملکِ دولت سے غداری کی۔ اور وزخ بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں جعفر صادق ہیں جو غداری کی وجہ سے۔

”نگاہِ آدم، نگاہِ دیس، نگاہِ وطن، نگاہِ زمیں“ ہیں۔

فلکِ زحل میں قلمِ خونیں ہے اور یہیں ہندوستان کی روح نمودار ہوتی ہے۔ اور نالہ و شہون کرتی ہے اور اس جزئی سمندر کے ایک کشتی نشین کی فریاد بھی شامل ہے۔

اس کے بعد کا حصہ آں سوائے فلکِ مکے عنوان سے ہے۔ جہاں نطشے کے مقام کا بیان ہے۔ جنت الفردوس شرف النساء کا دیوان، سید علی ہمدانی، ملا طاہر غنی کشمیری بھرتی ہری سے ملاقات ہے سلاطینِ مشرق کے ایوانوں کی نقل و حرکت کا بیان ہے۔ ناصر خسرو و علوی کی روح کا ظہور ہے جو غزلِ مستانہ سا کرخصت ہو جاتی ہے۔ سلطانِ میو پشید کا پیغام ہے اور اس کے حوالے سے شہادت کی حقیقت کا بیان، پھر وہ لکھ ہے۔ جب زندہ رود کو فردوس سے روانہ ہونا ہے۔ اور حورانِ بہشتی اس سے غزلِ سنانے کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور زندہ رود غزلِ سنانا ہے آفری حصہ محفوظ ہے۔

خطابِ جاوید، جاوید نامہ سے مربوط نہ ہونے کے باوجود ربطاً معنوی رکھتا ہے اقبال جاوید اپنے پسرا کو وسیلہ بنا کر نژاد نو سے مخاطب ہوتے ہیں۔

ایں سخن آراستن بے حاصل است

بر نیاید آئینچہ در قعرِ دل است

اس حصے میں اقبال نے اپنے کلام کی اہمیت اور اپنی ساری کاوش کی تاثیر بیان کرتے ہوئے ہر زمانے کی نئی نسل کو تلقین کی ہے کہ ان افکار کو سمجھا اور اپنایا جائے۔

جاوید نامہ۔ ہر دور کی کتاب ہے۔ ہر بڑی کتاب کی طرح جو انسانی فکر و خیال اور احساسِ جمالیات کو ہمیشہ ہر دور میں سیراب کرتی رہتی ہیں۔ اقبال ماضی سے سرمایہ اندوز ہوتے ہوئے

حال کی حقیقتوں کی نشاندہی اور سیرابی کرتے ہوئے مستقبل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو جاوید نامہ بنی نوع انسان کے ماضی حال اور مستقبل کے مقدر کی نشاندہی کرتا ہے۔ جاوید نامہ کے فکری پہلوؤں اور اقبال کے نظریات کا احاطہ کرنے کے لیے کئی کتابوں کی ضرورت ہے۔ بطور خاص جاوید نامہ کو سمجھنے کے لیے جہاں انسانی فکر کی رسائی کا شاعر کی فکر کے ساتھ تطابقت رکھنا یحییٰ حیدر ضروری ہے۔ وہاں ان شخصیات اور مقامات کا شعور بھی ناگزیر ہے جن کا ذکر جاوید نامہ میں ہوا ہے۔ جاوید نامہ ایک ایسی عظیم تصنیف ہے جس کے معنی کا جہان بہت گہرا، بسیط اور وسیع ہے۔ یہ کتاب اپنے قاری سے مطالبہ کرتی ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ اور اس کے معنی کی تہ میں اتنے کے لیے مسلسل غور و فکر سے کام لیا جائے۔

”جاوید نامہ کے حوالے سے انسان کا جو تصور اُبھرتا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کے ہاں انسان کا جو تصور ہمیں جاوید نامہ سے پہلے ملتا ہے وہ جاوید نامہ میں اپنی انتہائی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے کہ آدم خاکی کی رسائی عالمِ انلاک تک ہے۔ وہ تقلید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کرے تو بلند لیوں اور عظمتوں کی انتہاؤں کو چھوڑا اور پاسکتا ہے۔

جاوید نامہ صرف ہمارے قومی شاعر اقبال اور زبان فارسی کا ہی عظیم فن پارہ نہیں بلکہ فکر و خیال، فلسفہ اور عشق رسول صلعم کے حوالے سے بھی ایک منفرد اور ہمیشہ زندہ رہنے والا تخلیقی کارنامہ ہے۔ اور اپنی منفرد شعرت اور روایت کے حوالے سے جاوید نامہ عالمی ادب کا عظیم لازوال فن پارہ ہے۔

فیری ٹیلز

جل پری کے مجسمے کا کسی نے سر توڑ کر چرایا، تو صورت ڈنمارک بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی جس نے پوری دنیا کے بچوں کو اُداس کر دیا۔ کئی بچے تو بفر پڑھنے کے بعد بے ساختہ آنسو بہانے لگے تھے۔ اس جل پری کی کہانی نے برسہا برس سے کئی نسلیں کو متاثر کیا تھا اور کہانی کے اس کردار کو ایک مجسمہ ساز نے مجسمے میں ڈھال دیا۔ اور اسے ساحل سمندر پر نصب کر دیا تھا تب سے دنیا کے ان گنت لوگ روزاً اس جل پری کے مجسمے کو دیکھنے کے لیے وہاں پہنچتے تھے۔ وہ اسے محبت اور عقیدت سے دیکھتے اور انہیں جل پری کی وہ کہانی یاد آجاتی جو نہیں ان کے کسی دادا، دادی یا نانا نانی یا باپ یا امی نے سنا ہی تھی۔ اور پھر انہوں نے اس کہانی کو خود کئی بار پڑھا تھا۔ اور اپنے بچوں کو سنا یا اور پڑھایا تھا۔

ہینس کرسچین اینڈرسن کی کہانیاں دنیا بھر میں مقبول ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسی زبان نہیں جس میں ان کہانیوں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی ماں یا نانی ہوگی جس نے اپنے بچوں کو اینڈرسن کی کوئی کہانی نہ سنی ہو۔ یہ کہانیاں پوری انسانیت کا ورثہ بن چکی ہیں۔ مقامی طور پر ان کہانیوں میں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ بہت سے بڑے جب کہانی سناتے ہیں تو انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ جو کہانی سن رہے ہیں۔ یہ دو دویس کے رہنے والے ایک غیر ملکی ہینس کرسچین اینڈرسن نے لکھی تھی۔

اینڈرسن خود اپنی فیری ٹیلز FAIRY TALES کی طرح ایک کہانی ہے۔ وہ

اپنی عمر کے آخری دور سے پہلے تک یہی سمجھتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کے ناولوں اس کے افسانوں اور شاعری کی وجہ سے عالمگیر اور ابدی شہرت حاصل ہو۔ لیکن اسے جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کہانیوں کی بدولت ملی۔ جو اس نے صرف پیسے کمانے کے لیے بچپن کے لیے لکھی تھیں۔

اینڈرسن ایک ایسا انسان تھا جو محبت سے مدد توں ہمک محروم رہا اور جب اسے محبت ملی تو اتنی ملی کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کی کہانیوں کے کردار زندہ جاوید ہو چکے ہیں۔ انسانی تہذیبوں میں رچ بس چکے ہیں۔ حالانکہ یہ تہذیبیں بہت مختلف ہیں ان کے عناصر ترکیبی ہیں بہت کم مماثلت پائی جاتی ہے لیکن اینڈرسن کی کہانیوں نے دنیا کی ہر نسل اور ہر ملک کے بچپن کو ایک وحدت اور اکائی میں پرو دیا۔ ہے۔

یہی کارنامہ اسے زندہ جاوید کر گیا ہے امر اور لازوال!

ہینس کرسمپن اینڈرسن ۲ اپریل ۱۸۰۵ کو فیونن آئی لینڈ کے قصبے اودنسنے ڈنمارک میں پیدا ہوا۔ وہ اپنی پیدائش کے وقت ہی ایک بد صورت بچہ تھے۔ بد صورتی اور کج صورتی نے ساری عمر اس کا ساتھ چھوڑا۔ اور اسے طرح طرح کی محرومیوں میں مبتلا کر دیا۔ وہ ایک موچی کا بیٹا تھا اور گھر کے حالات تسلی بخش نہ تھے۔ اینڈرسن کا پچھن ناداری اور عزت میں بسر ہوا اور پھر تقدیر نے اپنا دار کیا۔ اچھی اینڈرسن لڑکپن میں ہی تھا کہ اس کا والد مر گیا۔ گھر کے حالات ایسے تھے کہ اینڈرسن کو لڑکپن ہی میں ایک نیکڑی میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اپنی بد صورتی، اپنی محرومیوں اور عزت کی وجہ سے وہ لوگوں سے گھل مل نہیں سکتا تھا۔ اس کے مزاج میں اشتعال بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی عملی زندگی کی راہ میں کئی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ جن کا بہت حد تک وہ خود فے دار نہ تھا۔ بلکہ اس کی بد صورتی اور خارجی ماحول تھا۔

اپنی بد صورتی اور کم آئینی کے باوجود اس نے اپنے کچھ مزاج پیدا کر لیے۔ اس کی آواز بہت خوب صورت اور شیریں تھی۔ وہ جب گاتا تھا تو لوگ اس کا گیت سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ یوں اس کی آواز کے سحر نے اسے پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا۔

اینڈرسن نے فیصلہ کیا کہ اپنی اس شیریں آواز سے اُسے فائدہ اٹھا کر عملی زندگی میں نام اور مقام پیدا کرنا چاہیے۔ اس فیصلے کے تحت اس نے کوپن ہیگن کا رخ کیا۔ تھیٹر اور والوں نے اس کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ جس سے اینڈرسن کو شدید مایوسی ہوئی۔ اس نے گلوکاری کے علاوہ اداکاری کے شعبے میں بھی آنے کی کوشش کی لیکن اس کی صورت، اس کے اطوار، اس کی نا تجربہ کاری اس کی راہ کی رکاوٹ بن گئے اور یہاں بھی اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اس عرصے تک اینڈرسن کچھ نظمیں لکھ کر لوگوں کی توجہ اپنی شاعری کی طرف مبذول کرا چکا تھا۔ وہ لوگ جو اس کے سرپرست اور بہر دہتھے وہ اینڈرسن کے مستقبل کے بارے میں خاصے سنجیدہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے بادشاہ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی جس میں اینڈرسن کی مدد کے لیے استدعا کی گئی تھی۔ بادشاہ نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے اینڈرسن کو سرکاری خرچ پر ایک سکول میں داخلہ دلوا دیا۔ اور اس کے لیے یہ نصاب متعین کیا گیا کہ وہ اپنا مطالعہ جاری رکھتے ہوئے اپنی تصنیفی صلاحیتوں کی تکمیل کرے۔

اینڈرسن جسے آج دنیا بھر کے بچوں کا محبوب ترین مصنف تسلیم کیا جاتا ہے۔ ادبی دنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے وارد ہوا۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۸۲۳ء میں شائع ہوا۔ جب اس کی عمر پچیس برس تھی۔ ۱۸۲۱ء میں اس کا دوسرا مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اب وہ ادبی حلقوں میں خاصا جانا پہچانا جانے لگا تھا۔ بادشاہ بھی اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی کا معترف تھا۔ ۱۸۲۳ء میں بادشاہ نے اس کی سیر و سیاحت کے لیے خصوصی اعانت کی۔ اینڈرسن کو بادشاہ نے سفر کے اخراجات کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا اور یوں اینڈرسن جو مینی، سوئٹزر لینڈ، روم اور میلز کی سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس سیاحت سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس کے مشاہدے اور تجربے میں اضافہ ہوا۔ اس نے واپس آ کر ایک سفر نامہ بھی لکھا۔ اب وہ شاعری کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کرنے لگا تھا۔ جب ۱۸۲۶ء میں اس کا ناول *ONLY A FIDDLER*

شائع ہوا تو اس کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب اینڈرسن نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو خود زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ اینڈرسن تو بطور ایک ناول نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ابدی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ آج اس کی حیثیت کو دنیا نظر انداز کر چکی ہے۔ کسی سے بھی اینڈرسن کے بارے میں بات کیجیے۔ وہ اس کی کئی بچوں کی کہانیاں نہ بانی سناوے گا۔ لیکن اس کی شاعری اور ناول نگاری کا حوالہ دیا جا تو نئے فیصد قارئین اس سے لاعلم اور بے خبر نکلیں گے۔ بہر حال اینڈرسن ابتدا میں بچوں کی کہانیاں محض اس لیے لکھتا تھا کہ وہ جلدی چھپ جاتی تھیں اور ان کا معاوضہ جلدی مل جاتا تھا۔ وہ اسے محنت طلب کام نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ مغز کھپائے بغیر وہ ایک کہانی لکھ کر معقول معاوضہ حاصل کر لیتا ہے۔

اینڈرسن کی بچوں کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۸۲۵ء میں شائع ہوا اور اسے کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ۱۸۲۶ء اور تیسرا مجموعہ ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔ اب بتدریج ان کہانیوں کی شہرت بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۵ء میں بچوں کی کہانیوں کے جو دو مجموعے شائع ہوئے ان کی وجہ سے اینڈرسن کی شہرت یورپ میں پھیل گئی۔ اب وہ ایک ملکی سطح کا لکھنے والا نہ رہا تھا بلکہ اس کی شہرت آہستہ آہستہ ساری دنیا میں پھیلنے لگی تھی۔ کیوں کہ اسے بیرونی دنیا میں ایک جینس اور عظیم لکھنے والا تسلیم کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے اپنے ملک ڈنمارک میں اس کو ابھی تک اس کا اصل مقام حاصل نہ ہوا تھا۔ اور تو اور۔ خود اینڈرسن اس حد تک اتنی محرومیوں کے دباؤ تلے دبا ہوا تھا کہ خود بھی اپنی اہمیت اور مرتبے سے آگاہ نہ تھا۔ وہ تو اس امید میں جی رہا تھا کہ اسے ڈنمارک کا عظیم شاعر اور ناول نگار تسلیم کر لیا جائے گا۔ جبکہ ساری دنیا میں اس کی بچوں کی کہانیوں نے اس کی شہرت اور مقام کو مستحکم کر دیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں وہ انگلستان گیا۔ جہاں اسے کچھ احساس ہوا کہ بچوں کی کہانیوں کی وجہ سے وہ بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران اس کی ملاقات ڈارن

سے ہوئی۔ جو اس کی بچوں کی کہانیوں کا بہت بڑا مداح تھا۔ ڈارون نے اسے انگلستان کی خوب سیر کرائی۔

اینڈرسن اب بھی اپنی بچوں کی کہانیوں کو اپنی دوسری تصانیف پر فوقیت دینے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ بچوں کی کہانیوں کو نظر انداز کر کے اس نے ایک رومانس لکھا۔ سپین کا سفر نامہ تحریر کیا اور پھر اپنی زندگی کی کہانی، جس میں وہ بڑا متکبر اور جھنجھلا یا ہوا اشتعال پسند انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس کی امید کے مطابق ان کتابوں کو پڑھ کر انیٹہ ہوسکی۔ بلکہ اب ہر طرف سے بچوں کی کہانیوں کے مطالبے ہو رہے تھے۔ لوگوں کے تقاضوں، فرمائشوں اور مطالبوں پر اس نے ۱۸۴۷ء میں بچوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع کرایا جو بے حد مقبول ہوا اس مقبولیت کے پیش نظر اینڈرسن کو اگلے سال پھر ایک مجموعہ چھپوانا پڑا۔ بچوں کی کہانیوں کے عظیم خالق کی حیثیت سے اب وہ دنیا بھر میں جانا پہچانا اور سراہا جانے لگا تھا۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کہانیوں کے تراجم ہوئے تھے۔ اس مقبولیت کی وجہ سے اینڈرسن نے اپنی موت سے تین برس پہلے ۱۸۷۲ء تک بچوں کی کہانیوں کے متعدد نئے مجموعے شائع کیے۔

اب وہ دنیا کا ایک بڑا لکھنے والا تھا۔ بچوں کا محبوب ترین مصنف۔ اس کی کہانیاں تب سے لے کر اب تک فلموں اور ڈراموں اور کارٹونوں اور تصویروں کی صورت میں اتنی بار اتنے فلموں میں پیش کی جا چکی ہیں کہ ان کی گنتی بھی محال ہے۔

بھلا دنیا کا کونسا قاری جسے پلٹن کا کسپا ہی۔ بادشاہ سلامت کا نیا لباس کو پڑھا سنا نہ ہو۔ ان کی کہانیوں کے حوالے سے سنگ تراشوں نے مجسمے بنائے اور یوں اس کی شہرت پھیلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اپنے ملک میں بھی اسے وہی مقام اور مرتبہ حاصل ہو گیا جس کا وہ بعداً تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کی بچوں کی کہانیوں کی بدولت ممکن ہو سکا۔

اس نے ساری زندگی تنہا بسر کی۔ وہ ایک بد صورت انسان تھا۔ بڑے بڑے ہاتھ اوڑھ پاؤں۔ لمبی بد وضع ناک۔ بھدے اور بد صورت حد درجہ۔ چلتا تو مضحکہ خیز دکھائی دیتا۔ جس حالت میں بھی دکھائی دیتا بد صورت نظر آتا۔ بچے تک اس کے پاس آنے سے کتراتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں اینڈرسن خود ایک بچہ بن کر رہ گیا۔ وہ اپنے آپ کو

وجہ اور خوب صورت انسان سمجھنے لگا تھا۔ اپنے بارے میں اس کا یہ دہم یقین کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حسین سمجھنے لگا تھا۔ شاید یہ اس کے باطن کا حسن تھا جس نے اس پر اس طرح غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

۱۸۷۲ء کے موسم بہار میں وہ بستر سے اس طرح گر گیا کہ اسے شدید چوڑیں آئیں۔ اس کے بعد وہ اپنی موت کے دن تک علیل اور بیمار رہا۔ بالآخر ۲۸ اگست ۱۸۷۵ء کو اس کا انتقال کوئین بیگن میں ہوا۔

انڈین سن کی مقبول ترین کہانیوں میں ایک کہانی "بادشاہ سلامت کا نیا لباس" ہے۔ اس سادہ لیکن پرکشش کہانی کا تجزیہ کیا جائے تو آج کے دور میں اس کی سنوٹیت نئے انداز سے اجاگر ہوتی ہے۔

چالاک جولاہے ہیں جنہوں نے بادشاہ کو فریب دے کر دولت ہتھیالی ہے۔ وہ بادشاہ سلامت کے لیے ایسا کپڑا تیار کر رہے ہیں جیسا کپڑا نہ کسی نے سنا نہ دیکھا نہ پہنا سارے ملک میں اس لباس کا چرچا مہو رہا ہے۔ ساری رعایا میں شدید اشتیاق پایا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کا نیا لباس دیکھا جائے۔ اور پھر ایک دن وہ جولاہے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لباس تیار ہے۔ بادشاہ خود اس لباس کو پہنے اور دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ جولاہوں نے بادشاہ سے کہا۔ حضور والا! یہ انڈیا کا لباس ہے۔ یہ ہر اس شخص کو نظر نہیں آئے گا جو حرام کی اولاد ہے۔ وہ چالاک جولاہے بادشاہ کا پہلا لباس اتار کر نیا لباس پہنانے لگتے ہیں۔ جو بادشاہ کو بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن بادشاہ کیسے کہے کہ وہ لباس اسے دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ اپنے آپ کو حرامی کیسے کہتا ہے۔ یہ خبر۔ اس لباس کی اس انوکھی خصوصیت کا چرچا ملک بھر میں ہو چکا ہے۔

یوں بادشاہ سلامت اس 'نئے لباس' میں ملبوس اس صورت میں باہر نکلتے ہیں۔ جہاں ان کی رعایا ان کا نیا شاہی لباس دیکھنے کے لیے گلیوں، بازاروں میں جمع ہے۔ یہ جلوس شاہانہ مملکت سے رواں دواں ہے۔ لیکن مضحکہ خیز اور نمایاں ہے۔ بادشاہ سلامت ہر شخص کو ننگے دکھائی دے رہے ہیں۔ لوگ حیرت زدہ اور پریشان ہیں۔ لیکن کسی

کوزبان کھولنے کی جرات نہیں ہو رہی۔ ایسے میں ایک بچہ بے اختیار بول اٹھتا ہے بادشاہ
ننگا ہے۔ اور پھر سب کوزبان مل جاتی ہے۔
کسی بھی شعبہ حیات کے حوالے سے ان کی منافقت فریب اور جبر اور سچ کی
معصومیت کو سمجھنے کے لیے اس کہانی سے بہتر مثال نہیں دی جاسکتی۔

چھوٹی بڑی کہانیاں

اس میں کے کلام ہو سکتا ہے کہ چیزوں دنیا کے چند اہم اور بڑے خلاق انسانوں میں سے ایک تھا لیکن چیزوں کی تحریروں اور تخلیقات کے حوالے سے اس کی کہانیوں کو عظیم کتابوں میں شامل کرنا بعض بڑھنے والوں اور ناقدوں کے لیے اس لیے قابل اعتراض ٹھہر سکتا ہے کہ چیزوں کو وہ بطور ایک بڑے اور یکتا ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی جانتے اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جدید روسی ڈرامے میں دنیا میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا۔ جس کے حوالے سے کوئی اس کا مد مقابل ٹھہرنا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

چیزوں بھی ان بڑے کھینے والوں میں سے ایک ہے جن کی تخلیقات کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ "نا قابل تقلید" ہیں۔ چیزوں کے اثرات تو عالمی ادب پر دکھائی دیتے ہیں لیکن کوئی اس کا ہمسرا اور مثیل نہیں ملتا۔

عالمی ڈرامے میں چیزوں کا مقام بے حد اونچا ہے۔ اس نے ڈرامے کو کم از کم "مقیّداریکل" اور زیادہ سے زیادہ حقیقی بنانے کی کوشش کی۔ اسے روزمرہ زندگی کی تخلیقی اور سچی تصویر بنانے کا عزم کیا اور اس میں بے مثل کامیابی حاصل کی۔ اس کے ڈراموں میں آج بھی اتنی قوت ہے کہ اس کے دن ایکٹ فارس پڑھ کر ہی آدمی بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔ پر پوزل جو بلجی اور یوچو اور میجر اس کے عظیم شاہکار "مٹری کسٹرنز" اور "چیری آئیڈل" میں سے چیری آئیڈل کو جو اس کی زندگی کا آخری فن پارہ ہے۔ بلاشبہ دنیا کے چند بڑے ڈراموں میں شمار کرتا ہوں۔

چیزوں اور عالمی ادب کو جتنا مقور ابہت میں نے پڑھا ہے۔ اس کے حوالے سے میں

سمجھتا ہوں کہ ڈرامے میں کیتا مقام رکھنے کے باوجود۔ چیخون کمانی کار کے اعتبار سے کہیں زیادہ بڑا ہے اور اس کو کمانی کار کی حیثیت سے جو عالمی شہرت حاصل ہے اور کمانی کی صنف میں جو اس کا مقام بنتا ہے۔ اس کے حوالے سے اس کی کمانیوں کے مجموعے "چھوٹی بڑی کمانیوں" کو میں دنیا کی عظیم کتابوں میں شامل کرنے پر مجبور ہوں لیکن یہ وضاحت پھر ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا کے چند بڑے ڈراما نگاروں اور چند بڑے ٹکاموں کا انتخاب کیا جائے گا تو اس میں چیخون اور اس کا کھیل "چیری آرچرڈ" ضرور شامل ہوں گے ان کے بغیر بڑے ڈراموں کا کوئی مجموعہ مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔

چیخون نے صرف چوالیس برس کی عمر پائی، ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء اور اس کا یوم پیدائش ہے اور یکم اور دو جولائی ۱۹۰۲ء کی درمیانی رات یوم وفات، چیخون کا دادا ایک غلام (SERF) تھا اصلتاً کے بعد آزاد ہوا تھا۔ اس کی والدہ ایک بڑے تاجر کی بیٹی تھی اور باپ بھی کاروبار کرتا تھا لیکن اس میں ناکام رہا تھا۔ چیخون نے نازاری اور غربت کو دیکھا۔ وہ اپنے باپ کے کاروبار میں لڑکپن ہی سے ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اور اپنے گھر سے مشاہدے کی بنا پر آنے والوں کی حرکات کو ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ چیخون کا بڑا بھائی، ایکسانڈر ایک عرصے تک اس پر اثر انداز رہا۔ چیخون نے ابتدائی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن جو چیز اس کے بھائی کو پسند نہ آتی۔ وہ اسے ضائع کر دیتا تھا

چیخون نے لکھنے کا آغاز اس ضرورت کے تحت کیا کہ اس طرح کچھ آمدنی ہو جائے اور گھر پر اخراجات کی شدت میں کمی اس کا بچپن اور لڑکپن سمندری بندرگاہ ٹکانرگ میں بتا۔ یہیں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد جب ماسکو چلا گیا تو بھی چیخون اپنے دادا کے پاس رہا جو اس علاقے میں ایک جائیداد کا مینجر بن چکا تھا۔ یہ علاقہ اس کی کمانیوں میں اپنی بھرپور جھلک دکھاتا ہے اور اس کی شاہکار اور دنیا کی عظیم ترین کمانیوں میں سے ایک "ایسٹپ" میں منعکس ہوا ہے۔

چیخون بہت معنی اور اچھا طالب علم تھا وہ طب کی تعلیم حاصل کرنے ماسکو پہنچا اور ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لیا اس سے پہلے وہ کئی چھوٹے بڑے ڈرامے لکھے چکا تھا لیکن کمانی لکھنے کا باقاعدہ آغاز اس زمانے میں ہوا جب وہ ماسکو یونیورسٹی میں میڈیکل کا طالب علم تھا۔ اس کی پہلی کمانی

ماسکو سے شائع ہونے والے ایک جریدے میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی اس کے بعد پھر کمانیوں کا تانتا بندھ گیا اور وہ ڈرامے لکھنے لگا ۱۸۸۴ء میں اس نے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی اور کچھ عرصہ تک وہ اس پیشے سے وابستہ رہا۔ لیکن پھر اسے ترک کر دیا۔

۱۸۸۷ء میں اس کی کمانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا اس مجموعے کی اشاعت نے اسے روس کے صفت اول کے لکھنے والوں میں لاکھڑا کیا وہ سب سے منفرد اور مختلف تھا۔ اس کی کمانیوں کا انداز ہی ایسا تھا کہ دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کا اچھا ذوق ہے۔ چیخوف کی کمانی کو ہزاروں کمانیوں میں پہچان لیتا ہے کیونکہ ان کمانیوں کی تمک ہی جداگانہ ہے۔

۱۸۸۹ء میں اس کی کمانیوں کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔ پہلے مجموعے کو آج اس کی "ابتدائی کمانیوں" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت نے چیخوف کو پوری دنیا میں متعارف کرادیا اور کمانی کار کی حیثیت سے اسے وہ شہرت حاصل ہوئی جو ہر عہد میں بڑھی ہے اور اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

یہ وہ دوسرا مجموعہ ہی ہے۔ جس کی کمانیوں پر چیخوف کا مخصوص اور بے مثل رنگ چڑھا ہے۔ وہ چیخوف جو اپنی ابتدائی کمانیوں میں بڑا پر مزاج اور طنز بھی ہے اپنی آخری دور کی کمانیوں اور ڈراموں میں زندگی کے حزن کو اپنی کمانیوں اور ڈراموں کی خصوصی پہچان بناتا ہے۔ چھوٹی بڑی کمانیوں میں یہ حزن جو انسانی زندگی کے بائے میں اس کے ان تمام چھوٹے بڑے افسانوں پر چھایا ہوا ہے۔ جن سے بغیر عالمی افسانے کا کوئی مجموعہ اور انتخاب مکمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

چیخوف بہت مہذب، بہت شرمیلا، بہت نیک خواد اور شریف انسان تھا وہ اپنی تخلیقات سے کبھی مطمئن نہ ہوتا تھا۔ چیخوف کے فن کی خصوصیت خود اختیابی کا عمل ہے۔ چیخوف کی عمر کے آخری برس شدید علالت میں گزے۔ کھانسی کے شدید دورے پڑتے۔ وہ ماسکو میں قیام نہ کر سکتا کہ ماسکو کا موسم اس کی صحت کے لیے سازگار نہ تھا جنوبی روس میں وہ ایک دور قاعدہ گاؤں میں چلا گیا۔ ایک جھونپڑے میں بسیرا کیا۔ یہاں وہ دیہاتیوں اور کسانوں کا علاج بھی کرتا رہا۔ ترقی کا مرض اسے چائٹا رہا تھا۔ اسی زمانے میں

اسے سیٹیج کی اداکارہ ادلگا سے عشق ہوا جس سے اس نے شادی کی آخری عمر میں ہی نے جدید روسی تھیٹر کی بنیاد رکھی "انگل دانا" "تھری سسٹرز" اور چیری ارچڈ اس کا آخری ڈرامہ اسی عداوت کے زمانے میں لکھے گئے۔ اس کا انتقال بریڈن ویلیز میں ہوا اور اس کا جسد خاکی ماسکو لاکر دفن کر دیا گیا۔

کسانی کارچیفز پر کچھ باتیں کرنے سے پہلے ڈرامہ نگار چیخوف کے بارے میں ایک دو باتیں جدید روسی تھیٹر کے بانی سینسکو کی نے اس کے کھیل "تھری سسٹرز" کے پہلے سٹو کے بعد ناظرین کے سامنے جو تقریر کی تھی اس کا یہ حصہ چیخوف کے اس مقام کو ظاہر کرتا ہے جو اسے روسی تھیٹر میں حاصل ہے سینسکو کی نے کہا تھا

"ہمارا تھیٹر آپ کی ذہانت اور عظیم تخلیقات کا مفروضہ اور شکر گزار ہے۔ آپ کے نرم دل کے ہم پر احسان ہیں۔ آپ کی روح نے جدید روسی تھیٹر کو زندگی دی ہے اور آپ کو یہ نورا استحقاق حاصل ہے کہ آپ یہ کہہ سکیں کہ جدید روسی تھیٹر میری دین ہے۔"

ڈرامے کے بارے میں چیخوف کا کیا منظر یہ تھا۔ وہ اسی کے الفاظ میں۔ اس کے ایک خط سے جو اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ سیٹیج پر لوگ ویسے ہی دکھائی دیں جیسے وہ روزمرہ کی زندگی میں ہنستے کھاتے اور روتے ہیں۔ ڈرامے کے کرداروں کو عام آدمیوں کے بہت قریب اور مثال ہونا چاہیے جیسی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چیخوف نے ڈراموں میں اہم واقعات مکالموں میں بیان کر پاتے ہیں۔ ڈرامائی کش مکش اندرونی سطح پر ظاہر اور مرتب ہوتی ہے۔ یوہین ادیل نے ایک بار کہا تھا۔ چیخوف کی شکل کون کر سکتا ہے۔ اس کے لیے آدمی میں چیخوف کی طرح باطن میں انسانی دکھ کو چھپانے اور سچ سچ سے بیان کرنے کا گڑ بھی تو آنا چاہیے۔"

یہی دھیماں، یہی گہرا حزن، یہی زندگی کی قربت ہے جو ہمیں چیخوف کی کہانیوں میں ملتی ہے وہ کسی طرح کی "پتے بازی" نہیں کرتا۔ بیشتر افسانہ نگاروں میں جو ایک طرح کا خاص کہانی بنانے میں جھلی پن ہوتا ہے۔ وہ چیخوف کے ہاں نہیں ملتا۔ اس کے ہاں انسان ایسی ہی صورت میں دکھائی دیتا ہے جیسا کہ وہ ہے یا اسے ہونا چاہیے۔

چیخون کی کہانیوں کا ایک ایسا طغیانیہ ہے جو کورڈون کو متاثر نہیں کر سکتا۔ گور کی جتنا بڑا لکھنے والا ہو جس انداز کی کہانیاں اس نے لکھی ہیں وہ ایک کہانیوں کو چھوڑ کر ان کہانیوں کو پسند کرنے والے یقینی طور پر چیخون سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے کیونکہ روس کی بے پناہ وسعت، عزن اور اداسی اور انسانوں کی اصلی صورتیں ظاہر اور باطن چیخون کی کہانیوں میں نمودار ہوتے ہیں۔

پھر چیخون پوری انسانیت کا درد محسوس کرتا ہے۔

اور یہی بھی محسوس کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں فیصلے، نہیں حتمی انداز کسی صورت میں نہیں ملتا کیونکہ یہ فن کا تقاضا ہے نہ۔ زندگی کا۔ اس کے باوجود یہ کہانیاں زندگی اور انسان کے بارے میں جس بصیرت اور علم کی دولت سے مالا مال کرتی ہیں۔ وہ بہت کم افسانہ نگاروں کی دین ہے۔

چیخون کی کس کس کہانی کا ذکر کیا جائے۔ ”دشمن“ کا اور ڈومبر، کا ایک غیر دلچسپ کہانی کا۔ پونچ، کا کتے والی میم، ”سٹیپ“ کا، ”دلہن“ کا یا پھر۔ ”سکول مسٹریس“ کا جس کے بارے میں مرحوم محمد حسن عسکری نے لکھا تھا۔

ان تمام نظموں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں سے جو آج تک میں نے پڑھے ہیں۔ صرف ایک چیز کو میں نے واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنی شدید طور پر کہ اس احساس کی لہریں جب چاہوں اپنے اندر پاسکتا ہوں۔ چیخون کا افسانہ ”سکول مسٹریس“ ہے۔ (جو بڑے ص ۴۴)

چیخون کی کہانیوں کے تراجم دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں اردو میں بھی اس کی بہت سی کہانیاں

کو بار بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس کی بعض کہانیاں پہلی دفعہ روس میں ہی دریافت

ہوئی تھیں۔ جنہیں انگریزی اور دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ اردو میں اس کی ان نو دریافت

کہانیوں کا ترجمہ کرنے کا اعزاز اراقم کو حاصل ہے۔ چیخون کے چھوٹے دن ایک ڈراموں کے تراجم

بھی ہوئے ہیں۔ اس کا شہکاروں میں سے ”سٹری سسٹرز“ کا اردو ترجمہ محمد سلیم الرحمان نے کیا ہے۔

چیخون کی افسانے اور ڈرامے کی صنف میں طلبے بہا ہے۔ چیخون بہت بڑا کہانی کار اور بہت

بڑا ڈرامہ نگار ہی نہیں بہت بڑا اور عمدہ انسان بھی تھا۔ اس نے ڈرامے اور کہانی کے فن کو پختہ

سے آزا د کیا۔ ایلسویٹا فن (ELISUETA FEN) اس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا۔ ”HE

WAS AFTER ALL THE LERS DOGMATIC OF WRITERS AND ONE OF THE MOST HUMAN OF MEN”

منتخب کہانیاں

اگر اس پر بنک میں غبن کا الزام نہ لگتا تو ممکن ہے کہ آج دنیا ادب ہنری نام کے کسی لکھنے والے کو نہ جانتی اور اگر وہ کہانیاں لکھتا بھی تو اپنے اصلی نام ولیم سڈنی پورٹر کے نام سے لکھتا۔

نئی دنیا امریکہ میں ناول۔ ادب اور شاعری میں بعض بڑے نام اور بڑے کام ابتدائی دور میں ہی سامنے آ گئے تھے لیکن افسانے کی دنیا میں بہت دیر کے بعد بڑا نام سامنے آتا ہے۔ اور وہ ادب ہنری ہے۔ جب ادب ہنری ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوا تو ایڈگار ایلن پو کی موت کو بارہ برس ہو چکے تھے۔ اور پو کے حوالے سے امریکی کہانی نے بہت حد تک اپنے خدوخال نمایاں کر لیے تھے۔ ہاتھورن وغیرہ نے کہانیوں کے لیے جو فضائیں تیار کی تھی اور جس قسم کی کہانیاں لکھی تھیں پو کی کہانیاں ان سے بہت مختلف تھیں، جرم و سزا اور چھپر پراسرار فضائیں پیدا کرنے میں پو نے کہانی کو ایک جنت فراہم کر دی تھی۔ اس کی کہانی "فال آف دی ہاؤس آف انشر" نے امریکہ اور انگریزی زبان میں ایک تھکے پکار دیا تھا۔ اور بعض نقادوں نے اسے جدید کہانی کا بانی بھی قرار دے دیا۔ اس کی کہانیوں کے دوسری زبان میں بھی تراجم ہوئے۔ اردو میں مرحوم ابن انشاء نے اس کی کہانیوں کا بہتر انداز میں ترجمہ کیا۔ "چودلہ و راست وزوے" اور "عطر فرورش حسینہ کے قتل کا معرہ" دو چھوٹے مجموعے ہیں جن میں ابن انشاء نے ایڈگار ایلن پو کی کچھ چھوٹی بڑی کہانیوں کا ترجمہ کر کے شائع کرایا تھا۔ تاہم کہانی کی صنف میں ایڈگار ایلن پو کی بہت بڑی کنٹری بیوشن کے

باوجود میں سمجھتا ہوں کہ وہ کہانی کار کی نسبت سے شاعر بہت بڑا تھا اس کی نظم RAVEN کو آج بھی بڑی شاعری کا ایک فن پارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

امریکی ادب میں کہانی کی صنف میں جس لکھنے والے نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی اور عالمگیر سطح پر کہانی لکھنے والوں میں بڑا فنکار تسلیم کیا گیا وہ اور ہنری ہے اس کی کہانیوں کے متعدد مجموعے اس کی زندگی اور اس کی موت کے بعد شائع ہوئے۔ ۱۹۳۸ میں رچرڈ ایرکین نے اس کی کہانیوں کے تمام مجموعوں سے بہترین کہانیوں کا انتخاب کیا۔ ان کو THE BEST OF O. HENRY کے نام سے ایک طنزیل ویباچے کے ساتھ شائع کیا اور کہانی کی صنف میں اور ہنری کا جائز اور صحیح مقام متعین کیا۔

اور ہنری کی بہترین کہانیاں بڑے شہروں کے چھوٹے لوگوں کی زندگیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بعض فرانسیسی اور آسٹریائی لکھنے والوں نے پیرس اور ڈبلن کو اپنی تصانیف میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ جیمز جوائس نے تو اپنی کہانیوں کے مجموعے کا نام ہی "ڈی ڈبلینز" رکھا تھا۔ اسی طرح اور ہنری نے نیویارک کو اپنی کہانیوں میں زندہ کیا۔ اور یہ کہانیاں دنیا کے بڑے شہروں کے انہی لوگوں کی نمائندگی کرتی ہیں جو بڑے شہروں کی مصروف و بے التفات افراتفری اور کس مہر سی کا شکار ہوتے ہیں۔ (یہاں مجھے غلطیاد آ رہا ہے جس نے بمبئی کو بلور خاص اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ ریاض شاہد اور حمید شیخ جن کے ناولوں میں لاہور شہر جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا تھا ہے۔)

ولیم سٹرن لورڈ (او۔ ہنری کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والا) ۱۱ ستمبر ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوا۔ پندرہ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے اٹکل کے ڈرگ سٹور میں کلرک ہو گیا۔ اس کی صحت اچھی نہ تھی اس لیے وہ اپنے ایک دوست کے ریچھ چلا گیا جہاں اس نے دو برس گزار دیے۔ وہ امریکہ کے مختلف علاقوں اور شہروں میں رہا تھا۔ وہاں اس نے زندگی کا جس طرح مشاہدہ کیا اس پر مبنی اس کی ایک کتاب CABB AGES AND KINGS کے نام سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۸۸۶ء میں اور ہنری نے مختلف طرح کی تحریروں اور رسالوں کو بھجوانی شروع

کردی تھیں وہ زیادہ تر مزاحیہ چیزیں لکھا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ اسٹریٹس بھی کرتا رہا۔ یوں اس کی ان ابتدائی نگارگوں کی وجہ سے اس کا نام لوگوں میں جانا پہچانا جانے لگا تھا۔ تب وہ اپنے اصلی نام ہی سے لکھ رہا تھا۔ ایک زمانے میں وہ ہوسٹن سے شائع ہونے والے پوسٹ کے لیے روزانہ کامل بھی لکھا کرتا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں اس نے آسٹن کے ایک بینک میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۹۶ء میں اس پر ایک معمولی سی رقم کو حذب و اور غبن کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس پر جو الزام لگایا گیا اس کی صداقت کا کبھی تسلی بخش ثبوت نہ مل سکا۔ لیکن اس کی پاداش میں اسے پانچ برس کی سزا دی گئی جب مقدمہ چل رہا تھا تو اس وقت اسے کئی جریدوں نے کہانیاں لکھنے کی پیش کش کی تھی اسی زمانے میں ولیم سڈنی پورٹر نے اپنا اصلی نام ترک کر دیا۔ فلمی نام ادہنری اختیار کیا اور کہانیاں لکھنے لگا۔ اس کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ اور ادہنری نے تین سال اور تین مہینے جیل میں گزارے۔ اس واقعہ کا ادہنری کی زندگی پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے اپنی ذات اور پہچان کو اپنا نام بدل کر چھپا دیا اور دنیا کے ایک بڑے کہانی کار کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں اس کا ظہور ہوا۔ اس واقعہ نے اسے تنہا کر دیا تھا۔ وہ ہر شخص سے بے تکلف نہ ہو پاتا تھا۔ طے جلنے میں بہت اہتمام کرتا۔ لیکن عام انسانوں کی زندگیوں میں بہت گہری اور سچی دل چسپی لینے لگا تھا۔ وہ ہر بڑے فنکار کی طرح بہت حساس تھا اس واقعہ نے اس کے جذبات کو بہت مجروح کیا تھا۔ لیکن اپنی کم آئینہ کی تلافی اس نے نیویارک شہر کے عام آدمیوں میں گہری دل چسپی لے کر کی جو اس کی کہانیوں کے کردار بنے۔ وہ گھنٹوں نیویارک کے گلی کوچوں میں گھومتا کرتا اور نیویارک کو ”چھوٹے راستوں والا بغداد“ کہا کرتا تھا۔

اس نے اپنی زندہ اور لازوال کہانیوں کے لیے مواد نیویارک جیسے ہنگامہ پرور شہر کے عام ہاسیلوں کی زندگیوں سے حاصل کیا۔ اس طرح شہر کے عام آدمیوں کے حوالے اور ہنری کہانیوں پر بڑے شہر میں رہنے والے عام آدمیوں کی زندگیوں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

اس نے جبل سے آزاد ہونے کے بعد اپنی ساری زندگی نیویارک میں گزار دی۔ اس نے اپنے آپ کو کہانی لکھنے کے لیے وقف کر دیا۔ وہ نیویارک ورلڈ کے لیے ہر ہفتے ایک کہانی لکھتا تھا۔ جس کا معاوضہ اسے ایک سو ڈالر ملتا تھا۔

اس کی کہانیوں کا مجموعہ "دی نورٹین" ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اردو میں ابن انشاء مرحوم نے ہی اس کا ترجمہ "لاکھوں کا شہر" کے نام سے کیا تھا۔ اس مجموعے کے بعد ادہزنی کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں "دی ٹریڈ میپ" "دی وائس آف دی سٹی" "رودز آف ڈیٹھی" "دی ٹوڈین" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اس کی موت کے بعد بھی اس کی کہانیوں کے چھ مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں "گفٹ آف دی وائز مین" "سکس اینڈ سیونز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ادہزنی نے اپنی زندگی میں سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں کے ترجمے دنیا کی ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ ان کی متعدد کہانیوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے لیے بھی ان کہانیوں کو ڈرامائی شکل دی گئی ہے۔ ادہزنی ایک زندہ رہنے والا کہانی کار ہے۔ اس کے ہاں ایک ایسی سادگی ملتی ہے جو کہانی کے انجام پر بے حد حیران کن بن جاتی ہے۔ لیکن بیشتر صورتوں میں اس کی کہانیوں کا انجام کہانی کے واقعات و کردار کے تانے بانے کے عین مطابق اور منطقی ہوتا ہے تاہم اس کی بعض کہانیوں کا انجام خاصا مضحکہ خیز بھی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے تھیلے میں سے بلی نکالی گئی ہے۔ ادہزنی کی بعض عالمگیر شہرت یافتہ اور لازوال کہانیوں کے بغیر عالمی ادب کی کہانیوں کا کوئی مجموعہ مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کی ایسی ہی لازوال کہانیوں میں اس کی ایک کہانی "آخری پتہ" ہے جس کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک فنکار کی کہانی ہے جو ایک بیمار، مالوس عورت کی جان بچانے کے لیے ایک مصنوعی پتہ چھینٹا کرتا ہے۔ کیونکہ عورت کا یہ وہم یقین کی حدود میں داخل ہو چکا ہے کہ اس کی کھرکی سے نظر آنے والے درخت کا آخری پتہ جس دن گرا۔ وہ اس دن عود مر جائے گی۔ فن کار عود مر جاتا ہے لیکن فن کا شہکار پتہ تخلیق کر کے اس کہانی کی عورت کو زندگی بخش دیتا ہے۔

اس کی بڑی کمائیوں میں "تخفہ" ایک لازوال کمائی ہے۔ یہ دو چاہئے والوں کی کمائی ہے۔ جو کہ سمس پر ایک دوسرے کو تخفہ دینا چاہتے ہیں لیکن پیسہ نہیں ہے لیکن وہ محبت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایسا تخفہ لاتے ہیں جو دونوں کی محبت اور ایثار کا بے پایاں اظہار بنتا ہے۔

ادہنری کی بڑی کمائیوں میں سے ایک وہ کمائی ہے جو دو دوستوں کی کمائی ہے جو لمبے عرصے کے بعد ملتے ہیں تو ایک مجرم بن چکا ہے اور دوسرا اس کی گرفتاری پر مامور ہے۔ پھر ان کمائیوں میں ادہنری نے بڑے شہروں میں رہائش کے مسئلے کو چھیڑا ہے اور "سزا" جیسی لازوال کمائی لکھی ہے۔ ایک ایسے شخص کی کمائی جو بے گھر ہے پر موسم سرما میں چرتی کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ یوں اسے چھت میسر آ جاتی ہے لیکن ایک موسم سرما میں پکڑا نہیں جاتا اور جب موسم بدل رہا ہوتا ہے تو ایسے جرم میں پکڑ لیا جاتا ہے جو اس سے سزا دہی نہیں ہوا تھا۔

ادہنری کی کمائیوں کے کردار بڑے شہروں کی مخلوق ہے۔ بے گھر، محروم لوگ دکانوں پر کام کرنے والی لڑکیاں، اٹکے، کلرک، معمولی پیشوں سے وابستہ لوگ جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی خوشیوں کی راہ میں بڑا کٹھن حاصل ہوتا ہے اور رکاوٹ بنتا ہے۔

ادہنری کی کسی کمائیاں یقیناً ایسی ہیں جو صحافیانہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ اس کا باعث اس کی زود نوٹیس بھی ہتی لیکن اس کی وہ کمائیاں جنہوں نے اسے زندہ جاوید اور لافانی بنایا ہے ان کمائیوں کے حوالے سے بعض نقادوں نے کہا ہے کہ "ادہنری میں ٹیلنٹ (TALENT) نہیں تھا وہ جسنس (BENINS) تھا" اس کی کمائیوں کی ساوگی اور ناسلوب ایک ایسا سحر ہے جو پڑھنے والے پر ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔

ادہنری کو اس کی زندگی کے آخری برسوں میں وہ شہرت حاصل ہوئی جس کا وہ عرصے سے مستحق تھا۔ آخری برسوں میں اس کی کمائیوں کے مجموعے بہت مقبول ہوئے اور یوں اس کو خوش حالی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ادہنری نے اپنی زندگی

میں ہی اپنے مقام کو پایا تھا۔

۱۹۰۷ء میں اوہنزی نے اپنے بچپن کی دوست سارہ کو ملین سے دوسری شادی کی وہ ۵ جون ۱۹۱۰ء کو اپنے محبوب شہر نیویارک میں فوت ہوا۔

اوہنزی نے افسانے میں نہی روح چھوٹی اس کے اثرات نہ صرف امریکی افسانے پر بلکہ عالمی کہانی پر بھی بہت گہرے اور امنٹ ہیں اس کے فن پر کسی کتابیں شائع ہو چکی ہے، امریکہ میں اوہنزی ایوارڈ، ہر سال بہترین کہانی لکھنے والوں کو دیا جاتا ہے۔!!

کہانیاں

اُستاد نے کہا تھا اور استاد بھی کون گستاخو، بلیو، بیس، بس وہ کچھ لکھو جو تمہارے مشاہدے میں آتا ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے سادہ، موزوں اور بر محل الفاظ تیار کرو کہ جو تصویر لفظوں کی بناؤ وہ اُجلی، نمایاں اور پرکشش ہو۔“

اور پھر مولپساں پر ایک لمحہ آیا کہ جب اس نے تکمیل فن کے سب مراحل طے کرتے ہوئے بڑے فخر سے اعلان کیا۔

”میں نے کوئی چیز اخراج اور ایجاد نہیں کی۔ بس وہی کچھ لکھا ہے جو دیکھا ہے جو مجھ پر بیٹا ہے۔“

مولپساں کی زندگی پر ایک بہت خوب صورت اور سچا ناول لکھا گیا ہے۔ یہ نیکٹر کا ناول ہے *CONDIMENT TO DESIRE* کے نام سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عالمی افسانے کے اس عظیم معمار مولپساں کے فن اور اس کی شخصیت کو سمجھنا مقصود ہو تو نیکٹر کا یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیے۔

مولپساں جن کی کہانیاں ساری دنیا میں ایک عرصے سے پڑھی جا رہی ہیں۔ جن کا شمار دنیا کے چند بڑے فن کار کہانی کاروں میں ہوتا ہے، جن کی کہانیوں کے تراجم دنیا کی تقریباً سب زبانوں میں متعدد بار ہو چکے ہیں۔ وہ بہت کم جیوا۔ وہ تینتالیس برس کا تھا کہ جب دنیا کو اپنے شاہکار ناول اور افسانے دے کر خود راہی ملکِ عدم ہوا۔

ہنری رینے گالی ڈومی مولپساں نارمنڈی ڈفرانس کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس

علاقے کے دو ہفتانوں کو بعد میں اس نے اپنی کمائیوں میں زندہ جاوید کر دیا۔ اس کی تاریخ پیدائش ۵ اگست ۱۸۵۰ء ہے۔ اس کا باپ پیرس میں شاک برادر تھا اور اس کی ماں کو علم و ادب سے شغف تھا اور فلوریئر بھی عظیم لکھنے والے کے ساتھ اس کے ذاتی اور گہرے مراسم تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے مولپاساں بجز یہ کے دفتر میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ وہ ہزاروں دوسرے کلرکوں کی طرح تھا۔ اور اس کے علاوہ کوئی ممتاز حیثیت نہ رکھتا تھا کہ وہ جید توانا، وجید اور مضبوط آدمی تھا۔ اسے کشتی رانی کا بھی بڑا شوق تھا۔

اس کے ادبی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں نے اسے فلوریئر کی سرپرستی میں دے دیا۔ جہاں مولپاساں کی ملاقات اس دور کے فرانس کے عظیم لکھنے والوں سے ہوئی۔ جن میں زولا بھی شامل ہے۔ اس نے جو پہلی چیز لکھی، وہ ایک ڈرامہ تھا۔ جسے فلوریئر کے ہاں اس کے دوستوں کے سامنے سخی نشست میں کھیلا گیا۔ فلوریئر لکھنے کے معاملے میں بہت وقت پسند اور محتاط تھا اس نے سات برس تک مولپاساں کی تربیت کی۔ مولپاساں جو لکھنا وہ اس پر کڑی تنقید کرتا بہر حال ۱۸۸۰ء میں مولپاساں کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ جو اس کا پہلا اور آخری مجموعہ ہے۔ مولپاساں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ شاعری میں خاصی مقام حاصل نہیں کر سکتا اور اس نے افسانے لکھنے کو ترجیح دی۔ ۱۸۸۰ء میں ہی افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ جس میں زولا سمیت کئی دوسرے لکھنے والوں کے افسانے شامل تھے۔ زولا نے ایک ادبی حلقے کی بنیاد رکھی تھی۔ اور اس حلقے میں مولپاساں کی کافی۔ BOULE DE SUIF شامل تھی۔ جس نے مولپاساں کی عظیم صلاحیتوں کا موثر ثبوت پیش کر دیا۔ اس کے بعد مولپاساں کی جو کمائیاں شائع ہوئیں انہوں نے اس کی عظمت کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش کر دیا۔

ملازمت مولپاساں کے لیے بیزار کن تھی۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی دی۔ پھر وہ لذت پرستی میں پڑ گیا۔ لیکن اپنے فن کے ساتھ ہمیشہ مخلص رہا۔ اس کی ذاتی زندگی غیر معمولی کسی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنی جوانی اور اپنی طاقت کو دونوں ہاتھوں سے لذت پرستی کی نذر کر دیا فلوریئر کی تمام نصیحتیں بھی اس پر کارگر نہ ہو سکیں۔ اعصابی اور ذہنی مرض اسے اپنی والدہ سے ورثے میں ملی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں وہ شدید بیمار ہوا۔ لیکن اس بیماری کے نتیجے میں اس کے

جسم کے سارے بال جھڑ گئے۔

مولپاں کی تخلیقی زندگی بے حد مختصر تھی یعنی ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک۔ محض دس برس ان دس برسوں میں مولپاں نے لگ بھگ تین سو افسانے، چھ ناول اور دو تین سفر نامے لکھے ایڈمنڈ میئر نے انگریزی میں اور شارلی نیوفز نے اس کا جو انتخاب فرانسسیسی میں شائع کیا ہے وہ اس کے شاہکار افسانوں پر مشتمل ہے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ دونوں نقادوں نے اس کے ساتھ افسانوں کو اس کا شاہکار قرار دیا ہے۔

اپنی آخری عمر میں وہ مولپاں جس نے بڑی بے باک، غیر معتدل اور بنا ریل زندگی گزاری تھی۔ مذہب میں گہری دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے باوجود وہ زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ جنوری ۱۸۹۲ء میں اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ دماغی امراض کے ہسپتال میں بھی رہا۔ اور ۶ جولائی ۱۸۹۳ء کو وہ دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو برس بہت تکلیف دہ اور کرب ناک تھے۔

مولپاں نے چونکہ ملازمت چھوڑ دی تھی، زندہ رہنے کے لیے اس نے تحریر و تصنیف کو ہی اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اس لیے اپنی مختصر تخلیقی زندگی میں اسے بہت زیادہ لکھنا پڑا۔ اس لیے اس کی بہت سی تحریریں کمزور بھی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک مضمون میں سب لکھا ہے کہ مجھے اردو کا چیخوت نہ کہا جائے اور منٹو کو اردو کا مولپاں نہ سمجھا جائے۔ لیکن چند ایسی مشرک اقدار منٹو اور مولپاں میں ملتی ہیں اور منٹو نے مولپاں کی کئی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ جن کا ذکر ضروری ہے۔

مولپاں اور منٹو نے لگ بھگ ایک جتنی عمر پائی۔

مولپاں اور منٹو نے تحریر و تصنیف کو ہی ذریعہ معاش قرار دیا۔

مولپاں اور منٹو نے غیر معتدل زندگی گزاری۔

دونوں بہت سچے، بہت بے باک اور جرأت مند لکھنے والے تھے۔

منٹو کی طرح مولپاں کی کمزور ترین کہانی پر بھی مولپاں کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے

مولپاں اور منٹو نے کفایت لفظی کے فن پر عبور حاصل کیا تھا۔
 منٹو کی کسی کہانیوں پر مقدمے چلے۔ اسے حزب اخلاق اور محسوس سمجھا گیا۔ مولپاں پر بھی
 ایسے ہی الزام لگائے گئے۔ اس کے ناول UNE VIE (۱۸۸۳ء) پر پابندی لگائی
 گئی۔ جس نے اس کی شہرت میں اضافہ کیا۔
 ہاکنسن نے مولپاں کے فن پر جو رائے دی ہے وہ منٹو پر بھی سو فیصدی صادق آتی
 ہے۔ ہاکنسن نے مولپاں کے بارے میں لکھا تھا:-

"HE WAS NEVER A LOOSE WRITER, - BUT
 HE WAS AFTER A HURRIED ONE."

مولپاں نے فلور میر کی تربیت اور اپنی محنت سے یہ سیکھ لیا تھا کہ لفظ کا صحیح استعمال
 کیسے کیا جاتا ہے۔ اور اس کی کہانیوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ کہانی اور ہر ادھر نہیں ہوتی۔
 مولپاں کی کہانیوں کے اردو میں عرصے سے تراجم ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس
 کی بعض کہانیاں کئی بار مختلف مترجموں نے ترجمہ کی ہیں۔ اس کے شاہکار ناول
 VNE کا ترجمہ سید قاسم محمود ایک دل کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اچھی حال ہی میں مولپاں
 کی کہانیوں کا ایک انتخاب اور ترجمہ سارٹا گھار نے مولپاں کی بہترین کہانیاں کے عنوان سے
 شائع کرایا ہے۔ جس میں مولپاں کی آٹھ شاہکار کہانیاں شامل ہیں۔

مولپاں کا درجہ بطور ناول نگار بھی عالمی ادب میں بہت بلند ہے۔ اور اس کے دو
 ناول UNE VIE اور BELAMI بہت اہم ناول سمجھے جاتے ہیں لیکن اسے جو مرتبہ
 مقام اور شہرت اس کی کہانیوں کی وجہ سے حاصل ہوا وہ بطور ناول نگار نہیں مل سکا۔
 مولپاں کی کہانیوں کے موضوعات میں جنس کا گرم موضوع بھی شامل ہے لیکن
 اس کی بیشتر کہانیاں انسان کا گہرا باطنی مشاہدہ اور مطالعہ پیش کرتی ہیں۔ مولپاں انسانی
 فطرت کو ایک خاص اور منفرد انداز میں بیان کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ فن میں
 رہا کاری کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے اس کی کہانیوں پر بعض نقادوں نے اور پڑھنے والوں
 نے شدید ردِ عمل کا اظہار بھی کیا ہے۔

مولیساں نے ہر موضوع پر ہر انداز میں کہانی لکھنے کی کوشش کی۔ اس کی کہانی چھتری کو دیکھیے جس میں مادام اور پلے کی سبیلی اتھا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ یک لختا کردار نہیں بنتی۔ بلکہ بعض مقامات پر وہ عام انسانی احساسات کا بھی اظہار کرتی ہے۔ گداگر، کامرکزی کردار تو گداگر ہی ہے۔ لیکن اس کردار کو مختلف انسانی کردار اور رویے اُبھارتے ہیں اور اسی سے اس کہانی میں ایک ایسی معنویت پیدا ہوئی ہے جس نے اس کہانی کو دنیا کی چند بڑی کہانیوں میں شامل کر دیا ہے۔

ایجن آف آئز، میں جو سفاکی اور طنز ہے وہ ایسے ہی معاشروں میں جنم لیتی ہے۔ جہاں جسم بھی ترقی کی منزل تک پہنچانے میں سیرھی کا کام دیتے ہیں اور ایسی کہانی مولیساں جیسا افسانہ نگار ہی لکھ سکتا ہے۔ رسی کا ایک ٹکڑا، ایک فرد اور ایک پوسے معاشرے کی کہانی ہے۔ جہاں ایک بار انسان پر ضبط الزام کا دھبہ لگ جائے تو وہ ساری عمر اس دھبے کو دھو نہیں سکتا۔ یہ الزام اس کے لیے جان لیوا بن جاتا ہے۔ مولیساں کی کہانی عالمی افسانے میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور چھرنیکلس "یہ وہ کہانی ہے جس کے بغیر عالمی افسانے کا انتخاب بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ چند گفتوں کی مستروں کی سزا انسانوں کو ساری عمر جھگتنی پڑتی ہے اور پھر اس سزا کی بنیاد بھی کتنی ناہائیدار اور چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی کہانی ہے جو بار بار دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ پھر طوطا جیسی گہری نفسیاتی داہے کی کہانی، جعلی زیورات، جس میں مرد ایک عجیب طرح کا سمجھوتہ بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ یہ کہانی انسانی نفسیات کا ایک سماج اور عمیق مطالعہ ہے اور پھر اس کی کہانی "انتقام" انسان اور حیوان کے رشتے کی ایک انوکھی تفسیر۔۔۔

مولیساں کی کس کس کہانی کا تذکرہ کیا جائے۔!

مولیساں انسان کی جبلتوں کو سمجھتا ہے۔ ان کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ انسان کی جبلت کے سامنے اس کا اپنا وجود کھینچ کر رہ جاتا ہے۔ "مارو کا" کہانی میں انسان اور فطرت ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ماسک، کابلوڑھا بھی تو ایک زندہ کردار اور زندہ حقیقت سے جو جہرے پر جوانی کا نقاب اوڑھے جوانی کے دلائل کو واپس لانے کے لیے کوشاں ہے لیکن

مولپساں انسان کی تحقیق نہیں کرتا۔ وہ گھٹیا سے گھٹیا ہڈیوں اور کم تر سے کم تر درجے کے انسانوں سے بھی تحقیق کا انداز اختیار نہیں کرتا۔ وہ بے رحم ہے کہ سب کچھ بلا کم و کاست بیان کر دیتا ہے۔ لیکن وہ انسان سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ نیک اور نام نہاد شریف لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لیے ایک طوائف کی زندگی ہی بے معنی اور حقیر لگتی ہے۔ یوں مولپساں اس طوائف کو انسانیت کی ارفع ترین بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔

مولپساں کے ہاں انسان کا جو تصور ملتا ہے وہ فطری انسان کا تصور ہے۔ مولپساں کے ہاں بے باکی تو مل جاتی ہے لیکن اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ ہمیں اس میں بے احتیاطی نہیں ملتی۔ اس لیے کہ اس نے انسان کا مطالعہ اور مشاہدہ لاپرواہی سے نہیں کیا۔ وہ صرف مشاہدے کے بل پر ہی نہیں بلکہ اپنے گونا گوں اور متنوع غیر معمولی جبلتی تجربوں کی بناء پر بھی بڑا کمانی کاربن کر سامنے آتا ہے۔ اب اس میں کیا شک ہے کہ اس کے مشاہدوں مطالعوں اور تجربوں میں اس کا روحانی تجربہ اور کرب بھی تو کھل گیا تھا۔

عالمی انسانوں کے سمباروں میں چند ایسے نام ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جن سے دنیا ہمیشہ متاثر ہوتی رہے گی۔ ان میں ایک نام مولپساں کا ہے اور ایک نام چیخوف کا بھی ہے اور روس کے چیخوف نے فرانس کے مولپساں کے بارے میں لکھا تھا۔

مولپساں کا مطالعہ کیجیے۔ اس کے ایک ایک صفحے کی قدر و قیمت روئے زمین کی ساری دولت سے زیادہ ہے اس کی ہر سطر میں ایک نیا آفتی کھلتا ہے۔ نرم و نازک رومانی محسوسات کے دوش بدوش شدید طوفانی سنسنی خیز جذبات نازک ریشوں کا جہاں۔

والڈن

دنیا میں ایسے لکھنے والوں کی تعداد خاصی کم ہے کہ جنہوں نے جس انداز سے لکھا ہو جس فلسفے یا طرز زلیست کا پرچار کیا ہو، خود اپنی زندگی بھی اسی کے مطابق ڈھالی اور بسر کی ہو۔ تھوریو انہی معدودے چند بڑے لکھنے والوں میں سے ایک ہے۔ جس نے اپنے نظریات اور اپنی عملی زندگی کو یک جان کر دیا.....

تھوریو کی تصانیف میں 'والڈن' سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کا شمار دنیا کی بڑی کتابوں میں ہوتا ہے اور یہ کتاب جہاں اس کی اپنی زندگی کی داستان ہے۔ وہاں اس کے فلسفے اور فکر کی بھی سچی تصویر ہے۔ 'والڈن' کو (۷۰x) نے لکھا ہے کہ یوں تو 'والڈن' یا تھوریو کی دوسری تصانیف بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن اگر پڑھنے والا اس کی زندگی کی داستان سے بھی واقف ہو تو پھر اس کی تحریروں کے معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ اور اثر پذیری میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ 'والڈن' کے ساتھ تھوریو کی زندگی کے واقعات اور انڈیا فکر کا بہت گہرا تعلق ہے۔ 'والڈن' پہلی بار ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے تھوریو ایسے تجربات کر چکا تھا جنہوں نے اس کتاب کو جنم دیا۔ اس کی فکر سہنتہ ہو چکی تھی۔ وہ ایک نظریہ حیات وضع کر چکا تھا اور اس پر عمل کر رہا تھا۔ 'والڈن' دراصل اس کی فکر طرز زلیست کا ہی اظہار نہیں۔ بلکہ اس کی زندگی کا بھی ایک جزو اور لاینفک ہے۔

تھوریو مفکر، شاعر اور نیچرلسٹ تھا۔ اس نے فرد کی آزادی کو بہت اہمیت دی ہے۔ آج کا امریکی معاشرہ فرد کو جو اہمیت دیتا ہے۔ اس کے پیچھے تھوریو کی فکر کار فرما ہے۔

مختور یو کا فلسفہ کیا ہے اسے اس کے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔
ایک فرد کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی اس طرح بسر کرے۔ جس طرح
زندگی کے اصول اس سے تقاضا کرتے ہیں۔

والڈن۔ فرد کی زندگی کے اہم ترین تجربے کا ایک لازوال ریکارڈ ہے۔ فرد کی
آزادی کا وہ اظہار ہے جس کی بدولت مختور یو دنیا کے عظیم مصنفین اور مفکروں میں گھڑا
دکھائی دیتا ہے اور اس کی کتاب دنیا کی گنتی کی چند بڑی کتابوں میں سے ایک تسلیم
کی جاتی ہے۔

مختور یو عجیب و غریب انسان تھا۔ آزاد، یکتا، اپنے عمل میں منفرد، وہ ۱۲ جولائی
۱۸۱۷ء کو کنکارڈ (ریس چوسٹس) میں پیدا ہوا اور اپنی بیشتر زندگی اس نے یہیں
گزار دی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ فطرت کے ایک طالب علم کو جو کچھ چاہیے وہ سب کچھ
یہاں میسر ہے۔

اس کا باپ اس قصبے میں سیلے کی پنسلیں بنانے کا کام کرتا تھا۔ مختور یو نے
مجھی ایک عرصے تک اس کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا۔ اس زمانے میں اس کی
اس اعتبار سے بڑی شہرت تھی کہ وہ پنسلوں کے ڈھیر میں سے ایک ہی وقت میں
ہاتھ ڈال کر اتنی ہی پنسلیں نکال لیا کرتا تھا جتنی کہ کسی گاہک کی ضرورت ہوتی تھی۔
بعد میں اس کا یہ تجربہ اس نظر بھی کام آیا کہ وہ تالاب یا جوہڑ میں وہیں ہاتھ ڈالتا
جہاں مچھلی ہوتی۔

کنکارڈ کا یہ قصبہ جہاں ہنری ڈیوڈ مختور یو پیدا ہوا، اس اعتبار سے بڑی شہرت
رکھتا ہے کہ اسی قصبے میں امریکی ادب کے بعض اہم ترین لکھنے والے پیدا ہوئے
ایرسن، ہاتھورن، لوئزائے الکاٹ، ان سب کی جائے پیدائش یہی قصبہ ہے۔
مختور یو نے ہارورڈ میں تعلیم حاصل کی اور ساری عمر کلاسیکی ادب کا پڑھنا اور علم رہا
اس نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہارورڈ جیسی درسگاہ کا
پڑھا ہوا ہے۔ وہ علم کا جو بایا تھا اور ساری عمر علم ہی حاصل کرتا رہا۔ اس نے ایک مختصر عرصے

تک اپنے بھائی کی شراکت میں ایک سکول میں درس بھی دیا۔ لیکن جلد ہی یہ پیشہ چھوڑ دیا وہ مروا زاد تھا اور کسی طرح کی پابندیاں قبول کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ اپنے آبائی قصبے اور سٹیٹن آئی لینڈ میں ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا لیکن پھر اس سے بھی اس کا جی بھر گیا اس نے اپنی زندگی اپنے وسائل سے بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چھوٹے موٹے کام کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔ اس نے اپنی زندگی کے حوالے سے ثابت کیا کہ انسان کم سے کم وسائل میں کم سے کم کام کر کے انتہائی سادگی کے ساتھ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہوئے، پُر سکون زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کسی دھوم دھڑکے، شان و شوکت اور مٹھا مٹھا بائٹھ کے اظہار کے بغیر بھی انسان ایک سچی روحانی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

وہ کھیتوں، باغوں، جنگلوں میں گھومتا رہتا۔ درختوں، پودوں، کیڑے مکوڑوں کو دیکھتا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرتا۔ وہ جنگل کی زندگی کا اتنا عادی ہو گیا اور جنگل اور اس کی مخلوق کو بھی اس سے اتنا انس پیدا ہوا کہ ایرسن جیس بتاتا ہے کہ جنگل کے سانپ، مچھلی اور بے تکلفی کے ساتھ اس کے جسم کے کسی حصے کے ساتھ لپٹ جاتے تھے۔ جنگل اور جنگل کی مخلوق نے اپنا سامعہ سمجھتے ہوئے اسے جنگل کے "محموق شہریت" دے دیے تھے۔

ایک زمانے میں ایک مختصر سا عرصہ تھورلویو۔ ایرسن کے گھر بھی رہا۔ اپنے قیام کے اس زمانے میں اس نے ایرسن کے باغ کی نگہداشت سنبھالی لی۔ وہ پودوں اور درختوں سے ہمکلام ہوتا۔ اس نے ایرسن کے گھر کی چھت مرمت کر دی۔ اس کے لیے نایاب پودے تلاش کیے۔ بڑی مرمت کی اور پھر ان مشاغل کے ساتھ ساتھ فلسفے پر لمبی بحث کیا کرتا تھا

جولائی ۱۸۲۵ء سے ستمبر ۱۸۲۷ء تک تھورلویو نے جس انداز میں زندگی بسر کی اس کی دین اس کی یہ عظیم کتاب 'دالٹن' ہے۔ اس نے جس طرز حیات کا پرچار کیا تھا۔ اب اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اس نے 'دالٹن جوہر' (POND) کے کنارے خود ایک چھوٹا پڑا تعمیر کیا جو کھکارو کے قصبے کے بیرونی حصے میں واقع تھا۔ یہاں وہ اس دوران میں اکیلا زندگی بسر کرتا رہا۔ اسے اپنی ضرورتوں کے لیے، جتنی رقم کی ضرورت ہوتی وہ ادھر ادھر کے کام کر کے حاصل کرتا۔ وہ محنت اور دستکاری کرتا تھا وہ لمبی سیر کرتا۔ ایک ایک پتے اور ایک ایک کیڑے کو

دیکھتا جن کی تفصیل وہ اپنی ڈائری میں قلم بند کر لیتا۔ اس کے انہی تجربات کا سچہ لورڈ فلنڈر "والڈن" میں ہوا ہے۔ اس نے کسی پرندے یا جانور کو ہلاک کیا نہ شکار۔ وہ سبزی پر زندگی گزارتا رہا۔ لمبی سیر اور فطرت کے مظاہر کے مشاہدے کے بعد جو وقت بچتا اسے وہ مطالعے اور غور و فکر میں بسر کرتا۔ اس زمانے میں وہ انسانی رفاقت سے نفرت کرنے لگا تھا۔ لیکن جب اس کا یہ مراقبہ مکمل ہوا تو وہ انسانوں کی دنیا میں آگیا۔ والڈن میں اس نے جو عرصہ گزارا اس کے حوالے سے تھوریو پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ انسان سے نفرت کرتا تھا۔ وہ نرم اور انسانی جذبات سے تھی اور محروم تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

وہ انسانوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے کنکارڈ میں ایک ہال کرائے پر لیا اور وہاں غلامی کے خلاف تقریریں کرتا۔ وہ امریکہ میں غلامی کے خلاف موثر ترین آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ میکسیکو کے سامنے جو لڑائی ہو رہی تھی اس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا

تھوریو کا یہ کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے کہا کہ وہ ایک ایسی حکومت کو ہرگز ٹیکس ادا نہ کرے گا۔ جس نے غلامی کی اجازت دے رکھی ہو۔ اس کو اس احتجاج اور ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں اسے سزا ہوئی۔ جیل بھیجا دیا گیا۔ اس نے ہنسنا خوشی یہ سزا قبول کر لی لیکن امدادوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

تھوریو نے نہ صرف حکومت کو ٹیکس ادا نہ کیا جیل چلا گیا بلکہ اس نے اپنے فلسفہ کو اپنے مشہور زمانہ مضمون میں بھی بیان کیا۔ اس مضمون کا نام
ON THE DUTY OF CIVIL DISOBEDIENCE ہے۔

اس کا یہ مضمون بے حد اہم ہے۔ اس کے اثرات پوری دنیا پر بہت گہرے ہیں والڈن اس کی کتاب کو ایک تخلیقی کام کہا جاتا ہے۔ لیکن اس مضمون کو ایک دلائل سے پر محبت اور مناظرہ قسم کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ امریکی نقاد چارلس آر ایڈرسن نے لکھا ہے۔
CIVIL DISOBEDIENCE IS NOT LITERATURE BUT

POLEMICS - اس مضمون میں وہ ریاست پر تنقید کرتا ہے۔ وہ ریاست کے سیاسی مقاصد کو زیر بحث لاتا اور ورس دیتا ہے کہ جب ریاست کے مقاصد سٹرائیکٹرز ہوں تو پھر یہ آزاد انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسی ریاست کے احکام کی نافرمانی کرے۔ اس مضمون میں مٹھوریو نے دلائل سے کام لیا ہے۔ اس مضمون کا یہ جملہ فرد کی مرضی اور منشا کا دستور بن گیا ہے۔ مٹھوریو لکھتا ہے۔

“THE ONLY OBLIGATION WHICH I HAVE A RIGHT TO ASSUME IS TO DO AT ANY TIME WHAT I THINK RIGHT.”

مٹھوریو کی تحریروں میں اس کا یہ مضمون سب سے زیادہ اثر انگیز ثابت ہوا۔ عدم تعاون کے فلسفے کا سہرا بعض لوگ گاندھی کے سر باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس فلسفے کا موجد اور بانی مٹھوریو ہے۔ اس نے نہ صرف یہ فلسفہ پیش کیا بلکہ اس پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ اس کا یہ مضمون فرد کی جدوجہد کی تاریخ کی اہم ترین دستاویز ہے۔ گاندھی نے اس سے اثر قبول کیا اور اس کی تقلید کی۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی استبداد اور تسلط کے خلاف لوگوں نے اسے اپنایا اور بہت سی زیر زمین تحریکوں نے اسے حرز جان بنا کر رکھا۔

مٹھوریو نے اپنی باقی زندگی اپنے نظریات اور افکار کے عین مطابقت بڑی سادگی سے بسر کی۔ وہ کنکارڈ میں ہی ۶ مئی ۱۸۸۲ء کو فوت ہوا۔

اس کا شاہکار ”والڈن“ دنیا کی منفرد اور کیا تصنیف ہے۔ اس کے اپنے افکار و اعمال کی آپ بیتی یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جسے آدمی ایک بار پڑھ کر بھی اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کا مطالعہ بذاتِ خود ایک بہت اہم تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا تخلیقی انداز بیان، مادے پر نگہ افروز، فطرت سے عشق، وہ عناصر ہیں جنہوں نے اسے ایک سدا بہار کتاب کی حیثیت بخشی ہے۔ یہ ایک لازوال کتاب ہے۔ ہر دور میں اس کی معنویت برقرار رہے گی۔

”والڈن“ انسان کو فطرت اور سادگی کی طرف لوٹنے کا پیغام دیتی ہے۔ مٹھوریو اس کتاب کے حوالے سے بتاتا ہے کہ صحیح معنوں میں فطرت سے ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کرنا،

کتھن خوشگوار اور سادہ کام ہے اس نے جس انداز میں زندگی کی ضروریات کو کم کیا آج کے دور میں یقیناً تکلیف دہ اور بالکل اہمیز معلوم ہوں گی لیکن یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور میں ہر طرح کے حالات میں کس طرح پرسکون اور سادہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہ سادگی اور فطرت سے ہم آہنگی کو گہرے مفہوم سے پہنکا کرتا ہے۔ یہی اس کا فلسفہ ہے۔ یہی فزک کی آزادی وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ضرورتوں کو کم کر کے کس طرح انسان اپنی زندگی کی ۹۹ فیصدی بوجھل ذمہ داریوں سے نجات کر کے آزادی کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

بعض نقادوں نے اسے رومانیت، بھی قرار دیا ہے لیکن یہ عاجزانہ سی رائے ہے کہ والدین میں پیش کیا جانے والا فلسفہ حیات رومانیت کی کچھاپ سے آزاد ہے یہ ذلیل کاری کی کتابوں کے انداز کی کتاب نہیں۔ نہ ہی یہ فزیکل کی کتاب، کس طرح دولت مند بنا جا سکتے، کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب تخلیقی ہے اور ایک طرز زلیست پیش کرتی ہے جو انسانی تجربے کی دین ہے۔ والدین۔ رومان نہیں ہے بلکہ REALISM ہے والدین کا ترجمہ دنیا کی ہرزبان میں ہو چکا ہے۔ اردو زبان اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ محقروں کے اس شاہکار کا ترجمہ جدید اشعر مرحوم نے کیا تھا۔ والدین کی تخلیقی اور ادبی خوبیوں کے حوالے سے میں چارلس آر اینڈرسن کی رائے درج کر دوں گا۔

”والدین کو آپ بڑی آسانی سے ایک نظم سمجھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں اگرچہ اسے نثر کے روپ میں لکھا گیا ہے۔“

فزک کی آزادی اور اس کا حصول، فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بھرپور سادہ زندگی بسر کرنے کا فلسفہ اس کتاب کا موضوع اور روح ہے۔

سینئر

انسان کا عجز یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات اور عوامل میں جکڑا ہوا یہ نہیں جانتا کہ اگلے لمحے یا مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ انسان اگلے اندر ہمیشہ یہ تجسس رہا ہے کہ آنے والے زمانے یا ایام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر سکے۔ انسان کی اس غلب اور اس کے اس تجسس نے اسے ازل سے تاریک داویوں میں بھٹکایا ہے۔ اس نے دیوی دیوتا تخلیق کیے۔ کاپنوں اور راہبوں کو اپنی تقدیر شناسی کے لیے روحانیت کے شاندار اور بلند مندوں پر فائز کیا اور طرح طرح کے علوم کی بنیادیں رکھیں۔ دست شناسی، لکیروں کو پڑھنے اور تقدیر کو جاننے کا علم، ستاروں کی گردش سے اپنے مقدر اور مستقبل کو دالستہ کیا۔ اعداد اور ان کے معنی اور اثرات کو اپنی تقدیروں اور زندگیوں پر عادی کر دیا۔ اس سے تو ہم پرستی، تعویذ اور گندھے کا کاروبار شروع پر پہنچا۔ لگاہیوں کے نت نئے راستے کھل گئے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے جو اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اس حوالے سے بعض اہم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ غیب کا علم جاننے کی تمنا شاید ہی کوئی انسان ہو، جس کے دل میں اپنے مخصوص حالات کے سخت، پیدائش ہوئی ہو۔

اگے دن اخباروں میں دنیا کے بعض منجوں ستارہ شناسوں کی پیش گوئیاں شائع ہوتی ہیں۔ دست شناسی، علم نجوم، ستاروں اور اعداد کے حوالے سے دنیا میں ہر برس کتنی ہی کتابیں شائع ہوتی ہیں جو انسانوں کی عارضی تسکین کا جواز فراہم کرتی ہیں اور پھر بھلا دی جاتی ہیں لیکن ایک کتاب ایسی ہے جو دنیا کی عجیب و غریب کتاب ہے جو پچھلی صدیوں سے مسلسل عام انسانوں کے مطالعے میں بھی رہی ہے اور محققین نے بھی کسی بار تجزیے کیے ہیں۔ اس کتاب اور اس کے مصنف کے حوالے سے جو کچھ اب تک

مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے اس کو کیوں بیکارنا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو اب تک اتنی بار پڑھا گیا اور اتنی بار اس کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔

یہ کتاب دنیا کی سوغظیم کتابوں میں سے ایک ہے لیکن اپنی جگہ سب سے منفرد اور الگ تھلک ہے، اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب میں جو کشش ہے وہ عالمگیر نوعیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب نوسٹرا ڈامس کی تصنیف ہے۔ اس کا نام صدیاں ہے۔ اس کتاب میں صدیوں کے آنے والے واقعات کے بارے میں غیب بینی کا اظہار کرتے ہوئے پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب اپنے اسلوب کے لحاظ سے بھی بے حد منفرد ہے۔ نوسٹرا ڈامس نے اس کتاب کو رومی سے ملتی جلتی صنعت چومصرعوں کی نظم میں لکھا ہے۔ یہ پیش گوئیاں منظوم ہیں اور شاعری کے ذریعے پیش کی جانے والی ان پیش گوئیوں کے اسرار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے یہ پیش گوئیاں صدیوں سے عالم انسانوں اور محققوں اور عاملوں کے مطالعے میں رہی ہیں اور ان پر ہر دور میں اس موضوع کے ماہرین نے اظہار خیال کیا ہے ان کی معنویت پر بہت سرکھاپا گیا ہے اور پھر ایسے نتائج برآمد ہوئے ہیں جو بہت حیران کن اور ناقابل یقین ثابت ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے کو دیکھا ہے اور اس حوالے سے کچھ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ہٹلر کے حکم پر نازی پرہیگنڈہ وزیر کوئبلز نے نوسٹرا ڈامس کے حوالے سے بھی ساری دنیا پر ہٹلر کی عظمت اور برتری کا سکہ جملنے کی کوشش کی تھی۔ "سینچریز" میں یقیناً بعض بعض ایسی پیش گوئیاں شامل ہیں جن کا تعلق ہٹلر کی آمد سے تھا۔ اس کی فتوحات کے بارے میں نوسٹرا ڈامس نے صدیوں پہلے پیش گوئیاں کر دی تھیں۔ یہ پیش گوئیاں ہٹلر کے زمانے میں خوب اچھالی گئی تھیں۔ ان کی عالمگیر ہونے پر تشہیر کی گئی تھی۔

نوسٹرا ڈامس ایک ایسا شخص ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان تھا جو وقت کے اس پار دیکھ سکتا تھا اور اس کی کتاب "سینچریز" ایسی کتاب ہے جو آنے والی صدیوں کے بارے میں پیش گوئیاں کرتی ہے اور پچھلے چند سو برسوں میں نوسٹرا ڈامس کی اس کتاب میں جو پیش گوئیاں شامل تھیں وہ بہت حد تک سچی ثابت ہو چکی ہیں۔ اس حوالے سے اس عجیب و غریب کتاب پر محققوں، سائنس دانوں، ستارہ شناسوں، طبیعیات کے عاملوں، مورخوں اور روحانیت کے علم سے دلچسپی

لینے والوں نے بہت کچھ کیلھا ہے۔ باقی رہا عام آدمی تو وہ اس کتاب کو صدیوں سے پڑھتا چلا آ رہا ہے اور جب تک دنیا قائم ہے اور انسان میں مستقبل کا حال جاننے کے لیے تجسس کا جذبہ موجود ہے اس کتاب کا مطالعہ ہوتا رہے گا۔

نوسٹراڈامس کی موت کو چار سو برس سے زائد عرصہ ہو چکا ہے اور اس عرصے میں اس کی پیش گوئیاں حیران کن حد تک صحیح اور سچی ثابت ہو چکی ہیں۔!

نوسٹراڈامس فرانس کے صوبے پر دوئس کے ایک قصبے میں ۱۴ دسمبر ۱۵۰۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد نے ریاضی اور طب کے علوم میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اور اس دور کے کئی بادشاہوں اور نوابوں کے دربار سے وابستہ رہے تھے۔ محققین اور مورخین نے اس ضمن میں چند ایسے نتائج بھی پیش کیے ہیں جو بطور خاص ہماری دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔

نوسٹراڈامس جزا ایک ریگانہ رُوزگار طبیب تھا۔ اس نے اپنے دادا سے اس سلسلے میں خاص طور پر فیض حاصل کیا تھا اور اس کا دادا بطور خاص طب اسلامی سے متاثر تھا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس نے مسلمانوں کی طب سے استفادہ کیا تھا اور کئی قلمی نسخے در ثے میں نوسٹراڈامس کو اپنے دادا سے ملے تھے۔ اپنے زمانے میں نوسٹراڈامس نے جو بے مثل شہرت حاصل کی وہ ایک طبیب کی حیثیت سے تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے عہد کے بڑے بڑے نوابوں اور پھر شاہ فرانس تک کا مقرب ٹھہرا اور کئی اعزاز اور عہدے اس کو نصیب ہوئے۔ اس زمانے میں یورپ میں پلگ کو ایسا دہانی مرض سمجھا جاتا تھا جو قہر خداوندی تھا اور اس کا کوئی علاج نہ تھا اسے لا علاج سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نوسٹراڈامس نے دبا، میں گھرے قصبوں میں لوگوں کا علاج کیا۔ پلگ کا مقابلہ کیا اور اس نے ایسا نام پایا جو اپنے دور میں کیسا سمجھا گیا۔ پلگ کے مرض کا علاج اس نطنے کے فرانس میں صرف اسے معلوم تھا اور اس نے یہ طریق علاج اپنے دادا کے حوالے سے اسلامی طب سے حاصل کیا تھا۔

نوسٹراڈامس نے طب کے حوالے سے جو نام کمایا وہ اسلامی طب کا مریوں منت تھا لیکن آج وہ اپنی عجیب و منفرد تصنیف "سینچوریز" کے حوالے سے ساری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ "سینچوریز" جو بائی سے ملتی جلتی شعری صفت QUATRAINS پر مشتمل ہے۔

مائیکل ڈی نوسٹرا ڈامس نے طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور جن درسگاہوں میں اس نے تعلیم حاصل کی ان کے اساتذہ کی نگاہوں میں اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اہم مقام حاصل کیا

وہ ابتدائی عمر میں ہی ایک جنس

کا تاثر دینے لگا تھا۔ لیکن ساری عمر نوسٹرا ڈامس نے کبھی اپنی نفسیت کا ڈھنڈورہ نہ پیٹا۔ وہ بے حد منکسر المزاج اور بڑبڑا انسان تھا اس نے غالب علی کے زمانے میں طب کا ہی مطالعہ نہیں کیا بلکہ ادبیات ریاضی اور فلسفے کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ مذہب سے بھی اسے گہری دل چسپی تھی اور مذہب کے بارے میں اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس نے ایک مجبور پورا اور کامیاب زندگی بسر کی۔ پیگ کی دباؤں پر قابو پا کر اس نے پیشہ درحرف بھی پیدا کیے۔ وہ بھی تھے جو اس پر جادو کا الزام لگاتے تھے اور وہ بھی تھے جو اس کی بے مثل کامیابی سے حسد کرتے تھے۔ ایسے لوگوں نے نوسٹرا ڈامس کو نیچا دکھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی

ایسی تمام مخالفتوں سے بے نیاز اپنے انداز کی مطلق زندگی بسر کرتا رہا۔ اور پھر وہ فرانس کے شاہ کا مقرب خاص اور طبیب بن گیا، جس سے اس کی توقیر اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

وہ ۱۵۶۶ء میں فوت ہوا۔ اس نے ۶۲ برس ۶ ماہ ۷ دن کی عمر پائی۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی تدفین کے لیے خود ہی سیلون کے گرجے میں جگہ کا انتخاب کر کے اپنا مقبرہ تیار کروایا تھا۔ اس کی قبر پر لاطینی زبان میں ایک کتبہ لکھا ہوا ہے جس کی عبارت یوں ہے۔

یہاں ہمہ صحت انسان مائیکل نوسٹرا ڈامس کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اس نے ستاروں کے زیر اثر آنے والے زمانے کے بارے میں مستقبل کی پیش گوئیاں کیں اور وہ غالی ہونے کے باوجود واحد ایسا انسان تھا جو اس کی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ سیلون میں ۱۵۶۶ء میں فوت ہوا، خدا اس کی روح کو آسودہ رکھے۔ اس کی روجر این پونسارٹ اس کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔



نوسٹرا ڈامس۔ وہ انسان جو زمانوں کے پار دیکھ سکتا تھا۔ جسے ایسی نگاہ ملی تھی جو مستقبل میں صدیوں بعد آنے والے اہم واقعات کو دیکھ سکتی تھی۔ کون تھا؟ کیا وہ کوئی پیغمبر تھا، روحانی بصیرت اور بشارت کا علم رکھنے والا؟

اس سوال پر بہت بحث ہوئی ہے اور اس حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ آخر وہ کیا تھا، کون سی طاقت یا بصیرت اس کے پاس تھی کہ وہ آنے والوں کے بارے میں پیش گوئیاں کر سکتا تھا۔ ا وہ صدیوں بعد آنے والے واقعات، جنگوں، شخصیات کے بارے میں سہی بتاتا ہے۔ ہٹلر، پولین پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم، ہوائی جہازوں کی ایجاد، انسان کا چاند پر اترنا اور ایسے ان گنت تاریخی واقعات کو، جو اس کی زندگی اور موت کے صدیوں بعد رونما ہوئے، ان کا علم اسے صدیوں پہلے کس طرح ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام سوالات جو نو سٹراڈامس اور اس کی عجیب تصنیف "سینچریز" کے حوالے سے سامنے آتے ہیں ان کا جواب سائنس کے پاس موجود نہیں ہے، لیکن نو سٹراڈامس نہ سینچریز ہی کوئی مذہبی مقدس انسان، نہ ہی اس کا ایسا دعویٰ تھا۔۔۔ پھر اس سے پہلے اور بعد میں ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے مختلف پیش گوئیاں کیں جو کچھ درست نکلیں۔ کچھ غلط۔ لیکن صدیاں گزرنے کے بعد "سینچریز" کی پہلی اشاعت ۱۵۵۵ء سے اب تک اس کتاب میں جو مصرعوں کی صورت میں لگی پیش گوئیاں ہمیشہ سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔؟

سینچریز کی حیثیت محض، منظوم پیشگوئیوں پر مشتمل ایک کتاب ہی کی نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ تاریخ اور تاریخ کے تسلسل کے حوالے سے بھی بے حد دل چسپ ہے۔ آج اس کو پڑھیں تو کچھ پہلی صدیوں کی تاریخ بھی ان میں ملتی ہے اور آنے والے دور کے بارے میں تاریخی واقعات کی پیشگی اطلاع بھی۔ اس اعتبار سے بھی "سینچریز" دنیا کی ایک اہم کتاب ہے جو دنیا کی سب کتابوں سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔

ٹراں ایملی ڈی شیوگنی نے "سینچریز" کی جو تفسیر لکھی ہے اس کے مطالعہ سے اس کتاب کی کئی جہتوں کا شعور حاصل ہوتا ہے۔

نو سٹراڈامس کی کتاب "سینچریز" کے حوالے سے کہنے ہی ماہرین اور محققین نے اس سلسلے میں سرکھپا ہے کہ یہ جانا جاسکے کہ وہ کونسی طاقتیں، تحریکات اور پراسرار اسباب تھے جنہوں نے نو سٹراڈامس کو یہ صلاحیت بخشی کہ وہ پیش گوئیاں کر سکے۔ لیکن صدیوں سے کوئی ماہر، عالم اور محقق اس کے صحیح جواب تک نہیں پہنچ سکا۔

آج بیسویں صدی کے اختتام پر انسان نے جتنی عجیب العقول ایجادات کی ہیں، ان سب کا ذکر

کسی نہ کسی اشارے کے ذریعے نو سٹراڈاؤمس کی "سیلچرینز" میں ملتا ہے۔ آخر وہ کوئی طاقت بھتی جس نے نو سٹراڈاؤمس کو یہ سب کچھ صدیوں پہلے بتا دیا تھا۔

نو سٹراڈاؤمس کی زندگی کا مطالعہ کریں تو کسی نہج سے بھی وہ غیر معمولی انسان دکھائی نہیں دیتا۔ وہ غیر معمولی اور ناقابل یقین صلاحیتوں کا تو مالک تھا لیکن بطور ایک انسان اور شخص کے وہ آستمانی متوازن اور نارمل انسان تھا۔ یقیناً وہ اپنے دور میں فرانس کا سب سے بڑا مصلح اور طبیب تھا۔ اس میں بھی کوئی رشک نہیں کہ اس نے بڑی شہرت پائی لیکن وہ عام انداز کی متوازن زندگی بسر کرتا تھا اور اس میں پیغمبروں، نجومیوں، مذہبی اور مقدس آدمیوں جیسی کوئی نہج چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔

اس نے اپنی رصد گاہ قائم کی تھی۔ وہ ستاروں کی گردش کا مطالعہ کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ معصن ستاروں کے علم سے ہی تو ظہور میں نہیں آیا۔ اس کو جو غیر معمولی صلاحیت و دلچسپی تھی، اس کے بارے میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عطیہ خداوندی تھی اور نو سٹراڈاؤمس نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔ اس کے زمانے میں بعض لوگوں نے اس پر کافر اور جاہل ہونے کا الزام لگایا تھا نو سٹراڈاؤمس نے ہنری دوم کے نام جو خط لکھا تھا وہ اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس میں اس نے اس الزام کی تردید کی اور بتایا کہ وہ آسٹرالوجی کے ذریعے سے سب راز "معلوم کرتا ہے لیکن یہ بات ہو چکی ہے کہ معصن آسٹرالوجی اور دو سب علوم ہی اس کی پیش گوئیوں کے سلسلے میں اس کے معادن نہ تھے۔ بلکہ وہ خاص صلاحیت اہم کردار اور رہی تھی جو دلچسپی خداوندی تھی۔

نو سٹراڈاؤمس اپنی پیش گوئیوں کی اشاعت سے گھبراتا تھا کیونکہ مذہبی اداروں کی مخالفت کا خوف حقیقی تھا۔ اس نے ابتدا میں پہلے قریبی دوستوں کو وہ منظوم پیش گوئیاں سنائیں اور جب وہ اصرار کرنے لگے تو ان کی اشاعت پر رضامند ہو گیا۔ اس نے ان پیش گوئیوں کی زبان میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ تاکہ لوگ ان کے اسرار و معنی کو فوراً نہ پا جائیں بلکہ اس پر غور کریں نو سٹراڈاؤمس نے خود لکھا ہے کہ ان پیش گوئیوں کا ایک مقصد یہی ہے کہ انے والے دور کا انسان، آنے والی صدیوں میں رونما ہونے والے واقعات سے پیشگی طور پر واقف ہونے کے بعد احتیاطی تدابیر اختیار کر سکے۔ اور اپنی زندگی کے چلن کو بدل سکے۔

بہر حال ۱۵۵۵ء میں سیلچرینز کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کی اشاعت فرانس کے شہر لیون میں ہوئی۔ پہلے ایڈیشن میں چار سو چالیس منظوم پیش گوئیاں شامل کی گئی تھیں۔ اپنی اشاعت کے

فرانسیس سینیئر نے کو بے مثل مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان پیش گوئیوں نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ نوسٹرا ڈامس سے وضاحتیں طلب کی جانے لگیں۔ اس کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں۔ لیکن نوسٹرا ڈامس اپنی روایتی بردباری سے کام لیتا رہا۔

آسٹرا لوجی، علم ستارہ شناسی سے واقف لوگوں اور تاریخ کا علم رکھنے والوں کے لیے ان پیشگوئیوں کا صحیح ادراک کرنا زیادہ آسان ہے۔ یہ منظم پیش گوئیاں بالکل واضح بھی ہیں اور مشکل بھی۔ الفاظ کے اندازہ جاکر جھانکنا پڑتا ہے۔ کچھ حساب کتاب کی ضرورت بھی ان کے سمجھنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ "سینیئر" کی منظم پیش گوئیوں کی متعدد تفسیریں متعدد ادوار میں لکھی گئی ہیں اور کئی دہائیوں کے زمانے کے حوالے سے بھی ان پر مستقل بنیادوں پر بعض ماہرین کام کتے چلے آ رہے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں ان پیشگوئیوں کے حوالے سے اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نوسٹرا ڈامس کی "سینیئر" میں بیسویں صدی کے بارے میں جو باب ہے۔ وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہی اس کتاب کا آخری باب ہے۔ اس صدی کو نوسٹرا ڈامس DEADLINE کا نام دیتا ہے۔

اس حصے کی منظم پیش گوئیوں میں بیسویں صدی میں رونما ہونے والے خوفناک واقعات کے بارے میں نوسٹرا ڈامس باقاعدہ ہمیں سال اور سن تک کی خبر دیتا ہے۔ وہ اس صدی کے حوالے سے پانچ سو برس پہلے ہیں ستاروں کی صحیح گردش تک کا علم دیتا ہے۔ کہ کس سن اور تاریخ کو ستاروں کی گردش کا عمل کیا ہوگا اور کب اور کونسا واقعہ رونما ہوگا۔ اور یہ حیرت انگیز بات ہے کہ پانچ صدیوں کے بعد ویسا ہی کچھ رونما ہوا۔ اور ستاروں کی ویسی ہی گردش پائی گئی۔ جیسا نوسٹرا ڈامس نے اپنی کتاب میں لکھا اور پیش گوئی کی تھی۔

ان پیش گوئیوں میں ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم اور اس کے مابعد اثرات کا ذکر موجود ہے نوسٹرا ڈامس پانچ سو برس پہلے ایک آف نیشز کے بارے میں بھی اطلاع دے چکا ہے۔ سپین کا انقلاب روس کا انقلاب، دوسری جنگ عظیم، روس اور امریکہ یورپ کا رویوں سے استداد، ہنگو کا نمودار، عروج، فتوحات، مسولینی، نازی ازم اور فاشزم کا عروج، دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں، فرانس کا سقوط اور شکست، بیسویں صدی کی ایجادات، ایٹمی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، تباہیاں، سیلاب اور

بیسویں صدی کی سیاسی تبدیلیوں، ان سب کے باوجود اس میں نو سٹراڈامس نے چار سو برس پہلے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ حرف بہ حرف نہ سہی نوٹا نوٹے فیصد صحیح اور سچی ثابت ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ نو سٹراڈامس بیسویں صدی کے حوالے سے اپنی پیش گوئیوں میں یہیں بتاتا ہے کہ بیسویں صدی میں یورپ اور مغربی دنیا اپنی تمام تر مادی ترقیوں کے باوجود تباہی سے دوچار ہوگا۔ اور یہیں یہ نوید دیتا ہے کہ مشرق کو بیسویں صدی میں اہمیت حاصل ہوگی اور مشرق کو عروج ملے گا۔ لی میکا نے ان میں سے بعض پیش گوئیوں کی تفسیر اور وضاحت کی ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۸۱ تک نو سٹراڈامس کی کتنی پیش گوئیاں صحیح نکلیں اور بعض ایسی پیش گوئیوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو ۱۹۸۱ء میں نو سٹراڈامس کے حساب کے مطابق پوری آئیں۔

نو سٹراڈامس کی پیش گوئیاں پوری دنیا کے بارے میں ہیں۔ وہ یہیں دنیا کی تباہی کے بارے میں بتاتا ہے جو سن اس کی پیش گوئیوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ وہ ۱۹۹۹ء ہے۔۔۔

نو سٹراڈامس کی ریکتاب "سیچنز" دنیا کی عجیب و غریب کتاب ہے۔ چار مصرعوں میں بیان کی گئی کسی سو پیش گوئیاں پوری ہو چکی ہیں جو چار سو برس کے زمانے پر محیط ہیں۔

چار سو برس کی عالمی تاریخ کے اہم واقعات اور شخصیات کے بارے میں نو سٹراڈامس نے چار سو برس پہلے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ سچ نکلی ہیں۔ اس کی کتاب کا آخری باب بیسویں صدی سے متعلق پیش گوئیوں پر مشتمل ہے جسے وہ تباہی کی صدی قرار دیتا ہے یا پھر دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ نو سٹراڈامس کی غیر معمولی صلاحیت جو صدیوں اور زمانوں کے پار تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ بیسویں صدی سے لگے نہیں دیکھ سکی۔

"سیچنز" کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے۔ اس کتاب پر ہزاروں کتابیں اور تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ نو سٹراڈامس کے بارے میں کتابیں مختلف زبانوں میں ملتی ہیں۔ نو سٹراڈامس اور اس کی پیش گوئیوں پر مشتمل کتاب "سیچنز" سدا بہار کتاب ہے۔ جس نے پوری دنیا کو چونکا دیا ہے!

سٹڈی ان سائیکولوجی آف دی سکس

ہیولاک ایس۔ فرائڈ سے مختلف انسان ہی نہیں تھا بلکہ اس نے جو کام کیا وہ بھی فرائڈ کے کام سے مختلف ہے۔ ہیولاک ایس بے عرض انسان تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک جو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے دنیاوی آسائشوں اور آسودگیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس نے جس کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا تھا اسے مکمل کرنے میں اسے تقریباً اپنی ساری عمر نکبت اور ناداری کا سامنا کرنا پڑا اور جب کہ اس کے لیے خوش حالی اور آسودگی کے تمام مواقع موجود تھے۔ ہیولاک ایس نے اپنے کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

اس کی عظیم تصنیف "سٹڈی ان دی سائیکولوجی آف سکس" اپنے موضوع پر ایک ایسا کام ہے جو مستند اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے اس کام کی وجہ سے ہیولاک ایس کو "دارون آف سکس" بھی کہا جاتا ہے۔

ہیولاک ایس ۲ فروری ۱۸۵۸ء کو روتر سے (انگلستان) پیدا ہوا۔ اس کا والد سمندری جہاز کا کپتان تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم لندن میں حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر تھی جب اسے عزابی صحت کی وجہ سے اس کے والد کے پاس آسٹریلیا بھجوا دیا۔ جہاں وہ چار برس تک مدرس کی حیثیت سے پڑھنا شروع کیا وہ غیر موثر شخصیت کا جھینڈا اور شرمیلا انسان تھا۔ لنڈن واپس آ کر بائیس برس کی عمر میں ہیولاک ایس نے سینٹ تھامس ہسپتال میں طب کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ پکنس کوٹا ٹارٹم۔ اس نے جو علاقہ چنا تھا۔ وہ لنڈن کے نادار لوگوں کا علاقہ تھا لیکن اس کی اصل دلچسپی تھی و تصنیف میں تھی۔ اس لیے اس نے ڈاکٹری کی پکنس جیلر ہی ترک کر دی۔ جب وہ تیس برس کا ہوا

تو اس کی پہلی کتاب شائع ہوئی جس کا نام "دی نیو سپرٹ" تھا۔
اس کتاب کی اشاعت کے بعد اسے جنس کے موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر اس نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ یہ وہ موضوع تھا جو اس زمانے میں ممنوعہ قرار دیا جا چکا تھا انسانی جنس کے بارے میں ہیولاک ایلس نے مواد جمع کرنا شروع کر دیا اور تحقیق کا آغاز ہوا۔

اس عظیم الشان علمی کارنامے "سڈیز ان سائیکولوجی آف سیکس کی پہلی جلد - SEXUAL INVER-SION" کے نام سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تو تسلیم کیا ہوگا حکومت وقت نے اسے "فحش" قرار دیا ایک علمی اور سائنسی نوعیت کے کام کو فحش اور مخرب اخلاق قرار دینا بظاہر بڑا عجیب لگتا ہے لیکن اس دور میں انگلستان کا معاشرہ ابھی فراخ دل اور سائیکھک نہ ہوا تھا۔ اس شدید دھچکے کے باوجود ہیولاک ایلس نے اپنے کام کو جاری رکھا اور اپنے عظیم الشان تحقیقی اور علمی کام کی دیگر جلدیں اور حصے شائع کرتا چلا گیا اس کے ہم عصر اور ہم جہاں اس کے عظیم الشان کارنامے کو سراہتے نہیں تھکتے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر وہ اپنے اس علمی اور ادبی کام کو ثانوی حیثیت دیتا اور ڈاکٹری کی پریکٹس کو جاری رکھتا تو ناداری اور مفلسی کی زندگی بسر کرنے سے بچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے لیے ساری عمر کی تنگی اور ناداری کو قبول کر لیا۔ لیکن اپنے مقصد اور عظیم علمی اور تحقیقی کام کو ثانوی حیثیت نہ دی۔

ہیولاک ایلس کی عمر ۶۴ برس تھی جب اس کی کتاب "ڈانس آف لائف" شائع ہوئی یہ کتاب "تجارتی اعتبار سے کامیاب ہوئی اور زندگی میں پہلی بار اس نے خوش حالی اور آسودگی کا ذائقہ چکھا۔ ہیولاک ایلس ۸ جولائی ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔

اس کی عمر اس وقت انتی برس تھی۔ ہیولاک ایلس عورتوں کے حقوق کا زبردست حامی تھا۔ وہ ہم جنسیت میں مبتلا افراد کا بھی دفاع کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ان کو ملین سمجھتا تھا۔ جنس کے موضوع پر گفتگو مذاکرات اور مکالمے کے سلسلے میں ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اس موضوع پر آدیں کام کرنے والے تھے۔ اس نے اپنا یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جنسی مسائل کے بارے میں جو شخص بھی مشورے کے لیے اس سے رجوع کرتا وہ اسے اپنے ماہر اور مشورہ دینا اور کسی قسم کی فیس نہ لیتا۔ ہیولاک ایلس کو یہ بات کبھی سمجھ میں نہ آسکی کہ فریڈ اپنے فریڈوں سے فیس کیوں وصول کرتا ہے۔ ؟

ہیولاک ویسے مزاج کا انسان درخت شخص تھا۔ جس کے بارے میں بڑے وثوق سے کہا جا

سکتا ہے کہ اس کے ایک وجود میں صوفی اور سائنسدان ایک جا ہو گئے تھے۔ مارگرٹ، سیگنر جس نے برتھ کنٹرول کے عامی کی حیثیت عالمی شہرت حاصل کی۔ اس نے ہیولاک ایس کی شخصیت کو بڑے خوب صورت اجمالی انداز میں پیش کیا ہے۔

”وہ ایک طویل القامت فرشتے کی طرح تھا، نیلی آنکھیں پر کشمش چہرہ اور

ایک منفرد سفید لمبی داڑھی کا مالک۔“



ہیولاک ایس نے اپنی زندگی کا یادگار اہم اور ہمیشہ زندہ رہنے والا علمی اور تحقیقی کام سٹڈیز ان سائیکولوجی آن سیکس، سات جلدوں میں مکمل کیا۔ یہ سات جلد ۱۸۹۷ء سے ۱۹۲۸ء تک شائع ہوئیں۔ گویا یہ عظیم کارنامہ ۳۱ برس کی محنت شاقہ کے بعد اپنی تکمیل کو پہنچا۔ چونکہ یہ ایک بڑا کام تھا اور ضخیم بھی۔ اس لیے عام قاری کی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہیولاک ایس نے اپنے اس عظیم کام کا خلاصہ بھی خود ہی سائیکولوجی آن سیکس کے نام سے شائع کرایا۔

یہ اس عظیم اور کام کی تلخیص ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور تب سے اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں پچکے ہیں۔ دراصل کتاب جو سات حصوں پر مشتمل ہے۔ وہ سات جلدوں اور ایک جلد میں بھی بار بار شائع ہوتی رہتی ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ہیولاک ایس ایک محقق اور سائنس دان تھا جو ساری عمر جنس انسانی کے حوالے سے سائنسی صداقت کی تلاش میں رہا مطالعہ جنس کے حوالے سے وہ اس موضوع پر کام کرنے والوں میں اولین بانی کی حیثیت رکھتا ہے اور سائنس کی حیثیت بھی اور اسی حوالے سے اسکی عظیم اٹان تصنیف سٹڈیز ان سائیکولوجی آن سیکس کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے اور اس کا شمار دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔

اس کتاب کا اندازہ اس کے موضوعات اور دائرہ تحقیق کی وسعت سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہیولاک ایس پہلے جنس کی باولوجی۔ اس کے حیاتیاتی پہلو کو سامنے لاتا ہے کہ جنس کی طبیعیاتی

بنیادیں کونسی ہیں جنس کی نیچر کیا ہے، پھر وہ ایروجنیک زونز کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے
 باہمی میل ملاقات، کورٹ شپ، کی حیاتیاتی حیثیت کیا ہے۔ رجیماتی دصال اور ملاپ کے مسئلہ جنس

کی حیاتیاتی حیثیت کیا ہے۔ رجیماتی دصال اور ملاپ کا مسئلہ جنس کے انتخابات کے عوامل یعنی
 لمس، شامہ، سماعت اور بصیرات

اس کے علاوہ عمقوان شباب میں جنس کے مظاہر کو سامنے لاتا ہے۔ ان میں جنسی
 MUSE کا پہلا طور، جاگتے خواب، شہوانی خواب، خود لذتی نزگیت اور جنسی تعلیم جیسے
 موضوعات پر اپنی تحقیق، فکر کا حاصل بیان کرتا ہے۔ جنسی انحراف و تجاوز اور جنسی محبت کی علامتوں
 کے حوالے سے وہ جنسی نمائش پسندی، فتنے ازم، سادیت اور مساکیت اور جنسی انحراف و تجاوز
 کے حوالے سے سماجی ردیوں پر بحث کرتا ہے۔

اہم جنسیت، کے موضوع پر ہیولاک ایس کی تحقیقات کو اس موضوع پر بطور خاص ننگ
 میل کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اسے جنسی INVERSION یعنی جنسی عمل معکوس سمجھتا ہے۔ اس
 عمل معکوس کا بھرپور تجربہ کرتے ہوئے اس کے اسباب کی تہہ تک پہنچتا ہے اور پھر سب سے اہم
 مسئلہ جو اس سلسلے میں اٹھاتا ہے کہ ہم جنسیت میں مبتلا لوگوں کا علاج کیسے ہو سکتا ہے۔

سڈیزان سائیکوجی آف کیس " میں ہیولاک ایس نے بہت اہم نازک اور متنازعہ کام
 کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ نفسیات جنس کے حوالے سے اس نے پوری کوشش کی کہ اس کے مطالعہ میں
 کوئی خامی نہ رہے یقیناً اس کے اس عظیم الشان کارنامے کے بعد آنے والے ادوار میں اب تک
 اس کے کام کو بنیاد اور رہنما بنا کر اس موضوع پر بہت بڑی عمارت تعمیر کی گئی ہے اور ہیولاک ایس
 نے اس موضوع پر کام کے امکانات کو جس انداز میں مرتب اور ظاہر کیا۔ اس سے بہت استفادہ
 کیا جاتا رہا ہے۔

اس عظیم الشان کام میں اس نے شادی کے ادوار اور ہم ادوار اس کے جنسی پہلو کی نفسیات
 پر اہم نتائج سے بھرپور کام کیا ہے وہ شادی کے ادوار کے کا جنسی حوالے سے بہت قائل ہے اور
 اس کی افادیت کو نمایاں کرتا ہے پھر شادی میں جو تکسین اور آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ اس پر تفصیل

گفتگو کرتا ہے۔ ایسی شادی جو اولاد سے محروم اور بے اثر ہو، اس کے بارے میں بھی وہ اپنے خیالات سے آگاہ کرتا ہے۔ اسی ضمن میں وہ جنسی سرد مہری اور جنسی نامتاسمی اور مردمی کو بھی زیر بحث لا کر جنسی مغرضات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اور اس کی تخلیق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نفسیات جنس کے مطالعے میں بیولاگ ایس محبت کو بے حد اہم سمجھتا ہے۔ محبت کے فن (ART OF LOVE) کے حوالے سے پہلے تو وہ یہ مسئلہ پیش کرتا ہے کہ محبت کے رشتے میں جنسی پہچان کا کتنا واسطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ پھر وہ اس سوال سے عمدہ براہوتا ہے کہ محبت کرنا ایک آرٹ اور فن کیوں ہے اپنے اس مہتمم باشان علمی اور تحقیقی کارنامے کے آخر میں وہ جنسی پہچان و تحریک کے تہلکہ خیز پہلو اور اس کی نوعیت پر خاتمہ کلام کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہوئے جنس کے ارتقائی پہلو (SUBIMTY) اور کو نمایاں کرتا ہے۔۔۔۔

بیولاگ ایس اپنی مہتمم باشان ہمیشہ زندہ رہنے والی تصنیف میں لکھتا ہے۔

ہماری پوری زندگی جیسا کہ میں اکثر مواقع پر اس طرف اشارہ کرتا رہا ہوں، ایک آرٹ ہے۔ میرے اس بیان کو ان لوگوں نے ہی مسترد کیا ہے جو آرٹ کو جاہلیانہ جنیات کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک دوسرا اور جداگانہ موضوع ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ بناتے ہیں وہ سب آرٹ ہے اور آرٹ کو ان کے دوسرے تمام اعمال سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کن کن زندگی ایک آرٹ ہے، ایک صداقت ہے، محض صداقت اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی ایک بڑا آرٹ ہے۔

اپنی عظیم الشان اور ہمیشہ زندگی رہنے والی تصنیف "سڈیز ان سائیکولوجی آف سیکس" کے حوالے بیولاگ ایس یہیں یہ راہ دکھاتے ہیں کہ اگر زندگی بسر کرنا۔ ایک بڑا آرٹ بن جائے تو اسے اچھا اور خوب صورت آرٹ کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔۔۔۔

شاخ زریں

علم الانسان میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جن کا وہ مقام اور علمی رتبہ ہو جو سر جیمز فریزر کی عمد آفریں تصنیف ہے۔ شاخ زریں کا ہے۔
ایک نقطہ پھیلنے پھیلنے کے لیے کس طرح دریا بنتا ہے یہ کتاب اس پھیلاؤ اور عمل کی سمجھی ایک ایسی مثال ہے جو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

شاخ زریں کا موضوع جاو اور مذہب کے باہمی رد وابط کا مطالعہ ہے یہ ایک موضوع ہے جس پر اب تک بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن اس موضوع کو جس علمی اور فکری انداز میں سب سے پہلے سر جیمز فریزر نے کھنگالا تحقیق کی اور اس پر کام کرتے ہی چلے گئے۔ اس کی وجہ سے اس اہم انسانی موضوع پر اس کتاب کو دنیاوی حیثیت حاصل ہے۔

یہ بھی اس کتاب کا ایک دلچسپ پہلو ہے کہ اہتمام میں جو موضوع دو جلدوں میں سما گیا تھا۔ وہ پھیلتا ہوا بارہ جلدوں تک پہنچ گیا۔

علم الانسانیات میں سر جیمز فریزر کی اس عمد آفریں تصنیف سے پہلے علماء کا یہ رویہ بہت نمایاں اور غالب تھا کہ انسانی عقائد اور رسوم کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ سر جیمز فریزر نے اس رویے کو اپنانے کے بجائے یہ مطالعہ کیا کہ انسانی رسوم، جاو اور مذہب ہی عقائد کے باہمی رد وابط کیا ہیں ان میں کون سی مشابہت ہیں اس طرح سے فریزر نے یہ دریافت کرنے کی سعی کی کہ مذہب کے باسے میں انسانی فنکارانہ عقائد کس طرح ہوا

سر جیمز فریزر یکم جنوری ۱۸۵۴ء کو گلاسگو میں پیدا ہوئے ان کے والد ایک بڑی تجارتی کمپنی

میں حصے دار تھے فریزر کے والدین مذہبی لوگ تھے اور گھریلو ماحول مذہبی تھا۔ عبادت پر خاص توجہ جاتی تھی۔ فریزر کے تعلیمی دور کا آغاز ہوا تو انہوں نے لاطینی اور یونانی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔

اس دور میں ہی انہیں کلاسیک ادب سے وہ دلچسپی پیدا ہوئی جو تمام عمر برقرار رہی اگرچہ والدین کی یہ خواہش تھی کہ وہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی خاندانی سبجارتی کمپنی میں کام کریں لیکن فریزر کے علمی انہماک کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے گلاسگو یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا گیا یہاں سے میٹرک کے بعد وہ ٹرنٹی کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں فریزر کو مشرقی زبانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ بعد میں والد کی خواہش پوری کرنے کے لیے فریزر نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا تاہم فریزر نے ساری عمر دکالت نہیں کی

علم الالف ان میں فریزر کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ ٹائیلز کی کتابوں نے ان کو بطور خاص متاثر کیا اور پھر ان سے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے لیے TABOO کے موضوع پر مضامین لکھوائے گئے۔ فریزر کے یہ مضامین ۱۸۸۸ء میں انسائیکلو پیڈیا کے نوٹس ایڈیشن میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین تھے جو فریزر کی اس عمد آفرس کتاب "شاخ زریں" کی بنیاد بنے۔ فریزر نے لکھا ہے۔

"اس مضمون کے لیے میں نے جو تحقیقی کام کیا وہ دراصل اس منضبط کام کا پیش خیمہ ثابت ہوا میں نے بطور خاص ان قروں کے رسم و رواج کا مطالعہ کیا جو لہذا نہ ہی اور جنہیں وحشی سمجھا جاتا ہے۔"

۱۸۹۶ء میں فریزر نے شادی کی اور فروری ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سر جیمز فریزر کی تصانیف میں یونان پر بھی ایک کتاب شامل ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہت کی ابتدائی تاریخ، لازوال زندگی اور مردوں کی پوجا، عمد نامہ عین میں عام لوگوں کے عقائد اور روایتیں، مظاہر پرستش، آگ کے مانند سے متعلقہ دیونا لا وغیرہ ان کی وہ تصانیف ہیں جن کے عنوانات سے ہی ان کے موضوعات اور اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے تاہم ان کی عمد آفرس تصنیف "شاخ زریں" ہے جس کا پورا نام شاخ زریں، جادو اور مذہب کا مطالعہ ہے

یہ کتاب ۱۸۹۰ء میں پہلی بار دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء تک بارہ جلدوں میں مکمل ہو کر شائع ہوئی اس کی اشاعت کی مختصر تفصیل یوں ہے۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں، دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۰ء میں تین جلدوں میں اور پھر تیسرا ایڈیشن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک

بارہ جلدوں میں شائع ہوا اور اس پر ہی ختم نہیں ہوئی۔ فریزر نے عام قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی تلمیض خود ہی کی جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔

سرجمین فریزر کی اس کتاب کو اپنے موضوع کے اعتبار سے بنیادی حیثیت حاصل ہے اور یہ دنیا کی ان کتابوں میں سے ایک ہے جن کے ثمرات انسانی فکر پر بہت گہرے ہیں اور اس سے انسان کے عقائد اور مذہب میں جو مشابہت ہے اس کے حوالے سے دور رس نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب میں واقعات کا جو سلسلہ اور تحقیق سامنے آتی ہے اس سے انسانی فکر و عمل کے مراحل پر روشنی پڑتی ہے۔ فریزر کے نزدیک انسانی فکر نے در بدر ترقی کی۔ اس ترقی کے بنیادی مدارج سحر اور جادو ہیں۔ سحر سے مذہب اور مذہب سے سائنس تک یہ مدارج تبدیل ہوتے چلے گئے ہیں فریزر نے اس فکر و عمل کو رزمیہ منظم کا نام دیا ہے۔ فریزر لکھتا ہے۔

واقعات کا دور جو شاخ زریں میں بیان ہوا ہے ایک پیمپہ خاکے میں اندھیرے اور اجالے کے گھٹتے بڑھتے کھیل ہیں۔ اس طویل ارتقا کو سامنے لاتا ہے جن سے انسانی فکر درجہ بدرجہ سحر سے مذہب اور مذہب سے سائنس میں تبدیل ہوتے ایک مددگار یہ انسانیت کی ایک رزمیہ منظم ہے اس انسانیت کی جن نے سحر سے ابتدا کرتے ہوئے اپنی پختہ عمر میں سائنس پر قابو پایا ہے اور یہی سائنس شاید اس کے لیے موت کا سبب ہے کیونکہ جس عمر فریت نے آج انسانی فکر کو جنم دیا ہے وہ انسانیت کو موت کی دھمکی بھی دیتا ہے حالانکہ انسانیت کا دار و مدار اچھی ترقی اور آسودگی کے لیے اسی فکر پر ہے۔

سرجمین فریزر کی اس کتاب کا جو دو جلدوں میں طبعی ایڈیشن ہوا تھا اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے اور مترجم سید فاکر اعجاز ہیں۔ شاخ زریں کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے اثرات جدید ادب اور جدید نفسیات پر بھی بہت گہرے ہیں۔ دیو مالا اور اساطیر کے حوالے سے جو کام ڈونگ نے اپنی تصنیف میں کیا۔ اس کتاب کے حوالے سے ڈونگ کے نظریات کا مطالعہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اور پھر ادب کے حوالے سے بھی فریزر کی کتاب ایک بہت بڑا حوالہ بنتی ہے۔

شاخ زریں "دیو مالا اور مذہب" کا ایک ایسا مطالعہ ہے جس نے علم انسان، قدیم انسانی تاریخ یورپ اور ایشیا کے عوام کے عقائد، قصے، کہانیوں اور روایات اور رواجوں سے پورا مفادہ کیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ عناصر جو فریزر کی اس کتاب کے موضوع کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

”شاخ زریں“ میں انسانی فکر کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد جس طرح انسانی فکر نے ترقی کی ہے اس کا تحقیقی اور فکری جائزہ لیا گیا ہے اس کتاب کا موضوع تو گزشتہ زمانے ہی سے تعلق رکھتا ہے لیکن دراصل اس کا پھیلاؤ حال اور ماضی تک کا حامل کرتا ہے۔

فریزر کا یہ کام اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے نتائج نے انسانی فکر کو بدل کر رکھ دیا ہے وہ لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے یا اس کا مطالعہ کریں گے وہ اس کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس علمی کام کے حوالے سے یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ اسے جس زبان میں لکھا گیا ہے وہ اعلیٰ درجے کی نثر ہے۔

”شاخ زریں“ اس اعتبار سے ہی اہم نہیں کہ اس کا موضوع اہم ہے اور اس موضوع پر فریزر نے اپنی عمر کے پچاس برس صرف کیے بلکہ اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی شرعی اور ادبی ہے اور ادب میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے

فریزر نے اس کتاب کے حوالے سے جن نظریات اور نتائج تک رسائی حاصل کی ہے اس کے اعتبار سے اس کو وہی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جو ڈارون اور فرائیڈ کے نظریات اور تصانیف کو حاصل ہے۔ اور فریزر نے جو نتائج اخذ کیے وہ ہماری تہذیب کا ایک اہم اور ناگزیر حصہ بن چکے ہیں اس کتاب کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کسی جا سکتی ہے انسان جو صدیوں سے فوق الفطرت کے خوف میں جکڑا ہوا تھا اور اس خوف سے آزادی کے لیے جو کوشش کش صدیوں سے انسانی اجتماع فیہن میں ہو رہی تھی یہ کتاب اس خوف سے نجات دلاتی ہے۔

انسان بہت ترقی کر چکا ہے اس کی ترقی بے مثل ہے لیکن آج بھی وہ سحر اور توہمات کے اثرات سے آزاد نہیں ہوا اور اس کی بھرپور جھلکیاں انسان کے مذہبی عقائد میں ملتی ہیں۔ فریزر نے اپنی اس عمدہ آفریں کتاب میں سحر اور مذہب کا جو مطالعہ پیش کیا ہے وہ ہماری فکر پر اثر انداز ہوتا ہے اس کتاب میں وہ سحر اور مذہب پر بحث کرتا ہے اور اس کی تمام جزئیات پر لوتجو دیتا ہے پھر بادشاہ اور مقدس بادشاہ کا فرق بیان کرتا ہے۔ سحر پرستی کے عقیدے کا کھوج لگاتا ہے اور اس کے ڈانڈے جدید یورپ میں سحر پرستی تک ملتا ہے انسانی روح کے بارے میں اس کا مطالعہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ پھر وہ تحریف (TABOOS) پر بحث کرتا ہے جس میں اشخاص اور اشیاء کی تحریف بطور

خاص دعوتِ فکر دیتے ہیں اپنے موضوع کو فریئر کہیں بھی تشنہ نہیں چھوڑتا۔ اس نے الفاظ کی تحریم کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف ادب بلکہ انسیات کے حوالے سے بھی بہت اہم ہے اور پھر وہ جو مطالعہ قدیم انسان کے حوالے سے کرتا ہے اس میں اس کا نقطہ نگاہ بہت اہم ہے فریئر قدیم دور کے انسانوں کو وحشی نہیں سمجھتا بلکہ اس کا مطالعہ اسے اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ قدیم دور کے وحشی انسان کے جدید انسان پر بہت سے احسانات ہیں وہ قدیم دور کے انسان کی مگر اہسیوں اور لغزشوں کو ان خطاؤں کا نام دیتا ہے جو تلاشِ حق کی راہ میں سرزد ہوتی ہیں۔

شاخِ زریں، ایک عظیم علمی کام ہے۔ اپنے موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا۔